انشاء
خصوصی
پیشکش
Rs. 10/-

thing Support a Goodnight Sleep

A package deal to knock you out!

Agent & Stockist

WESTERN PLYWOOD STORES

80, COLOOTOLA STREET, CALCUTTA - 700 073, Phone : 25-0184

Also Available

★ WESTIND BRAND PLYWOOD
(Decorative + Boiled Water Resistant and Proof and Laminated etc.)

★ HARD BOARD (WIPLAC – H – BSF)

ماہنامہ **انشاء**

کی انتھک محنتوں اور
نتیجہ خیز کوششوں کے اعتراف
کے ساتھ
اہل اردو کو مبارکباد
پیش کرتا ہوں

اردو پریمی : **راجیش کھیتان**

ممبر مغربی بنگال اسمبلی

کانگریس (I)

ماہنامہ **انشاء** کلکتہ

جلد ۱۰ شمارہ : ۱ جنوری ۱۹۹۵ء

رہنما : احمد سعید ملیح آبادی
ڈاکٹر قمر رئیس

مدیر : ف۔س۔ اعجاز

معاون : جی۔ ایم۔ جگنو

مجلس مشاورت : محمد امیر الدین
افضل اقبال
جمال الدین احمد صدیقی

ستزئین : امیر حسن

پروسیسنگ : ثاقب فیروز

Price of this (Century) issue :	Ordinary	Library Edition
India :	Rs. 16/-	Rs. 50/-
Abroad :	£ 3 or US$5	X

Price of ordinary issue : Rs. 8/- (in India)
Annual Subscription : Rs. 90/- (in India)
£ 10 or US$17 (Abroad)
(Add £ 2 or $ 3 for this issue)
(Ordinary airmail charge included)

Drafts/Cheques are accepted in the name of
"M/S. INSHA PUBLICATIONS"
(U.K. Subscribers are advised to send B.P.O.)
Mailing Address :
MAHNAMA INSHA
Insha Publications
25-B, Zakaria St, Calcutta - 73, (India)
Phone : 25-4616, Fax : 247-6063

فہرست

صدی شمارہ

صفحہ نمبر

منظومات :-

یہ انشاء کا سوواں شمارہ ہے

الحمد للہ یہ ماہنامہ انشاء کا سوواں شمارہ ہے ۔ انشاء کلکتہ سے نکلتا ہے اور پہلی بار کلکتہ کا کوئی رسالہ اپنے قارئین کو سو شمارے دے پایا ہے ۔
اردو کا پہلا اخبار " جام جہاں نما " ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے نکلا تھا ۔ لیکن انشاء سے پہلے کلکتہ کی ادبی صحافت اپنے صحیح تعارف کی محتاج تھی ۔
ابتداء میں انشاء کو ایک معیاری متنوع فیملی میگزین بنانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن انہیں کار اسے ایسا بننا تھا جیسا کہ اب یہ ہے ۔ انشاء کو ہم نے جام جمشید بنانے کی کوشش کی ہے کہ ساری دنیا کے ادباء و قارئین کے چہرے اس میں نظر آسکیں ۔ ہمارے وسائل محدود تھے ، ہمارے نتائج بھی محدود ہیں حالات موافق ہوتے تو ہم ترقی کی کئی اور منزلیں سر کرلیتے ۔ سو مہینے کوئی بڑی مدت نہیں ہوتی لیکن اس مدت میں لکھنے اور پڑھنے والوں نے طرح طرح ہمیں آزمایا ہے ۔ انشاء کا موجودہ تانا بانا ان ہی کا بنا ہوا ہے ۔ ہمارے قائین چالو پرچوں کے قارئین سے تعداد میں کم سہی لیکن وہ علم و استدلال اور ذوق کی سطح پر مستحکم ہیں اور متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔ وہ عصری افکار اور تازہ کار حوادث کا فوری اثر قبول کرتے ہیں ۔ اور ان کا ردعمل تیز ہوتا ہے یہی سبب ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں انشاء کے عام اور مختلف موضوعات یا شخصیتوں پر مشتمل ادبی گوشوں والے شماروں نیز خاص نمبروں مثلاً احمد سعید ملیح آبادی نمبر ، ادیبوں کی حیات معاشقہ نمبر ، قمر رئیس نمبر ، انشاء عالمی اردو افسانے نمبر اور بابری مسجد نمبر میں پائدار اور منقلب ادبی ، تنقیدی ، صحافتی یا سیاسی رویوں کو پڑھا جاسکتا ہے ۔

یہ ایک کڑوا سچ ہے کہ انشاء جیسے پرچوں کو سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع سے تعاون حاصل نہیں ہوتا ۔ اور ناشرین کو قدم قدم پر دکھ اور مصیبت جھیل کر یہ کار خیر انجام دینا پڑتا ہے ۔ عام پرچے سکہ بند ڈگر پر چلتے ہیں ۔ ان کے قارئین اس ڈگر کو قبول کرتے ہیں ۔ ایک کنزیومر آئٹم کی طرح یہ پرچے گویا کسی کارخانے سے تیار ہو کر بازار میں پہنچ جاتے ہیں ۔ انہیں خرید لیا جاتا ہے ۔ یہ سیدھی اور جائز تجارت ہے نہ یہ کوئی قابل اعتراض بات ہے اور نہ اس پر اعتراض کیا جانا چاہیے ۔ لیکن ملک کے ادب و ثقافت کی آبرو انشاء جیسے رسالے ہوتے ہیں ۔ ادبی اور ذہنی تحریکات ایسے ہی جریدوں کی رہنمائی میں سر ابھارتی ہیں ۔ لیکن ہمارے مسائل پر نہ حکومت کی نظر ہوتی ہے اور نہ اکاڈمیوں کی ۔ اور نہ کسی اور کی ۔ حتی کہ اردو اخبارات کے مسائل پارلیمنٹ میں جو لوگ اٹھاتے ہیں وہ بھی اردو کی Totality کو مدنظر نہیں رکھتے ۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۳ / جولائی ۹۴ء کی آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے اجلاس منعقدہ نئی دہلی میں کانفرس کے صدر م۔ افضل صاحب ممبر پارلیمنٹ و ایڈیٹر ہفت روزہ " اخبار نو " اور فاضل سکریٹری جنرل خلیق انجم صاحب نے ممبر ایڈیٹروں کو مدعو تو کیا مگر میٹنگ میں یہ اعلان کردیا کہ روزناموں سے ماہناموں کو الگ کیا جاتا ہے اور پیریوڈیکلز کے لئے ایک الگ کمیٹی بنادی جائے گی ۔ ظاہر ہے یہ تجویز ناقص ہے ۔ خیر یہ ایک الگ بحث ہے اور اس کا یہ موقع نہیں ہے ۔

انشاء کے دم سے کلکتہ کی ادبی صحافت میں تعمیری اور مثبت تبدیلیاں واقع ہوئیں ۔ ہمارے شہر میں دلچسپ اور خوبصورت ادبی محفلیں منعقد ہونے لگیں جن سے ناظرین میں امنگ جاگ اٹھتی ہے ۔ ادبی محفلوں میں لوگوں کو لب اظہار وا کرنے کا موقع ملتا ہے اور تحریروں کے ذریعہ وہ اپنے تاثر ، اپنی تخلیق اور تنقید کو منظر عام پر لے آتے ہیں ۔ تہذیب اور کلچر کا تحفظ اسی طرح ممکن ہے لیکن ایسی کوششوں کی سرپرستی سوسائٹی کے بالاتر طبقے کے لوگ ہی کرسکتے ہیں ۔ جو متمول ہونے کے علاوہ باذوق بھی ہوتے ہیں ۔ کبھی اس شہر میں اردو کلچر کے دلدادگان میں زیادہ تر غیر مسلمین ہوا کرتے تھے ۔ اب وہ ہندو اور سکھ و غیر سکھ پنجابی رہے نہیں ۔ یوں کہئے کہ اردو کے صحیح سرپرست اللہ کو

پیارے ہوچکے ہیں ۔ اور اس گنتی کے چند باشعور اور باذوق مسلمان اور ہندو رہ گئے ہیں جو ان باتوں کو سمجھتے ہیں ۔ مسلمان بھائیوں کا تو یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر بے تکے خرچ ضرور کریں گے لیکن اپنی زبان اور شائستہ کلچر کے سلسلے میں انوکھی بے حسی اور لاتعلقی کا اظہار کردیں گے ۔ حالانکہ سب طبقے سے زیادہ خوشحال ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں کوئی کر بھی کیا سکتا ہے کاش یہ رسالہ کلکتہ کی بجائے دہلی سے نکلتا تو کچھ فائدے ہمیں بھی ہوجاتے ۔ مثلاً جہاں سے مختلف عنوانات سے اردو کے سرکاری مال دھندے تقسیم ہوتے ہیں اور انجمنوں ، اداروں اور وزیروں کا رحم و کرم بانٹا جاتا ہے اور جہاں " اردو ہائے اردو " چلانا ہی ایک پیشہ ہے وہاں اردو کا مد بھی اپنا بھلا ہونے کا کچھ امکان ضرور ہوتا یہ بھی نہ ہوتا تو پرچے کے ساتھ ایک فرضی دواخانہ کھول لیتے اور " قبلہ بڑے حکیم صاحب " کے نام سے پوشیدہ امراض ، نامردی اور بانجھ پن کی دوائیں بیچ کر ماہوار رسالے کا پیٹ پالتے ۔ مگر وائے قسمت ہم کلکتہ میں ہیں جہاں ترقی پسند حکومت کے خداوندوں کو مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے معصوم فرشتے پتہ نہیں کیا سمجھاتے ہیں اور کیا دکھاتے ہیں ۔ ۸۹ء کی جن کتابوں کے لئے مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے انعامات کا اعلان کیا ان کے مصنفین کو وہ انعامی رقمیں آج تک نہیں دے پائی ہے ۔ اور اس کے بعد سے انعامی مقابلوں کے لئے اس نے کتابیں لینا ہی بند کردیا کتابوں کی خریداری بند ہے رسالے تو یہ اکاڈمی خریدتی ہی نہیں ۔ طرہ یہ کہ اکاڈمی اپنے اوپر تنقید برداشت نہیں کرتی ۔ اکاڈمی کا اپنا ایک مجلہ بھی ہے ۔ سہ ماہی ۔ مگر وہ کبھی چھ کبھی نو مہینے میں نکلتا ہے اور اس پر ایک مخصوص حلقے کا غلبہ ہے ۔ پھر بھلا بنگال میں اردو کا ماحول کیسے بنے ؟ اس کے برعکس بعض دیگر اکاڈمیوں کی کارکردگی بہتر ہے انہوں نے کبھی کبھی " انشاء " کو اپنا تعاون بھی دیا ۔ خاص طور پر اردو اکاڈمی دہلی نے شروع سے ہی انشاء کو فیضیاب ہونے کا موقع دیا ہے جس کے لئے ہم اس کے شکر گزار ہیں ۔

مرکزی حکومت نے بڑے ، درمیانے چھوٹے اور بہت چھوٹے پرچوں کے لئے تعداد اشاعت کی حد بندی قائم کررکھی ہے ۔ اس سے اردو والوں کو گھاٹا ہی گھاٹا ہے ۔ اردو کے ۹۸ فی صد اخبارات و رسائل سرکولیشن کے اعتبار سے چھوٹے اور بہت چھوٹے پرچوں کے زمرے میں آتے ہیں ۔ ادبی رسائل کی تو پھر کیا حیثیت ہوگی ۔ سرکاری اشتہارات کے لئے پرچوں کا مستقل نکلنا بھی ایک شرط ہے ۔ یہ ایک اور دور سر ہے ۔ یہ سمجھ لیجئے ایک طوائف اور ایک فقیر شاید اپنے اپنے پیشے سے خوش ہوسکتے ہیں لیکن یہ چھوٹے چھوٹے " جینوئن " پرچے اپنے پیشے سے کچھ حاصل نہیں کرپاتے ۔ (اس جملے کے لئے معاف فرمائیں) ۔

ایسے حالات میں کلکتہ سے انشاء کا سوواں شمارہ نکلا ہے ۔ اللہ کا شکر ہے کہ آج تک نہ ہم نے قارئین کو ٹھگا اور نہ مشتہرین اور ادیبوں کو چرکا دیا ۔ لیکن یہ " گھر پھونک تماشا دیکھ " کب تک چلتا رہے گا ۔ اب یہ ہمیں بھی سوچنا ہے اور آپ کو بھی ۔ یہ ایک لمحہ فکریہ ہے ۔ قارئین ، ادباء اور مشتہرین حضرات ! آپ کے تعاون کے بغیر یقیناً ہم اس منزل تک نہیں پہنچ سکتے تھے ۔ ہماری آپ سے مودبانہ گزارش ہے کہ آپ صحت مند ادب اور صحافت کو مالدارانہ نظروں سے دیکھیں ۔ اپنی پسند کے اچھے اخبار و رسائل اپنے لئے خریدیں ، اپنے دفتروں کے لئے خریدیں ، لائبریریوں ، کالجوں ، یونیورسٹیوں کے شعبوں کے لئے خریدیں ۔ انہیں اپنی مصنوعات و تجارت کے اشتہارات سے نوازیں ۔ قوم کو خوددار بنائیں اور ہمیں خود کفیل بننے دیں ۔ اس علم و ادب اور باخبری کو رحمت خداوندی تصور کیجئے ۔ ایک بامقصد فریضہ تصور کیجئے ۔ ورنہ ہمیں کہنے دیجئے کہ بہت جلد اردو قوم کے سو دن پورے ہوجائیں گے ۔ اس لئے اچھے اخباروں اور رسالوں کو زندہ رکھنا آپ کا اجتماعی فرض ہے ۔

انشاء کا یہ شمارہ پیشگی اعلان کے بغیر کمپیوٹر کے ذریعہ پیش کیا جارہا ہے ۔ صرف چند صفحات ہاتھ کی کتابت کے ہیں ۔ اگلا شمارہ " اسکنڈے نیویائی ادب نمبر " بھی کمپیوٹر سے کمپوز ہوا ہے ۔ اس کی ضخامت 450 تا 500 صفحات ہوگی ۔ یہ نمبر ایک تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوگا ۔ اس کے بعد انشاء کا عید نمبر اور پھر نیاز فتحپوری نمبر منظر عام پر آئے گا ۔ نیاز فتحپوری نمبر کی کتابت ہاتھ سے ہوئی ہے اور تقریباً تیار ہے ۔ بعد کے شمارے کمپیوٹر سے تیار کئے جائیں گے انشاء اللہ ۔

جن ادیبوں نے اس شمارے کے لئے کچھ تعاون پیش کیا ہم ان کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتے ہیں ۔

صدی شمارے کے لئے موصولہ چند پیغامات

FAX No. 0091 40-503188
EDITOR : 594180-446.
MANAGER . 594109
PRESS : 594114

The Siasat Daily

JAWAHARLAL NEHRU ROAD, HYDERABAD-1 (A.P)

TELEPHONES:
EDITOR : 44666
MANAGER · PRESS

Telex No : 425 - 6579 COME IN
P.O. Box : 197 Grams "SIASAT"

Founder : Late ABID ALI KHAN
Editor : ZAHID ALI KHAN

Ref.No :

Date
۴/اکتوبر 1994ء

محترمی۔ السلام علیک۔

رسالہ انشاء اور سیاست میں ایک اہم قدر مشترک یہ ہےکہ دیارِ غیر میں اردو والوں سے ایک تعلق اور رشتہ قائم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کا صرف ایک اردو اخبار اور ایک ہی رسالہ ایسا ہے جس میں بیرون ملک مقیم اہل قلم اور اہل فکر کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں، مغرب میں جو نئے ادبی و فکری نظریات اور نئے تجربے ہو رہے ہیں اس کا ذکر شائع ہوتا رہتا ہے۔

انشاء نے یوروپی ممالک میں اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات کو ترجیح دی ہے۔ انشاء ہی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یورپ اور برطانیہ میں ہمارے ادیبوں کا موضوع کیا ہے، وہ کس طرح اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔

اب ہندوستان میں شاعر، آج کل، انشاء اور سب رس صرف (4) اہم اردو رسائل ہیں۔ مشکلات کے باوجود پابندی سے اردو معیاری رسائل کی اشاعت، موجودہ حالات میں ایک معجزہ سے کم نہیں۔ کلکتہ میں بنگالی کے اثر کے باوجود چار پانچ اردو اخبارات اور ایک معیاری رسالہ انشاء، مغربی بنگال میں اردو کے وجود اور کلکتہ میں جو غالب کا پسندیدہ شہر بھی رہا ہے اردو کی روشنی، ہمارے تہذیبی ورثہ کا تحفظ ہے۔

میں انشاء کے 100 ویں شمارہ کو ہندوستان میں اردو کے لئے فال نیک سمجھتا ہوں۔

احقر
[signature]
زاہد علی خاں

MEMBER : -A B C—I N S

ڈاکٹر قمر رئیس، دہلی

برادرم ف۔ س۔ اعجاز صاحب مکرم

ماہنامہ انشاء کا سوواں شمارہ شائع ہو رہا ہے ۔ یہ بڑی رسمی تحسین ہوگی اگر میں کہوں کہ ایک ادبی مجلہ کے سو شمارے نکال کر آپ نے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے ۔ایک ادبی اور علمی پرچہ کا مدیر اس کے لئے معیاری مضامین جمع کرنے ، انہیں ترتیب دینے ، اداریہ لکھنے ، کتابت کے مرحلے سے گزرنے اور پھر اسے طبع کرانے تک ، جس طرح کی آزمائش ، اذیت اور کشمکش سے گزرتا ہے اس کا اندازہ صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں جو ادبی ماہناموں کی ترتیب کے جوکھم سے گزرے ہیں ۔اس جوکھم میں جو سب سے زیادہ دشوار اور اہانت آمیز کام مدیر کو انجام دینا پڑتا ہے وہ ہے ہر شمارہ کے لئے اشتہار حاصل کرنا ۔میں نے دیکھا ہے کہ بڑے خوددار اور باکمال ادیب بھی اشتہاروں کے لئے بھیک مانگنے کی ذلت سہتے ہیں ۔لیکن اس کے بغیر چارہ نہیں ۔

انشاء سے اور آپ سے ذاتی تعلق کی بناء پر میں جانتا ہوں کہ سو شماروں میں سے ہر شمارہ کی طباعت سے پہلے آپ ان دلدوز مراحل سے گزرتے ہیں ۔ پھر انشاء کے خاص نمبر آپ نے کیسی زبردست تیاری محنت اور شوق سے نکالے ہیں ۔ اور ان میں سے بعض نے کیسی بے مثل مقبولیت حاصل کی ہے ۔ہر معیاری پرچہ کی طرح انشاء کے قارئین اور قدر شناسوں کا ایک خاص حلقہ ہے اور وہ جانتے ہیں کہ ان سو شماروں میں آپ نے کتنے نئے اور نوجوان لکھنے والوں کو متعارف کرایا ہے ۔ان کی تربیت کی ہے ان کے حوصلے بڑھائے ہیں ۔ تاکہ بڑھتے ہوئے اندھیروں میں چراغوں کا یہ سلسلہ چلتا رہے ۔

" انشاء کو زیادہ دلچسپ ، بامعنی اور بہتر بنانے کی تگ و دو میں جہاں آپ نے کچھ ادیبوں کو بار بار لکھ کر تاکید کرکے جاندار تخلیقات حاصل کی ہیں وہاں کچھ اچھے دوستوں کی کمزور تخلیقات مسترد کرکے ان کو خفا بھی کیا ہے ۔اس کے لئے آپ نے کتنا وقت دیا ۔ کتنی انرجی صرف کی اور کتنا ایثار کیا ہے افسوس کہ عام قارئین اس کا حساب نہیں رکھتے ۔ان کی خفگی سے آپ کے دل پر کتنا بوجھ رہا ہوگا ۔ اسے میں محسوس کر سکتا ہوں ،ہم عصر ادب اور تہذیب کے کتنے بحث طلب مسائل پر آپ نے مضامین شائع کئے ہیں ۔ان کے ردعمل میں آنے والے معلوماتی اور نکتہ آفریں مکتوب شائع کئے ہیں اور اس سے پچھلے دہے میں اردو شعر و ادب کا منظر نامہ کتنا روشن ہوا ہے ؟ کتنی گرہیں کھلی ہیں ؟

یہ سب حقائق ایسے ہیں جن کا جائزہ لینے کے لئے پورا ایک دفتر درکار ہے حیرت اس پر ہے سو شماروں کی آزمائش سے گزر کر بھی آپ کا جنون برقرار ہے ۔ تھکن اور اضمحلال کے آثار نظر نہیں آتے ۔اشتہاروں سے پتہ چلتا ہے کہ کئی ضخیم خاص نمبر تکمیل کے آخری مرحلہ میں ہیں ۔آپ کے جنون و شوق کا یہ سفر کہاں ختم ہوگا ؟ میں اتنا ہی کہوں گا ۔

ہر لحظہ نیا طور ، نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

آپکا اپنا
قمر رئیس

نیاز قومی
مقبول لاری منزل
سٹی اسٹیشن روڈ لکھنو

یہ تاثر صداقت پر مبنی ہے کہ کلکتہ کی ادبی صحافت میں یہ پہلا موقع ہے جب ایک اردو رسالہ اپنی بھرپور علمی و ادبی خدمات کے سبب اتنے دن جی پایا ۔اس میں شک نہیں کہ ایک منزل تک انشاء کو پہونچانے میں آپ کی مخلص و مستور کاوشوں کا بڑا دخل ہے کہ ادبی معیار کو برقرار رکھتے ہوئے آپ نے یہ صد سنگ میل کا سفر طے کیا ۔خدا آپ کے عزم و حوصلے کو برقرار رکھے ۔

وسیم مینائی شاہجہاں پوری
تارین جلال نگر ۔ ۲۴۲۰۰۱
شاہجہاں پور (یو ۔ پی)

یہ جان کر بیحد مسرت ہوئی کہ ماہنامہ "انشاء" اپنی ڈائمنڈ جوبلی منانے جارہا ہے اور اس موقع پر آپ "انشاء کی جانب سے ایک خصوصی شمارہ شائع فرمارہے ہیں ۔جس کا عنوان انشاء کا "سوواں شمارہ " رکھا گیا ہے ۔اس میں کوئی شک نہیں کہ "انشاء نے اتنی کم مدت میں آپ کی ادارت میں جو کارنامے انجام دئے ہیں وہ یقیناً قابل ستائش ہیں ۔جس کی مثال " **احمد سعید ملیح آبادی نمبر** " **ادیبوں کی حیات معاشقہ نمبر** " **عالمی اردو افسانے نمبر** " اور **ڈاکٹر قمر رئیس نمبر** ہیں ۔مغربی بنگال سے شائع ہونے والے جریدوں میں " انشاء " نے جو شہرت اور مقبولیت پائی ہے وہ شاید کسی دوسرے جریدہ کے حصہ میں نہیں آئی ۔ "انشاء " کو عالمی سطح پر روشناس کرانے میں آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا ہر کسی کو اعتراف کرنا ہی پڑے گا ۔آپ نے جس محنت ،

لگن اور ایثار کے جذبے کے تحت "انشاء" کو جاری رکھا ہے اس کے لئے آپ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر (پاکستان)

فورٹ ولیم کالج اور غالب کے قیام کی وجہ سے کلکتہ کا اردو ادب کی تاریخ میں تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ شاید یہ ذکر دہلی اور لکھنؤ جیسا رنگین تو نہ ہو لیکن میر امن اور "باغ و بہار" اور ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی بناء پر جدید اور سلیس اردو نثر کے آغاز، نشو و نما اور ارتقاء میں کلکتہ کا کردار اساسی بھی ہے اور عہد ساز بھی! اور اسی کلکتہ سے جناب ف۔ س۔ اعجاز نے "انشاء" کا اجراء کیا۔

بھارت کی عمومی کلچرل فضاء میں، جہاں اردو قلم ہندی قلم کے طور پر چلائی جاتی ہے، خالص ادبی اردو پرچہ کا اجراء یقیناً گھاٹے کا سودا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایسے تمام ادبی پرچے ایک طرح کا قلمی جہاد کر رہے ہیں کہ اردو زبان کی ترقی اور تخلیقی جوہر کی نمو کے مشکل کام میں مصروف ہیں۔

اعجاز صاحب مدیرانہ ناخدائی میں انشاء کے سو پرچے چھپ چکے ہیں اور اب "انہیں صدی کرہ" منانے کا حق حاصل ہے۔ کرکٹر سنچری بناتا ہے تو انعامات حاصل کرتا ہے۔ ادبی پرچے سنچری مکمل کرے ہیں تو بھی خواہ مبارکباد چاہتے ہیں۔

تم سلامت رہو ہزار برس

عشرت بیتاب
زیب کدہ
جہانگیری محلہ۔ آسنول۔ ۲

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ انشاء نے ۱۰۰ ماہ پورے کرلئے۔ کلکتہ جیسے جلوسوں اور احتجاجوں کے شہر میں کسی ادبی ماہنامہ کا حسن و خوبی ۸ سال سے زائد عرصے تک چھپتے رہنا اپنی مثال آپ ہے ورنہ یہاں کے بیشتر رسالے ۵ / ۶ شمارے تک ہی چل پاتے ہیں۔ میرے خیال سے بنگال انقلابی شہر کا یہ واحد رسالہ ہے جس نے اپنی شاندار روایت کے ساتھ عام شماروں کے علاوہ کئی ایک خصوصی نمبر بھی پیش کئے ہیں جن میں احمد سعید ملیح آبادی نمبر "حیات معاشقہ نمبر" اور "عالمی اردو افسانہ نمبر" اپنی غیر معمولی مقبولیت کی بناء پر اردو ادب خصوصاً بنگال کے ادب میں ہمیشہ قابل ذکر رہیں گے۔ آپ کی مدیرانہ بصیرت سے مجھے پوری امید ہے کہ سابقہ خوبصورت نمبروں کی طرح یہ "ڈائمنڈ جوبلی شمارہ" بھی اپنی مثال آپ ہوگا۔

ڈاکٹر راہی قریشی
۸۱۔ودیانگر۔ گلبرگہ۔ ۵۸۵۱۰۳

اردو دور حاضر میں عناد اعدا سے زیادہ تغافل احباب کی گلہ گزار ہے۔ اردو داں آبادی کے متمول اور متوسط طبقات کے لئے نسل نو کی اردو تعلیم موجب ننگ و عار ہوتی جارہی ہے۔ ظاہر کہ اسیر ستم ہائے روزگار طبقات غرباہی اردو کے مستقبل تابناک کے ذمہ دار نہیں ہوسکتے۔ اردو داں اعلیٰ و متوسط طبقات کی اردو بیزاری اور دانستہ و مجرمانہ تغافل کے بعد ہم سب کو مزار داغ سے اس صدائے حسرتناک کے بلند ہونے کا منتظر رہنا چاہیے۔

"اردو تھا" جس کا نام، ہمیں جانتے تھے داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی "تھی"

بہ الفاظ دیگر
"سعدی از دست خویشتن فریاد!"

سید احمد سحر
خلیل غربی
شاہجہاں پور۔ ۲۴۲۰۰۱

اس دور پر آشوب میں کسی رسالے کا اس تواتر سے جاری رہنا کہ اس کی سوویں اشاعت نہایت آب و تاب سے ہونے کا مبارک موقع آئے، ضمانت ہے اس جریدے کی مقبولیت اور اس کی مجلس ادارت خصوصاً مدیر خاص کی جانفشانی، لگن، جذبہ خدمت اردو اور اولوالعزمی کی۔

"انشاء" یونہی کامیابی اور کامرانی کے منازل طے کرتا رہے گا۔ انشاء اللہ اور اپنے قارئین کو ذہنی آسودگی کی بخشتا رہے گا۔ مبارکباد۔

رام پرکاش کپور
صدر انجمن ترقی، اردو ہند (بھلائی۔ درگ برانچ)
۷/۱۸۔ ایم۔ آئی۔ جی۔ پدم نابھ پور
درگ ۴۹۱۰۰۱ (مدھیہ پردیش)

انشاء کے سوویں شمارے کی اشاعت پر ہماری دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ اردو کی اشاعت کو جن پروانوں نے مشن کے طور پر اپنایا ہے ان میں انشاء بھی شامل ہے۔ آپ کا رسالہ نہ صرف ہندوستان، پاکستان بلکہ ساری دنیا میں پھیلی

ہوئی اردو کی بیرونی بستیوں میں بھی ایک معتبر نام ہے ۔ آپ نے انشاء کے ذریعے جو شمع جلا رکھی ہے ہماری دعا ہے کہ اس کا اجالا ہمیشہ ہمیشہ اردو ادب و صحافت کے اوراق کو منور کرتا رہے ۔

ہمت رائے شرما
(آرٹ ڈائرکٹر و ادیب)
۲ ۔ وشوا شانتی اپارٹمنٹس
مقابل سیون بنگلاز ۔ گارڈن گیٹ ۔ اندھیری (ویسٹ)
ورسووا ۔ بمبئی ۔ ۴۰۰۰۶۱

آپ ماہ دسمبر کے تیسرے ہفتے میں انشاء کا سوواں شمارہ شائع کر رہے ہیں ۔ پروردگار آپ کو کامیابی دے ۔ خدا کرے انشاء کا "ہزارواں" شمارہ بھی ایک دن شان و شوکت کے ساتھ شائع ہو اور اس طرح اشاعت کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے ۔ آمین ۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں ۔ محترم جناب بھائی صاحب (کدار شرما صاحب) کی جانب سے بھی مبارکباد قبول فرمائیں ۔ کل ہی ٹورانٹو سے انکا، ٹیلیفون آیا تھا ۔ وہ آجکل کنیڈا اور امریکہ گئے ہوئے ہیں ۔ ویسے تو انشاء کا ہر شمارہ اپنی مثال آپ ہوتا ہے ۔ لیکن میرا خیال ہے یہ سوواں شمارہ نہایت شاندار اور لاجواب ہوگا ۔ ایک بار پھر مبارکباد ۔

قیصر تمکین ۔ لندن (برطانیہ)

انشاء کے تازہ ترین شمارے سے آپ کے "صدی نمبر" یعنی سوویں شمارے کے اشاعت کی خوشخبری ملی ۔ اللہ مبارک فرمائے ۔ جس محنت، لگن اور جاں سوزی کے ساتھ آپ یہ کوہ کنی کر رہے ہیں اس پر آپ کا معترف نہ ہونا "ذوق حسن و بینائی" سے محرومی کا مظاہرہ ہوگا ۔

مقصود الٰہی شیخ
مدیر ہفت روزہ "راوی" ۔ بریڈفورڈ (برطانیہ)

"انشاء" کے سوویں شمارے کے لئے آپ نے "پیغام" بھیجنے کو کہا ہے ۔ بھائی! پیغام بڑے آدمی دیتے ہیں یہاں تو برگ سبز تحفہ درویش والا معاملہ ہے ۔ سام کس

قائل ہیں ، ہمیں تو آپ ہی نے "گوشہ" چھاپ کر گوشے سے نکالا ہے ۔ ایک بات ضرور کہوں گا آپ "انشاء" کے ذریعے ادب کا، محبت کا، انسان دوستی کا، اہل قلم کے ساتھ زندہ دوستی کا (اس مردہ پرست دنیا میں) اور سب سے اوپر اردو کا جو پیغام پھیلا رہے ہیں ایک روز اس کا اثر ہم ادھر بھی دیکھیں گے ۔

آپ بڑی لگن سے ، وقت نظر سے اور مستقبل پر نگاہ رکھتے ہوئے کام کر رہے ہیں ۔ عالمی افسانہ نمبر چھاپا، حقیقت میں تاریخ بنا دی کی ۔ اب سکنڈے نیویا کے لئے "گولڈن شمارہ" ترتیب دے رہے ہیں ، کہنا چاہیے لنگر لنگوٹ کس کر سمندر میں جا اترے ہیں ۔ ساتھ ساتھ سوویں شمارے کی تیاریاں ہیں مجھے یقین ہے آپ کے یہ دونوں کارنامے بھی اہمیت کی چوٹی سر کرکے رہیں گے ۔ کیا اللہ تعالیٰ نے ایک کے بعد ایک سرخاب کا پر آپ کے مقدر میں لکھ دیا ہے ؟ ماشاء اللہ ۔

پھر ان مشقتوں کے ساتھ ساتھ مشق سخن بھی جاری ہے ۔ جب دیکھو آپ کے نوک قلم سے جو شعر نکلتا ہے اس کی نوک پلک ہی درست نہیں ہوتی اس کی بلند خیالی پر دل سے آفرین نکلتی ہے ۔ یہ کون ساجن آپ کے اندر سمایا ہے ؟

میری خوشگوار حیرتوں میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے کہ کلکتے کا "انشاء" انگلستان ، سکنڈے نیویا اور امریکہ کے باثر اردو حلقوں میں کثرت سے پڑھا جاتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوا کہ اس ناچیز کی درخواست پر آپ نے اردو کی بقاء کے سلسلے میں جو وقیع و بسیط اداریہ لکھا اور پھر ہندوستان کے اونچے دانشوروں کی آراء ، منگوا کر شائع کیں یہاں اس کی بازگشت نے ہم دیوانوں کو از سر نو تحریک کے آغاز پر اکسایا ہے ۔

"انشاء" کے سوویں شمارے کی بات ------

دل سے دعا نکلتی ہے کہ (انشاء اور) تم جیئو ہزار برس ، ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار ۔ یہاں ۱۰۰ ویں سالگرہ پر خوب دھوم دھام ہوتی ہے لارڈ اور لیڈی مسز/مس بنفس نفیس آکر مبارکباد دیتے ہیں تو ملکہ معظمہ (الزبتھ ثانی) کی طرف سے ، بکنگھم محل سے براہ راست کارڈ بھی پہنچتا ہے ۔ "انشاء" کا سوواں شمارہ ، کسی بھی سوویں سالگرہ سے کم نہیں ۔ سدا سہاگن اردو پر بھارت یا یہاں پیغمبری وقت ہی مگر اس کے بہی خواہ دنیا کے کونے کونے میں ہیں اس موقعہ پر آئے مل کر نعرہ لگائیں :

اپنے بچوں سے اردو بولئے ، اردو لکھوائیے اور (ان کو) اردو پڑھائیے ۔

مجھے امید ہے بہ چہار سو یہ نعرہ گونجے گا اور ہر سمت سے آواز ملائی جائے گی کہ "انشاء" کا دائرہ اثر وسیع ہے اور "انشاء" کا سوواں شمارہ اپنی افادیت کی بناء پر عام شماروں کے مقابلے میں بہت زیادہ بڑے حلقے میں نفوذ کرے گا ۔

Buddhadeb Bhattacharjee
Minister
INFORMATION & CULTURAL AFFAIRS DEPARTMENT
GOVERNMENT OF WEST BENGAL
WRITERS' BUILDINGS
Phone 25-2345

No. 516/M/94

Date : 17th November, 1994.

I am glad to learn that INSHA PUBLICATIONS is going to bring out it's 100th prestigious issue in the 3rd week of December, 1994.

I convey my greetings to the members of the organisation and wish the programme all success.

Bhattacharjee
(Buddhadeb Bhattacharjee)

Editor,
Mahnama Insha.

Professor Indra Nath Choudhuri
Secretary

साहित्य अकादेमी
रवीन्द्र भवन, 35, फ़ीरोज़शाह मार्ग, नई दिल्ली-110 001
तार साहित्यकार दूरभाष 386621, 386623, 386626-29
टेलेक्स 031-65445 सैंड इन फ़ैक्स 091-11-382428

Sahitya Akademi
(National Academy of Letters)
Rabindra Bhavan, 35, Ferozeshah Road, New Delhi-110 001
Gram Sahityakar Phone 386621, 386623, 386626-29
Telex 031-65445 SAND IN Fax 091-11-382428

SA.16/14/ 29556 28 November 1994
29

Dear Sri Ejaz,

I am happy to learn that "Mahnama Insha" is going to bring out it's prestigious 100th issue on 21 December 1994. I am also happy to note that "Insha" is the first Urdu periodical of Calcutta to deliver 100 issues thus working for the cause of Urdu literature. I send my good wishes on this occasion.

With kind regards,

Yours sincerely,

(Indra Nath Choudhuri)

Sri F.S.Ejaz,
"Mahnama Insha",
Insha Publications,
6-A, Kanai Seal Street,
Calcutta 700 073.

KALIMUDDIN SHAMS
MINISTER IN CHARGE
DEPARTMENT OF AGRICULTURAL MARKETING
GOVERNMENT OF WEST BENGAL
WRITERS BUILDINGS
CALCUTTA 700 001

D.O. NO. HA...

Dated The 199

Janab Fae.Shin.Ajaz
Insha Publishers
6A,Kanai Seal Street
Calcutta-73

Janab Ajaz Sahab,

Assalamo Alaikum

I am glad to know that Insha has completed its hundred volumes and you are going to publish a special number on the occasion of publication centenary. In this connection, I would like to say that so far as Calcutta is concerned, this city is very much dry for a Urdu Magazine. Many stallwarts and the renowned journalists failed to continue any of the weekly or monthly Magazines. But credit goes to you that you have not only accepted the challenge of the circumstances but you have given a ray of hope to those who are still disappointed. I am sure that your untiring effort in connection with uplift of Insha has shown a destination to many who are yet to come in this field.

I pray to God that this glorious literary and helpful magazine of our city will shine as bright as the Sun of the Universe.

Thanking you,

(KALIMUDDIN SHAMS)

WEST BENGAL URDU ACADEMY
17, Sundari Mohan Avenue, Calcutta-700 014
Phone ; 29-8450

مغربی بنگال اردو اکاڈمی
۱۷، سندری موہن ایونیو، کلکتہ ۱۴

میمو نمبر - اردو / اکاڈمی / X-6/90(Part-II)/414 تاریخ ۹ / دسمبر ۹۲ء

مکرمی تسلیم !

نوازش نامہ موصول ہوا - یاد آوری کا شکریہ !

ہم ماہنامہ " انشاء " کی گراں قدر خدمات کے معترف ہیں - بڑی خوشی کی بات ہے کہ " انشا " کا خصوصی نمبر جلد ہی منظر عام پر آرہا ہے جو بلا حسب توقع اپنی شاندار روایات کو برقرار رکھتے ہوئے منفرد اہمیت وافادیت کا حامل ہوگا -

مغربی بنگال اردو اکاڈمی گذشتہ چند برسوں سے قلیل بجٹ کی بنا پر مالی دشواریوں سے دو چار ہے جیسا کہ آپ نے خود ہی اعتراف کیا ہے کہ اکاڈمی کا بجٹ مختصر ہے ہمارے لئے فی الوقت آپ کی دونوں گذارشات کی عمل آوری ممکن نہیں ہے - چیرمین صاحب معذرت خواہ ہیں -

آپکے خصوصی نمبر کے لئے ہماری نیک خواہشات آپکے ساتھ ہیں -

مخلص

سکریٹری

بخدمت جناب ف - س - اعجاز
مدیر
ماہنامہ " انشا "
25 بی ذکریا اسٹریٹ ، کلکتہ - 73

Gulzar.

محترم اعجاز صاحب!

آپ بھی گویا سکندر سے کم نہیں! اور ہمیں بڑا ناز ہے آپ پر!
انشاء کے سوویں شمارے پر مبارکباد قبول فرمائیے — یہ
سنچری اردو ادب میں بڑے اقدام کے ساتھ دیکھی جائے گی۔
خاص نمبر آپ ہمیشہ بہت خوبصورت نکالتے ہیں۔ عالمی اردو
افسانہ نمبر ابھی تک ذہن میں تازہ ہے۔ مجھے یقین ہے، یہ
سنچری نمبر بھی باکمال ہوگا — میری دعائیں اور
نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔

گلزار
7.8.94

91-A COZIHOM SOCIETY, 251 PALI HILL, BANDRA BOMBAY-400 050 TELE: OFF 531957 RESI 546351 540365
FAX : 604 0477

انشاء کی صدی

از: احمد سعید ملیح آبادی

مدیر روزنامہ "آزاد ہند"

۲۵- ایڈن اسپتال روڈ- کلکتہ- ۷۰۰۰۷۳

کلکتہ کے ماہ نامہ " انشاء " کا یہ ایک سوواں شمارہ ہے اور اس پر " انشاء " نے اپنی " صدی " پوری کرلی ہے! - اردو کے کسی ادبی رسالے کے لئے اور وہ بھی کلکتہ جیسی جگہ میں، ایک سو مہینے زندہ رہنا بڑی بات ہے بلکہ معجزہ ہے - کلکتہ میں ہمیشہ ہی ادبی و سیاسی اردو پرچے نکلتے اور دم توڑتے رہے ، بعض نے بہت ہی مختصر عمر پائی، چار دن بہار دکھا کر مرجھاگئے اور بعض نے کچھ لمبی عمریں پائیں - " انشاء " بھی لمبی عمر پانے والوں میں ہے جس کے لئے زندگی کے سو مہینے ، سو سال سے کم نہیں - اور اس بیچ بھاری بھاری خصوصی نمبر بھی نکالنا اور انٹرنیشنل ادب سے اردو ادب کا رشتہ جوڑنا ، یہ بھی ایک جراءت مندانہ عمل اور سخت جان ہونے کا ثبوت ہے۔

" انشاء " کے مدیر ف- س- اعجاز صاحب کو اپنے رسالے کے خصوصی نمبر نکالنے کا بہت شوق ہے اور جیسا شوق ہے ویسا ہی ملکہ بھی حاصل ہے - ایک سے ایک بڑھیا اور یادگاری نمبر نکال کر دھوم مچادی - اس میں ان کی جس قدر محنت، مشقت اور ریاضت و صلاحیت صرف ہوتی ہے اسے کچھ ان ہی کا دل جانتا ہوگا - طرح طرح کے موضوعات پر ضخیم نمبر نکالنے کا جوکھم مول لیتے ہیں اور سدا کامیاب رہتے ہیں - اب تک کوئی آدھے درجے سے زائد نمبر نکال کر اپنی دھاک جماچکے ہیں - کوئی سات برس پہلے انہیں اچانک خیال آگیا کہ " میرا نمبر " نکالیں گے - ہوا یہ کہ " ایوان غالب " (نئی دہلی) نے صحافت پر مجھے غالب ایوارڈ دیا، یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی - مجھ سے پہلے کتنے ہی لائق و فائق صحافیوں کو غالب ایوارڈ مل چکا تھا - خاص بات بس اتنی تھی کہ مغربی بنگال میں پہلی مرتبہ کسی کو یہ ایوارڈ ملا تھا - اہل بنگال کو ہمیشہ شکایت رہتی ہے کہ انہیں پورب کے ساکن جان کر نظرانداز کیا جاتا ہے - " آزاد ہند " کے ایڈیٹر کو " غالب ایوارڈ " ملا تو لوگوں کو سچ مچ بہت خوشی ہوئی اور سب سے زیادہ خوش ف- س- اعجاز ہوئے - اسی خوشی میں مغربی بنگال اسمبلی کے اسپیکر جناب ہاشم عبدالحلیم اور ڈپٹی اسپیکر جناب کلیم الدین شمس (اب وزیر حکومت مغربی بنگال) نے گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں ایک شاندار استقبالیہ جلسہ کرڈالا، اس کے بعد مدیر " انشاء " کو اور زیادہ جوش آگیا اور " احمد سعید ملیح آبادی نمبر " نکالنے پر کمر کس لی - میں نے بہت سمجھایا کہ گھاٹے کا سودا ہے ، سارا پرچہ فروخت ہوئے بغیر پڑا رہ جائے گا، نقصان ہوگا مگر نہیں مانے اور کافی موٹا سا نمبر نکال کر رہے - نمبر کے اجراء کی بھی تقریب دھوم دھام سے کرڈالی - (ایسی ادبی تقریبیں کرنے کا بھی ف- س- اعجاز کو شوق اور سلیقہ ہے - کسی نہ کسی بہانے اجتماعات کرتے رہتے ہیں) میرا نمبر نکلا اور چار دن میں ہزاروں کاپیاں اڑن چھو ہوگئیں - وہ بھی حیران اور میں بھی حیران کہ لوگوں کو اس نمبر میں ایسی کیا خوبی دکھائی دی کہ ہاتھوں ہاتھ نکل گیا اور لوٹ سی مچ گئی ؟ دراصل یہ ف- س- اعجاز کی محنت اور ذہانت کا صلہ تھا جس کی عوام نے دل کھول کر داد دی - اس کے بعد ان کی ہمت بندھ گئی اور " خاص الخاص " نمبر پر نمبر نکالنے کی عادت پڑ گئی - عادت کیا، لت کہیں اسے - دن رات اپنے خاص نمبروں کی تیاری میں غرق رہنے لگے - " انشاء " کے عام نمبروں کے ساتھ خاص نمبروں کا بوجھ بھی ہر وقت اپنے سر پر ڈھوئے پھرنے لگے - نمبر پر نمبر نکالے گئے - قمر رئیس نمبر نکالا - ادیبوں کی حیات معاشقہ نمبر اور " عالمی اردو افسانے نمبر " نکالے - بابری مسجد گرائی گئی تو " آزاد ہند " کے ۴۲ اداریوں کو ایڈٹ اور یکجا کرکے " بابری مسجد نمبر " نکال دیا (بعد میں احمد آباد کے ایک ذی مرتبت اور صاحب فہم شاعر جناب رحمت امروہوی نے انہیں ملی جذبے سے سرشار ہوکر گجراتی زبان میں منتقل کیا اور کتابی صورت میں پیش کیا) - اور یہ فہرست بڑھتی چلی گئی، ابھی رکی نہیں ہے اور بھی نمبر زیر ترتیب ہیں - کہتے ہیں کہ اللہ کسی کی محنت رائیگاں نہیں کرتا - اخلاص سے کی گئی محنت کا پھل بھی میٹھا ملتا ہے - ف- س- اعجاز کی محنت کو اللہ نے قبول عام بخشا، ان کا پرچہ " انشاء " چل

نکلا اور خوب چلا۔ چلتے چلتے ہندوستان سے باہر پڑوسی ملکوں تک پہنچا پھر عرب ممالک، یورپ، امریکہ اور کینڈا تک جا پہنچا۔ ف۔ س۔ اعجاز نے "انشاء" کو اردو کا انٹرنیشنل پرچہ بنادیا۔ ہمیں اس پر فخر ہے کہ ایک آدمی کی سچی لگن اور ادب و زبان سے اس درجہ گہرا لگاؤ اسے کتنی بلندی تک لے جاسکتا ہے۔ ف۔ س۔ اعجاز ایک اچھی منفرد فکر کے شگفتہ شاعر ہیں۔ نثر بھی ویسی ہی صاف ستھری اور دل نشیں لکھتے ہیں اور ادارت میں بھی اپنی مہارت ثابت کردی ہے۔ "انشاء" کے ایک سو شمارے اور خصوصی نمبروں کا انبار اس بات کا ثبوت ہیں۔

ف۔ س۔ اعجاز اور ان کے پرچے "انشاء" کی کامیابی کے پیچھے جو دشواریاں اور پریشانیاں ہیں ان کا حال وہی خوب جانتے ہیں جو اس پرخار وادی میں ان کے ہم سفر ہیں۔ اردو اخباروں، رسالوں اور کتابوں کی تصنیف و تالیف اور اشاعت کا مشغلہ اور دھندا سخت اذیت ناک، دل جلاؤ اور گھاٹے کا ہے۔ اس کاروبار میں معاشی مشکلات اور فکریں ہمیشہ گھیرے رہتی ہیں۔ قارئین کی تعداد تو ایسی کچھ کم نہیں ہوتی مگر خریداروں کی تعداد بیشک بہت کم ہوتی ہے جو وقت کے ساتھ دن بہ دن گھٹتی جاتی ہے۔ اعزازی قاری بہت اور خریدار قاری بہت تھوڑے۔ اردو صحافت و اشاعت کا یہ المیہ اور مقدر بن گیا ہے۔ شوق کے سہارے کوئی کب تک اردو پرچہ نکالتا جائے، وہ بھی ادبی پرچہ؟

اردو صحافت، طباعت و اشاعت نے ایک بہت لمبا اور کٹھن سفر طے کیا ہے۔ طباعت کی دشواریوں پر تو قابو پالیا گیا ہے۔ اردو پریس، پتھر کے عہد سے یعنی لیتھو کی چھپائی کے دور سے نکل آیا ہے اور آفسٹ پرنٹنگ ٹکنالوجی کے اعتبار سے دوسری زبانوں کے ترقی یافتہ پریس کے برابر آگیا ہے کتابت کا بھی جھنجٹ ختم ہو چلا ہے، نستعلیق کمپیوٹر ٹایپ سیٹنگ، اردو پریس میں رواج پارہی ہے اور وہ وقت دور نہیں جب یہ سسٹم عام ہو جائے گا اس میں وقت اور خرچ کم لگتا ہے۔ کتابت میں مشکل سے ہی خط کی یکسانیت برقرار رہتی ہے، کمپیوٹر فوٹو ٹایپ سیٹنگ میں تمام حروف، الفاظ اور سطروں میں یکسانیت ہوتی ہے۔ آج ملک کے کئی روزنامے اور رسالے کمپیوٹر فوٹو ٹایپ سٹنگ پر نکل رہے ہیں۔ جالندھر، دہلی، بمبئی، حیدرآباد اور بنگلور میں اس کا چلن ہو گیا ہے، کلکتہ ابھی پیچھے ہے۔ یہاں کے سب ہی اردو اخبار اور رسالے ابھی تک کتابت پر نکل رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب کاتب نہیں ملتے تھے اور کمپیوٹر کمپوزنگ ابھی ہندوستان میں آئی نہیں تھی۔ کاتبوں کی کمی دور کرنے میں ریاستوں کی اردو اکیڈیمیوں نے اہم تعمیری رول ادا کیا۔ شہروں شہروں کتابت ٹریننگ سنٹر کھولے گئے جنہیں حکومت ہند کے "ترقی اردو بورڈ" کا تعاون بھی حاصل رہا۔ ان کتابت ٹریننگ سنٹروں سے بہت اچھے اور استاد قسم کے کاتب تو نہیں نکل سکے مگر کام چلاؤ ملنے لگے۔ جہاں کہیں خطاطی کی تربیت و مشق کا انتظام تھا وہاں سے استادوں کے کچھ اچھے شاگرد بھی تیار ہو سکے۔ مغربی بنگال میں خطاطی کے مقابلے کے لئے پانچ ہزار روپے کا "گورنر ایوارڈ" رکھا گیا جو اردو اکیڈیمی کی معرفت ہر سال دیا جاتا ہے۔

کتابت ٹریننگ سنٹروں میں اب کمپیوٹر ٹایپ سیٹنگ کی ٹریننگ کا بھی جابجا بندوبست کیا جارہا ہے تاکہ جدید پرنٹنگ کے تقاضوں اور ضرورتوں کو اردو پریس پورا کر سکے۔ اردو ٹایپ رائٹر ٹریننگ کا بھی کئی سنٹروں میں بندوبست ہے۔ شروع میں تو اس کا کوئی خاص مصرف نظر نہیں آتا تھا کیونکہ دفتروں میں اردو ٹایپنگ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کہیں کہیں اکا دکا اس کی ضرورت نکالی گئی۔ لیکن اب اردو ٹایپنگ کام آئے گی۔ کمپیوٹر پر ٹایپ سیٹنگ کے لئے اردو ٹایپسٹ چاہیے۔ یو این آئی کی اردو ٹیلی پرنٹر نیوز سروس بھی جون ۱۹۹۲ء سے شروع ہو گئی ہے یہ سروس ابھی اور پھیلے گی تو اس کے علاقائی سنٹروں میں بھی اردو ٹایپسٹوں کی کھپت ہوگی۔ **لیکن اس وقت اردو پریس کا سب سے بڑا مسئلہ صحافیوں کی کمی ہے۔ اردو اخباروں میں کام کرنے والے صحافیوں کی تعداد دن بہ دن گھٹتی جارہی ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک وجہ تو تعلیم کی کمی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں جس طرح کی تعلیم ہو رہی ہے اس سے طلبہ کو کسی بھی زبان پر حتیٰ کہ اپنی مادری زبان پر بھی عبور حاصل نہیں ہوتا اور اردو کی پڑھائی تو ناپید ہو رہی ہے۔ دوسری وجہ اردو پریس کی کم مائیگی ہے۔** اس کے پاس سرمائے اور آمدنی کی کمی ہے روزناموں کی آمدنی کا دارومدار اشتہارات پر ہوتا ہے صرف اخبار کی اشاعت اسے خود کفیل نہیں بنا سکتی کیونکہ نیوز پرنٹ کی حد سے سوا گرانی اور دیگر بڑھتے ہوئے اخراجات کے سبب اخبار کی قیمت سے اس کی پیداواری لاگت پوری نہیں ہوتی۔ اخبار کی ہر کاپی پر ۳۳ سے ۴۰ فیصدی تک ہاکر یا ایجنٹ کا کمیشن بھی نکل جاتا ہے۔ دوسری زبانوں کے

اخباروں کے پاس اشتہاروں کی ایسی بہتات ہوتی ہے کہ صفحات بڑھاتے چلے جاتے ہیں اور تب بھی اشتہارات ابلے پڑتے ہیں۔ اتنی ضخامت کے باوجود دوسری زبانوں کے اخبارات کم سے کم قیمت میں دستیاب ہوتے ہیں۔ انہیں اشتہاروں سے اس قدر زیادہ آمدنی ہو جاتی ہے کہ اخبار اگر مفت دیں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس کے مقابلے میں بیچارے اردو اخباروں کا دامن زیادہ تر اشتہاروں سے خالی ہی رہتا ہے۔ چند چھوٹے موٹے اشتہار اگر کبھی نظر بھی آئیں تو ان کے ریٹ کم ہوتے ہیں۔ اچھے کمرشیل اشتہار بھولے چوکے کبھی مل گئے تو اردو اخبار کی عید ہو جاتی ہے۔ صرف رمضان شریف میں "عید بازار" کے اشتہاروں سے اردو اخباروں کے صفحات بھرے نظر آتے ہیں مگر یہ اشتہار زیادہ تر دکانداروں کے ہوتے ہیں اور کم شرح پر چھاپے جاتے ہیں۔ اس طرح صورت حال یہ بنتی ہے کہ اردو اخباروں کے ذرائع آمدنی مسدود، اسٹاف کو اچھی تنخواہ دینے سے معذور اس لئے اسٹاف محدود، جو پھنس گیا اور رہ پڑا تو اسی گدڑی میں زندگی گزار لے گیا۔ **اچھی استعداد اور لیاقت والے نوجوان اردو پریس کی طرف نہیں آرہے ہیں کیونکہ انہیں اپنا مستقبل روشن اور محفوظ نظر نہیں آتا۔ اردو صحافت کا معیار دن پر دن گرتا جارہا ہے۔** کم مائیگی کا یہ عالم ہے کہ تھوڑے ہی اردو اخباروں کے پاس نیوز سروس ہوتی ہے ورنہ زیادہ تر اخبار، ریڈیو اور ٹی وی پر خبریں سن کر کالم بھر لیتے ہیں۔ اس سے خبریں ادھوری اور ناقص حالت میں قارئین تک پہنچتی ہیں۔ بہار میں جہاں اردو دوسری سرکاری زبان تسلیم کی گئی ہے، اردو پریس کی بدحالی کا یہ عالم ہے کہ کسی ایک اردو اخبار کے پاس بھی نیوز سروس نہیں، سب اپنا کام ریڈیو اور ٹی وی سے چلاتے ہیں۔ بعض اور شہروں میں بھی ایسی ہی حالت ہے۔

اردو پریس کو اس پستی سے اٹھانا ضروری ہے کیونکہ اردو پریس محض صحافت اور تجارت نہیں ہے بلکہ ایک اقلیت کی نمائندگی بھی ہے۔ اردو پریس جس طبقے سے تعلق رکھتا ہے اس کا ترجمان بھی ہے اور وکیل بھی۔ اس کے حقوق کی لڑائی لڑتا ہے اور **قیادت** کے فقدان میں رائے عامہ بنانے میں **رہنمائی** کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ کسی بھی قوم، سماج اور طبقے کے لئے پریس ایک کارگر ہتھیار بھی ہے اور ڈھال بھی۔ یہ جتنا طاقتور ہوگا اتنا ہی کارآمد ثابت ہوگا۔ جو قوم، سماج اور طبقہ اپنی اہمیت قائم رکھنا چاہتا ہے اسے ایک طاقتور پریس کی ضرورت پڑے گی۔ **دوسری زبانوں میں تو شاید ہی کسی جگہ مسلم اقلیت کے اخبارات ہوں، مغربی بنگال میں اس وقت بنگلہ زبان بولنے والے مسلمانوں کا ایک بھی اخبار نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بنگالی مسلمانوں کو نہ اپنے ملی مسئلوں کی خبر ہے اور نہ دوسرے لوگ جانتے ہیں کہ وہ کس حال میں ہیں اور ان کی ضرورتیں کیا ہیں؟ اپنا پریس نہ ہونے سے بنگالی مسلمان بے زبان ہو کر رہ گئے ہیں۔ لے دے کر اردو اخبارات ہی ملک کے کونے کونے میں مسلم اقلیت کی آواز بنے ہوئے ہیں مگر اردو پریس کمزور ہونے کے سبب یہ آواز بھی کمزور ہے۔** اسے زوردار بنانے کے لئے اردو پریس کو مضبوط بنانا ضروری ہے۔ اردو پریس میں اچھا سرمایہ لگانا چاہیے۔ اشاعت میں اضافہ ہونا چاہیے۔ ابھی حالت یہ ہے کہ ایک مقبول عام اور چالو اردو اخبار کی ہر فروخت شدہ کاپی پر قارئین کی اوسط تعداد ۲۰ ہے۔ اگر یہ آدھے "اعزازی قارئین" بھی اردو اخبار کو مل جائیں تو اس کی اشاعت بڑھ کر دس گنا ہو جائے۔ اردو ماہناموں اور ہفتہ وار اخباروں کو مانگ کر پڑھنے والوں کا اوسط ۲۰۔ قاری فی کاپی سے بھی زیادہ ہے۔ خریدار کم، اشتہارات کم، آمدنی کم، صحافی کم، اردو پریس کیسے چلے اور آگے بڑھے؟

اردو پریس کی بدحالی کو دور کرنے اور اسے اپنے پاؤں پر جم کر کھڑے ہونے کے لئے کچھ سوچنے اور کرنے کی ضرورت ہے ورنہ دو نقصانات ہوں گے ایک تو یہ کہ سسک سسک کر اردو اخباروں اور سالوں میں ایک دو مرتے جائیں گے اور جو سخت جان ہونے کی وجہ سے زندہ بچیں گے وہ اچھی اور صحت مند صحافت و ادب پیش کرنے سے قاصر رہیں گے۔ اس سے اردو قارئین کی ذہنی نشوونما متاثر ہوگی۔ ان کی آواز میں کمزوری آئے گی۔ ترجمانی زیادہ موثر نہ رہے گی۔ مجموعی طور پر اردو پریس ملت کی ضرورت بن گیا ہے۔ قومی زندگی میں ملت کا باعزت مقام حاصل کرنے اور برقرار رکھنے کے لئے اس کے پاس طاقتور پریس کا ہونا ضروری ہے۔ اور یہ کام پورے احساس اور ادراک کے ساتھ انجام دینا ہوگا۔

اردو پریس کی یہ "داستان امیر حمزہ" سن کر قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ ماہنامہ "انشاء" نے اپنے سو شمارے اور ساتھ میں بعض خاص نمبر کیسے

نکالے ہوں گے، کیا کیا جتن کئے ہوں گے، کیسے کیسے پاپڑ بیلے ہوں گے؟ اسی لئے تو ہم کہتے ہیں کہ ان سو نمبروں میں "انشاء" کی صدی پوری ہوگی اور مدیر "انشاء" ف۔ س۔ اعجاز کی عمر بھی اسی حساب سے آگے بڑھی۔ "انشاء" اور مدیر "انشاء" کو اپنی "صدی" مبارک ہو۔

دونوں کے لئے درازی عمر کی دعا پر ہم اپنی بات ختم کرتے ہیں۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قتیل شفائی
Qateel Shifai Street
Ghalib Colony Samanabad
Lahore 25, PAKISTAN
Phone · 412888

مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں انشاء کے پہلے شمارے سے اس کا قلمی معاون ہوں اور اس کے مالک و مدیر ف - س - اعجاز سے میرے قریبی دوستانہ مراسم ہیں - مجھے معلوم ہے کہ انڈیا میں اردو کے ادبی رسائل کن مشکلات سے دوچار ہیں اور میرے عزیز اعجاز کو انشاء کی اشاعت کتنی بھاری پڑ رہی ہے اس کے باوجود انشاء کو سوویں شمارے تک لے جانا اعجاز کا ایک ایسا کارنامہ ہے جسے دنیا بھر کے اردو نواز قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے - لیکن صرف داد و تحسین سے کسی ادارے کا ثبات ممکن نہیں اگر ہم اردو والے اپنے مشن کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے جرائد کیلئے کچھ نہ کچھ عملی تعاون بھی مہیا کرنا ہوگا - یہ ہم سب کے سوچنے کا مقام ہے -

غزل

ہم نے جب مانگا صلہ قربانیوں کا
دیدنی تھا حال کچھ پشیمانیوں کا

ہوگئے اس کے لئے تعمیر بنگلے
غم تھا جس کو شہر کی ویرانیوں کا

میں تو سمجھا مل گئی ہے مجھ کو منزل
یہ تو ہے اک مرحلہ حیرانیوں کا

مشورہ لیتے وہ کیا خلق خدا سے
پڑ گیا چسکا جنہیں من مانیوں کا

برف پگھلی اور دریاؤں تک آئی
بڑھ گیا خطرہ مگر طغیانیوں کا

لڑ پڑے آپس میں پہرہ دینے والے
لو مقدر جاگ اٹھا زندانیوں کا

کاغذی کشتی کہاں تک ساتھ دیتی
تھا سفر درپیش اچھلتے پانیوں کا

کچھ نئے وعدے **قتیل** اس نے کئے ہیں
پھر سے موسم آگیا نادانیوں کا

اعجاز کا انشاء گفتنی یا "انشاء" کا اعجاز گفتنی

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط
کل گاؤں 445203

باعث صد ستائش و افتخار ہیں "انشاء" کی ادبی خدمات اور لائق صد مبارک کباد و امتنان ہیں جناب ف - س - اعجاز ، جن کی مسلسل تگ و دو ، سعی ، پیہم اور انتھک کوششوں سے آج "انشاء" کا سوواں شمارہ دیکھنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے - "انشاء" نہ صرف ایک ادبی جریدہ ہے بلکہ سرزمین کلکتہ کی اردو تہذیب کا علم بردار اور پاسبان بھی ہے - اعجاز نے اپنی لگن ، اپنے شوق اور عرق ریزی سے اسے ہر ممکنہ طور پر سجانے سنوارنے اور ایک معیار پر پہنچانے کا بیڑا اٹھایا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں وہ آج کے نامور مدیرین کی طرح کامیاب بھی ہوئے ہیں اردو کے قدآور ادباء و شعراء نے اس کی پذیرائی کی جس کی وجہ سے بڑے مختصر سے عرصہ میں "انشاء" نے اردو جرائد کے بیچ اپنا اہم مقام بنالیا - ۱۹۸۷ء سے جاری یہ رسالہ پابندی ، وقت ، عمدہ گٹ اپ ، دیدہ ریز کتابت منتخب مشمولات اور معیاری ادبی صحافت کے لحاظ سے پہچانا جاتا ہے - وہ اپنے رنگین پلاسٹک کوٹیڈ سرورق پر جس انداز سے رنگ حسن بکھیرنے میں (بحیثیت ادبی جریدہ) ممتاز ہے اسی طرح رسالہ کے مشمولات بھی ادب کی قوس قزح کے رنگوں میں سجے سنورے ہوتے ہیں

بحیثیت صحافی اعجاز نے (شاعر و ادیب ہونے کے ناطے) قوم کی نباضی کا حق ادا کر دیا ہے - ان کی نگاہ شاعرانہ نے جہاں "انشاء" کے صفحات میں حسین ادبی مرقعے پیش کئے ہیں وہاں ان کی صحافتی بصارت نے "تلخ واقعات" کو بھی برائے اصلاح و عبرت پیش کرنے کی جسارت کی ہے - اعجاز کا یہی وہ صحافتی و شعری میلان ہے جس کی وجہ سے "انشاء" میں "قوم" اور قوم کی میراث - ادب کی خوب خوب پذیرائی ہوئی -

انہوں نے ببانگ دھل سماجی انتشار ، معاشرتی بحران ، اقدار کی شکست اور اخلاق کی پامالی کا پردہ فاش کیا - اور عصری حسیت سے مملو ایسے افکار کے تانے بانے سے بنے ادب پاروں سے اپنے انشاء کے صفحات کو سجایا - اس طرح انہوں نے نت نئے انداز و عزم نو سے انشاء کے معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کی سعی ، جمیل کی اور آج بھی زبان حال سے وہ کہہ رہے ہیں "ابھی تو میں جوان ہوں" - ہاں! کبھی کبھار قارئین کی بے حسی سے تنگ آکر اور مالی خسران میں روز افزوں بڑھوتری ہوتی رہنے کی وجہ سے وہ حرف شکایت برملا تو نہیں بہ ہزار تردد "انشاء" کے صفحات پر لے آتے ہیں - اس میں اعجاز کا قصور نہیں اردو سماج کی ذہنی پراگندگی کو دخل ہے کہ "اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا" والا معاملہ ہمیشہ درپیش رہتا ہے -

اردو رسائل میں معروف ترین جرائد بعض اپنے مشمولات کی وجہ سے مشہور ہوئے - بعض اپنے مدیروں کی وجہ سے اور بعض اپنے اداریوں کی وجہ سے - آخر الذکر وصف رکھنے والے جرائد میں البلاغ صدق ، نگار ، معارف ، شاعر اور برھان وغیرہ کا شمار ہو سکتا ہے کہ ان کے اداریوں کو سپرد قلم کرنے والوں میں بالترتیب مولانا ابو الکلام آزاد ، عبد الماجد دریاآبادی ، نیاز فتح پوری ، شبلی نعمانی ، سیماب اکبر آبادی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی جیسے نام آور مدیر رہے ہیں - اداریوں کے تحت مشہور گردانے والے جرائد میں معارف کے بعد نیاز کے "نگار" کو فوقیت حاصل رہی ہے - انہوں نے (ہر دو رسائل) عصری ادبی مسائل سے لے کر سماجی ، معاشی ، معاشرتی اور سیاسی نیز تمدنی و تہذیبی حالات و کوائف کا ملکی اور بین الاقوامی سطح پر جائزہ لیا اور اپنے قارئین کو وقت

کے دھارے سے آگاہ کیا۔ عصر حاضر میں "ذہن جدید" "انشاء" اور "شاعر"، "معارف و نگار" کی راہ اپنا رہے ہیں اور اپنے اداریوں میں چونکا دینے والے حالات، لسانی مناقشات، تارکین وطن کے مسائل حیات اور اردو تہذیب کے مفردات و مرکبات سبھی کا احاطہ کر رہے ہیں۔ "**انشاء**" **فی الوقت اس وصف میں باقی دیگر دونوں سے آگے ہے۔**

"انشاء" کے اداریہ "**گفتنی**" کا اپنا ایک علاحدہ مزاج اور انشاء ہے۔ اعجاز نے اپنے خلاق تخیل سے اسے ہر ممکنہ طور پر موثر بنانے کے جتن کئے ہیں۔ "گفتنی" میں ان کی اداریاتی تحریر "بولتی" ہوتی ہے۔ شاید اسی مناسبت سے انہوں نے اپنے اداریہ کا نام "گفتنی" رکھا ہو۔ وہ اپنی طرز انشاء اور ندرت اسلوب سے "ناگفتہ" اور ناگفتہ بہہ) موضوعات کو بھی "گفتنی" بنا دیتے ہیں کہ قارئین انشاء جب اسے پڑھتے ہیں تو اس تحریر میں انہیں اپنے دل کی آواز سنائی دیتی ہے۔ انشاء کی یہ بولتی تحریریں بعض وقت ہوش ربا بھی ہوتی ہیں اور ہوش بردار بھی جو پڑھنے والوں کے دلوں کو جھنجھوڑ دیتی ہیں۔ انہوں نے سماجی، معاشی، معاشرتی مسائل ہوں یا سیاسی یا ادبی ہر جگہ ہر میدان میں اپنے رخش قلم کو سرپٹ نہیں دوڑایا بلکہ دھیمی چال سے انہوں نے ہر کوچہ اور ہر گوشہ پر بھرپور نظر ڈالی ہے۔ ان کی اداریائی تحریریں الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں بلکہ صوفی، کامل کے ذکر اللہ میں گھومتے ہوئے تسبیح کے دانے ہیں کہ ایک ایک دانہ اپنا حق ادا کرتا چلا جاتا ہے۔ ان کی "گفتنی" کی تحریر ملاحظہ فرمائیں۔ "**نظم کے دن پھرے**" عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں

> ۔نظم و غزل کی اصناف اپنی اپنی دلکشی رکھتی ہیں، لیکن دونوں اصناف کی پذیرائی کے ڈھنگ الگ الگ ہوتے ہیں۔ غزلیہ اشعار کے لئے معنی و مقصد سے زیادہ لطافت و نزاکت کو مقدم سمجھا گیا ہے، نظم میں ایک تحریک، جذباتی یا فکری تنظیم، مقصد خیال یا کئی خیالات کا پایا جانا ضروری ہے۔ (انشاء اکتوبر / نومبر ۸۹ء)

نظم و غزل کے اس باریک فرق کی انہوں نے جس طرح وضاحت کر دی ہے۔ اپنے مجموعہ کلام "مالک یوم الدین"، "لاشریک" اور "موسم بدل رہا ہے" میں اسے عملاً برتا بھی ہے۔ اعجاز کی غزلوں میں جہاں لطیف و نازک خیالات اشعار کی لڑیوں میں پڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، افکار کی صلابت اور جذباتی آہنگ کی گھن گرج سے ان کی نظمیں مملو دکھائی دیتی ہیں۔

حالی اور آزاد نے لاہور کے مشاعرے میں جب سے نظم کی داغ بیل ڈالی اور شاعری میں گل و بلبل کی بجائے مسائل حیات کے داخلہ کو روا رکھا تب سے غزل نے بھی اپنے آرائش جمال میں ترمیم کر دی اور آج غزل "غزل" سے "جدید غزل" تک پہنچ گئی ہے۔ غزل میں نئے موضوعات کو تحریک حالی و آزاد سے ملی ہے۔ اعجاز نے اپنے اداریہ میں اس کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے۔

> "غزلوں میں نئے نئے موضوعات نظموں کے کامیاب تجربوں کے زیر اثر ہی داخل ہونا شروع ہوئے"۔

یہ اور اس جیسے اداریوں کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اعجاز کی اردو ادب کی تاریخ پر گہری نظر ہے اور اصناف ادب کے نظم و ضبط سے وہ کما حقہ واقف ہیں۔ وہ فن کے جمالیات اور اس کے افادی پہلو پر ایمان رکھتے ہیں اور ادب برائے ادب کے مقابلے میں ادب برائے زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ "**فن اور جمالیات**" کی سرخی قائم کر کے انہوں نے لکھا ہے۔

> "فن کی خوبصورتی حقیقی زندگی کی خوبصورتی کا چربہ نہیں ہوتی۔ دراصل فن دنیوی خوبصورتی کے بارے میں ایک نظریہ، ایک خیال ہوتا ہے جو زندگی کے تسلیم شدہ حسن کو منعکس کر کے انسانی ذہنوں کو آگاہ و بیدار کرتا ہے"۔ (جون ۸۷ء)

اعجاز کی اس جمالیاتی حس کی کرشمہ سازی ہے کہ ان کی نظم و نثر میں فنی جمالی بے پردہ دکھائی دیتا ہے۔ انشاء کا سرورق اس پر دال ہے۔ "یورپ کا سفرنامہ" کی تصاویر اور سفر کے حالات میں نکھرتا ہوا یوروپ کا حسن، اس کے علاوہ ان کے مجموعہ کلام کے اشعار میں بکھرا ہوا شعری حسن یہ سارے اعجاز کی جمالیاتی حس کے گواہ ہیں۔

اعجاز نے اردو کے مسائل پر بہت کھل کر بحث کی ہے۔ اور اپنے قارئین کو اردو کی قومی اور بین الاقوامی مشکلات سے آگاہ کیا ہے۔ وہ دیگر ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اردو کی بھی ترقی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے بچوں کے ادب میں کامک (Comic) کی اہمیت سے لے کر ادب اور روزی روٹی کے مسئلہ تک کو گفتنی میں پیش کر دیتے ہیں۔ مدرسوں میں اردو تعلیم کے مسائل کو جہاں وہ ایک طرف پیش کرتے ہیں وہاں

اردو کی نئی بستیوں میں اردو کی بقاء کے مسئلہ پر بھی اظہار خیال فرماتے ہیں ۔ برطانیہ میں اردو کی بقاء کے مسئلہ پر مدیر " راوی " حضرت مقصود الٰہی شیخ نے جب تشویش کا اظہار کیا اور اردو قوم کو اس جانب متوجہ کیا تو ہندوستان ہی نہیں برصغیر میں ف ۔ س ۔ اعجاز ہی نے شیخ صاحب کی آواز پر لبیک کہا ۔ بعد میں دیگر رسائل نے اس مسئلہ پر لکھنا گوارا فرمایا " آرٹ اور پروفیشنلزم " عنوان بنا کر (اپریل / مئی ۹۲ء) اعجاز نے ستیہ جیت رے کی فلمی خدمات کو سراہتے ہوئے " آرٹ اور پیشہ کے باہمی جوڑ سے ہونے والے فوائد و نقصانات بتائے ۔

اعجاز کو ہندوستان سے پیار ہے ۔ یہاں کی تہذیبی میراث کو وہ گلے سے لگائے ہوئے ہیں ۔ ہندو مسلم مناقشات کو پھیلانے کے لئے آج کل کے نام نہاد رہنمایان قوم " کرسی " کی خاطر جو نت نئے ہتھکنڈے استعمال کر کے غریب عوام کا خون بہا رہے ہیں ان سے اعجاز بیزار ہیں ۔ لیکن ان کی تکلیف اس وقت دو بالا ہو جاتی ہے جب پرستاران ادب ، ادب جیسی مقدس ، بے ضرر و بے ضرار صنف کو منافرت پھیلانے کے لئے استعمال کرتے ہیں ۔ " کو ستایا کچھ اور " (اگست ۹۲ء) میں ہندی کوی سمیلنوں میں پھیلائی جانے والی ہندو مسلم دشمنی و منافرت سے اردو داں طبقہ کو آگاہ کیا ہے اور اس کے سد باب کے لئے اپیل بھی کی ہے ۔ اعجاز نے ہندوستانی تہذیب کے ماحول میں آنکھیں کھولیں ۔ یہاں کے ذرہ ذرہ سے انہیں پیار ہے ۔ ہندو ، مسلم کی طبقاتی تفریق کے وہ قائل نہیں ۔ ادب میں تو وہ اس کے بالکل ہی روادار نہیں ۔ چنانچہ بمبئی کی ایک چھوٹی بچی شاعرہ " گیتانجلی " کی کینسر سے موت واقع ہوئی تو انہوں نے اپنی نظموں میں رنج و غم کا اظہار فرمایا ۔ اور اس کی ۲۸ نظموں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ۔ پاکستان کے ایک غیر ذمہ دار قسم کے ادیب نے جب اعجاز کی نظم اور گیتانجلی کے لئے نیک خیالات پر لعن طعن کیا تو قمر رئیس صاحب نے اعجاز کو ایسے نام نہاد ملا قسم کے ادیبوں سے بچنے کا مشورہ دیا ۔

" کھیل کھیل میں " کے عنوان سے " ریلائنس کپ " کرکٹ برائے امن کے میچ کے موقع پر جو ابتری پھیلائی گئی تھی ، اعجاز اس سے بڑے دلگرفتہ ہوئے ۔ انہوں نے " گفتنی " میں ہر دو قوموں کے ہونہاروں کو للکارا :

" ..... محبت سے وطن میں اپنی شرکت کو لازم بنایا جائے ۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا کھیل کھیل میں گیند کی جگہ انسانی سروں سے باؤلنگ ، بلے کی بجائے بندوق سے بیٹنگ کے امکانات پیدا ہوتے رہیں گے اور انسانی سانسوں کے وکٹ گرائے جاتے رہیں گے ۔ اسکور بورڈ پر ہندو اور مسلمان اموات کے ہندسے اور اعداد پلٹتے رہیں گے ۔ (دسمبر ۸۷ء)

مگر ساتھ ہی انہوں نے " رامائن " سیریل کے قبیح اثرات سے بھی آگاہ کر دیا تھا ، جس کی آخری کڑی بہ صورت بابری مسجد کو ڈھاتے وقت دکھائی دی تھی ۔ حکمراں طبقہ کی ایسی دریدہ ذہنی کو انہوں نے آڑے ہاتھوں لیا ہے ۔ " تحفظ کی آگ " میں انہوں نے منڈل کمیشن کی سفارشات کا پردہ چاک کیا ہے تو " ظالم کی ترقی " میں کشمیر کے گورنر " جگ موہن " جیسے بدنام زمانہ ظالم و سفاک کو راجیہ سبھا کا ممبر بنا دیئے جانے پر اپنے رنج و غم کا اظہار کیا ہے ۔

بمبئی کے فسادات " نتھو رام گوڈسے اچھا پتر نیاس " کے مذموم منصوبے ، دور درشن اور جرائی رسائل سے پھیلائے جانے والے جرائم وغیرہ پر انہوں نے اپنے اداریوں میں نہایت مدلل بحث کی ہے اور اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے ۔ اور نہ جانے ایسے کتنے ملکی سنگین مسائل ہیں جن پر انہوں نے برملا کہا ہے اور اس کے مداوؤں کی شکلیں اور راہیں بھی بتائی ہیں ۔

آزادی کے بعد سے اردو کے لئے بنجر بنتی جارہی کلکتہ کی زمین میں پروان چڑھے اعجاز کو اردو زبان و ادب سے بڑا پیار ہے ۔ مشکل ترین حالات میں وہاں سے پرچہ نکالنا اور اردو پریس چلانا اردو سے ان کی محبت کے مظہر ہیں ۔ ان کا صحافتی ذہن بھی بڑا پختہ ہے اس لئے اردو صحافت کے مسائل پر ان کی گہری نظر ہے ۔ تہواروں کے مواقع پر اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کے رسائل میں " نمبر " نکلتے ہیں ۔ اردو میں اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اعجاز ہمیشہ سے " انشاء " کا " عید نمبر " نکالتے رہے ہیں ۔ لیکن اس کی جتنی پذیرائی ہونی چاہیے تھی وہ نہ ہوئی تو انہوں نے " گفتنی " میں لکھا ۔

" عید جیسے عظیم تہوار کی عظمت کو کلاسیکی ادب میں قابل ذکر جگہ دینے کے لئے کبھی کبھار ادیبوں کو اپنی ذہنی اپج سے کام لینا چاہیے ۔ عید کے چاند کو جس طرح ہمارے شعراء و ادباء نے قابل ناز بنادیا ہے اسی طرح وہ عید سے جڑی ہوئی بہترین تاریخی روایات اور اسلامی ثقافت کو بھی قابل فخر بنا سکتے ہیں " ۔ (مئی ۸۹ء)

وہ خود اس بات میں پہل کر چکے ہیں۔ ۹۳ء کے عید نمبر میں ان کا اداریہ "سرنذرانے دو" اور ۹۴ء کے عید نمبر کا اداریہ "آسمانی دھرم کلنک پر" حوالے کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں۔ دونوں اداریے منظوم ہیں۔ اور عید کے پس منظر میں عصری مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس نوع کے دیگر صحافتی مسائل میں "ادبی رسائل میں اشتہار کا مسئلہ"۔ "اقلیت کا اخباری وجود" وغیرہ مسائل پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے جو ان کی دور بینی اور عمیق مطالعہ کی غماز ہے۔

غرض کہ "انشاء کی گفتنی" واقعی انشاء کا اعجاز ہے۔ اعجاز نے اپنے انشاء و اسلوب سے اردو کے قومی اور بین القومی مسائل کو "گفتنی" بناڈالا ہے۔ میں انہیں مکرر مبارکباد دیتا ہوں اگرچہ کہ میں ابھی بھی اسی تذبذب میں مبتلا ہوں کہ آیا یہ "انشاء کا اعجاز گفتنی" ہے یا "اعجاز کا انشائے گفتنی"۔

سید منیر نیازی
(کلکتہ)
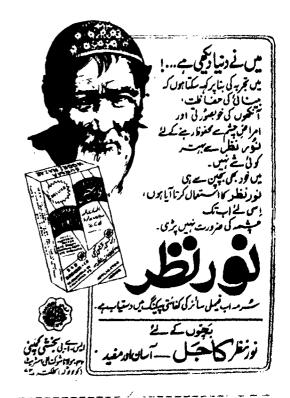
فارورڈ بلاک رہنما اور مغربی بنگال کے وزیر زراعت (مارکیٹنگ) کلیم الدین شمس سے انٹرویو

مسلمانوں کیلئے ریزرویشن وقت کا تقاضہ ہے

آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی اقتصادی، تعلیمی اور سماجی پس ماندگی ان دنوں گفتگو کا موضوع بنی ہوئی ہے اور عام طور پر محسوس کیا جارہا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ مسلسل کی جانے والی اس ناانصافی کا خاتمہ ہونا چاہیئے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ گزشتہ ۴۷ سال کے دوران کسی بھی مرکزی یا ریاستی حکومت نے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ دوسری طرف مسلم لیڈر شپ نے بھی اپنے لئے عافیت اسی میں محسوس کی کہ مسلمانوں کو اردو، فساد، مسلم یونیورسٹی اور پرسنل لا جیسے مسائل ہی میں الجھائے رکھا جائے۔

ان حالات میں تقریباً ۱۶ سال پہلے فارورڈ بلاک مغربی بنگال کے ایک نوجوان مسلم لیڈر کلیم الدین شمس نے جب پہلی بار مسلمانوں کیلئے جاب ریزرویشن کا مطالبہ کیا تو گوشہ عافیت میں اونگھتی ہوئی بوڑھی مسلم قیادت چونک پڑی۔ ناموافق حالات میں اس مطالبہ کو منوانے کیلئے لمبی جدوجہد کی ضرورت تھی جو سہل پسند مسلم قیادت کا مزاج نہیں۔ کلیم الدین شمس نے سیکولر ہندوؤں کے تعاون سے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ آج جو مختلف سیاسی اور غیر سیاسی حلقوں کی جانب سے مسلمانوں کیلئے ریزرویشن کے مطالبہ کی حمایت کی جارہی ہے اس کیلئے زمین ہموار کرنے میں کلیم الدین شمس کا بڑا ہاتھ ہے۔ پچھلے دنوں میں نے کلیم الدین شمس سے ریزرویشن کے موضوع پر گفتگو کی تھی جس کی تفصیل یہاں درج ہے۔

سید منیر نیازی

سوال شمس صاحب! آج سے تقریباً ۱۶ سال پہلے مسلم لیڈروں میں غالباً سب سے پہلے آپ نے مسلمانوں کیلئے جب جاب ریزرویشن کا مطالبہ کیا تھا تو حکومت تو درکنار دیگر مسلم لیڈروں نے بھی اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن حالیہ دنوں میں حالات میں تبدیلی آئی ہے۔ اب نہ صرف بیشتر مسلم لیڈر مسلمانوں کیلئے ریزرویشن کا مطالبہ کر رہے ہیں بلکہ بی جے پی کے علاوہ دیگر اپوزیشن پارٹیاں بھی اس مطالبہ کی حمایت کرنے لگی ہیں۔ حکمراں کانگریس کا بھی ایک حلقہ محسوس کر رہا ہے کہ مسلمانوں کیلئے ریزرویشن وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کو مسلمانوں کیلئے ریزرویشن کا خیال کیوں آیا اور آپ اسے کیوں ضروری سمجھتے ہیں؟

جواب آپ نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ پہلے کے مقابلے میں آج حالات قدرے بہتر ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں جب میں نے مسلمانوں کیلئے ریزرویشن کا مطالبہ کیا تھا تو حالات اتنے بہتر نہیں تھے۔ اس وقت اگرچہ تقسیم ہند کے سانحہ کو گزرے ۳۱ سال ہو چکے تھے پھر بھی مسلم قیادت اس قدر سہمی ہوئی تھی کہ اسے مسلمانوں کے جائز مطالبات کی بھی حمایت کرنے میں یہ سوچ کر ہچکچاہٹ ہوتی تھی کہ کہیں اس پر فرقہ پرستی کا لیبل نہ چسپاں کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے مسلمانوں کیلئے ریزرویشن کا مطالبہ کیا تو اس کی تائید اتنی گرمجوشی سے نہیں کی گئی جیسی آج کی جارہی ہے۔

آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ آزادی کے بعد

جب ملک کا دستور مرتب کیا جارہا تھا تو کچھ سیکولر اور انصاف پسند ممبروں نے مطالبہ کیا کہ شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب کی طرح مسلمانوں کیلئے بھی ریزرویشن کا بندوبست کیا جانا چاہیے کیونکہ تقسیم ہند کے نتیجے میں ان کی اقتصادی اور تعلیمی حالت مزید بدتر ہو گئی ہے ۔ یہ مطالبہ اتنا معقول اور مناسب تھا کہ سردار پٹیل جیسے لیڈر کو بھی اس کا قائل ہونا پڑا اور انہوں نے خود اس سلسلہ میں ایک تجویز پیش کی ۔ بدقسمتی سے یہ تجویز صرف ایک ووٹ سے مسترد ہو گئی اور وہ فیصلہ کن ووٹ کسی غیر مسلم کا نہیں بلکہ بیگم اعجاز رسول کا تھا ۔

سوال بیگم صاحبہ نے ایسا کیوں کیا؟

جواب دل کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن بظاہر، جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا، تقسیم ہند اور اس کے بعد ہونے والی ہند پاک جنگوں نے ملک میں ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا کہ پریشان حال ہندوستانی مسلمانوں کے جائز مطالبات اور حقوق کی حمایت بھی فرقہ پرستی قرار دی جارہی تھی ۔ مسلم قیادت کی گردن پر لٹکتی ہوئی فرقہ پرستی کی تلوار نے اس کی زبان بند کر رکھی تھی ان حالات میں کچھ ہی ایسے مسلم لیڈر تھے جنہوں نے نتائج کی پرواہ کئے بغیر مسلمانوں کے حقوق کیلئے صدا بلند کی ۔

سوال میرے پہلے سوال کا دوسرا حصہ یہ تھا کہ آپ مسلمانوں کیلئے ریزرویشن کو ضروری کیوں سمجھتے ہیں؟

جواب ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان کی ٹوٹل آبادی میں مسلم آبادی کا تناسب ۱۱.۳۵ فیصد ہے ۔ ویسے غیر سرکاری رپورٹوں کے مطابق ہندوستان میں مسلمان کل آبادی کا ۱۵ فیصد حصہ ہیں ۔ بہرحال اگر مسلم آبادی ۱۱.۳۵ فیصد بھی تسلیم کرلی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سرکاری نوکریوں میں مسلمانوں کا حصہ کم از کم ۱۱.۳۵ فیصد ہونا چاہیے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۴۸-۴۹ء میں سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب ۳۲.۵ فیصد تھا جو آج گھٹ کر ۳.۵ فیصد رہ گیا ہے ۔ ۱۹۹۱ء کی سروے رپورٹ کے مطابق مسلمان سیول سروسیز میں ۲.۲۵ فیصد، انڈین پولیس سروسیز میں ۲.۲۵ فیصد اور فارن سروسیز میں ۳ فیصد تھے ۔

ان اعداد و شمار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمان اقتصادی طور پر کتنے بدحال ہیں ۔ یہ بات قرین قیاس نہیں کہ آزادی ملتے ہی ہندوستانی مسلمان راتوں رات نااہل ہوگئے اور ان کی صلاحیتیں اتنی کم ہو گئیں کہ وہ مقابلے کے کسی امتحان کے لائق نہیں رہے ۔ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ مسلمانوں کے ساتھ جان بوجھ کر ناانصافی کی گئی ۔ ایسی بہت سی مثالیں سامنے آئی ہیں جب مقابلے کے تحریری امتحان میں امتیازی نمبروں سے پاس ہونے والے مسلمان امیدوار انٹرویو میں پراسرار طور پر ناکام ہوگئے میں نے آنجہانی وزیراعظم اندرا گاندھی سے ایک ملاقات کے دوران تجویز پیش کی تھی کہ مقابلے کے امتحانات میں انٹرویو کی کارروائی کی ٹیپ ریکارڈنگ کرائی جائے تاکہ اگر کوئی امیدوار اپنے ساتھ ناانصافی کی شکایت کرے تو اس کی جانچ کرکے حقیقت حال کا پتہ لگایا جاسکے ۔ اندراجی نے اس تجویز سے اصولی طور پر اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ ایسا کرنے میں کچھ "انتظامی دشواریاں" ہوں گی، پھر بھی میں اس تجویز پر غور کروں گی ۔ وجہ خواہ جو بھی ہو اس تجویز پر ابھی تک عمل نہیں کیا جاسکا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کا سلسلہ جاری ہے ۔

ان حالات میں ہم اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ مسلمانوں کو سرکاری نوکریوں میں ان کا حصہ دلانے کیلئے ریزرویشن کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ۔

سوال اس سلسلہ میں آپ حضرات نے اب تک کیا کارروائی کی ہے؟

جواب اس کاز کیلئے ہم ۱۹۶۸ء ہی سے جدوجہد میں مصروف ہیں ۔ اس سلسلے میں پہلی بار ۲۷/ دسمبر ۱۹۶۸ء کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے زیر اہتمام لکھنؤ میں دو روزہ کانفرنس ہوئی جسے بجا طور پر ہندوستان میں مسلم سیاست کا ایک اہم موڑ کہا جائے گا ۔ اس کانفرنس کی صدارت میں نے کی اور افتتاح جامع مسجد دہلی کے

امام سید عبداللہ بخاری صاحب نے کیا۔ سی پی ایم کے علاوہ دیگر سبھی بڑی سیاسی پارٹیوں کے مسلم لیڈروں نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ ملک کے گوش گوشے سے آئے ہوئے تقریباً پانچ ہزار ڈیلی گیٹوں میں مختلف ریاستوں کے ۸۰ مسلم ممبران اسمبلی اور ۱۵ مسلم ممبران پارلیمنٹ بھی شامل تھے۔ اس تاریخی کانفرنس میں ایک قرارداد پاس کرکے مسلمانوں کیلئے زندگی کے ہر شعبے میں ان کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ریزرویشن کا مطالبہ کیا گیا۔

اس سلسلہ کی دوسری کانفرنس ۹/ دسمبر ۱۹۷۹ء کو کلکتہ میں میری صدارت میں ہوئی۔ پورے ملک سے آئے ہوئے تقریباً ۳۵۰ ڈیلی گیٹوں نے لکھنؤ قرارداد کی تائید کرتے ہوئے اس پر جلد از جلد عمل درآمد کا مطالبہ کیا۔ اس کے ایک سال بعد ۳۰/ دسمبر ۱۹۸۰ء کو کلکتہ میں دو روزہ "اقلیت بچاؤ کنونشن" ہوا۔ اتفاق سے اس کنونشن کی بھی صدارت میں نے کی۔ اس اہم اجتماع میں ڈاکٹر شیر سنگھ (چیرمین ہائی پاور پینل فار مائنار ٹیز اینڈ ادر بیک ورڈ کلاسیز) ڈاکٹر فاروق عبداللہ (ایم پی) میر واعظ فاروق (عوامی ایکشن کمیٹی، جموں و کشمیر) مولانا سید اسعد مدنی اور مولانا سید احمد ہاشمی (جمعتیہ علماء ہند) احمد سعید ملیح آبادی (ایڈیٹر آزاد ہند، کلکتہ) جسٹس ایس اے مسعود اور جاوید حبیب (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈینٹس یونین وغیرہ نے شرکت کی۔ ڈیلی گیٹوں کی تعداد تقریباً ۵۴۲ تھی جن میں کانگریس جنتا پارٹی، لوک دل، فارورڈ بلاک، مسلم لیگ، جمعتیہ علماء ہند، آل انڈیا کرسچین ڈیموکریٹک پارٹی، سکھ برادری، مسلم مجلس مشاورت، مسلم مجلس، نیشنل کانفرنس (جموں و کشمیر) عوامی ایکشن کمیٹی (جموں و کشمیر) او علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈینٹس یونین کے نمائندے شامل تھے۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے، جو اس کنونشن کے مہمان خصوصی تھے، اپنے والد مرحوم شیخ عبداللہ سے صلاح و مشورہ کرنے کے بعد مسلمانوں کیلئے جاب ریزرویشن کی قرارداد پیش کی جسے اتفاق رائے سے منظور کیا گیا۔

اس سال ۱۶/ اکتوبر ۱۹۹۴ء کو لکھنؤ میں پھر ایک کنونشن کرکے حکومت ہند سے مطالبہ کیا گیا کہ مسلمانوں کیلئے ان کی آبادی کے تناسب سے ریزرویشن کا بندوبست کیا جائے اس طرح گزشتہ ۱۶ سال سے ہماری جدوجہد جاری ہے۔

سوال آپ مسلمانوں کیلئے ریزرویشن صرف نوکری اور تعلیم میں چاہتے ہیں یا انتخابی سیاست میں بھی؟

جواب صرف جاب ریزرویشن یا ایجوکیشن ریزرویشن ہی کافی نہیں ہے۔ ملک کا کنٹرول روم سیاست ہے۔ اگر سیاست میں ہمارا عمل دخل بڑھ جائے تو بیشتر مسائل آسانی سے حل کئے جاسکتے ہیں۔ بدقسمتی سے ملک کی سیاست میں بھی مسلمانوں کا حصہ کم ہوتا جارہا ہے۔ پارلیمنٹ میں، جہاں ملک کی تقدیر کا فیصلہ کیا جاتا ہے، ۱۹۸۲ء میں مسلم نمائندگی ۸.۴۵ فیصد تھی جو ۱۹۹۱ میں گھٹ کر ۴.۷۷ فیصد رہ گئی ہے۔ آج ملک کی ۱۴ ریاستوں سے پارلیمنٹ میں ایک بھی مسلم نمائندہ نہیں۔ یوپی جیسی اہم اور بڑی ریاست میں صرف تین مسلم ایم پی ہیں۔ یہ صورت حال نہایت افسوسناک اور مایوس کن ہے۔ اس طرح تو ہم قومی سیاست سے بیدخل ہوتے جارہے ہیں۔ ملک کی ٹوٹل آبادی کا ۱۵ فیصد ہونے کے باوجود ہماری حیثیت قومی سیاست میں "پریشر گروپ" کی نہیں رہی۔ اس لئے ہمارا مطالبہ ہے کہ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں بھی مسلمانوں کیلئے ان کی آبادی کے تناسب سے نشستیں ریزرو کی جائیں۔

سوال مسلمانوں کے جن طبقات کو منڈل کمیشن کی سفارشات اور سپریم کورٹ کے فیصلہ کے تحت ریزرویشن کا حق دیا گیا ہے ان کی مجموعی آبادی مسلم آبادی کا ۸۰ فیصد ہے۔ کیا آپ اس سے مطمئن نہیں ہیں؟

جواب منڈل کمیشن نے ذات پات کی بنیاد پر کچھ طبقات کو پسماندہ قرار دیکر ان کیلئے ۲۷ فیصد ریزرویشن کی سفارش کی ہے جن میں کچھ مسلم گروپ بھی شامل ہیں۔ ہمیں کئی وجوہات کی بناء پر اس سے اختلاف ہے۔ اول یہ کہ ہندو دھرم کے برعکس اسلام میں ذات پات کا کوئی تصور نہیں۔ ہندوؤں کے اثرات کی وجہ سے صرف بہار اور یوپی کے مسلمانوں میں کسی حد تک

ذات پات کا رواج ہے جس کو ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے ۔ ایسی صورت میں اگر مسلمانوں کو ذات پات کی بنیاد پر ریزرویشن دیا گیا تو اس سے ان میں بھی ذات پات کی تفریق کی حوصلہ افزائی ہوگی اور بالآخر ہندوؤں کی طرح ان میں بھی ذات پات کی بنیاد پر لڑائی چھڑ جائے گی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں کیلئے ۲۷ فیصد ریزرویشن کی سفارش کی گئی ہے ان میں ظاہر ہے کہ بھاری اکثریت ہندوؤں کی ہے ۔ ایسی صورت میں اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ اس ۲۷ فیصد ریزرویشن میں مسلمانوں کو ان کا حصہ لازمی طور پر ملے گا۔ اب تک کے تجربات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ ۲۷ فیصد ریزرویشن کا بڑا حصہ ، بلکہ پورا حصہ ، اکثریت والے ہڑپ کرلیں گے اور اقلیتی گروپ منہ دیکھتا رہ جائے گا۔

ان حالات میں ہمارا مطالبہ ہے کہ پورے مسلم فرقہ کو پسماندہ قرار دے کر اس کیلئے اس کی آبادی کے تناسب کی بنیاد پر ریزرویشن کا بندوبست کیا جائے ۔ اگر مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ سلوک واقعی مقصود ہے تو پھر اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

سوال شمس صاحب ! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ دستور ہند میں مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن کی گنجائش نہیں ۔ اس کیلئے دستور میں ترمیم کرنا ہوگی اور نیا قانون بنانا ہوگا ۔ ایسی صورت میں کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ بی جے پی کی مخالفت کے باوجود ، جو لوک سبھا کی دوسری سب سے بڑی پارٹی ہے ، نیا قانون بنانا ممکن ہوسکے گا؟

جواب جی ہاں ، آپ نے ٹھیک کہا کہ مسلمانوں کو ریزرویشن دینے کیلئے دستور میں ترمیم کرکے نیا قانون بنانا ہوگا ۔ میرا خیال ہے کہ اگر حکومت خلوص دل سے تہیہ کرلے کہ اس کو یہ کام بہرصورت کرنا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کو کامیابی نہ ملے ۔ یہ تو طے ہے کہ بی جے پی اس کی مخالفت کرے گی اور اس کی ہر ممکن کوشش یہی ہوگی کہ اس طرح کا کوئی بل پارلیمنٹ سے پاس نہ ہونے پائے ۔ لیکن اگر حکمراں کانگریس نے دیگر سیکولر اپوزیشن پارٹیوں کی حمایت حاصل کرنے کی سنجیدہ کوشش کی اور انہیں یہ یقین دلاسکی کہ اس کے اس اقدام کا انتخابی سیاست سے کوئی تعلق نہیں اور وہ واقعی پسماندہ مسلمانوں کی مدد کرنا چاہتی ہے تو مجھے امید ہے کہ اسے پارلیمنٹ سے بل پاس کرانے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔

برِ صغیر کی تقسیم کی بنیاد کیسے پڑی

تحریر: رئیس الدین فریدی
مدیر روزنامہ ہند
سا گردت لین، کلکتہ ۷۳

فاضل مصنف برگزیدہ صحافی، ادیب، شاعر اور نقاد ہیں۔ ان دنوں اپنی سوانح حیات مرتب کر رہے ہیں جس میں کئی ابواب ملک کے سیاسی اور تاریخی پس منظر میں تحریر کئے گئے ہیں۔ فریدی صاحب سن رسیدہ ہونے کے باوجود کافی بذلہ سنج، متحرک اور فعال انسان واقع ہوئے ہیں۔ ان کی سوانح حیات کا لوگوں کو بے چینی سے انتظار ہے۔ (مدیر)

سیاست سے مجھے کم عمری میں ہی دلچسپی ہو گئی تھی اور زیادہ تر جمعیتہ العلماء ہند کی تقلید میں آزادی کی تحریک کو میں اچھی نظر سے دیکھتا تھا۔ تاریخ کی کتابوں اور اخباروں نے دماغ کو کافی جلا بخشدی تھی۔ کانگریس کی تحریکوں کے سلسلے میں سب سے پہلے ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کی ملک میں آمد کے خلاف ہونے والا مظاہرہ دیکھا۔ یہ کمیشن جبل پور آنے والا تو نہ تھا مگر صوبائی دار الحکومت ناگپور آرہا تھا۔ اس دن سارے ملک میں مظاہروں کا انتظام تھا۔ جو کانگریس اور مسلم لیگ کے اتفاق رائے سے ہو رہے تھے اگرچہ مسلم لیگ والے ان میں عملی حصہ نہیں لے رہے تھے۔ جبل پور میں الف خاں کی تلیا سے جس کا نام کانگریس والوں نے تلک بھومی کر کے مسلمانوں کے لئے شکایت کا ایک اور سبب پیدا کر دیا تھا ایک جلوس نکلا جس کے شرکاء سارے ملک میں گونجنے والا نعرہ سائمن کمیشن واپس جاؤ بلند کر رہے تھے۔ ابھی یہ جلوس شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ اسے خلاف قانون قرار دے کر اس پر پولیس نے لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ جب کافی لوگ زخمی ہو کر گر پڑے اور شرکائے جلوس نعرے لگاتے ہوئے قریب کی سڑکوں اور گلیوں میں منتشر ہوگئے تو ان پر لاٹھی بند گھوڑ سوار چھوڑے گئے۔ جنہوں نے جگہ جگہ گھوڑوں کے اوپر سے نہتے لوگوں کے سروں پر ڈنڈے برسائے۔ میں جلوس میں شریک تو نہ تھا کیونکہ والد صاحب عملی سیاست میں حصہ لینے کے خلاف تھے اور میں ان کا دست نگر تھا۔ مگر یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس سے انگریزوں کے خلاف نفرت کے جذبے میں اضافہ ضرور ہوا۔ اب انگریزوں سے نفرت کی بات چلی ہے تو یہ بھی سن لیجئے کہ میرے دل میں نفرت کا آغاز مولانا حسین احمد مدنی کی ایک دو تقریریں سننے کے بعد سے ہوا۔ پھر جب خود تاریخ کا مطالعہ شروع کیا اور خواجہ حسن نظامی کی غدر سے تعلق رکھنے والی کتابیں۔ ساورکر کی غدر کی تاریخ اور پنڈت سندر لال کی بھارت میں انگریزی راج جیسی کتابیں پڑھیں تو یہ نفرت دشمنی میں بدل گئی اور ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ اور حافظ رحمت خاں کی زندگی اور شہادت کے واقعات نے اس دشمنی کو اور بڑھا دیا۔ علمائے دیوبند کی تقریریں سنکر انگریزوں کی ہر چیز سے گھن آنے لگی۔ مسلمانوں سے دشمنی اور مسلم دور حکومت کی تاریخ کو فرقہ پرستی پھیلانے کے لئے مسخ کرنے کی کوشش قومی اتحاد اردو زبان اور فرقے وارانہ امن کے خلاف ان کی سازشوں کا حال معلوم ہونے کے بعد اس میں اور اضافہ ہونا یقینی تھا۔ صرف انگریزی زبان سب سے بڑی مجبوری تھی کیونکہ اس سے واقف ہوئے بغیر خود اپنی تاریخ اور دنیا کے حالات سے پورے طور پر واقف ہونے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس لئے اس کو سیکھنے کی خاص کوشش کی، تاہم ذاتی تجربے سے یہ بھی معلوم کہ انفرادی طور پر انگریز بڑا شریف۔ مخلص اور ایماندار ہوتا ہے مگر

جب اسکے قومی مفاد کا سوال آتا ہے تو اس سے بڑا سنگ دل اور بے مروت ملنا مشکل ہے ۔ ہندوستانی عام طور پر اس کے برعکس ہوتے ہیں وہ نہ انفرادی طور پر مخلص ہوتے ہیں نہ ذاتی مفاد کے سامنے اجتماعی یا قومی مفاد کو اہمیت دیتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیپو ان کے ہاتھوں ہولناک نقصان اٹھانے سے نہ بچے اور آزادی کی جدوجہد کے دنوں میں بھی اس کو نقصان پہونچانے والے اور انگریزوں کی ہاں میں ہاں ملانے والے ہندوستانی بڑی تعداد میں موجود رہے ۔ ستیہ گرہیوں کو بے دردی سے گرفتار کرنے ان پر لاٹھیاں اور گولیاں برسانے والے زیادہ تر ہندوستانی ہی تھے ۔

ملک میں جو بھی ظلم و ستم ہوا اس کے بانی اور موجد اگرچہ انگریز تھے مگر ان کی بندوق کو اٹھانے والے کندھے ہندوستانیوں ہی کے تھے ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے بعد جس کے نتیجے میں دونوں ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے کے روادار نہ تھے اور سرسید بھی ہندو مسلم اتحاد کا زبردست داعی اور حامی ہونے کے باوجود مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رہنے کی تلقین کر رہے تھے تاکہ مسلمان اپنی پس ماندگی کی وجہ سے ہندو اکثریت کے غلام نہ ہو جائیں ۔ انگریزوں نے ۱۹۰۵ء ہی میں بنگال کو تقسیم کرکے بتادیا تھا کہ ان کے سیاسی طوفان کا رخ کیا ہے مگر ہندوؤں نے اس تقسیم کو مسترد کرانے میں کامیابی حاصل کرکے یہ سمجھ لیا تھا کہ اب میدان صاف ہے اور وہ جو چاہیں اپنے لئے حاصل کر سکتے ہیں ۔ دوسری طرف مسلمانوں میں یہ احساس جاگا کہ اگر انہوں نے اپنی صفوں کو سیدھا نہ کیا تو مکمل تباہی و بربادی ان کی تقدیر ہو جائے گی ۔ اس لئے ڈھاکے میں نواب سلیم اللہ کی قیادت میں مسلم لیگ عالم وجود میں آئی ۔ یعنی انگریزوں نے پہلے کانگریس قائم کرکے ہندوؤں کو آگے بڑھایا ۔ پھر بنگال کی تقسیم کا شوشہ چھوڑ کر اور ہندوؤں کی مخالفت کے بعد اسے ختم کرکے مسلمانوں کو مسلم لیگ قائم کرنے کا راستہ دکھایا اور دونوں اپنے پروں کو دیکھ کر ناچتے رہے اور پیروں کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی ۔ آخر ۱۹۱۴ء کی جنگ شروع ہو جانے کے بعد مسٹر جناح نے ملک کی رہنمائی کی اور انگریزوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے کانگریس اور مسلم لیگ میں سمجھوتہ کرادیا جس کی بنیاد یہ تھی کہ آزادی کے بعد مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلم اکثریت محفوظ رہے گی اور ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو کچھ زیادہ نمائندگی ملے گی اور طریق انتخاب جداگانہ ہوگا ۔ یہ ایک انقلابی سمجھوتہ تھا مگر افسوس کہ تنگ دل ہندو اسے بھی قبول کرنے سے انکار کرتے رہے ۔ مگر مسٹر جناح کی وطن پرستی نے انہیں مسز اینی بسنٹ کی گرفتاری کے بعد ہوم رول لیگ کا کرتا دھرتا بنادیا اور وحشیانہ رولٹ ایکٹ کے نفاذ اور جلیانوالا باغ کے قتل عام کی مخالفت اور مذمت میں بھی وہ کانگریسی لیڈروں کے ساتھ رہے ۔ وائسرائے کی کونسل سے استعفی دیدیا مگر گاندھی جی کے عدم تعاون اور ستیہ گرہ کے پروگرام کے مخالف رہے اس لئے گاندھی جی نے ان کی سیاسی زندگی کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی اور خلافت و سوراج کی تحریک چلانے کے لئے خلافت کمیٹی سے سمجھوتہ کرلیا مگر ان کا ہندو ۔ مسلم اتحاد کا خیال دیرپا ثابت نہ ہوا ۔ چوراچوری کے حادثے کو بہانہ بنا کر گاندھی جی کے اپنی تحریک کو ختم کرتے ہی انگریزوں ۔ ان کے حامی مسلمانوں اور فرقہ پرست ہندوؤں کی بن آئی ۔ جو تحریک کو ناکام کرنے کے لئے برابر ہاتھ پیر مارتے اور سازش کرتے رہے تھے اور انہوں نے لاکھوں آدمیوں کی قربانی پر پانی پھیرنے کے لئے فرقہ وارانہ فسادات شروع کروائے اور چند روزہ اتحاد و مستقل دشمنی میں بدل گیا ۔ پنڈت مدن موہن مالویہ اور ان کے ساتھی بھی یہی چاہتے تھے کیونکہ ان کو ڈر تھا کہ اگر انگریز اس وقت بھاگے تو ملک پھر مسلمانوں کے قبضے میں چلا جائے گا جو نہ صرف مسلم لیگ کی صورت میں منظم تھے بلکہ کانگریس پر بھی انہی کا قبضہ تھا ۔ ۱۹۱۶ء کے کانگریس اور مسلم لیگ کے میثاق لکھنؤ کے بعد انگریزوں نے اگرچہ جنگ کے خاتمے پر مزید سیاسی حقوق دینے کا وعدہ کر لیا تھا مگر جنگ میں فتح حاصل ہوتے ہی انہوں نے آزادی کی تحریک کو تباہ کرنے کی ٹھان لی اور جنگ میں ہندوستان کی قربانی کا پہلا انعام ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کی صورت میں دیا اور اپنی گرفت مضبوط کرنے میں لگ گئے ۔ ہندوستانیوں کے احتجاج کو وحشیانہ بے دردی سے کچلا یہاں تک کہ اور حرمین مارشل لاء بھی لگایا اور جلیانوالا باغ میں ایسا قتل عام بھی کر ڈالا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ، مسٹر جناح رولٹ ایکٹ کی مخالفت میں پیش پیش رہے اور انگریزوں نے چند دوسرے لیڈروں کے ساتھ ان کو بھی ملک بدر کرنے کی ٹھانی اگرچہ اس پر عمل کرنے کی ہمت نہ ہو سکی ۔ اس کے بعد کانگریس میں پھوٹ پڑی اور کانگریسی لیڈروں کے ایک حصے نے مرکزی اسمبلی میں جاکر آزادی کی جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تو مسٹر جناح نے کانگریس کی سوراجیہ پارٹی سے پورا تعاون کیا مگر کانگریس نے موتی لال نہرو کی فوری طور پر گول میز کانفرنس بلانے

کی تجویز کو مسترد کر دیا لیکن چند سال بعد جب ملک کا سب سے منحوس یہودی وائسرئے ریڈنگ فرقہ پرستی پھیلانے کا کام پورا کر چکا تو اس کی جگہ اروِن کو بھیجا گیا۔ سائمن کمیشن آیا۔ جس نے اپنی رپورٹ میں ہندوستانیوں کو مزید سیاسی اختیارات حاصل کرنے کے نااہل قرار دیدیا پھر لندن کی گول میز کانفرنس کی تجویز آئی اور ہندوستانیوں کے آپس میں لڑنے کا نیا سامان کر دیا گیا۔ گول میز کانفرنس میں کوئی سمجھوتہ نہ ہونے کی وجہ سے برطانیہ نے کمیونل ایوارڈ دیدیا۔ جس میں مسلمانوں کے علاوہ اچھوتوں کو بھی جداگانہ حق نیابت دیا گیا تھا۔ گاندھی جی نے مرن برت رکھکر اور ہندوؤں کو کچھ فیاضی دکھانے پر آمادہ کر کے اچھوتوں کے جداگانہ حق نیابت کا تو خاتمہ کرادیا اور برطانیہ نے اسے تسلیم بھی کر لیا مگر مسلمانوں کو پنجاب اور بنگال میں برائے نام تحفظ دے کر ہندو مسلم مسئلے کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا اور دو قومی نظرئے کی بنیاد میں ایک اور بڑا پتھر رکھدیا گیا۔ بعد میں اسے حل کرنے کی کوشش ضرور ہوئی مگر نمائشی۔ عجیب بات یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں پنجاب اور بنگال کی ہونے والی تقسیم کا تصور برسوں پہلے جن صاحب نے پیش کیا تھا وہ کوئی اور نہیں چند سب سے بڑے قوم پرست لیڈروں میں سے ایک لالہ لاجپت رائے ہی تھے۔ جنہوں نے برسوں پہلے کہا تھا کہ بنگال اور پنجاب کے ہندوؤں کو مسلمانوں کے زیر حکومت نہیں دیا جا سکتا اگر ان دونوں صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت مانی جاتی ہے تو ان کو تقسیم کرنا ضروری ہو جائے گا برسوں بعد یہی نظریہ سردار پٹیل نے دہرایا۔ مطلب یہ تھا کہ مسلمان سارے ملک میں ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی گزارنا قبول کر لیں مگر ہندو کسی ایک صوبے میں بھی مسلم اکثریت کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ سائمن کمیشن کے آنے کے بعد ہندو۔ مسلم قیادتوں نے اپنا دستور خود بنا کر انگریزوں سے آزادی کا متحدہ مطالبہ کرنے اور گول میز کانفرنس میں اسے پیش کرنے کا فیصلہ بمبئی کی آل پارٹیز کانفرنس میں کیا جس کے نتیجے میں نہرو کمیٹی بنی اور اس نے درجہ، نوآبادیات پر مشتمل ایک دستور حکومت مرتب کر دیا۔ مگر جب اگست ۲۹ء میں اس پر غور کرنے کے لئے کانگریس۔ مسلم لیگ، خلافت کمیٹی اور ہندو مہاسبھا وغیرہ کے نمائندوں کا اجلاس ہوا تو پنڈت مدن موہن مالویہ نے یہ تجویز پیش کر کے اجلاس کو درہم برہم کر دیا کہ برطانیہ سے فوراً درجہ نوآبادیات دینے کا مطالبہ کر دیا جائے اور اس کے جواب میں جواہر لال نہرو نے آزادی کامل کا مطالبہ کرنے کی حمایت کر دی۔ اس کے بعد نہرو رپورٹ پر آخری فیصلہ کرنے کے لئے کلکتہ میں کل جماعتی کنونشن ہوا جس میں مسٹر جناح نے نہایت وطن پرورانہ اور مصالحت پسندانہ جذبات کے ساتھ نہرو رپورٹ پر تین جزوی ترمیمیں پیش کیں مگر وہ مسترد کر دی گئیں۔ کیونکہ ہندو مہاسبھا نے ان کی مخالفت کی تھی۔ اس مقام پر مولانا محمد علی پر بھی مسٹر جناح کی تائید کرنے پر پھبتیاں کسی گئیں اور وہ کنونشن سے ہی نہ اٹھ گئے بلکہ اس کے بعد کانگریس میں بھی نظر نہ آئے۔ اس کے ایک ہفتے بعد ہی دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس ہوئی جس میں مسلمانوں کی طرف سے ۱۴ مطالبات پیش کئے گئے جو مسٹر جناح کے ۱۴ نکات کے نام سے مشہور ہوئے اور جناح صاحب کا وہ درد بھرا اعلان کار فرما ہو گیا جو انہوں نے آل پارٹیز کنونشن میں اپنی تجویزیں مسترد ہو جانے کے بعد بایں الفاظ دیا تھا کہ اب ہمیں تمام حالات پر ازسرنو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

دردناک حالات

سیاسی حقوق کی کشمکش کی وجہ سے فرقہ وارانہ حالات بھی تیزی سے ابتر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ شاید ہی کوئی دن جاتا ہو کہ دو چار مقامات پر ہولناک فرقہ وارانہ فساد نہ ہوتے ہوں اور ان میں شدید جانی نقصان نہ ہوتا ہو کیونکہ دونوں فریق پوری طرح تیار تھے اور برطانوی پالیسی کے مطابق پولیس غیر جانبدار رہتی تھی لیکن ان دنوں فسادات زیادہ تر سڑکوں پر ہوتے تھے یا اکا دکا حملوں کی صورت میں آگ لگانے، مردوں، عورتوں، بچوں کو زندہ جلانے اور عصمت دری کرنے کا رواج عام نہیں ہوا تھا۔ یہ وحشت تقسیم کے وقت کے فسادات کے وقت سے شروع ہوئی اور روبہ ترقی ہی نہیں بلکہ اب تو پولیس والے بھی باقاعدہ ایک فریق کا ساتھ دینے اور گھروں کے اندر بیٹھے ہوئے عورتوں، بچوں کو ہلاک کرنے سے بھی نہیں چوکتے ہیں۔ انگریزوں کے زمانے میں فسادیوں کو گرفتار کر کے ان پر مقدمات بھی چلائے جاتے تھے اور سزا بھی ہو جاتی تھی۔ اب یہ رواج بھی برائے نام ہی رہ گیا ہے۔ آزادی سے پہلے مسلمانوں کو اشتعال دلا کر تباہ کن فساد شروع کرنے کا رواج زور پکڑ گیا تھا۔ اور مسلمان بھی جوابی اشتعال انگیزی میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے تھے۔ ملک تیزی سے تباہی کے غار کی طرف جا رہا تھا۔ امن و صلح کی بات کرنے والا کوئی نہ تھا۔ سب ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانے میں لگے ہوئے تھے۔
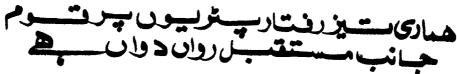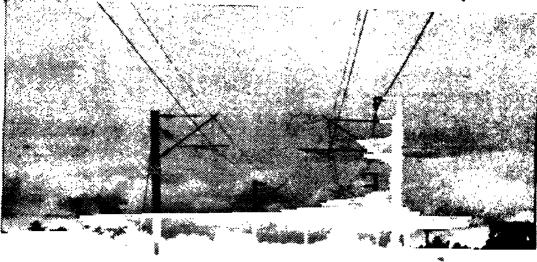
ہمارے محکمۂ ریلوے کے مرد اور عورتیں رات اور دن گرمی میں، سردی
میں اور بارش میں باہم کام میں جٹے ہوئے ہیں تاکہ آپ
کا سفر سہل اور محفوظ ہو اور سماجی استحکام اور ترقی کے
لئے کوئلہ، سیمنٹ، تیل، غلہ و اناج اور دیگر اشیاء لے
کر چلنے والی مال بردار ٹرینوں کی آمد و رفت
جاری رہے۔

Eastern Railway

قوم کی خدمت میں

بیچاری اردو

گلزار

Bokiyana

Pali Hill, Bandra

Bombay - 400050

چاولہ صاحب کے ہاں جب بھی کوئی خاص مہمان آتے یا دو چار دفتر کے اچھے عہدے دار آجاتے تو وہ مرزا اختر کو ضرور بلالیا کرتے تھے۔

وجہ یہ نہیں تھی کہ مرزا صاحب ایک بہت بڑے عہدہ دار ہیں کارپوریشن میں بلکہ اس لئے کہ ایک تو دوست ہیں اور پھر پڑوسی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے رہنے سے ادب اور اخلاق کی دھونس پڑتی ہے، چاولہ صاحب کے مہمانوں پر۔ مرزا صاحب کے بات کرنے کا ڈھنگ ہی کمال ہے اور اس پر ان کی اردو زبان! پھر بیچ بیچ میں وہ جو شعر پڑھ دیتے ہیں تو لگتا ہے کہ چاولہ صاحب کا حلقہ بڑے اونچے درجے کے لوگوں کا حلقہ ہے۔ اور جب چاولہ صاحب مرزا صاحب کے شعر پر بے ساختہ اٹھ کر داد دیتے تھے تو لوگ سمجھتے کہ وہ بھی بڑے قابل اور باذوق شخص ہیں۔

اگلے دن پی جے، راج بہل سے کہہ رہا تھا

"تم نے دیکھا چاولہ صاحب کیا اردو بول رہے تھے مرزا بھائی کے ساتھ؟"

"سنا ہے چاولہ لکھنو میں بہت رہے ہیں پانچ چھ سال تو "سلاسل" اسی علاقے میں پوسٹنگ ہوتی رہی ان کی؟"

"واہ! تم بھی کم نہیں ہو راج بھائی۔ کیا سلاسل بولا ہے رات تم بھی تو بڑے بڑے ورڈ چن چن کے استعمال کر رہے تھے؟"

بہل نے مرزا صاحب کے انداز میں آداب عرض کیا۔ پی جے بولا:

"ایک تم ہی تھے جو ان کی اردو کے سامنے ڈٹے رہے۔ یوں دفتر میں تو کبھی نہیں سنا تمہیں، اس طرح بات کرتے۔

"بھئی یوں ہے کہ کوئی اردو بولنے والا بیٹھا ہو تو پھر ذرا سوچ سمجھ کر ہی بولنا پڑتا ہے رات سبھی سوچ سوچ کر بول رہے تھے۔

جیسے ہی مرزا صاحب آکر بیٹھے چاولہ صاحب نے پوچھا

"مرزا صاحب آپ کو کیا پیش کروں؟"

"جو معزز صاحبان لے رہے ہیں۔ ہم بھی وہی لے لیں گے"۔

راج بہل ان کے لفظ معزز صاحبان سے غوطہ کھاگئے۔ ابھرے تو ایک مشکل سا لفظ کالج کے زمانے سے نکال کر لائے:

"مرزا صاحب ہر طرح کی شراب کہنہ حاضر ہے۔ جن بھی ہے رم بھی ہے اور......"

وسکی کہتے ہوئے رک گئے۔ انہیں لگا وہ انگریزی کا لفظ ہے۔ کہیں بات کو کرکرا نہ کردے۔ اس لئے سوچ کر بولے:

"اور یہ شراب دو آتشہ! ہم تو وہی نوش فرمارہے ہیں۔"

"جی میں بھی وہی پی لوں گا"۔

مرزا صاحب کو سمجھ تو آگئی کہ اردو کی "تیلی" لگ گئی ہے، اب آگ مشکل ہی سے بجھے گی۔ اردو زبان کا یہ رد عمل وہ بہت بار دیکھ چکے تھے۔ خوامخواہ ان کی موجودگی میں لوگ اردو کے بولڈرز (Boulders) لڑھکانے لگتے تھے۔ شاید ان کے لہجے کی وجہ سے۔ اور یہ رد عمل صرف چاولہ صاحب کے ہی ہیں۔ بہت جگہ دیکھ چکے تھے کہ ایک اردو بولنے والے صاحب آکر بیٹھ جائیں تو سب کی زبان بدلنے لگتی ہے۔ خاص طور پر یہاں یوپی اور پنجاب والے مل جائیں اور کہیں آپ نے شعر پڑھ دیا تو پھر خیر نہیں۔ اتنے کنکر ڈھیلے جواب میں ملیں گے کہ پوچھئے نہیں۔ فلمی گانوں سے، قوالیوں سے اور جانے کہاں کہاں سے اٹھائے ہوئے شعر سننے پڑیں گے۔ موقع پر ہوں، تب بھی برداشت کرلے آدمی۔ ایک تو بے موقع۔ اوپر سے جگہ جگہ سے ٹوٹے ہوئے، چٹخے ہوئے، اور کوئی کوئی تو ایسا کہ لگے مربع کے مرتبان سے ڈنڈی ڈال کے اٹھایا گیا ہے، پنجابی اکثر اسے "چوندا چوندا" شعر کہتے ہیں۔

جب باقی لوگوں پر اردو اترنے لگی تو مرزا صاحب چپ سے ہوگئے۔ سوچنے لگے کہ وہ کچھ بولے تو اردو اور بھڑکے گی۔ لیکن بہل صاحب کو پتہ نہیں، کہاں سے ہوا لگ رہی تھی۔

"مرزا صاحب آج بڑے خاموش پسند ہیں۔ یا ہمیشہ ہی کم گو رہتے ہیں"۔ مرزا صاحب مسکرا دیئے۔ بہل صاحب کھلتے جا رہے تھے۔

"آپ ہمارے عنقریب آکر بیٹھئے نا بہت دور بیٹھے ہیں۔"

"جی۔ میں۔ یہاں بڑے آرم سے ہوں" چاولہ بولے:

" کرسی آگے کر لیجئے اختر صاحب ۔ آج
خوب نبھے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دوچار
!"

مرزا صاحب نے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو
چاولہ کچھے شعر پہ داد ملی ہے ۔ جھک کے
آداب، آداب بجالائے ۔

راج بہل کو شہہ مل گئی ۔ غالب
صاحب نے عرض کیا ہے ۔

" شراب نہیں ہے تو ساقی نظر ملا کے
پلا ۔!"

بے اختیار مرزا صاحب کے منہ سے
نکلا " بیچارا غالب!"

ایک زور دار قہقہہ پڑا ۔ مرزا
صاحب کے سامنے ایک ہتھیلی بڑھ آئی ۔
" دے تالی " کے لئے ۔

پی جے ، جو بہل کے ساتھ آئے تھے ،
انہیں بھی مزا آگیا ۔

" کیا بات فرما دی مرزا صاحب ۔
بیچارا غالب !! رئیل تو ملی نہیں نظر سے ہی
سکاچ پی گیا ۔ واہ مرزا صاحب پی جے ، ساری
شام بس اسی بات پر جھومتا رہا ۔ اور جب
دوہرانے کی کوشش کی تو بھی کہا ۔

" سکاچ نہیں ہے تو ساقی نظر ملا کے
پلا ۔ واہ ، چاولہ نے شعر صحیح کرنے کی کوشش
کی ۔

" اوئے ، پی جے ۔ سکاچ نہیں ،
شراب ، شراب"

ہاں وہی ۔ وہسکی نہیں ہے تو نظر سے
ملا کے پلادے ! واہ مرزا صاحب ! کیا بات کہی
بہل بھائی نے ! ہم تو اردو نہیں ہوں ۔ لیکن
اردو لوگوں کے ساتھ بہت رہا دہائی میں ۔
اسلم خان ، دبیر خان ، ہمارے دوست تھے ۔
لیکن آپ جیسے میزبان لوگوں میں بیٹھ کے
ہمارا بھی نزدیک کھل گیا!"

نزدیک کہتے ہوئے اس نے ماتھا
چھوا اور " نصیب " کے معنی سمجھائے ۔ پی جے ،
کے لئے تو بس ایک ہی شعر کافی تھا ۔ لیکن مرزا
صاحب پر بہت ڈھیلے پڑے ۔ تین چار پیگ
کے بعد بہل تو بالکل ہی لکھنوی ہوگئے تھے ۔
سب کو " میاں میاں " کہہ کر بلانے لگے ۔ اور
ایسے اترا رہے تھے اپنی اردو پر کہ دونوں
پاؤں صوفے پر اٹھ گئے تھے ۔ اور بازو صوفے
کی پشت پر پھیل گئے ۔ لگتا تھا کسی مسند پر
بیٹھے ہیں ۔ اردو میں یہ بھی ایک خوبی ہے کہ
بولتے بولتے ہی انسان کو نواب بنا دیتی ہے ۔
اور بہل کی اردو تو بس " قطب مینار " کی
بلندیاں چھو رہی تھی ۔ بے وجہ کسی بات پر
بھی ہاتھ کی انگلیاں جوڑ کے ماتھے سے چھوا کے ،
آداب ، آداب کہنے لگتے ۔ مرزا صاحب کو متاثر
کرنے کے لئے اردو کے بڑے بڑے لفظ
ڈھونڈ ڈھونڈ کر تیز سے تیز تر " بولنگ "
کر رہے تھے

دونوں ہاتھوں سے چیر کے تندوری
مرغ کی ٹانگ کھینچی اور دانتوں میں لیتے
ہوئے بولے:

" میاں چاولہ ، یہ تندوری مرغا بڑا
مضالقہ بنا ہے بھئی ۔"

مرغ کی ٹانگ کھینچتے ہوئے وہ اردو
بول رہے تھے ۔ اور مرزا بیچارے یہ محسوس
کر رہے تھے کہ مرغ نہیں ، ان کے دانتوں
میں بے چاری اردو پھنس گئی ہے ۔ جس کی
بڑی بے رحمی سے ، وہ ٹانگ کھینچ رہے ہیں ۔
راج بہل نے کہا:

" مرزا صاحب دلی کے اردو بازار
میں ایک نانبائی کے ہاں ایک بار مرغا مسلم
کھایا تھا ۔ کیا بات ہے صاحب........"

مرزا صاحب نے حیرت سے دیکھا ۔
شاید غلطی سے کہہ گئے ہوں ۔ لیکن بہل نے
دوہرایا ۔

" ایک وہ مرغا مسلم تھا اور ایک آج
کھایا ہے" ۔

مرزا صاحب طیش میں آگئے ۔

"جی ہاں ! اور آپ کی اردو مسلم کے
سامنے تو آج کا یہ مرغ مسلم بھی کوئی چیز نہیں ۔
آپ نے تو ٹانگ ہی توڑ کے رکھ دی!"

وہ کھڑے ہوگئے ۔ مرزا صاحب نے
فیصلہ کر لیا کہ وہ گھر بدل لیں گے ۔ اور چاولہ
چاہے کتنے بھی اچھے انسان کیوں نہ ہوں ۔ پھر
ان کے ہاں کبھی نہیں آئیں گے ------
---- اور آئے بھی تو اردو نہیں بولیں گے
!!

یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟
اپنے تاثرات ہمیں جلد لکھ بھیجیں
آئندہ آپ کیا تبدیلیاں چاہتے ہیں
یہ بھی لکھیں

(ادارہ)

لباس

میرے کپڑوں میں ٹنگا تیرا ایسہ ریدہ لباس

گھر پہ دھوتا ہوں میں ہر بار اُسے اور سکھا کر پھر سے

اپنے ہاتھوں سے اسے استری کرتا ہوں مگر

استری کرنے سے جاتی نہیں شکنیں اس کی

اور دھونے سے گلے شکووں کے چکتے نہیں مٹتے

رشتے گر صرف لباس ہوتے

بدل لیتے انہیں

زندگی کتنی سہل

جینے میں تب کتنی سہولت ہوتی!

گلزار

گرمیوں کی چھٹی میں

بزرگوں کے کمرے سے ہوتا ہوا
سیڑھیوں سے گذر کے
دبے پاؤں چھت پہ تمہاری چلا آیا تھا میں
میں آیا تھا تم کو جگانے، چلو بھاگ جائیں
اندھیرا ہے اور سارا گھر سو رہا ہے
یہی موقع ہے، صبح کی پہلی گاڑی کا وقت
ہو رہا ہے
ابھی پچھلی منزل سے چھوٹی نہیں ہے
وہاں سے چھٹے گی تو گارڈ ایک لمبی
بجائے گا سیٹی
اسی منہ اندھیرے میں گاؤں کے ٹی ٹی سے
چہرہ چھپائے
دو ستاتوں کی بکل لگائے
نکل جائیں گے ہم!

مگر تم بڑی میٹھی سی نیند میں سو رہی تھیں
دبی سی ہنسی تھی لبوں کے کناروں پہ مہکی ہوئی
گلے کا اک ادھڑا ہوا تاگا، کرتی سے نکلا ہوا
سانس چھو چھو کے
بس کپکپاتے چلا جا رہا تھا
طرب ہلکی ہلکی سی سانسوں کی بجتی ہوئی
ہوا جیسے سنتور کے تار پر

پیر رکھ کے پھسلتی ہوئی
میڑھ لیتی ہوئی
بہت دیر تک اپنے ہونٹوں کو آنکھوں
پہ رکھ کے، تمہارے کسی خواب کو
پیار کرتا رہا میں ـــــ
نہیں جاگیں تم ـــــ اور میری جگانے
کی ہمت نہیں ہو سکی ـ
لوٹ آیا ـــــ

بزرگوں کے کمرے سے ہوتا ہوا
سیڑھیوں سے اتر کے!
مجھے کیا پتہ تھا کہ ماموں کے گھر سے
اسی روز وہ تم کو لے جائیں گے ـ!

زندگی ایک الگ موڑ مڑ جائے گی!!

گلزار

آصفہ نشاط
P.O Box : 713
HOLLYWOOD CA 90078 (U.S.A.)

ہاں تو خالہ بی سچ سچ بتائے ناکہ خالو میاں نے آپ کو پہلی بار دیکھا تو کیا کہا تھا۔ عثمان نے ہزاروں دفعہ کا پوچھا ہوا سوال دھرایا تو سب کے چہروں پر مسکراہٹ آگئی۔ دراصل خالہ کے چہرے پر پھیلی ہوئی معصوم سی جھلاہٹ سب کو پسند تھی۔ ان دنوں سب طرح طرح کی مصروفیتوں میں جتے ہوئے تھے۔ اور سب کو گویا بوکھلاہٹ ہوگئی تھی۔ یہ چھوت کی بیماری میری اماں سے اڑ کر لگی تھی۔ جنہوں نے فرض کرلیا تھا کہ مہمانوں کے سامنے تھو تھو ہوجائے گی۔ میری چڑ تھی کہ ہمارے گھر میں ہر کام اعلان کرکے ہوتا تھا۔ ہاں بھئی وہ ذرا مہمانوں کی لسٹ تو لانا! ہاں بھئی وہ سامان کی لسٹ کہاں ہے۔ اس "ہاں بھئی" "وہ ذرا" سے میری جان جاتی تھی۔ ایسا کیوں نہیں ہوسکتا تھا کہ سب کچھ نہ کچھ کرلیں اور اسی ہنگامی صورت حال میں کام ختم ہوجائے۔ اماں نے تین کمروں کے ٹھٹلے سے مکان میں اپنا بچے سازی کا شوق بھی پورا کر رکھا تھا۔ اور سات دم پال پوس کر ٹھکانے لگادیئے تھے۔ اور کونے میں رنگین چڑیوں کا پنجرا اور بولنے والا طوطا الگ ٹانگ رکھا تھا۔ اب مسئلہ تھا کہ ذکیہ آپی کی شادی کا۔ خدا کی پناہ ہر دو منٹ کے بعد لسٹ کی دہائی مچنے لگتی تھی۔ پھر ایسے بھی بہت سے کام تھے جو کسی لسٹ میں درج نہیں تھے

چپ چپ کے موقع نکالنے کے کام۔

چپ چپ کے موقع فراہم کرنے کے کام۔ اس آنکھ مچولی میں عجب بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اس کا توڑ یہ نکالا کہ ساری چنڈال چوکڑی میں ٹائم ٹیبل بانٹ دیا جائے۔ بہت سے لوگ مشروبات پہنچانے، تصویریں کھینچنے، پان چھالیہ اور دیگر الابلا پہنچانے کے بہانے اپنے اپنے پسندیدہ مقامات پر نشانے لگارہے تھے۔ اور اچھا خاصا ڈھنگ سے کام ہورہا تھا۔ کہ عفت نے اماں سے جڑدیا کہ لڑکوں کو میری وجہ سے ڈھیل ملی ہوئی ہے۔ پھر تو اللہ دے اور بندہ لے۔ تاکا جھانکی کی دوسروں نے، پھٹکار مجھے پڑی۔ کیا میں نے لڑکوں میں عشق کے سرٹیفکیٹ بانٹنے تھے؟ پر اماں کو کون سمجھاتا۔

فون کی گھنٹی بجی تو خیالات کا سلسلہ اچانک ہی ٹوٹ گیا۔ یادیں بھی کیسی ظالم ہوتی ہیں۔ بیس سال پرانی باتیں کہاں اور یہ فضول سی مشینی زندگی کہاں۔ فون لیری (LARRY) کا تھا۔ میرا کو ورکر (CO-WORKER) اس کی قومیت ہنگری کی تھی۔ اس کی زبردست حس مزاح اور پاکستان کے بارے میں غضب کی معلومات ہماری دوستی کا باعث تھیں۔ لیری دراصل تاریخ کا طالب علم تھا۔ خدا جانے کمپیوٹر پر کیوں مہربان ہوگیا تھا۔ ابھی کال ختم نہیں ہوئی تھی کہ مارسی (MARCEY) آگئی۔ حسب معمول ہاتھ میں نفیس گلاس اور گلاس میں کوئی ایسا مشروب جس کی اس کو عرصے سے عادت تھی۔ مارسی امریکہ آتے ہی مجھے اتفاقاً میسر آگئی تھی۔ جس دوستی کی ابتداء ضرورتاً ہوئی تھی وہ رفتہ رفتہ بڑھتی چلی گئی۔ مجھے لگتا تھا کہ میں اس سے مرعوب ہوتی چلی جارہی ہوں۔ کسی بھی مذہب پر یقین نہ ہونے کے باوجود مارسی میں غضب کا اعتماد تھا۔ وہ جب کبھی کچھ کہتی بالکل سچ سچ بلکہ خطرناک حد تک سچ۔ میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ خدا پر اتنا یقین ہونے کے باوجود

میرے اندر یہ خوف اور مایوسی کیوں ہے۔ دوسروں کی مدد کرنے میں تو مارسی کا جواب ہی نہیں تھا۔ اور کسی کا عیب یا جرم تو اسے نظر ہی نہیں آتا تھا۔ شہد کی مکھی کی طرح جو کبھی گندگی پر نہیں بیٹھتی۔ بس پھولوں کا رس چوستا اور شہد کا چھتہ بنانا جانتی ہے۔ وہ سارے نسوانی کام جو میرے حلقہ احباب کی ہر خاتون کا خاصہ تھے مارسی ان سے یکسر محروم تھی۔ آج اس کی آمد کا سبب بھی میری مدد کرنا تھا۔ کیونکہ ابا ایک دن پہلے پاکستان سے پہنچے تھے اور میں نے ایک چھوٹی سی Get to gether رکھ لی تھی۔ میری خوشی پر خوف بھی غالب تھا۔ کیونکہ ابا خاندان کے سب سے بڑے سب سے لاڈلے سب سے زیادہ کماؤ پوت تھے۔ لہذا سب سے زیادہ بولنے کا حق بھی انہیں کا تھا۔ یہ تو حسرت ہی رہی کہ کبھی ابا خاموش ہو جائیں۔ برداشت کر لیں یا نظر انداز کر دیں۔ ان کے وجود سے مشورے خشک پتوں کی طرح جھڑتے رہتے تھے۔ جنہیں کوئی اٹھاتا بھی نہیں۔ کہیں انہوں نے نفس کی تربیت، خاندان اور خون کا حوالہ، کلچر اور مذہب کی بحث چھیڑ دی یا تاریخ اور معاشیات کا پٹھالے لیا تو مشکل ہو جائے گی۔ عثمان کے کئی دوست گورے تھے۔ عثمان نے مشکل سے یہ مقام بنایا تھا۔ بچے اردو بھول چکے تھے کسی بچے کا قرآن تک ختم نہیں ہوا تھا۔ اور نہ ہی عرصہ تک ایسا کوئی امکان تھا۔ گھر میں ہر وقت بھاگ دوڑ مچی رہتی اور موضوع گفتگو بھی زیادہ تر حجاب اور حجاب کی سیاست کے گرد گھومتا تھا۔ میں یہ سوچ سوچ کر پریشان تھی کہ ابا جب یہ سب باتیں اماں سے جڑیں گے تو وہ تو دودھ بھی نہیں بخشیں گی۔ مارسی کا کفایت شعارانہ لباس ابا ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ لیری کی کوئی کال نہیں آپائے گی اور بیشتر کنواروں کے ساتھ جو گرل فرینڈز تھیں تو کیوں تھیں۔ یہ بات ابا کو کبھی ہضم نہیں ہوگی۔

یا اللہ میں کیا کروں یا اللہ کیا ہو گا؟

یا اللہ میری یہ چھوٹی سی پارٹی خیر خیریت سے گزر جائے۔ ابا بعد میں میرا جو حشر کریں گے، دیکھا جائے گا۔ وہ سب جوابات میرے دماغ میں آرہے تھے جو ابا کے سوالوں کے نتیجہ میں مجھے دینا تھے۔ بہرحال یہ تو طے ہے کہ اعتراف شکست مشکل تھا۔ اور یہ کہنے کا فائدہ بھی کیا ہے کہ ہم انتخاب کا رستہ کھو چکے ہیں۔ بس یہ سمجھ لیں کہ سب کچھ ہم نے بہتر سمجھ کر اپنایا ہے۔ پھر بھی میں نے کمرے کو حتی الوسع مشرف بااسلام کر لیا تھا۔ کرسمس کے ڈیکوریشن ہٹا کر مسجد کا طغرہ لٹکا لیا تھا مگر پھر بھی جل تو جلال تو کا ورد لاشعوری طور پر جاری تھا۔ پارٹی رات کو دو بجے ختم ہوئی۔ لڑکوں نے جلدی جلدی میزیں وغیرہ سمیٹ دی تھیں۔ بچا ہوا کھانا رکھوانے کے لئے میں نے دوسرا فرج اوپر والے بیڈ روم کے برابر کے کونے میں رکھوا دیا تھا۔ سوچا سونے سے پہلے دیکھ لوں کہ اتنا سارا کھانا خراب نہ ہو جائے۔ آخری سیڑھی پر پہنچی تو جل تو جلال تو کا ورد خود بخود رک گیا۔ میرے سارے اندیشے ختم ہو گئے۔ مجھے یقین سا ہو چلا کہ اب ابا کے سارے لیکچر خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ کیونکہ انہوں نے امریکی سوسائٹی کا سب سے مثبت پہلو منتخب کر لیا تھا۔ مارسی ان کو بہت مکمل کمپنی دے رہی تھی۔ ابا کے چہرے پر متفق ہونے کی تسلی پھیلی ہوئی تھی اور ان کے بشرے سے ظاہر تھا کہ مسلمان ہو تو ہو اسلام خطرے میں نہیں۔

ہر قدم کا رہنما........
آرام کی سچّی پہچان
6 ماہ کی گارنٹی
ہماری دوسری پیش کش:
• جنتا فوم
• جنتا ہوائی
JRI
رنگ میں بھی دستیاب ہے
تیار کردہ:
جنتا ربر انڈسٹریز
کلکتہ - ۷۰۰۰۴۶
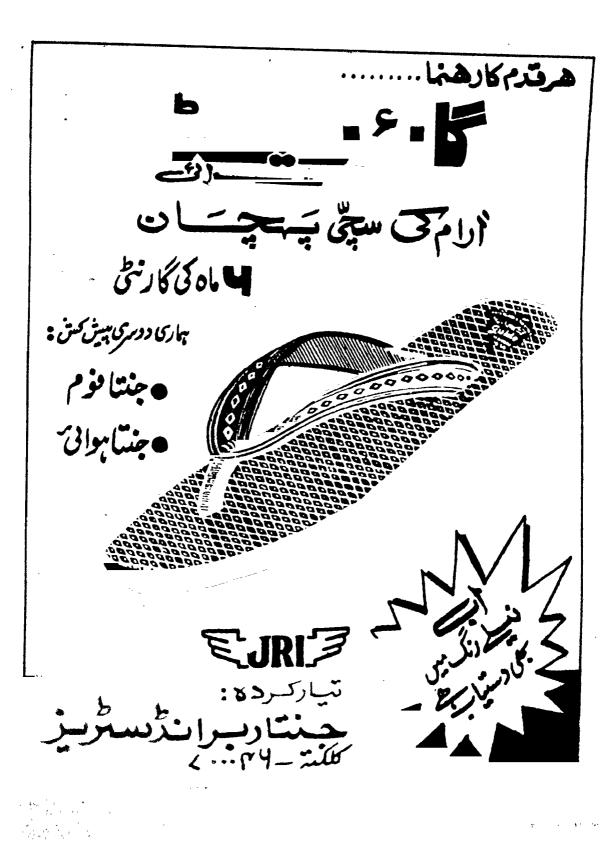
ساتھ ساتھ

جوگندر پال
۲۰۴ - مندا کنی انکلیو، نئی دہلی - ۱۱۰۰۱۹

جوگندر پال

لاہور محض ایک شہر نہیں، ایک پوری تہذیب کا بھی نام ہے - اس تہذیب کی باشندگی کسی لاہوری کو اپنے دل و دماغ میں بھی ویسے ہی محسوس ہوتی ہے جیسے لاہور کی جغرافیائی حدود میں - مجھے اپنا سونا پنجاب چھوڑے ایک مدت ہوئی ہے اور آج کل میں یہاں دلی میں قیام پذیر ہوں اور لاہور یہاں سے کوئی خواب بھر رات کے فاصلے سے دور نہیں، اس لئے سرحدوں پر نصب شدہ توپ و تفنگ کے باوجود میں جب چاہتا ہوں یہاں سے بے روک ٹوک وہاں جا پہنچتا ہوں - خدا کا شکر ہے کہ خوابوں میں، ہم گولیوں کی بوچھار میں سے بے گزند گزر جاتے ہیں، ورنہ اب تک میری انگنت موتیں واقع ہو چکی ہوتیں -

میں تو ہوں ہی ادھر کا، اور پنجاب کے پانچوں دریا ہر برسات میں میرے دل و دماغ میں چڑھ آتے ہیں، مگر مولانا تاجور جیسے بے لاگ پوربی علامہ کا جب شاید چوتھی دہائی میں ایک بے خیالی میں پان چباتے ہوئے ادھر گزر ہوا تو وہ سدا کے لئے لاہور کے ہی ہو کے رہ گئے - یہ دیکھ کر تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ ہی نہ رہا کہ ہر شخص یہاں اپنی پنجابی میں صرف اردو بولتا ہے - انہوں نے ٹھان لی کہ باقی عمر اب وہ پنجابیوں کا شین کاف درست کرنے میں بتا دیں گے - مگر انہیں کیا پتہ تھا کہ پنجابی اپنی زبان میں ہی اردو نہ بولے تو اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا بول رہا ہے - سو چند سال میں ہی سر عاشق حسین بٹالوی ان ہی کے پنجابی قبیلے کے لکھنے والوں سے "تربیت پاکر" مولانا ان ہی کے مانند بولنا سیکھ گئے اور جب سیکھ کر سدھ گئے تو لاہوریوں نے بخوشی انہیں اردو کا بہترین استاد تسلیم کر لیا - مولانا کے شاگرد ایک دوسرے کو بڑے فخر سے بتایا کرتے کہ ہمارے مولانا اگرچہ ہندوستانی ہیں، پھر بھی کوئی ان جیسی زبان بول کے تو دکھائے - ہر چند کہ پنجابی ہندوستان زندہ باد کا نعرہ سب سے بلند آواز میں لگاتا تھا، پھر بھی ہندوستانی وہ اسے کہا کرتا تھا جو پنجاب سے باہر کہیں رہتا ہو - اس کے نزدیک پنجابی صرف پنجابی تھا (پنجابی کا جو سہولتی مطلب آپ کی سمجھ میں آجائے) اور لاہوری صرف لاہوری - پنجاب بھر میں لوگ کہا کرتے تھے، جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوا - مجھے یاد ہے اپنے کالج کے ایک بھوندو دوست سے میں کہا کرتا تھا، اتنے بڑے ہو گئے ہو مگر ابھی تک پیدا ہی نہیں ہوئے -

"مگر میں نے تو لاہور دیکھ رکھا ہے" - میرا دوست سند پیش کرتا -

"تو تم نے اسے میری نظر سے دیکھا ہو گا" -

"مجھے ہیرا منڈی کا راستہ ہی معلوم نہیں، پھر میری نظر سے کیسے دیکھا ہو گا؟"

مگر ایشیاء کے اس سب سے بڑے چکلے ہیرا منڈی کے باعث ہی لاہور یکتائے عالم نہ تھا - اس شہر کی نہایت گنجان آبادی میں بڑے پارسا اشخاص بھی اس مانند رہ رہے تھے جیسے کسی گھنے جنگل کی جھاڑیوں میں باریش درویش نما بڑ کے درخت - جن درختوں کے ڈاڑھیاں نہ تھیں ان کے سروں کے عین درمیان بڑی موٹی چوٹیاں ہوتی تھیں اور جب کبھی وہ وجد میں آکر سر ہلانے لگتے تو کئی پرندے ان چوٹیوں میں بنائے گھونسلوں سے پھدک کر باہر آجاتے اور آس پاس ٹہنیوں پر پہنچ جا کر بڑے شوق سے چوٹیوں اور ڈاڑھیوں کے مابین مناظروں کا انتظار کرنے لگتے جو ایک بار شروع ہو جاتے تو پرندے اور سب کچھ بھول کر انہیں ہی سنتے چلے جاتے -

لاہور کے ان مناظروں کی شہ سرخیوں میں مذہب کے علاوہ سیاست بھی شامل تھی، بلکہ سیاست مذہب سے بھی زیادہ شامل تھی یا پھر مذہب ہی اپنی سیاسی اہمیت کے باعث پیش پیش تھا - مجلس احرار

اسلام کے عطاء اللہ شاہ بخاری جب اپنی تقریر کے لئے لاہور سے آیا کرتے تھے تو کوا کے کی سردی میں سارا سیالکوٹ رام تلائی میں سمٹ آتا تھا ۔ کیا ہندو کیا مسلمان ، سبھی رات کے کھانے سے سرشام فارغ ہو کر کمبلوں میں پاؤ پاؤ بھر کی پوٹلی سنبھالے پسند کی جگہ پر قابض ہو کے شاہ صاحب کی آمد کا انتظار شروع کر دیتے تھے ۔ تلاوت کے بعد شاہ صاحب اپنی تقریر شروع کرنے سے پہلے چند لمحے بڑی متین خاموشی سے ڈھیروں حاضرین کا جائزہ لیتے ۔ پھر یہ دیکھ کر مسکرانے لگتے کہ پوری رام تلائی بھر چکی ہے پھر بھی انبوہ کے انبوہ چلے آرہے ہیں ۔ اسی دوران اچانک کوئی منچلا انتظامیہ کے مائیکروفون پر گلا پھاڑ کر نعرہ تکبیر بلند کرتا اور ہم سب بیک دل و صدا اپنے آپ کو اللہ کے سب سے بڑا ہونے کا یقین دلاتے اور پھر عطا اللہ شاہ بخاری کی آواز رقص کرنے کے انداز میں ان کے منہ سے برآمد ہونے لگتی ۔ سنتے تو ہم سبھوں کو ہیں ، مگر شاہ صاحب کا یہ تھا کہ ہم گویا ان کی آواز پر بھارت ناٹیم دیکھ رہے ہوتے ۔ جولیس سیزر کے روما کے عہد کے مانند لاہور میں بھی ایک سے ایک بڑھ کر مقررین تھے مگر شاہ صاحب کی آب و تاب کچھ ایسی تھی جیسی ستاروں کے جھرمٹ میں مارک انتھنی کی ۔

پنجاب کے سیاسی بازاروں کی سرگرمی کا ایک بڑا سبب لاہور کے اخبارات بھی تھے ۔ اگر آپ کے نزدیک "تقریر کے ہندسوں" کا استعمال ناروا نہ ہو تو کہا جاتا ہے لاہور میں لتنے ہی اخبارات تھے جتنے وہاں کے لوگ ۔ اس کا سیدھا مطلب تو یہ ہوا کہ ہر لاہوری ایک جیتا جاگتا اخبار تھا اور اس نے اپنی زندگی کی ساری سرخیاں جلی حروف میں اپنی پیشانی پر لکھ رکھی تھیں جنھیں کوئی پڑھنا چاہتا تو وہ اس کے مطالعہ کے لئے خود ہی اپنی پیشانی کے ورق پلٹتا چلا جاتا اور قاری دیکھتے ہی دیکھتے اسے سارے کا سارا فرفر پڑھ لیتا ۔ مگر اسی بیان کا ایک اور مطلب بھی ہے : لاہور کے کسی ایک علاقے میں اگر ایک لیتھو پریس ہوتا تو اس کے گرد و پیش کوئی پندرہ بیس سے کم روزنامے نہ ہوتے جو پچیس پچیس سو کی تعداد میں شائع ہوتے ۔ ان دنوں جائنٹ فیملی سسٹم کا رواج تھا اس لئے میرا خیال ہے جو روزنامے پچیس تک ہی چھپتے وہ کسی ایک ہی کنبے کے افراد اسپیشل قیمت پر خرید لیتے ہوں گے ، تاکہ گھر کا آدمی مزے سے دھندے پر لگا رہے ۔ ان کے علاوہ کئی بڑے اخبار نکلتے تھے ۔ پرتاپ ، ملاپ ، ویر بھارت ، گورو گھنٹال ، زمیندار اور مزید کئی ۔ کوئی کانگریس کا بہی خواہ ، کوئی مسلم لیگ کا ، کوئی ہندو مہا سبھا کا اور کوئی اپنے آپ کا...... نہیں ، یہ اخبار خبروں کے لئے کون پڑھتا تھا ؟ ان کی آپسی نوک جھونک انار کلی کے گول گپوں سے بھی زیادہ تیکھی تھی ، چنانچہ گول گپوں کی بجائے یہی کیوں نہ لیتے ؟ ایک دو ہندی اور دو چار انگریزی کے اخبارات چھوڑ کر سب کے سب لیتھو پر اردو میں ہی نکلتے تھے ، یہاں تک کہ بعض ہندو جماعتوں کو ہندی اور ہندومت کی تبلیغ کے لئے بھی اردو کا سہارا لئے بغیر چارہ نہ تھا ۔ تبلیغ کی اس مہم سے پیدا شدہ ساری لڑائیاں ایک ہی زبان ۔ صرف اردو ۔ میں ہونے کے باعث راست اور کھلم کھلا ہوتیں جس سے دونوں صفوں کے متعلقین کے تمام تر اختلافات کے باوصف ان کی ایک ہی معاشرے سے وابستگی پر باور کر پانا آسان ہو جاتا ۔ اس تعلق سے ہندو صحافت کے مہاشہ کرشن اور مسلم صحافت کے عبدالمجید سالک اپنے اخباروں میں بالترتیب ہندی اور فارسی میں اردو لکھ کر ہر روز اپنی صف آرا نوک جھونک کا اہتمام کرتے اور ان کا توسیعی مکالمہ صحافتی صفوں کے باہر فون پر بے تکلف قہقہوں میں انجام پاتا ۔

اردو ادب کا معاملہ یہ تھا کہ کوئی ادیب برصغیر میں کہیں بھی لکھ رہا ہوتا ، وسیع تر ادبی دنیا میں اس کا داخلہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک وہ لاہور کے مولانا صلاح الدین کے "ادبی دنیا" میاں بشیر احمد کے "ہمایوں" اولین دور میں احمد ندیم قاسمی اور دور ثانی میں محمد طفیل کے "نقوش" چودھری برکت علی کے "ادب لطیف" حکیم یوسف حسن کے "نیرنگ خیال" یا مولانا تاجور کے "شاہکار" میں شائع نہ ہو پاتا ۔ سوال صرف اعلیٰ تر ادبی معیار کا ہی نہیں ، عام اردو قارئین کا مقبول ترین ماہنامہ "بیسویں صدی" اور جہاز سائز کا محبوب فلمی اور ادبی ہفتہ وار "چترا" بھی لاہور ہی سے شائع ہوتا تھا ۔ آج کے لسانی اور تہذیبی ماہرین کے لئے یہ امر کسی عجوبے سے کم نہیں کہ غیر منقسم ہندوستان میں اردو دانوں کی سب سے بڑی تعداد ایک ایسے علاقے میں آباد تھی جہاں کے باشندے پنجابی بولتے تھے ، انگریزی کے ذریعے کمائی کرتے تھے اور اپنی نجی محبت یا نفرت کی چٹھیاں صرف اردو میں لکھتے تھے ۔ یہ تو عام آدمی کی بات ہوئی ۔ اس زمانے کے اردو ادیبوں کا یہ ہے کہ جب ایک دوسرے کی تحریروں پر بول بول کر آپسی بحثیں کرتے تھے تو بڑی پھکڑ پنجابی میں ، اور اگر کوئی روانی میں اردو بولنے لگتا تو سب کے کان کھڑے ہو جاتے ۔ کیا بات ہے ؟ جھوٹ بول رہا ہے یا یار کا بلڈ پریشر چڑھا ہوا ہے ؟

لاہور میں ان دنوں اردو ادباء کی ایک پوری برات اتری ہوئی تھی اور اس شہر کی طلسمی بھبن برائیوں کے دل میں کچھ یوں گھر کر گئی تھی کہ وہ لپنے گھر بار فراموش کر کے یہیں کے ہو رہے - لہذا وہ دن جب ذہن میں اترنے لگتے ہیں تو کرشن چندر، منٹو، بیدی، اشک، میرزا ادیب، قاسمی، میراجی، ممتاز مفتی، رامانند ساگر، سدرشن، ایم اسلم - ستیارتھی، عدم، فکر تونسوی، فیض، ساحر، تاثیر، امتیاز علی تاج، گوپال متل، پریم ناتھ در اور کتنے ہی اوروں میں سے آدمی ہر قدم پر کسی نہ کسی سے ٹکرا جاتا ہے - بڑوں کی بھیڑ کا اتنا فراواں تصور ہونے لگے تو عظمتیں لپنے آپ کو دہرا دہرا کر گویا ناقابل یقین معلوم ہونے لگتی ہیں -

اس سلسلہ میں ایک اور پہلو بھی قابل توجہ ہے چند سال پہلے یہاں کسی ہندو ادیب کی یہ شکایت میرے پڑھنے میں آئی کہ اردو کے ہندو ادیبوں کو کسی باہری اقلیت کے مانند برتا جاتا ہے - اس سے قطع نظر کہ ادب میں صرف ایک ہی اقلیت ہوتی ہے، اچھا لکھنے والوں کی اقلیت، شاید یہ بھی غلط نہیں کہ نئے ہندوستان میں اردو کے ہندو ادیبوں کی کمیابی کی بناء پر بعض کمزور لکھنے والے بھی مصلحتاً کسی کڑے محاسبے کی زد میں نہیں لائے جاتے رہے اور یوں ان کی قبولیت میں غیر ادبی خارجی اسباب کار فرما رہے - ملک کی تقسیم سے پہلے کسی کو اس نوع کے تحفظات کا خیال ہی نہ گزرتا تھا - زبان سب کی ساجھی تھی، سو آپ اچھا لکھتے تھے تو بے تحفظ اچھے تھے، اور برا، تو برے - اردو میں لاہور اسکول کی اس روایت کے مبہم انحطاط کا سامان کر کے ہم نے اتنی بڑی زبان کے ادب کا تنقیدی معیار لپنے مصلحت آمیز کوتاہ سانچوں میں گھٹا لیا ہے اور یوں خوامخواہ ایک کنفیوژن کھڑا کر دیا ہے -

لاہور کے ہیومن مانومنٹس کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے بار بار ایک انتھک بوڑھے معمار کا خیال آرہا ہے، مولانا صلاح الدین - مولانا نے اپنی زندگی اردو کے نت نئے ادیب دریافت کئے جانے کے لئے وقف کر رکھی تھی - وہ انہیں دریافت کر کے بڑی ممتا سے ان کی تخلیقی تحریک میں جٹ جاتے - تقاضے کر کے ان کی تخلیقات حاصل کرتے، انہیں سنوارتے اور پھر نہایت ہمدردانہ رائے کے ساتھ لپنے ماہ نامہ "ادبی دنیا" میں پیش کر دیتے - جہاں کرشن چندر کے "طلسم خیال" پریم ناتھ در کے "کاغذ کا واسدیو" محمد حسین عسکری کے "چائے کی پیالی" یا بیدی، اشک اور شمس آغا کے افسانوں کے لئے "ادبی دنیا" کا انتظار کیا جاتا، وہاں قارئین یہ جاننے کے لئے بھی بے تاب رہتے تھے کہ مولانا لپنے مصنفین اور ان کی تخلیقات کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں - اسی زمانے کا واقعہ ہے میرے کالج کے دوستوں نے میری ایک کہانی کی بہت تعریف کی تو میں نے اسے "ادبی دنیا" کے لئے بھیجنے کا فیصلہ کر لیا - اسی دوران سید جابر علی نے جب مجھے بتایا کہ وہ اورینٹل کالج میں لپنے داخلے کے ضمن میں مولانا صلاح الدین سے مشورہ کرنے لاہور جارہا ہے تو میں جیب میں وہ کہانی ٹھونس کر میں بھی اس کے ساتھ نندہ بس میں جا بیٹھا - لاہور میں جب ہم مولانا کے آفس میں داخل ہوئے تو وفور تعظیم سے میری بوکھلاہٹ کا یہ عالم تھا کہ مجھے مولانا کو آداب پیش کرنے کی بھی نہ سوجھ پائی اور سارا وقت میں ان کے سامنے ڈھیٹ سی چپ سادھے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنی کہانی کا مسودہ مسلتا رہا اور جابر کی بات چیت ختم ہونے پر اسی لاتعلق خاموشی سے جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا - اس واقعہ کے کئی سال بعد جب میں کینیا سے ایک دفعہ چھٹی پر ہندوستان آیا اور لاہور بھی گیا تو مولانا سے ملاقات پر میں نے انہیں یہ واقعہ سنایا - انہوں نے بڑی ملائمت سے میرا ہاتھ لپنے ہاتھ میں لے لیا اور گیلی گیلی اپنائیت سے کچھ اس طرح میری طرف دیکھا تو وہ مجھے آسمانی سے لگے اور لپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ میں فرط مسرت سے بوکھلا کیوں نہیں پا رہا -

لاہور سے لوٹ کر لپنے سیالکوٹ کے بازار مجھے ہمیشہ بہت چھوٹے معلوم ہونے لگتے، مانو میرا یہ آبائی شہر لپنے اندر ہی اندر سمٹ کر رہ جاتا جیسے کوئی شخص لپنے ہی دل میں - اس کے برعکس لاہور پہنچ کر مجھے ہمیشہ یہی لگتا کہ یہ عظیم شہر لپنے باہری باہر کھل کر بے کراں ہوتا جارہا ہے لاہور میرے لئے اوائل سے ہی ایک عزم، ایک حوصلے کا علامیہ رہا ہے، پنجابی میں اردو بولنے کا، یا پھر اردو میں انگریزی بولنے کا، یا شاید انگریزی میں بھی اردو بولنے کا - لپنے اس نہایت محبوب علامیے کی بدولت ہی ساری عمر قدم بہ قدم باہر آ کے کھو جانے پر آمادہ رہا اور کھو کر کسی اجنبی مقام پر بھی مجھے اپنی مقامیت پر شک کی گنجائش محسوس نہ ہوئی - امریکہ، افریقہ، ایشیا میں جب جہاں بھی جا پہنچا، یہی سمجھا کہ میں لاہور آ پہنچا ہوں - اس اعتبار سے لاہور میرا ماسٹجیا، میرا ماضی نہیں، میرا حال اور مستقبل بھی ہے -
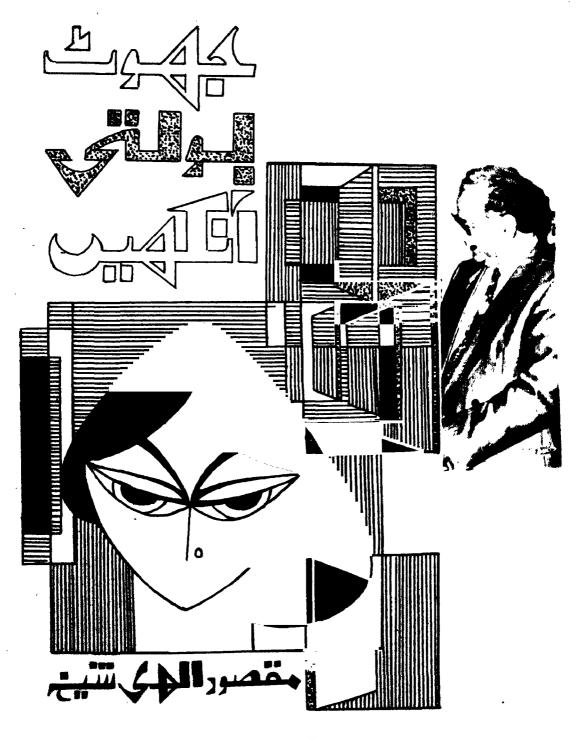
جھوٹ
بولتی
آنکھیں
مقصود الٰہی شیخ

جھوٹ بولتی آنکھیں

مقصود الٰہی شیخ

مدیر "راوی"

براڈفورڈ (یو۔ کے)

چوھدری صاحب کی لال گائے نومولود بچھیا کو اپنی زبان سے چاٹ رہی تھی ۔ دہلیز پر بیٹھا گلابو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا جیسے یہ بھی کوئی مشغلہ ہو ۔ ننھی سلیمہ بھی پاس آکر بیٹھ گئی ۔ پیار سے چاٹ رہی ہے ۔ سلیمہ نے گلابو کو بتایا گویا بڑی سمجھ دار ہے ۔ گلابو نے مسکرا کر کہا نہیں تو ۔ یہ اس کو کھا رہی ہے ۔ کیا کھا جائے گی ۔ سلیمہ کو غصہ آگیا" پاگل ، اتنا بھی نہیں پتہ ، یہ تو اس کو پیار کر رہی ہے ۔ "اچھا ، یہ پیار کر رہی ہے ، آؤ میں بھی تمہیں پیار کرو ۔ " گلابو نے مڑ کر سلیمہ پر نظریں گاڑ دیں ۔ اور ہی ہی ہی کرنے لگا ۔ سلیمہ بکتی کوسنے دیتی اندر بھاگ گئی ۔ سلیمہ چوھدری مقدس علی کی اکلوتی ، پیاری ، موہنی اور لاڈلی بیٹی تھی ۔۔۔۔ گلابو ان کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے بہت سے ملازمین سے ایک کم عمر کامی تھا بظاہر ان کے یہاں اونچ نیچ نہیں تھی مگر ہر کسی کو اپنا اپنا مقام خوب معلوم تھا ۔

گلابو ماسی جیوان کے گیارہ نواسے نواسیوں اور پوتے پوتیوں میں سے بس ایک تھا ۔ عمر یا چھوٹائی بڑائی کا حساب ماسی کو پتہ ہو گا یا گلابو کی ماں کو ۔ دیکھا جائے تو ان کو خاک پتہ ہو گا ۔ اس کی ماں بس جننے کی گناہگار تھی ۔ باپ مر چکا تھا ۔ ماں اور ماسی جیوان دن بھر محلے کے خوشحال گھروں میں برتن بھانڈے مانجھتی اور اوپر کے متفرق کام کر کر کے اپنا اور اپنی اولادوں کا پیٹ بھرنے کا جتن کرتے جیون گزار رہی تھیں ۔ ایسے میں بچوں کے چونچلے کون کرے ۔ جن بچوں کی زندگی ہوتی ہے وہ بغیر نگہداشت پل جاتے ہیں ۔

گلابو کو باپ کا پیار سرے سے نصیب نہ ہوا ۔ ماں کی چھاتیاں چیکنے اور پاس سونے کی حسرت کبھی پوری نہ ہوئی ۔ اسے بعد میں ہوش آیا لیکن جب ماسی جیوان کی نظر میں وہ چادر کی گانٹھ باندھنے جوگا ہوا تو وہ اس کو چوھدری صاحب کی سیوہ کرنے کے لئے چھوڑ گئی ۔ اکثر تہوار کو گھر والوں کو گلابو یاد آتا اور دونوں چوھدری صاحب کے ہاں آکر سارا دن یوں مصروف ہو جاتیں کہ جنم جنم سے یہیں کام کر رہی ہوں اور شام کو چوھدرائین کے پاؤں دباتے ہوئے گلابو کو گھر لے جانے کی اجازت طلب کرنے کی نوبت آتی اور یوں وہ گلابو ۔ گلابو کے نئے جوڑے اور پرانے دھرانے کپڑے لئے اور چند ٹکوں سے نہال اناج کی ایک ایک پوٹلی سر پر لادے اپنے گھر واپس آتیں ۔ ماشاء اللہ گھر میں کھانے والوں کی کمی نہ تھی مگر کھانے کی کمی دوسرے ہی دن محسوس ہونے لگتی اس لئے گلابو کو دوسرے روز ہی واپس چوھدری کی خدمت گزاری کے لئے روانہ کر دیا جاتا ۔

یوں تو سب کو معلوم تھا کہ بیگار لینے کو گلابو موجود ہے لیکن خود گلابو کو یہ پتہ نہ تھا کہ وہ ہے بھی یا نہیں ۔ اس سے جو کہا جاتا کر دیتا ۔ رات میں چوھدری صاحب کی مٹھیاں بھرنا وہ کبھی نہ بھولتا کیونکہ جب وہ کچھ بھی نہ کر سکتا تھا تو اس کی وہاں موجودگی کا جواز یہی کام اس کے سپرد کر کے پیدا کر لیا گیا تھا اور جب آس پاس کوئی بچہ نہ ہوتا اور سلیمہ چوھدرائین کے پنڈے سے چپکی ضد کر رہی ہوتی تو گلابو کے سپرد یہ ڈیوٹی بھی ہوتی جاؤ سلیمہ کو کھلاؤ ۔ اب گلابو کو اپنی عمر بے شک نہ معلوم ہو لیکن اتنا بڑا بھی نہ تھا کہ ڈھو کی ڈھو سلیمہ کو گود لے لیتا ۔ دونوں مل کر کھیلنے لگتے ۔

پھر وہ وقت بھی آگیا گلابو نے بتدریج بہت سے کام اپنے ذمے ڈال لئے ۔ کھیل کے لئے اس کے پاس کوئی وقت نہ رہا ۔ ایک کام جس میں اسے کھیل کی سی لذت ملتی وہ تھا ۔ لال گائے کی دیکھ ریکھ ۔ سلیمہ کے پاس اتنا وقت تھا کہ کھیل کود سے بھی بچ رہتا تو وہ آکر گلابو کے سر پر سوار ہو جاتی آج سلیمہ ادھر آئی تو گلابو گائے اور بچھیا کو دیکھنے میں محو تھا سلیمہ کو معلوم تھا گائے سے گلابو کو بہت پیار ہے اور یہ گائے کی پہلی

بچھیا ہے ۔ مگر گلابو کی بی بی اس کو کی بالکل اچھی نہ لگی اس لئے بکتی جھکتی بھاگ گئی۔

سلیمہ جتنی خوبصورت ، نازک اور صاف ستھری رہتی تھی یا رکھی جاتی تھی ۔ گلابو اتنا ہی میلا کچیلا اور بدہیئت ، ایک بچپن کا ساتھ دوسرے ایسی زیادہ اونچ نیچ بھی نہ تھی جیسی شہری گھرانوں میں ہوتی ہے اس لئے دونوں اس طرح کھیلتے کودتے کہ گو اندھی ہوں ۔ پڑوسی ہوں اور بچے ہوں اور پھر سب کو دیکھنے سے ہی محسوس ہوجاتا کہ وہ کامی ہے اور وہ چوہدری مقدس علی کی بیٹی تو جو فرق تھا وہ تھا ہی باقی دونوں ہنس بول لیتے ہیں بچی کا دل بہلا جاتا ہے اس سے کیا فرق پڑتا ہے ۔ سلیمہ روز نہاتی ۔ کپڑے بدلتی اور اس کے بے لمبے لمبے بال تھے ۔ گلابو کے سر پر استرا پھرا ہوتا تاکہ جوئیں نہ پڑیں ۔ مگر جوئیں اس کے مختصر سے لباس میں افراط سے تھیں ۔ وہ بطور خاص کبھی نہایا نہیں ۔ گائے کو نہلاتے سے جو چھینٹے پڑتے تو اس کے جسم کے عریاں حصوں پر گل بوٹے بنا جاتے اور سلیمہ ہنسا کرتی گلابو نے دھاری دار کپڑے پہن رکھے ہیں ۔ پھر کھرلی صاف کرتے ہوئے بھی اس کا پنڈا بھیگتا تھا اس لئے نہانے کا کون جتن کرتا ۔ دوسرے تیسرے بھینسوں کا رکھوالا اللہ بخش یوں بھی گلابو کو لال گائے کے بہانے تالاب پر بھیج دیتا تھا اور خود حلم گڑاگڑانے کا شغل کرتا تھا تب بھی گلابو ایک طرح سے نہا ہی لیتا تھا ۔ لال گائے ضدی نہ تھی مگر گلابو جب تک اپنی چادر اور کرتی اتار کر تالاب میں نہ اترتا بھینسیں چھپڑ سے نکل کے نہ دیتیں ۔ اب گھر پر چوہدری کی طرح غسل خانے میں پانی بہانے کو ہی غسل کہا جائے تو علاحدہ بات ہے ۔ پھر چودھدرائین اسے غسل خانے ، باورچی خانے اور دوسرے خانوں کے پاس سے گزرنے کب دیتی تھی ۔

رنگ گلابو کا سانولا تھا ۔ اوپر کا ہونٹ تھوڑا کٹا ہوا ۔ دیکھنے میں دبلا پتلا مگر سوکھی روئی کی طرح تگڑا کہ کوئی بھی تو چورانہ ہو ۔ اس کا ہونٹ دیکھتے ہی کہا جاتا چاند گرھن کے وقت اس کی ماں حاملہ تھی اور کوئی شئے کاٹ رہی تھی ۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی ، کان بڑے بڑے اس کا اور سلیمہ کا کوئی جوڑ نہ تھا مگر بچپن سے ساتھ کھیلتے آئے تھے سلیمہ نے کبھی نفرت نہ کی ۔ پھر سلیمہ کسی گھر والے کے کاندھوں پر چڑھی وہ فوراً ہی تھک جاتا اور اسے اتار کر کہا جاتا جاؤ کھیلو ، ہم تھک گئے ۔ ادھر گلابو کبھی تھکتا ہی نہ تھا ۔ سلیمہ چڑکر آتی اور اچک کر اس کے کندھے پر سوار ہو کر بس دوڑاتی رہتی ۔ دالان کے اس سرے سے اس سرے تک اور پھر واپس ۔ حتیٰ کہ وہ خود ہی تھک جاتی تب وہ اسے بھوسے پر پٹک دیتا اور دونوں ہنستے ہنستے بے حال ہوجاتے ۔ سلیمہ کو دوپہر میں کم ہی نیند آتی ۔ گھر بھر کا ناک میں دم رہتا ۔ ان کے آرام میں ایسا خلل ڈالتی کہ ماں گھرک کر دبوچ لیتی اور جیسے ہی ماں پہلا خرانٹا بھرتی بیٹی کھسک کر دالان میں آکر غل غپاڑہ مچاتی ، چوھدرائین کا بستر چھوڑ گلابو کا پنڈا آپکڑتی ۔ نیند گلابو کو بھی نہ آتی تھی پھر کسی کی مجال بھی نہ تھی کہ ٹوکتا ۔ الٹا نوکر چاکر کھی کھی کرتے نیند کرتے دوسرے کونے کھدروں میں جا پڑتے ۔

گلابو تو خیر کیکر کی طرح بڑھ رہا ، سلیمہ بھی لونٹھا کی لونٹھا ہوگئی مگر اس کے معمول میں فرق نہ آیا ۔ گلابو کو اس کا بوجھ تو کبھی محسوس نہ ہوا ، پر اس کا جسم اب پسیج کر زیادہ ہی چپ چپ کرنے لگتا اور اس کے بدن سے ایسی باس اٹھنے لگتی جو سلیمہ کو کبھی تو اچھی لگتی کبھی بری ۔ منہ پھٹ تھی فوراً کہتی جا نہا کر آ ۔ ورنہ میں چڑھی نہ لوں گی ۔

اس گرمیوں کی دوپہر کو لو چل رہی تھی ۔ تپش معمول سے زیادہ تھی ۔ تڑکے تڑکے گاؤں میں قتل ہوگیا تھا ۔ گھر کے اکثر افراد چوپال سے پلٹے نہ تھے ۔ چوھدرائن پلنگ پر لیٹی بیوہ بھاگ بھری کی داستان سنتے ہوئے پاؤں دبوا رہی تھی اور اندھی نوراں اس کے سر میں تیل اتار رہی تھی ۔ سلیمہ نے محسوس کیا بجلی کے پنکھے کی ہوا بھی بھوبھل کی مانند گرم گرم ہے اس سے دالان ہی ٹھنڈا ہوتا ہے پنکھے کا سارے کا سارا رخ ماں کی طرف کر بھوسے والے دالان میں اٹھ آئی ۔ یہاں کی خنکی اسے بھلی لگی ۔ نازک سے بدن میں تازگی اور طراوت سی محسوس ہوئی ۔ پرے گلابو ٹنڈ منڈ اونگھ رہا تھا ۔ گلابو کی ہیئت اور دوسرے اس کی تازہ تازہ ٹنڈ دیکھ کر سلیمہ کی ہنسی چھوٹ گئی ۔ وہ ہڑ بڑا کر کھڑا ہوگیا ۔ اتفاق تھا گلابو کھڑا ہوا تو اس کی چادر نیچے گر گئی ۔ سلیمہ اور بھی بے تحاشہ ہنسی وہ محجوب ہو کر چادر اٹھانے کو ہوا تو سلیمہ نے شرارتاً جیسے چادر اٹھانے کو ہاتھ بڑھایا ۔ گلابو تپ گیا ۔ چادر بھول کر سلیمہ کی طرف لپکا ۔ سلیمہ آگے اور وہ مادر زاد پیچھے ، سلیمہ اور ہنسی اور ہنسی ۔ اس میں سکت تو تھی پر جانے کیا شرارت آئی یکدم رک گئی اور وہ بچتے بچتے بھی لپٹنے ہی زور میں اس سے بھڑ گیا ۔ اور دونوں بھوسے پر آرہے ۔ سلیمہ کو وہی مانوس سا بو کا بھبکا اپنے نتھنوں میں در آتا محسوس ہوا ۔ جانے کیوں اسے زیادہ برا بھی نہ لگا ۔ بولی گلابو کبھی نہا بھی لیا کر ۔ گلابو ہی ہی کھی کھی کرتا اٹھا اور اپنی چادر لپیٹ کر اسے گھورنے لگا ۔ پھر کیا خیال آیا کہنے لگا آؤ ایک تماشہ دکھاؤں ۔ دالان میں ایک کھڑکی باہر کھلتی تھی ۔ گلابو اس کے پاس

جاکر گھوڑا بن گیا۔ سلیمہ بڑی بے تکلفی سے سوار ہوکر باہر جھانکنے لگی۔
گلابو اونگھنے سے پہلے بھی یہ تماشہ دیکھ گیا تھا اور جب اسے جان پڑا کہ
سلیمہ باہر جھانک رہی ہے تو گڑ گڑنے لگا کیونکہ اللہ بخش بھینسوں والے
اور پھتے چمار نے اسے مصلحتاً اندر بھیج دیا تھا۔ وہ خوب سمجھتا تھا
------سلیمہ نے منڈیا کھڑکی سے باہر نکالی تو دیکھا ایک سانڈ لال
گائے کو سونگھ رہا ہے۔ اللہ بخش اور پھتا دونوں سانڈ کو ہشکار رہے ہیں
اور چٹک پھیریاں دے رہے ہیں۔ کچھ سمجھتے، کچھ نہ سمجھتے سلیمہ جھک کر
پھدکی تو اس کی دونوں ٹانگیں پھسل کر گلابو کے گلے کا ہار ہوگئیں گلابو
سیدھا کھڑا ہوگیا اور دالان میں بھاگنے لگا۔ سلیمہ غصے سے اس کی تازہ تازہ
ٹنڈ پر مکیاں مارنے لگی اور منہ بنا بنا کر چھی، چھی، کرنے لگی۔ گلابو اور تیز
بھاگا اور بولا وہ سنڈ الال گائے کی چھی چاٹ رہا ہے لال گائے گابھن ہو رہی
ہے۔ اب وہ ایک اور بچھیا دے گی۔ اسے نہانے کیا خوشی مل رہی تھی۔
کونسی بجلی اس میں بھر گئی تھی خوب تیز بھاگ رہا تھا۔ پل کی پل میں
سلیمہ بھی چڑھی کا مزہ لینے لگی اور اسی کی مانند کھی کھی کھی کرنے لگی۔
یکبارگی لال گائے اور سانڈ کے ڈکرانے کی آوازیں ابھریں اور دھیان
پلٹنے پر گلابو رکا تو توازن قائم نہ رکھ سکا اور دونوں بھوسے پر آپڑے۔

گلابو نے اپنے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا چھیما یاد ہے جب
میری لال گائے کے پہلی بچھیا ہوئی تھی۔ سلیمہ نے بے ساختہ کہا ہاں یاد
ہے وہ اسے چاٹ رہی تھی۔ گلابو اپنی کنجاسی آنکھوں سے پسینہ پونچھتے
ہوئے پوچھنے لگا۔ چھیمی، یہ بھی تو یاد ہے میں نے پوچھا تھا۔ میں بھی تمہیں
چاٹوں؟۔ سلیمہ نے دوپٹے سے منہ صاف کرتے ہوئے اثبات میں
اور منتظر رہی گلابو اور کیا یاد دلاتا ہے -----

"تو"---------- گلابو نے سلیمہ کے شانے پکڑ
کے اس پر جھکتے ہوئے پوچھا------ تو چاٹوں" سلیمہ نے اس دھکا دیا
چل دفان ہو۔ اس کی گرفت سے نکلتے ہوئے بولی۔ الو تو تجھے کھا جائے
گا۔ اسے بچپن کی بات ذرا ذرا یاد آچکی تھی۔ وہ اٹھی اور بھاگنے کو ہی تھی
کہ ٹھینگا بھی دکھایا اور کہا تیرے منہ سے بو آتی ہے۔ گلابو ویسے ہی گھات
لگائے پڑا تھا۔ سلیمہ کے کاندھے تو گرفت سے نکل چکے تھے مگر وہ اس کی
پہنچ میں تھی۔ جھٹ ہاتھ بڑھا کر پیر پکڑ لیا۔ سلیمہ لڑکھڑا گئی۔ گلابو نے
اپنی لمبی جیبھ سلیمہ کے تلوے میں چپکے سے رکھ دی۔ سلیمہ سرکی، سمٹی،
سکڑی، جان نہ پائی۔ پیر کھینچے یا رہنے دے۔ کچھ تری کچھ گدگدی لگی اور
سارے بدن میں پھریری سی چھوٹ گئی گلابو نے دوسرا پیر بھی اپنی طرف
کھینچ لیا اس کی زبان سلیمہ کے پیر کی پہنچی سے اوپر کومل کومل ریشم کو تر
بتر کر رہی تھی۔ ریشمی روئیں کی نرماہٹ سے گلابو کی جیبھ کی نرمی، اور
عجب طرح کا کھردرا پن ایسا ہی تھا کہ سلیمہ سدھ بدھ کھو کر کھو سی گئی
------ اچانک باہر سے پہلے سے بالکل مختلف سی آوازیں آئیں۔ یہ
دونوں بھی چونکنے ہوئے۔ چونکے اور سلیمہ دلکی دلکی چلی گئی۔

اس رات گلابو سلیمہ کو خواب میں چاٹتا رہا۔ صبح گلابو نے سلیمہ
کی بجائے لال گائے کا نام لے کر حسین بخش کو خواب سنایا تو اس نے کہا
"گلابو تو اب جوان ہوگیا ہے۔ ایسے خواب دیکھ کر صبح کو اٹھ کر نہا لیا کر
آج تجھ پر نہانا واجب ہے۔

گلابو کو واجب کا مطلب تو معلوم نہیں تھا بہرحال سمجھ گیا اور
یوں اس نے سب سے پہلا غسل چودھریوں کے غسل خانے میں غسل
کر کیا۔ پھر جب کبھی ضرورت پڑتی" گلابو وہیں نہانے لگا۔

وقت اپنی چال رینگنے لگا۔ وقت تو پہلے بھی رینگ رہا تھا۔ اس
کی رفتار بھی وہی تھی۔ کوئی فرق نہ پڑا تھا لیکن گلابو اور سلیمہ کو لگتا ان
میں فرق آرہا ہے بظاہر وہ اسی طرح کھیلتے کودتے رہے، مگر یہ خیال رکھنے
لگے کہ جب ان کا کھیل عروج پر پہنچے اور سلیمہ بچھیا بنی ہو تو اریب
قریب دوسرا کوئی نہ ہو----- ہاں اتنی سمجھ ان میں آگئی تھی۔

پھر سلیمہ کی شادی ہوگئی۔ وہ دوسرے شہر چلی گئی۔ گلابو اکیلا
رہ گیا۔ تھک کر بھوسے پر گرتا، پاس سلیمہ کو نہ پاکر بس پچھاپا کرتا
----- اسے لال گائے کی دیکھ بھال بری لگنے لگی۔ وہ اس پر خفا ہونے
لگا۔ ایک روز وہ اتنا چڑچڑا ہوگیا کہ لال گائے کو پیٹ ڈالا۔ تنگ آکر
بھوسے پر آگرا۔ اس کی آنکھیں آپ ہی آپ بھیگ گئیں۔ ان دنوں
سردیاں تھیں۔ سب لوگ کونے کھدروں میں پڑے سستا رہے تھے۔
سردیوں میں بھی، دن میں، ایسا وقفہ ضرور آتا ہے جب کوئی کام کرنے کو
نہیں ہوتا حالانکہ دن چھوٹے ہوتے ہیں، ایسے میں جہاں جس کا سر چھپا،
وہیں ذرا دیر کو پڑ رہا۔ پھر اس نے اپنے کرتے سے آنسو پونچھے اور لال
گائے کو کھرلی سے کھول کر اندر ڈیوڑھی میں لے آیا۔ اسے پیار سے تھپکا،
چمکارا، اس کی تھوتھنی سہلائی، پیار کیا، پھر جانے کیا ہوا، اس پر ایک
وحشت سی سوار ہوگئی------ وہ پیار کرتے کرتے گائے کو چاٹنے لگا
------ جب سردی کی ایک لہر نے اسے کپکپایا تو اسے حسین بخش کی
بات یاد آگئی اب اس پر نہانا واجب تھا۔ چودھریوں کا غسل خانہ بھی
خالی تھا۔ اس نے دالان کے کونے میں پڑے بھوسے پر لیٹ کر مکمل

اوڑھا اور سو گیا ۔ اس روز وہ اتنی دیر سویا کہ شام پڑ گئی ۔ کئی کام دھرے رہ گئے ۔ بچارے کو خوب جھڑکیاں سننی پڑیں ۔ جتنی گالیاں دی گئیں اتنا ہی اسے سلیمہ کی یاد نے تڑپایا!!

دن میں گلابو سو لیا تھا، رات میں نیند نہ آئی ۔ وہ اٹھا اور چودھری صاحب کے پاؤں دبانے چلا گیا ۔ وہاں چودھری صاحب اور چودھرائین کی گفتگو سن کر اس کا من کھل اٹھا، چودھری صاحب نے کہا" ------ سلیمہ کے آنے پر داماد کا خاص خیال رکھا جائے" اور چودھرانی کہہ رہی تھی، ----- گلابو نے خاک سنا وہ کیا کہہ رہ تھی ۔ اسے دن سے کیا لینا دینا ۔ خاص طور پر اسے چودھرائین ویسے بھی ناپسند تھی ۔ وہ بڑی درشت مزاج عورت تھی ۔ گلابو نے تو بس یہی سنا ۔

سلیمہ آرہی ہے ۔
اس کے کانوں میں شہنائیاں بج رہی تھیں
سلیمہ آرہی ہے
ہوائیں گا رہی تھیں
سلیمہ آرہی ہے
اسے لگا، جدھر نظر اٹھتی ہے، فضا میں سلیمہ کی تصویریں سجی ہیں ۔

سلیمہ آرہی ہے
گلابو نے جانا سردیوں کا زور ٹوٹ گیا ہے
سلیمہ آرہی ہے ۔ سلیمہ آرہی ہے
خوابوں کا گیت، جیتا جاگتا نغمہ ----- اس کے کانوں میں رس گھول رہا تھا!!

سلیمہ آرہی ہے، سلیمہ آگئی ہے کا فرق گلابو کو اس وقت جان پڑا جب وہ واقعی آگئی وہ آتو گئی مگر سلیمہ نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا ۔ گلابو بجھ گیا ۔ دل نے اسے چین ہی نہ لینے دیا ۔ سلیمہ بلائے نہ بلائے وہ بہانے بہانے آس پاس آکھڑا ہوتا ۔ وہ اسے کوئی کام بتاتی ہی نہ تھی حالانکہ وہ تیار، ہر دم تیار تھا، سلیمہ ذرا اشارہ کرے تو وہ اپنی جان بھی حاضر کردے ۔ جب دو روز گزر گئے تو اس کے ہاتھ سے صبر جاتا رہا ۔ وہ تپ اٹھا ۔ اسے غصہ آگیا، غصہ ڈھلا تو وہ ملول ہو کر دالان میں چلا گیا ۔ بھوسے پر دوڑنے لگا، پھر رکا اور ٹھوکریں مار مار کر بھوسہ اڑانے لگا ۔ اس نے سوچا سلیمہ کی بچی اگر ہوتی لال گائے تو اس کی ڈنڈوں سے پٹائی کرتا ۔ پگلا باہر نکلا اور واقعی بلا وجہ لال گائے پر ڈنڈے برسانے لگا ۔ سارا غصہ اتار چکا تو اسے بے زبان جانور پر رحم آگیا ۔ وہ اسے تھپکانے پیار کرنے لگا وہ اسے اچھی لگی -------- کیا بات تھی سلیمہ کی کمی پھر بھی محسوس ہوئی ۔ اسے سلیمہ چاہیئے تھی ۔ اس کی جیبھ، اس کے ہاتھ، اس کے کٹے پھٹے ہونٹ، اس کی آنکھیں، اس کا بدن، اس کا انگ انگ سلیمہ سلیمہ پکار رہا تھا ---- مگر دن پر دن گزرتے گئے، سلیمہ نے اس کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا!!

گلابو روز کا کام ختم کر کے بھوسے پر آکر آکڑوں بیٹھ جاتا اور سوچتا ---- سوچتا رہتا ۔ ایسا کیوں ہے، ایسا کیوں ہے ۔ وہ دونوں غیر کب سے ہوگئے!

سلیمہ کے جانے سے ایک روز پیشتر وہ اپنے خیالوں میں، بیتی یادوں میں اداس بیٹھا تھا کہ ڈیوڑھی میں کھڑکا ہوا ۔ وہ چوکنا ہو گیا ۔ جیسے کچھ پہچان میں ہے ۔ وہ دروازے کی طرف لپکا، اس کے نتھنوں سے عطر کی خوشبو ٹکرائی ۔ اسے لگا سلیمہ ہی کہیں آس پاس ہے ۔ وہ گھات لگا کر بیٹھ گیا ---- سلیمہ اکیلی تھی ۔ کسی سہیلی سے مل کر آئی ہوگی ---- وہ ڈیوڑھی سے گزر کر اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں چڑھنے لگی ۔ گلابو لپک کر گیا اور اسے دبوچ لیا ۔ سلیمہ نے گلابو کے گال پر تھپڑ جڑ دیا ۔ اس پر برسنے لگی مگر گلابو نے فوراً ہی اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا اور اسے اٹھالیا ۔ وہ پہلے سے بھاری لگی لیکن اس کا بوجھ تو گلابو کے دل کا قرار تھا ۔ خوشی سے ہانپتے کانپتے اس نے سلیمہ کو بھوسے پر لا ڈالا اور بغیر کہے سنے اسے چاٹنے لگا، سلیمہ نے منہ بنایا ۔ کسمائی مگر چند ہی لمحوں میں اس کی مدافعت سپردگی میں بدل گئی ۔

گلابو کے لئے یہ بہت بڑی خوش خبری تھی کہ سلیمہ بی بی اپنے ساتھ واپسی پر لال گائے بھی لے کر جارہی ہیں ۔

رات اس نے چودھری صاحب کے پیر اس طرح دبائے کہ حق ادا کر دیا ۔ پاس ہی موڑھے پر چودھری صاحب کے داماد بیٹھے تھے ۔ چودھری صاحب کے بعد گلابو ان کی طرف بڑھا تو بابو جی نے اپنے پیر کھینچ لئے ۔ دوسروں کی طرح گلابو نے بھی چودھری صاحب کے داماد کو بابو جی کہہ کر مخاطب کیا" بابو جی! آپ کی خدمت کر کے مجھے خوشی ہوگی!" جب چودھری صاحب نے کہا" کوئی بات نہیں" تو بابو جی چپ ہوگئے بابو جی کی ٹانگیں دباتے دباتے گلابو کو جانے کیا خیال آیا وہ بابو جی کی منت کرنے لگا کہ وہ اسے بھی ساتھ لے چلیں ۔۔ وہ کہہ رہا تھا" میں سلیمہ بی بی کا نوکر ہوں ۔ لال گائے کا نوکر ہوں گائے آپ کے ساتھ جارہی ہے

لال گائے میرے بغیر کسی سے مانوس نہیں۔ میں آپ کی خدمت کروں گا ---- کہہ وہ چپ رہا تھا اس سے پہلے کہ بابوجی کچھ کہتے، چوہدری صاحب نے کہا "ہاں! ہاں تم بھی چلے جاؤ" اس طرح چوہدری صاحب نے بیٹی کے بعد لال گائے اور لال گائے کے بعد ان کا خدمت گار گلابو بھی بابوجی کی نذر کر دیا!!

گلابو کا واپس گاؤں آنے کو کبھی دل نہ کیا۔ ماسی جیواں کے مرنے پر آیا تو تیج ہوتے ہی پلٹ گیا۔ عید، شب برات، پر بھی بن چاہے آتا۔ اس کا آنا بھی کیا ہوتا۔ ادھر آیا۔ ادھر واپس ہوا۔ یوں بھی وہ ماں یا اپنے بہن بھائیوں کے کون سا قریب تھا۔ اس کے آنے پر ان سب کو اس کی خوشی ہوتی کہ وہ ان کے لئے کیا کر آیا ہے۔ جانے کا نام لیتا تو سوائے ماں کے کوئی رکنے کی بات نہ کرتا گلابو کو بھی وہاں ٹھہرنے کا کوئی شوق نہ تھا بلکہ وہ خوشی خوشی اپنے ٹھکانے پر واپس جایا کرتا تھا۔

دن رات کا چکر اسی ڈھب پر چل رہا تھا۔

اگر کوئی تبدیلی آئی تھی تو بس اتنی کہ گلابو، بابوجی کے کہنے پر ذرا صاف ستھرا رہنے لگا تھا۔ ٹینڈ کی بجائے خشخشی بال رکھ لئے تھے۔ بابوجی ہی کے کہنے پر مونچھیں بڑھالی تھیں۔ اس طرح اس کے اوپری ہونٹ کا پیدائشی کٹاؤ مونچھوں کے بالوں میں تقریباً چھپ گیا تھا۔ پہلی نظر میں اس کا یہ عیب اب نظروں میں اٹک کر چبھنے سے ایک حد تک محفوظ ہو گیا تھا۔

ایک اور تبدیلی آئی تھی سلیمہ کو کاندھوں پر بٹھا کر دوڑ لگانے کا موقعہ نہیں ملتا تھا۔ چوہدری مقدس علی کے بھوسے کا دالان بھی وہاں نہیں تھا۔ بھوسہ ایک تنگ سی کوٹھری میں بھرا رہتا تھا وہیں سے نکال کر لال گائے کا چارا تیار کیا جاتا تھا۔ بابوجی کے یہاں کی ہر بات ایک دوسرے ہی ڈھب پر تھی اوپر سے یہ دھڑکا لگا رہتا کہ بابوجی ابھی گئے ہیں کیا خبر ابھی پلٹ آئیں۔ خواہ وہ دنوں نہ آئیں ڈر تو چھایا رہتا تھا۔ انہوں نے اپنے ذمہ کئی کام لگا رکھے تھے۔

بابوجی کے یہاں کام کرنے والے اور لوگ بھی تھے۔ ایک مائی تھی۔ وہ سلیمہ کی دوسراہٹ کے لئے کبھی کبھی رات کو بھی ٹھہر جاتی۔ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ کوئی کام تو وہ کر ہی نہ سکتی تھی۔ باقی لوگ بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہتے۔ اصل کام سارے کے سارے تو گلابو نے آتے ہی سنبھال لئے تھے۔

بابوجی کے یہاں مہمان بہت آتے تھے۔ قتل کہیں ہوتا، لوگ ان کے پاس چلے آ رہے ہیں۔ جھگڑا ہوتا زمین کا یا بٹوارا ہوتا، مقدمے بابوجی لڑ رہے ہیں۔ افسر آ رہے ہیں تو بابوجی سے مشورے ہو رہے ہیں۔ ان کی وکالت کی شہرت بھی بہت تھی۔ خاص طور پر الیکشن کے دنوں میں، وہ جھمگٹا رہتا کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ بعض وقت تو وہ زنانے میں بھی نہ آتے۔ کئی کئی دن نہ آتے -------- گلابو کو اطمینان تھا تو اتنا کہ وہ لمحے ضرور مل جاتے ہیں جب اس کی مالکن پہلے والی سلیمہ بن جاتی ہیں۔ غیر نہیں رہتی لیکن سلیمہ سے زیادہ خود اسے بابوجی کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ وہ تو چاہتا تھا وہ ہو، سلیمہ ہو اور کوئی دھڑکا نہ ہو۔ پھر وہی دالان ہو، وہ سلیمہ کو کاندھوں پر بٹھا کر دوڑے، ادھر سے ادھر دوڑے اور ہانپ کر، تھک کر، چور ہو کر پسینے میں تر بھوسے پر گر پڑے سلیمہ کا گورا بدن، نازک نازک پنڈا، ریشم کی لچھیاں، سب کچھ پسینے پسینے ہو رہا ہو۔ سلیمہ دوپٹے سے اپنا چندن جیسا چہرہ خشک کرے پھر اصرار کر کے گلابو کا کرتہ اتروائے۔ اپنے پلو سے اس کی چھاتی کا پسینہ پونچھے اور لپٹ جائے۔ چمٹ جائے -------- اب یہ سب تو نہیں ہوتا، بس ایک جلدی مچی رہتی ہے۔ کہیں بابوجی نہ آجائیں، بابوجی آتے ہوں گے، یہی خدشات اکثر بے کیف بنا دیتے۔ اسے لگتا جیسے لال گائے کو گتاوا بٹنے میں دیر ہو جائے تو وہ بھوک میں خالی کھرلی پر ہی زبان پھیرنی شروع کر دیتی ہے یا دیواریں چاٹنے لگتی ہے اور بے مزہ ہو کر ڈکراتی ہے مگر اس طرح بھوک تو نہیں مٹتی ------

اب کے گلابو عید پر گھر آیا تو اس کی ماں نے پیار سے، تھوڑا زور دے کر دودھ کی دھاریں نہ بخشنے کی دھمکی دے کر اسے روک ہی لیا

باہر رہنے والوں کی اصلی حالت سے اکثر لوگ ناواقف ہوتے ہیں لیکن باہر کمائی کرنے والوں کا بھرم تو ہوتا ہے۔ ظاہر ہے محلے میں گلابو کا خاصا بھرم تھا۔ وہ گاؤں آکر جو لین دین کرتا تھا اس کو سامنے رکھ کر ہی ان لوگوں نے گلابو کی حیثیت متعین کی تھی۔ اس کے دوسرے بھائی بھی جوان ہو گئے تھے۔ کماتے تھے۔ ماں نے اب گھر گھر کی چاکری چھوڑ دی تھی۔ مکان کی حالت سدھر گئی تھی۔ ان کے حالات سدھر گئے تھے تو گلابو کی ماں کی آس بھی تو کچھ اونچی ہوئی چنانچہ اس نے گلابو کو کہا کہ تیرے لئے بڑا اچھا رشتہ ڈھونڈا ہے۔ ٹھیک ہے گلابو دور رہتا ہے۔ ماں کی ممتا تو سارے جگ میں مشہور ہے۔ وہ گلابو پر واری، واری جا رہی تھی۔ اس نے میدان پہلے سے ہموار کر رکھا تھا۔ خود گھر میں

گلابو کو اس کے بہن بھائی اب گلاب دین ------ بھائی گلاب دین کہہ کر پکار رہے تھے ۔ وہ اب ان کو زیادہ بھدا، ہونق اور بھونڈا سا نظر نہ آتا تھا چنانچہ جب اس کی ماں محلے کی مسجد کے مولوی صاحب کے یہاں گئی تو انہوں نے زیادہ تامل نہ کیا اور برخوردار گلاب دین کا رشتہ اپنی دختر نیک اختر کے لیے منظور کر لیا وہ یہ اطمینان کر چکے تھے کہ گلاب دین کی عزت باہر محلے یہی میں نہیں گھر میں بھی کی جاتی ہے ۔ ان کا خیال تھا جس شخص کے گھر میں عزت نہ ہو وہ ہلکا ہوتا ہے ۔ لہذا اس طرف سے گلاب دین ان کے معیار پر پورا اترتا تھا البتہ انہیں یہ غم ضرور تھا کہ برخوردار گلاب دین ابجد، ہوز سے قطعی نابلد ہے چنانچہ رخصتی کے وقت مولوی صاحب نے اپنی برخورداری مسماۃ ... بی نور چشمی کو یہ بات پلے باندھ لینے کے لئے زور دے کر کہی نہ وہ اولین فرصت میں گلاب دین کو حروف آشنا کر کے قرآن ضرور پڑھا دے ۔ کتاب مقدس کی برکت سے دونوں دین دنیا میں سرخرو ہوں گے ۔ ام ہانی کے، خدا کے ہاں کئی درجات بلند ہوں گے ۔ دین کی جھلک اس کے شوہر کی زندگی میں آئی تو وہ نام کا گلاب نہیں رہے گا بلکہ سچ مچ دین کا گلاب بن کر خوشبو پھیلائے گا۔

نور چشمی امی ہانی کی رخصتی بھی خوب رہی

چٹ منگنی، پٹ بیاہ اور جھٹ جھٹ رخصتی ۔ وہ لپنے والد ماجد حضرت مولی علم دین کی ہر بات غور سے سنتی رہی ہے اس لئے جب انہوں نے رخصت کے وقت اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر شفقت سے شوہر کو قرآن پڑھانے کی تاکید کی تو اس نے ڈولی میں بیٹھتے بیٹھتے ہچکیوں، سسکیوں اور آنسوؤں کی لڑیوں کے درمیان اٹک اٹک کر بڑی ہمت و عزم سے کہا تھا۔

"اباجی امیری کوشش ہوگی کہ وہ قرآن پڑھ لیں ۔"

یااللہ! کیا انقلابات ہیں ۔

کہاں گلابو اور کہاں اللہ کی باتیں

بہرحال مولوی صاحب اپنا فرض پورا کر کے مطمئن تھے ۔ ادھر ام ہانی صاحبہ کو اپنی تعلیم و تربیت پر ناز تھا، پورا پورا اعتماد تھا کہ وہ گلاب دین صاحب کی زندگی میں تغیر لا کر رہے گی ، او سرے ہی پھیرے میں اس نے لپنے بہن بھائیوں کو سنا دیا تھا کہ گلاب دین کے گھر والے اب ہمارے رشتہ دار ہو گئے ہیں اسکے چلے جانے پر رشتہ داروں سے پہلو نہ کترایا جائے ۔ ممکن ہو تو پڑھائی لکھائی کی ترغیب دی جائے اور ان لوگوں میں اسلام کا چرچا ضرور کیا جائے ۔

انسانی رشتوں اور زندگی کے انقلابوں کی گردمیں کس کو کہاں پہنچا دیتی ہیں ؟ گلاب دین کے لئے بھی یہ سب کچھ نیا اور دلچسپ تھا ۔ زندگی میں پہلی بار اسے مذہب سے آشنائی اچھی لگ رہی تھی ۔ وہ ام ہانی کو ساتھ شہر لے آیا اور جب وہ نماز پڑھتی تو یہ اسے بیٹھا دیکھا کرتا۔

وہ منظر تو بھلانے والا ہے ہی نہیں ۔ جب ام ہانی نے لپنے گورے فراخ ماتھے پر چاروں انگلیاں جوڑ کر اور انگوٹھا پیچھے چھپا کر نہایت قرینے سے سلیمہ کو سلام کیا تو سلیمہ بس حیران رہ گئی ۔ ایک ہی پل لگی ہوگی اسے محلے کی کئی لڑکیاں یاد آ گئیں پھر وہ ام ہانی کو پہچان گئی کہ ارے یہ تو وہی مولوی علم دین صاحب کی منجھلی بیٹی ہے ۔ نام بھول رہی تھی جیسے ہی نام یاد آیا اس نے کہا" ---- تم کہاں ؟" ام ہانی نے نئی دلہنوں کی طرح شرما کر کہا "آپ ہی کی خدمت کیلئے شہر آئی ہوں ۔"

سلیمہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ ام ہانی کا بیاہ گلابو سے ہوگا ۔ کبھی خیال میں بھی نہ آیا تھا کہ گلابو کا بیاہ ہو سکتا ہے اور آج اسی کے گاؤں کے مولوی صاحب کی اچھی خاصی لڑکی دلہن بنی سیدھی اسی کے یہاں چلی آئی تھی ------ بڑوں کی بڑی باتیں، فوراً مائی کو دوڑا کر، ماہتاباں مالن، شیداں جھیوری اور پھیجے نائی کو بلوایا اور احاطے کے مشرقی کونے کی کوٹھری خالی کر کے ام ہانی اور گلابو کے رہنے کے لئے ٹھیک ٹھاک کرنے کو کہا ۔ سلیمہ ساتھ ساتھ سوچتی گئی ۔ اسے یقین ہی نہ آتا تھا کہ ام ہانی اور گلابو ایک ساتھ رہیں گے --- گلابو --- گلابو ------ نہ ------ نہ ------ کرتے بھی گلابو کا سلیمہ کی زندگی سے کچھ تعلق تو تھا ------ ناجائز، غلط، گندہ، غلیظ سا تعلق مگر تھا تو ----- اسے سخت کوفت ہو رہی تھی کہ اس حقیقت کو نگلے گی کس طرح ؟ وہ ٹھیک سے اپنی کیفیت سمجھ نہ پا رہی تھی مگر تازہ صورت حال کے تقاضے اور اس سے جڑی تفصیلات اچھی طرح سمجھ گئی تھی چنانچہ اس سلسلے میں درکار انتظامات کے لئے احکامات جاری کرنے میں اسے قطعی تامل نہ ہوا۔

گلابو تو اس کے سامنے ہی نہ آیا تھا ۔ وہ فی الحال گلابو کے بارے میں زیادہ غور کرنا بھی نہ چاہتی تھی ۔

گلابو کئی روز اس کے سامنے نہ آیا۔ سلیمہ کے دل میں ہمک ہمک کر یہ خواہش بھڑک اور پھڑک رہی تھی کہ دیکھوں اس کا کیا حال ہے ؟

گلابو مست تھا ۔ یہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا ۔ آناً فاناً میں ہوا ۔ بھلا

کہاں وہ اور کہاں یہ سب نئی نئی (خوشگواری) تبدیلیاں - اسے بس سلیمہ سے شرم سی محسوس ہوتی تھی حالانکہ وہ بابوجی کے سامنے جانے میں ذرا بھی نہ جھجکتا تھا۔
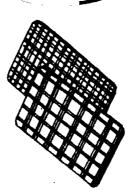
گلابو کو یہ سب اچھا لگ رہا ہے۔ کوئی تو ہے جو اس کا خیال رکھتا ہے - دیکھ بھال کرتا ہے۔ وہ ام ہانی کو نماز پڑھتے دیکھا کرتا - پھر اس نے اپنی بیوی سے دین مذہب کی باتیں پوچھنی شروع کر دیں - ام ہانی خوش تھیں، گلاب دین صاحب خود ہی اسلام کی طرف مائل ہو رہے تھے وہ سوچتی ایک روز وہ میکے جاکر یہ بتائے گی کہ گلاب دین صاحب بڑی اچھی قراءت کرتے ہیں ابا جی کتنے خوش ہوں گے ----؟

سلیمہ نے بہت بہانے سوچے کہ کسی طرح گلابو سے سامنا ہو مگر جیسے دل میں چور چھپا بیٹھا ہوا سے ہر بات آخر میں بے وزن اور چغلی کھاتی نظر آتی - آخر عورت تھی - عورت جو سات پردوں میں رہ کر بھی اپنے وجود کا احساس کرانے کی اہلیت رکھتی ہے - جب ایک روز بابوجی بعض معزز مہمانوں کے لئے چائے، کھانے وغیرہ کا خاص اہتمام کرنے کا کہنے آئے تو اس نے دودھ کی بات شروع کی اور لال گائے پر تان توڑی "دودھ سوکھ رہا ہے اس کا اور برابر بول رہی ہے - کچھ بندوبست کریں گے کہ بس مہمانداری میں لگے رہیں گے؟" بابوجی کو اور کچھ تو جیسے معلوم ہی نہ تھا بس اتنا جانتے تھے کہ ان کے گھر میں ہر مرض کا علاج اور دوا گلابو کے ہاتھ میں ہے، فرمایا "گلابو کو بھیجتا ہوں -----اسی سے کہنا---!"

"گلابو، کچھ کرو - دیکھو تو گائے بولنے لگی ہے - رات رات بھر سونے نہیں دیتی" گلابو کے آنے پر سلیمہ بی بی نے کہا "میں گیا تو ٹھیک تھی - یہ تو بے موسم ہی بولتی ہے - " گلابو نے جو منہ میں آیا، کہہ دیا "موسم کی کیا بات، گائے بول تو رہی ہے ----!" سلیمہ نے نظریں اٹھائیں تو سامنے وہی گلابو کھڑا تھا ایک ایک کرکے سلیمہ کی آنکھوں میں ساری پرانی تصویریں تیر گئیں - لال گائے اپنی نومولود بچھیا چاٹ رہی ہے - لال گائے، گابن ہو رہی ہے - گلابو اسے کاندھوں پر بٹھائے دوڑ لگا رہا ہے - وہ بھوسے پر گر پڑے، گلابو اس کو چاٹ رہا ہے - جیسے کچا ہی کھا جائے گا - - دونوں بھوسہ اڑا، اڑا کر کھیل رہے ہیں - گلابو کی چادر گر گئی ہے پر وہ سلیمہ کو گود میں بھرے چھلانگیں لگا رہا ہے ----- رس بھری آنکھوں والا گلابو -------کٹے ہونٹ والا، مدتوں نہ نہانے والا، بدبودار پسینے میں، تر بتر، وہی لمس زبان والا، پیر کے انگوٹھے سے ماتھے تک اور بالوں میں کاڑھی ہوئی مانگ کے بیچ اپنی لمبی جیبھ سے گدگدیاں کرنے والا ------- گاؤدم ہاتھوں، چھوٹی انگلیوں اور موٹے انگوٹھوں والا، ٹیڑھے میڑھے ہاتھ پیروں والا -----گلابو اس کے سامنے کھڑا تھا لیکن کتنا بدلا بدلا تھا وہ!! ہاں کئی تبدیلیاں دیکھنے میں آچکی تھیں - ٹنڈ پر بال تھے - ہونٹ کا کٹاؤ مونچھوں میں چھپ گیا تھا کپڑے ستھرے پہنے ہوئے تھا - پسینے کی بو کہیں دور جا چھپی تھی - آنکھیں کچھ سے صاف تھیں - بالکل صاف تھیں - کسی مچھلی کی آنکھوں کی مانند ---- کسی مچھلی کے آنکھوں ہی کی طرح تمام جذبوں سے عاری اور خالی ------

سلیمہ نے سوچا، واقعی گلابو کی آنکھیں پانی سے دھلی دھلی دکھائی دے رہی تھیں - جیسے وہ کبھی گدلی نہ ہوئی تھیں - وہ حروف دیکھ سکتی ہیں مگر بول نہیں سکتیں ----اسے جھٹکا سا لگا، سلیمہ کو صدمہ سا ہوا - کیا وہ واقعی بدل گیا ہے - یا سلیمہ خود اپنی حسرت سامانیوں اور تجسس اور ملکیت کے جذبوں کے بیچ گھری اسے ---- گلابو کو دوسری نظروں سے دیکھ رہی ہے ???

ایک پل کے لئے گلابو اور سلیمہ کی نظریں ملیں اور بکھر گئیں - اسی وقت ام ہانی چائے باہر بھجوا کر آگئی - جیسے کسی نئے حکم کی منتظر ہو - اسے دیکھ کر گلابو نے سلیمہ کو لال گائے کے بارے میں جواب دیا - "--- کچھ کرنا ہی پڑے گا---" اور وہ باہر نکل گیا جیسے غلطی سے اندر آگیا تھا!

یا تو سلیمہ کو کرید لگی تھی، وہ بہانے بہانے گلابو کو بلوا کر دیکھنا چاہتی تھی اور یا اب انجانے سے گردابوں میں پھنس گئی تھی - وہ عقلی، جذباتی تجزیے کرتی جا رہی تھی - اپنا اور گلابو کا تقابل بھی کرتی - لیکن یہ اس کے بس کی بات نہ تھی اس کے اپنے جسم سے ہلکی ہلکی آوازیں آتی، "گلابو --- گلابو ----" وہ عجیب سے کرب کے بیچ گھری پریشان سی، اداس سی بیٹھی تھی - ہتیرا ذہن جھٹکتی مگر جیسے خیال، نہیں خیالوں کے سمندر، سوچوں کے بھنور سے اس کا کوئی گہرا اناطہ تھا - اسے کسی پہلو چین و قرار نہ تھا - اسے اس وقت بڑا تعجب ہوا - ایک سوال کسی بڑے تالاب میں گرنے والے چھوٹے سے کنکر کی طرح اس کے قلب و ذہن میں ننھا سا دائرہ بناتا غائب ہو گیا مگر دائرہ تھا کہ پل پل بڑھتا، ٹوٹنے سے بچتے، پورے تالاب کی وسعت پر محیط ہوتا چلا جا رہا تھا بالکل ویسے ہی وہ سوال اس کے دماغ کے ہر خلئے سے چپک کر رہ گیا --- "کیا گلابو اپنی بیوی کو بھی چاٹتا ہوگا؟" ---- ضرور چاٹتا ہوگا - غصے کی ایک بانجھ لہر

نے اسے دبوچ لیا۔ اس کی لمبوتری جیبھ والے ہونق سے کچھ بعید نہیں، غصہ ڈھلا تو اسے پچھتاوا محسوس ہوا۔ امنگ سی اٹھی کاش یہ اسی کے لئے مخصوص ہو اور ام ہانی بے خبری ہو ---- لیکن گلابو کو کون روک سکتا ہے اور اس کو آتا ہی کیا ہے پھر سلیمہ کی خود ستائی رنگ لائی، گاؤں کے دالانوں میں ابھرتا روپ حاوی ہو جاتا ---- ہے ہے کیسی بری بات تھی۔ کتنی بری بات ہے۔ وہ کن سوچوں میں گرفتار ہے ---- چھی ---- چھی ---- ماضی زندہ سانپ بن کر اسے ڈس رہا تھا وہ سب غلط تھا، ہو گا مگر معمول میں بندھ گیا تھا۔ دونوں نے اسے قبول کر لیا تھا۔ وہ راز جاننا چاہتی تھی۔ وہ اس راز سے پردہ اٹھا کر رہے گی۔ سب باتیں، سب کے لئے نہیں ہوتیں۔ وہ ام ہانی سے دوستی کرے گی۔ وہ اس سے بے تکلف ہو کر سب راز اگلوائے گی۔ جیسے اس کی آئندہ زندگی کا انحصار اسی ایک بات پر آکر ٹک گیا ہو۔

ادھر ام ہانی نے کسی نیک پروین کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ وہ بات کرتی تو اللہ رسول کی۔ اگر کچھ چاہتی تو تھوڑا وقت چاہتی کہ گلابو کو اتنی فرصت مل جائے کہ ام ہانی اسے قرآن پڑھانے کی ابتداء کر سکے۔ سلیمہ سنتی اور سن کر بجھ بجھ جاتی۔

اور پھر وہ ہوا جس کے بارے میں سلیمہ نے سوچا بھی نہ تھا۔

وہ ام ہانی سے سبق لے رہی تھی۔ قرآن پڑھنے کے ساتھ مسئلے مسائل کی باتوں میں سلیمہ کا دل لگنے لگا۔ وہ نماز کی طرف مائل ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اسے سکون مل رہا ہے۔ گلابو کی طرف سے اس کا دھیان بٹ رہا ہے۔ بوجھل پن غائب ہو رہا ہے۔ وہ اپنے تئیں سب، نازک نازک سا محسوس کرنے لگی۔ وہ خوش ہو گئی --- گناہ، گناہ ہوتا ہے۔ اس نے اس سمت میں کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ جب گناہ کا تصور بندھا تو اسے ڈر لگنے لگا اگر کبھی پکڑے جاتے ---- وہ سرتا سر لہو رنگ ہو گئی۔ جگ ہنسائی --- بدنامی --- ذلت کیا کیا نصیب ہوتا ---- کشمکش جو تسکین پانے کو تھی۔ کرب جو پہلو بدل کر سونے جا رہا تھا۔ ہوتے ہوتے بھولا ہوا، گزرا ہوا درد بن کر سکون آشنا ہو گیا تھا کہ تقدیر نے ایک اور چکر کاٹا ----

اچانک ایک رات وہ آگیا ---- گلابو بغیر کھڑکائے اندر ہی گھس آیا۔ بابو جی دورے پر تھے مائی دوسرا تھ کے لئے، سونے کو ابھی پہنچی نہ تھی۔ حرامزادہ آیا اور آتے ہی اسے بے تحاشا چاٹنے لگا (اور اسے آتا ہی کیا ہے؟) بڑا اچانک حملہ تھا مگر سلیمہ تو بدل چکی تھی وہ بڑے تحمل سے سمٹتی رہی --- گلابو، ام ہانی کو پتہ چل جائے گا --- مائی آنے والی ہے ---- اور ---- اور اب جانے دو۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ یہ قصہ ختم ہونا ہی چاہیئے مگر گلابو بھر بھر منہ مار رہا تھا ---- سلیمہ نے لجاجت سے کہا "گلابو! میں نے بڑی مشکل سے اپنے کو سنبھالا ہے" سلیمہ نے "سنبھالا" یوں کہا جیسے وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ بری تیز ہوا کا جھونکا پنڈا چھوتا محسوس ہوا اور وہ کسی پتلی سی، ہلکی شاخ کی طرح ہلکورے لینے لگی ---- سنبھالا ہے ---- سنبھالا ہے۔ سنبھالا ہے۔ خاک سنبھالا ہے۔ خاک سنبھالا ہے وہ پھسک پڑی۔ وہ بے قابو ہو گئی۔ وہ روہانسی ہو گئی۔ اس کے آنسو تو نہیں بہہ رہے تھے پھر بھی وہ سسک رہی تھی۔ اس کی سانسیں دھونکنی بنی جا رہی تھیں ---- وہ بے سدھ ہو گئی، ڈھیر ہو گئی۔

سلیمہ، سلیمہ نہ رہی، ریت کے تودے کی طرح بھر بھر بیٹھ گئی گلابو اسے خزانہ دینا چاہتا تھا مگر سلیمہ کی مٹھی میں مرا چوہا بھی نہ آیا۔ وہ خالی کی خالی رہی --- وہ حیران، پریشان، اٹھی، کپڑے سمیٹے اور کرسی پر منہ نہوڑائے اوندھی دھنس گئی ---- گلابو نے تھامنا چاہا تو بمشکل کہہ سکی ---- جاؤ ---- گلابو چلے جاؤ ---- پھر وہ خفا خفا سا ہو کر بولا " تمہاری خواہ مخواہ کی ہٹ، تمہاری سسکیوں نے میرے پر برفیں ہی گرا دیں، ----" سلیمہ کی آواز میں صدیوں کے پچھتاوے ہڑ بڑا کر اٹھ آئے تھے " نہیں میں رو نہیں رہی تھی۔ کہیں برف بھی نہیں گر رہی تھی ---- جاؤ، چلے جاؤ ---- مائی آتی ہو گی ---- پھر سلیمہ نے غرا کر کہا " دفع ہو جاؤ تمہاری بیوی تمہارا انتظار کر رہی ہو گی ---" اور وہ دم دبا کر وہاں سے نکل گیا۔

وہ چلا گیا۔ مائی آگئی۔ دل شکستہ، ہارے ہوئے جواری کی طرح سلیمہ کرسی سے اٹھ کر پلنگ پر دراز ہو گئی۔ وہ یخ تھی۔ وہ سرد تھی۔ بجھ چکی تھی مگر سینے میں تاسف کا دور تھا تو ذہن میں سوچوں کا الاؤ دہک رہا تھا۔ وہ گلابو سے یہ بھی نہ پوچھ سکی اتنی مدتوں جھوڑتے رہے ہو کسی دوسرے کا بننے سے پہلے پوچھا بھی نہیں، بتایا بھی نہیں۔ سب کر گزرے تو اس کے بعد آنکھ بھی نہ ملائی آنکھ تو بولتی ہے۔ سب کچھ کہہ دیتی ہے۔ اسی لئے نظریں چرائے دور رہے؟ اب میں راہ کے کانٹے چننے میں لگی تو تم پھر سے، ببول بچھانے آگئے ---- "تو، سسکنے اور بلکنے کی بجائے یہ سب کہہ دیتی آخر وہ کچھ بولی کیوں نہ؟" اسے یاد آیا کتنے جتن کئے تھے پھر گانے کے بولنے کے بہانے بلایا تو اس نے گلابو کی آنکھوں میں جھانکنے کی

کوشش کی تھی ۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا ۔ جیسے وہ گلابو کی آنکھیں نہیں کسی
مچھلی کی آنکھیں ہیں ۔ جذبوں سے خالی ، قطعی گونگی ، پھر اس نے ٹھوکر
کیوں کھائی وہ سمجھ کیوں نہ گئی اس نے گلابو سے وابستہ توقعات کا گلا
تبھی کیوں نہ گھونٹ ڈالا ۔ اس کا سنبھلنا جھوٹا تھا اور نہ گلابو کے چھوتے
ہی اسے جھڑک کر نکال دینا چاہئے تھا ۔ اس کا رویہ لجلجانہ ہوتا تو اس کی کیا
مجال تھی کہ ہاتھ بھی لگاتا ۔ آخر ان کا آپس میں کیا رشتہ ہے ۔ وہ اسے اپنے
جسم سے ، اپنی جان سے اپنے وقار سے کیوں کھیلنے دیتی ہے ۔ ذرا اندھی
ہو گئی ہے ایک ان بجھ پیاس کا سراب لے کر وہ کسی خشک کنوئیں میں
گر پڑی ہے ۔ لیکن جتنی پستی کا منہ آج اس نے دیکھا اس سے مرجانا اچھا تھا

---- پھر خیال کی ایک دوسری رو آئی ۔ بات یہ ہے سلیمہ بی
بی تمہارا اور گلابو کا رشتہ جھوٹا تھا ۔ ام ہانی اور گلابو کا رشتہ سچا ہے ۔ وہ
پوری طرح اس کا ہو گیا ہے ۔ یہ اس میں اور ام ہانی میں سماجی امتیاز کا نتیجہ
نہیں یہ تو عورت کو عورت کی پچھاڑ ہے ۔ گلابو اسے " نیک پروین "
سمجھتا ہے اور سلیمہ کو کھلونا ---- اور کیا ---- خطا کس کی ہے ؟
سلیمہ نے سر جھٹکا اور پریشان خیالی سے جان چھڑائی مگر سوچوں
کی ، فکروں کی یورش اسے چھوڑتی ہی نہ تھی ۔ اسے حیرانی ہوئی اسے نہ ام
ہانی پر نہ گلابو پر بلکہ خود اپنے اوپر غصہ آیا ۔ بس خیال آرہے تھے خیال
جا رہے تھے ۔ وہ ان کی تیز رو میں تنکے کی طرح بہہ رہی تھی ۔
" کتنی عجیب سی بات ہے ۔ " سب پچھتاوے ، الجھاوے ایک
طرف اس میں یہ کرید اب بھی پوری طرح موجود تھی ۔ آخر گلابو کو ہو کیا
گیا ہے ؟

ایک بار بابوجی اسی طرح باہر گئے ہوئے تھے ۔ اس نے مائی کو
اپنی دوسراتھ کے لئے رات کو بھی بلا لیا تھا مگر رات اسے جو دودھ پلایا
اس میں افیم ملا دی تھی ۔ مائی پڑی سوتی رہی اور وہ گلابو کو بلا لائی تھی کہ
آج تیری سب سے بڑی خواہش پوری کر دوں ۔ تیری تمنا تھی کہ تو رات
بھر میرے ساتھ سوئے ۔ لیکن دونوں سوئے کہاں تھے ۔ ان کا تو انگ
انگ جاگ اٹھا تھا ایک بار وہ نیند سے غافل ہو گیا ذرا اونگھ آئی تو اس
وقت بھی گلابو کا جسم جاگ ہی رہا تھا ---- تب کیا اس کا خزانہ بھرا تھا
کیا ؟ اور آج خالی ہو گیا ---- ؟
ہاں یہ خیال تازہ کرب کے ساتھ جڑتا نظر نہ آتا تھا بلکہ یہ احساس
غالب تھا وہ لٹ گئی ہے برباد ہو گئی ہے ۔ اسے یوں برباد نہیں ہونا
چاہیے تھا ۔ وہ ایک سراب کے لئے کیوں بے چین ہو ۔ ماضی کو دفنا
کیوں نہ دے ۔ وہ یوں کب تک قلق کرے گی ۔ وہ کب تک گراوٹوں کا
شکار رہے گی ۔ آخر ایک دن یہ بھید کھل جائے گا تب ---
اس نے فیصلہ کیا ۔
وہ صبح اٹھتے ہی دونوں کو ---- دونوں میاں بیوی کو گھر سے
نکال دے گی ۔ بابوجی سے کہہ دے گی انہیں ان کی آئندہ نسلیں نہیں پالنی
---- اور پھر یہی خیال ، دھیرے دھیرے اس پر غالب آگیا ۔ یہ کوئی
خیال نہ تھا ۔ ایک سیدھ ، صحیح راستہ تھا جس پر چلنے میں سکھ تھا ، شانتی
تھی ، خدشے معدوم خطرے دم توڑ کر پیروں تلے مرجاتے ہیں !!
صبح آنکھ نہ کھلی ، کھلی تو سورج اپنا آدھا سفر تمام کر چکا تھا ۔ بابو
جی پاس والی کرسی پر بیٹھے اس کو دیکھ رہے تھے ۔ سلیمہ کو بیدار دیکھ کر
مسکرائے " پتہ ہے ؟ کب سے بیٹھا یاد خدا کر رہا ہوں ؟ " وہ جھینپ گئی
دوڑ کر غسل خانے میں چلی گئی ۔ منہ دھوتے سے سوچتی رہی ۔ بابوجی میں
کیا نہیں ہے ۔ وہ اسے کتنا چاہتے ہیں کتنا سکھ دیتے ہیں ۔ آرام پہنچاتے
ہیں ۔ جان چھڑکتے ہیں لیکن وہ کتنی نیچ ہے ۔ ان سے بے وفائی کرتی ہے ۔
ان کی عزت نیلام کرتی ہے ۔ وہ خود کو کبھی معاف نہیں کرے گی ۔ وہ
تلافی کر کے رہے گی ۔ بابوجی کو خوش رکھے گی ۔ ان پر نثار ہو جائے گی ۔
وہ مشین نہیں ، بے حس نہیں وہ انسان ہے ۔ احساس رکھتی ہے ، ضمیر
رکھتی ہے ۔

اب وہ بابوجی کے لئے صرف بابوجی کے لئے وقف ہے ۔ بابوجی
تھوکیں گے وہ چاٹ لے گی --- چاٹنے کے تصور سے اس کا خیال پھر
گرنے لگا وہ گلابو کے بارے میں آئی سوچ کو پہلی بار نفرت سے ، کراہیت
سے جھٹکنے میں کامیاب ہو سکی ۔ وہ بال سلجھاتی ، مسکراتی بابوجی کے سامنے
آکھڑی ہوئی ۔ بابوجی چیتے کی سی پھرتی سے لپکے ۔ دروازہ بند کیا چٹخنی لگائی
اور زور سے کہا " ادھر کوئی نہ آئے ۔ میں آرام کر رہا ہوں ---- "
سلیمہ نے بیچ بیچ محسوس کیا ۔ بابوجی کے پاس تو سب کچھ ہے ۔
سب کچھ ہے ۔ ان کے خزانے بھرے پڑے ہیں ۔ خزانے بھرے ہیں اور
پھر اس کا خیال خالی خزانے کی طرف چلا گیا مگر یہ بگولے کی طرح اور اسی
کی طرح فنا ہو جانے والا خیال تھا --- گلابو اس کی نظروں سے گر چکا تھا ۔
وہ اس کا دشمن تھا ۔ اسے کھسوٹ لیا تھا اس نے سوچا ،
سلیمہ بی بی کیچڑ سے جینا سیکھو !
بابوجی ساری رات کا سفر کر کے لوٹے تھے ۔ تھوڑی دیر میں

غافل ہو گئی سلیمہ نے پیار سے کان میں پوچھا " ناشتہ کر کے سوتے تو اچھا تھا ..... " مگر وہ گہری نیند میں چلے گئے تھے ۔ کوئی جواب نہ دیا ۔ وہ پہلو سے اٹھی باہر آئی اور گھر کے کاموں کی طرف متوجہ ہو گئی ۔

اسے خبر ہی نہ ہوئی گلابو وہاں کھڑا ہے ۔ وہ دیر سے وہاں کھڑا تھا اس نے خیریت سے اجنبیت سے بالکل مالکوں کی طرح پوچھا " کیا بات ہے ؟ " گلابو مسکرا رہا تھا اس کی مسکراہٹ سہما کر رہ گئی وہ " کچھ نہیں " کہہ کر ہٹ گیا ۔ ہلکے بادل کے گزرتے سائے کی طرح سلیمہ کو لگا گلابو کی آنکھوں میں کچھ تھا ۔ وہ مچھلی کی آنکھیں، کم از کم اس وقت نہیں تھیں ۔ ان میں کچھ تھا، کیا تھا، کیا تھا ؟ سلیمہ نے اپنے کمزور خیالوں کو سرزنش کرتے ہوئے عزم باندھا " بکواس ہے " ۔ اس کمینے کی آنکھیں جھوٹ بولتی ہیں " جیسے سلیمہ نے نئی حقیقت دریافت کر لی ..... آنکھیں شاید جھوٹ بول سکتی ہیں مگر جسم کی بھی ایک زبان ہے اور جسم کبھی جھوٹ نہیں بولتا ..... بس یہ حقیقت ہی یاد رکھنے والی ہے ۔ وہ یہ یاد رکھے گی تو کبھی نہیں ڈوبے گی ۔

دوپہر کے لگ بھگ سلیمہ ، بابوجی کے لئے کئی کھانے بنا چکی تھی پھر وہ طشت میں چن کر سجا کر کمرے میں ، مائی سے اٹھوا کر ، لے آئی ۔ بابوجی کو جگایا ۔ مائی پانی ڈالتی رہی اور وہ بابوجی کے ہاتھ دھوتی رہی ۔ بابوجی مسکراتے رہے ۔ ہنستے رہے پھر انہوں نے سلیمہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر مائی کو دیکھا جیسے ان کے دل میں کچھ تھا مگر مائی کی موجودگی مانع تھی اس لئے باز رہے ۔ انہوں نے جلدی جلدی دو چار چھینٹے مارے اور مائی کو رخصت کر دیا ۔ وہ کھانے لگے تو انہوں نے کہا سلیمہ بار بار کیا نہانا ..... اور غسل دوسری صبح پر ملتوی ہو گیا ۔

سلیمہ غسل کر کے نکلی تو آئینہ دیکھ کر حیران رہ گئی ۔ کیا سامنے اسی کا عکس ہے ؟ وہ اتنی پر وقار ، اتنی حسین کہاں تھی ۔ کیا سچ سامنے اسی کا عکس ہے ؟ اس نے باور کر لیا ۔ سامنے وہی ہے ، وہی حسین ہے اور اس میں وقار اور تمکنت بھی ہے ، روپ بھی ہے ۔ ایسا روپ کہ سنگھار کی ضرورت نہیں ..... آج ضرور کوئی نئی سی بات اس میں آگئی ہے ۔ نیا پن پیدا ہو گیا ہے ۔ بابوجی باہر نکلنے سے پہلے خدا حافظ کہنے لگے تو جاتے جاتے رک گئے ۔ پلٹے نظر بھر کر دیکھا اور ایک زبردست مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیل گئی ۔ بری گمبھیر خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوئے ۔ سلیمہ کو لگا وہ رانی ہے ، پدمنی ہے ، ہیر ہے ، سوہنی ہے ، وہی شیریں ہے ، خوشیاں اسی کا حق ہیں اور خوشیاں اس کی چاروں سمتوں میں رقص کر رہی ہیں ۔

تھوڑی دیر بعد اس کے میکے کے چند لوگ آگئے ۔ گھر میں گہما گہمی کم کب ہوئی تھی ۔ رونق بڑھ گئی شام تک مسرتوں کا راج رہا ۔ ایسی مصروف ہوئی کہ بابوجی کا دھیان بھی نہ آیا ۔ اس نے پوچھا کب تھا وہ آئیں گے ، کب آئیں گے ؟ مائی کو کھانا دیا اور رخصت کر دیا ۔ باہر والے ملازم اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے ۔ وہ باہری رہتے تھے ۔ سلیمہ کو ان کی ضرورت بھی نہ تھی ۔ سلیمہ ایسی چور، چور کبھی نہ ہوئی تھی ۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں جو کچھ ہوا وہ پہلے یوں ہوا ہی کب تھا ۔ وہ تھک چکی تھی ۔ لیکن وہ مسرتوں کے احساس تلے بھی چور چور ہو رہی تھی ۔ وہ ہلکے کپڑے پہن کر سونے کے لئے اپنے نرم بستر پر چلی ہی تھی کہ کسی نے بڑے دروازے پر زور ، زور دے دستک دی ۔ وہ حیران رہ گئی کہ اب اکیلی تھی اور جواب میں اسی کو دروازے تک جانا تھا ، دروازہ کھولا تو وہی گلابو کھڑا تھا ۔ اس کا وجود اس کو سخت ناگوار گزرا ۔ وہ اس کو برداشت کرنے کے لئے قطعی تیار نہ تھی ۔

" کیا ہے ؟ " سلیمہ نے حقارت سے پوچھا ۔

وہ کچھ دیر منہ ہی منہ میں بڑ بڑاتا رہا ، پھر بولا " ام ہانی بیمار ہے ۔ شاید گردے کا درد ہے ..... اس کی بات ادھوری ہی رہی کہ سلیمہ بیچ میں بول پڑی ... " " تو میں کیا کروں ۔ میں کوئی ڈاکٹر ہوں ۔ ہسپتال جاؤ ڈاکٹر کو بلالاؤ .... " وہ جانے لگا پھر پلٹ آیا سلیمہ بی بی، .... بابو جی کہہ گئے تھے ، وہ دیر سے آئیں گے ۔

" اچھا ، اچھا ! جاؤ اور بیوی کی خبر لو " سلیمہ نے سپاٹ سے لہجے میں کہا ۔ وہ واقعی چٹان بن گئی تھی ۔ وہ دروازہ بند کرنے لگی تو گلابو لجاجت سے بولا " بی بی ! وہ شاید مر جائے گی ۔ ہائے ہائے کرتی آپ کا نام لیتی تھی ۔ سلیمہ بی بی کو بلا دو ، سلیمہ بی بی مجھے بچالو ..... "

سلیمہ ، گلابو سے اچاٹ تھی ، اس سے سلیمہ کا دل بھر گیا تھا ۔ بالکل ہی بھر گیا تھا لیکن ام ہانی تو بے قصور ہے ۔ ان کی آپس میں دشمنی نہیں ۔ وہ اسے کتنے خلوص سے دین کی باتیں بتاتی ہے ۔ اس کی خبر نہ لینا سنگدلی ہے ۔

" اچھا جاؤ ۔ ڈاکٹر کو بلالاؤ اور مائی کو راستے سے لیتے جانا میں جاکر ام ہانی کو دیکھتی ہوں " سلیمہ نے کسی قدر متردد ہوتے ہوئے کہا ۔ گلابو جب چلنے لگا تو اسے بالکل ہی فضول قسم کا آدمی دکھائی دیا ۔ اسے بڑی کراہیت اور نفرت سی محسوس ہوئی ۔ ام ہانی اپنی جگہ ، اس کی تکلیف پر ،

پریشان ہونا دوسری بات ہے لیکن یہ عراقی کیسا مرا جارہا ہے۔ گلابو
بائیں طرف مڑا تو سلیمہ۔ بھی تیز تیز قدم اٹھانے شروع کئے اسے لگا دور ام
بانی ہی کراہ رہی ہے۔

احاطہ پار کرکے وہ گلابو کی کوٹھری پر پہنچی تو وہ سنسان تھی۔
سلیمہ نے اندر جھانکا، ایک قدم ادھر گئی، ایک قدم ادھر گئی۔ کوٹھری
کون سی اتنی بڑی تھی۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ پلٹ رہی تھی کہ دروازے
پر گلابو آکر کھڑا ہوگیا۔۔۔۔وہ شیطانی قہقہہ لگاکر سلیمہ کو کھاجانے والی
نظروں سے دیکھنے لگا۔

"ام بانی تو آپ ہی کے مہمانوں کے ساتھ میکے گئی ہے۔۔۔۔اور
بابوجی بھی آج نہیں آئیں گے۔۔۔۔"

سلیمہ نے صورت حال کا جائزہ لیا۔ وہ بے بس تھی لیکن اب
وہ گلابو اور اس کے ساتھ تازہ ہتھکنڈے سے اور بھی متنفر ہو چکی تھی۔
اس نے اپنی قوتوں کو جمع کیا اور گلابو کو دھکا دے کر باہر نکلنے کے لئے
جست لگائی۔۔۔۔وہ پھر اس کے بالکل سامنے آکھڑا ہو" سرکار اب تو نہیں
جانے دوں گا۔ صبح ہوگی تب جائیے گا!"

"مردار۔۔۔۔۔دفان ہو۔ دیکھ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا! سلیمہ
نے اعلان کیا پچھلے سب قصے اب ختم۔۔۔۔"

وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اسے یقین ہوگیا۔ سلیمہ بی بی اس پر
حاوی نہ ہوسکیں گی۔ ہاتھ پیر نہ چلائیں گی۔ اس نازک سی عورت میں
اتنی ہمت اور طاقت نہیں۔ وہ نرمی سے بولا "سلیمہ جی ذرا میری طرف
دیکھنا۔۔۔۔" گلابو تمام تر شہد و شکر بن چکا تھا۔ "دیکھو تو سہی۔ میں
ہوں تمہارا نوکر تمہارا اکائی تمہارا خدمت گار۔۔۔۔مجھ سے خفا نہ ہو۔"
گلابو کی آنکھوں کا پیمانہ چھلکنے کو تھا "ہٹ جا میرے سامنے سے" سلیمہ
نے پوری نفرت سے کہا مگر "ہٹ جا" کہتے کہتے وہ جیسے پگھل بھی گئی
"چل تیری آنکھیں تو جھوٹ بولتی ہیں۔۔۔۔۔"

"نہیں نہیں۔۔۔۔۔ سلیمہ بی بی۔ ہرگز نہیں" گلابو نے
یقین دلانے کے لئے پورا زور لگادیا۔

نہیں، نہیں۔۔۔۔۔" "سلیمہ بی بی نے بھی ایک ہی وقت میں
اس کے ساتھ ساتھ کہا مگر دونوں کی "نہیں نہیں" کا مفہوم جدا جدا تھا
۔۔۔۔گلابو نے ہاتھ بڑھا کر سلیمہ کو اپنی طرف کھینچا اور گود میں بھرلیا
شانوں پر بٹھالیا۔ وہ چھوٹی سے کوٹھری میں ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ "بی بی
جی میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ ام بانی کی ماں کی۔۔۔۔ام بانی کی بہن کی
۔۔۔۔۔وہ اپنی بیوی کا نام لے لے کر گالیاں بک رہا تھا۔ پھر وہ گیت
گانے لگا۔ آج اس کے سب کھیل نرالے تھے۔ وہ سلیمہ کو گیند کی طرح
لڑھکاتا، کچھ کرتا اسے مدھول رہا تھا اسے روڑک رہا تھا۔ بلو رہا تھا۔ وہ
بھی لسی کی طرح پتلی ہوتی گئی۔ مکھن بنتی گئی پھر اس نے گلابو کے
کشمشی بال مٹھی میں لے کر اسے نیچے گرالیا وہ اس کے سینے پر سوار ہوگئی
اسے پیار کرنے لگی اور پھر خود بخود رونے لگی۔ ہاں مجھ سے دور مت ہونا
مجھ سے خفا نہ ہونا۔۔۔۔۔ مجھے مت چھوڑنا۔ میں مرجاؤں گی، میں
مرجاؤں گی" گلابو اس تغیر پر حیران ہوگیا۔ وہ سیدھا چت لیٹا تھا، لیٹا ہی
رہا۔ وہ یوں پڑا تھا جیسے وہ ایک پتھر کی سل ہے جیسے وہ۔۔۔۔وہ کچھ
بھی نہیں۔۔۔۔۔آج پہلی بار سلیمہ بی بی وارفتگی سے اسے چوم رہی تھی
اسے چاٹ رہی تھی۔ ادھر سلیمہ کی دیوانگی بڑھتی جارہی تھی، ادھر گلابو
حیران ہو ہو کر ڈھیر ہوا جارہا تھا۔

یہ کیا؟ یہ کیا؟ سلیمہ بے بسی سے چپ ہوگئی۔ اس کی عزت
نفس کو ایک بار پھر دھکا لگا۔ وہ دوبارہ رونے لگی یہ رونا، پہلے رونے
سے مختلف تھا۔ اسی میں ہار تھی شکست تھی پچھتاوا تھا۔ افسوس اور
کرب تھا، ذلت اور بے عزتی کا احساس تھا۔ یہ سنگین مذاق اس کی
برداشت سے باہر تھا۔ گلابو کو اپنا قصور معلوم نہ تھا مگر وہ خود کو قصور
وار بھی سمجھ رہا تھا وہ معطل سا ہوکر رہ گیا۔ سلیمہ اٹھ کر جانے لگی تو وہ
روک بھی نہ سکا۔

سلیمہ دروازے تک گئی۔ پلٹی، گلابو کو دیکھا اور چیخ کر کہا۔
تیری آنکھوں نے جھوٹ بولا تھا۔ اس سے تو میں مرجاتی، مرجاتی۔۔۔۔۔
میں جانتی ہوں۔ جسم کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔۔۔۔۔۔مرجانے! تو نے
مجھ سے کون سا بدلا لیا۔ سلیمہ یوں چل رہی تھی جیسے اس کی ٹانگیں شل
ہوں۔ وہ گھسٹ رہی تھی اپنی ٹانگوں کو، کبھی سر کو تھامتی کبھی آسمان کی
طرف دیکھتی۔۔۔۔۔۔چاند نکل آیا تھا۔ روشنی میں اس کا سایہ گلابو کو
بڑا بھیانک لگا۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اٹھ کر سلیمہ کے ساتھ ساتھ
چلتا۔ وہ اپنی کوٹھری میں لیٹا تھا اور باہر سلیمہ اس سے دور۔۔۔۔دور
ہوتی جارہی تھی فاصلہ مہیب اور بے کراں فاصلہ درمیان میں حائل ہوتا
جارہا تھا!!

ڈاکٹر وجے موہن ومٹو
209, DOVER ROAD
CORNWALL, ONTARIO
K6J IT 7 (CANADA)

میں تمہارے ساتھ جینا چاہتا ہوں، اور مرنا بھی

تمہیں وہ دن ضرور یاد ہوں گے۔ جب ہم گھنٹوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ اور درخت کی جھکی ٹہنیاں چپ چاپ ہماری باتیں سنتی رہتی تھیں۔ چاہے وہ ٹھنڈی راتیں تھیں، یا مہکتی ہوئی چاندنی سے بھری یا تیز ہواؤں کے تھپیڑے سے کھاتی چلاتی یا ہلکی ہلکی بوندوں سے بھری۔ ان راتوں میں، تمہاری پیار بھری باتوں میں ایک جادو سا بھرا ہوتا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا۔ جب ہم نہر کے ساتھ ساتھ چلتے تھے اور شام کی خاموشیوں میں ہلکے سے اندھیرے بڑھنے لگتے تھے تو میں اور تم دونوں نہر کے پل کے اوپر بیٹھ کر ایک دوسرے کی طرف پیار سے گھنٹوں دیکھتے رہتے تھے۔ بنا ایک لفظ کہے۔ لیکن اس خاموشی میں سب کچھ تھا۔ اقرار تھا، وفا تھی اور سب کچھ تھا۔ جو ہمارے دو دل ایک دوسرے سے چاہتے تھے۔ پھر جب وہ پورا چاند آسماں پر نکل آتا تھا۔ تمہاری ہر سانس میں، چنبیلی کی خوشبو سی دوڑ جاتی تھی۔ بہکی ہوئی سی چاندنی تمہیں بے بس سا کر دیتی تھی۔ ہمیں لگتا تھا۔ اس چاندنی کی کرنوں میں دنیا بھر کی محبت کے سب گیت تھے۔ پیار کی ہوس نہیں۔ ہماری پاک محبت کی آگ تھی۔ اس محبت کی آگ کو میں آج بھی اپنے دل کی گہرائیوں میں آباد کئے بیٹھا ہوں۔ چاہے میں دریچے میں کھڑا ہوتا ہوں، چاہے میں اکیلا ہوتا ہوں یا کسی محفل میں دوسرے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہوں۔ میں اب بھی ان بہاروں کو، ان دنوں کو یاد کرتا ہوں۔ جب تم اور میں ساتھ ساتھ تھے۔ ایک دوسرے کے تھے۔ اور اکثر ان دنوں کی یاد مجھے آتی ہے۔ جب تم مجھ سے روٹھ جایا کرتی تھیں۔ اس روٹھنے میں، تمہاری، تمہارے پیار کی ایک خاص ادا تھی۔ جب بھی تمہارا روٹھنے کا انداز میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے، میرے ہونٹوں پر سنجیدگی کے ساتھ ساتھ ایک مسکراہٹ سی چلی آتی ہے اب اس طرح کوئی نہیں روٹھتا۔ جیسے کہ تم روٹھا کرتی تھیں۔ میں اب بھی تمہارے روٹھنے کا انتظار کرتا ہوں۔ شام کی خوشیوں میں تم اکثر میرے دل و دماغ پر چھا جاتی ہو۔ میں اداس سا ضرور ہو جاتا ہوں۔ لیکن غمگیں نہیں۔ کیونکہ میرا دل اب بھی تمہارے پیار کے ساتھ ہے۔ یعنی تم اب بھی میرے پاس ہوتی ہو۔

میں نے ان خوابوں کو کبھی تمام نہ ہونے دیا۔ اس محبت بھرے درد کو، آنسوؤں کی نمی نہ بننے دیا۔ اب چاہے ملنے کی، ملاقات کی کوئی امید نہ سہی، نہ گھنٹوں ساتھ بیٹھنے کی، نہ ایک دوسرے کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے کی، ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی۔ پھر بھی تم میرے بہت قریب رہتی ہو۔ میں تمہیں ہر روز بے حد یاد کرتا ہوں۔ اور میں تم سے یہ کبھی پوچھنا نہیں چاہتا کہ کیا تمہیں اب بھی میری یاد آتی ہے۔ کیونکہ ہمارا ایک دوسرے کے بارے میں سوچنا، وہ پاکیزہ اعتماد، امنگوں سے بھری محبت، ہماری ایک دوسرے کی یاد ———— ابھی تک ہم دونوں کی امانت ہیں۔ تمہیں بھول جانا آسان نہیں، اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے سینے میں، تمہارے خیالوں میں، ہر سوچ میں، تمہارے جسم کے ہر حصے میں اب بھی میری یاد ویسے ہی زندہ ہے جو سالوں پہلے تھی۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہم اس زندگی میں رہتے ہوئے اس دنیا میں، ہم ایک

دوسرے کے نہ ہوسکے ۔ صرف یادوں کے سہارے رہتے رہے ۔ میں اکثر سوچتا ہوں یعنی اکثر یہ خیال میرے دل میں آتا ہے کہ کاش ہم دونوں ہر صبح ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ، مسکراتے ہوئے بستر سے اٹھتے اور اس طرح ہر رات ، ایک دوسرے کی طرف محبت سے دیکھتے ، ایک دوسرے سے لپٹ کر سوتے ۔ میں اب بھی گھنٹوں ان خیالوں میں ، تمہاری یاد میں کھویا رہتا ہوں ۔ اور میرے سب دن ، اچھے ہوں یا برے ، تمہارے بنا گزر ہی جاتے ہیں ۔ لیکن میں ان اچھے سنہرے دنوں کو یاد کرتا ہوں ۔ جن میں ، ہم تم دونوں ساتھ تھے ۔ اب بھی جب چاندنی راتوں کو میں اس نہر کے پل سے گزرتا ہوں ۔ وہ پورا چاند کئی بار آسمان سے ، نہر کی گود میں چمک کر میری طرف دیکھتا ہے ۔ بالکل اسی طرح جیسے تم مجھے دیکھا کرتی تھیں ۔ اس چاندنی رات میں اب وہ مہک نہ سہی ، لیکن اس چاند پر اب ہماری کھوئی ہوئی محبت کا گہرا داغ ہے ۔ یہ چاند اور چاندنی مجھے اب بھی بے حد پیارے ہیں ۔ کیونکہ ان کے ہوتے ہوئے مجھے وہ دلکش دن اور چاندنی میں ڈوبی راتیں یاد آتی ہیں ، جب تمہارا میرا ساتھ ہوتا تھا ۔ یہ چاندنی اب بھی ایک گہرا تاثر لئے ہے ۔ لیکن یہ تاثر اب کئی بار ایک اجنبی درد بن کر امڈ آتا ہے پھر بھی یہ اجنبی درد مجھے بڑا پیارا ہے ۔

تمہیں یاد ہوگا ۔ جب خزاں آتی تھی ۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ، مرجھائے ہوئے ، زمین پر گرے ہوئے سوکھے پتوں پر گھومتے پھرتے تھے ۔ ہمارے قدم ، ان سوکھے پتوں پر کیسی آواز کیا کرتے تھے ۔ وہ پت جھڑ کے پتوں پر چلنے کی آواز اب بھی میرے دل کو بہت بھاتی ہے ۔

پھر تم اپنا سر ، بائیں طرف کو جھکا کر میرے دائیں کندھے پر رکھ دیتی تھیں ۔ اور میرا داہنا ہاتھ ، خود بخود تمہاری کمر کے گرد چلا جاتا تھا ۔ تم کہا کرتی تھیں ۔ یہ ہاتھ کبھی نہ اس کمر سے ہٹنے دینا ۔ اور تمہارے سر کو ہمیشہ اس کندھے کا سہارا دیتے رہنا ۔ یہ صرف باتیں نہ تھیں ۔ ہماری ایک دلی چاہت تھی ۔ ایک دوسرے سے پیار کا اظہار تھا ۔ ایک دوسرے سے ساتھ رہنے کا وعدہ تھا ۔ ایک دوسرے کے ساتھ جینے کی تمنا تھی ۔ کاش ، ہم دونوں اس وقت ، ہمیشہ اکٹھا رہنے کی قسم بھی کھالیتے ۔ یہ ہم دونوں سے بڑی بھول ہوئی ۔ میں اب سوچتا ہوں ۔ اور میرا دل ہر بار کہتا ہے کہ ان محبت بھری باتوں سے ، پیار کے صحیح جذبوں سے ، ایک دوسرے سے روز ملنے سے ، ساتھ ساتھ چلنے سے ، اٹھنے بیٹھنے سے ، زندگی میں کوئی اور چیز زیادہ حسین نہیں ہے ۔ پہلے یہ کبھی گمان بھی نہ تھا کہ ہم ایک دن ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں گے ۔ میں تمہیں کہنا چاہتا ہوں کہ جب سے تم میری آنکھوں سے اوجھل ہوئی ہو ۔ مجھ سے جدا ہوئی ہو ، تم مجھے بے حد یاد آتی ہو ۔ یعنی اور زیادہ یاد آتی ہو ۔ پہلے سے کہیں اور زیادہ ۔ اور شاید یہی تمہاری یاد میرے پیار کا سرمایہ ہے ۔ یہ بچھڑنا بھی عجیب فطرت ہے جب ہم لوگ ایک دوسرے کی آنکھوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں تو ایک دوسرے کو کتنا یاد آتے ہیں ۔ میں نے ویسے محسوس کیا ہے کہ لوگ صرف اور اکثر پرانی یادوں کے سہارے زندہ رہتے ہیں ۔ کسی سے ملو تو اکثر گزرے دنوں کی باتیں ہوتی ہیں ۔ چاہے وہ پرانے دن اچھے ہوں یا برے

ویسے میرا خیال ہے کہ لوگ اپنے ماضی کے ساتھ ہی زندہ رہتے ہیں اور خاص کر اس ماضی کی باتیں کرتے ہیں ۔ جس میں نہ بھلانے والی خوبصورت یادیں بھری ہوتی ہیں ۔ میں نے دیکھا ہے کہ کوئی حال کی زیادہ باتیں نہیں کرتا ۔ اگر کسی سے پوچھو کہ کیا حال ہے مطلب کہ اب کیسے گزر رہی ہے ۔ تو اکثر جواب ملتا ہے ۔ ٹھیک ہوں یا سب ٹھیک ہے یعنی حال کی کوئی اور زیادہ بات نہیں ہوتی ۔ جب کہ دوستوں ، رشتہ داروں کے سامنے ماضی کی ایک بات چھیڑ دو ۔ تو پھر وہ پرانی باتیں ، پرانے قصے کبھی ختم ہونے پر نہیں آتے ۔ لوگ بچپن کی باتیں کرتے ہیں کہ جب موسلا دھار بارش پڑتی تھی ، نالے پت نالے بہہ جاتے تھے ۔ تو وہ کیسے ننگے ہوکر ، سڑکوں پر ، گلیوں میں بارش میں دوڑتے پھرتے تھے اس ماضی میں خوشی کا اظہار ہے ۔ پھر کیسے گرمیوں میں وہ چھتوں پر ، سڑکوں پر ، پتنگ اڑایا کرتے تھے ۔ گلی گلی میں کنچے ، گولیاں کھیلتے پھرتے تھے ۔ گلی ڈنڈا کھیلتے تھے ۔ آنکھ مچولی کھیلتے گلیوں ، گھروں میں اور پیڑوں کی موٹی موٹی جڑوں اور تنوں کے پیچھے چھپتے تھے ۔ یہ سب ماضی کے رنگین خوبصورت خواب ہیں ۔ جو ایک دن حقیقت تھے ۔ یہ سب کھیل بچپن کی پرانی باتیں ، اور کالج کے دنوں کے خوشگوار لمحے ، چاہے کچھ بھی کہو ، قبر کو جانے تک انسان کی یادوں میں سنورتے ، ابھرتے اور کلپتے رہتے ہیں ۔ میرا خیال ہے ۔ مستقبل کی کوئی بات نہیں کرتا ۔ کیونکہ مستقبل کس نے دیکھا ہے ۔ حال میں کتنے محبت بھرے خواب نہیں ، جو زندگی کو ماضی کی طرح حسین بنادیں ۔ سو اسی لئے میری زندگی میں ، ان

راہوں میں، یہ تمہاری یادیں ہیں جو میرے ہام سکون کا سرمایہ ہیں ۔ کئی بار قدرتاً یہ یادیں ایک آدھ آنسو بن جاتی ہیں ۔ جو رک کر اور کئی بار رک رک کر، میری آنکھوں سے گر جاتے ہیں ۔ لیکن یہ آنسو مجھے پھر یاد دلاتے ہیں کہ ابھی وہ تمہارے ساتھ گزارے دن اور کالج میں ملنے کا دلکش اور خوشگوار باب ختم نہیں ہوا ۔ یہ آنسو مجھے لڑکپن کی بے فطری یاد دلاتے ہیں ۔ اس آغاز محبت کے رنگین خواب دکھاتے ہیں ۔ اور کئی بار میں ان گرتے ہوئے آنسوؤں کے قطروں کو اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں رکھ کر ان کی طرف روشنی میں گہری نظر سے دیکھتا ہوں ۔ کئی بار ان آنسوؤں میں قوس قزح ابھر آتی ہے ۔ اور ہر آنسو میں ہر قسم کے رنگ ابھرنے لگتے ہیں، ان سات رنگوں میں تمہارا مسکراتا چہرہ بے حد دلکش لگتا ہے ۔ یہ قوس قزح کا رنگ تمہاری خوبصورتی کو اور زیادہ ابھار دیتا ہے، تمہاری مسکراہٹیں، اس قوس قزح میں، دلفریبی سے چھپی ہوتی ہے ۔ یہ آنسو میری کھوئی ہوئی محبت کی یادیں ہیں، جس محبت کو میں نے اپنے آپ اپنے ہاتھوں سے جان بوجھ کر نہیں کھویا ۔ یہ آنسو اب بھی ان دنوں کا، ان بہاروں کا اور تمہارا انتظار کرتے ہیں ۔ خاص کر ان یادوں کا جو روٹھ کر منہ موڑ چکی ہیں ۔ لیکن یہ آنسو میرا بے حد سہارا ہیں، یہ میرے پیار کو، سپنوں کو ختم نہیں کر دیتے، میرے دل کو ہارنے نہیں دیتے ۔ مجھے اندھیروں میں گم نہیں ہونے دیتے ۔ یہ برفباری کی ویران خاموش راتوں میں مجھے تمہارے پاس لے جاتے ہیں ۔ تمہیں اپنا نہ بنانے کے باوجود، میرے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں ۔ غمگین ہوتے ہوئے بھی میرے اندر مسرت کی کیفیت پیدا کرتے ہیں ۔ چاہے وہ بسنت کے دن ہوں یا تیج تیوہار کے، یا ہولی دیوالی کے جھمگھٹے اور میلے، یا عید، محرم کے دن ۔ مجھے ان خاموشی سے گرتے ہوئے آنسوؤں سے محبت ہے ۔ یہ میری راحت و سکون کا سنگم ہیں ۔ تمہارے بچھڑنے سے میری زندگی کے سب گیت ختم ہو گئے تھے ۔ سب آرزوئیں ڈوب سی گئی تھیں ۔ محبت میں، اس سماج نے، ایک گہری چوٹ اور انتہائی مات سی دی تھی ۔ جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا ۔ لوگ سوچتے ہوں گے کہ اب میرے اردگرد رکھا ہی کیا ہوگا ۔ بکھرے ہوئے رنگ یا حسین یادوں کے ٹکڑے ہی ٹکڑے ۔ لیکن میں کہنا چاہتا ہوں کہ تمہاری یادوں میں، ان آنسوؤں میں اب بھی چاندنی سی گنگناتی ہے ۔ میرے ذہن و جسم کی وادیوں میں، پہاڑیوں میں اب بھی بانسری سی بج رہی ہے ۔ اب بھی میرے ہاتھ اس قربت کو محسوس کرتے ہیں ۔ جب تم میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیتی تھیں ۔ اور ایک لفظ تک نہ تم کہتی تھیں، نہ میں کہتا تھا ۔ میں اب بھی دنیا کو اس محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس میں میرے اور تمہارے نشیلے خواب تیرتے تھے ۔ اب بھی میرے دل میں دریا کے اس پار کی، جہاں آموں کے جھنڈ تھے، یادیں زندہ ہیں ۔ وہ دریا برسات میں کیسے اپنا سینہ پھلا لیتا تھا ۔ اس کی روانی میں کس قدر جوش آجاتا تھا ۔ اور پھر گرمیوں کے دنوں میں، وہ سوکھ کر کیسے صرف ریت کا سمندر سا بن کر رہ جاتا تھا ۔ میں جاننا چاہتا ہوں ۔ کیا اب بھی ان آموں کے جھنڈ ہیں، وہ محبت کا مارا آموں والا، رات کو بانسری پر سوز بھرے، دردناک گیت گاتا ہے ۔ تمہیں یاد ہوگا ۔ وہ آم والا ہمیں کس قدر خوش نصیب سمجھا کرتا تھا ۔ وہ ہر بار کس طرح ہمارا مسکراہٹ سے استقبال کیا کرتا تھا ۔ چوسنے آموں کی چھوٹی سی ٹوکری بھر کر لے آتا تھا ۔ اب میں سوچتا ہوں کہ اس کی بیوی کے گزرنے پر، کوئی یہ نہ دیکھتا تھا کہ اس کی ہر ہنسی میں دل کا درد چھلک رہا تھا ۔ وہ زندہ تھا، مگر اس کی زندگی مر سی چکی تھی ۔ وہ مجھے اکثر کہا کرتا تھا کہ اسے، اپنے ہاتھوں سے، آموں کے ایک پیڑ کے تلے، جہاں اس کی بیوی دفن تھی، زمین کھود کر، چپکے سے، اس بانسری کے ساتھ اس کی بیوی کے ساتھ دفن کر دینا ۔ اس کا رنگین خواب، گہری دلی محبت اسے سچا تھا، پھر کبھی واپس نہ آئیں گے ۔ میں اب اکثر یہ چاہتا ہوں ۔ کاش ہر آموں کے جھنڈ تلے، ہر محبت کرنے والا، ایک دوسرے کے ساتھ دفن ہو ۔ میں جب بھی آگرہ، تاج محل دیکھنے جاتا ہوں ۔ دروازے پر پہنچ کر اکثر تھوڑی دیر تک، خاموشی سے میں اس یادگار کو دیکھتا ہوں ۔ جس میں دو دلوں کی محبت دفن ہے ۔ اور جب ان چند سیڑھیوں سے نیچے اتر کر، میں شاہجہاں اور ممتاز محل کی قبروں پر نظر ڈالتا ہوں ۔ ان کے پاس کھڑا ہوتا ہوں تو میرا سارا جسم، دل و جاں ایک گہری خاموشی اور خیال میں ڈوب جاتے ہیں ۔ میری آنکھیں ایک انتہائی اداسی اور عقیدت کے ساتھ ان دونوں قبروں کو دیکھتی ہیں اور سارا ذہن، خیالات، شاہجہاں اور ممتاز محل کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں ۔ اس زیارت پر تقریباً میں ہر سال جاتا ہوں ۔ کئی بار اب میرے دل میں آتا ہے کہ کاش کوئی ان قبروں کو کھول کر،

دنیا کو، ان دونوں محبت کرنے والوں کو دکھا
سکے ۔ نہ جانے یہ خیال، یہ خواہش ہر بار، جب
بھی اب میں تاج محل اور ان قبروں کو دیکھنے
جاتا ہوں، کیوں میرے ذہن میں اٹھ جاتے
ہیں ۔ شاید اس لئے کہ میں واقعی دل کی گہرائی
سے، ان کی وفا محبت کو پوجتا ہوں اور ان
دونوں کو دیکھنا چاہتا ہوں ۔ یہ دونوں ایک
دوسرے کو چاہتے رہے ۔ مگر وقت نے ان کا
ساتھ نہ دیا ۔ لیکن قبر تراشوں نے انہیں ہمیشہ
کے لئے قریب کر دیا، پاس پاس رکھ دیا ۔

اس مقبرے میں جاکر میں ایک اور
تاج محل کا تصور کرتا ہوں کہ کاش ہمارے
مرنے پر، ہم چاہے ایک دوسرے کے ساتھ نہ
رہ سکے، ایک دوسرے کے نہ ہو سکے، کوئی قبر
تراش، ہم دونوں کو، قبروں کی بجائے، صرف
ایک قبر میں دفنا دے ۔ ساتھ ساتھ ۔ ایک
دوسرے کی آغوش میں لپٹے ہوئے، لیٹے ہوئے
ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے ۔ یا
ہمارے خاموش سرد جسموں کو ، ایک
دوسرے کے اوپر رکھ دے ۔ تاکہ ہم ایک
دوسرے سے ہمیشہ لپٹے رہیں، ایک دوسرے
کو دیکھتے رہیں ان مردہ لیکن محبت سے کھلی
آنکھوں سے، ان خاموش لیکن کھلے ہونٹوں
کے ساتھ تاکہ وہ ساری گزری زندگی کا
سارے پرانے دنوں کا، ایک دوسرے کو
افسانہ سناتے رہیں ۔ وہ افسانے، وہ روزمرہ
کی باتیں، جو ہم زندہ ہوتے ہوئے ایک
دوسرے کو نہ سنا سکے ۔ اور پھر جب ہر بات
ختم ہو جائے ۔ کاش ایک معجزہ ہو کہ ہمارے
جسم پھر ہل جائیں ۔ وہ ہونٹ پھر ایک
دوسرے کو چھونے لگیں، میرے ہاتھ پھر
تمہارے جسم پر دھیرے دھیرے پھرنے
لگیں ۔ ہماری آنکھوں میں پھر محبت کی چمک
جاگ اٹھے ۔ تمہاری ستواں ناک، میری ناک
کو چھونے لگے ، میرے ہونٹ تمہارے
ہونٹوں سے جکڑ جائیں ۔ میرے ہاتھ تو خود
بخود پھرتے ہوئے، ہلکے ہلکے دھیرے دھیرے
بائیں سے دائیں، گول دائیرے سے بناتے
ہوئے تمہارے خوبصورت سینے کو ہتھیلی اور
انگلیوں سے دباتے رہیں ۔ ہمارے جسموں
میں گرمی آجائے ۔ ہم پسینوں میں شرابور
ہو جائیں، اور پھر ہماری قبر سینہ پھاڑ کر ہمیں
ایک نئی زندگی دے دے ۔ ہم ایک دوسرے
کا ہاتھ تھامے ، قبر سے باہر آجائیں ۔ تمہارا
بایاں ہاتھ، پہلے پیار کی طرح میرے دائیں ہاتھ
میں ہو ۔ اور تمہارے دائیں ہاتھ میں ، گودی
سے لگا ہوا، سینے سے چپٹا سا، ایک خوبصورت
ننھا منا، گڈا سا بچہ ہو ۔ کاش یہ خیال، یہ سوچ
ایک حقیقت ہو جائیں ۔

میں اب بھی اکثر پرانی باتوں کو ذہن
میں دہراتا رہتا ہوں ۔ ہم کیسے سکول کے باہر
ایک دوسرے سے ملتے تھے، رکشے میں بیٹھ کر
بازار چلے جاتے تھے، پھر کالج میں کیسے ساتھ
ساتھ گھومتے رہتے تھے، کیسے ہم مل کر بازار،
یا سنیما جایا کرتے تھے ۔ سنیما کے باہر کیسے ہم
سموسے، آلو کی ٹکیہ خرید کر املی اور ہرے
دھنیئے پودینے کی چٹنیوں کے ساتھ کھایا کرتے
تھے ۔ گول گپوں کے ساتھ پھر چاٹ، پاپڑی
کے پتے بنواتے تھے ۔ گنڈیری والا نظر آگیا تو
گنڈیری خرید لیتے تھے، وہ دن کیا دن تھے،
محبت اور خوشیوں سے بھرے ، ایک
دوسرے کے پیار میں ڈوبے ہوئے، چاروں
طرف جیسے چاہت تھی، مسکراہٹیں اور اپنا
پن ۔ زندگی ایک گلاب کی کلی بھی تھی اور
کھلا ہوا گلاب بھی ۔ تمہارے بالوں میں چنبیلی
اور موتیا کے پھول سجے رہتے تھے ۔ تمہاری
کلائیوں میں، جوڑے میں پھول تھے ۔ اور وہ
تمہارے ہاتھ تھے یا خوبصورت کھلے سے پھول
دل چاہتا تھا کہ ان پھولوں کو ہمیشہ اپنے ہاتھ
میں سنبھالے رکھوں ۔ تمہارا چہرہ تھا یا چاندنی
کی جھلملاہٹ ۔ تمہارے بال تھے یا مالوے کی
حسین رات ۔ تم تھیں یا کوئی صندل کا تراشا
خوبصورت بت، تمہاری سانس تھی یا بارش
کے بعد زمیں سے اٹھتی ہوئی خوشبوؤں کی بھینی
لپٹ، تم تھیں یا رات رانی کی کھلی ہوئی کلیاں
تمہاری مسکراہٹ تھی یا بہار کا کوئی جھونکا، وہ
خوبصورت خاموشی تھی یا اودھ کی ایک شام ۔
وہ آنسو تھے یا ننھی ننھی بوندیں ، تمہارے
ساتھ شام کی رنگینیاں تھیں یا بجتے جلترنگ ،
تمہاری چال تھی یا جمنا ، گنگا اور گومتی کی
موجوں پر لہراتی کوئی کشتی ۔ تمہارے آنچل کے
رنگ تھے یا پھولوں بھری بہار ۔ وہ ماتھے کی
بندیا تھی یا کسی دلہن کی سیندور بھری مانگ
کا حصہ ۔ تمہاری شرمیلی آنکھیں تھیں یا جنگل
میں کھڑی وحشی ہرنی کی دلفریب تاک ۔ تم
لڑکی تھیں یا خوبصورت پریوں کی رانی ۔ تم جو
بھی تھیں ۔ میری تھیں ۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کل
ہی کی بات ہو ۔ لیکن دل کہتا ہے کہ ایسا نہیں
ہے ۔ اور مجھے کتنی گزری ہوئی باتیں ،
سردیوں کی چاند بھری راتیں، وہ اماوس کی
کالی سیاہ راتیں، تمہارا ہر روز کا ساتھ، سب
اب بہت یاد آتے ہیں ۔ اور اکثر میں سوچتا
ہوں کہ کیا کبھی وہ دن پھر لوٹ آئیں گے ۔
جب تم چاندنی راتوں میں، پھر اپنے سر کو
میرے سینے پر رکھ دو گی اور آنکھیں میچ لو گی کچھ
وقت گئے تک ۔ یا پھر ہم دونوں کی آنکھیں،

پلکوں کا بھار سہتی سہتی اچانک ہی بند ہوجائیں گی ۔ اور اچانک ہی پھر صبح ہوگی ۔ لوگ باغ میں سیر کرنی شروع کر چکے ہوں گے اور صبح کا ہنگامہ سا جاگ چکا ہوگا اور تم اچانک ہی اپنے بیتاب ، سیمیں بدن کو سنبھالتے ، سنوارتے کھوگی کہ یہ کیا ہوگیا ۔ تم نے اٹھایا کیوں نہیں ۔ گھر والے کیا کہیں گے ؟

میں تمہیں کہنا چاہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ گزارے دن میرا پیار تھے ، محبت کا رقص تھے ، ساز تھے ۔ میں جانتا ہوں کہ ہم دونوں غیروں کے ہاتھوں میں دے دیئے گئے ہیں ۔ لیکن تم اب بھی میرے تصور پہ چھائی رہتی ہو ۔ میرا دل اب بھی تمہاری طرف کھینچا رہتا ہے ۔ مجھے اب بھی تم سے پہلی سی وہی محبت ہے ، تمہاری ہر بات مجھے اب بھی اچھی لگتی ہے ۔ میں اب بھی تمہاری شوخ بندیا کی جھلملاہٹ میں کھویا رہتا ہوں ۔ تمہاری چوڑیوں کی جھنجھناہٹ میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے ۔ وہ شام کو جو گجرا خرید کر تم اپنی کلائی اور بالوں میں لگایا کرتی تھیں ۔ میں ابھی تک اس گجرے کی خوشبو اپنے اندر محسوس کرتا ہوں ۔ تمہاری اوپر نیچے ابھرتی سانس لیتی دھڑکنیں ، میں اب بھی اپنے سینے میں دبائے بیٹھا ہوں ۔ گرمیوں کے دنوں کا ، وہ تمہارے جسم کا پسینہ اب بھی ایک عجیب گرمی لئے مجھ سے چپٹے ہوئے ہے ۔ میرے خیالوں میں تم اب بھی شرما کر ، جھجک کر میری بانہوں میں سمٹ جاتی ہو ۔ تم اب بھی میرے سامنے ایسی بیٹھی رہتی ہو جیسے کہ ہم پہلے ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے رہتے تھے ۔ تم حالانکہ اب میری نہیں ہو ، لیکن میں اب بھی تمہیں اپنی امانت سمجھے بیٹھا ہوں ۔ میں اب بھی تمہارے گہرے کالے بالوں کی چھاؤں میں لیٹنا چاہتا ہوں ۔ تمہاری چال میں جھانجروں کی آواز سننا چاہتا ہوں ۔ میں پھر ایک سہاگ رات کا سپنا حقیقت میں بدلنا چاہتا ہوں ۔ میں تمہارا ہاتھ ہمیشہ کے لئے اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتا ہوں ۔ میں تمہیں سرخ ساڑھی یا جوڑے کی جھلملاہٹ میں ، گھونگھٹ اٹھاکر دیکھنا چاہتا ہوں ۔ اپنے ہاتھوں سے تمہیں رنگ برنگی چوڑیاں ، تمہاری خوبصورت نازک کلائیوں میں پہنانا چاہتا ہوں ۔ ایک چھوٹی سی ، چمکتی لال شوخ بندیا تمہارے ماتھے کے بیچ میں لگانا چاہتا ہوں ۔ گجروں کے سجانے کے ساتھ ساتھ میں تمہارے جسم کی بھینی بھینی خوشبو سونگھنا چاہتا ہوں ۔ تمہارے پاؤں میں چاندنی کی پائیلیں پہناکر ، تمہاری چال میں ، ہر تھم تھم کر اٹھتے ہوئے قدم میں ، ان جھانجروں کی آواز سننا چاہتا ہوں کمرے کی کھڑکیاں کھول کر ، اس کمرے کو پورے چاند کی چاندنی میں ڈبونا چاہتا ہوں ۔ اور پھر وہ کھڑکیاں بند کرنا چاہتا ہوں تاکہ وہ اندر آئی ہوئی چاندنی کی کرنیں پھر باہر نہ جاسکیں ہمارے ساتھ بند ہوکر رہ جائیں ۔ تمہارا جسم ان کرنوں میں نہائے دھوئے ، اور ایک ایسا گہرا سناٹا ہوجائے ۔ جس میں صرف ہماری سانسوں کی آواز ہو ۔ تمہارے ، میرے سانسوں میں آگ سی ابلتی ہو ، تمہارا جسم میرے جسم سے جکڑا ہو ۔ میرے ہونٹ تمہارے ہونٹوں سے ملے ہوں ۔ میرا سینہ تمہارے سینے کے پسینے سے شرابور ہو ۔ تمہاری ٹانگیں میری ٹانگوں سے ملی ہوں ۔ تمہارے ہاتھ میری پیٹھ پر ہوں ، تم میرے اتنے قریب آجاؤ کہ اس دنیا میں جیسے کوئی دلہن نہ آئی ہو ۔ میرے ہاتھ تمہارے جسم کا ہر حصہ محسوس کریں ۔ یعنی میں اور تم ایک دوسرے میں سما جائیں ۔ ایک دوسرے میں کھو جائیں ۔ جیسے کہ ہم دو جان نہیں ، ایک جسم ہیں ۔ آخر میں ، میں پھر تم سے کہنا چاہتا ہوں کہ تم اب بھی میری ہو ۔ میں کسی اور کا نہیں ، تمہارا ہوں ۔ مجھے اب بھی تمہاری ہر بات سے محبت ہے ۔ میں تمہیں اب بھی بے حد چاہتا ہوں ۔ اور ان سنسان راتوں میں ، دن کے ہنگاموں میں ، کہکشاں کی شال اوڑھی راتوں میں ، بہاروں میں ، گرمی کی جھلستی ، آگ برساتی دوپہروں ، شالوں کو ، قبروں کی طرح تاریک راتوں کو ، پھولوں بھری بہاروں میں ، پت جھڑ میں ، یعنی سب ماحول اور موسموں میں ، میں دن رات تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں ۔ چاہے وہ دلی کے کوچے ہوں ، یا اودھ کی گلیاں ، اور یا خوبصورت پہاڑیوں کے دامن ۔ میں تمہیں پھر پہلی سی مچلتی ، روٹھتی ، محبت سے بھری دیکھنا چاہتا ہوں ۔ میں تمہیں نیم یا پیپل کے پیڑ پر ڈالے جھولے پر ، اپنے ہاتھوں سے جھلانا چاہتا ہوں ۔ تمہارے ساتھ رنگ برنگی ، اڑتی ، ناچتی تتلیاں دیکھنا چاہتا ہوں ۔ تمہارے ساتھ کسی پھول پر رقص کرتے ، رس پیتے ، گاتے ، کالے بھونرے کو دیکھنا چاہتا ہوں ۔ برسات کے بھیگے ہوتے دنوں میں ، تمہارے ساتھ بارش میں بھیگنا چاہتا ہوں ۔ تالاب میں اگے کنول کے پھول کو تمہارے ساتھ دیکھنا اور چھونا چاہتا ہوں ۔ کسی گلی کے نکڑ پہ کھڑی بکری کو دیکھنا چاہتا ہوں ۔ جو اپنے میمنے کو دودھ پلا رہی ہو ۔ کسی گولن کو گائے کا دودھ دوہتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں ۔ میں بارش

کے قطروں سے ڈھکی تمہاری پلکوں کو چھونا چاہتا ہوں ۔ ان بھیگی پلکوں کے سایے میں رہنا چاہتا ہوں ۔ میں تمہاری پالکی کو کہاروں کے کاندھوں پر دیکھنا چاہتا ہوں ۔ میں تمہارے ساتھ جاگنا چاہتا ہوں اور سونا بھی ۔

میں ہر پنگھٹ پر ، جہاں پنہارنیں پانی بھرتی ہیں ، تمہارے ساتھ انہیں کنویں سے پانی بھرتے، مسکراتے ، اچھلتے، خوشی سے مچلتے اور چلتے دیکھنا چاہتا ہوں ۔ ساون کی برکھا سے پہلے تمہارے ساتھ آسماں پر وہ کالے مٹیالے بادل کو دیکھنا چاہتا ہوں ۔ اس ریوڑ کو چراتے ، چرواہے کو دیکھنا چاہتا ہوں ۔ جس کی رسیلی بانسری سے ،ہم دونوں پیار کے نغمے سنا کرتے تھے ۔

میں تمہارے ساتھ خربوزے کے کھیتوں کی گم ہوتی ہوئی پگڈنڈیوں پر گھومنا چاہتا ہوں ۔ لو سے تپتی ہوئی راہوں پر چلنا چاہتا ہوں ۔ گھر کے آنگن میں بیٹھی چڑیوں کی چہک سننا چاہتا ہوں اور گھر کی دیواروں ، چھتوں پر بیٹھے ان کوؤں کی کائیں کائیں بھی ۔

میں اب اس ادھوری زندگی کو ایک نیا موڑ دینا چاہتا ہوں اس سادہ بے معنی زندگی کو ایک نئی جنت بنانا چاہتا ہوں ۔ اس ہاری ہوئی قسمت کو بدلنا چاہتا ہوں ۔ میں محبت کی راہ میں بکھرا ضرور ہوں ۔ لیکن میں یہ پیار کی بازی ہارنا نہیں چاہتا ۔ میں اب بھی اس پیار کو سینے میں لئے بیٹھا ہوں ۔ میں تمہارے پیار کے ساتھ جینا چاہتا ہوں ۔ ہر موڑ ہر قدم پر تمہارا انتظار کرنا چاہتا ہوں ۔

یعنی میں تمہیں کہنا چاہتا ہوں کہ میں تمہارے ساتھ جینا چاہتا ہوں اور مرنا بھی ۔ کیا تم بھی میرے ساتھ جینا چاہتی ہو ، اور مرنا بھی!

کیا تم میرے ساتھ زیست اور موت پر بھی کھول کر ہنسنا چاہتی ہو ۔ اس شدت درد کو ہمیشہ کے لئے چھپانا اور مٹانا چاہتی ہو ۔ اگر ہاں ، تو آؤ ۔ ساتھ جئیں بھی ، اور مریں بھی ۔

غزلیں

اطہر راز (لندن)

وہ آج بھی ہے نگاہوں میں اجنبی کی طرح
جو دھڑکنوں میں اترتا ہے زندگی کی طرح

کہاں گئی ہے وہ خوشبو حسین خوابوں کی
گذر رہی ہے سحر شام بے کسی کی طرح

تصورات میں خوشبو بکھیرنے والا
نگاہِ شوق میں آتا ہے بے کلی کی طرح

ترے مزاج کی نا آشنائی کا غم ہے
کھڑا ہوں کب سے ترے در پہ اجنبی کی طرح

مری شراب میں خوف خدا بھی شامل ہے
شراب خانے کے اندر ہوں اک ولی کی طرح

یہ زندگی کا عجب راز ہے محبت میں
کسی کی یاد ستاتی ہے تشنگی کی طرح

اجل تو کیا کہ ہمیں زندگی نے مار دیا
یہ آدمی ہے جسے آگہی نے مار دیا

تمام عمر لٹاتے رہے متاعِ سکون
ہجومِ شوق کی حیلہ گری نے مار دیا

یہ زندگی کا تقاضا تھا جرم تھا کیا تھا
تعلقات کی سوداگری نے مار دیا

سکوں کے ساتھ اندھیرے میں لوگ زندہ تھے
سحر ہوئی تو ہمیں روشنی نے مار دیا

وہ ابتدا تھی کہ تیر نظر کے زخم کھلے
یہ انتہا ہے تری بے رخی نے مار دیا

میں دشمنوں کی عنایت سے راز واقف تھا
یہ اب کھلا کہ مجھے دوستی نے مار دیا

محمود سعیدی
۱۱۷ - غالب اپارٹمنٹس، پروانہ روڈ
پیتم پورہ، دہلی ۱۱۰۰۳۴

غزل

جینے کے لیے جان سے گزرتا ہوں شب و روز
میں مجھ پہ مجھ یوں ہی مرتا ہوں شب و روز

اک ذوقِ طلب ہی مرا مقصودِ سفر ہے
آ کر اسی مرکز پہ ٹھہرتا ہوں شب و روز

سورج نہ ستارہ، مگر اس تیرہ فضا میں
میں مطلعِ امکاں پہ ابھرتا ہوں شب و روز

کرنا ہے وہی کچھ کہ جو کرنا نہیں مجھ کو
کرتا ہوں شب و روز، مکرتا ہوں شب و روز

بستی کی طرف میں مرے دن رات روانہ
میں اپنی بلندی سے اترتا ہوں شب و روز

وہ اپنے تصور میں اب آ سکے تو سمیٹے
میں اپنے خیالوں میں بکھرتا ہوں شب و روز

اس بزمِ شب و روز میں وقتِ گزراں کا
آئینہ مقابل ہے، سنورتا ہوں شب و روز

کیا سہل ہے تقدیر کے زنداں سے نکلنا!
کرنے کو میں تدبیر تو کرتا ہوں شب و روز

خود میرے ہی قدموں کی تو آہٹ وہ نہیں ہے؟
محمود! جس آہٹ سے میں ڈرتا ہوں شب و روز

غزل

چہرہ مرا، مجھی کو ڈراتا ہے روز و شب
منظر، مجھے یہی نظر آتا ہے روز و شب

رکھتی ہے بے سکوں، کوئی موہوم سی خلش
مبہم سا اک خیال ستاتا ہے روز و شب

سنتا نہیں یہ شہرِ ہوس میری گفتگو
اپنے مطالبات سناتا ہے روز و شب

آتا ہے لوٹ لوٹ کے اک لمحۂ زیاں
کچھ، جیسے میرے ہاتھ سے جاتا ہے روز و شب

میں لمحہ لمحہ خود سے ہوا جا رہا ہوں دور
کوئی مجھے قریب بلاتا ہے روز و شب

کب سے عذابِ دیدہ و دل سہہ رہا ہوں میں
یہ کون ہے کہ مجھ کو جگاتا ہے روز و شب

کتنی مسرتیں تھیں کہ پل پل بچھڑ گئیں
اک غم، کہ میرا ساتھ نبھاتا ہے روز و شب

اک اجنبی وجود، مرے ساتھ ساتھ ہے
مجھ سے جو راہ و رسم بڑھاتا ہے روز و شب

کیوں وقت دے گیا مرے خوابوں کو تلخیاں؟
محمود! اب خیال یہ آتا ہے روز و شب

جوگیندر پال طائر
293-New-Plots (Sarval)
Jammu- 180005

غزل

سفر میں کھوگئے یادوں کے قافلے کتنے
ہوائیں بدلیں تو ہم بھی بدل گئے کتنے

میں چاہتا تو زباں اپنی کھول سکتا تھا
بڑھا دیئے مری اس چپ نے فاصلے کتنے

کوئی ادا تیری ان میں نہ جانے ہے کہ نہیں
تراش ڈالے مصور نے بت ترے کتنے

کھدا ہوا تھا درختوں پہ نام پت جھڑ کا
خلا میں کھو گئے ساون کے قہقہے کتنے

تجھے یہ علم کہاں ، انتظار میں تیرے
نثار ہوگئے دہلیز پر دیئے کتنے

وہ راہ رو ، جسے میں نے پناہ دی غم میں
چرا کے لے گیا ہونٹوں سے قہقہے کتنے

ہمیں بھی آگیا جینے کا فن زمانے میں
ترے بدلنے سے ہم بھی بدل گئے کتنے

یہ لگ رہا ہے کہ نزدیک اب قیامت ہے
دکھائی دیتے ہیں منظر ڈرے ڈرے کتنے

نہ جانے کتنے مسافر یہاں لٹے طائر
اس اندھے شہر میں اندھے ہیں راستے کتنے

اندیشہ ہائے دور و دراز

دل تو کہتا ہے کہ اب ختم ہے افسانۂ شوق
اک تری سمت سے اظہار ذرا باقی ہے
تو بھی اک لفظ جو کہہ دے
اسی مفہوم کا لفظ
تو مجھے
اپنے دل کا، دل مجبورِ تمنا کا یقیں آجائے!

○

یوں تو دیکھا ہے تجھے میں نے مزاجاً خاموش
اور ہمیشہ ہی محسوس کیا ہے میں نے
کہ خموشی یہ تری محض خموشی ہی نہیں
بلکہ یہ لاکھ اداؤں کی ادا ہو جیسے

○

لیکن اس وقت اسی تیری خموشی نے مجھے
جانے لا پھینکا ہے احساس کے کس صحرا میں
کہ گماں ہوتا ہے
اس خموشی میں ہے اب اور ہی مفہوم نہاں
دور ماضی کو کوئی بھول گیا ہو جیسے
اور جب کہتا ہے دل ختم ہے افسانۂ شوق
تو جو گزرے ہوئے لمحات ہیں
اس طرح نظر آتے ہیں
مری مٹھی میں کبھی بند ہوا ہو جیسے

جگن ناتھ آزاد (جموں و کشمیر)

عنوان چشتی
A-107 ، جامعہ نگر
نئی دہلی-25

غزلیں

(۱)

زندگی تو نے دیا کیا کیا مجھے
غم زدہ ہوں ، چھوڑ دے تنہا مجھے

اس کے دل کی تو میں کہہ سکتا نہیں
اس کی آنکھوں نے بہت سوچا مجھے

سانحے دل پر گزرتے ہی رہے
تم نے کس انداز سے دیکھا مجھے

" دل سمندر " تک پہنچنے کے لئے
اس کی آنکھوں میں اترنا تھا مجھے

کیا مرے منہ پر لکھا ہے اس کا نام
جس نے دیکھا ، غور سے دیکھا مجھے

(۲)

خوشبو سا اک رنگ کا پیکر دیکھا ہے
یعنی ہم نے چاند کو چھت پر دیکھا ہے

سنتا ہوں ، ہوتی ہے محبت خود سے بھی
تم نے بھی کیا خود میں سنور کر دیکھا ہے

روپ ہی روپ اور نشہ ہی نشہ ہے یعنی
ہم نے اس کو بانہوں میں بھرکر دیکھا ہے

چہرہ چاند ، رسیلی باتیں روپ بدن
تم نے بھی کیا ایسا دلبر دیکھا ہے

ڈھونڈھتا ہوں میں جس کو زمیں پر مدت سے
میں نے اس کو خواب میں اکثر دیکھا ہے

اس کے ابرو جیسے دو محرابیں ہیں
اس کے بدن کی قوس میں مندر دیکھا ہے

کس سے کہوں یہ بات تو اچھی ہے ، لیکن
تن کا جادو ، من کے اندر دیکھا ہے

نعتِ محبوبِ خدا

ماہرن ایمن، نیویارک

ایسی دانا کبھی دیکھی ہے نہ بینا دیکھی
ذاتِ محبوبِ خدا تنہا تھی، تنہا دیکھی

عرش و کرسی نے، رسولوں نے بھی معراج کی رات
اپنے اللہ کی محبوب تمنا دیکھی

چاند سورج سے حسیں، دل سے حسیں، سب سے حسیں
آپ کی شکل بہر طور دل آرا دیکھی

جس کا ہر قطرہ ہے فردوس بروں، عرش بروں
پیارے زائر! کبھی وہ وادیٔ بطحا دیکھی

اُن نگاہوں کو محبت سے خدا نے چوما
جن نگاہوں نے کبھی وہ صورتِ زیبا دیکھی

سدرہ! رتبہ ترا تسلیم، مگر یہ تو بتا!
کیا کبھی منزلتِ گنبدِ خضرا دیکھی

اُس کی آنکھوں کا مقدر ہے خدا کا دیدار
جس نے طیبہ میں نبیِ بزم آرا دیکھی

دیکھنے والوں نے بس گنبدِ خضرا دیکھا
یعنی ہر آنکھ نے ہر دل کی تمنا دیکھی

دل نے دیکھا اُنہیں ایمن! تو مسلسل دیکھا
خود کو دیکھا نہ کبھی صورتِ دنیا دیکھی

نیویارک سٹی، ۳ اکتوبر ۱۹۹۲ء

غزل

ماہرن ایمن، نیویارک

تعبیر کوئی خواب کی پا جائے تو کیا ہو
جادو یہ کبھی وقت چلا جائے تو کیا ہو

دیوانے کو فرزانہ بنا جائے تو کیا ہو
چہرہ وہ کبھی دل کو دکھا جائے تو کیا ہو

اِس دور میں بھی جس کو چھپا رکھا ہے دل نے
ہونٹوں پہ وہی نام جو آ جائے تو کیا ہو

آئینہ دکھاتا ہے اُسے روز نئی شکل
ماضی کا پتا حال جو پا جائے تو کیا ہو

آ جائے کبھی ضبط کا طوفان، اور آ کر
تدبیر کی دیوار بھی ڈھا جائے تو کیا ہو

رستوں ہی کو ملتی ہیں منازل سی منازل
منزل کبھی رستہ کوئی پا جائے تو کیا ہو

ذرّے تو سماتے ہیں سدا دشت میں، لیکن
ذرّے میں کوئی دشت سما جائے تو کیا ہو

جو ابر برستا ہے سمندر پہ ہمیشہ
صحرا پہ کبھی ابر وہ چھا جائے تو کیا ہو

اُمید یہ کہتی ہے کہ دن، رات ہے، ایمن!
دھوکا یہی جگنو کبھی کھا جائے تو کیا ہو

نیویارک سٹی، ۹ جنوری ۱۹۹۴ء

غزل

ملفوظ گورکھپوری

کسی دن اپنا سارا حال اُس کے سامنے رکھ دوں
پھر اُس کا دفترِ اعمال اُس کے سامنے رکھ دوں

وہ اپنا ہے اُسے اُلجھاؤں کیوں اپنے مسائل میں
اُسی کی خواہشوں کا جال اُس کے سامنے رکھ دوں

سُنا ہے پربتوں کو پار کرنا کھیل ہے اُس کا
میں اک دیوار ہی فی الحال اُس کے سامنے رکھ دوں

کبھی منظر سا کھل جاؤں میں اُس کی بند آنکھوں میں
اور اُس کے سارے خط و خال اُس کے سامنے رکھ دوں

ذہین انسان کا یوں مطمئن ہونا نہیں اچھا
بہت خوش ہے کوئی جنجال اُس کے سامنے رکھ دوں

وہ شاید اس طرح پہچان پائے اپنی سمتوں کو
میں اپنی گردِ ماہ و سال اُس کے سامنے رکھ دوں

A-302 کنول بلڈنگ، شاستری نگر، اندھیری (ویسٹ)
بمبئی 400053

غزل

دیدہ و دل جسم و جاں آزار سب
کاش ہو جائے فنا اک بار سب

اک محبت جس سے سب نا آشنا
اک یہی شے جس کے دعوے دار سب

آسماں پر ہنس رہا ہوگا خدا
کھا رہے ہیں اپنی اپنی مار سب

کس کو فرصت اینٹ رکھے اینٹ پر
ڈھونڈتے ہیں سایۂ دیوار سب

رات کا یہ کون سا انداز ہے
سب کے سب سوئے ہیں اور بیدار شب

اب تو بس اک فیصلے پہ ہے نظر
جانتی تو ہے نگاہِ یار سب

گھر پہ اس موسم میں کیا بیتی ملفوظ
ہو گئے گونگے در و دیوار سب

کالا بال اور بنجات

وجے

کالا بال اور نجات

ہندی: وجئے {729 لکشمی بائی نگر نئی دہلی 110023}

اردو ترجمہ: حیدر جعفری سید

{79/112 بانس منڈی۔ پوسٹ باکس 468 ، کانپور}

اندھیرا کٹی پتنگ کے ساتھ دھرتی پر پھیل گیا تھا۔ وکٹوریہ میموریل کا سنگ مرمر کچھ زیادہ ہی سفید نظر آنے لگا تھا۔ ٹیریس پر بنے سنگین مجسمے اڑتے ہوئے یا تیرتے ہوئے لگ رہے تھے۔ جگنوؤں نے جلنے بجھنے کا کھیل شروع کر دیا تھا۔ میموریل کے نیچے روحیں سرگوشی کے انداز میں لانگ لو آور کنگ، لانگ لو آور کوئین LONG LIVE OUR QUEEN, LONG LIVE OUR KING رہی تھیں اور میموریل کے بند گیٹ کے باہر کچھ خاص قسم کے دبنگ حضرات محو خرام تھے۔ جن کا روزگار سرشام ہی شروع ہو جاتا ہے۔ باہر آئس کریم کے ٹھیلے اور مرمرے والے مستی سے جے ہوئے تھے وہ جانتے ہیں کہ اس علاقے کا دوسرا دور اب شروع ہونے والا ہے۔

میں داہنی طرف مڑ کر سنسان فٹ پاتھ پر چل دیتا ہوں جگہ جگہ ان سینے ہوئے پتوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ جنہیں چاٹ کر لوگوں نے لاپرواہی سے پھینک دیا تھا۔ کتے انہیں جی بھر کر ٹٹول چکے تھے۔ یہ پتے ان مزدوروں کی یاد دلاتے ہیں جو جانے کہاں کہاں سے کارخانوں میں محنت کرنے کے لئے لائے گئے تھے۔ اور اچانک تالابندی نے جن کے وجود کو شیشے کی طرح چکنا چور کر کے بیکار کر دیا تھا اجنتا کے دل میں دبے پیار کی بھی تو یہی حالت ہے۔ جھوٹے پتوں جیسی۔

ادھر ادھر درخت اور دیوار ں اوٹ لیتے چند جسم کار کی ہیڈلائٹس بند ہوتے ہی چیل کی طرح جھپٹتے۔ ایک سیٹی بجتی اور پرفیوم سے مہکتا ہوا ایک جسم کار میں داخل ہو جاتا۔ ہیڈلائٹس پھر روشن ہو جاتیں۔ سائے پھر ندارد ہو جاتے۔ سڑک پر دوبارہ کرفیو کا سناٹا پھیل جاتا۔ کالی رات، کالا کاروبار رات بھر جاگتے ہیں۔ چلتے پھرتے جنازے ادھر ادھر امنگوں کے دھکے کھاتے ہیں۔ شہر کے جانے پہچانے چوراہوں پر لگے مجسمے جو فراخدلی سے دن بھر آئیڈیلز اور بغاوت کے پوسٹر بانٹتے رہتے ہیں۔ چشم دید گواہ کی طرح اپنا بیان دوہراتے رہتے ہیں۔ لیکن صبح ہوتے ہی سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ اندھیرے کی تجارت کے بارے میں ایک بھی سچائی ان کے منہ سے نہیں پھوٹتی۔ اسی لئے تو بے شمار اجنتاؤں کو نظر انداز کر جاتے ہیں یہ مجسمے!

دور خواہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا رہا ہو یا خالص مارکس واد سرکار کا (جس نے انسانیت کو استحصال سے نجات دلانے کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے) کلکتہ کی ہر سڑک نے جسم فروشی کی سہولیات فراہم کی ہیں۔ بھوک نے مفلس عورت کو دن میں کھوٹا سکہ بنا کے رکھا ہے جسے رات میں آسانی سے ہاتھوں ہاتھ بھنایا جا سکے۔ مجسمہ خواہ سبھاش کا ہو یا ملکہ وکٹوریہ کا۔ سڑک کا کالی داس ہو یا مدر ٹریسا، بستی چاہے کالی باڑی ہو یا فاطمہ گنج۔ لڑکی خواہ فاطمہ ہو یا انپورنا، رات ہوتے ہی گھر یا بازار میں بنت حوا کی ہی تلاش ہوتی ہے۔ اجنتا بھی ایک فاطمہ ہے۔ ایک انپورنا ہے۔ وقت کے قصائی کی دوکان پر ٹنگی ہوئی!

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جہاں پاپوں کو دھونے والی گنگا خود ہزاروں میل کا سفر طے کر کے پہنچتی ہے اور سورج جس طرف سے روشنی کی دستک دیتا ہے وہیں ایک طبقہ بلند عمارتوں کی بالکنی سے بے جھجک بلغم نیچے تھوکتا ہے۔ اور دوسرا طبقہ انپورنا اور فاطمہ کی عصمت، روٹی اور چھت کے سائے کے لئے۔ درندوں کے ہاتھ فروخت کرتا ہے۔ کوڑیوں کے مول ہر دن قربان ہوتی کمسن لڑکیوں کی عصمتیں کس قسم کی قربانیاں ہیں

عورت کا جسم تو ایک گھر ہے جس میں
خاندان جنم لیتا ہے ۔پھلتا ہے ،پھولتا ہے اس
گھر کو چھت پڑنے سے پہلے ہی گرانے کی
کوشش کیسے برداشت کی جاتی ہے ۔
بریلا پور ، علی پور ، بالی گنج ، بہو
بازار ، سرکلر روڈ ، دھرم تلہ ، بہالہ کی سربلند
عمارتوں میں ٹیگور سنگیت بج رہا ہو گا ۔ کلکتہ
کلب میں ڈرامہ نگاری کا فن ، شرت چندر
چٹرجی کے ادب ، اور سیاست پر گرما گرم بحث
ہو رہی ہوگی اور دکھنیشور کی سیڑھیوں پر کوئی
بیراگی بہراتے ہوئے دریا کو دیکھتا ہوا موکش
کا منتظر ہو گا ۔ لیکن جینے کی آرزو میں سینکڑوں
جسم اپنے آپ کو انجان وحشی ہاتھوں میں نچنے
کھسٹنے کے لئے سونپ چکے ہوں گے اور کتنے ہی
اس دور سے گزرنے کے لئے پھڑ پھڑاتے
ہوئے اندھیرے کی قطار میں لگے ہوں گے ۔
جسم کی بوٹیاں زندگی کی پلیٹ میں سجا کر یہ
سب کچھ کس کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے
آج تک کوئی گوتم بدھ ان کی زندگی میں کیوں
نہیں آیا ؟ خود اجنتا کا بھائی جسے اجنتا کی حفاظت
کرنی چاہیے تھی ، دلالی کا پیشہ کرتا رہا ، ایسا
کیوں ہوتا ہے ؟ ۔

کوئی بجلی کی طرح سامنے آکر ہاتھ تھام
لیتا ہے ۔ میں اس کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھتا
ہوں گوری نیپالن واپس لوٹ جاتی ہے ۔ پیڑ
کے پیچھے کوئی خالص کلکتیا ہنسی ہنستا تھا ۔ سالا
کنگلا ۔ بھو کا بنگالی !

کیریکٹر خواہ مرد کا ہو یا عورت کا اسے
مرغے کی گردن کی طرح توڑنے کے لئے ہر ہاتھ
بے قرار رہتا ہے ۔ اپنی جھولتی خالی جیبوں پر
ہنسنا چاہتا ہوں ۔ اگر جیب میں کچھ وزن ہوتا تو
نیپالن ابھی تک گلے سے لپٹ چکی ہوتی ۔

اچانک لگتا ہے کہ جیکٹ کے داہنے
کندھے پر ایک خوشبو اور ایک کالا گھنگھریالا
بال عجیب قیمتی زیور کی طرح چپکا ہوا ہے ۔
اجنتا کی خوشبو اور اجنتا ہی کا بال ۔

اسپلینیڈ پر سڑک سناٹے میں ڈوبی
ہوئی ہے ۔ جیسے ہجوم کے پیروں کو برداشت
کرتی ہوئی اب اپنی تھکاوٹ کو سہلا رہی ہے ۔
یہ رات کا سڑک کا آرام سوناگاچھی کی بھری دوپہر
کی مانند ہے جہاں سورج نکلنے کے ساتھ
عورتیں انگڑائی توڑتی ہوئی سونے کی تیاری
کرتی ہیں ۔ جبکہ رات بھر انہوں نے جاگ
جاگ کر کئی مردوں کو اپنا جسم نوچنے دیا ہو گا ۔
خوشحال خاندان کی لڑکی جب بھی اپنی آنکھوں
میں پیار اور پیاس کا پہلا خواب بنتی ہے تو
سوناگاچھی کی نابالغ لڑکی دہشت میں ڈوبی ہوئی
اپنی دوشیزگی کسی اجنبی کے حوالے کر دیتی
ہے اور وہ اجنبی اس کے خوابوں کو نگل جاتا
ہے اور جسم کو روئی کی طرح دھن کر ، پیسہ
تھما ، باہر نکل جاتا ہے ، مندر ، مسجد اور گرجا
گھر سے ایک دوسرے کو گالیاں دیتے پگڑی ،
ٹوپی اور حیٹ یہاں بغیر کسی حجت کے قطار
میں کھڑے ہوئے ایک ہی عورت کے ساتھ
سو کر اپنی رواداری کا ثبوت دیتے ہیں ۔

کیسی عجیب بات ہے کہ کسی کا دن
کسی کی رات کی مانند ہے ۔ روز سڑک پر
سماج واد کھڑا کیا جاتا ہے ، غریبی دور بھگائی
جاتی ہے اور بھائی بھائی کے نعرے بلند ہوتے
ہیں ۔ سماجی ناہمواری مٹانے کی قسمیں کھانے
والے لوگ ہاتھ میں گولڈن چین والی گھڑی
کسے ودھان سبھا اور پارلیمنٹ میں پہنچ کر
انسان کی غربت ، بیکاری اور عورت کی
مجبوری بھول جاتے ہیں ۔

دولت لوٹتے اور بٹورتے ہاتھ
محنت کشوں کو بیروزگار ، حق پرست خواتین
کو طوائف اور مردوں کو کوڑے دان میں روٹی
تلاش کرنے والا کتا بنا دیتے ہیں ۔ بنک یا
تجوریوں میں پوشیدہ بے حساب رقم وہ اپنے
کس جنم کی نجات کے لئے محفوظ رکھے ہوئے
ہیں ۔

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ اجنتا سرکار
جوان ہونے سے پہلے ہی طوائف بن جاتی ہے
جبکہ اس کے پڑوس میں رہنے والا ہر خاندان
ہر دن صدقہ خیرات دیتا ہے ۔ ایک دوسرے
کی بہن بیٹی کو اپنی بہن بیٹی بنانے کا دعوی
کرتا ہے ۔ پھر یہ ہم بستری کا رشتہ کہاں سے
نکل آتا ہے ۔ کہاں ڈوب گئے ہیں آداب اور
مقدس دستور ۔

لیکن یہ اجنتا سرکار کا واقعہ
مارواڑیوں کی گدی کلکتہ کا کاپی رائٹ نہیں
ہے ۔ کلکتہ جس میں مذہب ، ادب ، ثقافت
اور انقلاب کے مسیحاؤں نے جنم لیا ہے ۔ یہ
واقعہ نیویارک کا بھی ہے ۔ جہاں دولت کی
ریل پیل ہے اور جس سے ہر شہر اور ہر ملک
بھیک مانگتا ہے ۔ یہ قصہ بمبئی کا بھی ہے جسے
انگریزوں نے سنوارا تھا ۔ اور اب عرب
ممالک کا منظور نظر ہے ۔ یہ قصہ ہانگ کانگ
کا بھی ہے ۔ جہاں لوگ دور دراز سے آکر
تجارت کرتے ہیں اور غیر ملکی عورتوں کا ذائقہ
نوٹ کرتے ہیں ۔ جتنی رقم جسم فروشی کی
تجارت پر یومیہ خرچ ہوتی ہے اگر اس کا
نصف بھی تعمیری کاموں میں صرف ہو تو ہر
ملک میں گاندھی کا خواب عملی جامہ پہن لے
اور مارکس کی بھٹکتی روح مطمئن ہو جائے
لیکن ایسا کہاں ہوتا ہے ۔ لینن کا انقلاب گھٹنے

ٹیک دیتا ہے اور گاندھی کا خواب ارتھیوں
میں باندھ کر ایکسپورٹ کر دیا جاتا ہے ، ہر
ملک ، ہر بستی اور ہر انسانی کمیشن ایجنٹوں کی
مٹھی میں تڑپتا رہتا ہے۔
وقت اپنے اوپر عائد کردہ الزامات
کا انکار کرتا ہوا ، بیکاری ، بھوک اور فساد کی
پرچیاں تقسیم کرتا رہتا ہے اور جدید ایجادات
کی باتیں کرتا ہے ۔ وش کنیائیں ماحول میں
منڈلاتی رہتی ہیں اور بھوک قریہ قریہ ، شہر شہر
آدمی کو بڑے شہروں کی طرف ہجرت کرنے
کے فرمان بانٹتی رہتی ہے ۔ نسیم ، ظالم سنگھ
کے ساتھ ، مریم ، احسن کے ساتھ اور درگادتی
مجید کے ساتھ ، لیٹنے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے
فرقہ پرست ان کے تحفظ کے لئے کیوں
جدوجہد نہیں کرتے ۔

ہر چوراہے پر خاندانی منصوبہ بندی
کے کیمپ لگتے ہیں اور ناجائز تعلقات کی طرح
ملک کی آبادی بڑھتی جاتی ہے ۔ لوگ راج
گھاٹ پر بھائی چارے کی قسم کھا کر فرقہ وارانہ
فساد کرتے ہیں ۔ سیاست دان اپنی پالیسی کو
پیک کی طرح اگالدان میں تھوک کر صنعت
کاروں کو استحصال کے اختیارات تقسیم
کرتے ہیں اور دانشور ، مارکسزم اور سارترے
پر بحث کرتے ہوئے ایر کنڈیشنڈ ریستوران
میں کافی کے پیالے لگاتار پیتے رہتے ہیں ۔
اسکیمیں کمپیوٹر پر گشت لگاتی رہتی ہیں ۔
اپوزیشن چلچلاتی دھوپ اور سیلاب سے
متعلق دلائل کے بل بوتے پر حکومت کو
کوستی رہتی ہے ۔ زعفرانی لباس میں ملبوس
فقیر لوگوں کے ہجوم اور تکالیف کو نظر انداز
کرتے ہوئے بے غرض اور بے نیاز ہو جانے
کا نسخہ تقسیم کرتا رہتا ہے ۔ لیکن اجنتا کے

تحفظ کے لئے کوئی بھی نہیں پہنچتا۔
دھرم تلہ سے مڑ کر آگے بڑھتا ہوں
رات میں ، سڑک پر کتنے آرام سے چلا جا سکتا
ہے جبکہ دن میں سڑک پار کرنا بھی جوئے شیر
لانے سے کم نہیں ہے ۔ پل سے ہر گلی ایک
لگاتار پھیلتی ہوئی چادر معلوم ہوتی ہے ۔
روشنی سے نہاتے جگمگاتے اسٹیمر اس چادر پر
کڑھے بیل بوٹے سے نظر آتے ہیں ۔ ہاوڑہ
اسٹیشن اس وقت بھی پوری طرح سے جگمگا رہا
تھا جیسے مرد کی ایمانداری اور عورت کی
عصمت جیت کر جشن منا رہا ہو ۔ الیکٹرک
انجن یکے بعد دیگرے چل اور رک رہے تھے

اچانک خیال آتا ہے کہ داہنے شانے
پر اجنتا کی خوشبو اور کالا بال اب بھی چسپاں
ہے ۔ ہاوڑہ برج سے اتر کر ہر گلی کے ساتھ
ساتھ چلتے ہوئے ایک بڑے پتھر پر بیٹھ جاتا
ہوں ۔ آہستہ سے بال کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہوں
جانتا ہوں کہ اگر اسے ایک ڈبیہ میں بند
کرکے ایر کنڈیشنڈ کمرے میں رکھ دوں تو
مدتوں یہ بال کالا بنا رہے گا ۔ جبکہ اجنتا کے سر
پر اس کی میعاد زیادہ سے زیادہ چار آٹھ سال
ہوتی لیکن تب یہ بال میری جیکٹ کے کندھے
پر نہیں آتا اور ایک داستان ادھوری رہ جاتی

میں پاس ہی میں پڑے ہوئے ایک
کاغذ کو اٹھاتا ہوں اور اس پر بال رکھ کر
ہومیوپیتھک دوا کی پڑیا بناتے ہوئے اندر کی
جیب میں رکھ لیتا ہوں ۔ محسوس ہوتا ہے کہ
بال ایک سنسنی خیز خبر کی طرح میری بغل
گدگدا رہا ہے ۔ جیسے میں کہانی میں جذب ہو کر
اچانک ہی امر ہو سکتا ہوں پھر اس کہانی کا
ترجمہ دنیا بھر کی زبانوں میں شائع ہوگا اور

لوگ مجھے گورکی ، موپساں ، کیو برن یا سارتر
بنا ڈالیں گے ۔
اچانک اجنتا کی کنگھی سے چنکی مہک
میرے تخلیق کردہ تخیل کو تالی بجا کر توڑ دیتی
ہے ۔ کوئی کہتا ہے ۔ یہ مہک ، یہ اجنتا اور یہ
دنیا فانی ہے ۔ ہر گلی کی تیز روانی پر حکومت
کرتا ہوا کوئی مانجھی بلند آواز میں گا رہا ہے ۔ ہر
گلی پر بے شمار اسٹیمر جگمگا رہے تھے اور
سینکڑوں بادبان لگی کشتیاں ٹمٹما رہی تھیں ۔
جانتا ہوں کہ ان سب میں لوگ کرائے کی
لڑکیوں کو ہم آغوش کئے ہوئے اپنی جسمانی
بھوک مٹا رہے ہوں گے ۔ اپنی بیویوں سے نہ
مٹنے والی ہوس کرائے کے جسموں سے پوری
کر رہے ہوں گے ۔ فصیح و بلیغ ادبی و رومانی
ڈائلاگ نازل ہو رہے ہوں گے ۔ اور چیونگ
گم کی طرح چبائی جا رہی نابالغ لڑکیاں یا کھیلی
کھائی عورتیں ہر کروٹ میں پاپڑ کی طرح چٹخ کر
ٹوٹ رہی ہوں گی ۔ ایک بھی ناؤ میں کوئی
داؤد نہیں ہوگا جو عورت کو قانون کی طرح
پڑھ سکے اور نہ ہی سوامی رام کرشن ہوگا جو
عورت کو دیوی کی طرح پوج سکے ۔
شاید کسی ایک کشتی میں اجنتا بھی ہو
جو بے عصمتی کے درد کو بھول کر مرد کو لوٹنے
کے فن میں ماہر ہو چکی ہو ۔ لوٹ در لوٹ
سلسلہ ہر دن مانجھی کے گیتوں کے ساتھ ہر گلی
پر بہتا رہتا ہے ۔ ایک طرف دکشنیشور اور
دوسری طرف بیلور ۔ مندروں کے درمیان
اپنے تجرد کو جسمانی بد ہضمی سے بچانے کے لئے
آنکھیں بند کئے رہتے ہیں ۔ ماں ۔ ماں ایک
آواز ایک بے چینی گونجتی اور منڈلاتی ہے ۔
لوگ سن کر کہتے ہیں ۔ یہ کون پاگل ہے ۔
ایک انگریزی کہاوت یاد آتی ہے ۔

پیسہ سے بستر خرید سکتے ہو نیند نہیں ۔ دوا خرید سکتے ہو صحت نہیں ۔ تصنع خرید سکتے ہو اصلیت نہیں ۔ اور دھرم خرید سکتے ہو نجات نہیں ۔ لیکن دولت کی اپاہج قوت حاصل کرنے میں سر سے پاؤں تک ڈوبا ہوا آدمی کچھ بھی دیکھنے سے قاصر ہے ۔

لیکن اس اجنتا کی مہک کا میں کیا کروں ؟ رشتے کی ہر کڑی ٹوٹ جانے کے بعد بھی باقی ماندہ الگ نہیں ہوتا ۔ مردہ بچوں کو نالی میں بہا دیا جاتا ہے ۔ مردہ ہی نہیں بلکہ ناجائز اور غیر مطلوبہ اولاد کو بھی زندہ پھینک دیا جاتا ہے ۔ مچھیرے جہاں جال ڈالتے ہیں کچرے کی طرح بچے اور بچوں کے اعضاء کو چیل کووں کے لئے کنارے پر اچھال دیتے ہیں ۔ یہ بچا کھچا مٹتا نہیں ہے ۔ بنتا ہے تو دوسرا ابھر آتا ہے ۔ بالکل اجنتا کی یاد کی طرح ۔ اس کی مہک اور بال کی طرح پورا کلکتہ ہی ان بچوں کھچوں کا ٹھاکر دوارہ لگتا ہے ۔

اجنتا کی مہک سے وابستہ میرا ماضی تو ویسا ہی ایک بچا کھچا کلکتہ ہے ۔ آرٹ فلمیں بنانے کا بھوت سوار تھا ۔ لوگ کہتے کہ بنرجی کا دماغ گھوم گیا ہے ۔ چوبیس سال کا لونڈا کیا فلم بنائے گا لیکن میرا عزم مصمم تھا ۔ کلکتہ کے درد کو نفرت کو سیلولائڈ پر اتار کر اچانک ہی امر ہو جانا چاہتا تھا ۔ دوزخ کی مجسم تصویر دکھا کر آدمی کی اینٹ در اینٹ بنے اندھے عقیدے کی دیوار گرا دینا چاہتا تھا ۔ دنیا کو بتانا چاہتا تھا کہ ستیہ جیت رے کی فلم بنگالی عورت کی تاریخ کا صرف ایک حصہ پیش کرتی ہے ۔ درد وہ ہے جس کا شہتیر چھت سے ٹوٹ کر ہر دل میں اٹکا ہے ہر جگر میں چبھتا رہے ۔ اس فلم کے لئے سستے داموں ملنے والی سو لڑکیاں جمع کی تھیں ۔ ان میں اجنتا بھی شامل تھی ۔ اجنتا کی طوائف میں ایک نسوانی کشش تھی ایک انفرادی حسن تھا ۔ میں ڈائرکٹر ہونے کے باوجود اس کے ساتھ دو لمحے کی خلوت تلاش کرتا تھا ۔ ایک دن اس نے کچھ پس و پیش کرتے ہوئے اپنا پتہ بتا دیا تھا ۔ کہا تھا" بنرجی موشائے دن میں ہی آئیے گا" ۔

سوچا تھا کہ فلم ریلیز ہوتے ہی اجنتا سے ملاقات کروں گا لیکن فلم سینسر بورڈ نے پاس ہی نہیں کی " یہ کیا ہے بنرجی ؟ کیا کلکتہ میں صرف طوائفیں ہیں اور ...... " بہت جدوجہد کی لیکن فلم پاس نہیں ہوئی اور ہوتی بھی کیسے ؟ سرکاری کرسی پر پہنچتے ہی ادیب ، فنکار ، یا اداکار کسی بیورو کریٹ کی روح کو اپنے اندر اتار لیتے ہیں ۔ پھر اس کے نظریات نقد و نظر تبدیل ہو جاتے ہیں ۔ وہ فنکار وزیر کے ساتھ اپنے جذبات کو سنکرونائز (Synchronize) کرنے کے بعد خود کو ختم کر لیتا ہے ۔ لوگ مذاق اڑاتے کہ اب کون بنائے گا ۔ تجربہ کی ہوئی سچائیوں پر فلم ؟ ٹین کے بکسے کو صلیب کی طرح پیٹھ پر لاد کر بنگالی مٹھائی بیچے گا بنرجی موشائے ۔ انقلاب ختم ۔ اب آؤ گے خوش فہمی میں ؟

مکان گیا ، پیسہ گیا ، کرائے کے سیلن زدہ کمرے میں کہانیاں لکھیں لیکن ان سے کیا ہوتا ہے ؟ نندی نے پھٹکارا اچھا ادب کیا ہے ؟ کیا عمر گزرنے پر گوتم بدھ جیسی شہرت ؟ اگر ادیب اپنی عمر بھی نہ جی سکے تو حضرت عیسی علیہ السلام کی قربانی ، امام حسین کا جہاد حق و باطل ، ہندوؤں کے اوتار اور دیگر انسانی انقلاب انسان کو کہاں پہنچا گئے ہیں ؟ ہر بحث ، ہر تبدیلی غرور کا ایک پرچم ہی تو بن کر رہ گیا ہے ۔ تم زندہ رہنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ امر ہونے کی جدوجہد بھی جاری رکھ سکتے ہو ۔ ویسے ٹیگور ہوں یا پریم چند ان کا ادب بھی تو امپورٹ ہو کر قائم ہوا ہے ۔

نندی نے گھوشال پرکاش سے بات کیا کرائی کہ مختلف ناموں سے ناول شائع ہونے لگے ۔ سانولے نمکین جسم " ترستے خواب ، لرزتے ہونٹ " ایک کتاب پورے ایک ہزار روپے ۔ ایک ماہ جینے کا موقع ! دریں اثناء ایک حقیقت پسند افسانہ نگار پیسہ ختم ہوتے ہی لکھتا " جسم کا جادو " ۔ وہ اس کتاب میں بلور کی ایک عورت تراش کر اپنے ہی ہتوڑے سے پاش پاش کر دیتا ۔ لیکن لوگ عورت کو نگل جاتے تھے اور اس کے درد کو تھوک دیتے تھے ۔

غیر ارادی طور پر ایک شام اجنتا کے گھر پہنچ گیا تھا ۔ میں حیران ہوا تھا گھر کی سجاوٹ دیکھ کر ۔ اجنتا خوب گہرا میک اپ کئے ہوئے تھی ۔ ایک کمرہ اور کچن ، چال کا مکان ، لیکن ڈبل بیڈ آرام دہ تھا ۔ اجنتا اپنی حالت پر رو پڑی تھی ۔ چھوٹی سی تھی اس کی کہانی ۔

جس دن باپ کو پھانسی ہوئی تھی اسی دن اس نے اپنی عمر کے چودہ سال پورے کئے تھے ۔ اب اس کی سالگرہ اور باپ کی برسی ایک ہی دن پڑتی ہے ۔ اس کے باپ منشی تھے ایک نابالغ لڑکی کو سیٹھ کے زنا بالجبر سے بچانے کے لئے قتل کر بیٹھے ۔ لیکن وہ نابالغ لڑکی عدالت میں گواہی دینے بھی نہیں پہنچی ۔ کیسے پہنچتی ؟ خوشحال لوگوں کے لئے عزت ہی تو سب سے بڑی دولت ہے ۔ جب پھانسی کا وقت ہوا ۔ ماں اسے اور بھائی رکھال کو لے کر اوپر چھت پر جا کھڑی ہوئی ۔ اس نے کہا تھا

"آتما ادھری سے گزرے گی" کوئی لاش لینے
بھی نہیں گیا۔ کفن اور سنسکار کا خرچ کہاں
سے آتا؟ ماں ہر دن چھت پر جاکر اسکے پتا کی آتما
سے گفتگو کرتی اور نیچے اتر کر گھر کا کوئی سامان
بازار میں بیچ آتی اور چاول کا جگاڑ کرتی۔ گھر کا
آخری برتن بھی بک جانے کے بعد وہ چھت
سے نیچے نہیں اتری بلکہ سیدھی سڑک پر
جاگری۔ گھر سے اتر کر بکنے کے لئے بچا ہی کیا
تھا۔ تب اجنتا پندرہ برس کی تھی۔ گھر میں
فرش اور چار خالی بوتلیں بچی تھیں۔ راکھال
واپس آیا تو ہاتھ میں تھال اور جھولے میں دو
پلیٹیں تھیں۔ اجنتا جھپٹ پڑی تھی۔ ماں کا
دکھ بھول گئی تھی۔ اس وقت راکھال نے کہا
تھا "رات میں کباڑی آئے گا اور سب بندو
بست کر دے گا"۔

اسی رات پانچ روپے کی دو رائس
پلیٹوں کے عوض اجنتا کی دوشیزگی کباڑی کے
ہاتھ بک گئی تھی اور اب راکھال بہن کی
عصمت کو روٹی کی سیڑھی بنا عیش و عشرت
کے آسمان چھونے کا خواہشمند تھا۔

کہانی ختم ہونے ہی کو تھی کہ راکھال
آگیا۔ ساتھ میں ایک کھوسٹ آدمی تھا۔ اجنتا
نے بلب روشن کر کے کالی کی تصویر کو پرنام
کیا تھا۔ اجنتا نے اس دن ملنے کے لئے کہا تھا
"آج میری طبعیت ٹھیک نہیں ہے آج کچھ
نہیں ہوگا"۔

راکھال فلمی ویلن کی طرح ہنسا تھا
"سب کچھ چلا گیا اجنتا دی! ۔ موشائے بنرجی کی
قلم ولم ٹھپ؟ بنرجی موشائے اب کھوکھلا ہے
تو دھندا کرا!" اجنتا تن گئی تو راکھال نے
سیدھے ہاتھ سے اس کے گال پر تھپڑ جمادیا۔
میں اٹھ کر باہر آگیا۔ احساس ہوا تھا کہ تجربہ کی
ہوئی حقیقت اور دائرہ تحریر میں آنے والی
حقیقت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ میں نے
خود کو نامرد محسوس کیا تھا۔

ایک مدت بعد آج اجنتا وکٹوریہ پر
اچانک ہی ملی تھی۔ سرمئی کار سے اتری تھی،
خوب بجی سنوری ہوئی، خوش و خرم آکر پہلو
میں بیٹھ گئی تھی۔ مجھ میں اس دن کی اپنی بے
بسی کراہ اٹھی تھی۔ پوچھا تھا "کیسی ہو؟"

اس نے ہنس کر میرا ہاتھ تھامتے
ہوئے کہا تھا "آزاد۔ مکمل آزاد" مجھے محسوس
ہوا کہ نجات کا احساس ایک راز ہے۔ میں نے
کہا "سمجھا نہیں!"

وہ اپنا ہاتھ ایک مخصوص انداز میں
گردن کے پاس لائی۔ "کھس! ختم! قصہ ختم
بنرجی موشائے" وہ بھیا فلمی ویلن کے انداز
میں بول رہی تھی۔ پھر کھکھلا کر سرگوشی
کرنے لگی "اسے قتل کرادیا۔ ارے اسی دلال
راکھال کا قتل۔ مجید نے اسے چاقو گھونپ کر
ہر گلی پہنچانے کا بندوبست کر دیا۔ پھر بوڑھے
کباڑی کو اشارہ کر کے پولیس بلوادی۔ دلال
بھی گیا اور اس کا قاتل بھی"۔

میں کپکپا گیا۔ "تم نے بھائی کا قتل
کرادیا" پھر خود ہی سوچنے لگا "کیسا بھائی۔ جو
اپنی بہن کی دوشیزگی بوڑھے کباڑی کے ہاتھ بیچ
کر اپنا پیٹ بھرے۔ اور اسے پیشہ کرنے کے
لئے مجبور کرے وہ بھائی کہاں؟ اپنی بہن کا
جسم قصائی کو پیش کرنے والا کہاں کا بھائی؟
کیسا بھائی۔

اجنتا نے کسی آزاد تخیل میں گم ہو کر
میرے کندھے پر سر ٹکا دیا تھا اور اس کی نگاہ
آسمان میں مرتکز تھی۔ سورج پوری طرح
غروب نہیں ہوا تھا۔ فوارے جاری تھے۔ اور
ہوا میں منتشر ہوتے ہوئے پانی کے چھینٹے اجنتا
کو گدگدا رہے تھے۔ بہت دیر سوچتا رہا۔
اجنتا کی ذہنیت پر۔ روٹی کے لئے جسم فروشی۔
وہاں بھی استحصال۔ اس استحصال سے نجات
کے لئے قتل اجنتا کی بائیس سالہ زندگی میں کیا
کچھ بیت گیا تھا۔ عورت کی خوشبو اور ایثار
سے لبریز دوشیزگی ٹوٹ کر کیسی ناگ پھنی بن
جاتی ہے۔

اجنتا جاگ اٹھی تھی۔ مہک اور بال
جیکٹ پر پڑے رہ گئے تھے۔ اس نے اٹھتے
ہوئے پوچھا تھا "بنرجی موشائے آؤ گے؟ ایک
تاریخ ہے وقت کی!"

اجنتا چلی گئی اور میں سوچتا رہا
"عورت! اجنتا جیسی عورت واقعی تاریخ ہے
ایک ملک جسے اپنے ہی ملک کے لوگ
اسمگلنگ، لوٹ، ملاوٹ، اور فسادات کا مرکز
بناتے ہیں اور باہر والے جس پر حملہ کر کے
نیست و نابود کر دینا چاہتے ہیں۔

مجھے احساس ہوا کہ سعادت حسن منٹو
اور کیو پرن نے کتنا درد برداشت کر کے اس
عورت کی تاریخ اپنے قلم سے لکھی ہوگی۔
"کالی شلوار" ہو یا "مادی حیل حول" لفظ
لفظ درد میں ڈوبا ہوا ہے۔ لیکن اس تاریخ کو
لکھ کر نہ تو کسی نے پہلے بدلا اور اب بھی کوئی
کیا بدلے گا؟ انسان، راکشش، جانور اور
جونک بن چکا ہے۔ اس پر دوسروں کے درد
کا اثر نہیں ہوتا۔ دوسروں کے خون کے
چھینٹے اور پان کی پیک اب دو الگ الگ
تہذیبیں نہیں ہیں۔ اس کے لئے روحانیت
سماجیت، یا الادیت سب دھوکہ ہے۔
بھگوان کرشن کیوں نہیں آتے کسی کی لٹتی
عصمت بچانے کے لئے۔ سچائی کی دیوی کی

بددعا پر آدم خور انسان پتھر کیوں نہیں بن جاتے۔ ؟ انقلاب کی ندیاں آخر کیوں آدمی کو غلط فہمی کے سمندر میں چھوڑ دیتی ہیں کہ جلوس نعرے لگاتے ہوئے نکل جاتے ہیں اور کاسہ۔گدائی بھی کھو جاتا ہے۔

نیم خوابی ختم ہوتی ہے۔ اسٹیمر نے سائرن بجا دیا تھا یاد ؟ کشنیشور کے کنارے کوئی چلایا تھا۔ ماں۔ ماں تو کہاں ہے ؟ اسٹیمر کے باہر ہنگامہ برپا ہوا۔ کوئی کسی مسافر کی پوٹلی لے کر بھاگ گیا تھا۔

بال کو پڑیا سے نکالتا ہوں اور چٹکی سے پکڑ کر ناک کی سیدھ میں لاتا ہوں۔ بال پنڈولم کی طرح ہلتا ہے۔ ہر جسم نابدان، پیکدان، کوڑے دان اور مندر سے گزرتے نالے کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس میں سینکڑوں گلے سڑے اعضاء تیرتے رہتے ہیں۔

میں گھبرا کر بال ہوا میں اچھال دیتا ہوں۔ ہوا میں اڑتا ہوا بال ہر گلی کے سینے پر گر کر غائب ہو جاتا ہے۔ اندھیرا پیچھے سے پشت تھپتھپاتے ہوئے کہتا ہے" بھول جا بال کو---

--- لھنتا کی مکمل نجات سے خود کو آزاد کر لے۔"

اچانک اسی وقت کوئی جگمگاتا اسٹیمر چیخ اٹھتا ہے اور ہبگلی کے کنارے کوئی چلاتا ہوا دوڑتا ہے... ماں... ماں تم کہاں ہو ؟" مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تمام شہر دلالوں اور کمیشن ایجنٹوں کی مٹھی میں ہے۔ جن سے خوفزدہ ہو کر سورج، چاند اور ستارے دور چلے گئے ہیں۔ ورنہ وہ ان کی اجارہ داری حاصل کر کے ایک ایک کرن کی قیمت مانگتے۔

غزلیں

اختر ضیائی

13 E HOE STREET
LONDON E17 4SD
(UK)

اب کے موسم میں عجب شعبدہ پیرائی ہے
جیسے روٹھی ہوئی ہر پھول سے پُروائی ہے

جن کی بے داد سے جینا ہوا بے نیل و مرام
وہ بھی کہتے ہیں کہ نادان ہے سودائی ہے

خود ہی کر دیجئے اس عہدِ وفا کی تاویل
ہم سے رغبت نہیں غیروں سے شناسائی ہے

نہ تبسم، نہ تکلم نہ محبت کی نظر
کتنا دلچسپ یہ اندازِ پذیرائی ہے

سایۂ زلف کی اُمید کہاں دید کہاں !
کہ مقدر میں سیہ رات ہے تنہائی ہے

موت کے خوف سے جیتے ہیں نہ مر سکتے ہیں
اُن کو اصرار کہ یہ دورِ مسیحائی ہے

جب سے پھیری ہیں زمانے نے نگاہیں ہم سے
ہم نے حالات بدلنے کی قسم کھائی ہے

مستقل چیز ہے حوروں کی جوانی واعظ !
سچ ہے کہ آپ کی ہر بات میں گہرائی ہے

اُس کی نیت پہ بھلا مجھ کو ہو کیا شک اختر
وہ جو یوسف کا خریدار نہیں بھائی ہے

سُن لیں سفاک زمانے والے
ہم نہیں سر کو جھکانے والے

وقت کے ساتھ گزر جائیں گے
پھر نہیں لوٹ کر آنے والے

وہ جو دھرتی کی لگن میں گم ہیں
خود نہیں ٹھور ٹھکانے والے

زندہ رہتے ہیں سحر کی خاطر
آس کی شمع جلانے والے

دربدر پھرتے ہیں خوشبو کی طرح
فصلِ گل ڈھونڈ کے لانے والے

کیا تعجب ہے کہ تھک کر سو جائیں
خلقتِ شہر جگانے والے

شکریہ تیری مسیحائی کا
زخم کا پھول کھلانے والے

خوار و بدحال کروڑوں انساں
اور کچھ لوگ خزانے والے

کاش لوٹ آئیں کسی دن اختر
بے سبب روٹھ کے جانے والے

دو غزلیں

شجاع خاور
نمبر ا پارک لین ۔ تالکٹورہ، نئی دہلی

مکتب میں پڑھی تھی جو لغت چھوڑ دی وہ وئیں
کہتی ہے طبیعت کہ ہنیں کو بھی لکھو نئیں

اپنی تو نظر اور ٹھہرتی ہنیں کہئیں
اور اس کا یہ انداز کہ دیکھا ہی ہمیں نئیں

اس نے مری درخواست پہ باتیں تو بہت کئیں
مایوسی کا عالم تھا مجھے یاد ہنیں رئیں

حالانکہ اب اس کو بھی لگاوٹ ہے مرے تئیں
اظہار کے موقع بھی بہت آئے ۔۔۔ مگر نئیں

قاضی مرے معصوم تصور کا یقیں کر
اللہ ہے شاہد کہ وہ بیٹھا تھا ابھی یئیں

دنیا کا مزہ تھا ترے کوچے کے سفر میں
آرام بہت کم ملے ، تکلیفیں بڑی سئیں

گرمی کو تو بس عارضی سمجھے تھے شجاع آپ
اب بولئے برسات کی امیدیں کہاں گئیں

○

صحیح بات تو یہ ہے کہ تم غلط نہ ہم غلط
غزل کے شعر کہہ کے یوں ہی کر رہے ہیں غم غلط

زبان نے کہا تو ہے کہ سب یہاں پہ ٹھیک ہے
بیان دے رہی ہے صاف میری چشمِ نم غلط

وہ راستے ملیں جو منزلوں سے بھی عظیم ہوں
کبھی اٹھا کے دیکھیے تو ایک دو قدم غلط

جہاں سے چاہئے تھی ابتداء وہیں ہے خاتمہ
کسی نے شرحِ آرزو لکھی ہے ایک قلم غلط

شمار حشرِ آرزو نہ کیجئے آرزو کے ساتھ
حساب زندگی کا آرہا ہے ایک دم غلط

ماہیے

دیپک قمر
... لیڈیا، صدر ... میرٹھ ۲۵۰۰۰۱

کچھ ایسے سنبھل جاتے
جب وقت بُرا دیکھے
غصے کو نگل جاتے

وہ سوچے ہے کب ہوگا
جواب کو ذرا دیکھے
معلوم یہ سب ہوگا

وہ سب سے ہی پہلے ہے
جو آیا نہیں اب تک
وہ راہ میں کل کا ہے

اِک دوجے سے انجانے
گھر والے سبھی اس کو
اب لگتے ہیں بیگانے

گردن کو جھکا لینا
وہ دیکھنا جی بھر کے
پھر آنکھیں چرا لینا

جب دنیا کی صحبت ہو
احساس ہے سوجاتا
جو دل کو نہ فرصت ہو

سونے کو نظر آیا
آنکھوں سے مرے دل میں
وہ چاند اتر آیا

نوچے ہے بدن جاڑا
بچوں نہ جوانوں کا
بس بوڑھوں کو ہے تاڑا

چمکار اچانک سی
بجلی کی طرح قسمت
ہنس مکھ سی بھیانک سی

کیسی ہے خطا کھائی
تھا غصہ چڑھا سر پہ
اترا تو سمجھ آئی

سر اپنا وہ پھوڑے گا
مانا کہ غلط ہے وہ
ہٹ دھرمی نہ چھوڑے گا

جب وقت بلائے گا
دروازہ کھلا رکھنا
خود ملنے وہ آئے گا

پہچان ہے یوں کھوئی
جو ہوں وہ نہیں ہوں میں
ہوں دوسرا اب کوئی

خالی ہی رہا بھر کر
دو بھر کیا جینا بھی
نت موت سے ڈر ڈر کر

پہلے تو بڑھے آگے
جب حد سے ہوئے باہر
افسوس ہوا پیچھے

اِک جائے تو اک آئے
اس بھیڑ میں جذبوں کی
کچھ بھی نہ لکھا جائے

پیروں کی تھکاوٹ پر
مت کوسو سڑک کو تم
جوتوں کی بناوٹ پر

جیسے ہو نبھاتے ہیں
وہ آئی چلاتی سے
ہر کام چلاتے ہیں

وہ بہرہ ہے اندھا بھی
ہوتا ہے ہر اک عاشق
جاہل کی طرح ضدی

ہے چاند بدریا میں
چکوے کی طرح جھانکیں
گوری ہے اٹریا میں

پی۔پی۔ سریواستو رند ساغری

غزل

گم شدہ لمحات کی زنجیر لے کر آئی ہے
غم کی پروائی عجب تاثیر لے کر آئی ہے

دھوپ لفظوں کی سنہرے تیر سے کر آئی ہے
زنگ آلودہ سہی شمشیر لے کر آئی ہے

مدتوں کے بعد اب ٹوٹی ہوئی دہلیز تک
پھر وہی خوشبو وہی تحریر لے کر آئی ہے

موسموں کی زد میں کچھ الفاظ گیلے تھے مگر
اب کے بارش اک نئی تدبیر لے کر آئی ہے

پھر نئی تخیل ریتیلے شبستانوں کے بیچ
اک شکستہ خواب کی تعبیر لے کر آئی ہے

ہم نفس فکر تمنا، پتھروں کے شہر میں
ایک بے آواز سی زنجیر لے کر آئی ہے

رندؔ میری ذات تو ہے ربط منظر تھی مگر
زندگی اپنی الگ تصویر لے کر آئی ہے

P.P. Srivastava 'Rind'
Manager (Personnel)
RASHTRIYA SAHARA

Residence . R-16, Sector-XI, NOIDA-201301

ایک شکریہ

جانِ من جینیفر!
خط تمہارا ملا، شکریہ یاد فرمائی کا
تم نے لکھا ہے میں نے جو بھجوائی تھی
بیس دن قبل تم کو رقم
گھر کے خرچے میں پوری کی پوری
ہوئی صَرف
اب کچھ بھی باقی نہیں
اور تم بیقراری سے ہو منتظر
ایک معقول چیک کے لئے

میری جانِ تمنّا، مری جانِ عشرت، مری جینیفر
سیم تن، گُل بدن، ڈارلنگ
جان و دل تم پہ قربان جانِ جگر
فرض مجھ پر ہے تعمیلِ فرمانِ حسن

اور اسی واسطے، آج ہی
اِس لفافے میں
ارسال کرنے لگا ہوں تمہارے لئے
دو ہزار اور پچیس بوسوں کا چیک

میرے سرتاج!
بھولے سجن! بجھن!
پیارا پیارا سا الطاف نامہ
تمہارا مِلا
شکریہ، شکریہ، بارہا شکریہ
تم نے از راہِ مہر و خلوص و وفا
دو ہزار اور پچیس بوسوں کا چیک
جو روانہ کیا تھا مرے واسطے
کل پڑوسی نے وہ کیش کر بھی دیا
شکریہ، شکریہ، جانِ من شکریہ

شباب للت (شملہ)

۱۲۔ بولائی دت اسٹریٹ کلکتہ-۷۳

منور رانا

غزلیں

بند کر کھیل تماشا ہمیں نیند آتی ہے
اب تو سو جانے دے دنیا ہمیں نیند آتی ہے

دل کی خواہش کہ ترا راستہ دیکھا جائے
اور آنکھوں کا یہ کہنا ہمیں نیند آتی ہے

ڈوبتے چاند ستاروں نے کہا ہے ہم سے
تم ذرا جاگتے رہنا ہمیں نیند آتی ہے

اپنی یادوں سے کہو اب تو رہائی دیدے
اب تو زنجیر نہ پہنا ہمیں نیند آتی ہے

چھاؤں پاتا ہے مسافر تو ٹھہر جاتا ہے
زلف کو ایسے نہ بکھرا ہمیں نیند آتی ہے

رات اجازت ہے اگر کوئی کہانی اور ہے
ان کٹوروں میں ابھی تھوڑا سا پانی اور ہے

مذہبی مزدور سب بیٹھے ہیں انکو کام دو
اک عمارت شہر میں کافی پرانی اور ہے

خامشی کب چیخ بن جائے کسے معلوم ہے
ظلم کر لو جب تلک یہ بے زبانی اور ہے

خشک پتے آنکھ میں چبھتے ہیں کانٹوں کی طرح
دشت میں پھرنا الگ ہے باغبانی اور ہے

پھر وہی اکتاہٹیں ہونگی بدن چوپال میں
عمر کے قصے میں تھوڑی سی جوانی اور ہے

انسان تھے کبھی مگر اب خاک ہو گئے — لے اے زمین ہم ترے خوراک ہو گئے
رکھتے ہیں جو چاہنے والے سنبھال کے — ہم ننھے روزہ دار کی مسواک ہو گئے
آنسو نمک ملا ہوا پانی ہی تھے مگر — آنکھوں میں رہتے رہتے خطرناک ہو گئے
مصروف پردہ پوشی میں رہتے ہیں ہر گھڑی — آنسو بھی جیسے آنکھوں کی پوشاک ہو گئے

دنیا جو چاہتی تھی فقط وہ ہو گیا
ہم بھی شکارِ گردشِ افلاک ہو گئے

آگہی

سلیم سرفراز
جے۔ این۔ فارمیسی، کے ٹی۔ روڈ
آسنسول ۷۱۳۳۰۲، مغربی بنگال

اس کے ملنے سے قبل مجھے انگوٹھوں کی قدر و قیمت کا مطلق اندازہ نہیں تھا۔ اب جو شئے موجود ہی نہ ہو، چاہے وہ زندگی کے لئے کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو، بغیر کسی ذاتی تجربے کے اس کی اہمیت و افادیت کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا اپنے ہاتھوں کو انگوٹھوں سے محروم ہی پایا۔ ان کی عدم موجودگی سے بہت ساری روایتیں منسوب تھیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ میں ایام طفلی میں بے حد کند ذہن تھا اور اسی کند ذہنی کے باعث میں نے اپنے انگوٹھوں کو ایک چارہ کاٹنے والی مشین میں ڈال دیا اور انہیں گنوا بیٹھا جب کہ بعض افراد اس حادثے کو میری شرارت کا خمیازہ مانتے تھے۔ ان کے مطابق مجھے یہ سزا قدرت کی طرف سے میری شرارت کی پاداش میں ہی ملی تھی۔ معدودے چند ایسے بھی تھے جن کا یقین تھا کہ میرے انگوٹھوں کو جبراً کاٹ ڈالا گیا تھا۔ اب روایتوں میں جتنے بھی ابہام ہوں لیکن یہ ایک روشن حقیقت تھی کہ میرے ہاتھوں میں انگوٹھے نہیں تھے۔ اور مجھے ان کے نہ ہونے سے کوئی خاص پریشانی بھی نہیں تھی۔ یہ اصول فطرت ہے کہ ناموجود عضو کی کمی کی تلافی کے لئے موجود اعضاء میں ہی اضافی صلاحیتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ میری انگلیوں نے بھی اعصابی طور پر اس کمی کو قبول کرلیا تھا اور ان کی فاضل ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی تھی۔ میری انگلیاں زیادہ تر وہ کام بحسن و خوبی کرلیتی تھیں جو انگوٹھوں کے تعاون کے بغیر مشکل تھا اور میں کسی محرومی کے احساس سے یکسر عاری ہوکر مطمئین سی زندگی گزار رہا تھا کہ اس سے ملاقات ہوگئی۔

یہ ملاقات بالکل اتفاقیہ تھی۔ ذرائع ابلاغ سے معلوم ہوا کہ ملک کا مقبول ترین قلم کار س۔ی۔ راشد ایک سڑک حادثے میں بری طرح زخمی ہوکر ہسپتال میں داخل ہے۔ وہ میرا ہم عصر ہونے کے ساتھ ساتھ میرا اچھا دوست بھی تھا۔ حالانکہ اسے جس قدر عوامی مقبولیت اور شہرت حاصل تھی وہ میرے لئے خواب جیسا تھا اس کے باوجود میں کسی احساس کمتری میں مبتلا ہوئے بغیر اس کی دوستی میں مخلص تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی یہ مقبولیت، یہ شہرت تمام کی تمام عارضی ہیں میرے خیال میں وہ اپنی تخالیق سے روشنی کی ایک لکیر کھینچتا ہوا معصوم و محروم لوگوں کو اپنے عقب میں جس خواب جہاں کی طرف لیے جارہا تھا حقیقتاً اس جہاں کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ عالم غنودگی میں مبتلا لوگوں پر جب یہ حقیقت آشکار ہوتی تو اس کے تئیں ان کی محبت اور وفاداری یک لخت غم و غصے اور بغاوت میں تبدیل ہوجاتی۔ میرے شدید اختلاف کے باوجود وہ اپنے نظریہ، فکر و فن سے ایک انچ بھی ہٹنے کا روادار نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہوسکتا ہے وہ جہاں ایک خواب ہی ہو لیکن اس جہاں کی اس نے جو تفصیل اور تصویر پیش کی ہے اور لوگوں نے جتنی گہرائی اور شدت سے انہیں قبول کیا ہے اگر وہ جہاں نہ بھی ملا تو وہ خود ہی اسے تشکیل کرلیں گے۔ میرا اعتراض تھا کہ وہ جہاں تو غیر حقیقی ہے ہی اس کے پیش کردہ خد و خال بھی اتنے غیر حقیقی ہیں کہ یہ تشکیل ممکن ہی نہیں۔ نظریاتی طور پر اس اختلاف کے باوجود ہم میں ایک قدر مشترک تھی کہ ہم دونوں ہی اپنے اپنے طریقۂ کار سے ظلم و استحصال کے خلاف محاذ آرا تھے۔

اس کے حادثے کی خبر سن کر میں پہلی فرصت میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ ہسپتال میں اسپیشل وارڈ کے باہر بچھی کرسیوں پر اس کی بیوی اور بچے پریشان اور مضمحل سے بیٹھے تھے۔ ان کے علاوہ ایک اور شخص بے حد فکر مند اور فعال تھا۔ میں نے اس شخص کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اس کی

شخصیت میں کچھ ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ اسے بار بار دیکھنے کے لئے کوئی بھی فرد مجبور ہو سکتا تھا ۔ بلند قد و قامت اور سرخ و سپید چہرے پر سب سے قابل توجہ اس کی بڑی بڑی آنکھیں تھیں ۔ ایسی زندہ ، روشن اور متحرک آنکھیں میں نے شاید ہی پہلے کبھی دیکھی ہوں ۔ بعد میں اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنے اور اس کی آنکھوں میں بغور دیکھتے رہنے پر ایک عجیب و غریب مشاہدہ ہوا ۔ اس کی آنکھوں میں بیک وقت دو متضاد کیفیتیں ابھرتی تھیں ۔ محبت و نفرت ، یاس و مسرت اور نرمی و سختی جیسے متضاد رنگوں کا ایک ساتھ جھلکنا حیرت انگیز امر تھا ۔

راشد کے بیٹے سے معلوم ہوا کہ فوری طور پر اعلیٰ درجے کا ہسپتال اور علاج میسر ہو جانے کی وجہ سے راشد کی جان بچ گئی اور اب وہ خطرے سے باہر ہے ۔ گرچہ کچھ ہڈیاں فریکچر ہو گئی ہیں لیکن اس کے لئے فکر مند یا خوفزدہ ہونے والی کوئی بات نہیں ۔ اسی سے یہ جانکاری ملی کہ راشد کی جان بچانے میں اس شخص کا بڑا ہاتھ تھا اگر وہ بذات خود مداخلت نہیں کرتا تو ایسا خاص الخاص علاج ممکن بھی نہیں تھا ۔ اس کے علاج پر جو کثیر رقم خرچ ہو رہی تھی اسے وہی برداشت کر رہا تھا ۔ دراصل راشد کا اسکوٹر جس ٹرک سے ٹکرا گیا تھا اس کا مالک وہی شخص تھا ۔ حالانکہ عینی گواہوں کے مطابق ٹرک ڈرائیور کی کوئی غلطی نہیں تھی بلکہ نشے کی زیادتی کی وجہ سے راشد ہی اپنا اسکوٹر سنبھال نہیں پایا تھا ۔ اس شخص سے باضابطہ تعارف ہونے پر یہ جان کر کچھ زیادہ ہی حیرت ہوئی کہ وہ ملک کا مشہور اور کامیاب ترین انڈسٹریلسٹ اودے سنگھ لاسکانی ہے ۔ میرا نام سن کہ وہ بے حد گرم جوشی سے پیش آیا ۔ میرے ہاتھوں کو والہانہ انداز میں دباتے ہوئے بولا:

" میں آپ لوگوں کا بے حد قدر داں ہوں ۔ مجھے جیسے ہی علم ہوا کہ اس حادثے کے شکار راشد صاحب ہیں تو میں اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر چلا آیا ۔ اوپر والے شکر ہے کہ اس نے میری لاج رکھ لی ورنہ میں خود کو کبھی معاف نہیں کر پاتا"

اس سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی ۔ گفتگو کے دوران میں اس کی ایک ایک ادا سے متاثر ہوتا رہا ۔ غضب کی باغ و بہار شخصیت تھی اس کی ۔ یوں تو اس کے لہجے میں انکسار ہی انکسار جھلکتا تھا لیکن اس میں ایک ایسا تحکم بھی پوشیدہ تھا کہ اس کی باتوں سے انحراف کی قطعی گنجائش نہیں تھی ۔ اسی لئے جب اس نے مجھے دوسرے دن اپنے گھر کھانے پر بلایا تو میں انکار نہیں کر پایا ۔

اس کے عظیم الشان بنگلے میں قدم رکھتے ہوئے میں اس کی شان و شوکت کا قائل ہوتا گیا ۔ اس نے میرا پرتپاک خیر مقدم کیا ۔ ہلکی سی شراب نوشی کے بعد ہم کھانے کی میز پر پہنچے ۔ کھانے کے دوران طرح طرح کی باتیں ہوتی رہیں ۔ اس کی باتوں سے احساس ہوا کہ نہ صرف وہ میری تخالیق سے مکمل طور پر واقف ہے بلکہ کچھ تخالیق تو اسے زبانی یاد ہیں بجا طور پر یہ میرے لئے قابل فخر بات تھی ۔ چونکہ اب تک ادب ہی موضوع گفتگو تھا اس لئے ماحول بالکل سنجیدہ ہی تھا کہ اچانک وہ کچھ ہنس کر بولا ۔

" آپ نے خود کو کبھی کھانا کھاتے ہوئے آئینے میں دیکھا ہے ؟"

" جی ! ؟ " میں نے شدید حیرت سے اس کے متبسم چہرے کو دیکھا ۔

" آپ کے ہاتھ میں انگوٹھے نہ ہونے کی وجہ سے کھانا کھاتے وقت عجیب مضحکہ خیز منظر پیدا ہو جاتا ہے ۔ اب ہم لوگ کھاتے ہیں تو نوالے کو منھ میں ڈالنے کے لئے انگوٹھا ہی سب سے اہم کردار ادا کرتا ہے ۔ یہ دیکھئے ۔ اس طرح" ۔

اس نے ہاتھ میں نوالہ اٹھایا ، چاروں انگلیاں منھ میں ڈالیں اور پھر انگوٹھے سے دھکیلتے ہوئے نوالے کو منھ میں ڈال لیا ۔ یہ سارا عمل اتنی آسانی اور نفاست سے ہوا کہ میں حیران ہو کر دیکھتا رہ گیا ۔ سچ سچ اس کے مقابلے میں میرا کھانے کا انداز کچھ بے ڈھب اور بے ڈھنگا ہی تھا ۔ زندگی میں پہلی بار انگوٹھوں کی غیر موجودگی پر مجھے بری طرح شرمندگی کا احساس ہوا ۔

" سچ ! انگوٹھے تو بے حد کارآمد اور ضروری ہیں کیا آپ کو ان کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی ؟"

ابھی ابھی چند لمحے قبل اس کی تعریف و توصیف اور قدر دانی پر میرے اندر احساس تفاخر کا جو بلند مینار کھڑا ہوا تھا یکلخت وہ ڈھے گیا میں اپنے اندرونی کرب کو چھپاتا ہوا شکستہ آواز میں بولا: "جی ! میں نہیں سمجھتا کہ انگوٹھے انتہائی ضروری ہیں ۔ میں ان کے بغیر بھی اچھی خاصی اور مکمل زندگی گزار رہا ہوں" ۔

" جی نہیں ! " وہ قطعی لہجے میں میری بات کی تردید کرتے ہوئے بولا ۔ " آپ زندگی گزار رہے ہیں لیکن مکمل نہیں ۔ آپ کی زندگی میں ڈھیروں خلاء ہیں ۔ کیا آپ پانی یا

شراب کا ایک گلاس بھی قاعدے سے پکڑ سکتے ہیں ؟ صبر و قناعت اچھی چیز ہیں لیکن یہ کسی محرومی کا ازالہ نہیں کر سکتیں ۔ زیادہ سے زیادہ اس محرومی کو قبول کرنے کے لئے ذہن کو آمادہ ہی کر سکتی ہیں ۔ دنیا میں ایسے بہت سارے کام ہیں جو آپ بغیر انگوٹھوں کے سہارا لئے کبھی نہیں کر سکتے ۔ اچھا ایک چھوٹا ہی سہی لیکن بے حد اہم کام ہے ۔ کیا آپ چٹکی بجا سکتے ہیں ؟ اس طرح" ۔

اس نے اپنے انگوٹھے اور بیچ کی انگلی کو ملا کر چٹکی بجاتے ہوئے کہا ۔ میں نے تعجب سے اس کی جانب دیکھا ۔

"اگر چٹکی نہیں بجا سکتا تو اس میں کیا نقصان ہے ؟"

"یہی تو قابل غور امر ہے ۔ ذاتی تجربہ نہ ہو تو ہر عمل بے فیض نظر آتا ہے ۔ آپ بڑے سے بڑے مسئلے کو چٹکی بجا کر حل کر سکتے ہیں ۔ آپ اپنے تمام فکر و غم کو چٹکیوں میں اڑا سکتے ہیں ۔ یہ عمل آپ کو بالکل بے فیض نظر آتا ۔ لیکن میرے تجربے کے مطابق انگوٹھے کا سب سے اہم مقصد چٹکی بجانا ہی ہے اچھا ایک بات پوچھوں ۔ آپ کی عمر کتنی ہوگی ؟

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اپنی عمر بتائی ۔ "یہی ۴۷ یا ۴۸ سال ہوگی" ۔

"کیا آپ اندازہ لگا کر بتا سکتے ہیں کہ میری عمر کتنی ہوگی ؟"

میں نے اس کے صحت مند چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا " میرے خیال میں آپ مجھ سے پانچ چھ سال ہی چھوٹے ہوں گے" ۔

"جی نہیں ! میں آپ سے بہت زیادہ بڑا ہوں ۔" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ۔

"اور میری اتنی اچھی صحت اور جوانی کا راز بس اتنا ہے کہ میں چٹکی بجا سکتا ہوں ۔ اس لئے کوئی بھی مسئلہ میرے لئے لاینحل نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی غم میرے قریب پھٹکتا ہے ۔"

میں دیر تک اس کی باتوں کی صداقت اور اہمیت پر غور کرتا رہا ۔ حیرت انگیز طور پر آہستہ آہستہ مجھ پر منکشف ہوتا گیا کہ بغیر انگوٹھوں کے زندگی عبث ہے ۔ مجھے ہر وہ کام یاد آتا گیا جو میں انگوٹھوں کے نہ رہنے کے باعث کرنے سے مجبور تھا ۔ میں جس قدر بھی خوش فہمی میں مبتلا رہوں لیکن یہ ایک تلخ حقیقت تھی کہ میں ایک قابل رحم معذور شخص تھا ۔ مجھے شدت سے خواہش ہونے لگی کہ کاش کسی بھی صورت میری اتنی بڑی محرومی کا ازالہ ہو سکتا ۔ میں گہری شرمندگی کے زیر اثر اس شخص سے نگاہیں چرانے کی کوشش کرنے لگا جو بڑی محویت سے میرے چہرے کی تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا ۔ کافی دیر تک ماحول پر بوجھل سی خاموشی چھائی رہی ۔ معاً اس نے سرگوشیوں میں مجھے مخاطب کیا ۔ "اگر آپ چاہیں تو میں اس عظیم نقصان کی تلافی کر سکتا ہوں ۔ میں آپ کو عاریتاً انگوٹھے دے سکتا ہوں" ۔

"کیا ؟" میری حیرت ایک ناقابل بیان خوشی کے بوجھ تلے دبتی چلی گئی ۔

"جی ہاں ! " میں آپ کا زبردست مداح ہوں اس لئے آپ کی خاطر یہ قربانی دینے کے لئے تیار ہوں ۔ میرے دیئے ہوئے انگوٹھوں کو آپ بلاتکلف اپنے ہر استعمال میں لا سکتے ہیں ۔ بس ایک چھوٹی سی شرط ہوگی ۔"

"وہ کیا ؟" میں نے بے ساختگی سے پوچھا ۔ ذہنی طور پر میں اس کی پیشکش کو قبول کرنے کے لئے بالکل تیار ہو چکا تھا ۔ میرے لئے اس کی یہ پیشکش نعمت غیر مترقبہ تھی ۔

"گرچہ یہ انگوٹھے ہمیشہ آپ کے حکم کے تابع رہیں گے لیکن کبھی کبھی پل دو پل کے لئے یہ اپنی مرضی سے آزادانہ حرکت کر سکیں گے" ۔

میں نے اس شرط کی گہرائی سے جائزہ لیا اور مجھے اس میں کوئی بڑی خرابی نظر نہیں آئی ۔ بھلا انگوٹھوں کی بساط ہی کیا ۔ کبھی کبھی یہ آزادانہ حرکت کر بھی لیں تو میرا کیا بگڑ سکتا تھا ۔ اور میں نے ہامی بھر دی ۔

انگوٹھوں کی فراہمی کے بعد میری زندگی میں ایک نہایت خوشگوار اور روشن انقلاب آیا ۔ میں نے جانا کہ انگوٹھے کار حیات میں کتنا لازمی اور اہم مقام رکھتے ہیں اور بیچ بیچ چٹکی بجانا کتنا کارگر اور مفید ہے ۔ اب میں ہر مسئلہ ہر غم سے نجات پا چکا تھا ۔ میری صحت تیزی سے بہتر ہوتی جا رہی تھی ۔ میرے چہرے سے وہ صحت مند سرخی جھلکنے لگی تھی جو بے فکر زندگی کی پہچان ہے ۔ اب میرے ہر قدم میں ایک مضبوط اور استحکام پیدا ہو چکا تھا ۔

اس مدت میں ان انگوٹھوں نے میری مرضی کے خلاف آزادانہ طور پر کچھ حرکتیں کیں لیکن یہ اتنی بے ضرر تھیں کہ میں نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی ۔ ہاں ایک بار اس کی حرکت بے حد ناگوار گزری ۔ میں ایک ایسی محفل میں شریک تھا جس میں ملک کے معزز اور سربرآوردہ افراد شامل تھے ۔ شراب کا پہلا گلاس ختم کرنے کے بعد میں نے دوسرا اٹھایا ہی تھا کہ یکلخت انگوٹھا میرے اختیار سے باہر ہو گیا ۔ اس کی گرفت ڈھیلی

پڑتے ہی گلاس زمین پر گر پڑا اور ساری شراب قیمتی دبیز قالین میں جذب ہو گئی ۔ اور اس کے ساتھ ہی لوگوں کے استہزائیہ قہقہے ابل پڑے ۔ انہیں شاید گمان ہوا کہ مجھے شراب کی ذرا بھی سہار نہیں اور میں ایک ہی پیگ میں ہوش و حواس کھو بیٹھا ہوں ۔ جہاں تہذیب اور سلیقے کو پیمانوں کی تعداد سے ہی ناپا جاتا ہو وہاں لوگوں کے اس گمان پر مجھے بے حد خفت اور شرمندگی ہوئی ۔ انگوٹھے کی اس غیر مہذب حرکت پر میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا ہوا لوٹ آیا ۔

خیر اسے میں جلد ہی بھول گیا لیکن اس روز کی حرکت نے مجھے ان کے متعلق کچھ سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور کر دیا ۔ صبح سویرے میں چائے کے ساتھ اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا کہ میرا دیرینہ و نمک خوار ملازم سسکیاں بھرتا ہوا میرے پاس پہونچا ۔ استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ میرے بڑے بیٹے نے بلا وجہ اشتعال میں آکر اسے زدو کوب کیا تھا ۔ اس کے دائیں گال پر طمانچے کا واضح نشان تھا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں ۔ اپنے بیٹے کا یہ حیوانی عمل مجھے سخت ناگوار گزرا ۔ پشیمانی اور ہمدردی کے جذبے سے مغلوب ہو کر میں نے اس کی ڈھارس بندھائی اور اس کے آنسوؤں کو پونچھنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا کہ انگوٹھا اپنی من مانی پر اتر آیا ۔ اس سے قبل کہ میں کچھ سوچ پاتا اس نے خود کو اس کی اشک آلود آنکھوں میں گھسا دیا ۔ ملازم درد کی شدت سے چھٹپٹایا اور چیختا ہوا بھاگ کھڑا ہوا ۔ میں غم و غصہ کی مورتی بنا انگوٹھے کی اس سرکشی پر حیران سا کھڑا رہ گیا ۔ اس لمحہ میں نے سوچا کہ یہ انگوٹھے

کچھ کچھ ناقابل برداشت ہوتے جا رہے ہیں اور اس سے پہلے کہ یہ میرے لئے کوئی بڑی پریشانی کھڑی کریں ان سے نجات حاصل کر لینا عقلمندی ہے ۔ لیکن ناگہاں مجھے ان کی موجودگی سے پیشتر کی محرومیاں اور معذوریاں یاد آتی گئیں اور میں بری طرح سہم گیا ۔ میں نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ان سے حاصل ہونے والے مسلسل فیض کے مقابلے میں کبھی کبھی کی یہ ہلکی پھلکی پریشانی قابل درگزر ہے ۔ آئندہ احتیاط برتوں گا کہ یہ ایسی کوئی حرکت نہ کرنے پائیں جو میری ذلت و رسوائی کا باعث ہو ۔

کچھ عرصہ اطمینان اور سکون سے گزرا ۔ میں ان انگوٹھوں کے ذریعہ گزشتہ محرومیوں کا برق رفتاری سے ازالہ کرتا رہا کہ وہ واقعہ ہوا جس نے کسی تیز و تند آندھی کی طرح میرے وجود کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا ۔ میرے گھر سے منسلک تھوڑی سی زمین تھی جسے میں نے چھوٹے سے خوبصورت باغیچے میں تبدیل کر رکھا تھا ۔ اس زمین کے کچھ حصے پر میرے پڑوسی کا ناجائز قبضہ تھا اور وہ باقی پر بھی دعویٰ رکھتا تھا ۔ اس سلسلے میں طویل عرصے سے ہمارے درمیان تنازعہ تھا ۔ ایک دو بار یہ تنازعہ باہمی تصادم میں بھی تبدیل ہو گیا تھا ۔ ان دنوں میں نے خلوص دل سے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ برسوں کے اس تنازعے کو حل کرنے کے لئے کوئی کوئی ایسی راہ نکالی جائے کہ یہ تلخی اور بدگمانی کی فضاء ختم ہو ۔ اس کے لئے بہتر صورت یہی تھی کہ کسی مفاد پرست ثالث کی موجودگی کے بغیر آپسی گفتگو کے ذریعہ کسی ایسے حل پر پہونچا جائے جو دونوں کے لئے قابل قبول ہو ۔ میں

نے پہل کی اور کچھ ردو کد کے بعد ادھر سے بھی رضامندی ظاہر کی گئی ۔ دو تین ملاقاتوں کے باوجود کوئی امید افزا کرن نظر نہیں آئی لیکن میں مایوس نہیں تھا ۔

ایک روز گفتگو کے دوران اس کے لہجے میں کچھ تلخی در آئی ۔ میں نے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی کہ ماحول کو تلخ بنانے سے کوئی فائدہ نہیں ۔ اول تو اس کا دعویٰ ہی غلط اور ناجائز ہے پھر بھی یہ میری شرافت اور صالح اور ذہنیت کی پہچان ہے کہ میں اس مسئلے کو گفتگو کے ذریعہ ہمیشہ کے لئے ختم کر کے آئندہ اچھے پڑوسیوں کی طرح رہنا چاہتا ہوں ۔ میری نرمی کو شاید اس نے بزدلی پر محمول کیا اور وہ کچھ اور شیر ہو گیا اور باقی زمین پر بھی زبردستی قبضہ کرنے کی دھمکی دینے لگا میں ہر ممکن حد تک معاملے کو بڑھانے سے گریز کرنا چاہتا تھا اس لئے اس کی احمقانہ دھمکی کو نظر انداز کرتا ہوا بولا ۔

" آپ خواہ مخواہ اشتعال میں آرہے ہیں ۔ بات وہ کہئے جو قابل عمل ہو ۔ میں کسی لڑائی سے گریز کرنا چاہتا ہوں تو اس کا مطلب یہ قطعی نہیں کہ میں کمزور ہوں ۔ بلکہ ہم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف اپنی توانائی ضائع کرنے کی بجائے کوئی باوقار صلح کر کے اس توانائی کو اپنے اپنے گھریلو مسائل پر صرف کریں ۔ "

" میں بھی صلح چاہتا ہوں لیکن دب کر نہیں ۔ اگر مجھے دبانے کی کوشش کی گئی تو میں اس تنازعے کو میدان میں ہی حل کر دوں گا " اس کے لہجے کی کرختگی میری سماعت کو بے حد ناگوار گزری پھر بھی آخری کوشش کے تحت میں نے اپنی شہادت کی انگلی سے اس کی

سمت اشارہ کرتے ہوئے کہنا چاہا کہ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ میں اس مسئلے کے حل کے لئے بے حد مخلص اور سنجیدہ ہوں کہ یکلخت ایک بار پھر انگوٹھا میرے اختیار سے باہر ہوگیا اور وہ تمام انگلیوں کو سختی سے دباتا ہوا سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس کھلی بے عزتی اور دھمکی پر میرا پڑوسی ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اور غصے کی زیادتی سے تھر تھر کانپتا ہوا چیخا۔

"میں تمہیں اس ٹھینگے کا مطلب سمجھاؤں گا۔ میں نے اپنی اس بے عزتی کا بدلہ بیچ چوراہے پر نہ لیا تو میرے نطفے میں فرق سمجھنا۔" وہ پاؤں پٹکتا ہوا دروازے کی سمت بڑھا۔ میں نے تیزی سے آواز دے کر اسے روکنا چاہا کہ انگوٹھے وہ حرکت کر بیٹھے جس کا میں نے تصور تک نہیں کیا تھا۔ دونوں انگوٹھے میرے ہونٹوں پر اس طرح جم گئے کہ میری آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ اور تب مجھے احساس ہوا کہ یہ انگوٹھے حد سے تجاوز کر چکے ہیں۔ اور اب ان کا وجود ناقابل برداشت ہو چکا ہے۔ آج انہوں نے میری آواز کا گلا گھونٹا ہے کل پتہ نہیں........ کسی انجانے خدشے سے میرے رگ و پے میں خوف کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ اس سے قبل کہ انہیں اپنی من مانی کرنے کا کوئی اور موقع نصیب ہو میں نے ان سے نجات حاصل کرنے کا پختہ فیصلہ کر لیا۔ میں نے اپنی انگلیوں کی مدد سے انہیں اپنے ہونٹوں سے ہٹانے کی کوشش کی۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد انگوٹھے اپنی جگہ سے ہلے اور نیچے کی جانب سرکتے چلے گئے اور اس سے پہلے کہ میں ان کی نیت کا اندازہ کر پاتا وہ میری شہ رگ [?] پر کس گئے۔ میں نے بری طرح چھٹپٹا کر ان کی گرفت سے شہ رگ کو چھڑانا چاہا لیکن ان کا دباؤ بتدریج بڑھتا ہی گیا۔ میری سانسیں رکنے لگیں، آنکھیں باہر کی جانب ابل پڑیں اور بس اب وہ لمحہ آنے ہی والا تھا کہ میری روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے۔ اس آخری پل میرے ڈوبتے ہوئے ذہن میں ایک شدید خواہش ابھری۔

کاش مجھے اتنی سی مہلت مل جائے کہ میں اپنی آنے والی نسل کو بھی ابھی حاصل ہونے والی یہ آگہی بخش سکوں کہ مانگے کا انگوٹھا بالآخر شہ رگ کو ہی کستا ہے۔

ف۔ س۔ اعجاز

کی آئندہ کتابیں

* اونچے مکانوں کے قریب
(غزلیات)

* موقف
(مضامین)

* خوابوں کے اسرار
(نفسیاتی مضامین)
(انگریزی سے ترجمہ)

* نظموں کا مجموعہ

"یہ عشق نہیں آساں"

بدنام بشر بگان پاڑہ وارڈ ۲
پوسٹ و ضلع پاکوڑ ۔ ۸۱۶۱۰۷ (بہار)

جو چاند تمہارا ہے
کتنوں کا پیارا ہے
احساس تمہیں ہے بھی ۔۔۔؟

اک چاند ہمارا تھا
برسوں سے پیارا تھا
افلاس کی آندھی نے
اس طرح اجاڑا تھا
کہ آج تلک اپنا
سر ڈھونڈ رہے ہیں ہم
روشن ہے جہاں لیکن
گھر ڈھونڈ رہے ہیں ہم

اب چاند کہاں ہے وہ
اک زخم جواں ہے وہ
اک درد نہاں ہے وہ

جو لوگ یہ کہتے ہیں
یہ عشق نہیں آساں
سچ کہتے ہیں وہ سارے
اب میں بھی یہ کہتا ہوں
یہ عشق نہیں آساں

سید معراج جامی

۲۱۔ قصبہ کالونی، منگھوپیر روڈ۔ کراچی

شاعروں سے جو سچ رقم ہوتا
ہاتھ کٹتے یا سر قلم ہوتا
پیروی عشق کی جو کرتا میں
سیدھے عرش پر قدم ہوتا
ہم اگر خوش نصیب ہو جاتے
کیا کہیں کس کو کتنا غم ہوتا
میرے دم سے جہاں میں رونق ہے
میں نہ ہوتا تو کیا ستم ہوتا
صرف میرے لئے ہی وہ ہوتے
ظلم بھی باعث کرم ہوتا
میرا ہونا ثبوت ہے تیرا
دیر ہوتا نہ یہ حرم ہوتا
کون جاتا طواف کعبہ کو
اپنا دل ہی اگر حرم ہوتا
کوئی لغزش تو کام آجاتی
دامنِ زیست کچھ تو نم ہوتا
رنگ کیا کیا بدلتیں تقدیریں
ہاتھ میں اپنے گر قلم ہوتا
زر جو ہوتا نصیب اے جامی
میں زمانے میں محترم ہوتا

○

منصور ملتانی

۲۱۲/۱۳ راحولہ ایریا
ایئر پورٹ کراچی نمبر۱۱

حوصلے دل کے آزماتی ہیں
تیری یادیں بہت رُلاتی ہیں
ساحلوں کے فریب میں آکر
کشتیاں ڈوب بھی تو جاتی ہیں
خود کو اکثر یقین دلاتا ہوں
یہ ملاقاتیں حادثاتی ہیں
خواہشِ خواب سے بھری آنکھیں
ہجر میں رتجگے مناتی ہیں
اپنے ہاتھوں صداقتیں اب بھی
زہر سقراط کو پلاتی ہیں
تیری سچائیاں تجھے منصور
دار کی سمت کھینچ لاتی ہیں

سید معراج جامی

جب مرا انتخاب تو نے کیا
ذرہ تھا، آفتاب تو نے کیا
کیا ستم ہے کہ آگہی دے کر
مجھ کو شیدائے خواب تو نے کیا
مجھ پہ اسرار منکشف کر کے
مبتلائے عذاب تو نے کیا
مجھ کو احساسِ زندگی دے کر
ہر جگہ کامیاب تو نے کیا
آگئی پھر بہار صحرا میں
جب کلی کو گلاب تو نے کیا
آئینہ میرے روبرو رکھ کر
کیوں مجھے لاجواب تو نے کیا
پہلے مختارِ عقل کر کے مجھے
پھر مرا احتساب تو نے کیا
ہر نفس تیری ہی امانت تھا
ہر نفس کا حساب تو نے کیا
شوقِ دیدار دے کے جامی کو
باعثِ اضطراب تو نے کیا

○

حاصل مرادآبادی

ہاؤس نمبر سی۔۳۲ حلیم آباد طیر
ایکسٹینشن کالونی کراچی۔۳۴

یوں تو انسان کی عظمت کیلئے کیا نہ لکھا
سچ کہا ہوں کا مگر ہم نے قصیدہ نہ لکھا
ظلمتِ شب کو کبھی دن کا اجالا نہ لکھا
ہم نے جو رنگ بھی دیکھا اُسے جھوٹا نہ لکھا
روشنی ڈالی زمانے کے شبستانوں پر
اہل خامہ نے مرے گھر کا اندھیرا نہ لکھا
اس حقیقت کو چھپانا ہے بڑے ظرف کی بات
دل شکستہ تھا مگر ہم نے شکستہ نہ لکھا
مطمعِ اہل نظر حضرت یوسف تو رہے
لکھنے والوں نے کبھی کربِ زلیخا نہ لکھا
بارہا درد کی سوغات تو بھیجی اس نے
اپنے بیمار کو جینے کا سلیقہ نہ لکھا
ہر نگارش میں حکایات زمانہ تو لکھیں
کسی تحریر میں اس نے مجھے اپنا نہ لکھا
اپنی پروازِ سخن کتنی ہی اونچی تھی مگر
قد کو اپنے کبھی حاصل قدِ بالا نہ لکھا

غزلیں

فضا ابن فیضی

مئوناتھ بھنجن (یو۔پی)

یہ محبس زلا حاصلی کیا اور بام و در پہ رکھا ہے
دیا بے منظری کا، طاقِ ہر منظر پہ رکھا ہے

لہو میں تیرتا ہے، فاقہ اونچی اڑانوں کا
ہوا کا بوجھ سارا، میرے ہی شہپر پہ رکھا ہے

جنوں کو آگیا ہے راس، شہروں کا گھٹن موسم
بیاباں کا اثاثہ لاکے، سب نے گھر پہ رکھا ہے

مقدر ہے ہمارا، سایہ سایہ، دھوپ میں رہنا
عجب وہ سائباں ہے، جو ہمارے سر پہ رکھا ہے

میں کیا آنکھیں کھلی رکھتا، کہ میری آگہی نے بھی
مدار اپنا، اسی اک حرفِ خواب آور پہ رکھا ہے

بہت ہے، ہم کو تم کو، یہ متاعِ علم لاعلمی
کہ سب کچھ منحصر، جہلِ ہنر پرور پہ رکھا ہے

غنیمت ہے، سحر بختانِ حرف و صوت! اتنا بھی
چراغ اک، شب گزیدہ سا، ہمارے در پہ رکھا ہے

ہوئے جب شعر تو، احساس کی سطحیں چمک اٹھیں
یہ لگتا ہے، قلم نے پاؤں تختِ زر پہ رکھا ہے

یہی بس دیکھنا ہے، اب لہو مقبول ہو کس کا
کہ سب نے ہاتھ اپنا، وقت کے خنجر پہ رکھا ہے

معانی بھی، نجات اس کرب سے، اب کیا دلائیں گے
حریرِ لفظ ہوں میں، جو ابھی پتھر پہ رکھا ہے

فضا اپنے قلم کو، کس لئے شاخِ انا سمجھوں
عجب الزام اس نے، مجھ سے دانشور پہ رکھا ہے

سید احمد سحر
خلیل غربی
شاہجہانپور یو-پی 242001

غزل

یہ فردِ جرم ملی ہے دلِ تباہ کے ساتھ
چلی ہے رسمِ محبت مرے گنا کے ساتھ

ہمارے عہد میں تاثیر کا کھلا احوال
بہت فسانے تھے منسوب دل کی آہ کے ساتھ

کسی کی یاد کے ہمراہ عکس ہائے شباب
چلے ہجوم کوئی جیسے سربراہ کے ساتھ

بلند ہو ترا اقبال شہسوار ، حیات
مگر دلوں کی بھی تسخیر مہروماہ کے ساتھ

ہمیں دیا گیا جینے کا حق ضرور مگر
سروں پہ لٹکی ہوئی تیغ بے پناہ کے ساتھ

وہ کیسے زندہ ہیں اس انقلاب وقت کے بعد
جنہوں نے عمر گزاری ہے عزوجاہ کے ساتھ

کہاں کی بات ہے جینا ، مریں گے بھی تو سحر
نرالی شان سے ، قاتل سے رسم و راہ کے ساتھ

عقیل شاداب
برج راجپورہ
کوٹا-۳۲۴۰۰۶ (راجستھان)

غزل

کھلے ہوئے ہیں اپنے گھر کے سب دروازے
دستک کے محتاج نہیں ہیں اب دروازے

جب سے قتل کیا ہے اس نے سورج کو -
بند کئے بیٹھا ہے گھر کے سب دروازے

جھپک رہی ہیں پلکیں خوش اندام کھڑکیاں
کھول رہے ہیں چپکے چپکے لب دروازے

دو جسموں کی کچی کچی خوشبو - - سے
مہک رہے ہیں خواب گاہ سے شب دروازے

جیون رانجھا پوچھ رہا ہے دوارے دوارے
میری ہیر کہاں ہے میرے رب دروازے

ٹپک رہی ہے چھت دیواریں کانپ رہی ہیں
ہانپ رہے ہیں بوڑھے گھر کے سب دروازے

کتنی کراہیں دفن ہیں ان کے سینے میں
رنگ محل کے یہ عالی منصب دروازے

گزر رہی ہے ہوا کتابیں لئے بغل میں
چھیڑ رہے ہیں کچھ طفل مکتب دروازے

کب سنوائی ہوگی اپنی فریادوں کی
کھولے گا **شاداب** وہ ہم پر کب دروازے

عبدالاحد ساز
C/o Mohammed Haji Adam & Co
84, Chakla Street, Bombay - 400003

پس تقریب ملاقات......!

پس تقریب ملاقات یہاں شام ڈھلے
دیر تک پھیلی رہے گی تری شرکت کی مہک

مترنم سے رہیں گے یہ ہوا کے گوشے
جن میں غلطیدہ سا ہے لحن تکلم تیرا
رات بھر پھولی رہے گی یہ تاثر کی شفق
جذب ہے جس میں دل آویز تبسم تیرا

یاد رہ جائے گی اس صحن کو یہ شام فسوں
جل گئی تھیں کئی ان دیکھی سہانی شمعیں
لو سی دے اٹھا تھا ماحول ترے آنے سے
چھا گیا تھا درودیوار پہ وہ پر تو رنگ
جیسے ماخوذ ہوں لمحے کسی افسانے سے

چھوڑ جائے گا وہی نرم کسک پھر دل میں
(جس سے شاداب ہے مدت سے مرا ذوق طلب)
آج تقریب میں یہ طرز ملاقات تیرا :-

بے نیازانہ تخاطب میں پریشاں سا ترے
گوشہء لب پہ کوئی حرف شناسائی کا
تمکنت آفریں چہرے پہ انوکھا سا نیاز
مجتنب آنکھوں میں اک عکس پذیرائی کا

عام موضوع سخن میں بھی عیاں لہجہء خاص
ذہن کی بات میں بھی دل کی دھمک کا احساس
کوئی ھوئی سی کسی غمزہء سنجیدہ میں
ایک مانوس سا خم کا کل پیچیدہ میں

تجھ سے یہ ربط ، کہ موہوم بھی ، مفہوم بھی ہے ؟
تو کہ ہے مجھ سے تری زیست کا ہر رنگ جدا
شرح حالات الگ ، عمر کا آہنگ سوا
جیسے ہی راہ میں حائل ہے خلیج اقدار
کسی گلشن کی امانت ہے تری فصل بہار
تو نے تابندہ بھی رکھا ہے ترا خط حصار
پھر بھی اک قرب کی خوشبو ہے فضا میں بیدار
یہ رہ و رسم جو اظہار محبت بھی نہیں
ہے ترے دم سے یہ راحت کہ جو راحت بھی نہیں
غم بے نام ترے نام سے موسوم بھی ہے
تجھ سے یہ ربط کہ موہوم ، بھی مفہوم بھی ہے

حسن سے رابطہء عشق کے مضموں ہیں بہت
اس لطافت کدہء کیف میں افسوں ہیں بہت

نہ ترے جسم کا صندل ، نہ ترے لب کے گلاب
نہ تری زلف کی شبنم ہے اس احساس کا نام
یوں تو اس شام کا پیکر بھی ہے تیرا یہ جمال
اس شناسائی کا عنواں ہے فقط نکہت شام
چشم ہمدم کی عطا کردہ یہ آسائش دید
مہرباں حسن کا بخشا ہوا یہ اذن کلام

آج پھر جاگتی رہ جائے گی ہر بام تلے
وہی شاداب سی حسرت ، وہی آسودہ کسک
دیر تک پھیلی رہے گی تیری شرکت کی مہک
پس تقریب ملاقات یہاں شام ڈھلے

ملکہ نسیم ۔ جے پور

ٹوٹتے حوصلے

(ایک حادثہ سے متاثر ہوکر)

خدارا کچھ تو بولو
اس قدر خاموش کیوں ہو؟
اچانک ہی بچھڑ جانے کا تم نے
فیصلہ کیونکر کیا
کیسے رہوگے دور ہم سب سے
وہ ماں! گنتی رہی ہے جو تمہاری سانس
اک اک نو مہینے تک
تمہیں باہنوں میں لیکر رات
آنکھوں میں گذاری ہے
تمہاری ایک اک آہٹ سے
خوابوں کو سنوارا ہے
تمہیں چلنا سکھایا موسموں کی رہ گذاروں پر
تمہارا گھٹنیوں چلنا وہ لب تک یاد کرکے
اپنی تنہائی کا ہر لمحہ سجاتی تھی
تمہیں باہنوں میں بھر کر مسکراتی تھی
وہ بہنیں جن کا آنچل کھینچ کر
تم بھاگتے پھرتے تھے آنگن میں
کھڑی ہیں رو رہی ہیں
ان کے آنسو پونچھ دو اُٹھ کر
اٹھو اس بھائی سے مل لو
کھڑا ہے کس قدر تنہا ہراساں
کبھی تم کو کبھی بازو کو اپنے دیکھتا ہے
چلے جانا! مگر ماں سے اجازت لے کے جانا
میں آخر باپ ہوں
مجھ سے اگر ناراض ہو
میں پھر بھی اک اک بات خاموشی سے سہہ لوں گا
میں اپنے لفظ کے بجھتے ہوئے
اشکوں کو پونچھوں گا
لہو کو آتش سیال کرلوں گا
میں زہر اشک پی کر مسکراؤں گا
تمہاری یاد آنے پر
میں اپنی چیخ تو کیا سسکیاں بھی
قید کرلوں گا
مگر کیسے تمہاری ماں کو سمجھاؤں؟
وہ اپنی کوکھ کی ٹیسوں سے جب
بےچین ہوکر نام لیتی ہے تمہارا
میں اُس دم کانپ جاتا ہوں
لرز جاتا ہوں
اب مجھکو سنبھالو
ٹوٹ کر میں گرنے والا ہوں
خدارا کچھ تو بولو
اس قدر خاموش کیوں ہو؟

⊙

شاہین فصیح ربانی

معرفت سید معراج جامی، ۲۱ر قصبہ کالونی، منگھوپیر روڈ
کراچی (۷۵۸۰۰) پاکستان ۔

جاگتی سی آنکھوں میں خواب سا معلّق ہے
دائروں کے اندر اک دائرہ معلّق ہے

حیرتوں کے عالم میں راستہ معلّق ہے
منزلیں بُلاتی ہیں، قافلہ معلّق ہے

تم پُکار کر دیکھو، کوئی بھی نہیں سُنتا
جانے کن خلاؤں میں اب صدا معلّق ہے

پھر گمان گذرا ہے، عکس کا مجھے خود پر
پھر تمہاری آنکھوں میں آئینہ معلّق ہے

اک ذرا نہیں بڑھتا، اک ذرا نہیں گھٹتا!
درمیاں ہمارے جو فاصلہ معلّق ہے

ہاں! فصیح میرا تو جاگتا مقدر ہے
کیوں تمہاری آنکھوں میں رتجگا معلّق ہے

نوشاد علی انصاری

۸۵ جے توپسیا روڈ، کلکتہ ۔ ۳۹

کھلونا

بچہ جب جنم لیتا ہے
تو ہمیں کتنا اچھا لگتا ہے
اس کی معصوم سی مسکراہٹ
ہمیں پھول جیسی دکھائی دیتی ہے
اسکی چیخ و پکار سُن کر
ہر دل تڑپ اٹھتا ہے
اسے چپ کرانے کی خاطر
کوئی چٹکی بجاتا ہے
تو کوئی کھلونے تھماتا ہے
رکو! اے کھلونے تھمانے والو!
خاموشی سے اسے بہلانے والو!
میری تم سے یہ گذارش ہے
مان لو تو نوازش ہوگی
کھلونے دو، مگر، ہرگز نہ بندوق دو!
دینا ہے تو اُسے کتابوں کا صندوق دو!
کیونکہ بندوق چلانے میں اگر وہ مشاق ہو جائے گا
تو ممکن ہے کل وہ جرم میں شامل ہو جائے گا
ہاں! کتابوں سے وہ دوستی کرے گا
خود بھی پڑھے گا اوروں کو بھی پڑھائے گا
زندگی سے پیار کی دوستی کرائے گا
پُرامن دنیا کے لئے روشنی دکھائے گا

"آخری تدبیر"

ڈاکٹر سلیم اختر (پاکستان)

آمینہ عجب بے رونق صورت دکھا رہا تھا ۔ اندر کو دھنسی آنکھیں ان ویران گھونسلوں جیسی تھیں جن سے لطر کی چڑیا پرواز کرنے کو ہو ، پیشانی کی گہری لکیریں بے آرام بستر کی شکنوں کا منظر پیش کر رہی تھیں ، مونچھوں کے سر بلند کنارے شکست خوردہ پرچم کی مانند سرنگوں تھے ، منہ پر ہاتھ پھیرا تو بڑھی شیو کے کھردرے بالوں کی نوکیں پنوں کی مانند چبھیں ۔ دھندلاتی نظروں سے آمینہ کو لگا گیا حتی کہ جسم نے پھریری لی ، لگا جیسے رندھ رہا ہو ، آنکھوں کے گدلے شیشے نمی سے گیلے ہونے کو ہوں ، شاید بازو میں رعشہ ہی محسوس ہو رہا تھا یا پھر کچھ بھی نہیں تھا ، سب وہم تھا اور دل کی دھڑکن کا مد و جزر محض وسوسہ تھا ۔

تب آمینہ مخاطب ہوا ۔

پریشان ہو ؟

نہیں تو !

پشیمان ہو ؟

نہیں تو !

پھر یہ چہرہ کیوں لٹکا رکھا ہے ؟

مجھے کچھ نہیں معلوم ، جو دکھا رہے ہو وہی دیکھ رہا ہوں ،

تو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں ؟

نہیں تو !

تم خوش تو ہو نا ؟

قطعاً ۔

سوچ لو ؟

سوچنے کی کیا بات ہے ، میں نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے خوشی خوشی ، اپنی بیوی کے لئے کیا ہے

بیوی کے لئے --- ؟ آمینہ نے بیوی کی "ی" کو عجب لہجہ میں کھینچا ۔ تحقیر تمسخر ، طنز ، استہزاء ؟

تم مجھ پر شک کر رہے ہو ؟

یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

پھر یہ طعنے کیوں دے رہے ہو ؟

طعنے تو نہیں ، صرف سوال کر رہا ہوں ۔

سوال ؟

کیا تم خود سے سوال کرنے کی جرات رکھتے ہو ۔

اچھا بک بک مت کرو ۔ وہ بے چاری جاگ جائے گی

بے چاری جاگ جائے گی --- ہا ہاہاہا!

اس نے بے زار ہو کر آمینہ سے منہ موڑا تو بستر پر نظر پڑی بیوی نیند کے گہرے پانیوں میں اتری تھی ۔ نقاہت کے باوجود چہرہ پر اب عجب سی رونق دکھائی دے رہی تھی ۔ چہرہ پر کھنڈی وہ زردی جو پہلے موت کی کہانی کی تمہید دکھائی دیتی تھی اب صحت کے عنوان میں تبدیل ہو چکی تھی ماتھے اور تکئے پر بکھرے بال مریض چہرہ کی تصویر کو حاشیہ کیے تھے ۔ بھرے بھرے لب اس وقت ماند اور سیاہ سے تھے مگر جانتا تھا کہ جلد ہی صحت مند خون انھیں سرخ کر کے سنگترے کی پھانک کا رس بھر دے گا ۔ بھاری پپوٹوں میں ملفوف آنکھوں سے مرض کی چلمن سرکی تو یہ شربت کے کٹوروں میں تبدیل ہو جائیں گی

وہ دیر تک کھڑا اسے دیکھتا رہا ، پھر احتیاط سے بستر کے سرہانے بیٹھ کر پیار سے اس کے بکھرے بالوں کو سمیٹا مگر اس احتیاط سے کہ چھو جانے سے اس کی نیند خراب نہ ہو جائے ۔ اسے بہتر دیکھ کر فرط انبساط کی لہروں نے اعصاب میں سرشاری کی کپکپی پیدا کر دی ۔ بیوی کی محبت میں اس نے وہ کر دکھایا تھا جو کسی بھی شوہر

کے لمس کا نہ تھا جیسے وہ اپنی جان اور جان سے پیاری کہا کرتا تھا اس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا تھا کہ وہ واقعی جان سے پیاری ہے ------ وفور جذبات سے آنکھیں بھیگ گئیں!

نہ تو اس کا باپ فرغانہ کا حکمران مرزا عمر شیخ تھا اور نہ ہی ماں کا نام قتلوغ نگار خانم تھا مگر اس کے باوجود دونوں نے بیٹے کا نام ظہیر الدین بابر رکھا محض اس لیے کہ باپ ھسٹری کا استاد تھا اور اسے تمام تاریخی شخصیات میں بابر کی شخصیت اور کردار بے حد پسند تھا اگر بادشاھوں کے نام پر ہی بیٹے کا نام رکھنا مقصود تھا تو ناموں کی کمی نہ تھی شہنشاہ ھند اکبر اعظم، جہانگیر اور پھر شاہجہاں... مگر اس کا ھیرو تو بابر ہی تھا لہذا اس کے نام سے اپنی پیڑھی کا آغاز کیا یہ جانتے ھوئے بھی کہ استاد کا بیٹا کسی سلطنت کی بنیاد نہ رکھے گا۔ محل باغ اور باغیچے نہ بنوائے گا حتی کہ ثواب دارین حاصل کرنے کے لیے کوئی مسجد بھی کھڑی نہیں کر سکتا ہے اگر معلم تاریخ نے یہ سوچا کہ نام کے اثرات کے باعث اس کا بیٹا بابر ہی کی مانند جلال و جمال کا امتزاج ثابت ہوگا اور اولو العزمی، عالی ظرفی اور بلند ھمتی جیسے بابری اوصاف سے شخصیت جگمگا اٹھے گی تو اندازہ غلط ثابت ھوا اور توقعات پوری نہ ھوئیں یعنی نام نہند برعکس والی بات درست ثابت ھوئی کہ شاھانہ اوصاف کے برعکس عجیب کمینی طبیعت کا نکلا اور اس کی پیدا کردہ جملہ خامیوں نے کم ظرفی اور بالخصوص کنجوسی کی صورت میں اظہار پایا --- پیسہ خرچتا تو کہا کلمہ۔ خیر بھی منہ کے بٹوے میں بند رکھتا -- جس صبح فلش کر دیتا سارا دن خود کو فضول خرچ محسوس کرتا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ اطوار میں پختگی آتی گئی جو پہلے عادات اور پھر فطرت ثانیہ میں تبدیل ھوگئے۔ ویسے بقول والدہ محترمہ وہ دل کا برانہ تھا شاید یہ صحیح ہو کیونکہ جب اس کا دل ثمینہ پر آیا تو اس کی کایا کلپ ہوگئی یوں کہ وہ کسی لحاظ سے بھی برانہ رہا۔ اس نے ثمینہ کو ایک شادی میں دیکھا ---- نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس چھل مل کرتی ثمینہ دل میں سما گئی، وہ اسے ہی دیکھتا رہا دوپٹہ گرانے کا انداز اور دوپٹہ اٹھانے کا اسلوب چلتے چلتے گردن موڑ کر یوں ہنسنا کہ گالوں میں گڑھے پڑجائیں۔ بالوں کی لٹ کا سیاہ ہلال اور چہرہ کا بدر۔ الغرض وہ سالم کی سالم سما گئی دل میں۔

ظہیر الدین بابر پہلی مرتبہ محبت کی برکھا میں یوں بھیگا کہ دل کی شور زمین میں محبت کا گلاب مہک دینے لگا اور یہی گلاب اس نے ثمینہ کے جوڑے میں سجادیا

یہ عجب اتفاق یا پھر حسن اتفاق تھا کہ ثمینہ بابر کے برعکس کھلے دل اور کھلے ہاتھ کی، بے تکلفی سے قہقہہ لگانے والی جس کا دل، زبان اور عمل ایک، ثمینہ کی محبت اور اس کے جسم کی گرم جوشی نے بابر کی فطرت پر جمی برف جب پگھلا دی تو اندر سے ایک خوبصورت بابر برآمد ہوا۔ شاید اسے ان ہی چیزوں کی ضرورت تھی اور ان کے فقدان کے باعث شخصیت زنگ آلود ہو چکی تھی اور اب ثمینہ اسے صیقل کر رہی تھی اور جب زنگ کا کرخت چھلکا اتر گیا تو ظہیر الدین بابر کی شخصیت کا کندن نکل آیا۔ اب وہ ٹکسال سے نکلا لش لش کرتا نیا نکور سکہ تھا۔ ایسا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے عورت مرد کو کیسے برباد کرتی ہے اس کی مثال بیوی پیش کرتی ہے اور عورت مرد کو کیسے آباد کرتی ہے اس کی بھی مثال بیوی ہی پیش کرتی ہے۔ ثمینہ نے یہ پرانی بات سچ کر دکھائی۔

ظہیر الدین بابر خوش تھا۔ بے حد خوش، گویا اس نے اپنی مغل سلطنت کی بنیاد استوار کرلی ہو اس امر کے باوجود کہ ثمینہ ولی عہد دینے کی اہل نہ تھی۔

ثمینہ کو آئینہ میں سے دیکھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ آنکھوں میں سرمہ ڈال رہی ہے، لپ اسٹک لگا رہی ہے، کانوں سے بندے اتار رہی ہے، بیڈروم کی دیوار کے نیلے رنگ کے پاس منظر میں فریم کا سنہری رنگ خوب ابھرتا تھا اور اسی کے بیضوی فریم میں وہ ثمینہ کے چہرے کا حصہ بازو کی جھلک، ہاتھ کا کلوزاپ، دیکھتا رہتا اسے ثمینہ کو مکمل دیکھنے کے مقابلے میں یوں قسطوں میں دیکھنا زیادہ پسند تھا۔ تھوڑی تھوڑی جزوہ جزوہ!

وہ بستر پر لیٹا نہ دیکھنے کے انداز میں آئینہ میں اسے دیکھ رہا تھا وہ بال سنوار

رہی تھی ان بالوں کو سلجھا رہی تھی جنہیں
رات بابر نے بڑی مشکل سے الجھایا تھا وہ
اپنے خیالوں میں کھوئی کھوئی سی تھی ۔ ذہن
کہیں اور تھا مگر ہاتھ میکانکی انداز میں برش
چلائے جارہا تھا ۔ پھر وہ خود بخود یوں
شرما گئی جیسے کسی شرم دلانے والی بات نے
چٹکی لی ہو ۔ وہ مسحور سا اسے دیکھا کیا ۔
اسی آئینہ میں ان دونوں نے خود
کو پہلی مرتبہ یکجا دیکھا تھا ۔
" دیکھو " وہ اس بچہ جیسے پرجوش
لہجہ میں بولا جو پہلی مرتبہ تتلی دیکھ رہا ہو ۔
" ہٹو بھی ! بے شرم کہیں کے "
اور اب اس بیڈروم کی نیلی دیوار
پر آویزاں سنہری فریم والا بیضوی آئینہ
مریضہ کی نقاہت بھری ساکت تصویر دکھا
رہا تھا ایسی ساکت تصویر کہ ناتوانی کی
تصویر محسوس ہو ۔

ثمینہ جب بیمار ہوئی تو کسی نے
بھی بطور خاص تشویش کا اظہار نہ کیا چنانچہ
عورتوں کی عام بیماری سمجھ کر محلہ کی لیڈی
ڈاکٹر سے دوا لے لی گئی مگر جلد ہی مرض
بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی جیسا عالم ہوگیا
زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ مرض کی
تشخیص نہیں ہو رہی تھی جس کے نتیجہ میں
پہلے طرح طرح کے ٹسٹ اور اسپشلسٹ پھر
حکیم اور ہومیو پیتھک اور اب آخر میں
مزاروں پر منتیں اور پیروں کے تعویز ۔ مگر
سب بے سود ، ثمینہ نامعلوم مرض کی دلدل
میں دھنستی ہی گئی ۔
ظہیر الدین بابر کی زندگی اب تک
امن اور سکون کا گہوارہ تھی ۔ مگر اب پہلی
مرتبہ اسے زندگی کی بنیادوں میں زلزلہ
محسوس ہو رہا تھا زندگی کی مرکز و محور بیوی
موت کا لقمہ بننے کو تھی یہ اب اٹل مگر تلخ
حقیقت تھی اور بابر کے لئے بذات خود یہ
تصور موت سے کم نہ تھا ۔

آئینہ جس تیمار دار کا چہرہ دکھاتا
وہ بھی مریض ہی معلوم ہوتا ایک رات
ثمینہ کی آنکھ کھلی تو بابر پٹی سے لگا دکھائی
دیا چہرہ بیوی کا عکس تھا اور آنکھیں نیند
سے بوجھل ۔ خاوند کی محبت پر اس کا دل
بھر آیا اسے اب تک اپنی موت کا یقین
ہوچکا تھا ۔ پہلے تو وہ موت کا تصور سوہان
روح تھا ، رات کے پچھلے پہر کی خاموشی میں
وہ موت کے سرد ہاتھ کو اپنی جانب بڑھتا
محسوس کرتی تو لرز لرز جاتی مگر اب نہیں
اب اس نے یقینی موت سے سمجھوتہ کرلیا
تھا اس عالم یاس میں خدمت کرنے والے
خاوند کی محبت ہی اس کا سب سے بڑا سہارا
تھی بلکہ وہ تو یہ بھی سمجھتی تھی کہ اب تک
وہ جو زندہ ہے تو یہ صرف خاوند کی لگن کی
وجہ سے ہے ۔

اس نے بابر کے ہاتھ پر اپنا سوکھا
ہاتھ رکھ دیا ۔
" آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں " ۔
وہ خاموش اسے دیکھتا رہا ۔ بولنا
چاہا مگر ہونٹوں کے کنارے کپکپا کر رہ گئے

" مولی سب ٹھیک کر دے گا "
اس نے کہنا چاہا " نہیں اب کچھ
بھی ٹھیک نہ ہوگا " مگر خاموش رہا چہرہ کی
تکان سب کچھ کہہ رہی تھی ۔

ثمینہ کا مرجھایا ہوا ہاتھ اس کے
اعصاب میں عجیب طرح کی کپکپی پیدا کر رہا
تھا بابر کو اس ہاتھ کی انگلیوں کے نیچے
پڑنے والے گڑھوں کا گداز یاد آرہا تھا ۔
ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور وہ بچوں کی مانند
بلک بلک کر رو رہا تھا ۔ بستر پر ، ثمینہ کے
سر کے قریب سر رکھے ، سسکیوں سے سارا
جسم ہل رہا تھا ۔ وہ خاموشی سے اس کے
بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی ۔ گزشتہ ایام
کی تھکن ، کلفت ، تناؤ دکھ اور پریشانی سب
کا مظہر یہ آنسو تھے ۔ وہ بھی اپنے شوہر کے
ساتھ رونا چاہتی تھی مگر نقاہت نے جسم
سے شادابی کے ساتھ آنسو بھی چوس لیے تھے

پھر وہ آہستہ آہستہ سکون پذیر
ہوتا گیا ۔ پلنگ پر سے سر اٹھایا تو سامنے
آئینہ میں آنسوؤں سے بھیگا اپنا چہرہ دکھائی
دیا ۔ اندھیری رات میں بجلی کا کوندا چمک
کر لمحہ بھر کے لئے جس طرح تاریک منظر
اجاگر کر دیتا ہے ۔ بالکل اسی طرح پریشان
ذہن میں آخری تدبیر نے لشکارا مارا ۔

بابر نے آئینے سے نظریں ہٹاکر
مریضہ کو دیکھا جو پریشان نظروں سے اسے
گھور رہی تھی ۔ کچھ دیر تک بابر کی نظریں
ثمینہ کے چہرہ کا جائزہ لیتی رہیں دونوں کی
نظریں ملیں ۔ ثمینہ بابر کے چہرہ کے تغیر
سے پریشان ہورہی تھی ۔ وہ جو مدت سے
مسکرایا نہ تھا ۔ کھل کر ہنس رہا تھا ۔

"تم اب ٹھیک ہوجاؤ گی"
وہ اسے بے اعتقادی کی خاموشی
سے دیکھتی رہی۔
"ہاں ہاں!" وہ گنگناتے لہجہ میں
بولا "تم قطعی طور پر تندرست ہوجاؤ گی"
ثمینہ نے کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر وہ
بے صبری سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر
بولا۔ "مایوسی کی باتیں کرکے میرا سکون نہ
خراب کردینا"
"سکون"
"ہاں ہاں! ابھی ابھی انسپریشن ہوا
ہے سنو!"
کہیں یہ پاگل تو نہیں ہوگیا ثمینہ
نے دکھ سے سوچا، میری مسلسل بیماری
اور تیمارداری کی مسلسل پریشانی اور اب
آخری مایوسی سے یقیناً اس کا دماغ چل گیا
ہے۔ وہ اسے دکھ رحم اور محبت بھری
نظروں سے دیکھے جارہی تھی۔ اس نے
کرب سے آنکھیں بند کرلیں، یقیناً یہ پاگل
ہوگیا ہے۔
وہ انگلی کھڑی کرکے بولا۔ "تم
اسے راز ہی رکھنا" اس نے سرگوشی کی "گھر
میں کسی کو ہوا بھی نہ لگے، نہ اماں کو نہ ابا
کو اور نہ تمہارے کسی اور کو" وہ عجب سے
لہجہ میں بول رہا تھا "یہ ہمارا تمہارا راز ہے
میاں بیوی کا" اور ایک مرتبہ پھر ہنسا،
عجب سی ہنسی، شاید وحشت بھری ہنسی۔
"تم پاگل ہوگئے ہو" وہ بالآخر
بولی۔
"ہاہاہاہا!" وہ جواب میں ہنس دیا

وہ متوحش ہوکر دیکھ رہی تھی "خدا کے
لئے سوچ تو کیا کہہ رہے ہو"
"ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں" وہ
خوشی سے چٹکی بجاکر بولا۔
"ابھی سمجھ میں آجائے گا" وہ تسلی
دیتے ہوئے بولا۔
وہ اسے محبت بھری نظروں سے
دیکھتا رہا پھر ایک دم اٹھا۔
"کہاں جارہے ہو" اس نے گھبرا
کر پوچھا۔
"وضو کرنے"
"ہائے اللہ!"
تب ظہیر الدین بابر نے بڑے
اہتمام سے وضو کیا اور دو نفل پڑھے وہ دیر
تک ہاتھ اٹھائے دعا مانگتا رہا۔ ثمینہ اسے
متوحش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ
جانماز سے اٹھا اور ثمینہ پر دعا کی پھونک
ماری۔ پھر وہ اس کے سرہانے کھڑا ہوا اور
بلند آواز میں بولا۔ ایسی بلند آواز کہ ثمینہ
نے محسوس کیا سارا شہر جاگ جائے گا۔
"اے خدا! میں اپنی بیوی کی
بیماری اپنے سر لیتا ہوں"
ثمینہ رو رہی تھی۔
مگر وہ اس کے آنسوؤں سے لاتعلق
مریض کے پلنگ کے گرد چکر لگا رہا تھا،
اس کی چال میں مستانگی کی عجب لڑکھڑاہٹ
تھی کسی غیر مرئی نقطہ پر مرکوز اس کی
آنکھیں اندرونی روشنی سے دمک رہی
تھیں، گردن خنجر سے تنی، وفور شوق سے
جسم میں لرزش مگر پاؤں میں استقامت! وہ

ہر چکر کے بعد باآواز بلند پکارتا۔
"اے خدا! میں اپنی بیوی ثمینہ کی
بیماری اپنے سر لیتا ہوں!"
ظہیر الدین بابر کو لگا جیسے کمرہ ان
دیکھے وجودوں سے بھر گیا ہے، شاید وہ
فرشتے تھے جن کے مقدس پروں کی پھڑ
پھڑاہٹ آمین! آمین!! کہہ رہی تھی فضا میں
کسی عجب اور نامانوس موسیقی کی لہروں کو
جسمانی طور پر محسوس کیا جاسکتا تھا۔
موسیقی کے سروں کے ساتھ ساتھ کچھ
سرگوشیاں بھی سنائی دے رہی تھیں تعجب
اور مسرت کی۔ شاید ظہیر الدین بابر
بادشاہ، اس کا بیٹا ہمایوں اور مغل امراء
اور وزراء کی روحیں اسے برکت دینے کو
آئی تھیں۔ در و دیوار آمین آمین پکار رہے
تھے، جسم کا رواں رواں پکار رہا تھا آمین!
آمین!!
لیکن دیوار پر سنہری بیضوی فریم
والا آئینہ عالم حیرت میں گم! "اللہ اکبر! اللہ
اکبر!" مؤذن کی اذان گونجی۔
"دیکھا! وہ پرجوش لہجہ میں بولا۔
"خدا نے میری التجا سن لی"
ثمینہ روئے جارہی تھی مگر اسے وہ
آنسو گویا دکھائی نہ دے رہے تھے وہ اسی
پرجوش لہجہ میں بولا "کتنا نیک شگون ہے۔
قبولیت کا وقت اور اس کی جانب جھک کر
بولا، تم اب ٹھیک ہوجاؤ گی۔ میری التجا
قبول ہوچکی ہے"۔
"اور تم؟" وہ بوقت بولی
"میں؟" وہ ہنسا، میرا کیا ہے" وہ

پھر ہنسا " بھلا میرا کیا ہے ؟ "

اور واقعی معجزہ رونما ہوگیا ثمینہ بتدریج ٹھیک ہوتی جارہی تھی سب اسے اینٹی بائیوٹک کیپسول کا کرشمہ قرار دے رہے تھے مگر اصل سبب میاں بیوی ہی کو معلوم تھا ۔ بیوی کی صحت کے تناسب سے خاوند کمزور ہوتا جارہا تھا اور اس پر وہ خوش تھا کہ خدا نے اس کی جان کا نذرانہ قبول کر لیا تھا کئی صدیوں بعد اس نے عظیم مغل تاجدار کے نام کی لاج رکھ لی تھی. وہ محض نام ہی کا نہیں بلکہ عمل کا بھی بابر ثابت ہوگیا تھا پھر بابر نے تو ولی عہد کو بچایا تھا کہ مغل سلطنت داؤ پر لگی تھی مگر اس نے تو صرف اپنی محبت کو حیات نو دی تھی یہ کام تو شاہ جہاں بھی نہ کرسکا تھا شاہی خزانہ ہوتو تاج محل بنوانا آسان کام ہے مگر جان کے بدلے جان کا سودا کسی عاشق ، محبوب اور شوہر نے نہ کیا تھا اس احساس کے پیدا کردہ فخر و انبساط پر سینہ تن جاتا ۔

" دیکھا میں نہ کہتا تھا " وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا " تمہارا ہاتھ اب نرم ہوتا جارہا ہے " وہ اس کی انگلیاں بلاکر بولا " میں نہ کہتا تھا .... " اس کے ہاتھ پر آنسو کے قطرے گرے ۔

" پگلی " وہ ثمینہ کے گال پر پیار سے چپت مار کر بولا ۔

عین اسی وقت آمنہ سے آنکھیں چار ہوئیں ۔ اس نے پہلی مرتبہ غور سے اپنا پژمردہ چہرہ دیکھا ۔ تب آمنہ مخاطب ہوا ۔

" پریشان ہو " ؟

" نہیں تو ! "

" پشیمان ہو ؟ "

" نہیں تو ! "

" پھر یہ منہ کیوں لٹکا رکھا ہے ؟ "

اسے یقین تھا کہ وہ جاگ رہا ہے ، کمرہ میں بلا دستک ایک انسانی پنجر داخل ہوگیا اور بے معنی اچھل کود شروع کردی ایک اور ، اور پھر ایک اور ۔ وہ ان کی ہڈیوں کی کھڑکھڑاہٹ صاف سن سکتا تھا پھر ان کھڑکھڑاتے ڈھانچوں نے پنگ پانگ کھیلنی شروع کردی وہ ان کا کھیل بڑے غور سے دیکھتا رہا تب اسے اندازہ ہوا انسانی کھوپڑی گیند بنی ہے اور تب انکشاف ہوا کہ یہ تو اسی کی کھوپڑی تھی ۔ کمرہ کافور کی خنک بو سے بھرا بھرا سا تھا ۔ اس نے گھبرا کر ثمینہ کی جانب دیکھا وہ سکون کی نیند سو رہی تھی ۔ سانس ہموار اور خزاں زدہ چہرہ پر آنے والی بہار کی آمد کے آثار ہویدا تھے پھر اس کی نظریں آمنہ کی جانب اٹھ گئیں مگر وہ بھی غالباً آنکھ بند کیے محو خواب تھا ۔ بابر نے کلمہ کا ورد شروع کردیا تاہم رات بھر نیند نہ آئی !

جنازہ تیار تھا ۔ سفید کفن میں لپٹی نعش کے گرد والدین ، عزیز و اقارب اور احباب رو رہے تھے ۔ پھر فضا میں آواز گونجتی ہے ۔

" کلمہ شہادت ! "

جنازہ اٹھایا جارہا ہے گھر بھر میں کہرام برپا ہے ۔ اس کے چہرہ پر سے کفن سرکایا جاتا ہے ۔ تیز دھوپ آنکھوں میں کھب جاتی ہے ساتھ ہی فل میک اپ اور سرخ جوڑے میں ملبوس ثمینہ اس پر جھکتی ہے اس کی مسکراتی آنکھیں اسے عجب دلربا انداز سے دیکھ رہی ہیں ۔

" گڈ بائی ڈارلنگ " وہ اٹھلاکر کہتی ہے وہ ہنستی ہے " یو سینٹی مینٹل فول " وہ کفن کا سرا یوں بے پرواہی سے چھوڑتی ہے گویا صندوق کا ڈھکن بند کررہی ہو ۔ وہ چیخ مار کر بیدار ہوجاتا ہے اس کی دانست یہ چیخ سارا شہر بیدار کرسکتی تھی مگر ثمینہ کی نیند کے گہرے پانیوں پر بیداری کی ذرا سی بھی لہر رونما نہیں ہوئی ۔ وہ بے ترتیب سانس درست کرتا ہے ۔ ہاتھ سے پسینے کے قطرے پونچھتا ہے پانی پینے کو اٹھا تو سامنے آمنہ تھا ۔

" مجھے کچھ نہیں معلوم ، جو دکھا رہے ہو وہی دیکھ رہا ہوں "

" تو کیا میں غلط دکھا رہا ہوں ؟ "

" نہیں تو ! "

" تم خوش تو ہو نا ؟ "

" یقیناً ! "

" سوچ لو ؟ "

" سوچنے کی کیا بات ہے ، میں نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے خوشی خوشی ، اپنی بیوی کے لئے کیا ہے "

" بیوی کے لئے ...... ؟ " آمنہ نے بیوی کو عجب لہجہ میں کھینچا ۔ تحقیر ، تحیر ، طنز ، استہزاء ؟

ثمینہ کی بیماری سے پریشان گھر

والوں کے لئے اس کی بیماری مزید پریشانی کا باعث بن رہی تھی اس کی ماں کو اب پختہ یقین ہو چکا تھا کہ کسی بد خواہ نے ان کے گھر پر تعویز کرادیے ہیں ۔

نائٹ میرز (ڈراؤنے خواب) کا سلسلہ جاری رہا تقریباً ہر خواب میں قبرستان قبریں اور اپنا مردہ دیکھتا ۔ کار کارخیر کے باوجود خود کو قبر کے عذاب میں مبتلا دیکھتا بچھو ڈنک مارتے ، کنکھجورے جسم پر سرسراتے ، بڑے بڑے بازوؤں والی چمگادڑیں خون چوستیں اور الو دیدے نوچتے ۔ عظیم قربانی کا یہ اجر"

اپنی خاموش چیخوں سے اس کی روح تک پر لرزہ طاری ہو جاتا!

اس رات اسے نیند نہ آرہی تھی ۔

تمام رات دیوار کے ساتھ تکیہ لگائے ، نیم دراز ، گزرتی رات کی چاپ سنتا رہا ۔ ثمینہ صحت کی نیند سو رہی تھی اور وہ خود ....

کھلی کھڑکی سے اپریل کے پھولوں کی مہک اندر آرہی تھی وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا ، لمبی سانس پھیپھڑوں میں مہک بھری ہوا کی جھولی انڈیل لی ۔ خنک چاندنی اسے پرسکون کر رہی تھی کھڑکی میں دونوں بازو پھیلائے وہ خوابیدہ شہر اور بیدار آسمان کو تکتا رہا وہ خود کو عجب عالم میں محسوس کر رہا تھا تب چاندنی گویا بجلی کے کوندے میں تبدیل ہو گئی ، اندھیری رات میں لمحہ بھر کے لئے اجاگر ہو جانے والے منظر کی مانند ان دونوں کے امراض کے خاتمہ کے لئے آخری تدبیر آشکار ہو گئی ۔

بیوی کے ساکت جسم سے تکیہ اٹھا کر پلٹا تو ثمینہ سے سامنا ہو گیا ۔

" تم مجھ پر شک کر رہے ہو ؟ "

" یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے ! "

غزلیں

شہود عالم آفاقی (بیلگچھیا ۔ کلکتہ)

①

ترسیل کے بازار میں تنہا ۔ جو کھڑا ہے
اس دور میں فنکار وہی سب سے بڑا ہے
ٹپکا تھا ان آنکھوں سے کبھی اشک محبت
دھرتی پہ وہی تاج محل بن کے کھڑا ہے
زنجے میں ہے پیشانیٔ ارباب ہوس کے
سنگ در جاناں پہ عجب وقت پڑا ہے
اس شہر میں جس دن سے جنوں کا ہے تسلط
دروازۂ ارباب خرد بند پڑا ہے
یہ قدر ہنر کی ہے نئی قسم کہ اب جہل
کہسار سفارش کی بلندی پہ کھڑا ہے
ہم چشمہ صفت لوگ ہیں تالاب نہیں ہیں
ہم اس سے ملا کرتے ہیں جو ہم سے بڑا ہے
یہ دور ہے پتھر کے زمانے کا پرستار
آئینۂ دل لے کے یہاں کون کھڑا ہے
کیوں لوگ گزرتے ہیں نظر مجھ سے چرا کر
چہرے پہ مرے کیا کوئی آئینہ جڑا ہے
کیا کہئے اب اس کو کہ شہود آج کا شاعر
خود اپنی روایات کے لاشے پہ کھڑا ہے

②

ظلمت گیتی کا یہ چرچا ہوا
آنکھ رکھ کر آدمی اندھا ہوا
دائرے پانی میں ابھرے کھو گئے
ان کے پتھر مارنے سے کیا ہوا
کل جو تھا احباب کی آنکھوں کا نور
آج وہ سچ بول کر رسوا ہوا
کیجئے تعمیر کی کیا گفتگو
سازشوں کا جال ہے پھیلا ہوا
اے خدا ان کو بھی ہو شہرت نصیب
میری شہرت سے جنھیں صدمہ ہوا
رہ کے آغوش گہر میں اے شہود
کب کوئی پتھر گہر جیسا ہوا

ڈاکٹر زاہی قریشی ، ۸۱ بدیا نگر گلبرگہ ۵۸۵۱۰۳

ضمیر و دل کو ہے مدت سے شکوہ بے امانی کا
مگر کوئی مداوا ہی نہیں سوز نہانی کا
ہر اک سازش کو ہم نے ہی نوازش کا دیا رتبہ
ستم کو نام ہم نے ہی دیا ہے مہربانی کا
ابھی تک سب کی آنکھیں بات کرتی ہیں مرے غم کی
زبانوں پر ابھی قصہ ہے میری بے زبانی کا
عزائم پر تبسم کی اجازت کب عطا ہوگی
سکھایا جائے گا انداز کب تک نوحہ خوانی کا
یہی آغاز تیری اور میری آزمائش ہے
اسی آغاز میں انجام پنہاں ہے کہانی کا
مری تقدیر کا جبر مسلسل یہ بھی ہے زاہی
کہ مجھ کو کام سونپا ہے عدو کی پاسبانی کا

محور

انجم عظیم آبادی (کلکتہ)

عذاب زیست سے حاصل خوشیاں میاں

حیات ہے تو مسائل جڑے ہوتے ہوں گے
کہ چاک ہوں گے گریباں کبھی سلے ہوں گے
ہے دھوپ چھاؤں کی مانند رنج و راحت بھی
کسی کی گرم نگاہی کسی کی چاہت بھی
شکست ہوگی کبھی فتح و کامرانی بھی
ترانے عیش کے ہوں گے تو نوحہ خوانی بھی
ہمیں حیات کے محور پہ گھومنا ہوگا
جبین شام و سحر یونہی چومنا ہوگا
سفر حیات کا درپیش ہے اگر ہم کو
تو کیوں ہو راہ میں حائل زمین ناہموار
ہوائے تند ہو طوفاں ہو یا کہ گرد و غبار
بھلے ہے شرط قدم اپنے ہم بڑھاتے رہیں
چراغ عزم و عمل راہ میں جلاتے رہیں

وسیم یمانی
تارین جلال نگر
شاہجہانپور242001

رباعیات

حالات جہاں موڑ دئے ہیں ہم نے
تفریق کے بت توڑ دیئے ہیں ہم نے
اس ملک کی تاریخ اٹھاکر دیکھو
ٹوٹے ہوئے دل جوڑ دیئے ہیں ہم نے

کوشش ناکام ہو نہ جائے یارو
افسانہ تمام ہو نہ جائے یارو
مشکل ہے سفر نشان ، منزل معدوم
رستے ہی میں شام ہو نہ جائے یارو

کب خواب میں وہ حسن جو تعبیر میں ہے
ظلمت میں اثر کہاں جو تنویر میں ہے
جو بات ہے اے حسن سراپا تجھ میں
وہ بات بھلا کب تری تصویر میں ہے

خوابیدہ عزائم نظر آتے ہیں مجھے
پستی کے علائم نظر آتے ہیں مجھے
اردو کے بہی خواہ جہاں تھے پہلے
ابتک وہیں قائم نظر آتے ہیں مجھے

ہر قلم کی تاثیر بدل جاتی ہے
ہر خواب کی تعبیر بدل جاتی ہے
پتھر کی لکیر ہے بزرگوں کا یہ قول
تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے

غزل

مشق ستم و جور سے بیزار تو ہوتا
مائل بہ کرم وہ کبھی اک بار تو ہوتا

اس سمت سے الفت کا کچھ اظہار تو ہوتا
اقرار نہ ہوتا کبھی انکار تو ہوتا

پڑھ کر جسے بے خوف میں اک بار تو ہوتا
ایسا بھی کسی صبح کا اخبار تو ہوتا

مانا کہ اسے میری وفاؤں پہ یقیں ہے
لیکن کبھی اس بات کا اظہار تو ہوتا

اس دور میں غالب کے طرفدار تو سب ہیں
اردو کا کوئی ایک طرفدار تو ہوتا

نفرت ہی وہ کرتا جو نہ کرتا وہ محبت
وہ شخص کسی بات پہ تیار تو ہوتا

بے دیکھے جسے ہم نے خدا مان لیا ہے
حسرت ہے کہ اس کا کبھی دیدار تو ہوتا

وہ رام جنم بھومی ہے یا بابری مسجد
سرکار کی جانب سے کچھ اظہار تو ہوتا

فنکار کی تخلیق وسیم اپنی جگہ پر
ناقد کی پرکھ کا کوئی معیار تو ہوتا

۶ نظمیں

مکرمی اعجاز صاحب!
اپنی چند نظمیں انشاء کے لیے روانہ کر رہا ہوں۔ان میں آپ کو اپنے دسمبر ۹۳ء کے اداریئے کی بازگشت سنائی دے گی۔

ابراہیم اشک (بمبئی)

دیش بھگتی

ہمیں اک کام کرنا ہے
کہ وہ تاریخ کے اوراق
جن پر سچ لکھا ہے
مٹا دیں ---
اور پھر زہریلے شبدوں میں
ہم اپنا جھوٹ لکھ دیں ۔

زہر

کل سڑک پر
کھیلتا معصوم بچہ
ہاتھ میں لکڑی کی
اک تلوار تانے کہہ رہا تھا
مجھے بابر سے
اپنی ہار کا بدلا چکانا ہے

خوف

نہ جانے کیا ہوا ہے
اب جو راہوں سے گزرتا ہوں
سامنے سے آنے والا
بھولا بھالا آدمی بھی
ایسا لگتا ہے
کہ کوئی بھیڑیا ہوگا

وحشت

نہیں ، وہ دن نہیں تھا
رات کالی تھی
ہر اک انسان تھا وحشی
کوئی نیزہ کوئی تلوار لیکر
گھر سے نکلا تھا
کھلی آنکھیں تھیں لیکن لگ رہا تھا
گھپ اندھیرا ہے

تنگ ذہن

کھلے آکاش کے نیچے
کھلی سمتوں کی دھرتی پر
ہوائیں کھل کے بہتی ہیں
کھلا ماحول ہے سارا
نہ جانے کیوں مگر
آدمی کے ذہن و دل کے
سب دریچے بند لگتے ہیں

ثبوت

دنگا کے بعد
سوچا یہ سپاہی نے
زباں سے بول سکتی ہے ؟
زباں کاٹی گئی اس کی،
وہ سب آنکھوں سے کہہ دے گی !
نکالیں اس کی آنکھیں بھی
وہ کچھ چھو کر بتا دے گی !
قلم ہاتھ ہوگئے اس کے
خیال آیا ، ثبوت اب بھی سلامت ہے
تو لے لی جان بھی اس کی ۔

رفیق انجم
1, Deedar Buksh Lane,
Calcutta-700016

نظم "تین فصلیں"

(۱)

سائنس کی دنیا
کاایک نادر انسان
ASTPOPHYSICS کا
مائیکل انجیلو
جس نے فضائے بسیط
کی دھڑکنوں
کے سربستہ راز
کو آشکار کیا
جس کے تعاقب میں
ہمہ وقت
دولت و شہرت مصروف ہے
جب اپنے ہی ذات
کے افق کو نہ چھو سکا
تو اچانک ایک دن
علم و فراست کی سب سے
بلند چوٹی سے نہ جانے کیسے
اس نے قلا بازی کھائی
اور آج
خلائی سائنسدان ڈاکٹر جیکسن
گلے میں رودر راکھش
کی مالا ڈالے
گیروالباس پہنے
پوری کے جگن ناتھ
مندر کی سیڑھیوں پہ بیٹھا
سکون کا سراغ لگا رہا ہے

(۲)

ڈاکٹر منوہر جوشی
فزکس میں Ph.D
اور ایک نامور سائنس دان
امریکہ جانے کی
کوشش میں
دھیرے دھیرے
اپنا سارا اثاثہ
بیچ رہا ہے
اس میں اس کے
والدین بھی
راضی ہیں
آخرش
اسکی کوششیں
رنگ لائیں
اور امریکن سفارت خانے
نے اسے ویزا دیدیا
ڈاکٹر منوہر جوشی
اک فاتح کی مانند
AIR - INDIA کے جمبوجیٹ
میں سوار ہو چکا ہے
کچھ ہی ساعتوں میں
اسکا طیارہ
آسمان کی لامحدود
وسعتوں میں گم ہو جائیگا
اور اپنے پیچھے
چھوڑ جائیگا
چند مستحکم رشتوں کے
دھندلے ہوتے نقوش

(۳)

ڈاکٹر منوہر جوشی
سے
ڈاکٹر جیکسن تک کا سفر
اک انوکھا سفر ہے
لیکن آخر
ایسا کیوں ہے
کہ امریکہ جن بلندیوں
سے گر چکا ہے
ہم انہیں بلندیوں
کو سر کرنے میں
اپنی متاع حیات
لٹا دیتے ہیں
اور پھر ایسا ہوتا ہے
کہ ایک عرصے کے بعد
اچانک ایک دن
گلے میں رودر راکھش
کی مالا ڈالے
گیروالباس پہنے
ڈاکٹر منوہر جوشی
ڈاکٹر جیکسن کے
بغل میں آکر بیٹھ جاتا ہے
اور اب وہ دونوں مل کر
ایک روحانی سفر
کرنا چاہتے ہیں۔

منیرالدّین احمد (جرمنی)

پچیسویں سالگرہ

منیرالدین احمد
ہمبرگ (جرمنی)

جہاں پر بس نے مجھے اتارا تھا۔ وہاں پر دور و نزدیک کوئی شخص نہیں تھا۔ جس سے اسٹڈلے کالج کا راستہ پوچھا جاسکتا۔ سورج ڈھل چکا تھا، مگر ابھی شام ہونے میں دیر تھی۔ بس اسٹینڈ کے بالمقابل ایک پب تھا، جو اس وقت بند تھا، دو ایک مکانات تھے۔ مگر سڑک پر کوئی آدم زاد نہیں تھا۔ کچھ عجب نہ تھا کہ مجھے انگلستان کے نقشے پر اس جگہ کو ڈھونڈنے میں مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اگر اتفاق سے مجھے پتہ نہ ہوتا کہ وہ جگہ شیکسپیئر کی جنم بھومی اسٹریٹفورڈ اپون ایون کے قرب و جوار میں واقع تھی، تو میرا وہاں پر پہنچنا بالکل ناممکن تھا۔ چنانچہ جب میں نے بولٹن کی ریلوے انکوائری سے اسٹڈلے کے بارے میں پوچھا، تو کلرک نے مجھے اس طرح گھور کر دیکھا تھا، جیسے میں انگلستان کے کسی مقام پر جانے کے بارے میں نہیں پوچھ رہا تھا، بلکہ دنیا کے کسی دور دراز جزیرے کا اتا پتہ جاننا چاہتا تھا۔ اسٹریٹفورڈ اپون ایون کا ذکر آتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے بتایا کہ وہاں پر پہنچنے کا سہل طریقہ کوچ سے سفر کرنا تھا، جو مجھے رستے میں دو جگہوں پر بدلنی ہوگی۔ جب میں بالاخر اسٹڈلے والی بس میں سوار ہوا، تو کنڈکٹر نہ صرف میرا ہم وطن بلکہ گرائیں نکل آیا۔ بس میں سوار ہونے سے قبل میں نے تصدیق کروانا چاہی تھی، کہ کیا اس کی بس فی الواقعہ اسٹڈلے سے گزرے گی۔ اس نے جان لیا کہ میں اس ملک میں اجنبی تھا اس لئے اس نے مجھ سے میرا اتا پتہ پوچھا۔ اس کی اردو کا مخصوص پٹھوہاری لہجہ سن کر میں جان گیا کہ وہ میری طرح راولپنڈی کے گرد و نواح کا رہنے والا تھا۔ اس نے مجھے اپنے پہلو والی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا، تاکہ راستے میں گپ شپ ہوسکے۔ دوسری سواریوں کو ٹکٹ دینے کے بعد وہ میری طرف لوٹا اور اس نے میرے لئے ٹکٹ کاٹا۔ مگر وہ مجھ سے کرائے کے پیسے لینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ میں نے بہتیرا زور لگایا، مگر اس کے خلوص کے سامنے میری ایک پیش نہ گئی۔

مجھے بس اسٹینڈ پر کھڑے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ کالج کی بس آگئی۔ پتہ چلا کہ وہ سارا دن ایک ایک گھنٹے کے وقفے سے چلتی تھی۔ کالج وہاں سے ڈیڑھ کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس روز صبح سے سیمنار میں شمولیت کے لئے مہمان آرہے تھے۔ تیس چالیس افراد تو ضرور پہنچ چکے ہوں گے۔ کالج دراصل گرما کی تعطیلات کی وجہ سے بند تھا اور ساری لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کو گئی ہوئی تھیں۔ کیا مجھے پتہ نہیں تھا کہ اسٹڈلے گرلز کالج تھا؟ ڈرائیور، جو میری معلومات میں اضافہ کر رہا تھا، میری بے خبری پر حیران ہو رہا تھا۔ پھر اسے شرارت سوجھی اور اس نے آنکھوں کو مچکا کر کہا کہ جو بستر سونے کے لئے دیئے جائیں گے، وہ لڑکیوں کے بستر ہیں۔ پھر تھوڑے وقفے کے بعد اس نے اضافہ کیا: کنواری لڑکیوں کے بستر! ابھی وہ اسٹڈلے کالج کا اسی قدر تعارف کروا پایا تھا کہ کالج کی بلڈنگ آگئی، جو وکٹورین اسٹائل کی لمبی چوڑی عمارت تھی۔ ڈرائیور مجھے

استقبالیہ کے ڈیسک پر چھوڑ آیا، جہاں پر میرا استقبال ایک خاصی دلفریب جرمن لڑکی نے کیا، جو کاغذی کارروائی کے بعد مجھے میرے کمرے تک چھوڑنے کے لئے ساتھ گئی۔ رستے میں وہ مجھے کالج کے قواعد و ضوابط بتاتی گئی، ڈائیننگ ہال دکھایا اور کھانے کے اوقات سے آگاہ کیا۔ پانچ بجے کی چائے کا وقت ہو رہا تھا۔ جس میں شامل ہونے کے لئے جلدی کرنے کی وہ مجھے تاکید کرتی گئی۔

چائے کی گھنٹی بجنے پر میں بھی دوسروں کے پیچھے پیچھے ڈائننگ ہال میں پہنچا، جو چائے اور تازہ کیک کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ اس زمانے میں ابھی ٹی بیگ سے چائے بنانے کی بے ہودہ رسم نہ پڑی تھی۔ اتفاق سے مجھے استقبالیہ ڈیسک والی مارلس کی میز پر اس کے پہلو میں جگہ ملی۔ کالج کی سپرنٹنڈنٹ مسز ونٹر نے ہمیں سب سے پہلے کالج اور اس کی بلڈنگ سے متعارف کروایا، جو پہلے وقتوں میں کسی امیر کبیر خاندان کا رہائشی مکان رہ چکی تھی۔ وہ لوگ مر کھپ تو نہیں گئے تھے، مگر انہوں نے وہاں سے نقل مکانی کر لی تھی۔ البتہ ان کے جد امجد کی روح وہیں پہ رہ گئی تھی، جو راتوں کو کوریڈوروں اور ہالوں میں بھٹکتی ہوئی پائی گئی تھی۔ جن لوگوں کا اس سے آمنا سامنا ہوا تھا، ان کا کہنا تھا کہ وہ بالکل بے ضرر تھی۔ بلکہ اس نے ان کی موجودگی کا ذرہ بھر نوٹس نہ لیا تھا۔ اگر ہم میں سے کسی کو وہ راتوں کو نظر آجائے، تو اسے چھیڑے بغیر خاموشی سے اس کے پاس سے گزر جائیں۔

سب جانتے ہیں کہ پرانی عمارتوں کے بارے میں ایسی باتیں انہیں پراسرار بنانے کے لئے گھڑی جاتی ہیں۔ ہماری میز پر اور شاید دوسری میزوں پر بھی یہی امر مرکز گفتگو بن گیا۔ ہم نے مارلس سے جاننا چاہا کہ اس کا آمنا سامنا بوڑھے لارڈ کی روح سے کتنی بار ہو چکا تھا؟ اس نے اس سوال کے مزاحیہ پہلو کو بھانپتے ہوئے جواب دیا کہ اتنے سارے نوجوان لوگوں کے ہوتے ہوئے بوڑھی روحوں میں کیا دھرا تھا؟ کسی نے کہا کہ نوجوانوں کے اندر بھی تو بوڑھی روحیں ہی بستی ہیں۔ دوسرے نے لقمہ دیا کہ اس بات کا تعلق صرف ہندوستان کے باسیوں کے ساتھ ہے، جن کی روحیں بار بار جنم لیتی رہتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ گیند اب میری کورٹ میں تھا۔ میں نے کہا کہ میں تو آیا ہی بوڑھی روحوں سے ملنے کے لئے تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کے ساتھ میری سابقہ جنموں کی دوستی یاری نکل آئے۔ شاید بوڑھا لارڈ بھی ان میں شامل رہ چکا ہو، بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ ملکہ وکٹوریہ کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا ہو اور مجھ سے اپنی قسمت کا حال جاننے کے لئے ملا ہو۔ مارلس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں ہاتھ کی لکیروں کو پڑھ کر مستقبل کے بارے میں بتا سکتا تھا۔ میں نے کہا یہ تو میرے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ دوسروں نے بات کو آگے بڑھایا اور تعلیوں پر تعلیاں کی جانے لگیں۔ کسی نے کہا کہ وہ محض آواز کو سن کر انسانوں کے کردار کا احاطہ کر سکتا تھا۔ کسی اور نے کہا کہ یہ تو کچھ بھی نہ ہوا وہ سونگھ کر انسان کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں سب کچھ جان لیتا تھا۔ اسی روز ہماری میز پر سب سے زیادہ قہقہے لگائے گئے اور ہم سب پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلف ہو گئے۔

چائے کے بعد سیمینار کا پہلا تعارفی اجلاس ہوا، جس میں منتظمین نے اپنے بارے میں بتایا اور سیمینار منعقد کرنے والی فرینڈز سوسائٹی کا تعارف کروایا۔ عرف عام میں ان لوگوں کو کوئیکرز کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کے مذہبی عقائد کی بناء پر یورپ بالخصوص انگلستان سے ان کو ملک بدر کر دیا گیا تھا۔ امریکہ میں انہوں نے ایک صلح کل پالیسی کو اپنا لیا اور اس بات کا پرچار کرنے لگے۔ سیمینار کا مقصد یہی تھا کہ دنیا کے مختلف ملکوں، قوموں اور نسلوں کے لوگوں کو یکجا کر کے ان کے باہمی مناقشات کا تجزیہ کیا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ جنگ سے

دنیا کا کوئی مسئلہ حل نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ہر جنگ نئی بے انصافیوں کو جنم دیتی ہے اور انسانوں کے مابین فاصلوں کو بڑھاتی ہے ۔ جب کہ سارے مسائل صلح و آشتی کے ساتھ حل کئے جاسکتے ہیں ۔ بشرطیکہ فریقین ایک دوسرے کے جائز حقوق کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں ۔

سیمنار میں پینتیس ملکوں کے نمائندے شامل تھے، جن میں اکثر میری طرح یونیورسٹی کے طالب علم تھے ۔ ہندوستان کی نمائندگی جوشی کر رہا تھا، جو اس زمانے میں ہالینڈ میں پڑھتا تھا وہ پنجاب کا رہنے والا تھا اور اپنے ماں باپ کے ساتھ تقسیم ملک کے وقت ہجرت کر کے ہندوستان گیا تھا ۔ مجھے وہ ذاتی طور پر اچھا آدمی لگا ۔ مگر ہمارے درمیان کشمیر حائل تھا اور ہمیں ایک دوسرے کے قریب آنے کے لئے اس مسئلہ کا کوئی حل سوچنا تھا ہم سے زیادہ مشکل صورت حال کا سامنا اسرائیل سے آئے ہوئے ڈان اور جورج کو کرنا تھا ۔ ڈان یہودی تھا، چیکو سلواکیہ میں پیدا ہوا تھا اور ماں باپ کے ساتھ ہجرت کر کے اسرائیل میں جاکر آباد ہوا تھا، جب کہ جورج فلسطینی عرب تھا، جس کا خاندان صدیوں سے اس ملک میں آباد تھا اور اسرائیل کے قیام کے بعد اس کو دوسرے درجے کی شہریت قبول کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا ۔ جہاد سلامہ ایک فلسطینی مسلمان لڑکی تھی، جس کا خاندان ہجرت کر کے لبنان میں پناہ گزین ہوا تھا ۔ وہ اس زمانے میں قاہرہ کی امریکن یونیورسٹی کی طالبہ تھی اور اپنی خوبصورتی کے باعث سیمنار کی ملکہ ۔ حسن تھی ۔ اس کے ہمراہ قاہرہ سے فواد رمضان آیا ہوا تھا، جو اپنی تعلیم کے خاتمے پر صحافت میں ابتدائی تجربہ حاصل کر رہا تھا ۔ گویا عرب کیمپ خاصا مضبوط تھا ۔ مگر اسرائیل کے حامیوں کی تعداد بھی کچھ ایسی کم نہ تھی، کیونکہ مزید دو یہودی، ایک امریکن اور دوسرا کینیڈین، سیمنار میں موجود تھے ۔ افریقہ کے کئی ملکوں کے نمائندے موجود تھے، جن میں گھانا کی میری اور نائیجیریا کی روزی نمایاں تھیں ۔ پہلی میٹنگ میں ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ روڈیشیا اور ایڈوارڈ اور جنوبی افریقہ کا جونزسن کلونیل ازم اور نسلی امتیاز کے خلاف خوب معرکے ماریں گے ۔ امریکہ کی سفید فام نسل کی نمائندگی ایڈیتھ کر رہی تھی ۔ جب کہ سیاہ فام رچرڈ نہ تو باکسر تھا اور نہ ہی اتھیلیٹ ۔ وہ فلاسفی کا طالب علم تھا اور ہر بات کی گہرائیوں میں جانے کی کوشش کرتا تھا ۔ کیمونسٹ یورپی ممالک سے صرف دو نوجوان آئے ہوئے تھے، جن کا تعلق پولینڈ سے تھا اور ان کے انداز تقریر سے صاف لگتا تھا کہ پارٹی کے ممبر بلکہ خفیہ پولیس کے کارکن تھے ۔ مغربی یورپ کے تقریباً ہر ملک کے نمائندے موجود تھے، جن کی دلچسپیاں زیادہ تر ان سرگرمیوں تک محدود تھیں، جو سیمنار کے پروگرام سے باہر تھیں ۔ انہیں یہ جاننے کا شوق تھا کہ شاموں کی موسیقی اور ناچ کا کیسا انتظام تھا اور کب اور کن جگہوں کے تفریحی سفروں کا اہتمام کیا جائے گا ۔

یورپ میں گرمیوں کے موسم میں دن بے حد طویل ہوتے ہیں ۔ سورج کہیں نو دس بجے جاکر غروب ہوتا ہے ۔ اسی تناسب سے شامیں شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہوتی ہیں ۔ کالج میں شام کا کھانا سات بجے لگادیا جاتا تھا، جس کے بعد اندھیرا پھیلنے میں ابھی کئی گھنٹے پڑے ہوتے تھے ۔ چونکہ شام کو سیمنار کا کوئی پروگرام نہ ہوتا تھا، سوائے موسیقی اور ڈانسنگ کے اور ہفتے میں ایک یا دو بار منائے جانے والے کسی کنٹری فیسٹول کے، جس میں شامل ہونے کی شرط نہ تھی، اس لئے اکثر لوگ سیر و تفریح کے لئے باہر چلے جاتے تھے ۔ پہلے ہی روز مارلس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا، بلکہ وہ کہیں سے اپنے اور میرے لئے دو سائیکلیں بھی لے آئی ۔ اس کا پروگرام اس شام ایک قریبی گاؤں میں جانے کا تھا، جس کے رستے میں ایک جنگل پڑتا تھا، جہاں سے شام کے وقت گزرتے ہوئے اسے ڈر لگتا تھا ۔ تو گویا مجھے باڈی گارڈ ہونے کا شرف بخشا جا رہا تھا ۔

یہ بات میں نے اسے رستے میں کہہ ہی ڈالی، جس پر اسے بہت ہنسی آئی۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے ایک بہت ضروری کام کے سلسلے میں ساتھ لے جا رہی تھی۔ جس کا تعلق اس کی قسمت کے ساتھ تھا۔ اور یہ کہ میں اس سیمنار کے شرکاء میں سے واحد آدمی تھا، جسے وہ اپنے راز میں شریک کر رہی تھی۔ وہ یوں بھی چاہتی تھی کہ میں اس کے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھ کر اسے بتاؤں کہ آیا اسے اپنے مقصود کو حاصل کرنے میں کامیابی ہوگی یا نہیں۔ میرے پوچھنے کے باوجود وہ یہ بتانے کے لئے تیار نہ ہوئی کہ اس کا مقصود کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مجھے اس معمہ کو اکیلے حل کرنا ہوگا۔ میں پہلے حبنز میں جو تشی جو رہ چکا تھا۔

گاؤں کے پب میں اس نے مسٹر میکلین کے بارے میں پوچھا، جس کی بیوی جرمن تھی۔ اس نام کے آدمی کو وہاں پر کوئی نہیں جانتا تھا اور کسی جرمن عورت کے بارے میں انہوں نے نہیں سن رکھا تھا۔ ایک شخص نے کہا کہ اس نے ایک بار ایک فارم میں عورت سے بات کی تھی جس کا لہجہ اسے غیر ملکی سا لگا تھا۔ مگر یہ بات اتنی پرانی تھی کہ وہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ فارم کہاں پر واقع تھا۔ عورت البتہ بہت خوبصورت تھی، اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس کے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ ایسی عورتیں تو عام طور سے انسان کو صرف فلموں میں نظر آتی ہیں۔

واپسی کے راستے میں مارلس نے بتایا کہ وہ باری باری اس کونٹی کے ہر گاؤں میں جانا چاہتی تھی۔ وہ دراصل اس عورت کو تلاش کرنے کے لئے وہاں پر مقیم تھی۔ اس نے ایک نقشے پر ان تمام مقامات پر نشان لگا رکھا تھا، جہاں پر وہ جا چکی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ابھی بیس پچیس گاؤں باقی تھے، گویا سیمنار کے چار ہفتوں کے دوران تقریباً روز ایک گاؤں کا چکر لگتا ہوگا۔ مارلس نے کہا کہ ضروری نہیں تھا کہ میں ہر روز اس کے ساتھ جاؤں۔

میں نے کہا کہ میں ہر روز اس کے ساتھ چلنے کو تیار تھا، بشرطیکہ وہ مجھے بتائے کہ وہ کون عورت تھی، جس کی اسے تلاش تھی اور کس وجہ سے؟ مارلس نے کہا کہ وہ مجھے کالج میں پہنچ کر ایک تصویر دکھائے گی، جس سے ساری بات کھل جائے گی۔

تصویر پر ایک نظر ڈالنے سے میں نے جان لیا کہ وہ عورت مارلس کی ماں تھی۔ دونوں کی شکل و شباہت بالکل ایک جیسی تھی۔ ویسی ہی نیلی آنکھیں اور سنہری بال، تراشے ہوئے خدوخال، اٹھتی ہوئی ناک، بے حد رسیلے ہونٹ، گویا مارلس اپنی ماں کی تلاش میں تھی جو کسی مسٹر میکلین کے ساتھ اس کونٹی کے کسی گاؤں میں رہتی تھی۔ پب میں اس شخص نے کہا تھا کہ اسے اس عورت کو دیکھے ہوئے بہت عرصہ ہو چکا تھا، جس کا لہجہ اسے غیر ملکی لگا تھا۔

مارلس نے بتایا کہ جب اس کی ماں نے اس کے باپ کو مسٹر میکلین کی خاطر چھوڑا تھا، تو اس کی عمر ابھی ایک سال کی تھی۔ اس بات پر پورے چوبیس سال بیت چکے تھے۔ اس کے باپ نے دوسری شادی نہ کی تھی۔ مارلس کی پرورش ایک آیا نے کی تھی۔ اس کی حقیقی ماں نے اتنے سالوں میں کبھی بھول کے بھی اس کے بارے میں نہ پوچھا تھا، نہ ہی اس کی سالگرہ پر کوئی تحفہ بھیجا تھا۔ جب کہ اسے پتہ تھا کہ وہ اس کی سالگرہ کے دن کو بھول نہ سکتی تھی۔ ماں اور بیٹی کی تاریخ پیدائش ایک ہی تھی۔ اور اس نے مارلس کے باپ سے عین اپنی پچیسویں سالگرہ والے روز علیحدگی اختیار کی تھی۔

مارلس کو علم نہ تھا کہ اس کی ماں کیوں اس کے باپ سے علیحدہ ہوئی تھی اور کیا وجہ تھی کہ وہ اپنی ایک سالہ بیٹی کو اس کے پاس چھوڑ کے چلی گئی تھی۔ مارلس نے اپنے باپ سے اس بات کا راز جاننا چاہا تھا، مگر وہ اس بارے میں بات کرنے کو بالکل تیار نہ ہوتا تھا۔ اس کے دل کا چرکہ اتنا گہرا تھا کہ وہ ساری عمر بے حد غمگین رہا تھا۔ وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھا

کہ اس کی بیوی ایک بہت عامی قسم کے انگریز سپاہی کے لئے اس کو چھوڑ گئی تھی ـ جو دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے پر جرمنی میں تعینات تھا ـ

مارلس کو اپنی ماں کی سہیلیوں سے پتہ چلا تھا کہ وہ انگریز اتنا بھی عام آدمی نہیں تھا، جتنا اس کا باپ اس کو باور کروانے کی کوشش کرتا تھا ـ اس کے باپ کے برعکس، جو ہر وقت سنجیدگی کا ملمع اپنے چہرے پر کئے ہوئے پھرتا تھا، جیسے ہلکی سی مسکراہٹ بھی اس کے میک اپ کو تہہ و بالا کر دے گی اور پیچھے سے اس کا اصل چہرہ جھانکنے لگے گا، وہ انگریز بے حد خوش باش آدمی تھا ـ وہ منٹوں کے اندر لوگوں میں گھل مل جاتا تھا اور عورتوں کا تو وہ ہیرو تھا ـ جب وہ ڈانسنگ فلور پر قدم دھرتا تھا تو یوں لگتا تھا، جیسے موسیقی یکسر اس کا ہیولہ اختیار کر لیتی تھی سبھی عورتیں اس کے ساتھ ڈانس کرنے کی خواہشمند تھیں، مگر مارلس کی ماں نے اس پر ایسا جادو کر دیا تھا کہ وہ اس کی موجودگی میں کسی دوسری عورت کو ڈانس کرنے کی دعوت نہ دیتا تھا ـ مارلس کے باپ نے ان روزمرہ کی شکستوں سے تنگ آکر موسیقی کی محفلوں میں جانا چھوڑ دیا تھا ـ یوں بھی جنگ کے بعد جرمنی پر اتحادیوں کا قبضہ تھا اور قانونی اور غیر قانونی طور پر ہر بات میں ان کا سکہ چلتا تھا ـ اس کے باپ کو کبھی یہ جراءت نہ ہوئی کہ وہ مسٹر میکلین کے روبرو کھڑے ہو کر اسے اپنی بیوی کا پیچھا کرنے سے روک سکتا ـ اگر وہ کبھی ایسا کرتا بھی تو نتیجہ اس کے حق میں نہ نکلتا، کیونکہ اسے پتہ تھا کہ اس کی بیوی کبھی کی اس کے قابو سے باہر نکل چکی تھی ـ کھلم کھلا اس بارے میں جھگڑے سے شاید یہ ہوتا کہ پب میں اس کی بے عزتی کر دیتی، اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مسٹر میکلین اس کو دنگا فساد کرنے کے الزام میں گرفتار کر کے حوالات میں بند کروا دیتا ـ

مسٹر میکلین کے بارے میں عام طور سے یہ مشہور تھا کہ وہ بے حد شیخی باز تھا ـ وہ اپنے خاندان کی وسیع و عریض زرعی اراضی کا ذکر کیا کرتا تھا، جن کا وہ واحد وارث تھا ـ اگر اس کے پردادانے کسی زمانے میں کراؤن کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند نہ کیا ہوتا، اور اس کے خاندان کے موروثی القابات قائم ہوتے تو وہ "ارل آف اسٹڈلے" ہوتا ـ یہ بات اپنی جگہ پر، مگر میکلین کی جیب میں کبھی پیسے نہ ہوتے تھے ـ وہ اس بات کو اپنے خاندان کی پیسوں کے معاملے میں لاپرواہی پر محمول قرار دیا کرتا تھا ـ اس وجہ سے اکثر مسٹر میکلین کے ساتھ پب میں بیٹھنے والوں کو یا ڈانس کرنے والی اس کی پارٹنر لڑکیوں کو اس کا بل ادا کرنا پڑتا تھا ـ وہ ہر کسی سے وعدہ کرتا تھا کہ اگلے ہی روز قرض اتار دے گا ـ مگر وہ اگلا روز کبھی نہ آیا ـ

پھر اس کی بٹالین کی واپسی کے آرڈر آگئے ـ میکلین کو تو خیر انگلستان جانا ہی تھا ـ مارلس کی ماں نے خفیہ طور پر اس کے ساتھ چلنے جانے کا پروگرام بنالیا ـ اسے پتہ تھا کہ اس کا خاوند اس کے راستے میں روڑے نہیں اٹکائے گا، وہ اس کی جانب سے اس درجہ دل آزردہ ہو چکا تھا کہ میاں بیوی کی علیحدگی کی ناگزیری کو قبول کر چکا تھا ـ صرف مشکل یہ تھی کہ ان کی بیٹی مارلس ابھی بہت ننھی تھی، اس نے تو ایک سال بھی مکمل نہ کیا تھا ـ وہ ہر قیمت پر مارلس کو اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا ـ اور دل ہی دل میں ڈرتا تھا کہ اگر طلاق کا مقدمہ دائر کروانا پڑا تو عدالت مارلس کی کفالت کا فیصلہ اس کی ماں کے حق میں کر دے گی ـ مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی ـ مارلس کی ماں نے خاموشی کے ساتھ دو چار کپڑے لتے سنبھالے اور چپکے سے میکلین کی بٹالین کے ساتھ انگلستان چلی گئی ـ اس دن کے بعد اس نے اپنے خاوند یا مارلس کے ساتھ کوئی رابطہ قائم نہ کیا ـ وہ یکسر ان کی زندگی سے نکل گئی ـ

اس دن کے بعد اس کی طرف سے کبھی کوئی خط پتہ نہ آیا اور نہ ہی اس نے اپنی بیٹی کے بارے میں پوچھا کہ وہ کن حالات میں زندگی بسر کر رہی تھی ـ مارلس کے پاس اپنی ماں کی

دی ہوئی ایک گڑیا یادگار تھی، جسے اس نے جنگ کے زمانے میں کپڑوں کی لیروں کو جوڑ باندھ کر بنایا تھا۔ مارلس اسے بے حد چاہتی تھی اور ہمیشہ اپنے ساتھ لئے پھرتی تھی۔ اسٹڈلے کالج میں بھی اس نے اسے اپنے کمرے میں بستر پر سرہانے کے ساتھ سہارا دے کر بٹھایا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس ماں کا ایک فوٹو تھا۔ اس ماں کا جو اسے ننھی سی چھوڑ کر چلی گئی تھی اور پھر بھول کر بھی ادھر کا رخ نہ کیا تھا۔ اگر مارلس کو ماں کی سہیلیوں کی زبانی پتہ نہ ہوتا کہ میکلین کا خاندانی خطاب "ارل آف اسٹڈلے" تھا، تو اسے بالکل پتہ نہ چلتا کہ ماں کو کہاں پر تلاش کرے۔ اس نے انگلستان کے نقشے پر اسٹڈلے کا سراغ نکالا تو پتہ چلا کہ وہاں پر ایک زراعتی گرلز کالج تھا، جہاں پر اسے ایک آدھ ماہ کے لئے رہائش مل سکتی تھی۔

اسٹڈلے پہنچنے پر پتہ چلا کہ "ارل آف اسٹڈلے" کا کوئی وجود نہ پایا جاتا تھا۔ کالج کی بلڈنگ بنانے والا خاندان نصف صدی پہلے کسی دوسرے علاقے میں منتقل ہو گیا تھا۔ ان کی زمینوں کی بیشتر اراضی زراعتی کالج کے پاس تھیں، جہاں پر ایک موڈل فارم بنا ہوا تھا۔ میکلین نامی شخص کو وہاں پر کوئی نہیں جانتا تھا۔ مگر اس بات کی ضمانت بھی کوئی نہ دے سکتا تھا کہ آس پاس کے دیہات میں اس نام کا کوئی کسان پایا جاتا ہو چونکہ انگلستان میں آبادی کی سنٹرل رجسٹریشن کا انتظام نہیں ہے۔ اس لئے کسی کو تلاش کرنا آسان کام نہیں ہے۔

سیمینار اپنی ڈگر پر چل رہا تھا۔ ابتدائی دنوں میں ہر کوئی اپنے اپنے موقف پر یوں اڑا ہوا تھا جیسے اس سے ایک قدم ادھر یا ادھر ہونے سے دنیا کے ڈوب جانے کا خطرہ تھا۔ سیمینار کا ڈائریکٹر مسٹر اوور اسٹریٹ بہت ہوش مندی کے ساتھ ان بحث مباحثوں میں غیر جانب داری کا مظاہرہ کرتا تھا اور بہت دھیرے دھیرے دونوں پارٹیوں کو اس مقام پر لے جاتا تھا جہاں پر پہنچ کر شرکائے بحث کو تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ مسئلے کا حل اس صورت میں ممکن نہ تھا کہ ہر کوئی اپنے اپنے موقف پر قائم رہے۔ البتہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم نے چار ہفتوں کے دوران کشمیر، اسرائیل اور روڈیشیا سے لے کر جنوبی افریقہ تک سارے مسائل کو حل کر ڈالا تھا۔ ہم نے صرف یہ سیکھا تھا کہ دوسروں کے موقف کو اسی سنجیدگی کے ساتھ پرکھنا چاہیے۔ جس کی توقع ہم دوسروں سے رکھتے ہیں کہ وہ ہمارے موقف کے ساتھ برتیں گے۔

پہلا سیشن دوپہر کے کھانے تک چلتا تھا، جس کے بعد اڑھائی تین گھنٹوں کا وقفہ آجاتا تھا، جس کے دوران ہر کوئی اپنی اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے کر سکتا تھا۔ اکثر لوگ کالج کے لان میں کروکے کا کھیل کھیلتے تھے یا سیر سپاٹے کو نکل جاتے تھے۔ میری اور مارلس کی ٹولی میں بعض اوقات مارسل شامل ہو جایا کرتا تھا، جو بیلجیم کا رہنے والا تھا اور چونکہ اسے جرمن نہ آتی تھی، اس لئے ہمیں اس کی خاطر انگریزی بولنی پڑتی تھی، جب کہ مارلس کے ساتھ میں عام طور سے جرمن زبان میں بات چیت کیا کرتا تھا۔ اس کا ایک فائدہ یہ تھا کہ ہمارے منصوبے دوسروں سے پوشیدہ رہتے تھے۔ کسی کو پتہ نہ تھا کہ ہم شام کے وقت سائیکلوں پر کہاں جاتے اور کیا کرتے تھے۔

مارسل بہت بور شخص تھا۔ وہ سیر کے لئے بھی جاتا تھا تو تھری پیس سوٹ اور نکٹائی پہن کر۔ میں اس کا مذاق اڑانے کے لئے کہا کرتا تھا کہ وہ اپنا سلینڈر ہیٹ ساتھ لانا بھول گیا تھا، یا یہ کہ کوئی جنٹلمین چھتری کے بغیر ننگا دھڑنگا گھر سے نہیں نکلتا۔ وہ بے چارہ اپنی عادت کے ہاتھوں مجبور تھا یا شاید قصور اس کے پیشے کا تھا۔ اس نے کالج کی تعلیم کے خاتمے پر ایک بنک میں اپرنٹس شپ کر لی تھی۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح بینکر بننا چاہتا تھا، جس کا پرائیوٹ بنک برسلز میں بہت بڑا نام تھا۔ میں اسے تنگ کرنے کے لئے کہا کرتا تھا کہ بینکر کا بیٹا اور ایک پرائیوٹ بنک کا واحد وارث ہونے کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ اس قدر

اکڑ کر چلنا چاہیے، جیسے اس نے بانس کا ڈنڈا نگل رکھا ہو۔ مارس بھی اس چھیڑ چھاڑ میں میرا ساتھ دیتی تھی۔ مگر اس کی باتوں کا وہ برا نہیں مانتا تھا۔ وہ مارس کی ایک ایک ادا پر جان دیتا تھا۔ مگر میری موجودگی میں اس کی دال نہیں گلتی تھی۔ اس لئے اس کی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ وقت مارس کے ساتھ اکیلے گزار سکے۔ اس معاملے میں بد قسمتی سے یہ چیز حائل تھی کہ مارسل کو سائیکل چلانا نہ آتی تھی۔ اس وجہ سے وہ شام کے سفروں میں ہمارا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔ یوں بھی مارس نہیں چاہتی تھی کہ اس کے معاملے کے بارے میں دوسروں کو پتہ چلے۔

یہ راز اس کے اور میرے درمیان تھا۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا، جس کے دوران ذرہ بھر پیش قدمی نہ ہو رہی تھی، ہمارے حوصلوں پر اوس پڑتی جارہی تھی۔ ہر شام کسی مہم سے ناکام لوٹنا آدمی کو جان سے مار ڈالتا ہے۔

میری دلچسپی اس معاملے میں محض دوستانہ تھی۔ اس لئے ناکامیوں کا اثر مجھ پر اتنا گہرا نہ تھا۔ جتنا مارس پر۔ اس کے ولولے اپنی ماں کو ڈھونڈ نکالنے کے لئے دن پر دن مدھم پڑتے جاتے تھے۔ اس دوران میں ہمارے اسٹڈلے میں قیام کا آخری ویک اینڈ آن پہنچا تھا۔ ہفتے کے روز ہم نے نقشے پر نشان زدہ آخری گاؤں کا چکر لگایا، مگر حسب دستور وہاں سے ناکام لوٹے، اتوار کے دن میں مارس کے ساتھ اکیلا گزارنا چاہتا تھا کہ مارسل کو، جو تہوار کے دنوں میں ہمارے ساتھ سریش کی طرح چپک جایا کرتا تھا، کسی طریقے سے راستے سے ہٹایا جائے۔ ہفتے کی شام کو میں نے مارس سے نظر بچا کر ایک پب سے اسٹڈلے کالج میں فون کیا اور آواز کو کسی قدر بدل کر فرانسیسی لہجے میں مارسل کے لئے یہ پیغام چھوڑا کہ اس کے ماں باپ اتوار کے روز لندن پہنچ رہے تھے، جہاں پر وہ برسٹل ہوٹل میں ٹھہریں گے۔ وہ چاہتے تھے کہ مارسل اتوار ان کے ساتھ لندن میں گزارے۔ ہمارے کالج میں واپس پہنچنے تک مارسل کو پیغام مل چکا تھا اور اس نے اگلی صبح پہلی بس میں لنڈن جانے کا پروگرام بنالیا تھا۔ میں نے اپنے ضمیر کو یہ کہہ کر تسلی دلادی کہ محبت اور جنگ میں ہر حربہ جائز ہوتا ہے۔

بات دراصل محبت کی ہی تھی، اور میں چاہتا تھا کہ مارس کے سامنے اس کا اقرار کر لیا جائے۔ اس مقصد کے لئے بہت سا وقت درکار ہوتا ہے۔ انسان پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے یا کسی بینچ پر بیٹھے ہوئے یا گھاس میں لیٹے ہوئے تو محبت کا اظہار کر سکتا ہے مگر سائیکل چلاتے ہوئے یا مارسل کی موجودگی میں ایسی باتیں نہیں کہی جا سکتیں۔ اس لئے میں چاہتا تھا کہ ہم اتوار کے روز پچ ہائیکنگ کے لئے نکلیں، دوپہر کے کھانے کی بجائے لنچ پیکٹ بنوا لیے جائیں اور سارا دن کھیتوں میں گھومتے ہوئے گزاریں۔ مجھے امید تھی کہ دن کے دوران میں کوئی نہ کوئی مناسب موقع نکل آئے گا، جب میں مارس کو سینے سے لگا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی محبت کا اظہار کر سکوں گا۔

اتوار کے روز ناشتہ کسی قدر دیر سے ملتا تھا۔ مارسل ناشتے کا انتظار کئے بغیر پہلی بس میں لنڈن کے لئے روانہ ہو چکا تھا اسے رستے میں دوبارہ بس بدلنی تھی اور اگر خلاف توقع کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی تو اسے گیارہ بجے سے پہلے پہلے لنڈن پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ جب تک اسے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ کسی نے اس کے ساتھ مذاق کیا تھا اور وہ واپسی کی بس پکڑتا ہے، ہم اسٹڈلے کے گرد و نواح میں کہیں کے کہیں جا نکلے ہوں گے۔ ہمارا ارادہ سارا دن باہر گزارنے کا تھا۔

اسٹڈلے کے کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک ندی بہتی ہے۔ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ انسان اس کے کنارے کنارے چلتا ہوا اسٹریٹفورڈ اپون ایون پہنچ سکتا ہے۔ ہمیں راستے میں ایک شخص ملا، جسے ہم اس سے قبل متعدد بار ندی میں مچھلیوں کا شکار کرتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ مجھے یہ یقین تھا

کہ اس ندی میں سرے سے مچھلیاں پائی ہی نہیں جاتیں ۔ اسٹڈلے سے تھوڑا اوپر ایک کیمیکل ورکس بنا ہوا تھا ۔ جس کا استعمال شدہ پانی فلٹر ہوئے بغیر ندی میں گرتا تھا ۔ اس جگہ پر سفید جھاگ کے سبب انسان ندی کے پانی کو دیکھ ہی نہیں سکتا ۔ اس لئے میں نے مچھلی کے شکاری سے جاننا چاہا کہ وہ اتوار کے اتوار کتنی مچھلیاں شکار کرلیتا تھا ۔

اس نے جواب دیا کہ مچھلیوں کا شکار تو محض ایک بہانہ تھا ۔ دس برسوں کے دوران اس نے ایک بھی مچھلی نہ پکڑی تھی ۔ دراصل وہ شخص شیکسپیئر کا عاشق تھا ۔ اسے یقین تھا کہ شیکسپیئر اس گردونواح کی ندیوں پر مچھلیوں کا شکار کرتا رہا ہوگا اس لئے ہر اتوار کے روز کسی دوسری جگہ پر جاکر بیٹھتا تھا اور عین ممکن ہے کہ شیکسپیئر نے کبھی وہاں پر مچھلیوں کا شکار کرنے کے لئے ڈیرہ لگایا ہو ۔ اس نے شرارت آمیز نگاہوں کے ساتھ مارلس کی طرف تکتے ہوئے کہا کہ شیکسپیئر نے یقیناً اس ندی کے آس پاس اپنی محبوبہ کو بازوؤں میں لے کر اس کے ساتھ بوس و کنار بھی کیا ہوگا ۔

ہم نے اسے خدا حافظ کہا اور ندی کے کنارے کنارے چل دیئے ۔ وہاں سے لگ بھگ ایک کلومیٹر گئے ہوں گے کہ لینڈ سکیپ کے عین بیچ ایک ننھا منا سا چرچ کھڑا نظر آیا ۔ وہاں پر دور دور تک کوئی آبادی نہ تھی ۔ بیگ گراؤنڈ میں بڑے گرانڈیل درخت کھڑے تھے ۔ ایک طرف یہ نظارہ ایسا دلفریب تھا، جیسے اسے کسی مصور نے خاص طور پر تخلیق کیا ہو دوسری طرف وہ ایسا غیر فطری لگ رہا تھا، جیسے کسی جادوگر نے فریب نظر کے عمل سے اسے بنایا ہو، اور جوں ہی ہم اس کی سمت میں چلنا شروع کریں گے، ساری سینری پیچھے ہٹنے لگے گی اور ہم کبھی چرچ تک نہ پہنچ پائیں گے ۔

پھر جب ہم نے بیچ بیچ چرچ کی طرف اپنے قدموں کا رخ موڑا تو ہر چیز اپنی جگہ پر قائم رہی، بلکہ ہمیں یوں لگا جیسے چرچ ہماری طرف بڑھتا چلا آتا تھا ۔ ہماری رفتار میں تیزی پیدا ہوتی چلی گئی اور آخری ایک سو گز کا فاصلہ تو ہم نے دوڑ کر طے کیا ۔ بغیر ایک دوسرے کے ساتھ شرط لگائے ہم نے دوڑنا شروع کر دیا تھا، جیسے چرچ کے دروازے پر پہلے پہنچنے کا کوئی انعام ملنے والا تھا ۔ جب راستے میں مارلس کا دم اکھڑنے لگا تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور دوڑ کر رفتار کو کم کر دیا ۔ اس وقت تک ہمیں یہ علم نہ تھا کہ چرچ کا دروازہ کھلا ہوگا یا بند ۔ مارلس نے کہا کہ مزاتب تھا، جب دروازہ کھلا ہو اور اندر چرچ سروس ہو رہی ہو آخر وہ اتوار کا روز تھا اور وقت چرچ سروس کے لئے موزوں تھا

مارلس نے ڈرتے ڈرتے دروازے ہتھی کو پکڑا اور کسی قدر بے دلی کے ساتھ دروازے کو اپنی طرف کھینچا، جو کھلتا چلا گیا ۔ اندر ریپلیٹ کے دائیں بائیں موم بتیاں جل رہی تھیں، جیسے انہیں کسی نے ہمارے استقبال کے لئے روشن کیا ہو ۔ کھڑکیوں سے روشنی چھن چھن کر اندر آرہی تھی ۔ بیٹھنے کے لئے دو رویہ تین تین لکڑی کے بنچ رکھے ہوئے تھے ۔ چرچ فی الواقعہ بے حد مختصر تھا اور اگرچہ ہمارا قیاس تھا کہ سروس میں شاید ہی کوئی شخص حصہ لینے کے لئے آئے گا ۔ اس کے باوجود صاف نظر آرہا تھا کہ اس صبح سروس کے سارے انتظامات کیے جاچکے تھے، مگر وہاں پر کوئی پادری نہیں تھا ۔ پھر مارلس نے نوٹ کیا کہ وہ رومن کیتھولک چرچ تھا، جب کہ اس سارے علاقے میں سرے سے رومن کیتھولک آبادی نہ پائی جاتی تھی ۔ مارلس کا تعلق رومن کیتھولک چرچ سے تھا ۔ اس کی تیز نظروں نے ایک کونے میں وہ کرسی بھی تلاش کرلی، جو کنفیشن کے لئے استعمال ہوتی ہے ۔ حیرت صرف اس بات کی تھی کہ پادری کی عدم موجودگی میں کیسے کنفیشن لینے کا حق حاصل تھا اور وہ کون لوگ تھے جو اس گرجا گھر سے منسلک تھے ۔ فرنیچر اور دوسری چیزوں کی دیکھ بھال اتنی اچھی تھی کہ ہمیں یقین ہی

نہیں آتا تھا کہ گرجا گھر بلا مقصد اور بغیر محافظ کے لینڈ سکیپ کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔

کنفیشن کی کرسی نے میری مشکل کو آسان کر دیا۔ میں نے مارلس کو اس پر بٹھا کر اپنے گناہ محبت کا اقرار کیا اور وعدہ کیا کہ ساری عمر اس کو ہاتھوں پر اٹھاؤں گا۔ مارلس نے پوچھا کہ کیا مجھے پتہ تھا کہ گرجا گھر کے اندر ایسے عہد و پیمان کر کے انسان ان کو توڑ نہیں سکتا۔ میں نے کہا میرا وعدہ ہمیشہ کے لئے ہے اور آنے والے سال ثابت کر دیں گے کہ میں وعدے کا پکا ہوں۔

اب میری باری کنفیشن کی کرسی پر بیٹھنے کی تھی۔ مارلس نے کہا کہ وہ بھی بہت دنوں سے مجھے بتانا چاہتی تھی کہ وہ ہمیشہ کے لئے میری ہو چکی تھی اور اب کوئی چیز ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکے گی۔

میں نے خوشی کے مارے مارلس کو بازوؤں میں لے کر پیلپٹ کے سامنے چوما، جو گویا ہمارے عہد و پیمان پر مہر تصدیق تھی۔

گرجا گھر سے نکل کر ہم نے نہر کے کنارے اپنے سابقہ بے منزل سفر کو جاری رکھا۔ پروگرام صرف اس قدر طے شدہ تھا کہ اتنی دیر تک چلیں گے، جب تک بھوک کی شدت ہمیں رکنے اور لنچ پیکٹ کھولنے پر مجبور نہیں کرتی۔ ہلکی ہلکی چکبری سی دھوپ نکل آئی تھی اور لینڈ سکیپ کے رنگوں میں تازگی آگئی تھی۔ مارلس کو اس بات کا بے حد افسوس ہو رہا تھا کہ وہ کیمرہ ساتھ نہ لائی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایسا نظارہ انسان کو زندگی بھر میں بس ایک بار دیکھنے کو ملتا ہے۔ میری یادداشت کی لوح پر سارا نظارہ آج تک تازہ ہے، اپنے سارے رنگوں، خوشبوؤں اور پرندوں کی آوازوں سمیت، اور لینڈ سکیپ میں جڑے ہوئے ننھے سے گرجا گھر کے سامنے کھڑی مارلس اس نظارے میں روح پھونک رہی ہے۔

ابھی ہم زیادہ دور نہ گئے تھے کہ ہمارا آمنا سامنا ایک مرد اور عورت سے ہوا، جو شاید گرجا گھر کی طرف جا رہے تھے۔ مرد کسی قدر جھک کر چل رہا تھا۔ البتہ اس کے چوڑے چکلے ہاتھ پانوؤں سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ اپنی جوانی میں ایک گرانڈیل شخصیت رہا ہوگا۔ عورت کی عمر پچاس کے لگ بھگ لگتی تھی۔ اس کے سر بال سارے سفید ہو چکے تھے اور عرصہ ہوا ان کو کسی ہیر ڈریسر نے ہاتھ نہ لگایا تھا۔ دراصل مارلس اور میں اپنے پیار کے اظہار میں اس درجہ مصروف تھے کہ اگر اس عورت نے ہمیں مخاطب نہ کیا ہوتا تو ہمیں شاید پتہ ہی نہ چلتا کہ کوئی ہمارے پاس سے گزر رہا تھا۔

"ہائے، آپ میرے وطن کی زبان بول رہے ہیں"

عورت کے اس فقرے نے ہمیں چونکا دیا اور ہمارے قدم خود بخود رک گئے۔ عورت نے سورج کی شعاعوں سے بچنے کے لئے اپنے دائیں ہاتھ سے آنکھوں کے سامنے چھجا سا بنایا ہوا تھا اور ہمیں چندی آنکھوں کے ساتھ تک رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے کئی دانت گر چکے تھے اور دوسروں کو کیڑا لگا ہوا تھا۔

میں نے بتایا کہ ہم ایک سیمنار کے سلسلے میں اسٹڈلے کالج میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی میں نے جاننا چاہا کہ وہ کب سے انگلستان میں مقیم تھی؟

"اس بات پر ایک عمر بیت چکی ہے"۔ عورت نے کہا۔ پھر اس نے اپنے مرد کے کندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا، ۔ "میں پیٹر کی خاطر گھر بار سب کچھ چھوڑ کر اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔ مگر اس سارے عرصے میں مجھے اس بات پر ایک لمحے کے لئے بھی پچھتاوا نہیں ہوا۔ اگرچہ ہمیں اس علاقے میں بہت سی سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ ابھی کل ہی میری نظر کی عینک ٹوٹ گئی ہے۔ جس کے بغیر میں کسی میدانی چوہے کی طرح اندھی ہو جاتی ہوں۔ جس کی آنکھیں سرما کے مہینے زمین کے نیچے

گزارنے کے سبب جواب دے جاتی ہیں۔ اگر پیٹر مجھے ہاتھ سے پکڑ کر نہ لاتا، تو آج ہم گرجا گھر میں سروس کے لئے بھی نہ پہنچ پاتے"۔

میں نے بتایا کہ ہم سیدھے گرجا گھر سے ہی آرہے تھے۔ جہاں پر سروس کی تیاریاں مکمل تھیں۔

عورت نے کہا "یہ سب پیٹر کا کیا کرایا تھا۔ وہ اتوار کے روز سویرے سویرے وہاں پر جاکر موم بتیاں جلادیتا تھا کہ شاید اس طرح کوئی راہ گزر سروس کے لئے رک جائے"۔

پھر کسی قدر وقفے کے بعد اس نے بتایا کہ گرجا گھر کو پیٹر نے اپنی زمینوں میں خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ تاکہ اسے اتوار کے روز چرچ سروس کے لئے پرائے گرجا گھروں میں نہ جانا پڑے۔ اس نے کہا کہ شاید ہم نے نوٹ کیا ہوگا کہ وہ کیتھولک گرجا گھر تھا، جب کہ دور دور تک وہاں پر کیتھولک آبادی نہ پائی جاتی تھی۔ پہلے وقتوں میں ایک کیتھولک پادری بیس میل کا فاصلہ سائیکل پر طے کر کے سروس کروانے آیا کرتا تھا۔ مگر اب وہ بے حد بوڑھا ہو چکا تھا۔

مارلس اس گفتگو کے دوران مبہوت کھڑی رہی، جیسے اس کی زبان ماری گئی ہو۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں گیلی ہورہی تھیں اور اس کے ہاتھوں کا دباؤ میرے بازو پر بڑھتا جارہا تھا۔ اس کی انگلیاں میرے گوشت میں کھبتی جارہی تھیں۔

میں نے دو چار باتیں کرکے گفتگو کو ختم کیا اور رخصت چاہی۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں مارلس چیخ مار کر رونا شروع نہ کردے۔ چیخ کو تو اس نے دبالیا مگر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ جس کو تھمتے تھمتے بہت وقت لگا۔ مارلس نے اپنی ماں کو دیکھ لیا تھا۔ جس کے دل میں ممتا کے جذبات عرصہ ہوا دم توڑ چکے تھے۔ یہ وہ ماں نہ تھی۔ جس سے ملنے کی خواہش اس کو انگلستان لے کر آئی تھی اور جس کی خاطر اس نے ساری کونٹی کو چھان مارا تھا۔ ماں سے ملاقات اس کے لئے خوشی کا موجب نہ بنی تھی، بلکہ صدمے کا، جس سے سنبھلنے کے لئے بہت وقت درکار تھا۔

ہماری پیار و محبت کی باتیں بھی اس صدمے کا شکار بن گئیں۔ مارلس کی ماں سے مڈبھیڑ سے پہلے ہم اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں منصوبے بنارہے تھے۔ مارلس نے اس ارادے کا اظہار کیا تھا کہ وہ ہمبرگ میں کوئی مناسب ملازمت تلاش کرلے گی، تاکہ ہم روزانہ ایک دوسرے سے مل سکیں۔ اب ہماری گفتگو کا مرکز مارلس کی ماں بن گئی تھی جس کے بارے میں میری رائے شروع سے اچھی نہ تھی۔ اب مارلس اپنی ماں کی اس تصویر کی توڑ پھوڑ میں مصروف تھی، جسے اس نے طویل سالوں میں بنایا تھا۔ یہ عمل بے حد تکلیف دہ ہے اور اس سے صبر آزما ہونے کے لئے بہت وقت درکار ہوتا ہے۔

شام کو ہم واپس لوٹے تو مارلس ماں کو اپنے پیچھے چھوڑ چکی تھی۔ اب اسے اپنے باپ میں خوبیاں نظر آنے لگی تھیں، جب کہ اس سے پہلے ماں کو گھر سے نکالنے کا اصل ذمہ دار وہی تھا۔ دوسری طرف اس نے دوسری شادی نہ کی تھی اور شاید دل ہی دل میں آس لگائے بیٹھا تھا کہ وہ کسی روز اچانک واپس لوٹ آئے گی۔ انسان بھی عجیب شئے ہے، وہ اپنی زندگی موہوم امیدوں کے سہارے گزار سکتا ہے۔ وہ آنکھیں بھیچ لیتا ہے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا ہے اور منہ کو سی لیتا ہے۔

اس شام مارلس کھانے کے بعد اپنے کمرے میں چلی گئی وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ بچار کرنا چاہتی تھی۔ مجھے چونکہ سارے قصے کے پس منظر کا علم تھا۔ اس لئے میں تو چپ ہو رہا۔ مگر مارسل کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ وہ سارا دن لنڈن کے رستے پر مخمل خراب ہو کر لوٹا تھا اور اب مارلس شام اس کے ساتھ گزارنے کے لئے تیار نہ تھی۔ کم از کم یہ امر اس کے لئے تسلی بخش تھا کہ اس شام مجھے بھی اس کی مصاحبت حاصل نہ تھی۔

اگلا روز سیمینار کے خاتمے کا تھا۔پہلا سیشن ناشتے کے بعد دوپہر کے کھانے تک ہوتا تھا اور دوسرا پچھلے پہر۔ میں نے اس روز کارروائی میں زور و شور کے ساتھ حصہ لیا اور امریکی سیاہ فاموں کے حقوق اور اسرائیل اور جنوبی افریقہ کی نسلی امتیاز کی پالیسی پر بھرپور حملے کیے، جب کہ سیمینار کے ڈائریکٹر مسٹراوو راسٹریٹ اس روز صرف صلح کن باتیں سننا چاہتے تھے۔انہوں نے دوپہر کے کھانے کی گھنٹی بجنے پر مجھے روک لیا اور اپنے آفس میں ساتھ لے گئے۔انہوں نے کہا کہ چار ہفتوں تک وہ میری تقریروں کو نہ صرف برداشت کرتے رہے تھے، بلکہ ان سے محظوظ ہوتے رہے تھے۔مگر اس صبح میں نے جس جارحانہ انداز میں باتیں کی تھیں، ان کی روشنی میں سیمینار کا اصل مقصد ہی ختم ہوجاتا تھا۔انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ پچھلے پہر والے سیشن میں دوسروں کو بولنے کا موقعہ دوں۔

میں مسٹراوو راسٹریٹ کے آفس سے بھیگی ہوئی بلی کی طرح نکلا، اور سیدھا ڈائیننگ ہال میں پہنچا، جہاں پر ایک دوسری شکست میری راہ تک رہی تھی۔میری غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مارسل میری کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، جو مارلس کے پہلو میں تھی۔مجھے مجبوراً اس کی کرسی پر بیٹھنا پڑا۔میری میز کے دوسرے لوگ سویٹ ڈش کھا رہے تھے۔اور پیشتر اس کے کہ میں پہلا کورس ختم کرتا لوگ اٹھ کر جانے لگے۔میرے کھانا ختم کرنے تک مارلس اور مارسل کہیں باہر جاچکے تھے۔ میرا موڈ اس وقت یوں بھی کسی کے ساتھ باتیں کرنے کا نہ تھا۔ میں اپنے کمرے میں جاکر کپڑے بدلے بغیر بستر پر لیٹ گیا۔

جب میری آنکھ کھلی، تو شام کے کھانے کی گھنٹی بج رہی تھی۔گویا میں نے پچھلے پہر والا سیشن سوکر گنوادیا تھا۔ مسٹراوو راسٹریٹ ڈائیننگ ہال کے دروازے پر کھڑے میری راہ تک رہے تھے۔انہیں خیال گزرا تھا کہ میں نے ان کی بات کا برا منایا تھا، اس لیے پچھلے پہر والے سیشن میں شامل نہ ہوا تھا۔

وہ مجھے اپنے ساتھ اپنی میز پر لے گئے۔پھر ایک بار مارسل کو میری کرسی پر بیٹھنے کا موقعہ مل گیا تھا۔مسٹراوو راسٹریٹ کے ساتھ باتوں کا سلسلہ پھیلتا ہی چلاگیا اور کھانے کے ختم ہونے کے بعد دیر تک جاری رہا۔اس دوران میں سب لوگ ادھر ادھر بکھر گئے۔میں مارلس کو کہیں پر تلاش نہ کر پایا۔خدا جانے مارسل اسے کہاں پر لے گیا تھا۔

اس رات الوداعی پارٹی کا انتظام کیا گیا تھا، جس میں مجھے جادوگر کا رول کھیلنا تھا۔مجھے کالج کے زمانے کے دو چار کرتب آتے تھے، جو دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتے تھے۔ کسی نے مزاحیہ نظم لکھ رکھی تھی، تو دوسروں نے کوئی اور پروگرام پیش کرنا تھا۔نصف شب کے بعد ڈانسنگ پارٹی ہوئی تھی، جس کا اختتام اگلی صبح جاکر ہونا تھا۔اس رات کوئی بھی سونے کے موڈ میں نہ تھا۔مارلس ایک ایسے کونے میں بیٹھی ہوئی تھی جس کے ایک طرف دیوار تھی اور دوسری طرف مارسل بیٹھا ہوا تھا۔اس طرح میرے لئے مارلس تک رسائی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔

پھر مارلس کے دل میں خدا جانے کیا بات آئی کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پہلو میں آبیٹھی۔اس وقت پروگرام اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔آدھی رات ہونے والی تھی۔موسیقار اپنے اپنے آلات موسیقی کی ٹیوننگ میں لگے ہوئے تھے۔میں نے اس کونے پر نظر دوڑائی، جہاں پر مارلس اور مارسل ساری شام اکٹھے بیٹھے رہے تھے۔مارسل کی کرسی خالی تھی۔

مارلس نے کہا کہ اس نے اپنی ماں سے ملاقات پر بہت غور و فکر کیا تھا۔پہلے تو اس کو ماں پر غصہ آیا تھا کہ وہ اپنے خاوند اور بیٹی کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔مگر پھر اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ماں کا فیصلہ درست تھا۔اگر وہ اپنے خاوند کے پاس رہ گئی ہوتی تو ساری عمر مسٹر میکلین کی جدائی پر آنسو بہاتی رہتی۔اب اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اور اپنے کانوں

ے سنا تھا کہ اس نے مسز میکلین کے پہلو میں خوشی و مسرت کی زندگی گزاری تھی۔اس وجہ سے اس نے اپنی ماں کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ کیا تھا اور اگلے روز مارسل کے ساتھ بیلجیم جا رہی تھی۔

عین اس وقت بتیاں گل کر دی گئیں اور مارسل برتھ ڈے کیک اٹھائے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔اس پر ۲۵ پچیس موم بتیاں جل رہی تھیں۔سب نے کھڑے ہو کر "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" کا گانا گایا۔

اس روز مارسل کی پچیسویں سالگرہ تھی۔

وقت گزر ہی جاتا ہے

[illegible]

تمام دنیا کا امن نفرت میں اس طرح سے بٹا ہوا ہے
کہ جس طرف بھی نگاہ اٹھتی ہے
آگ اور خون کا تماشہ لگا ہوا ہے
اب آدمی، آدمی نہیں ہے
کہیں یہ دامن کی دھجیاں ہیں
کہیں کوئی آستیں نہیں ہے
سروں پہ کیا آسمان ٹھہرے
کسی کے پیروں تلے کہیں بھی زمیں نہیں ہے
وہ امن کے گیت گانے والے
کہاں گئے ہیں زمیں کو جنت بنانے والے
بہت خلا ہے
یہ زخم کب تک بھرے گا آخر
نیا زمانہ نئے دکھوں کا مداوا کب تک
کرے گا آخر

وقت گزر ہی جاتا ہے
لوٹ کے واپس کب آتا ہے
ایسی باتیں سوچ کے دل گھبراتا ہے
کن لفظوں میں سمجھائیں
ایک پہیلی آنکھوں میں لکھی ہے پڑھ لو
تم کو ویسے کیا بتلائیں
آنکھوں میں ٹھہری تحریریں
جانے کن خوابوں کی ہیں یہ تعبیریں
وقت گزر ہی جاتا ہے
لوٹ کے واپس کب آتا ہے
کب ٹوٹیں گی
پاؤں پڑی یہ زنجیریں
ایسی باتیں سوچ کے دل گھبراتا ہے
دل کا کیا ہے
یہ پگلا ایسی باتوں میں کب آتا ہے

شگفتہ طلعت سیما

۸۹/۵، رپن اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۱۶

چہرہ کیا ہے کہ پھول رکھتا ہے
ہر زباں میں ببول رکھتا ہے
ہر خوشی اپنی بانٹ کر وہ شخص
اپنے دل کو ملول رکھتا ہے
شعر اترتا ہے آسمانوں سے
کیسی شان نزول رکھتا ہے
باکمالوں میں نام ہے اس کا
خود کو جو بے اصول رکھتا ہے
کٹ چکا راستے سے پھر بھی وہ
اپنے چہرے پہ دھول رکھتا ہے
جی رہا ہے جو روز مر مر کے
اس پہ نظریں فضول رکھتا ہے
وہ غزل کیا کہے گا اے سیما
گفتگو میں جو طول رکھتا ہے

ریحانہ نواب

۱۴۷/۱- لور چیت پور روڈ،
گول کوٹھی امام باڑہ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳

اس کا غصہ بھی مجھے پیار لگے
اے خدا پھر نہ یہ آزار لگے

دل کو لے ڈوبے گا اشکوں کا بہاؤ
یہ وہ ناؤ نہیں جو پار لگے

دھوکہ کھاتے ہیں مگر کیا کیجئے
اس کا انکار بھی اقرار لگے

اب مریضوں کا خدا حافظ ہے
سب مسیحا مجھے بیمار لگے

خوب ہے شہر سخاوت اس کا
جس کو دیکھو وہی نادار لگے

اس پہ کیوں زلف کا سایہ ڈالوں
سر اٹھانا بھی جسے بار لگے

چھپ کے رو لیتے تھے ہم ریحانہ
اب تو یہ کام بھی دشوار لگے

آنکھیں لٹا رہی ہیں گہر تیرے بعد بھی
مرجھا سکا نہ زخم جگر تیرے بعد بھی

ٹھہریں کہاں کہ چھاؤں بلاتی نہیں ہمیں
کرتے ہیں دھوپ دھوپ سفر تیرے بعد بھی

وہ رنگ ہے سحر میں نہ وہ کیف شام میں
ہونے کو ہو رہا ہے گزر تیرے بعد بھی

تو خود نہیں مگر تری تصویر دل میں ہے
ہم نے سجا کے رکھا ہے گھر تیرے بعد بھی

حالانکہ تجھ سے ملنے کی امید بھی نہیں
رہتا ہے انتظار مگر تیرے بعد بھی

تو یہ سمجھ رہا تھا کہ میں ٹوٹ جاؤں گی
جاری ہے زندگی کا سفر تیرے بعد بھی

ریحانہ اپنا درد سنانے کے واسطے
اپنا لیا غزل کا ہنر تیرے بعد بھی

کوثر پروین

۲/۱ رپن اسکوائر
کلکتہ - ۱۶

پہلے دل لگا بیٹھے اب یہ فکر بھی ہوگی
آگ ہے اِدھر جیسی کیا اُدھر لگی ہوگی
دم بخود نہ ہو جاؤں دیکھ کر حسیں منظر
زندگی کی بانہوں میں جب کہ زندگی ہوگی
شام غم چلی آئے فکر اب نہیں مجھکو
داغِ دل کا ایسا ہے جس سے روشنی ہوگی
پوچھتی ہے مدت سے خامشی یہ کوثر کی
بے حسی کا عالم ہے کیسے شاعری ہوگی

کیدار شرما

6A, FERREIRA MANSION
SITLADEVI TEMPLE RD.
MAHIM, BOMBAY - 400016

میں اور میرا خدا

ایک دن دنیا کے ہنگاموں سے گھبرایا ہوا
دور ویرانے میں اک پیڑ کے نیچے تنہا
اپنے خاموش خدا سے تھا میں یہ پوچھ رہا:
" اے تماشائی ! یہ دنیا ہے تماشا کیسا ؟ "
یک بہ یک دل نے کسی چور کی آہٹ پائی
" کون ؟ " چونکا میں تو بولا " وہ ترا ہرجائی "
پیار سے اس نے کلیجے کو مرے تھام لیا
بولا " کیا بات ہے کیوں تو نے مرا نام لیا "
میں نے پوچھا کہ ہمیں دکھ ہی دئے جاتے ہیں ؟
میرے مولا نے کہا " سن تجھے سمجھاتے ہیں
سکھ اگر سکھ ہی رہے تب بھی تو گھبرا جائے
عیش وہ گھن ہے کہ لذت کو تری کھا جائے
کون مظلوم ہے اور کس پہ ستم ہوتا ہے
نا سمجھ ! میری چھری میرا گلا ہوتا ہے
تو سمجھتا ہے کہ سکھ چین سے میں سوتا ہوں ؟
ترے اشکوں میں مجسم میں نہاں ہوتا ہوں !
رہ الفت میں فنا ہونا مجھے بھاتا ہے
میرے پیارے تو اسی بات سے گھبراتا ہے
زندگی خواب نہیں - دیکھ - یہ بیزاری ہے
مرنا سونا نہیں پھر جینے کی تیاری ہے "

ہمت رائے شرما

2, Vishwa shanti Apts.
Ground Floor
Opp. 7 Bunglows, Garden Gate
Andheri, Versova, Bom - 400061

میں اور میرا خدا

میرے خدا۔
اے کاش! میں ہوتا تیرا خدا!!

کہتے ہیں سب کہ رب سا کوئی دوسرا نہیں
میرے لئے تو یہ بھی ابھی تک ہے ایک راز
میرے خدا ضرور ہے تیرا بھی اک خدا
کرتا ہے جس سے روز تو چھپ چھپ کے سازباز

تو جن کا راز دار ہے وہ تیرے راز داں
تو جن کا کارساز ہے وہ تیرے پاسباں
تو جن پہ مہربان ہے وہ تیرے مہرباں
تو ان کا میہمان ہے وہ تیرے میزباں

مفہوم بندگی ذرا اپنے خدا سے پوچھ
پھر راز زندگی کسی درد آشنا سے پوچھ
اک بار تو بھی دل تو کسی سے لگاکے دیکھ
دنیا میں رہ کے مہر و وفا آزما کے دیکھ

پیدا تو کر وہ ظرف جو ہر چوٹ سہہ سکے
لا وہ نظر جو کرسکے بندوں میں امتیاز
تو ہے خدا تو کیا ہوا میں بھی ہوں خود پرست
تو مجھ سے بے خبر ہے تو میں تجھ سے بے نیاز

بے شک مجھے دیا گیا احساس کمتری
لیکن نہ ہوسکے گی خوشامد کبھی تری
تیرے جہاں سے اے خدا بالکل جدا ہوں میں
میرا بھی اک جہان ہے جس کا خدا ہوں میں

ٹی ایس ایلیٹ کی نظم "THE HOLLOW MEN" کا ترجمہ

ف۔ س۔ اعجاز

کھوکھلے لوگ

(۱)

ہم لوگ کھوکھلے ہیں
بھُس لوگ ہم ہیں
بھوسا بھرے سروں کو
اک ساتھ ہیں جھکائے
افسوس، حیف، ہائے!

سرگوشیوں میں جب جب
ہم گفتگو کریں تو
آواز خشک اپنی
بے معنی اور خالی
جوں خشک گھاس میں سے
بوجھل ہوا گزرتی
یا خشک میکدے میں
جام شکستہ پر کچھ
چوہے پھدک رہے ہوں

بے ڈھب سی ایک صورت
بے رنگ ایک سایا
مفلوج ایک قوت
جامد کوئی اشارہ
سیدھی نگاہ والے
سیدھی نگاہ لے کر
اس پار موت کے جو
چپ چاپ جا بسے ہیں
ہم ان کو یاد آئیں تو ایسے یاد آئیں
گویا نہ تھے کبھی ہم پرجوش روح والے
ہم لوگ کھوکھلے ہیں
بھُس لوگ ہم ہیں

(۲)

وہ آنکھیں تاب جنکی
میں خواب ہی نہ لاؤں
خواب فنا کی حد میں
دیتیں نہیں دکھائی :
اس مملکت میں آنکھیں
ٹوٹے ہوئے ستوں پر
ہیں دھوپ کے دو ٹکڑے
اس مملکت کے اندر
اک پیڑ جھومتا ہے
گاتی ہوئی ہوا میں
آواز اور نغمے
تارے سے دور تر ہیں
گمبھیر بھی سوا ہیں
خواب فنا سے مجھ کو
نزدیک ہونے مت دو
مجھ کو پہننے دو تم
کچھ بھیس اس طرح کے :

چوہے کی کھال
زاغ کے پر
لکڑیوں کی چھال
کھیتوں کے ساتھ یعنی
میں بھی کروں سلوک وہی جو ہوا کرے
نزدیک ہونے مت دو
اس جھٹپٹے نگر میں
ملنا مرا تمہارا
کچھ آخری نہیں ہے

(۳)

مردہ زمین ہے یہ
یہ کیکٹس زمیں ہے
پتھر کے بت یہاں پر
ہوتے ہیں نصب ہردم
اک مردہ آدمی کے ہاتھوں کی منتوں سے

بجھتے ہوئے ستارے
کی جھلملاہٹوں میں
کیا موت کے ادھر کی
اک اور سلطنت میں
ممکن ہے ایسا ہونا؟
جس وقت ہم اکیلے
نرمی سے کانپتے ہوں
بوس و کنار والے
یہ لب دعا کے بدلے
ڈھل جائیں پتھروں میں؟

(۴)

آنکھیں یہاں نہیں ہیں
اس جا نہیں ہیں آنکھیں
دم توڑتے سسکتے تاروں کی وادیوں
میں
اک دوسرے کو اپنے ہاتھوں سے ہم
ٹٹولیں
ہونٹوں سے کچھ نہ بولیں
اس کھو کھلی زمیں پر
اس گمشدہ جہاں کی اجڑی ہوئی زمیں پر

اپنے ملن کی گویا اس آخری جگہ پر
چڑھتی ہوئی ندی کے ساحل پہ چپ
لگائے
ہم لوگ بے بصارت یونہی کھڑے رہیں گے
جب تک نہ لوٹ آئے
بینائی پھر ہماری
اور دائمی ستارہ
اس موت کے جہاں میں
نابینا جھٹپٹے کے
اوراق گل نہ پلٹے
ہر خالی آدمی کی
امید بس یہی ہے

(۵)

۱* ناشپاتیاں دینے والا خار دار اک پیڑ
جب ہوتی ہے صبح کی بیلا جب
ہوتی ہے بھور
گشت لگانے آجاتے ہیں ہم اس پیڑ
کی اور
ناشپاتیاں دینے والا خار دار اک پیڑ

ہے اک طرف تصور
اور اک طرف حقیقت
تحریک ایک جانب
اور اک طرف عمل ہے
دونوں کے درمیاں میں
پڑتا ہے ایک سایا

جس کا سبب اگر ہے
تو صرف اس قدر ہے
یہ تیری سلطنت ہے

ہے اس طرف تخیل
تخلیق اس طرف ہے
جذبہ اگر یہاں ہے
رد عمل وہاں ہے
دونوں کے بیچ لیکن
پڑتا ہے ایک سایا
کہ زندگی بڑی ہے

دکھ اور آرزو میں
یعنی وجود و جوہر
ہر دو کے درمیاں میں
روحوں میں اور ان کی
شان نزول میں بھی
پڑتا ہے ایک سایا
جس کی وجہ یہی ہے
کہ تیری سلطنت ہے

کہ تو ہے
زندگی ہے
تو ہی تمام و کل ہے

۲* اسی طرح مرتی ہے دنیا
اسی طرح مرتی ہے دنیا
کوئی دھماکہ شور کئے بن
ریں ریں کر کے مرجاتی ہے!

۱* و ۲ ایلیٹ نے ان دو بند کو الگ بحر میں نظم کیا ہے۔ یہ دو بند صوتی اور معنوی اظہار سے پس منظر کی آوازیں ہیں۔ اگرچہ اس کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔ میں نے بھی انہیں الگ وزن میں رکھا ہے (مترجم)۔

Aasi Kashmiri
788-Wood Borough Road
Nottingham. (U.K.)

عاصی کاشمیری کی ۱ غزل اور ۶ ماہیے

بھونرے کی طرح شخص جو ہرجائی بہت ہے
اب اس سے ملاقات میں رسوائی بہت ہے

کچھ بادہ پرستی نے بھی بدنام کیا ہے
کچھ عشق میرا باعث رسوائی بہت ہے

اب رنگ نظر آتے ہیں ہر سمت ہی بکھرے
موسم میں میرے حسن کی رعنائی بہت ہے

نکلے جو وطن سے تو کئی خواب تھے اپنے
اب لوٹ کے جانے میں بھی رسوائی بہت ہے

معصوم سے چہرے پہ نہ سرخی ہے نہ غازہ
یہ سادگی **عاصی** کو مگر بھائی بہت ہے

ماہیے

موسم بھی سیانا تھا
جب ساتھ تھے ہم دونوں
کیا خوب زمانہ تھا

زلفیں بھی سنہری ہیں
گوری تیری آنکھیں بھی
اک جھیل سی گہری ہیں

جب چھوٹے سے بچے تھے
وہ پیار محبت کے
جذبات بھی سچے تھے

ملنے کو بھی آتی ہے
جو تیری سہیلی ہے
وہ عشق جتاتی ہے

حالات کا مارا ہوں
تم تو نہ ہوئے میرے
میں پھر بھی تمہارا ہوں

جانا ہے مدینے کو
اک نور سے روشن کر
یارب میرے سینے کو

مجرم

کل اک جشن عام بپا تھا
بھیڑ بہت تھی
پل دو پل کے بعد اچانک
بات بات میں
بات بڑھی کچھ
بھگدڑ مچ گئی
کچل گیا
اک جسم لاغر
ٹوٹ گیا جیون کا ساغر
گلی گلی میں
ہوئی منادی
"کس کا آدمی ہے پہچانو"
اور میں چھپ کر اپنے گھر میں سوچ رہا ہوں
لاش پر اس کی،
کسی نے میرے نقش قدم
پہچان لئے تو؟

معصوم شرقی
مقام و پوسٹ: آر ایل بی لین
۲۴ پرگنہ (شمالی) ۷۴۳۱۹۴

بازیافت: ڈاکٹر حکم چند نیر مرحوم

مرسلہ: مانک ٹالا
G.K.MANAKTALA
E-10 Cenced Apartments,
Pall Hill Khar,
BOMBAY - 400 058.

جی۔کے۔مانک ٹالا

منشی پریم چند کی ایک نایاب کہانی

"داراشکوہ کا دربار"

منشی پریم چند ابتداء میں لگ بھگ دس سال تک اپنے مضامین اور کہانیاں " نواب رائے " کے نام سے شائع کراتے رہے۔ اس زمانے میں ان کی ایک کہانی نما تحریر " داراشکوہ کا دربار " ماہنامہ "آزاد" لاہور (جلد نمبر ۴ ۔ شمارہ نمبر ۳ ۔ ستمبر ۱۹۰۸ء) میں شائع ہوئی تھی۔ پریم چند کی یہ تحریر نایاب تھی ۔ بعض محققوں کو اس کا علم تو ضرور ہوا لیکن "آزاد" کے اس شمارے تک ان کی رسائی نہ ہو سکی ۔ غالباً ڈاکٹر جعفر رضا کے پاس اس کی ایک نقل موجود ہے ۔ انہوں نے پریم چند پر اپنی تحقیقی ہندی کتاب " پریم چند " اردو ہندی کتھا کار (ناشر: لوک بھارتی پرکاشن ۔ الہ آباد ۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۸۳ء) میں اس بات کی اطلاع دی تھی کہ انہوں نے پریم چند کی ۲۵ ہندی اور اردو نایاب کہانیاں حاصل کرلی ہیں اور کہ وہ انہیں "ہنس پرکاشن" الہ آباد سے ہندی میں "گپت دھن جلد سوم" کے نام سے شائع کرائیں گے ۔ ان کہانیوں میں " داراشکوہ کا دربار " بھی شامل ہے ۔ لیکن میری اطلاع کے مطابق یہ ہندی کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی ہے نہ ہی یہ کہانی ابھی تک پریم چند کی نایاب کہانیوں کے ہندی یا اردو مجموعے (یا الگ سے کسی جریدے) میں شائع ہوئی ہے ۔

۱۹۹۱ء میں ڈاکٹر حکم چند نیر یونیورسٹی گرانٹس کمشن (U.G.C) کے وظیفے پر کچھ تحقیقی کام کررہے تھے اور ملک کی مختلف لائیبریریوں کے چکر لگا رہے تھے ۔ میری استدعاء پر انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے یہ تحریر "آزاد" لاہور (مدیر: بشن سہائے آزاد) کے متذکرہ بالا شمارے سے زیراکس کرا کے مجھے ارسال فرمائی تھی ۔ میں نے پریم چند پر اپنی پہلی دو تحقیقی کتابوں " پریم چند اور تصانیف پریم چند " اور " پریم چند --- کچھ نئے مباحث " میں پریم چند کی چند نایاب کہانیاں اور مضامین شائع کرائے تھے ۔ اور اپنی تیسری تحقیقی کتاب " پریم چند --- حیات نو " میں پریم چند کی دو ایک دیگر نایاب تحریروں کے ساتھ یہ کہانی بھی شائع کرانا چاہتا تھا ۔ لیکن کتاب کی ضخامت بڑھ جانے کے باعث یہ تحریریں شائع نہ ہو سکیں ۔

ڈاکٹر شیلیش زیدی (اصل نام سید جعفر رضا زیدی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہندی کے معلم ہیں ۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ان کے مضامین شائع ہوتے ہیں ۔ پریم چند ان کی ایک ضخیم ہندی کتاب " پریم چند کی اپنیاس یاترا ۔نوملیا نکن " شائع ہو چکی ہے ۔ میرا قیاس ہے کہ ڈاکٹر زیدی کے پاس بھی اس کی ایک نقل موجود ہوگی ۔ کیوں کہ موصوف نے اتر پردیش اردو اکادمی کی طرف سے منعقد کردہ یوم پریم چند کے سیمی نار میں ایک مقالہ " پریم چند کے افسانے اور ان کا تہذیبی شعور " پڑھا تھا جس میں " ادارہ شکوہ کا دربار " سے ایک اقتباس پیش کیا تھا ۔ اکادمی نے سیمی نار کے سبھی مقالے " مقالات یوم پریم چند " کے نام سے شائع کئے تھے ۔ ڈاکٹر زیدی کا متذکرہ بالا مضمون بھی اس کتاب میں شامل ہے ۔

موصوف نے اپنے مقالہ میں پریم چند کو **فرقہ پرست اور متعصب** ثابت کرنے کے لئے ان کی کچھ دیگر تحریروں کے اقتباسات کے ساتھ اس کہانی کا ایک اقتباس بھی سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کیا تھا ۔ وہ سیاق سے الگ کیا ہوا اقتباس درج ذیل ہے ۔

" شہزادہ کہتا تھا کہ کیوں راجاؤں کی لڑکیوں سے شادی کی جائے ۔ کیوں نہ مغل خاندان کی لڑکیاں بھی راجاؤں سے منسوب کی جائیں ۔ اس نے خوب سمجھ رکھا تھا کہ ہندوستان کے لوگ اپنی لڑکیوں کی دوسری قوموں کے ساتھ شادی کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں اور یہ خیال اور بھی مضبوط ہوجاتا ہے جب ان کی لڑکیاں لی جاتی ہیں مگر مسلمانوں کی لڑکیاں دی نہیں جاتیں ۔ "

اس اقتباس کو پیش کرنے کے بعد موصوف فرماتے ہیں " درحقیقت یہ خیالات داراشکوہ کے نہیں بلکہ پریم چند کے ہیں...... "

ڈاکٹر زیدی کا یہ اقتباس اس اہم پراگرف کا ایک حصہ ہیں جس کی ابتداء پریم چند نے ان الفاظ سے کی تھی:

" اس قومی اتحاد کے لئے داراشکوہ کے ذہن میں بھی وہی بات آئی تھی جو اکبر کے ذہن میں ۔ یعنی کہ دونوں قوموں کے دلوں سے فاتح و مفتوح، غالب و مغلوب کا خیال اٹھ جائے ۔ دونوں دل کھول کر ملیں، آپس میں شادیاں ہوں، ربط ضبط بڑھے ۔ نہ کوئی ہندو رہے نہ کوئی مسلمان، بلکہ دونوں اہل ہندوستان ۔ دونوں میں کوئی علامت تمیز باقی نہ رہ جائے ۔ اس اتحاد کے معاملہ میں شہزادہ (داراشکوہ) اکبر سے بھی ایک انچ بڑھا ہوا تھا ۔ اکبر نے راجاؤں کی لڑکیوں سے عقد کیا تھا ۔ راجاؤں کو مناصب جلیلہ پر ممتاز کیا تھا ۔ ہندوؤں کے سر سے یہ جزیہ کا بوجھ اٹھا دیا تھا جو ان کو بوجہ ہندو ہونے کے دینا پڑتا تھا ۔ مگر شہزادہ کہتا تھا کہ...... (اس کے بعد ڈاکٹر زیدی کا پیش کردہ اقتباس اور اس کے بعد اسی پراگراف کا اہم آخری حصہ :

------ سچا میل جول اسی حالت میں ہوگا جب لڑکے اور لڑکی میں کوئی فرق باقی نہ رہ جائے ۔ اس نے خود مقدمۃ الجیش بننا چاہا تھا ۔ صرف موقعہ و محل کا متلاشی تھا " ۔

شاید ڈاکٹر زیدی پریم چند کی غلط اور یک طرفہ تصویر پیش کرنا چاہتے تھے ۔ اسی لئے انہوں نے نہ صرف سیاق سے کاٹ کر پریم چند کا یہ اقتباس پیش کیا بلکہ پریم چند کی یہ نایاب تحریر شائع کرانے کی ضرورت بھی نہ سمجھی ۔

میں یہ مکمل تحریر ڈاکٹر حکم چند نیر مرحوم کے شکریے کے ساتھ قاری کی خدمت میں پیش کرتا ہوں ۔ اس پوری تحریر سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ پریم چند فرقہ پرستی اور تعصب کی لعنت سے پاک تھے ۔ اس تحریر میں مغلوں (مسلمانوں) کی سلطنت کو نہ صرف " سلطنت ہند " لکھا ہے بلکہ مرہٹوں اور جاٹوں (جو کہ ہندو تھے) کی مفسدہ پردازی کا ذکر بھی کیا ہے ۔

(مانک مالا)

داراشکوہ کا دربار

اور مسلمانوں میں ربط ضبط یا اتحاد قائم نہ ہو جائے۔ وہ خوب جانتا تھا کہ جبر
سے سلطنت کی جڑ نہیں جمتی۔ استحکام و بقائے سلطنت کے لیے ضرورت ہے
اس کی کہ سلاطین پسندیدہ اصولوں اور منصفانہ قوانین سے رعایا کے دلوں میں
گھر کریں۔ دلوں میں گھر کرنا بہ نسبت پتھر کے مضبوط قلعوں کے زیادہ اہم ہے
رعایا کی محبت و جاں نثاری پر بہ نسبت افواج کے زیادہ بھروسہ کرنا چاہیے۔
داراشکوہ نے انہی اصولوں پر عمل کرنا شروع کیا تھا۔ اس نے ایک نہایت دلچسپ
و پر مغز کتاب تصنیف کی تھی جس میں براہین قاطعہ سے یہ ثابت کیا تھا کہ
مسلمانوں کے برقرار رہنے کا دارومدار ہنود کے اتحاد و اتفاق پر ہے۔ اس کی نظروں
میں بابا کبیر داس، گرو نانک جیسے آدمیوں کی بہت زیادہ وقعت تھی کیونکہ
وہ مذہب سے نوعِ انسانی میں تفرقہ ڈالتے تھے(?) بلکہ حضرات صلح کل کی
تعلیم دیتے تھے ۔

اس وقت ہندو مسلمان دونوں قومیں بمنزلہ دو بچوں کے تھیں۔ ایک
نے تو چند ہی دن ہوئے دودھ چھوڑا تھا۔ دوسرا ابھی شیر خوار تھا۔ داراشکوہ
کا خیال تھا کہ اس شیرخوار بچے پر دوسرے بچے کو قربان کر دینا مصلحت کے
خلاف ہے۔ گو اس کے دودھ کے دانت ٹوٹ گئے ہیں مگر اب وہ دانت
نکلیں گے جو نہایت زیادہ مضبوط ہوں گے۔ دانت نکلنے سے پہلے ہی چنے چبوانا
قرینِ عقل(?) کے خلاف ہے۔ کیوں نہ دونوں بچوں کی ساتھ ساتھ پرورش کی جائے
اگر ایک کو دودھ دیا جاتا ہے تو دوسرے کو اغذیہ لطیف کا استعمال کرایا
جائے ۔

اس قومی اتحاد کے لیے داراشکوہ کے ذہن میں بھی وہی بات آئی تھی
جو اکبر کے ذہن میں۔ یعنی یہ کہ دونوں قوموں کے دلوں سے تاریخ و منافرت(?)

غالب و مغلوب کا خیال اُٹھ جائے۔ دونوں گھل مل کر رہیں۔ آپس میں
شادیاں ہوں، ربط ضبط بڑھے، نہ کوئی ہندو رہے نہ کوئی مسلمان، بلکہ
دونوں اہلِ ہندوستان۔ دونوں میں کوئی علامتِ تمیز باقی نہ رہ جائے۔ اس
اتحاد کے معاملہ میں شہزادہ اکبر سے بھی ایک قدم بڑھا ہوا تھا۔ اکبر نے راجاؤں
کی لڑکیوں سے عقد کیا تھا۔ راجاؤں کو مناصب جلیلہ پر ممتاز کیا تھا۔ ہندوؤں
کے سر سے جزیہ کا بوجھ اُٹھا دیا تھا جو اُن کو بوجہ ہندو ہونے کے دینا
پڑتا تھا۔ مگر شہزادہ کہتا تھا کہ کیوں راجاؤں کی لڑکیوں ہی سے عقد کیا جائے
کیوں نہ مغل خاندان کی لڑکیاں بھی راجاؤں سے منسوب کی جائیں۔ وہ اس کو
خوب سمجھ سکتا تھا کہ اہلِ ہنود اپنی لڑکیوں کی دوسری قوموں کے ساتھ
شادی کرنا اپنی توہین و تذلیل سمجھتے ہیں اور یہ خیال اور بھی مضبوط ہو جاتا
ہے کہ جب اُن کی لڑکیاں لی جاتی ہیں مگر مسلمانوں کی لڑکیاں دی نہیں
جاتیں۔ میل جول اُسی حالت میں ہوگا جب لڑکے اور لڑکی میں کوئی
فرق باقی نہ رہ جائے۔ اُس نے خود مقصد ابلیس(?) بنا رکھا تھا۔ صرف موقع
و محل کا متلاشی تھا ۔

شہزادہ داراشکوہ ملکی مجتہد ہی نہ تھا۔ اس کے سر علم و فضیلت کی کلغی
بھی بندھی تھی۔ اس نے ہند کی کل مستند زبانوں پر عبور حاصل کر لیا تھا۔
خصوصاً سنسکرت سے تو اسے الفت سی ہو گئی تھی۔ گھنٹوں حسن سے(?) گیتا یا انجیل
یا گرنتھ کی فلاسفی بیٹھ کر پڑھتا اور غور کرتا اور روتا۔ علاوہ ایشیائی زبانوں کے اس نے
یورپ کی کئی زبانوں میں بھی مہارت بہم پہنچائی تھی۔ لاطینی، یونانی، عبرانی زبانوں
میں اچھی دستگاہ تھی۔ جدید زبانیں مثل فرانسیسی، انگریزی و جرمنی کی ابھی
اتنی ترقی نہ ہوئی تھی کہ اُن کی خوبی و لطافت دوسری قوموں کو فریفتہ کر سکتی۔

اُس کو اپنے اوپر مائل نہ کر سکیں۔ تاہم ان زبانوں سے وہ بالکل غیر مانوس نہ تھا
معمولی گفتگو سمجھ لیتا اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار بھی
کر لیتا۔ جب غور کیجئے کہ وہ ایسے وسیع ملک کی حکومت کرتا ہوا اس کے ساتھ
اپنی ذاتی تعلیم کے لیے ایسی کوششیں کرتا تھا تو حیرت معلوم ہوتی ہے
کہ اُس کے قُویٰ کیسے تھے اور ذہن کیسا! ۔

داراشکوہ اُس غلطی میں نہ پڑا جس میں اکبر پڑا تھا۔ اکبر کے مشیر یا تو ہندو
تھے یا مسلمان۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ فریقین میں برابر چشمک رہتی۔
اگر اکبر جیسا مستقل مزاج فرمانروا نہ ہوتا تو اُس جماعت کو ہرگز قابو میں نہ رکھ سکتا
جس میں مان سنگھ، ابوالفضل جیسے دل و دماغ کے لوگ تھے۔ صاف
ظاہر ہے کہ ایسے مشیروں کی رائیں کبھی غرض مندی سے خالی نہ ہوں گی۔ ہر ایک
اپنی ہی قوم کی طرف کھینچے گا۔ اس خوف سے شہزادہ نے اپنے مشیر فرنگیوں سے
لیے تھے۔ کیونکہ اُن کے اوپر جانب داری کا گمان نہیں ہو سکتا تھا۔ پہلے
اپنے صاحبوں(?) سے ہر ایک امر کی تحقیقات کرتا اور تب اپنے فرنگی مشیروں
سے رائے لے کر فیصلہ کرتا ۔

آج سہ پہر کا وقت ہے۔ شہزادہ داراشکوہ کا دربار خاص آراستہ ہے۔
مشیران صائب الرائے پر تکلف پوشاکیں پہنے دو رویہ مؤدب(?) استادہ ہیں۔
بیچ وسط میں ایک مرصع تخت ہے جس پر شہزادہ صاحب جلوس فرما ہیں۔
اُن کے چہرے سے غور و خوض عیاں ہے۔ ہاتھ میں ایک فرمانِ شاہی ہے۔
جس پر وہ رہ رہ کر مضطرب نگاہیں ڈالتے ہیں۔ اور پھر کچھ سوچنے لگتے ہیں۔
تخت کے جانب راست ہنری برنیئر(?) ایک جواہر نگار کرسی پر بیٹھا ہوا ہے
جو شہزادہ کا برگزیدہ مشیر ہے۔ اور اس کے بائیں کی بڑی وقعت کی جاتی ہے۔

بازیافت | منشی پریم چند کی ایک کہانی کا عکس

آزاد ۲۲ (۷) ستمبر ۱۹۰۱ء جلد ۲ نمبر ۳

ہنری بوزے کے بغل میں۔ دوسری مرصع کرسی پر آلِ ہیکا بیٹھا ہوا ہے۔ تخت کے بائیں جانب ڈاکٹر برنیر فرانسیسی سیاح ایک کرسی پر بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا ہے۔ اور اُس کے بغل میں ایک دوسری کرسی پر پادری جوزدیٹ پرتگالی سفیر متمکن ہے۔ تمام دربار میں غضب کی خموشی طاری ہے۔ دروازے چاروں طرف سے بند ہیں۔ مشیروں کی آنکھیں بار بار شہزادہ کی طرف اُٹھتی ہیں۔ مگر اُن کو خاموش دیکھ کر پھر نیچے گر جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد شہزادہ صاحب نے فرمایا "حضرات! شاید آپ لوگوں کو مہم قندھار کی تباہی کی خبر مل گئی ہو"۔

اس مختصر سے جملے نے حاضرین کے چہروں کے رنگ اُڑا دیئے۔ ہر شخص سناٹے میں آگیا۔ اور کئی منٹ تک کسی کو بولنے کی ہمت نہ پڑی۔ آخر ہنری بوزے نے فرمایا "خانہ زادوں کو اس خبر کے استماع سے سخت افسوس ہوا۔ ہم سلطنت کی سچے دل سے ہمدردی کرتے ہیں"۔

پادری جوزدیٹ "مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں ناکامی ہوئی۔ گولا اُتارنے والے سفوج کو ترتیب دینے والے تو زیادہ تر اہلِ فرنگ تھے۔ جن کے سروں پر حضرت مسیح کا سایہ تھا۔ ان کا ناکام رہنا خیال میں نہیں آتا"۔

یہ کہکر اُنہوں نے گلے سے مسیح کی ایک چھوٹی سی تصویر نکالی۔ اور اُس پر بڑے ادب کے ساتھ بوسہ دیا۔ اب ڈاکٹر برنیر کی باری آئی۔ پہلے اُنہوں نے حاضرین پر وہ نگاہ ڈالی جو راستی پسند کی ہوتی ہے۔ اور مسرت کو بھی بعد ازاں فرمایا "حضرات! آج پوچھیے تو مجھے اس مہم کی کامیابی میں پہلے ہی سے شک تھا۔ شہزادہ محی الدین اس کی قسمتوں کے مالک بننے کے قابل نہ تھے۔ اس لئے نہیں کہ اُن میں یہ قابلیت نہیں۔ بلکہ محض اس لئے کہ وہ اپنے تعصب کو دبا نہ سکتے تھے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ اس ناکامی کا باعث راجہ جگت سنگھ کی

آزاد ۲۳ (۸)

کنارہ کشی ہے"۔

اس کے بعد کئی منٹ تک سناٹا رہا۔

آخر شہزادہ صاحب نے خموشی کو یوں دور کیا۔ "حضرات! مجھے اس سے کوئی بحث نہیں کہ اس ناکامی کا کیا اصلی سبب ہے۔ اس امر کی چھان بین کرنا مناسب نہیں۔ آپ خوب جانتے ہیں۔ کہ ایسا کرنا دانشمندی کے خلاف ہوگا"۔

شہزادہ صاحب نے رُک رُک کر ان الفاظ کو ادا کیا۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس وقت یہ دل میں اُبھرنے والے خیالات سے پریشان ہو رہے ہیں۔ جیسے کوئی اندرونی کشمکش میں پڑا ہو۔ دل پہلے کہتا ہو بہتر ہے ایسا کر۔ مگر پھر پہلو بدل جاتا ہو۔ اپنی بات ختم کرکے شہزادہ نے حاضرین کو پُر معنی نگاہوں سے دیکھا۔ زبان سے جو کچھ ادا ہوا تھا آنکھوں نے ادا کر دیا۔

شہزادہ کا جواب پادری جوزدیٹ نے یوں دیا "جہاں پناہ! گستاخی معاف ہو۔ غلام کی رائے ناقص تو یہ ہے۔ کہ اس ناکامی کے اسباب کو ہر ایک پہلو سے غور کریں۔ خواہ یہ کتنا ہی ناگوارِ خاطر ہوا ہو۔ تاکہ آئندہ کے لئے اُن اسباب مزاحم کے دفعیہ کے لئے پیش بندیاں بھی کر لی جائیں۔ ناکامیابی ہم کو غلطیوں سے مُتنبہ کر دیتی ہے۔ اس لحاظ سے میری نگاہوں میں کامیابیوں کی اتنی وقعت نہیں۔ جتنی کہ ناکامیوں کی۔ بیشک دنیاوی تجربہ کا معلم ناکامی سے بڑھکر اور کوئی نہیں"۔

یہ کہکر پادری صاحب نے حاضرین پر ایک پُرناز نگاہ ڈالی۔ گویا اس وقت اُنہوں نے کوئی غیر معمولی کام کیا ہو۔ اور بیشک شہزادہ صاحب کی تقریر پر اعتراض جتانا معمولی کام نہ تھا۔ اُن کی صلاح سب کو پسند آئی۔ شہزادہ

آزاد آزاد ۲۴ (۹) ستمبر ۱۹۰۱ء

صاحب نے بھی اتفاق کیا اور فرمایا "پادری صاحب! آپ جو کچھ فرماتے ہیں بہت صحیح ہے۔ بیشک میں غلطی پر تھا۔ مگر شاید آپ نے میرے لہجے سے تا تو ضرور سمجھ لیا ہوگا۔ کہ مجھ کو یہ غلطی دیدہ و دانستہ کرنی پڑتی ہے۔ مجھ کو اس ناکامی کے اسباب کی تحقیق کرنے میں فی نفسہ کوئی اعتراض نہیں۔ مگر.... مگر بعض اوقات چشم پوشی کرنا ہی عین مصلحت ہے۔ خصوصاً اُس وقت جبکہ خاندان شاہی کے ایک رُکنِ اعظم کی عزت میں فرق آتا ہو۔ پس فی الحال ہم صرف اس امر کا تصفیہ کیا چاہتے ہیں۔ کہ آیا قندھار سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو جانا بہتر ہے؟ اس وقت تک قندھار کو دو مہیں جا چکی ہیں مگر دونوں کی دونوں ناکام رہیں۔ آپ سے مخفی نہیں۔ کہ ان دور دراز مہمات میں سلطنت کو کثیر التعداد صرفہ کا متحمل ہونا پڑتا ہے"۔

یہ سنتے ہی مشیران ارسطو نژاد پھر سر بزانو ہو گئے۔ مسئلہ بیشک نہایت اہم تھا۔ اور اُس کے حل کرنے کے لئے غور و خوض کرنے کی بھی ضرورت تھی پندرہ بیس منٹ تک تو سب کے سب استغراق کی حالت میں تھے۔ بعد ازاں مباحثوں شروع ہوا۔

ہنری بوزے "قندھار پر مغل بادشاہوں کا قبضہ کب سے ہے"؟

ڈاکٹر برنیر "شہنشاہ بابر کے عہد مبارک سے"۔

ہنری بوزے "باوجود اس مدت دراز کی حکومت کے وہاں اس خاندان کا تسلط نہیں رہا"۔

برنیر "اس کی وجہ یہی ہے۔ کہ شہنشاہ بابر کے بعد شاہان ہندوستانی معاملات میں اس قدر مشغول رہنے لگے۔ کہ قندھار پر کافی توجہ نہ دے سکے اس وجہ سے دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات روز بروز بگڑتے چلے گئے۔

۱۴

بازیافت | منشی پریم چند کی ایک کہانی کا عکس

بوزے "مختصراً اُس کے یہ معنے ہیں۔ کہ شاہان ہند کو قندھار سے اتنا فائدہ نہ تھا۔ کہ اُس کو بھی ہند کا ایک صوبہ سمجھ کر اُس پر کافی توجہ رکھتے اگر ایسا کرتے تو قندھار کبھی سر نہ اُٹھا سکتا" +

برنیر "بے شک شاہان ہند کا وقت زیادہ تر ہندو راجاؤں کو زیر کرنے اور صوبوں کے عناد و فساد کے فرو کرنے میں صرف ہوا کرتا تھا۔ حضرت عرش آشیانی نے البتہ ایک بار قندھار کو ایک مہم بھیجنی چاہی تھی۔ مگر چند در چند رکاوٹوں سے عاجز آکر ارادہ ترک کر دیا۔ یہ قطعی طور پر کہنا کہ شاہان ہند کیوں قندھار سے غافل رہے آسان نہیں۔ ممکن ہے کہ فاصلہ کے خیال نے باز رکھا ہو یا ناکامی کے خوف نے۔ یا خزانہ عامرہ کے افلاس نے" +

مال پیکاٹ "مگر کیا فی الحال وہی تردوات درپیش نہیں۔ دکن کی پیچیدگیاں ایسی بڑھ گئی ہیں۔ کہ اُن کا سُلجھانا اب بہت مشکل ہے اور اس کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ فتح دکن فتح قندھار سے بدرجہا اہم ہے۔ ہند و قندھار کے درمیان جو فاصلہ تھا وہ جوں بھر بھی کم نہ ہوا۔ اور ناکامی کا خوف اب ہمیشہ سے زیادہ ہے۔ کیونکہ اب تہران ایران بھی قندھار کی مدد پر کمربستہ ہے" +

پادری جوزریٹ "درست فرمایا۔ مگر اب تخت ہند پر وہ بادشاہ نہیں جس کو فاصلہ یا ناکامی کا خوف اپنے ارادہ سے باز رکھ سکے۔ شاہان سابقہ کے زمانہ میں ہند کی سلطنت طفولیت میں تھی۔ اب اُس کا شباب جوشوں پر ہے۔ اُس زمانہ میں ہند پر حضرت مسیح کی برکت نہ نازل تھی صاحبقران ثانی مدظل اللہ تعالیٰ کے فرق مبارک پر تو مسیح نے اپنے

ہاتھوں سے شوکت کا تاج رکھدیا ہے" +

اس پُرزور دلیل پر شہزادہ دارا شکوہ کے لبوں پر بھی خفیف سی مُسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ ڈاکٹر برنیر جو دو تین منٹ سے غور میں تھے بولے "حضرات! سلطنت کی بقا کے لئے ضرورت ہے۔ کہ مخالف قوتیں اُس کا لوہا مانیں۔ اُس کی وقعت کا دوسرے کی نگاہوں میں کم ہو جانا اُس کے لئے زہر قاتل ہے اگر مخالفین کے دلوں میں اُس کی ہیبت قایم ہو جائے۔ تو پھر سلطنت اٹل ہے تا وقتیکہ اندرونی عوارض اُس کی تباہی کا باعث ہوں کن کی پیچیدگیاں بڑھتی ہی جاتی ہیں۔ مرہٹوں نے مفسدہ پردازی پر کمر باندھی ہے۔ جاٹوں نے بھی کچھ سر اُٹھایا ہے۔ پس یہ وقت سلطنت ہند کے لئے نہایت نازک و خطرناک ہے۔ اس نازک وقت میں قندھار سے غافل ہو جانا ان مفسدوں کو شیر بنا دے گا۔ اگر صاحبقران ثانی نے علی مردان خان کو پناہ نہ دی ہوتی۔ اور قندھار کو دو مہمیں روانہ نہ ہو چکی ہوتیں۔ تو اس وقت اُس ملک سے کنارہ کش ہو جانے میں چنداں نقصان نہ تھا۔ مگر جب دنیا پر یہ ظاہر ہو گیا کہ شہنشاہ ہند قندھار پر تسلط جمانا چاہتے ہیں۔ اور اس کام پر آمادہ ہیں۔ تو پھر اس ارادہ سے ہٹنا سلطنت کے لئے نہایت خطرناک ہے۔ اب تو ہند کا یہ مقولہ ہونا چاہئے کہ لڑیں گے۔ مریں گے۔ مگر قندھار کو نہ چھوڑینگے اگر اس وقت قندھار سے دست بردار ہو گئے تو مرہٹوں کو قطعاً یہ خیال پیدا ہوگا۔ کہ اگر ہم بھی اسی طرح فساد برپا کرتے رہیں۔ تو قندھار کی طرح خود مختار ہو جائیں گے۔ شاہان دکن کو ہماری قوت کا اندازہ ہو جائیگا۔ سوائے ایران سمجھیگا۔ کہ ہند میں اب دم نہیں تو وہ قندھار سے ہوتا کابل تک چلا آئیگا کیا تعجب ہے۔ ہند کی طرف بھی رخ کرے۔ پھر تو کابل کے افغان بلا سر

اٹھائے ہر گز نہ مانیں گے۔ خلاصہ یہ کہ ہم قندھار سے اس وقت منہ پھیرنا نہایت خطرناک ہے" +

ڈاکٹر برنیر کی گرم و مصلحت آمیز تقریر نے ناظرین پر خوب اثر پیدا کیا۔ شہزادہ صاحب تو سکتے میں آگئے۔ انھوں نے ابھی تک نہ سوچا تھا۔ کہ قندھار سے کنارہ کش ہو جانے سے کیا کیا نتیجے پیدا ہوں گے۔ کیا کیا دشواریاں سامنے آئیں گی۔ اب ڈاکٹر برنیر کی زبان سے اس انجام کی کیفیت سُن کر اُن کے ہوش اُڑ گئے۔ پاپے ہنری بوزے کی اس تقریر نے دل کو کچھ ڈھارس دی۔ "حضرات! ڈاکٹر برنیر صاحب ایک غلط فہمی میں پڑ گئے۔ اُن کو شاید نہیں معلوم کہ سلطنتوں کو اپنا سکہ بٹھانے کے لئے محض فوجوں کی ضرورت نہیں۔ ایسی سلطنتیں جن کا دارومدار حربہ و ہتھیار پر ہوتا ہے۔ عرصہ تک قایم نہیں رہتیں۔ بلکہ ضرورت ہے اخلاقی قوت کی۔ تاکہ رعایا کے دل میں اُس کے جانب سے کوئی بدگمانی نہ پیدا ہو۔ سلطنت کا ہر ایک قول و فعل انصاف و راستی کی تائید میں ہو۔ کوئی اُس کو حریص و طامع نہ سمجھے۔ جب تک سلطنت اس معیار کو نظروں کے سامنے نہ رکھے گی۔ اُس کا رعب نہ تو دلوں میں جمے گا اور نہ دوسری مخالف طاقتیں اُس کا لوہا مانیں گی میں مانتا ہوں کہ سلطنت کو اولوالعزم ہونا چاہئے۔ تاکہ رعایا کے دلوں میں بھی جوش پیدا ہو۔ اپنے حاکموں سے اولوالعزمیوں کا سبق سیکھیں۔ مگر یہ خیال رہے کہ اولوالعزمیاں بیجا نہ ہوں۔ بیجا اولوالعزمی اور حرص دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ میں ایک تمثیل دیکر سمجھایا چاہتا ہوں کہ جا اور بیجا اولوالعزمی سے میری کیا مراد ہے۔ یورپی اقوام آج بڑی سرگرمی سے جہاز بنا رہی ہیں۔ فوجوں کی تعداد روز بروز افزوں ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان جہازوں پر دور دراز ملکوں کا سفر کیا جاتا ہے۔ ان ملکوں سے تعلقات پیدا کئے جاتے ہیں۔ خواہ تجارتی ہوں یا

بازیافت | منشی پریم چند کی ایک کہانی کا عکس

نکلی۔ نوآبادیاں قایم کی جاتی ہیں۔ اس کو میں بیشک اولوالعزمی کہتا ہوں۔ لیکن جب کسی کمزور قوم یا طاقت کو بزور شمشیر مغلوب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تو میں اُس کو بیجا اولوالعزمی کہتا ہوں۔ کیونکہ ناحق و ناراستی اُس کے پردے میں چھپی ہوتی ہے۔ اب آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ سلطنت ہند کا قندھار کو ہم بھینا بجا ہے یا بیجا۔ میں کہتا ہوں بیجا ہے۔ سراسر بیجا اور سخت افسوس کا مقام ہے کہ سلطان کا بھی یہی خیال ہے۔ گو اُس کی آوازیں آپ کے کانوں تک نہیں پہنچتیں آپ خود سمجھئے کہ اس خیال کا پیدا ہونا کیسا خطرناک ہے کیونکہ جب دوسری ریاستیں دیکھیں گی۔ کہ ہند تمامی یا کشور کشائی پر آمادہ ہے تو وہ حفظ ماتقدم کے طور پر اپنی فوجیں بھی بڑھائے گی۔ اور کیا تعجب ہے کہ باہم متفق ہو کر ہندوستان ہی پر چڑھ دوڑیں۔ جہاں پناہ! ڈاکٹر برنیر صاحب نے فرمایا کہ ہندکا اب یہ قول ہونا چاہئے کہ دوڑیں گے۔ مریں گے مگر قندھار نہ چھوڑیں گے۔ یا انکے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں۔ میں اُن کی اجازت سے چند الفاظ اور بڑھائے دیتا ہوں یہی کہ ہم کو نہ چھوڑیں گے بلکہ نہ چھوڑیں گے یا ساری دنیا زیر و زبر ہو جائے مگر قندھار کو نہ چھوڑیں گے دنیا بھر متفق ہو جائے۔ ہم مٹی میں مل جائیں مگر قندھار ہم سے نہ چھوٹے گا۔ حضرات خود تو سمجھئے یہ مصلحت ہے! ایک چھوٹے سے صوبے کے لئے ایک عظیم الشان سلطنت کو خطرے میں ڈالنا! میں یہ نہیں کہتا کہ خطرہ نزدیک ہے۔ مگر خطرہ سر پر بھی ہو تاہم ڈاکٹر صاحب کے قول کے مطابق ہندوستان کو جان پر کھیل جانا چاہئے تھا۔ یہ مصلحت کی نہیں مصلحت کی اُسے کہتے ہیں کہ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔ ما کر آپ نے دوبارہ قندھار کو ایک زبردست ہم روانہ کی۔ فرض کیجئے معاملے طول کھینچا۔ سلطان ایران اپنی پوری طاقت سے آ دھمکا۔ تو اکبر کو کمک کی ضرورت ہوئی اس طرح آٹھ مہینے گذر گئے۔ نویں مہینے میں جب برف پڑنے لگی تو اکبر مجبوراً ہٹا۔ اور غنیم نے اُس موقع سے خوب دل کھول کر فائدہ اُٹھایا۔ بتلائیے بجز ذلت و خواری و ناکامی کے کیا ہاتھ لگا! آپ کہیں ہم پوری طاقت سے قندھار پر چڑھیں گے اور آٹھ مہینے کے اندر ہی اُس پر قابض ہو جائیں گے۔ آپ پوری طاقت سے بڑھ گئے۔ ادھر ایل دکن اور مرہٹے اور اعجاز جو جاری ذرا ذرا سی نقل و حرکت کی ٹوہ لیا کرتے ہیں۔ موقع میدان خالی دیکھ کر آ دھمکے بتلائیے۔ اُس وقت ہند کی سلطنت کیا کریگی۔ کیا قلعہ کی دیواریں لڑیں گی! یا تم کچھ نفع والے متصدی یا سوداگر بیچنے والے سوداگر؟ جہاں پناہ! میں ڈاکٹر صاحب سے اتفاق کرتا ہوں کہ سلطنت کو اپنا سکہ بٹھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ بیشک اگر اُس کی دھاک بندھ جائے تو بہت مفید ہے مگر کیا اس کے لئے سلطنت ہی کو معرض خطر میں ڈالنا مصلحت ہے؟ اگر بک کی اصلی طاقت کو ضرر پہنچائے بغیر آپ اپنا رعب جما سکتے ہیں تو شوق سے جمایئے مگر میں ایک بار نہیں سو بار کہوں گا۔ کہ اگر ایسا کرنے سے ملک کمزور ہوتا ہو تو اس کا خیال ہی نہ کیجئے۔ دو مرتبہ کا ناکام رہنا صاف ثابت کرتا ہے کہ قندھار کا فتح کرنا مشکل نہ لا نہیں۔ دول دکن کا قریب قریب آدھی صدی کی خونریزیوں کے بعد بھی مقابلہ کے لئے تیار رہنا اُن کی اندرونی طاقت کا بیّن ثبوت ہے۔ میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ سلطنت ان دونوں صعب دشمنوں کا مقابلہ ایک ساتھ نہیں کر سکتی۔ قندھار اور دکن دونوں پر فتح پانا محال ہے۔ ان میں سے ایک مہم چھوڑ دیجئے قندھار یا دکن۔ میری صلاح یہ ہے کہ دکن کو قندھار پر ترجیح دیجئے۔

جہاں پناہ! میرا خیال ہے کہ دنیا کی ہر ایک نامور قوم کا زوال اسی وجہ سے ہوا کہ اُس نے اپنی کل سکت سے بڑھ کر پاؤں پھیلانے کی کوشش کی۔ ہنڈیاں ابلنے والی حرص و طمع کے حد تک پہنچ گئیں۔ میرا سیدونانی ساطانیہ روم ہر ایک نے مقدور سے زیادہ پاؤں پھیلائے۔ محض جنگی قوت مندور شمشیر سے وہ دور دراز ملکوں پر قابض ہونا چاہا۔ مگر کیا نتیجہ ہوا۔ اُن کو زیر کرنے کے کام میں اپنی طاقت کو کھو بیٹھے کہ نہ صرف اپنے مقبوضات ہی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ بلکہ اپنے گھر کی بھی خبر نہ رہی۔ اُن کا نام صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے مٹ گیا۔ ہند کیوں اُس غلطی میں پھنسے۔ کیوں نہ دوسری قوموں سے عبرت حاصل کرے؟ ہندوستان کا ملک بہت وسیع ہے اگر ہندوستان کی آبادی پچیس برس میں بھی دگنی ہو جائے۔ تو صدیوں تک تنگی کی شکایت نہ سننے میں آئے گی۔ قندھار کو مالک محروسہ میں شامل کرنا مصارف جنگی کو دوچند کرنا ہے۔ کیونکہ وہاں کی کوہستانی قومیں ہمیشہ عناد و فساد کا بازار گرم رکھیں گی۔ اور ان شورشوں کو زیر کرنے کے لئے ایک زبردست فوج رکھنی پڑے گی۔ پس محض سلطنت کو وسیع کرنے کے خیال سے قندھار پر حملہ آور ہونا یا مہم روانہ کرنا میری دانست میں مناسب نہیں۔

ڈاکٹر برنیر۔ اس وقت خیالات کے مابین فرق تھے۔ انھوں نے مفہری بوزے کے اعتراضوں کی تردید کرنے کے لئے چند نوٹ لکھے تھے۔ اُنکے چہرے سے جوش یا بیصبری صاف ظاہر ہوتی تھی۔ لوگوں کی نگاہیں اُن کی طرف لگی ہوئی تھیں کہ دیکھیں اب یہ کیا جواب دیتے ہیں۔ آخر کئی منٹ کے تامل کے بعد یہ کہ حضرات! مجھے کمال افسوس ہے کہ اس وقت مجھے چند نامرغوب سچائیوں کا اظہار کرنا پڑا ہے اگرچہ کڑوی سچائیاں بہت کم مرغوب ہوتی ہیں۔ امید ہے کہ آپ لوگ مجھے معاف فرمائیں گے میرے شفیق قدردان مفہری بوزے صاحب نے فرمایا کہ حکومت کا قیام دوام اخلاقی اثرات پر مبنی ہے نہ کہ طبعی اثرات پر۔ جس کے یہ معنے ہیں کہ اے شاہانِ عالم تمہیں یہ رعب و دبدبہ کس لئے؟ یہ جنگ و جدل کس لئے؟ یہ پیدل و سوار کس لئے؟ ان کو جہنم میں جھونکئے۔ خدا پرست۔ متقی۔ مقدس آپ بن جایئے اور گوشہ عزلت میں بیٹھ کر شارع عام پر کھڑے ہو کر وعظ کیا کریں۔ بس! اللہ اللہ خیر صلا۔ پھر دیکھئے

بازیافت | منشی پریم چند کی ایک کہانی کا عکس

بازیافت | منشی پریم چند کی ایک کہانی کا عکس

تو کیسے زمانے میں حکومت چلتی ہے" تعجب ہے کہ مسٹر لونسے صاحب باوجود وسیع تجربہ ہونے کے ایسی فاش غلطی میں پڑ گئے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جو اصول اُنھوں نے بیان کیا وہ غلط ہے۔ ہرگز نہیں۔ وہ بہت صحیح ہے۔ مگر اصولوں کی درستی اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ عملاً تمام ضروریات کو رفع کر سکتی ہیں۔ شاید صاحب موصوف جس وقت یوٹوپیا Utopia کا خواب دیکھ رہے تھے وہ بھول گئے تھے کہ اوتوپیا کا وجود خواب ہی تک محدود ہے۔ اور یہاں اُس کا ذکر کرنا لا حاصل ہے میں مسٹر لونسے سے پوچھتا ہوں خدا نے نیکی کے ساتھ بدی بھی پیدا کی تھی اُن کا جواب ہوگا "نہیں"۔ خدا نے نیکی پیدا کی۔ نیکی کی غیر موجودگی بدی ہے باوجود اس کے یہ دیکھئے بدی ہی کی گرم بازاری ہے۔ نیکی اور بدی میں پہلی لڑائی جو باغ عدن میں ہوئی اُس میں بھی میدان بدی ہی کے ہاتھ رہا۔ دنیا میں مشکل بیکر دس ڈھونڈھیئے تب بھی مشکل سے اتنے نیک آدمی ملیں گے جو ایک شہر آباد کر سکیں۔ ساری دنیا بدی سے بھری ہوئی ہے۔ ایسی حالت میں کیونکر ممکن ہے کہ کوئی حکومت قائم رہ سکے تاوقتیکہ وہ سرکشوں، مفسدوں، باغیوں، ظالموں کی سرکوبی کے لئے ہمیشہ آمادہ نہ رہے۔ ہماری خدا سے دعا ہے کہ مسٹر لونسے کسی ملک کے بادشاہ ہوں اور اپنے اصولوں پر عمل کر کے تمام دنیا کو سبق دیں کہ حکومت اخلاقی اثرات پر کیونکر قائم رہتی ہے ✦

جہاں پناہ! کون نہیں جانتا کہ بنی نوع انسان کے فرائض جدا جدا ہیں۔ باپ کا فرض بیٹے کے فرض سے جدا ہے۔ باپ کا فرض بیٹے کی تعلیم و تربیت۔ خورش و پوشش اور دیگر ضروریات کا مہیا کرنا۔ اور بیٹے کا فرض ہے والدین کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا۔ بادشاہ کا فرض عوام کے فرض سے بالکل جدا ہے۔ رعایا پروری و عدالت گستری بادشاہوں کے اعلیٰ ترین فرائض ہیں۔ اور اطاعت و

شکر گزاری رعایا کے۔ اگر باپ اپنے بیٹے کو مارے کوئی اُس کو بُرا نہیں کہہ سکتا مگر بیٹے کا باپ کی شان میں ایک سخت کلمہ بھی نکالنا کفر ہے۔ اگر عام افراد بلا اجازت ایک دوسرے کی چیزیں لیویں تو اس کو سرقہ یا رہزنی کہینگے۔ مگر ایک بادشاہ کا بغرض ملک گیری دوسرے بادشاہ پر حملہ کرنا ہرگز ہرگز ناجائز نہیں۔ توسیع مملکت تو بادشاہوں کا سب سے اہم فرض ہے۔ کہ رعایا پروری اس کا ایک خاص جُز ہے۔ توسیع مملکت سے تجارت کو فروغ ہوتا ہے۔ صنعت کو ترقی ہوتی ہے۔ رعایا کا جوش قومی بڑھتا ہے۔ حب الوطنی پیدا ہوتی ہے۔ اپنی قوم کے کارناموں پر ناز ہوتا ہے۔ کیا یہ سب اہم اور مفید نتائج نہیں ہیں۔ دعل تدریہ کی بربادی کو توسیع مملکت سے منسوب کرنا دانشمندی کے خلاف ہے۔ روم و ایران و یونان کا نام اس وجہ سے نہیں مٹا کہ اُنھوں نے اپنے مقبوضات کو وسعت دی بلکہ اس وجہ سے کہ اُن میں کاہلی۔ بزدلی۔ آرام طلبی۔ نفس پرستی اور بداعمالی کا زور ہو گیا۔ وہ فطرت کے اُس قانون سے متاثر ہوئے جس کو انتخاب فطرت کہتے ہیں۔ آغاز دنیا سے تمام جانداروں میں وہ کھینچا کھینچی۔ وہ کشمکش جاری ہے جس کو مصاف ہستی کہیں تو نازیبا نہ ہوگا۔ اس مصاف ہستی میں زبردستوں کو فتح ہوتی ہے۔ اور جو ضعیف و ناتواں ہیں وہ شکست پاتے ہیں اور اُن کا نام ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے نقش باطل کی طرح مٹ جاتا ہے۔ اس قانون کا اثر انسان و حیوان سب پر یکساں پڑتا ہے۔ جانوروں کی صدہا قسمیں معدوم ہو گئیں۔ اور صدہا بڑی بڑی قومیں بے نام و نشان۔ کیونکہ ایک خاص مدت کے بعد ہر ایک قوم میں وہ عوارض پیدا ہو جاتے ہیں جو دولت و ثروت و حشمت و شوکت کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ علاوہ اسکے زمانہ کی رفتار ترقی پر ہے۔ اور جب کوئی قوم ایک مدت دراز تک قائم رہتی ہے تو اس میں

بے اختیاری طور پر قدامت کی بو آنے لگتی ہے۔ اور چونکہ اسلاف پرستی ایک خاصہ انسانی ہے۔ یہ قوم اپنے رسم و رواج۔ تمدن و طرز معاشرت میں ایسی ترمیمیں نہیں کر سکتی جو موجودہ زمانہ کے موافق ہوں۔ آخر نئی نئی قومیں اُٹھ کھڑی ہوتی ہیں جن کا جوش تازہ ہوتا ہے۔ پُرانی قومیں اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتیں کیا مسٹر لونسے کا یہ منشا ہے۔ کہ ہندوستان اس مصاف ہستی سے منہ پھیر کے اور بزدل بن جائے۔ اور دوسری نئی قوموں کا شکار بنے؟ دیکھئے آج کل یورپ میں زندہ رہنے کی لڑائی کیسے سرگرمی سے لڑی جا رہی ہے؟ اپنی اپنی سلطنت بڑھانے اور ہاتھ پاؤں پھیلانے کے لئے دل و جان سے کوشش ہو رہی ہے۔ جہاز بنائے جا رہے ہیں اُن پر ہزاروں میل کا خطرناک سفر طے کیا جا رہا ہے۔ روپے کوڑیوں کی طرح پھونکا جا رہا ہے۔ اور آدمیوں کی جانیں نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کی جا رہی ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ نو آبادیاں قائم کی جائیں۔ ملک کی تجارت کو وسعت ہو۔ دولت میں افزونی ہو۔ اور ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے جگہ نکلے۔ دو صدیوں میں فرانس کی آبادی چوگنی ہو جائے گی۔ اُس کے لئے معیشت کا کیا سامان ہوگا۔ اگر ابھی سے پیش بندیاں نہ کی جائیں گی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہندوستان کو فی الحال تنگی محسوس ہو رہی ہے۔ نہیں ابھی بہت سے وسیع خطے بالکل غیر آباد ہیں۔ مگر جلد یا دیر میں یہاں بھی تنگی ضرور بالضرور محسوس ہوگی۔ آبادی کی افزونی ایک فطرتی قانون ہے۔ اس کو کوئی روک نہیں ہو سکتا کیوں نہ ہندوستان یورپی اقوام کی تقلید کرے۔ اور ابھی آئندہ کے لئے کوشش کرے۔ آنے والا زمانہ موجودہ زمانہ سے زیادہ قیمتی سمجھا جاتا ہے" ✦

جس وقت ڈاکٹر برنیا اپنی جگہ پر بیٹھے تو اہل مجلس نے تعریفوں کی بوچھا

کردی۔ خصوصاً شہزادہ صاحب کو اُن کی تقریر نہایت پسند آئی۔ فوراً تخت سے اُتر کر اُسے ہاتھ ملایا۔ ہنری بونزے صاحب دِل ہی میں کٹے جارہے تھے وہ سمجھتے تھے۔ کہ ڈاکٹر بربیر کی توقیر میری درپردہ توہین ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب اُن سے بہت کم اختلاف کیا کرتے تھے۔ اور اگر کرتے بھی تھے تو منہ کی کھاتے تھے۔ مگر اس وقت پالا انہیں کے ہاتھ رہا۔ چند منٹ کی خموشی کے بعد بھی جب ہنری بونزے صاحب جگہ سے نہ ہلے تو پادری جوزیٹ نے یوں دُرافشانی کی: "حضرت! میرے دانست میں مہذب اقوام کا فتوحات سے ہرگز یہ منشا نہیں ہونا چاہئے۔ کہ اپنے ہی ملک کا فائدہ سوچیں۔ اپنے ہی ملک کو دولت سے مالامال و نہال کریں۔ اور محض اپنی ہی مطلب براریوں کے لئے غیر قوموں کے گلے میں فرمانبرداری کا طوق پہنائیں۔ بلکہ ان فتوحات سے مفتوح قوموں کا فائدہ مدنظر ہونا چاہئے۔ یونان کے فتوحات نے یونان کی صرف شہرت نہیں بڑھائی۔ مگر اُس کی مفتوح قوموں میں علم و تہذیب صنعت و حرفت و فنون لطیفہ کی بنیاد ڈالی۔ سارا یورپ نہیں بلکہ ساری دنیا نے یونان ہی کے مدرسہ تہذیب میں تعلیم پائی ہے۔ یونان نے پہلے پہل دنیا کو اصول سیاست سکھائے۔ فلسفہ اور منطق۔ علم عروض و کیمیا۔ علم علاج و علم موسیقی سب اِسی یونانی ذہن کے کھلونے ہیں۔ آج یورپ میں یہ آنکھوں کو چوندھیا دینے والی روشنی کہاں ہوتی۔ اگر یونان نے اپنی تہذیب کی مشعل سے اُس گھٹا ٹوپ اندھیرے کو دور نہ کر دیا ہوتا۔ یونان کی تاریخ اُن قربانیوں سے بھری پڑی ہے جو یونانیوں نے دوسروں کو مہذب بنانے کے لئے کیں۔ اطالیہ کی فتوحات نے دنیا پر وہ احسان کیا جس کو وہ ابد تک کبھی فراموش نہیں کر سکتی جس نے مہذب کا فرض کو آدمی بنایا جس نے دنیا کی نجات کا دروازہ کھولدیا

حضرت! وہ کونسا احسان ہے؟ وہ یہ ہے۔ کہ اطالیہ نے مسیح کے مشن کو ساری دنیا میں پھیلایا۔ مسیحی روشنی سے کفر کی تاریکی کو دور کیا۔ اٹلی ہی وہ سرچشمہ ہے جس سے روحانی تشنگی کو بجھانے والا پانی نکلا ٭

جہاں پناہ! کون کہتا ہے۔ کہ اٹلی کا نام و نشان مٹ گیا؟ کون کہتا ہے کہ اطالیہ کی سلطنت نیست و نابود ہو گئی۔ آج کی دنیا ایک بڑی اٹلی ہے اور دنیا کی تمام سلطنتیں اٹلی کا نام روشن کر رہی ہیں۔ اگر کسی عہد میں اطالیہ کی بادشاہت انتہائے عروج پر پہنچی ہوئی تھی تو آج فلک چہارم تک پہنچی ہوئی ہے۔ ہر ایک قوم کا تمدن۔ اخلاق و آداب۔ اصول سلطنت جو آج دنیا میں رائج ہیں۔ اٹلی ہی کی ٹکسال سے ڈھلکر نکلے ہیں۔ حتےٰ کہ یونان کا ہم پر جو اثر پڑا ہے وہ بھی اٹلی ہی کا طفیل ہے۔ آج لاطینی جو اطالیہ کی زبان ہے۔ دنیا کی مہذب اقوام کی پاک زبان ہے ٭

ایشیا میں خدا نے ہند کو علم و تہذیب کا خزانچی بنایا ہے۔ اور اب کچھ دنوں سے یہی انمول جواہرات بھی اُس کو سپرد کئے جانے لگے ہیں۔ پس اُس کا فرض ہے کہ دوسری ایشیائی قوموں کو اپنی دولت سے فیض بخشے۔ دل کھول کر اُس خزانہ کو صرف کرے۔ سیر چشمی دکھائے۔ فیاضی کا ثبوت دے۔ اگر اس بے انتہا دولت سے خود فائدہ اُٹھائیگا تو خود غرض کہلائیگا آنیوالی نسلیں اُس پر بخل کا الزام لگائیں گی۔ اگر وہ تہذیب کا پیالہ خود پئے گا۔ اور دوسری قوموں کو اُس سے محظوظ نہ ہونے دے گا۔ تو اُس پر تم پروری کا الزام لگایا جائے گا پس اُس کا فرض ہے کہ قندھار کو یہ پیالہ پلائے۔ اصل میں سمجھے کہ وہ خدا کی طرف سے اس کام کو کرنے کے لئے تعینات ہوا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قندھار آسانی سے یہ پیالہ نہیں پیوے گا۔ مگر اس کا باعث یہ ہے کہ وہ اس کی لذت کو نہیں

جانتا۔ اس کے فوائد سے بے علم ہے۔ اب ہند کا فرض ہے۔ کہ اس کو اس کا مزہ چکھائے۔ اس کے فوائد ذہن نشین کرے" ٭

پادری جوزیٹ نے مشکل سے اپنی تقریر ختم کی تھی کہ شہزادہ والا تبار نے تخت سے اتر کر اُن سے ہاتھ ملایا۔ ڈاکٹر بربیر کا چہرہ جوش مسرت سے کھل اُٹھا۔ مگر ہنری بونزے صاحب کا چہرہ مدھم پڑ گیا کیونکہ ان پر صاف ظاہر ہو گیا کہ اب میری صلاح کے منظور کئے جانے کی ذرا بھی اُمید باقی نہیں۔ پادری صاحب کا کیا پوچھنا وہ تو سمجھتے تھے آج جگ جیت لیا۔ اور کیوں نہ سمجھتے ابھی تک ہم قندھار پر کسی نے اس پہلو سے بحث نہیں کی تھی۔ یہ پادری ہی صاحب کی سوجھ بوجھ ہے ٭

اس تقریر کے بعد کئی منٹ تک خموشی رہی۔ آخر شہزادہ صاحب نے یوں فرمایا۔ "حضرات! میں آپکا تہ دل سے ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی دانشمندانہ تقریروں سے مجھ کو مستفید کیا جس وقت میں نے اس دیوان خاص میں قدم رکھا تھا۔ میں مہم قندھار کے بالکل برخلاف تھا۔ متواتر شکستوں نے میرے حوصلے پست کر دیئے تھے اور مجھے فطرتاً یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ خدا نے ہمارے جوش تغلب کی سزا دی ہے۔ مگر ڈاکٹر بربیر و پادری جوزیٹ کی پُر اثر تقریروں نے میرے خیالات کی کایا پلٹ کر دی۔ اور میرا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ حتی الوسع قندھار کو ہاتھ سے نہ جانے دونگا۔ میں قندھار کو ہندوستان کا ایک صوبہ بنادونگا۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں سنسکرت کتابیں شاہد ہیں۔ کہ زمانہ قدیم میں جبکہ آریوں کا ستارہ عروج پر تھا قندھار ہند کا ایک صوبہ تھا۔ دونوں ملکوں کے فرمانرواؤں میں شادیاں ہوتی تھیں۔ مہاراجہ دھرتراشٹر کی بیوی گاندھاری راجہ قندھار کی لڑکی تھی۔ مدتوں بعد ہمیں یہ سنہری موقع ہاتھ آیا ہے۔ مگر میں اس کو ہرگز نہ جانے دونگا ٭

اس تقریر کے بعد جلسہ برخاست ہوا ٭

بازیافت	منشی پریم چند کی ایک کہانی کا عکس

فخرالدین عراقی

حیدر طباطبائی

28 Fairfield Road

ILFORD

ESS EX IG1 2FL

LONDON (U.K)

عراقی ادبیات فارسی میں مسلم الثبوت شاعر اور جید عالم کی حیثیت رکھتا ہے ۔ وہ ایران کے شہر ہمدان کی پہاڑیوں میں آباد کمجان نامی گاؤں میں ۶۱۰ھ میں پیدا ہوا ۔ اس کا گھرانہ علمائے ایران کے نامور گھرانوں میں سے ایک تھا ۔ عراقی کا پورا نام تھا شیخ فخرالدین ابراہیم ہمدانی تخلص عراقی اور والد کا نام تھا بزرگ مہر ۔ کہتے ہیں کہ جب وہ شکم مادر میں تھا تو بزرگ مہر نے خواب میں دیکھا کہ ایک خوبرو فرزند پیدا ہونے والا ہے جس کو ندائے غیب سے "عراقی" پکارا جارہا ہے ، چنانچہ اس کی عرفیت ہی اس کا تخلص بنا ۔ وہ یگانہ روزگار ، مقتدائے ائمہ کبار اور نہایت لطیف الطبع افراد میں سے ایک تھا ۔ مزاج میں قلندری کچھ اس طرح سے کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کہ کبھی ایک دیار میں مسکن نہیں کیا ۔ عنفوان شباب سے ہی اس کو مرد پرستی کا شوق تھا ، جو تمام زندگی باعث ذلت بنا رہا ۔ آٹھ سال کے سن میں کمجان سے ہمدان کے مرکزی مدرسہ روانہ کر دیا گیا ۔ کیونکہ اسی سن میں اس نے نصف قرآن حفظ کر لیا تھا ، اور والدین کو اشتیاق تھا کہ عراقی کو درس روحانیت کے تمام مدارج طے کروائیں ۔ نہایت خوش گلو تھے اور قرآن کریم کی تلاوت اس دلپذیر انداز میں کرتے تھے کہ راہگیر رک کر ہمہ تن گوش ہو جاتے ۔ جب کوئی جلال کی آیت ہوتی تو خود بخود عراقی کی صدا میں رعب اور دہشت طاری ہو جاتی اور جو بھی اس کو سنتا وہ خوف کردگار سے لرز اٹھتا چنانچہ ایک روز نماز عصر کے بعد قرآن حکیم کی تلاوت میں مشغول تھے کہ یہودی تاجروں کا ایک مختصر سا قافلہ مدرسہ کے سامنے سے گزر رہا تھا ۔ ان میں سے تین یہودیوں کے دل میں قرآن کریم کی آیات اور عراقی کی قراءت کچھ ایسا گھر کر گئی کہ وہ تینوں عراقی کے سامنے آکر نہایت ادب کے ساتھ دوزانوں ہو کر بیٹھ گئے ۔ اس وقت وہ سورہ "طہٰ" کی تلاوت میں مشغول تھے اور جب وہ اس سورہ کی آیت ۱۲۶ ۔ ۱۲۷ پر پہونچے :-

قال کذلک آیاتنا ننسیھا وکذلک الیوم تنسی وکذلک نجذی من اسرف ولم یومن بایات ربہ ولعذاب الاحرۃ اشد ابقی

(ارشاد ہو گا کہ اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں ۔ اور تو نے انہیں بھلا دیا ۔ تو آج تو بھی نظر انداز کر دیا جائے گا اور ہم زیادتی کرنے والے اور اپنے رب کی نشانیوں پر ایمان نہ لانے والوں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں اور آخرت کا عذاب یقیناً سخت تر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے ۔)

بس یہاں پر وہ آوارہ وطن یہودی خوف الہی سے کانپ اٹھے اور عراقی کے پاؤں پر گر پڑے ۔ ان پر گریہ طاری ہو چکا تھا اور نہایت خلوص کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوئے ۔ سترہ سال کی عمر میں عراقی نے جملہ علوم معقول و منقول پڑھ لئے تھے اور مدرسہ میں دیگر طلاب کے لئے تفسیر قرآن بیان کرنے لگے تھے کہ ایک روز چند اوباش اور مست قلندر ناچتے گاتے عراقی کے گرد جمع ہو کر یہ غزل پڑھنے لگے ۔

ما رخت ز مسجد بخرابات کشیدیم
خط بر ورق زہد و کرامات کشیدیم
در کوی مغاں در صف عشاق نشستیم
جام از کف رندان خرابات کشیدیم

گر دل بزند کوس شرف شاید ازیں پس
چون رایت دولت بسماوات کشیدیم
از بدو مقامات گزشتیم ، کہ بسیار
کلس تعب از زہد و مقامات کشیدیم

ان قلندروں کے درمیان ایک نہایت حسین پسر محو رقص تھا اس کے حسن و جمال کا یہ عالم تھا مانی و بہزاد بھی دنگ رہ جاتے ۔ عراقی اس لڑکے میں ایسا گم سم ہوئے کہ اس کو سامنے بیٹھا کر برجستہ یہ غزل کہی۔

چہ خوش باشد کہ دلدارم تو باشی
ندیم و مونس و یارم تو باشی
زشادی در ہمہ عالم نگنجم
اگر یک لحظہ غم خوارم تو باشی

عراقی صبح سے شام تک ان قلندروں کے حلقہ میں رہا اور رات گئے بھی رقص ہوتا رہا، غزلیں گائی جاتی رہیں ۔ نصف شب یہ قلندران بغیر کسی مقصد کے اصفہان روانہ ہوگئے ، لیکن قیامت یہ ہوئی کہ وہ خوبصورت لڑکا بھی چلا گیا ۔ اب عراقی کا دل مدرسہ سے اچاٹ ہوگیا جہاں اس نے امام فخرالدین رازی کی "تفسیر کبیر" پڑھ لی تھی ۔ حکمت پر "نسیان کثیر" اور "اشارات" کی تمام جلدیں نوک پر حفظ کرلی تھیں ۔ یہ کتاب تفسیر محی السنہ ابو محمد حسن بن مسعود مراء بغدی شافعی نے لکھی تھی ۔ طب پر محمد بن ذکریا رازی کی کتاب "معالم التنزیل" ۔ ابوالخیر رازی کی معروف کتاب "اسرار التاویل" پڑلی تھی جو نجوم پر لکھی گئی فارسی زبان کی بہت ہی ضخیم کتاب تھی ۔ عراقی عجیب و غریب ذہانت کا حامل تھا یہ تمام علوم اس کم سنی میں از بر کرلئے تھے اور اب دیگر علمائے وقت کے رسالے زیر مطالعہ تھے کہ عشق کا روگ لگ گیا اور دوسرے ہی دن یہ بھی ہمدان سے اصفہان کے لئے کوچ کر گیا ۔ ابھی اراک ہی پہنچا تھا ، کہ وہی طائفہٴ قلندران دکھائی پڑا جو ایک چشمہ کے نزدیک محو خواب تھا، عراقی اسی نازک اندام لڑکے کو تلاش کرتا ہوا نزدیک پہنچا اور ایک آہ سرد بھری و ذیل کا شعر دردناک آواز میں پڑھا۔

پسرا رہ قلندر بزن از حریف ماہی
کہ دراز و دور دیدم سرکوئے پارسائی

تمام قلندر عراقی کو دیکھ کر خوش ہوگئے اور اس کو بھی زرد و ارغوانی لباس پہنا دیا اور دیار بہ دیار گھومتے رہے ۔ آخر چند ماہ بعد عراقی اسی معشوق طرحدار کے ہمراہ جب ہمدان واپس آیا تو امیر مدرسہ نے اس کا اخراج کردیا اور یہ خبر آگ کی طرح تمام شہر میں پھیل گئی ۔ جب عراقی لوٹ کر اپنے پڑاؤ پر آیا تو وہ حشر ساماں غائب ہوچکا تھا، ممکن ہے اس نے عراقی کے مدرسہ سے اخراج کی خبر سن کر اپنے آپ کو مقصر جانا ہو اور راہ فرار اختیار کرلی ہو ۔ یہ صدمہ عراقی سے برداشت نہ ہوسکا پھر ہمدان میں اس کے احباب نے آکر کہا یا کہ تیرے کاسہ، سر میں جو علم سے منور سر ہے اس کی فکر کر ورنہ ایسا نہ ہو کہ لواطت کے الزام میں تیرا محاکمہ ہو و آخر آسنگسار کردیا جائے ۔ بس یہ سننا تھا کہ سرائے تجار میں جاکر ایک گھوڑا خریدا او ہندوستان تک رسائی کا نقشہ بنوایا اور راہی، سرزمین ہند ہوا ۔ پہلے ملتان آیا اور سیدھا خانقاہ سلطان المحققین مولانا بہاء الدین ذکریا میں دق الباب کیا، شیخ نے نہایت خندہ پیشانی سے استقبال کیا ۔ چند روز قیام کرنے کے بعد چند اصحاب کے ہمراہ دلی روانہ ہوگئے لیکن راستہ میں طوفان بادوباراں نے اس چھوٹے سے قافلے کو منتشر کردیا ۔ سب لوگ متفرق ہوگئے فخرالدین تنہا دلی پہنچا اور چند روز گھوم پھر کر پھر ملتان کی راہ لی ۔ ملتان آتے ہی خانقاہ پر گیا جہاں شیخ زکریا پہلے سے اس کی آمد کے منتظر تھے ۔ دیکھتے ہی فرمانے لگے کہ اے عراقی تو نے ہم سے راہ فرار اختیار کی تھی دیکھ ہم نے بادوباراں کا طوفان بھیجا اور تجھ کو پھر سے ملتان واپس بلوالیا ۔ عراقی نے یہ کلمات سنتے ہی فی البدیہہ یہ بیت پڑھی۔

ازنگر یزد دل من یکزمان
کالبدرا کی بود از جان گزیر
دایہء لطف مرا در بر گرفت
داد بیش ازمادرم صد گونہ شیر

یہ بیت سنتے ہی شیخ نے علی الفور عراقی کو ریاضت میں چلے جانے کا حکم دیا ۔ بیس روز وہ خلوت میں عبادت کرتا رہا اور اکیسویں روز، اول صبح عراقی کے حجرے سے نہایت خوش الحانی میں یہ غزل سنائی دی۔

نخستین بادہ کندر جام کردند
زچشم مست ساقی وام کردند
زلالی از لب العطش چشانیدند
خضر را آب حیواں نام کردند
بخود گفتند ارنی لن ترانی
بموسی نام عرض الہام کردند

چو خود کردند راز خویشتن فاش
عراقی را چرا بدنام کردند
نہاں باعری گفتند رازی
جہانی را ازین اعلام کردند

یہ غزل سنتے ہیں حضرت شیخ دروازہ کھول کر عالم وجد میں اندر گئے اور کہا کہ تمہاری ریاضت ختم ہوئی اب باہر آجاؤ۔ باہر آتے ہیں ایک انبوہ کثیر نے اس کا استقبال کیا اور عراقی نے یہ شعر پڑھا۔

در کوئے خرابات کسی راکہ نیاز ست
ہشیاری و مستیش ہمہ عین نماز ست

اسی حالت میں شیخ نے اپنے دست مبارک سے اس کو خرقہ پہنایا اور اسی رات اپنی بیٹی سے عراقی کا نکاح پڑھ کر اپنی دامادی میں لے لیا۔ لیکن ایک بیٹے کو جنم دے کر وہ نیک بخت اللہ کو پیاری ہو گئی اور چند ماہ بعد شیخ زکریا نے اپنی دوسری بیٹی کے ساتھ عراقی کا عقد کر دیا۔ پہلی خاتون سے ایک لڑکا بنام کبیرالدین اسمائیل پیدا ہوا تھا۔ دوسری بیٹی سے عقد کے موقع پر شیخ نے اپنے بعد فخرالدین عراقی کو ہی اپنا خلیفہ اعلان کر دیا۔ لیکن حقدار کو خلافت راس نہ آئی چند روز بعد شیخ انتقال کر گئے اور حلقہ شیخ کی اکثریت عراقی سے بغض اور حسد کرنے لگی اور اس کے خلاف سازشوں پر کمربستہ ہو گئی۔ سلطان کی خدمت میں ایک وفد کی شکل میں جاکر شکایت کی کہ یہ شخص صرف غزلیں کہتا اور امرد پرستی کرتا ہے۔ اس کو کس صورت زیب نہیں دیتا کہ اتنی بڑی خانقاہ مقدس کا امیر یا شیخ طریقت بن کر حکمرانی کرے۔ سلطان نے تیغ بر کف ہرکارے بھیجے کہ فوراً فخرالدین عراقی کو دستگیر کرکے دربار میں پیش کیا جائے ابھی یہ ہرکارے وارد شہر ملتان بھی نہیں ہوئے تھے کہ عراقی کے کسی پرستار نے یہ خبر اس کو سنادی اور سنتے ہی عراقی نے باآواز بلند کہا "حی علی الوداع" حلقہ اجتماع کی جانب کہا کہ "الرحیل" اور اپنے اصحاب و عیال سے رخصت ہوا، اسپ وفادار کو ایڑ لگائی اور بندرگاہ کراچی پہنچ کر ایک مسافر بردار کشتی پر سوار ہو گیا۔ کشتی میں سوار چند افراد عراقی کو پہچان گئے۔ اس لئے صبح و شام پھر سے محافل شعر خوانی بپا ہونے لگیں۔ یہ کشتی کراچی سے چل کر عمان کے ساحل پر لنگر انداز ہوئی۔ اسی دن سلطان عمان کو یہ خبر ملی کہ عراقی بھی اس کشتی میں سوار ہے اور عزم سفر خانہ خدا رکھتا ہے۔ پھر کیا تھا سلطان کے وزیر دربار نے آکر عراقی سے محل میں چل کر سلطان سے ملاقات کرنے کی درخواست کی۔ عراقی کے پاس چند اوراق پریشان و چند کتابوں کے سوا کسی طرح کا اساس و اسباب نہیں تھا۔ سلطان عمان نہایت علم دوست و شعر و شاعری کا مداح تھا۔ عراقی کا کلام سن چکا تھا۔ اس لئے سلطان نے عراقی کا استقبال اپنے محل کے صدر دروازے پر آکر کیا اور بہت ہی اعزاز و اکرام سے نوازا۔ دوسرے دن نماز جمعہ کے بعد عمان کے شیخ الشیوخ دیگر علماء اور اکابرین شہر نے جمع ہو کر عراقی سے علم کلام۔ مابعد الطبیعاتی اور روحانی امور پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ عراقی کسی یونانی مجسمے کی مانند یک راست کھڑا جواب دہی کرتا رہا۔ جواب دیتے وقت اس کی صورت پر اتنا سکون اور اتنی متانت تھی کہ اس کے چہرے پر کسی طرح کے آثار نمایاں نہیں ہوئے۔ ابرو پر شکن تک نہیں آئی۔ وہ نہایت ہی حکیمانہ سوالات کے مدلل جوابات دیتا رہا۔ اس کے علم کی روشنی سے محفل منور ہو گئی اور لوگوں نے بیش بہا زر و جواہرات ہتھیلیوں میں بھر کر عراقی کے حضور نذر کئے۔ جب اس نے رخصت کی اجازت چاہی تو سلطان نے جلوس شاہی و ماہی مراتب کے ساتھ اس کو قلمرو مملکت سے یمن تک پہنچایا اور جب وہ حجاز کی سرزمین پر آیا تو سب سے پہلا مسکن خانہ خدا میں کیا۔ احرام باندھا اور اپنے شاہد مقصود کو دیکھ کر دو قصیدے فوراً نظم کئے۔

اے جلالت فرش عزت جاوداں انداختہ
کوئے در میدان وحدت کامران انداختہ

بیت

اے جلالت فرش عزت جاوداں انداختہ
عکس نورت تابشے برکن فکان انداختہ

اور یہ قصیدہ، جب غلاف کعبہ کو بوسہ دیا۔

تعالی من توحد بالکمال
تقدس من تفرد بالجمال

بیت

جنہ اصفہ بہشت مثال
کہ بود آسائش صفت نعال

اور جب دیار عشق یعنی مدینہ منورہ پہنچا تو تمام شب حرم مطہر میں بسر کرتا اور یہ پانچ قصاید حرم کی پر نور فضا میں نظم کئے۔

عاشقاں چون بردر دل حلقہ سودا زنند
آتش سودای جاناں دردل شیدا زنند

دوم

قبہازم و چو مہ جہان نیست درخورم
مانگہہ بود کہ از کف ایام برپرم

سوم

اے رخت مجمع جمال شدہ
مطلع نور ذوالجلال شدہ

چہارم

راہ باریکست و شب تاریک و مرکب لنگ پیر
اے سعادت رخ نمای واے عنایت دست گیر

پنجم

دل ترا دوست ترز جان دارد
جان بہر تو درمیان دارد

جب وہ مسقط سے حجاز کے لئے چلا تھا تو پانچ مرید اس کے ہمراہ تھے جن میں سے تین تو حرم مطہر میں مجاور بن گئے اور مدینہ میں ہی رہ گئے ۔ دو عراقی کے ہمراہ دمشق تک آئے کچھ دن یہاں قیام کیا اور پھر روم کی جانب روانہ ہوگئے ۔ جہاں اس وقت خلاصہ الاولیاء شیخ صدر الدین قونوی اور مولانا جلال الدین رومی اپنے اپنے علم کے چراغ جلائے ہوئے تھے ۔ عراقی کو اسلام میں تصوف اور عرفان کے حصول کے لئے ، یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی کہ باسواد اور روشن فکر افراد جنگلوں اور ویران خانقاہوں میں گوشہ نشین ہوجاتے ہیں اور ان پر اسرار اور پیچیدہ مسائل میں سرگرداں رہتے ہیں ۔ جن پر خالق حقیقی نے قدغن لگا رکھا ہے اپنے اسرار کی تہ در تہ نقاب ڈال رکھی ہے ۔ عرفانی ادب کی اہمیت اپنی اقدار پر مشتمل ہے کہ اس میں انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے ، لیکن اس کے برعکس تمام مابعد الطبیعاتی تصورات جو ، راہبوں نے روحانی قوتوں کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے انسان پر جبراً نافذ کئے ہیں ، وہ انسان کو طمانیت قلب اور خوشی دینے سے قاصر ہیں ۔ عراقی کی نظر میں اصل راستہ یہ ہے کہ انسان اپنی منزل کو خود تلاش کرے ۔ اس نہج پر چل کر انسان ہر بار نیا ولولہ اور نئے عزم کے ساتھ اپنی عظمت اور ادراک کی بہتر جستجو کرسکتا ہے ۔ روم پہنچ کر اس کو معلوم ہوا کہ جس علم کی اس کو جستجو تھی ، اس زمین میں محی الدین ابن العربی گلستاں کے گلستاں کھلا چکا ہے ۔ شیخ صدر الدین قونوی نے عراقی کو "فصوص الحکم" اور "فتوحات المکیہ" پڑھنے کو دی ۔ اس زمانے میں اندلس سے قسطنطنیہ تک علم و حکمت کے گلزار کھلے ہوئے تھے ۔ ان کتب کو پڑھ کر عراقی کی بہت راہنمائی ہوئی ۔ جو تفکرات اس کے ذہن میں سوئے ہوئے تھے ان کو نئی جہد ملی و بیداری نصیب ہوئی اور اس نے ایک یادگار کتاب بنام " لمعات " تصنیف کی ۔ جب لمعات مکمل ہوچکی تو عراقی نے شیخ قونوی کی خدمت میں پیش کی ۔ جس کو پڑھ کر شیخ نے عراقی کو دعا دی اور کہا کہ تو نے عوام الناس پر اعلیٰ ترین خیالات کو آشکار کردیا " لمعات " کی مختلف کاتبوں سے نقلیں کرواکے شیخ نے مصر ، حجاز اور دمشق روانہ کردیں ۔ شیخ کے مریدوں میں ایک صاحب حیثیت شخص تھا امیر معین الدین ۔ اس نے اس کتاب کی خوشی میں آستانہ شیخ میں تین دن تک محفل سماع منعقد کی اس محفل میں ایک نازک گل اندام لڑکا جو حسن قوال کے نام سے مشہور تھا اور ہزاروں افراد اس کے ناز بردار تھے خاص طور پر مدعو تھا ، عراقی نے جب حسن قوال کو دیکھا تو پھر سے ان کا ذوق خفتہ جاگ اٹھا اور حسن قوال پر دل و جان سے فریفتہ ہوگئے اب اسی محفل میں اس کی زلفوں کو چومنے لگے اور تیس اشعار کی یہ غزل برجستہ کہہ ڈالی ۔

ساز طرب عشق کہ داند چہ سازست
کز طعمہ اونہ فلک اندر تگ و تازست

اب حسن قوال شب و روز عراقی کے پاس رہنے لگا ۔ اس بات کا اثر اس کی شہرت پر پڑا لیکن وہ بحر عشق کا شناور ہر لعن طعن سے بے نیاز حسن قوال کو بغل میں دبائے اپنے حجرے میں پڑا رہتا ۔ ایک دن امیر معین الدین اور ایک ایرانی تاجر خواجہ زین الدین کاشانی نے حسن قوال کو خلوت میں پکڑ کر اسلام بول (اسمتبول) روانہ کرادیا ۔ عراقی اس خبر سے دیوانہ ہوکر خانقاہ سے نکل گیا ۔ شیخ صدر الدین قونوی اس کے لاپتہ ہونے سے سخت پریشان ہوئے ۔ چہار دانگ اس کی جستجو میں اپنے مریدوں کو روانہ کیا پھر پتہ چلا کہ شہر سے بہت دور ایک برف پوش پہاڑی میں برہنہ گھوم رہے ہیں ۔ شیخ بنفس نفیس خود وہاں پہنچے اور اپنی عبا عراقی کے دوش پر ڈالی ، عراقی نے چشم حیرت سے شیخ کی جانب دیکھ کر یہ شعر پڑھا ۔

درجام جہان نمای اول
شد نقش ہمہ جہان مشکل

دیوانہ عشق کو پکڑ کر شیخ اپنی خانقاہ میں لائے لیکن وہ تو در حقیقت حواس باختہ ہوچکا تھا شیخ نے چند روز خاص توجہ دی اور آہستہ آہستہ عراقی کے اوسان ٹھکانے لگے ، شیخ نے نماز پڑھنے کی تلقین کی ۔ ایک روز نماز

فجر میں گریہ نے غلبہ کر لیا اور حالت سجدہ میں یہ غزل ترنم سے پڑھنے لگے

در کوے تو لولوی گدائی
آمد بامید مرحبائی
برخاک درست فتادہ مسکین
از دست غمت شکستہ پائی
پیش کہ رود کجا گریزد
باآنکہ نرفتہ بور جائی

غیر طبعی طریقہ کار سے جنسی آسودگی حاصل کرنا اپنے معاشرے سے بغاوت کرنا، ان باتوں نے عراقی کی شخصیت کو اور جاذب بنادیا تھا۔ جو علمی سرمایہ اس کے اردگرد تھا، وہ اس کے رجحان کی پرورش کے لئے کافی نہ تھا۔ اب اس کے شوق نے اور آشفتہ مزاجی نے اس کو نئی شاعرانہ جلا بخشی تھی۔ طویل مدت روم میں اقامت پذیر رہا لیکن مولانا جلال الدین رومی سے اس کی تفصیلی ملاقات یا کسی طرح کا کسب فیض کرنا، کسی تذکرہ سے ظاہر نہیں ہوتا ہے۔ اس دیوانہ وشی میں ایک اور غزل خانقاہ میں کہی جسکا مطلع مندرجہ ذیل ہے۔

مست خراب یابد ہر لحظہ در خرابات
گنجی کہ آن نیابد صد پیر در مناجات

روم میں عراقی کے مرید بہت ہوگئے تھے اس کو زر و جواہر سے لاد دیا تھا اونٹ گھوڑے اور لباس ہائے فاخرہ سے مزین کر دیا تھا پھر بھی اکثریت اس کو مذنب گردانتی تھی۔ اس لئے اپنے دو اصحاب کو لے کر مصر چلا آیا۔ قاہرہ میں امیر معین الدین کا لڑکا بہت بڑا تاجر تھا، سلطان کے دربار تک رسائی تھی۔ اس نے سلطان کے سامنے عراقی کے اوصاف بیان کئے تو حضور خسروی میں طلبی ہوئی۔ سلطان نے کہا کہ آپ کی کتاب "لمعات" پڑھی اور آپ کے علم کی بہت تعریف سنی ہے اب آئندہ کیا ارادہ ہے۔ عراقی نے سورۃ النسا کی انتہرویں آیۃ شریفہ کی تلاوت کی کہ **قل متاع الدنیا قلیل والا خرۃ خیرۃ لمن اتقی ولا تظلمون فتیلا ؕ** (فائدہ دنیا کا تھوڑا ہے اور آخرت بہتر ہے واسطے اس شخص کے کہ پرہیزگاری کرتا ہے اور نہ ظلم کئے جاؤ گے تم) اس گفتگو سے سلطان سخت حیرت زدہ ہوا اور سوچنے لگا کہ یہ شخص کتنا متبحر ہے۔ فوراً حکم دیا عراقی آج سے مملکت مصر کے شیخ الشیوخ (سپریم کورٹ کے جج) ہیں اور حکم دیا کہ تمام متصوفہ و علماء ان کے اجلاس پر حاضر ہوں۔ اس طرح مصر کے تمام صوفی علماء و اکابر عراقی کے اطراف میں حاضر رہے۔ اس لئے اب اس کے حاسدین بھی پیدا ہونے لگے۔ عراقی تو مست ملنگ شخصیت کا مالک تھا، اس کو کبھی بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ اس ملک کا قاضی القضات ہے۔ ایک دن اس کے سامنے شعر و شاعری کا ذکر ہو رہا تھا، وہ ترنگ میں آگیا اور ایک ستار منگا کر نہایت دلنشین انداز میں چند غزلیں پڑھیں سب پر وجد کا سا عالم تھا کچھ عیار طبع افراد روز دیگر سلطان کے حضور میں گئے اور اس قصہ کو رنگ دے کر بیان کیا۔ سلطان نے عراقی کو طلب کیا اور اصل ماجرا دریافت کیا۔ عراقی نے کہا کہ نفس مجھ پر غالب آگیا تھا، اگر ایسا نہ کرتا تو خلاصی نہ ہوتی۔ اس جواب پر سلطان عراقی کا اور بھی معتقد ہوگیا۔ عراقی ایک دن قاہرہ کے بازار میں گھوم رہا تھا کہ اس کا جوتا ٹوٹ گیا اور وہ ایک کفاش کے پاس گیا۔ وہ ایک نہایت خوش جمال لڑکا تھا، عراقی کی رال پھر ٹپک پڑی پوچھا کہ صبح سے شام تک کفشگری میں کتنا کما لیتے ہو! اس لڑکے نے جواب دیا فقط چار درہم۔ عراقی نے کہا کہ ہر روز میں تم کو آٹھ درہم دوں گا فقط میری آنکھوں کے سامنے بیٹھے رہا کرو۔ اب اس کی دکان میں شیخ الشیوخ ہر وقت بیٹھے رہتے اور غزلیں پڑھی جارہی ہوتیں یا عاشقانہ اداؤں سے چھیڑ چھاڑ چل رہی ہوتی مستزاد یہ کہ نہ نماز کی فکر نہ بر سر عام ان ناشائستہ حرکات سے اجتناب۔ سلطان کو خبر ہوئی تو وہ بھی خاموش رہا۔ لیکن اس کفاش پسر کے قبیلے والوں نے ایک دن اس لڑکے کو اغوا کر لیا پھر اس کا پتہ معلوم نہ ہو سکا۔ عراقی دل برداشتہ ہو اٹھا اور سلطان سے رخصت طلب کی۔ اس نے عراقی کو بہت روکا لیکن شیخ جب چل پڑا تو چل پڑا۔ آخر کار سلطان نے منزل دریافت کی تو کہا کہ سوئے دمشق جاتا ہوں۔ سلطان نے دمشق کے ملک الامرا کے نام خط لکھا کہ شیخ فخر الدین عراقی آرہے ہیں۔ آپ پر لازم ہے کہ شہر کے تمام علماء مشائخ اور اکابر دمشق پر ان کو مقدم سمجھا جائے۔ یہ خط رسمی طور پر عراقی کے دمشق پہنچنے سے قبل پہنچ چکا تھا۔ حسن اتفاق یہ کہ دمشق کا ملک الامرا ایک حسین خوبرو لڑکا تھا، عراقی جب دروازہ شہر پر پہنچا تو وہ خود استقبال کرنے آیا۔ عراقی نے نظر اٹھا کر ملک الامرا کو دیکھا تو کھل اٹھا اور گلے لگا کر بوسہ لیا۔ اب شیخ نے اپنے ہمراہ آنے والے مریدوں سے کہہ دیا کہ عمر عزیز کی اب یہ آخری منزل ہے۔ چنانچہ ایک مکان خرید اور اسی کے صحن میں بیٹھ کر درس و تدریس کا سلسلہ آغاز کر دیا۔ اکثر ملک الامرا خود آجاتا جس کو دیکھ کر عراقی شگفتہ ہو اٹھتا۔ وہ چشم باطن سے روح کی

گہرائیوں کو دیکھ چکا تھا اب تمناؤں اور خواہشات کی سرحد عبور کر چکی تھی، اس نے تمام زندگی کبھی اپنے آپ پر ملمع کاری نہیں کی۔ بغیر کسی جستجو کے اس کو جاہ و مقام ملے، دولت و ثروت ملی۔ اس کے ظاہر سے اس کے باطن کی شناخت مشکل تھی، لیکن اس نے نثر اور شاعری میں اپنا باطن نکال کر رکھ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دمشق میں اس کے مکتب نے بڑا نام پیدا کر لیا اور دوسرے بلاد ہائے اسلامیہ سے طلاب آنا شروع ہوگئے۔

لاہور، ملتان اور دلی اس زمانے میں دنیائے اسلام کے بلاد ہائے کبیرہ شمار ہوتے تھے خاص کر ملتان جو سرزمین اولیاء اللہ مشہور تھی، پنجاب اور سندھ کے مسلمان اسلامی تمدن کے لحاظ سے کافی بلند تھے۔ اڑتے اڑتے یہ خبر ملتان پہنچی کہ شیخ فخرالدین عراقی دمشق میں درس و تدریس میں مشغول ہیں۔ اب ان کا فرزند شیخ کبیرالدین اسماعیل ملتانی جو حضرت بہاؤالدین زکریا کا گدی نشین ہو چکا تھا، باپ کے بارے میں یہ خبر سن کر فوراً دمشق آیا۔ زیارت پدر کی، قدموں سے لپٹ گیا عراقی نے گلے سے لگالیا اور یہ دو اشعار باحسرت و یاس پڑھے۔

خدمت بندہ بوجہی کہ توانی برسان
کہ بیا، کز غم ہجرت انت شدم در بدری

در غم ہجر تو تنہا نہ منم، کز یاران
ہر کسی راست بقدر خود ازین غم قدری

بیٹے کو دیکھ کر عراقی بہت خوش ہوا جب کہ کبیرالدین نے شعر و ادب کی جاگیر تو وراثت میں پائی تھی پھر ملتان میں رہ کر عرفان، زہد اور تقویٰ کے اعلیٰ مدارج طے کر لئے تھے۔ عراقی کی تلون مزاجی میں اب ٹھہراؤ آچکا تھا۔ طبیعت میں اضمحلال رہنے لگا۔ اب مزاج میں سکوت تھا۔ علم کی روشنی کے باوجود تمام زندگی وہ حرص و ہوس کا بازیچہ بنا رہا اپنی فطری نفس پرستی کی وجہ سے گوناگوں مشکلات سے دوچار رہا۔ ایمان کو عقل سے ٹکرانے کا شوق سرد پڑ چکا تھا۔ دین نے اس کو نفس کشی کا درس دیا، غیر یقینی کا وسوسہ ختم کرنے کے لئے تجدید و تادیب کی بازگشت اب اس کے ذہن کے گنبد میں سنائی دینے لگی تھی۔ اپنے فرزند دلبند کو شب و روز درس میں مشغول کر لیا تھا۔ لیکن کاتب تقدیر نے اس کی عمر رواں کی کشتی کے بادبان لپیٹنا شروع کر دیے تھے اور آٹھویں ذوالقعدہ ۶۸۸ ہجری میں اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔ وقت نزع بیٹے کو آواز دی، اس کی صورت کو عالم حسرت سے دیکھا اس کے انداز دید میں اسرار پنہاں تھے ندامت بھی تھی سربلندی بھی۔ لائق اور صالح پسر نے باپ کو سنبھالا، اشارہ انگشت سے کچھ لکھنا چاہتے تھے کہ یہ رباعی پڑھی۔

در سابق چون قرار عالم دادند
مانا کہ بر مراد آدم دادند

زان قاعدہ و قرار کان روز افتاد
نی بیش بکس وعدہ ونی کم دادند

مفتی غلام سرور لاہوری نے تاریخ رحلت میں دو قطعات نظم کئے جو ان کی کتاب خزینۃ الاصفیا (چھاپ کانپور ۱۹۱۴ء جلد دوم ص ۳۲، ۳۳) پر درج ہیں۔

شد عراقی چون ازین عالم بخلد
سال وصل آن شہ والا مکان

" آفتاب حسن مولی " کن رقم
" شاعر محبوب مہدی " ہم بخوان

قطعہ دیگر!

عراقی چون زدنیا رخت بربست
باہل دہر گفت ہذا فراقی

بتاریخ وصالش " محترم " گو
دگر " سلطان ولی عالی عراقی "

" آفتاب حسن ولی " و " شاعر محبوب مہدی " و " محترم " و " سلطان ولی عالی عراقی " بحساب جمل ۶۸۸ ہجری کی تاریخ نکلتی ہے۔ عراقی کی موت کا غوغہ تمام بلاد ہائے اسلامیہ میں ہوگیا۔ دمشق میں ملک الامراء نے بطور رسمی عزاداری کا اعلان کیا۔ عزادار جوق در جوق آستانہ عراقی پر جمع ہوگئے سوگواروں کی گریہ وزاری کے فلک شگاف نعروں کے درمیان " جبل الصالحیہ " کے گورستان میں محی الدین ابن العربی کے متصل دفن کیا گیا۔ روز چہارم ختم القرآن کے بعد ملک الامراء نے تمام عمائدین و معززین شہر کے درمیان کبیرالدین ابراہیم کو باپ کا قائم مقام و جانشین حقیقی اعلان کیا۔ لیکن دل برداشتہ پسر بارہ سال کی مختصر مدت کے بعد رحمت حق سے جاملا۔ اس کا مدفن بھی باپ کے پہلو میں ہوا مؤلف خزینۃ الاصفیاء غلام سرور لاہوری نے قطع تاریخ اس طرح نظم کیا

چون کبیر الدین کبیر الاولیا
رفت از دنیا بحق ور زید عشق

سال تر حیلشس چو جبتم از خود
گفت روشن ازخرد " نور دمشق "

"نور دمشق" بحساب جمل ۷۰۰ھ ہوتے ہیں۔ عراقی کی غزل کا انحصار حقیقی مضامین اور وصل و ہجر کی داستانوں پر ہے۔ جس میں جذبات کی پاکیزگی اور خیالات کی بلندی بہت نمایاں ہے۔ اس کے کلام میں فکری اور جمالیاتی عروج و زوال کو بہت ہی انوکھے پیرائے میں نظم کیا گیا ہے۔ غزل کے بعد عراقی صنف قصیدہ پر بہت مسلط ہے۔ اس کے علاوہ مثنوی اور حکایات میں اس نے حیات اور کائنات کے مسائل بیان کئے ہیں۔ وصل اور ہجر کے نرم و نازک مضامین سے لے کر عظیم سے عظیم تر باتوں کا اظہار ہے فلسفہ، تصوف، حکمت، اخلاق اور زندگی کے گوناگوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس نے اپنے نظریے، عقیدے اور تجربے کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے، حقیقت میں وہ صاحب اسلوب شاعر تھا وہ ہر کلام پر ادبی تعہد میں کاربند ملتا ہے اس نے عوام کو ایک طرح کا Committed Literature فراہم کیا ہے جو نہ صرف اس کے دور کے افراد کے لئے فیض رساں تھا، بلکہ آنے والی نسلوں نے بھی اس سے اکتساب کیا اور وہ ہمیشہ فارسی ادب میں پرنور ادبی ستون کی مانند درخشاں رہے گا۔

آن مونس و غمگسار جاں کو
وآن آرزوی ہمہ جہاں کو

آنجان و جہان کجاست آخر
وآن شاہد روح انس و جان کو

حیران ہمہ ماندہ ایم و والہ
آن یار لطیف مہربان کو

حواشی

(1) نفحات الانس از عبدالرحمان جامی چاپ کلکتہ ۱۸۹۵ء
(2) تذکرۃ الشعراء از دولتشاہ
(3) حبیب السیر خوندمیر سہ جلد حبیب السیر
(4) مے خانہ ۔ تالیف ملا عبدالنبی فخرالزمانی قزوینی چاپ لاہور ۱۹۲۶ء
(5) سفینۃ الاولیاء تالیف محمد دارالشکوہ قادری چاپ لکھنؤ ۱۸۷۲ء
(6) مرآۃ الخیال تالیف امیر شیر علی خان لودھی چاپ بمبئی از ۱۳۲۴ھ
(7) نتائج الافکار تالیف محمد قدرت اللہ خان گوپاموی چاپ مدراس ۱۳۵۹ھ
(8) آتشکدہ، تالیف، لطف علی بیگ آذر بیگدلی، چاپ بمبئی ۱۲۹۹ھ
(9) شمع انجمن، تالیف، سید محمد صدیق حسن خان بہادر، چاپ بھوپال
(10) خزینۃ الاصفیاء، تالیف، مفتی غلام سرور لاہوری، چاپ کانپور ۱۹۱۴ء
(11) ریاض العارفین، تالیف، رضا قلی خان ہدایت، چاپ تہران ۱۳۰۵ھ
(12) ہدیۃ العارفین، تالیف، اسمعیل پاشا بغدادی، چاپ تہران ۱۹۵۱ء

شہر کلکتہ کی منتخب خوش ذائقہ
جنتا مٹھائیاں
سندیش
گلاب جامن
رس گلا
قلاقند
ملک کیک
رابڑی
چم چم
پیسٹری نما مٹھائیاں
لڈو
نمکینیات
مختلف اقسام کے حلوے
Janta Sweet MART
اپنے مہمانوں کی تواضع کے لئے دسترخوان کی
زینت بنائیے۔ ہر تہوار، تقریب، پکنک اور
سفر کے موقع پر جنتا مٹھائیاں نوش فرمائیے۔
جنتا سوئیٹ مارٹ ۵۳۔اے، کبی تیرتھ سرانی، خضر پور، کلکتہ۔۲۳۔۷۰۰۰

غالب اور یاس یگانہ

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
بیرو باڑی، گوہاٹی

عزیزم ف س اعجاز!

۱۴/ اگست ۱۹۸۲ء کی رات کو Landslide یعنی پہاڑی کا ایک حصہ گر جانے کے سبب جو المیہ پیش آیا اور جس میں میری شریک حیات ڈاکٹر راج مصرا رستوگی اور میرے تین بچے جاں بحق ہو گئے، میرے گھر کا 2/3 حصہ منہدم ہو گیا۔ جس کے بعد میں حسرت زدہ و غم زدہ ہو کر رہ گیا۔ کار فروخت کر دیا۔ ٹیلی فون کٹ گیا۔ خیر، ملبے کے نیچے سے یہ مضمون بھی نکلا جو انشاء کو پیش کر رہا ہوں۔ یہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اس کا کاغذ بوسیدہ ہو چکا ہے۔
ہاں میری بیوی راج مصرا ایک معروف M.B.B.S لیڈی ڈاکٹر تھی، بنگالی نژاد۔ لہذا بنگالی سے میری آشنائی ہوئی۔

تمہارے لئے دعائیں
تارا چرن رستوگی

بیرو باڑی۔ گوہاٹی ۷۸۱۰۱۶۔

مجنوں گورکھپوری نے "نگار" لکھنو اور "سوغات" سہ ماہی میں مطبوعہ مضامین میں جناب یاس یگانہ کی شاعرانہ خوبیوں پر کچھ لکھا ہے وہاں فاضل تنقید نگار نے یہ شکایت بھی پیش کی ہے کہ یاس یگانہ نے "نظم یا نثر میں جو کچھ اپنی خود ستائی اور غالب کی توہین میں لکھا ہے وہ یقیناً شائستہ مذاق رکھنے والوں کی نگاہوں میں بڑی چھوٹی بات ہے۔ ان کے اس رویہ نے ان کی شاعری کی صحیح قدر و قیمت کو بڑا صدمہ پہنچایا ہے۔ اس رائے سے قدرے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ یگانہ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ذات غالب کی توہین و اہانت کا میری رائے میں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اول تو غالب اس وقت زندہ ہی نہیں تھے اور دوسری قابل غور یہ بات ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سرتا سر غالب کی شاعری کے متعلق ہے۔ بالآخر ذات غالب اور شعر غالب کو خلط ملط ہی کیوں کیا جاتا ہے۔ یہ بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ قابل غور و خوض یہ پہلو ہے کہ مرکوزات و مضمرات یگانہ کا محل اصلی یعنی فوکل پوائنٹ (Focal Point) غالب یا شعر غالب تھا ہی نہیں بلکہ وہ عصری مزاج و ماحول تھا جس کا مطالعہ علم نفسیات سے استفادہ کرتے ہوئے کیا جا سکتا ہے۔ اس عصری مزاج و ماحول کو مجموعی حیثیت سے غالب کامپلکس (Ghalib Complex) کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ آئیے پہلے یہ دیکھتے چلیں کہ اس اصطلاح کا مفہوم کیا ہے۔

کبھی کبھی ہمارے جذباتی تجربات یا سنگین حادثات سے ایسے خیالات و میلانات پرورش پا جاتے ہیں جو لاشعوری طور پر ہمارے فعال و عمل پر اثر انداز ہوتے لگتے ہیں۔ ایسے خیالات و میلانات بالعموم سماجی سرزنش اور متبادلہ اقدار سے ابھرتی ہوئی قدغن وغیرہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ دل پسند نہیں کرتا اور ذہین بھی قدغن و سرزنش سے متنافر ہو اٹھتا ہے پھر بھی طوعاً و کرہاً ہمیں انہیں قبول کرنا پڑتا ہے۔ مجروح جذبات اور سرخیرہ

خیالات کی ایک ایسی تنظیم جس سے نفسیاتی و مرضیاتی پہلو
ہوتے ہیں تشکیل ہوجاتی ہے ۔اس تنظیم کو علم نفسیات میں
کامپلکس کہتے ہیں اردو میں عام طور پر اس کا ترجمہ گرہ کیا جاتا ہے
مگر میں گرہ پر نفسیاتی پیچاک کو ترجیح دیتا ہوں ۔

میں نفسیاتی پیچاک کا بھرپور عمل دخل یگانہ کے یہاں
نظر آتا ہے ۔غالب و متعلقات غالب پر یگانہ نے جو کچھ کہا یا لکھا
وہ سب کچھ ایک مخصوص نقطہ نظر سے عبارت تھا یعنی اس
خیال سے جو درج ذیل رباعی میں منظوم ہے ۔

ارمان نکلنے کا مزہ ہے کچھ اور
اور رشک سے جلنے کا مزہ ہے کچھ اور
ہاں یاد ہے دوست سے لپٹنا لیکن
دشمن کو کچلنے کا مزہ ہے کچھ اور

یاس سے یگانہ بن جانے کا راز دشمن کو کچلنے کی کاوش و
کوشش میں مضمر تھا ۔یگانہ کی آواز منفرد آواز تھی اور ایک
مخصوص انداز بیان تھا واجد حسین لکھنوی تو تھے نہیں ۔ لہٰذا
ان کی روز افزوں شہرت لکھنوی معاصرین کے دلوں میں خار
بن کے کھٹکنے لگی اور وہ سب اتنے خار خار ہوگئے کہ وہ اپنے خار و
خس کو غالب کو بیچ میں ڈال کر سحر حلال کہنے لگے ۔غالب کے
تتبع میں شعر کہنا طرہ امتیاز سمجھنے لگے ۔ دیکھئے عزیز جیسے قادر
الکلام کے یہاں غالب کا اثر و نفوذ ۔

بقدر جوش جوانی بڑھا غرور ان کا
کہ مے نے نشہ باندازہ خمار کیا

عزیز

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے
نشہ باندازہ خمار نہیں ہے

غالب

وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

غالب

وائے دیوانگی شوق کہ پھر بھی نہیں چین
جانتا ہوں جو نکل جائے وہ ارماں کیوں ہو

عزیز

بندگی میں بھی وہ آزاد و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در توبہ اگر وا نہ ہوا

غالب

بے نیازی پہ جو نازسیہ کاروں کو
الٹے پھر آئے در توبہ اگر باز نہ ہو

عزیز

یہ مثالیں ہیں عزیز کے ان اشعار کی جن میں غالب کی
ترکیبیں بجنسہٖ نقل کرلی ہیں ۔ایسے اشعار بھی نظر نواز ہوتے
ہیں جن میں غالب کے نفس مضمون اور مرکزی خیال ہی کو
ذرا سے تغیر کے ساتھ باندھا گیا ہے ۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

غالب

آئینہ رکھ کے دیکھ تماشا کہیں جسے
تو ہی تو خود ہے وہ بھی کہ تجھ سا کہیں جسے

عزیز

وائے واں بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوق تن آسانی مجھے

غالب

دم نہ لینے پایا تھا میں چھیڑدی اک داستاں
قبر میں کیا خاک حاصل ہو تن آسانی مجھے

عزیز

غرض کہ عزیز نے غالب کے اشعار اور مشہور تراکیب
سے خاصا استفادہ تو کیا ہی ہے ۔مزید براں عزیز نے خود بھی معنی

خیز تراکیب پیش کیں ۔ عزیز کے کلام کو زیر بحث لانے کی نہ تو کوئی کوشش ہی کی گئی ہے اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت ہے یہ سب کچھ بتانے کے پیچھے یہ مقصد کار فرما ہے کہ لکھنو کے دوسرے شعراء بھی باندازہ افتاد طبع کسب ضیا میں معروف تھے ۔ لکھنو کی انجمن معیار جس میں صفی، محشر، ثاقب، عزیز وغیرہ شامل تھے اپنے لئے ادبی اہمیت کی جستجو میں سرگرم عمل تھی اور اس کے لئے غالب پرستی کا سوانگ لانا ہی ضروری سمجھا گیا ۔ ظاہر میں تو غالب شناسی تھی مگر باطناً یہ سب توڑ جوڑ اس منفرد و مخصوص شعری آواز کو جو کلام یاس سے ابھر رہی تھی دبانے کے لئے تھا ۔ لکھنو کے شعری ماحول میں ایسی ریشہ دوانیوں سے زہر گھل گیا تھا جس کے تدارک کے لئے یاس نے غالب شکن ہونے کا بلند آہنگ دعوا کرنا شروع کر دیا اور یاس تخلص ترک کر کے یگانہ اختیار کیا ۔ حریفین کی، رجزخوانی کی لپیٹ میں آگیا ۔ کلام غالب جس کو ایک اچھا اور دوسرا برا کہنے لگا یہاں موجودہ سماجیات، و نفسیات کا پیش کردہ یہ نکتہ قابل غور و لحاظ ہے کہ کوئی شخص جزیرہ نہیں ہوتا (No man is an island) اور فرد و معاشرہ لازم و ملزوم طور پر ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ ماحول کے خلاف بغاوت کرنے والوں میں تین قسم کے لوگ مشاہدے میں آتے ہیں، اول، نیوراٹک (Neuratic) یعنی اعصابیت زدہ، دوم مجرم اور سوم غیر معمولی ذہانت سے حامل اشخاص ۔ نیوراٹک اشخاص لوگوں کی بغاوت ان کے لاشعور تک محدود رہتی ہے ۔ مجرم ذہنیت رکھنے والے کھلم کھلا بغاوت کرتے ہیں ۔ ان دونوں کے بعد آتے ہیں وہ اہل دانش و بینش جو اپنی آویزشوں (Conflicts) کا ارتفاع (Sublimation) کر کے فنون و ادبیات سے ہمہ تن مخاطب ہو جاتے ہیں ۔ انواع ۔ شخصیت نہایت پیچیدہ اور مشکل موضوع ہے مگر لب لباب یہی ہے ۔ یگانہ کا شمار تیسری نوع ہی میں ہوتا ہے ۔ ماحول کے مکروہات و خرافات سے ٹکر لینے کے لئے انہوں نے اپنی داخلی آویزشوں کو مرتفع کر کے غالب پر مرکوز کر دیا تھا اور ان کا یہ غالب اسد اللہ خاں غالب نہ ہو کر ایک مجموعی عام تھا ان کے حریفین کا کیونکہ شعری حسن و خوبی کے اعتبار سے یاس ویگانہ دونوں غالب کے نزدیک ترین تھے ۔

یگانہ کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم ہو گیا تھا کیونکہ لکھنو والے ان سے اپنی استادی کا لوہا منوانا چاہتے تھے مگر ظاہر ہے کہ یگانہ اپنے آپ کو بحیثیت شاعر ان سب سے کہیں بڑا تصور کرتے تھے ۔ متعدد مشاعروں میں یگانہ کو نیچا دکھانے کی کوششیں کی گئیں ۔ آرزو لکھنوی بظاہر تو اپنے کو اس چپقلش سے دور رکھتے تھے مگر کبھی کبھی یگانہ کو یگانہ سمجھنے میں ان کی اعانت آمادگی دور از قیاس بھی نہ تھی ۔ ایک مشاعرے میں یاس نے اپنی وہ غزل جس کا مطلع ہے

دیکھا دیکھی جو کوئی آپ کا دیوانہ بنے
نقد کیا جان بھی دے بیٹھے تو سودانہ بنے

پیش کی اور اس غزل کا ایک شعر جو مشاعرے پر چھانے لگا وہ یہ تھا ۔

قیمت دل تو ہے معلوم مگر کیا کہئے
مول جب تک نہ کرے کوئی تو سودا نہ بنے

کہا جاتا ہے کہ حضرت آرزو نے اپنے ایک شاگرد سے "سودا نہ بنے" پر یہ شعر پڑھوایا ۔

قیمت جنس وفا ، نیم نگاہی توبہ
ایسی باتیں نہ کریں آپ کہ سودا نہ بنے

اور کہا جاتا ہے کہ شاگرد آرزو کے اس شعر سے یاس کا شعر پٹ گیا ، حالانکہ میری رائے میں یاس کا شعر اپنی جگہ نہایت کامیاب ہے اور شاگرد آرزو کا شعر فارسی تراکیب کا مقبرہ اور بس ۔ یاس کا شعر بہت صاف ہے اور ساتھ ہی بہت تھوڑے الفاظ میں بہت کچھ پیش کیا گیا ہے ۔ شاعر اپنے دل کی قیمت جانتا ہے اور یہ بھی

جانتا ہے کہ دل یاس بیش قیمت بھی نہیں ہے مگر پھر بھی ہے اتنا خود دار کہ جب تک کوئی مول کرنے پر متوجہ نہ ہو وہ خود بخود سودا بننے پر آمادہ بھی نہ ہوگا۔ یاس کے اس شعر سے مخصوص وقار ابھرتا ہے جو شاگرد آرزو کے شعر میں چراغ لیکر ڈھونڈ نے پر بھی نہیں مل سکتا۔ کہنے کی کوشش یہ کی گئی ہے کہ محبوب کی نیم نگاہی عشق جیسی جنس وفا کی قیمت نہیں ہو سکتی ۔ بس استعجاب بھرے لب و لہجے نے قدرے اثر پیدا کر دیا ہے جس کا جادو مشاعرے ہی میں جگایا جاسکتا ہے ۔ مشاعرے کے ماحول میں شعر ضرور اٹھا ہوگا اور پھر ایسے لوگوں کی بھی کیا کمی ہوگی جو شعر کو اٹھانے ہی آئے تھے یا اٹھانے ہی کے لئے لائے گئے تھے ۔ نیم نگاہی نکتہ رس نظر کے لئے اس کیفیت سے قطعاً عاری ہے جو غالب کے اس شعر میں جلوہ در جلوہ موجود ہے ۔

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے
غالب

غالب کے اس شعر کے دوسرے مصرع میں جو لطیف ابہام ہے وہ دلکش بھی ہے اور پر کیف بھی ۔ شاید شاگرد آرزو نے یا محترم استاذی نے اپنے پیش نظر غالب کا یہی شعر رکھا ہوگا اور " نیم نگاہی " کی ترکیب ایسے ہی کیف و سرور پر محیط سمجھی ہوگی ۔ مزید براں " ایسی باتیں نہ کریں آپ " کے بجائے غالباً محتاط زباندانی " آپ ایسی باتیں نہ کیجئے آپ کو پسند کرے گی درحالیکہ بولنے والے " آپ کریں " وغیرہ بولتے ہیں اور شاید اب روز مرہ نے بھی قبولیت بخش دی ہو ۔ آسام جیسی دور دست ریاست میں رہتے ہوئے راقم الحروف اردو روز مرہ سے ناآشنا ہو چلا ہے کیونکہ صرف حافظے ہی پر اکتفا کیا جاسکتا ہے ۔ علاوہ بر ایں ہمہ وقت انگریزی گفتگو نے اردو سے یوں بھی خاصا بعد پیدا کر رکھا ہے ۔ بیچ میں اس جملہ معترضہ کا در آنا نفس مضمون سے کہیں توجہ نہ ہٹا دے ۔ لہذا میں اس بات کو دہرانا چاہتا ہوں کہ معنی آفرینی اور لطافت اسلوب و زبان کے اعتبار سے یاس کا شعر یقیناً بالاتر ہے ۔

اسلوب و معنی آفرینی کے لحاظ سے یاس یگانہ غالب کے دشمن معلوم ہی نہیں ہوتے ۔ غالب کی زمینوں میں بھی یگانہ نے نہایت زبردست کامیابی کا ثبوت فراہم کیا ہے ۔ ژرف بینی متبادلہ فلسفیانہ خیالات اور ان کی جذبات کی زبان سے اظہار یعنی الیٹ کے الفاظ میں خیال کا جذباتی متبادل (Emotional equivalent of Thought) لب و لہجے کا نکیلا پن ، انسان دوستی ، کھوکھلے اقدار پر لطیف طنز ، تصور غم وغیرہ وہ خصوصیات ہیں جن سے کلام غالب مختص و ممیز قدر و منزلت کا حامل ہو جاتا ہے اور یہی ساری کی ساری خوبیاں یگانہ یاس کے یہاں بھی ملتی ہیں ۔

غالب کی زمینوں میں جو کچھ یگانہ نے کہا اور جس انداز بیان سے کہا وہ اپنی نظیر آپ ہے ۔ غالب کی مشہور غزل جس کا مطلع ہے ۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

سہل ممتنع کی بہترین مثال پیش کرتی ہے ۔ یگانہ نے بھی خاصے اچھے شعر نکالے جو سہل ممتنع سے عاری بھی نہیں اور بے کیف بھی نہیں ۔ نمونتاً

کیوں کسی سے وفا کرے کوئی
دل نہ مانے تو کیا کرے کوئی
اپنے دم کی ہے روشنی ساری
دیدہ ، دل تو وا کرے کوئی

مقطع سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ غالب کو اپنے برابر کا شاعر ہی سمجھتے تھے ۔ کہا ہے ۔

غالب اور میرزا یگانہ کا
آج کیا فیصلہ کرے کوئی

اور اسی قسم کی بات یگانہ کے اس مقطع میں ملتی ہے۔

صلح کرلو یگانہ غالب سے
وہ بھی استاد، تم بھی ایک استاد

یگانہ کبھی غالب سے صلح کرتے رہے اور کبھی غالب کے خلاف سلحشوری میں معروف رہے مگر اغیار صرف ان کی سلحشوری پر جھوٹ سچ کے تانے بانے تنتے رہے اور یگانہ کی انفرادیت کو خود پرستی بتاکر چنگ پر چڑھاتے رہے۔

اگر غالب کے یہاں فلسفیانہ نکات پائے جاتے ہیں تو یگانہ کے کلام میں بھی ایسے خیالات جن کو فلسفے پر محمول کیا جاسکتا ہے ملتے ہیں۔ غالب اور یگانہ دونوں در حقیقت فلسفی نہ تھے۔ کسی مربوط نظام فکر کو پیش کرنے والے ہی کو فلسفی کہا جاسکتا ہے۔ خیالات کا ایسا نظام غالب کے کلام میں ہے نہ یگانہ کے کلام میں۔ صحیح معنوں میں صرف اقبال ہی اردو کا ایسا شاعر ہے جس کو فلسفی شاعر کہا جاسکتا ہے۔ یگانہ کے یہاں خیالات کا مربوط نظام تلاش کرنا توسعی لاحاصل ہی رہے گی۔ مگر فلسفیانہ نکات کہیں کہیں ایسی گرہ دیتی پیش کرتے ہیں کہ دل و دماغ مسحور ہوجاتے ہیں۔

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

غم کو خدا شناسی کا وسیلہ تو بہتیروں نے بتایا ہے مگر اس کے ساتھ ارادہ پرستی (Wish fulfilment) کو کسی نے نہیں لیا۔ بخت نارسا کی منزل سے گزرے بغیر لذت آگہی کا حصول ناممکن ہے۔ جو اس نکتہ سے ناواقف ہے وہ صرف اپنے ارادوں کی پرستش پر جان چھڑکے ہوئے ہے۔ وہ کبھی خدا کو نہیں جان سکتا۔ یگانہ کے اس شعر سے ایک یاد تازہ ہوجاتی ہے ایک زخم ہرا ہوجاتا ہے۔ ہر سال میں اپنے استاذی محترم آثر لکھنوی کی زیارت سے کسب فیض کیا کرتا تھا۔ ۴۲ء کی گرمیوں میں جب مرحوم سے ملنے کشمیری محلہ، لکھنؤ پہنچا تو ان کے در دولت پر پاکستان سے آئے۔ وہ نیاز مندوں سے ملنے کا بھی شرف حاصل ہوا۔ دوران گفتگو اثر مرحوم سے یگانہ کے اسی شعر پر رائے طلب کی گئی۔ اثر لکھنوی عزیز کے شاگرد تو تھے مگر اپنے مزاج و ماحول کے لحاظ سے بلند رکھ رکھاؤ کے حامل تھے۔ مرحوم نے یگانہ کے انداز بیان کی بھرپور تعریف کی اور اس المیے پر اظہار تاسف کیا جسکی طرف لکھنو کا ادبی ماحول بڑی مدت سے جولاں کیا جارہا تھا" کاش" انہوں نے مزید فرمایا" یگانہ مشاعروں سے دور رہتے کیونکہ بالعموم مشاعرے جراثیمی ہی ہوتے ہیں اور خواہ مخواہ شاعر چھری کٹاری ہوجاتے ہیں۔"

یگانہ کسی طرح بھی غالب سے کم مزاج شناس نہ تھے۔ نفسیاتی پہلو کی جلوہ گری دیکھنے کے لئے مشتے از خروارے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائے۔

پیالہ خالی اٹھاکر لگالیا منہ سے
کہ یاس کچھ تو نکل جائے حوصلہ مگر

دھواں سا جب نظر آیا سواد منزل کا
نگاہ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا

بند آنکھیں ہوگئیں بیتاب ہوکر گرپڑے
سامنے پیاسوں کے کسنے رکھ دیا ساغر کھلا

برابر بیٹھنے والے بھی کتنے دور تھے دل سے
مرا ماتھا جبھی ٹھنکا فریب رنگ محفل سے

یگانہ نے جگرداری، عزم و حوصلہ کے لئے اپنی شاعری میں جو جگہ دی اس کا ایک خاکہ ان اشعار ہیں ملاحظہ کیجئے۔

مزاج حسن بدلے آسماں بدلے زمیں بدلے
سرائے عشق کیا بدلے گی ذوق جانشیماں کو

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کرکے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سرمار کر تیشے سے مرجانا نہیں آتا

دل بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہمان
وہ آنسو کیا پیے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا

بادِ مراد چل چکی لنگر اٹھاؤ یاس
پھر آگے بڑھ کے خوبیٔ تقدیر دیکھنا

حسن و عشق، فراق و وصال وغیرہ مضامین کو وہ موضوع سخن سے باہر تو سمجھتے تھے مگر پھر کہیں کہیں یہ "غزل نما" موضوعات بھرپور تغزل کے ساتھ سامعہ نواز ہوتے ہیں مثال کے طور پر یہ شعر دیکھئے۔

دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا نہ کیجئے

تمہارے دم سے سلامت ہیں ولولے دل کے
سزا کے بعد خطا پر ابھارنے والے

مرے دل میں لگا کر آگ آنکھیں سینکنے والے
تری چشم توجہ اور قاتل ہوتی جاتی ہے

یگانہ کے یہاں بیشتر ایسے اشعار ملتے ہیں جو زبان زد خاص و عام ہوگئے ہیں اور جن کو بڑی معنویت کے ساتھ موقع بہ موقع استعمال کیا جاتا ہے۔ دیکھئے چند ایک اشعار

کہیں یہ وعدہ فردا پس فردا نہ ٹل جائے
کوئی شام اور آجائے نہ شام بے سحر ہو کر

بڑھتے بڑھتے اپنی حد سے بڑھ چلا دستِ ہوس
گھٹتے گھٹتے ایک دن دستِ دعا ہوجائے گا

یہ ناہموار ہی ہموار ہوجائے تو کیا کم ہے
زمیں سے جب نہیں فرصت تو فکر آسماں کیوں ہو

یگانہ ایسے شخص نے جن کو بلاشک و شبہ سیکولر ذہنیت سے حامل قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں مرزا ظاہر دار بیگوں کی کمی نہیں رہی ہے۔ ظاہر میں کچھ اور باطن میں کچھ قسم کے لوگ بد قسمتی سے اپنا الو سیدھا کرنے میں کامیاب ہوتے رہتے ہیں۔ شاعرانہ چشمک اور چپقلش کا تنازع مذہبی تنازع میں ہوگیا۔ قرآن کو خود قرآن سے سمجھنے کی کوشش میں یگانہ نے صحیفۂ شریف پر حاشیہ لکھنا شروع کیا تھا اور سادہ لوحی یہ کر بیٹھے کہ اپنے کچھ نوشتجات ایک ایسے شخص کو دیکھنے کو بھیج دیئے جو ان کی کرسی اور نامساعد حالات کا خیال و لحاظ بالائے طاق رکھ کر ان کا دشمن ہوگیا۔ اس نے اس نوعیت افواہوں کو ہوا دینا شروع کیا کہ یگانہ نے پیغمبر اسلام کی توہین کی ہے۔ جذبات اس درجہ برانگیختہ کر دئے گئے کہ مارچ ۱۹۵۳ء کے اواخر میں وہ المیہ رونما ہوا جس کے نتائج کو مٹنا اور لکھنوی تہذیب کو بے داغ بنانا ہنوز امکان سے باہر ہی معلوم ہوتا ہے۔ جو کچھ بھی ہوا، شاعری سے ابھرنے والے مذہبی خیالات سیکولر طرز زندگی و روشن خیالی سے قریب ترین ہی کہے جائیں گے۔

کرشن کا ہوں پجاری علی کا بندہ ہوں
یگانہ شانِ خدا دیکھ کر رہا نہ گیا

سب ترے سوا کافر آخر اس بات کا مطلب کیا
سر پھرا دے انساں کا ایسا خبط مذہب کیا

سمجھ میں کچھ نہیں آتا پڑھے جاؤں تو کیا حاصل
نمازوں کا ہے کچھ مطلب تو پردیسی زبان کیوں ہو

مطلب نہیں کوئی ترکِ منزل کے سوا
مقصد نہیں کوئی ترکِ باطل کے سوا
کعبہ کا ہوا میں، نہ صنم خانے کا
سر جھک نہ سکا کہیں درِ دل کے سوا

صبح ازل و شام ابد کچھ بھی نہیں
اک وسعتِ موہوم ہے حد کچھ بھی نہیں
کیا جانئے کیا ہے عالمِ کون و فساد
دعوے تو بہت کچھ ہیں سند کچھ بھی نہیں

یگانہ ذات خداوندی سے منکر نہیں تھے لیکن وہ مذہبیات کے ٹکے بندھے مفہوم سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ ذات ایک ایسا معنی ہے جو اسیر لفظ نہیں ہو سکتا۔ ایک جلوہ ہے جو رنگ سے بالاتر ہے

حسن فطرت بولتا ہے پردۂ اسرار میں
معنیِ بے لفظ پنہاں ہیں زبان خار میں
دم آخر فریب جلوۂ بے رنگ نے مارا
نگاہ یاس ورنہ کیوں گنہگاری یقیں ہوتی

یگانہ کے ان دو اشعار سے بیدل کا ایک شعر یاد آنے لگا۔

نشد آئینہ کیفیت ما ظاہر آرائی
نہاں ماندیم چوں معنیٰ بچندیں لفظ پیدائی

اعتراض وارد کیا گیا کہ معنیٰ تو تابع لفظ ہوتا ہے۔ لفظ ظاہر ہوتے ہی معنیٰ بھی واشگاف ہو جاتا ہے۔ بیدل کا جواب جواب مسکت تھا۔ اس نے کہا کہ لفظ کی اصلیت ایک لفظ سے زیادہ نہیں۔ جو چیز حقیقت میں معنیٰ کہلاتی ہے وہ کسی لفظ میں نہیں سما سکتی۔ یہی یگانہ کہنا چاہتے ہیں کہ ذات ایزدی گرفت لفظ میں نہیں آسکتی۔ لیکن یگانہ کو سمجھتا کون اور سمجھتا ہی کیوں

پیش نظر مضمون کا یہ مقصد نہیں ہے کہ یگانہ کی شاعرانہ خوبیوں کا تجزیہ کیا جائے مگر بر سبیل تذکرہ ان کا شعری محاسن کا خاکہ پیش کرنا ناگزیر ہو گیا کیونکہ اسی وضاحت سے یہ بتایا جاسکتا ہے کہ یگانہ بڑے فنکار تھے۔ ڈی ایچ لارینس (D.H. Lawrence) نے ایک عظیم و لازوال فنکار کے یہاں درج ذیل تین خوبیوں کی نشاندہی کی ہے۔

۱۔ وہ جیتے جاگتے جذبات کا حامل ہوتا ہے (Emotionally alive)

۲۔ دانشورانہ توانائی رکھتا ہے (Intellectually Capable)

۳۔ اخلاقاً بہت ایماندار ہوتا ہے (Morally very honest)

ایک مخصوص بانکپن لئے اسلوب کے ساتھ یگانہ کے یہاں یہ سب کچھ ملتا ہے۔ وہ بڑے شاعر تھے، ایک عظیم فنکار تھے اور کسی معنیٰ میں بھی غالب سے کمتر نظر نہیں ہوتے۔ وہ اپنے کو "غالب شکن" کہتے تھے تو ان کا مطلب "بت غالب شکن" سے ہوتا تھا۔ وہ اس طرز روش کے خلاف تھے جو غالب کو اپنے عیوب پر پردہ ڈالنے کے لئے غالب کو ایک بت بنا کر پیش کر رہی تھی۔ لکھنؤ کے شعراء ایک احساس کمتری کا شکار ہو گئے تھے۔ جس کے کابوس کا ازالہ مرحوم اثر نے اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعہ کیا اور غالب پرستی کے کھنڈر میں دبی میر کی شعری شخصیت کو ابھارا اور اجاگر کیا۔ غرض کہ اثر مرحوم کو چھوڑ کر نیز اسی وقار و وقعت کے دوسرے ہم عصروں کو چھوڑ کر باقی سبھی شعرائے لکھنو یگانہ کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ غالب نفسیاتی پیچاک مرضیاتی نوعیت کا حامل ہو گیا تھا اور جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے یگانہ غالب پرستی کے خلاف تھے اور ٹٹی کی اوٹ میں شکار کھیلنے والے حریفوں پر غالب کو بیچ میں ڈال کر بالواسطہ حملہ کرنے لگے تھے اور بس۔

یہ موضوع مزید شرح و بسط نیز مطالعہ کا مقتضی ہے۔ غالباً یہ مضمون اس سمت و جہت میں آگے بڑھنے کے لئے مہمیز کا کام دے۔ کوئی تنقید حرف آخر نہیں ہو سکتی۔ پائیں سخن، یگانہ چنگیزی، بہ حیثیت شاعر بہت بڑا شاعر تھا اور بڑے شاعر کی پیش کش ہمیشہ ہم عصر (Contemporary) رہتی ہے۔ مزید براں، یگانہ پہلا جواں مرد صاحب نظر تھا جس نے "غالب جنون" کی نشاندہی کی بلکہ غالبیات پر استفہامیہ لگانے کی جسارت کی جس سے ہمارے غالب شناس ہنوز مخاطب نہیں ہو سکے ہیں۔

فیض کی نظم میں اشاریت

پروفیسر عبدالقوی ضیا
(کناڈا)

کہاں سے آئی نگار سحر کدھر کو گئی
ابھی چراغ سر رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

جس منزل کی تلاش میں آزادی کے متوالوں اور سرفروشوں نے اپنی جان کی بازی لگادی تھی اور اپنے سر کٹوا دیئے تھے وہ صبح آزادی کے دامن سے لپٹی ہوئی آئی کہ نہیں ۔ یہ ذرا متنازعہ مسئلہ ہے ۔ بقول فیض "وہ منزل ابھی نہیں آئی" لہٰذا اس کی جہد جاری رکھو اس کے حصول کے لئے ہر امکانی کوشش کرتے رہو ۔ یہی زندگی کی حقیقت اور جان نثاری کی اصل علامت ہے اور سچ پوچھئے تو اسی زندگی کی علامت کا دوسرا نام **فیض** ہے ۔ جو ہماری آپ کی زندگی کی طرح رنگدار بھی ہے تہہ دار بھی ہے پیچیدہ بھی ۔ اوپر دیئے ہوئے اشعار اسی ذہن کی تخلیق ہیں جو اپنی زندگی ہی میں ایک ناقابل فراموش داستان اور ایک ناقابل تردید حقیقت بن چکا تھا ۔ جس کی شہرت اور مقبولیت دور دور تک پہنچ چکی ۔ جس کا آفاق گیر تخئیل، جس کا منفرد انداز بیان، جس کا نرم و نازک لہجہ، جس کی سبک سبک تراکیب آج قبول عام کی سند حاصل کر چکی ہیں اور جس کا انداز بیان اس دور کے نہ جانے کتنے ہی شعراء کا طرز نگارش بن گیا ہے ۔ اور نہ معلوم کتنے ہی دانشوروں نے اس کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنا اسلوب سخن بنالیا ہے پھر بھی اس دور میں کم شعراء ہوں گے جن کے یہاں اتنے گہرے شعور کے ساتھ رومانیت اور کلاسیکیت کا امتزاج، خارجی عوامل کا داخلی کیفیات پر تاثر اور اپنے دور کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی تقاضوں کا صحیح ادراک بہ ایک عنوان نظر آئے گا جیسا کہ فیض کے یہاں موجود ہے ۔ ایسی علامات، تلازمات اور استعارات کا استعمال جو جدید شاعری کے بجائے ہمارے ادب العالیہ اور کلاسیکی ادب سے گہرا تعلق رکھتے ہوں فیض کی شاعری کا حصہ بن گئے ۔ وہ انسانیت کے علمبردار تھے، انسانی محبت سے سرشار تھے انسانی حریت کے نگہدار تھے ۔ جبر و تشدد کے خلاف علامتی انداز میں آواز بلند کرنے والوں میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے ۔ نعرہ بازی علمبرداری اور تخریب پسندی کے وہ قائل نہیں تھے ۔ ان کی سیاسی نظموں کا لہجہ سیاسی کم اور ادبی زیادہ ہے ۔ کہ ان میں نہ تصنع نے دخل پایا اور نہ صنعت گری نے کوئی مرتبہ حاصل کیا روایت اور جدیدیت کے اشتراک کے سہارے اور نئے نئے استعارات، اشارات کے استعمال کرنے کی وجہ سے وہ ہمارے دور کے باشعور نمائندہ شاعروں کی صف اول میں جگہ کے مستحق قرار دیئے گئے ۔ فیض نے حیات انسانی کے پیچیدہ روابط پر گہری نظر ڈال کر اپنی فکر و آگہی کو اس انداز سے ترتیب دیا کہ خود ان کے جذبات سماج کے تمام درد مند اور شکستہ تن افراد کے احساسات کا حصہ بن گئے ۔

فیض نے ہئیت اور اسالیب میں مختلف النوع تجربے کرکے ان میں نئی نئی علامتوں کو داخل کرکے شعر کی وجدانی

کیفیت میں اضافہ کیا اور طرز ادائیگی میں اس قدر شیرینیت اور شعریت گھول دی کہ موضوع اور ہیئت دونوں اس کے تابع نظر آنے لگے ۔ زندگی کے گوناگوں تجربوں کو اشاریت اور رمزیت سے ہم رشتہ کر کے انہوں نے جس اسلوب سخن کی بنیاد ڈالی وہ جدید ذہن رکھنے والے تمام شعراء کی صدائے بازگشت بن گئی اور یوں فیض اس دور کے شعراء کے ترجمان بھی بن گئے اور ترقی پسند ادباء کے مفسر بھی ۔

ترقی پسند تحریک کی بنیاد اس صدی کی تیسری دہائی میں پڑی ۔ فیض کا اس سے نہ صرف قلبی، ذہنی اور روحانی رشتہ تھا بلکہ وہ اس کے بانیان میں سے تھے ۔ انہوں نے مارکسی، اشتراکی اور فرائیڈین نظریات کا نہ صرف مطالعہ کیا تھا بلکہ ان سے پورا فائدہ بھی اٹھایا تھا ۔ ان کی فکر میں غم جاناں پر غم جہاں غالب آیا ۔ غم عشق غم دوراں کے سامنے بے دست و پا نظر آیا ۔ تمام انسانوں کے دکھ ان کے اپنے دکھ بن گئے اور پھر انہیں دکھوں کا اظہار انہوں نے نئے نئے استعارات اور نئی نئی علامات کے سہارے کیا ۔ جس طرح ایڈگر ایلن پو EDGER ALLEN POE نے نئی نئی علامتوں کو تراش کے انگریزی ادب کو ایک نیا رجحان، ایک نیا رخ عطا کیا اور شاعری کا لب و لہجہ ہی بدل کر رکھ دیا ۔ اس طرح فیض نے بھی رمزیت اور اشاریت کو اپنی فکر سے ہم رشتہ کر کے اردو شاعری کو بہت سی نئی جہتیں اور سمتیں عطا کیں ۔

EDGER ALLEN POE (1809-1849)
نے ایک جگہ یہ بات بڑی شائستگی کے ساتھ کہی ہے کہ علامت کا استعمال شاعری کو آفاقیت اور ہمہ گیریت سے روشناس کرا دیتا ہے اور شاعر کے لہجہ میں نغمگی، غنائیت اور وجدانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے ۔ یہی بات پروفیسر ممتاز حسین مرحوم نے اپنے مضمون "دل پر خوں کا ہنر تو دیکھو" میں کہی ہے کہ شاعری اور موسیقی کا ساتھ چولی دامن کا سا ہے" انہوں نے مزید فرمایا "شعر کے پہچاننے کی ایک شرط آہنگ بھی ہے اور الفاظ اپنی شعلہ سامانی کا اکتساب زیادہ تر احساسات کے تلازمات سے کرتے ہیں نہ کہ آواز سے (۱) اب ذرا اس کی روشنی سے اس نظم کا یہ بند ملاحظہ فرمایئے اور اس میں جو ایک نازک سا علامتی رنگ ہے اس پر نظر رکھیئے:

آج پھر حسن دل آراء کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

اس پوری نظم میں اشاریت نہ تو مہمل ہے اور نہ بے معنی اور نہ ہی بے مزہ ۔ اس میں نغمگی بھی ہے ۔ ترنم ریزی بھی، حسن بیان بھی، کیف عرفان بھی اور اس عنوان فیض کی علامتی شاعری ایڈگر ایلن پو نے جو علامتی شاعری کی تعریف کی ہے اس کے بہت قریب آجاتی ہے اور پھر ہم کو یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ اردو شاعری کا علامتی انداز مغربی شاعری کی غنائیت، رومانیت اور اشاریت کے قریب آگیا ہے ۔ اس کے علاوہ ان کی نظم "تنہائی"، تمثیلیت اور اشاریت کے تعلق سے ایک بہت ہی خوبصورت کوشش ہے ۔

پھر کوئی آیا دل زار ! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر دو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود ان کی روح

میں جو تنہائی کا کرب اور اضطراب پنہاں ہے اس کے اظہار کے لئے انہوں نے نئی نئی تراکیب نئے نئے اشارات اور علامات کو اپنے فن میں شامل کر کے قاری کو بہت سی نئی سمتوں اور جہتوں سے روشناس کرایا ہے اسلوب اور ہئیت کے اچھوتے تجربے کر کے اپنے کلام میں انوکھا پن پیدا کیا ہے اور خود اپنی فکر کو توانائی اور گہرائی بخشی ہے۔ ہر چند کہ اس نظم پر یہ اعتراض ہے کہ علامتی انداز جابجا مبہم ہوجاتا ہے اور ایک مصرعہ دوسرے سے لگا نہیں کھاتا۔ پھر بھی مجموعی طور پر یہ نظم ایک جداگانہ تاثر اور ایک منفرد انداز لئے ہوئے ہے اور کہیں کہیں اس پر انگریزی علامتی شاعری کی مہر بھی ثبت نظر آتی ہے۔

فیض کی ایک اور نظم "ملاقات" بھی علامت نگاری کا ایک اچھوتا نمونہ ہے۔

ملاقات

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھوں مشعل بکف ستاروں
کے کارواں گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب اس کے سائے
میں اپنا سب نور رو گئے ہیں
یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے
مگر اسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتے
گرے ہیں اور تیرے گیسوؤں میں
الجھ کے گلنار ہو گئے ہیں

OOOOOO

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

مارٹن فاس MARTIN FOSS نے اپنی کتاب SYMBOLS AND METAPHORS IN HUMAN EXPERIENCE میں یوں علامت نگاری کی تعریف کی ہے کہ علائم کا استعمال شاعری میں کچھ اس عنوان سے ہوتا ہے وہ ہمارے پورے معاشرے اور سارے وجود کی رہنمائی کرے اور وہ بھی اس طرح کہ سلاست اور وضاحت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اس تعریف کو مدنظر رکھتے ہوئے اب اس نظم کو پڑھئے۔ رات کو ایک شجر درد سے مماثل کیا گیا ہے۔ اور یہ درد کا شجر پوری نظم میں علامتی انداز میں حاوی ہے جس نے نظم میں ایک وحدت فکر اور وحدت احساس کا عنصر پیدا کر دیا ہے۔ یہ نظم فیض کی فکر کی بلندی اور بلوغیت کا بھی اظہار کرتی ہے اور یہ بھی بتاتی ہے کہ یاسیت PESSIMISM ایک ختم ہوجانے والا جذبہ ہے اور کبھی نہ کبھی آس اور امید ایک تابناک سحر کی صورت میں رات کے درد کا جو شجر ہے اس کو کمہلا کر رہے گی۔ اور صبح کا روشن چہرہ ہر طرف اجالا بکھیر دے گا۔ آپ نظم پڑھتے جائیے اس کا علامتی انداز مدھم مدھم ہوتا نظر آئے گا۔ وضاحت اور قطعیت ابھرتی نظر آئی گی اور رمزیت کی جگہ صراحت لینے لگے گی۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ آپ اپنے اندر ایک خود اعتمادی کا جذبہ نکھرتے، سنورتے اور ابھرتے پائیں گے اور پھر یہ سوچنے پر مجبور ہوجائیں گے کہ پوری نظم درد کے مارے ہوئے تمام انسانوں کو ایک روشن مستقبل کی نشاندہی کر رہی ہے اور ایک صبح امید کے طلوع ہونے کا مژدہ سنا رہی ہے۔

اسی طرح فیض کی دوسری نظمیں مثلاً "یاد" - "صبح آزادی" اور "رات" میں جو رمزیت اور اشاریت موجود ہے وہ حیات انسانی کی اجتماعی کوششوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں - کہیں کہیں معنی مبہم ہوجاتے ہیں اور یہ بھی احساس ابھرتا ہے کہ جیسے علامت اپنی خصوصیت کھوتی جارہی ہے اور وضاحت اس کی جگہ لیتی جارہی ہے اس کا غالباً ایک سبب یہ بھی ہے کہ فیض مغربی شاعری اور ادب سے بے انتہا متاثر تھے وہ اسٹیفن اسپنڈر STEPHEN SPINDER ، اوڈن AUDEN اور T.S.ELIOT کے دلدادہ تھے - ان شاعروں کے یہاں یہ رجحان عام تھا کہ محرومی کا ذکر تو ہے مگر اس کا سبب بیان نہیں کیا جارہا ہے کہ یہ کن حالات کی پیداوار ہے - حرماں نصیبی کا احساس تو ہے مگر اس کا ماخذ کیا ہے اس کا سراغ نہیں ملتا - رنج و غم، حزن و ملال کا شائبہ تو ہے مگر کن محرکات کے تحت یہ پیدا ہوا، اس کا پتہ نہیں چلتا - فیض کی سیاسی نظمیں اس کے برعکس اپنے ایک مخصوص سیاسی حالات اور واقعات کی پیداوار ہونے کے باوجود ایک وجدانی حس، اک تر و تازگی اور شگفتگی رکھتی ہیں جو ان کو ہر عہد اور ہر زمان میں مقبول رہنے کی ضامن بن جاتی ہیں - فیض کا ذہن اور فن اس قدر تربیت یافتہ تھا کہ وہ رمزیت کو بھی صداقت کے روپ میں پیش کرنے کا گر جانتے تھے - انہوں نے اپنی کئی نظموں میں علامتوں کو نہایت ہی سبک انداز میں بڑے قرینے کے ساتھ پیش کیا ہے - جس کے سبب حالات کی تبدیلی کے باوجود ان نظموں میں جو نغمگی کی کیفیت اور شعری لذت ہے وہ ختم ہونے نہیں پاتی ہے -

دنیائے شاعری میں علامتوں کا استعمال اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود شعر کی تاریخ کا - ہر دور میں شعر کی تخلیق اور تشکیل کے لئے علامتوں کا سہارا لینا اتنا ہی ضروری تھا جتنا کہ صنائع، بدائع، تشبیہات اور استعارات کا استعمال کرنا - علامت نگاری اپنی جگہ خود ایک عظیم فن ہے اور ایک ہی علامت مختلف حالات میں مختلف مفاہیم رکھ سکتی ہے - عموماً استعارہ علامت کی ابتدائی شکل سمجھا جاتا ہے اور اردو شاعری میں استعارے کی وضاحت لازمی ہوتی ہے - مگر علامت کی مکمل صراحت ضروری نہیں سچونکہ وہ ہمارے سامنے غیر واضح شکل میں رمزیت یا اشاریت کی صورت میں ابھر کر سامنے آتی ہے - اس کے تیور کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں کہ جو نقش بھی بنایا جارہا ہے وہ بالکل مبہم نہ ہو - جیسا کہ ہمیں ن - م - راشد یا میراجی کے یہاں نظر آتا ہے بلکہ متعین اور قطعی ہو - اس لحاظ سے فیض کے یہاں اشاریت نہ پیچیدہ ہے نہ ابہامیت کا شکار - وہ جو بات کہتے ہیں وہ نہ تو پہیلی بن جاتی ہے اور نہ ہی معمہ - دوسرے معنوں میں پیچیدگی اور ابہام علامت نگاری کے بنیادی اوصاف نہیں ہیں اور اس معیار پر فیض پورے اترتے ہیں -

علامت نگاری کا نشاۃ الثانیہ فرانس کے اس دور میں ہوا جب اس ملک کا معاشرہ انحطاط پذیر تھا اور ضرورت اس بات کی تھی کہ اس دیمک لگے ہوئے معاشرے کے مسموم اثرات کس طرح نمایاں کئے جائیں اور اس کرم خوردہ نظام کے خلاف آواز کیونکر بلند کی جاتے - فرانسیسی شاعر REMY DE GOURMET نے علامت نگاری کو اپنا نصب العین بنایا اور اس طرح ایک نئی تحریک کی بنا ڈالی - جس نے بہت جلد قبولیت حاصل کرلی - اس کے بعد اسٹیفینے ملارمے STEPHANIE MALLARME نے اس تحریک کو اور آگے بڑھایا اور اس کا شمار بھی اس تحریک کے علمبرداروں میں ہوتا ہے اس کے نزدیک علامت نگاری کی خصوصیت یہ ہے کہ کسی نظریئے یا رجحان کو آہستہ آہستہ جستہ جستہ چابکدستی اور

خوش اسلوبی سے پیش کیا جائے کہ قاری یا سامع تک وہی معنے یا مفہوم پہنچ جائے جو شاعر کے بطون میں ہے۔

ملارمے کے مقلد اور پیروکار ہنری دے ریینے HENRI DE REGINER نے علائم نگاری کی وضاحت اس طرح کی کہ یہ قطعیت اور ابہام کے درمیان ایک نازک رشتہ قائم کرتی ہے۔ یہ ایک کیفیت بھی ہے اور ایک صفت بھی۔ ایک رجحان بھی اور ایک انداز سخن بھی۔ شاعر یا ادیب جو کچھ کہنا چاہتا ہے کہہ بھی جائے مگر دبے دبے انداز میں کھل کر نہیں۔ اس کے نزدیک علامتی شاعری کے درمیان ایک BUILT IN OBSCURITY کا موجود رہنا لازم ہے۔ ریینے کی یہ تعریف دوسرے علائم نگار شعراء سے ذرا سا اختلاف رکھتی ہے۔ آئرلینڈ کے مشہور ادیب شاعر WILLIAM BUTLER YEATS 1865-1939 نے علائم نگاری کو انگریزی ادب میں ایک مخصوص جگہ دی۔ اس کا اپنا عقیدہ یہ تھا کہ علامتوں کے استعمال کے بغیر کوئی اہم اور غیر فانی ادب پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات دوسری ہے کہ علامت کا استعمال ایک فنکار کس عنوان اور کس حس کے ساتھ کر رہا ہے۔ علامت نگاری کے فن کو YEATS نے خاصا پروان چڑھایا۔ اس کی تقلید میں THOMAS STEARNS ELIOT جس نے امریکہ میں پیدا ہونے کے باوجود برطانوی شاعر، ادیب، نقاد کی حیثیت سے شہرت پائی اور اس نظریے کو بار بار دہرایا کہ علامتی شاعری ہر اچھے شاعر کی امتیازی خصوصیت ہوتی ہے۔ جو اس کے مخصوص رویئے، نظریئے یا رجحان کی ترجمانی معنی خیز اشارات کے ساتھ کرتی ہے علامت اشعار میں وہ رنگ بھرتی ہے جو نہ بھڑک دار ہوتے ہیں اور نہ ہی خیرہ کن بلکہ نگاہوں کو بڑے بھلے اور پر سکون لگتے ہیں اور کانوں میں نغمہ کی گونج پیدا کر دیتے ہیں۔

علائم کی ترتیب وتدوین میں شاعران کرام کو ان تمام لوازمات کا خیال رکھنا چاہیے جن کا تعلق اس شعری فضا اور ماحول سے ہو جس سے متاثر ہو کر شعر کہا گیا ہو۔ گویا علامت ایک قطعی مفہوم کا غیر قطعی حوالہ ہوتی ہے اور جس موضوع میں قطعیت نہ ہو اسے مختلف مفاہیم میں دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ اب یہ بڑی حد تک شاعر پر منحصر ہے کہ وہ کس بات کے بیان کرنے میں کس نوع کی علامت کا سہارا لیتا ہے۔

اوپر دی ہوئی علائم نگاری کی تعریفوں میں اگر کوئی معنویت ہے تو پھر علامتوں کا کام اختصار اور ایجاز کے ساتھ پیش کرنا ہے وہ بھی خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ۔ اس عنوان فیض نے ایسے بہت سے تجربات اپنی شاعری میں سمو کر اور مروجہ اور پامال شدہ صنائع و بدائع اور علامتوں کو اپنے کلام میں نئے حسن اور سج دھج کے ساتھ شامل کر کے عصری شاعری کے ڈانڈے ادب العالیہ سے ملا دیئے۔ "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں" والی نظم میں جو علامتیں انہوں نے استعمال کی ہیں وہ کلاسکیت کے ساتھ طبقاتی کشمکش اور انقلابی آہنگ کی آئینہ داری بھی بڑی تازہ کاری اور طرحداری کے ساتھ کرتی ہیں۔ اس کی داخلی فضا زیادہ گھنی اور تہہ دار ہے۔ اس کا تناظر زیادہ وسیع اور موضوع ہمہ گیر ہے۔ آخری بند میں ساغر، شیشے، لعل و گہر محنت کش عوام کی آرزومندیوں، خوابوں، محرومیوں اور ان سے جنم لینے والے انقلابی عزائم کی علامت بن جاتے ہیں

(ڈاکٹر قمر رئیس)

فیض کے یہاں بہت سے علائم وہی ہیں جو ہماری قدیم شاعری کا حصہ ہیں مگر ان کا انداز جداگانہ اور ہنرمندانہ ہے۔ ان کی آرائش و زیبائش ذرا مختلف ہے وہ نہ تو انحطاطی دور میں پہنچنے والے فرانسیسی شعراء کی علامت نگاری سے مطابقت رکھتی ہیں ی اور نہ ہی انگریزی علائم نگاری کی تقلید کرتی ہیں ان کی علامات دراصل ہماری تہذیبی اقدار سے بہت قربت رکھتی ہیں

ان میں ایک تسلسل ہے ۔ ایک ہم آہنگی ہے انہوں نے ہمارے کلاسیکی ادب کی علامتوں اور تلازموں کو ایک نیا پیرہن عطا کیا ہے ، نیا لباس پہنایا ہے ۔ ان کو نئی آب و تاب بخشی ہے ۔ گل دامنی، کج کلہی، سنت منصور و قیس، دار و رسن اور ایسی بہت سی تراکیب اور روایات کو عشقیہ یا حزنیہ انداز میں پیش کرنا ایک علاحدہ بات ہے ۔ ان علامتوں کے ذریعہ اپنے ترقی پسندانہ رجحانات اور اشتراک پسند خیالات کو عام کرنا ایک جداگانہ وصف ہے اور پھر یہ حب الوطنی، انسان دوستی، انسانیت پرستی، طبقاتی ناہمواری، عوامی استحصال کو پیش کرنے کا آلۂ کار بنانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے ۔ انہوں نے اردو شاعری کو بہت سی نئی تشبیہات اور الفاظ سے روشناس کرایا ۔ اور ان کے سہارے اشتراکی حقیقت نگاری کے لئے نئے پہلو تراشے ۔ ممتاز حسین ان کی علامت نگاری کو SYMBOLIC REALISM سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ فیض کے سمبل ذاتی یا نجی نوعیت کے نہیں ہیں اور نہ ہی اس قدیم طرز کے ہیں جن کا استعمال تمثیلی نگارشات میں مجرد زندگی کی نمائندگی کے لئے کیا جاتا ہے " ۔

(پروفیسر ممتاز حسین ۔ "دل پرخوں کا بند تو دیکھو")

ایک دوسرے معروف نقاد احتفاظ الرحمن کے بقول فیض کے علائم " اپنی جگہ خود ایک تحریک ۔ ایک عمل اور پیغام ہیں ۔ یہ پیغام کسی خاص فرد یا قوم کے لئے نہیں ہے بلکہ پوری دنیا کے لئے ہے ۔"

(احتفاظ الرحمن "گندم کے کھیت ۔ بچوں کے ہاتھ اور شاعر" افکار ۔ فیض نمبر ۔ صفحہ ۵۲۹)

ان آراء کے تحت اگر ہم ان کی نظم "کتے" پڑھیں تو اسے ایک عجیب کیفیت کی حامل پائیں گے ۔ جمیل جالبی کے نقطہ نظر کے مطابق یہ نظم ایک نیم سیاسی تمثیلچہ کی اعلیٰ مثال ہے ۔" اور " مجموعی طور پر ایک معجزہ معلوم ہوتی ہے ۔ ہماری تہذیبی اقدار ، ہماری ثقافتی پستی اور ہمارے احساس کمتری پر ایک بھرپور وار ہے ۔ " (فیض ایک تقابلی مطالعہ ۔ افکار فیض عہد ۔ ۱۹۶۵ء، صفحہ ۳۹)

"کتے" بذات خود اس نظم میں تمثیلی انداز میں ابھرتے ہیں اور علامت کے طور پر استعمال کئے گئے ہیں وہ بھی اس طرح کہ نہ کہیں پیچیدگی ہے اور نہ ہی ابہامیت ۔ پوری نظم کا انداز بڑا دلکش ہے اور پرتاثیر ہے ۔ سب سے اعلیٰ بات یہ ہے کہ نظم علامتی انداز کے ہونے کے باوجود شاعر کا مفہوم بڑی خوبصورتی کے ساتھ پڑھنے والوں کو سمجھا دیتی ہے ۔

فیض کی ایک دوسری معروف نظم " بول کہ لب آزاد ہیں تیرے " ان تمام مصیبت زدہ انسانوں کے مسائل کا نقشہ پیش کرتی ہے جو مجبور ہیں، معذور ہیں ۔ مقہور اور بے مقدور ہیں ۔ ساری نظم میں سچائی کے معتبر ہونے اور ایک نہ ایک دن لب کے آزاد ہونے کی پیشگوئی کی جارہی ہے ۔ اس نظم میں آزادیٔ گفتار اور آزادیٔ کردار پر ایمان ہے ۔ انسانیت کی عظمت پر اعتماد ہے حق پرستی کا نعرہ ہے اور حق گوئی کا مطالبہ ہے ۔

اس کی ایک نظم سیاسی لیڈر کے نام پر ذرا ایک نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ رات کی بھیانک تاریکی اور پریشان کن سناٹے کو علامتی انداز میں کس چابکدستی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ۔ اور دل بے تاب کو اطمینان دلایا جارہا ہے کہ صبح ہونے ہی کو ہے بہت جلد یہ سطوت اسباب ختم ہوجائے گی اور گرانباریٔ آداب بھی اٹھ جائے گی ۔ نظم میں ایک مخصوص سیاسی نظام معاشرتی پس منظر میں پیش کیا گیا ہے مگر یہ اسراریت اور معنی خیزیت کے ساتھ کہ آپ اس کو پڑھتے چلے جائیے ۔ نہ کہیں تھکن محسوس ہوگی نہ چبھن ۔ پھر جیسے جیسے نظم آگے بڑھتی جاتی ہے رات کی ظلمت نور و نکہت کے سامنے بے دست و پا نظر آتی ہے اور امید کی کرنیں ہر طرف جگمگانے لگتی

ہیں۔

فیض کی ایک دوسری نظم "رہگزر" بھی علامت نگاری کا ایک حسین مرقع ہے۔ رمزیت کی وہی فضاء ملتی ہے جو T.S ELIOT یا W.B YEATS کے یہاں موجود ہے مگر فیض ان مغربی شاعروں کی طرح اس نظم میں علامتوں کا استعمال برجستہ طور پر نہیں بلکہ جستہ جستہ انداز میں کرتے ہیں۔ ان کی فکر اس قدر متوازن اور منظم (DISCIPLINED) نظر آتی ہے کہ وہ اشاریت کو بھی نزاکت کے ساتھ وضاحت کے شانہ بشانہ لا کھڑا کر دیتی ہے۔

"دریچہ" کے عنوان سے جو نظم ہے اس میں صلیب علامت کے طور پر بڑے تسلسل اور تدبر کے ساتھ استعمال کی گئی ہے یہ ان کی اشتراکیت پسندی کی بھی ترجمان ہے اور حقیقت پسندی کی بھی عکاس ہے۔ اس میں نہ اضمحلال ہے نہ اضطراب، اور نہ ہی اس کا موضوع وقتی یا لمحاتی ہے اور نہ ہی وہ موضوع کسی مخصوص عہد کی نمائندگی کر رہا ہے۔ یہی کیفیت ان کی ایک اور نظم "چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز" میں نمایاں ہے اس میں داخلی واردات بڑی معنی خیزیت کے ساتھ علامتی رنگ اختیار کر لیتی ہے اور چند روز کی ایذا رسانی کے بعد طلوع نو کے ابھرنے کی بشارت دیتے ہیں۔ ظلم و ستم برداشت کرنے کی تلقین ہے عہد تاریکی کے ختم ہونے کا اشاراتی انداز میں یقین ہے۔

فیض ایک نازک احساسات اور لطیف جذبات کے شاعر تھے۔ وہ اپنے مافی الضمیر کو لطیف اشاروں کے سہارے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ واضح طور پر بھی بیان کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ ان کی بیشتر شاعری ان کے نظریات اور رجحانات کی آئینہ دار تھی اور اس بناء پر اس میں ایک مقصدیت کا عنصر شامل تھا۔ لیکن وہ اپنے فن کو محض اس مقصد کی تشریح کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہتے تھے۔

جیسا موضوع ہو ویسا ہی پیرایہ بیان اختیار کرتے تھے۔ جہاں کہیں انہوں نے مناسب سمجھا علامات اور اشارات کا دامن تھاما اور جہاں کہیں اس سے گریز ممکن تھا وہ اپنا دامن بڑی خوبصورتی سے بچالے گئے۔

فیض ایک اعتقادات اور معتقدات کے بھی شاعر تھے اور جن عقائد کو انہوں نے اپنی زندگی اور فن و فکر سے ہم رشتہ کر لیا تھا ان پر مکمل اعتماد بھی رکھتے تھے اسی لئے انہوں نے وہ طرز اظہار اپنایا جس میں ان کے معتقدات کی وضاحت بھی ہو گئی مگر جھنجھلاہٹ کے ساتھ نہیں نرمی اور نرم روی کے ساتھ جہاں کہیں وضاحت درکار نہیں تھی وہاں بات اشاراتی یا علامتی انداز میں کہی انہی لئے علامتوں کا استعمال ان کی شاعری کے اوصاف میں تو شامل ہے مگر یہ اوصاف حمیدہ میں سے نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی ان کے فن کی امتیازی خصوصیت ہے۔ مجموعی طور پر ان کی سیاسی شاعری جبر و تشدد، ظلم و ستم اور ناروا حالات کے خلاف ایک محکم اور موثر آواز ہے اور اس آواز کو بلند کرنے میں کبھی وہ قطعیت سے کام لیتے ہیں تو کبھی علائم کی صورت میں رمز و کنایہ کا دامن تھام لیتے ہیں۔

ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ خون دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں
ہے دشت اب بھی دشت مگر خون پا سے **فیض**
سیراب چند خار مغیلاں ہوئے تو ہیں

طنز و مزاح اور اکبر الہ آبادی

ڈاکٹر محمد ظفر قدوائی ایم۔اے پی۔ایچ ڈی
۱۸- ہرن باڑی لین، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳

میگڈوگل کے نزدیک ہنسی چھوٹی چھوٹی ناگواریوں کے خلاف انسان کی فطری مدافعت ہے۔ لیکن ہربرٹ اسپنسر کا قول ہے کہ ہنسی زاہد قوت چھلک جانے کا نام ہے اور اس کی دلیل وہ یہ دیتا ہے کہ اسی لئے توانا اور تندرست لوگ اکثر بے بات بھی ہنسنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ راقم کے خیال سے اول الذکر نظریہ زیادہ قوی ہے۔ دراصل ہنسی یا طنز و ظرافت کا رجحان ہر ملک کے سیاسی، معاشی، معاشرتی یا تہذیبی اتار چڑھاؤ سے وابستہ رہتا ہے۔ اسی سماجی رجحان کے ساتھ افراد سماج کا تصور بھی بدلا کرتا ہے۔ انسان کے بنیادی اقدار و روایات میں کشمکش کے ساتھ ہی افراد سماج کی طنزیاتی حس بیدار ہوتی ہے اور انسان تصورات کے اعتبار سے گروہوں میں بٹ کر اپنی پسند ناپسند یا رغبت و نفرت کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ یہ اسلوب اظہار کبھی تو سادے طور پر سنجیدگی کے پیرائے میں ہوتا ہے اور کبھی صرف اشاروں میں یا مزاح کی چاشنی کے ساتھ۔

اردو کی ترویج و ارتقاء کے ساتھ ساتھ سماجی، سیاسی یا تہذیبی زندگی میں جو تبدیلیاں آئیں ان کے تجزیے میں بھی یہ صنف معاون نظر آتی ہے۔ طنز میں نفرت یا ملامت کا اظہار کھل کر نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس کی نشتریت میں کمی کرنے کی غرض سے صرف اشاروں کنایوں میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ طنز اپنا بھرپور وار کر جائے اور ناگوار خاطر بھی نہ ہو۔ لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ تضحیک کا پہلو نمایاں نہ ہو ورنہ طنز مذاق سلیم پر گراں گزرتا ہے اور اس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اسلئے ایک اچھے طنزنگار کے لئے ایک مخصوص افتاد طبع یا ذہنی کلچر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے بغیر لطیف طنز ممکن نہیں ہے۔ ویسے تو ایک عام ذہن و فکر کا انسان بھی اپنی پسند یا نفرت کا اظہار کرتا رہتا ہے چونکہ اس کے یہاں وہ مخصوص افتاد طبع نہیں ہوتی اس لئے مخاطب کے برہم ہونے کا اکثر قوی امکان رہتا ہے۔ لیکن ایک طنزنگار اپنا اظہار خیال ایسے پیرائے میں کرتا ہے کہ مخاطب کو برہم کئے بغیر اس کا مقصد حل ہو جاتا ہے۔

ہنسی انسان کا امتیازی وصف ہے کیونکہ انسان کے علاوہ اور کوئی ذی روح نہ کبھی ہنستا ہے اور نہ ہنسنا جانتا ہے۔ جس طرح کسی تکلیف سے رنجیدہ ہو کر انسان اس کا اظہار کرتا ہے اسی طرح خوشی یا ناگواری کے لمحات کا ذکر بھی کسی نہ کسی طور پر وہ کرتا ہے۔ انسان کی خوشی یا خوش طبعی سے اس کے پیش کردہ ادب میں نئی تازگی اور شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔ یوں تو صرف کسی کو ہنسا دینا کوئی مشکل کام یا نازک آرٹ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ کام تو بھانڈ، بہروپئے بھی کرتے رہتے ہیں لیکن ان کا فن صرف بازاری آرٹ ہوتا ہے جس کا ادب سے کوئی علاقہ نہیں۔

اردو ادب میں طنز و مزاح کی ابتدا کے بارے میں کسی خاص دور کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن چونکہ فارسی شاعری کے عناصر اردو شاعری میں رچے بسے ہیں اس لئے صرف اس قدر کہنا ممکن ہے کہ طنز و مزاح کا یہ عنصر بھی اردو شاعری میں فارسی ہی کی دین ہے۔ مزاح صرف شاعری کے لئے ہی مختص نہیں ہے بلکہ اردو ادب کا قدیم سرمایہ جو زیادہ تر نثری قصوں کہانیوں پر مشتمل ہے ان میں بھی کسی نہ کسی حد تک طنز و مزاح کی چاشنی موجود ہے مثال کے طور پر طلسم ہوشربا، باغ و بہار، فسانہ عجائب، سروش سخن، طلسم حیرت، مراۃ العروس وغیرہ وغیرہ۔ سبھی داستانوں اور کہانیوں میں مزاح و ظرافت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ رتن ناتھ سرشار نے تو اپنی مشہور تصنیف فسانۂ آزاد میں خاص طور سے خوجی کے ایسے ظریفانہ کردار کو پیش کر کے اسے اور زیادہ رنگین بنادیا ہے۔ اسی داستان میں ایسے مواقع بھی راقم کی نظر میں آئے ہیں۔ جہاں سرشار کا طنز بے ساختہ قہقہہ کی دعوت دیتا ہے۔ دراصل ہنسی

ایک ایسا سماجی عمل ہے جو بازگشت چاہتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بھی ایک مزاح نگار کی ہنسی میں بے ارادہ خوشی خوشی شریک ہو جاتے ہیں اور اسی لئے مزاح نگار بھی اپنے فن مزاح کو عروج دینے کے لئے کثرت کے ماحول کو پسند کرتا ہے وہ براہ راست تادیب و تہدید سے کام نہیں لیتا بلکہ صرف لطیف اشاروں سے ہی اپنا فشائے دلی ظاہر کرتا ہے اس کا بہہ فن تنقیدی ہوتا ہے اور یہ اس کے اس احساس برتری کی دین ہے جسے ہم اس کے فریب نظر سے تعبیر کر سکتے ہیں ۔ وہ اپنی کوتاہیوں اور غیر آہنگ برتاؤ پر گہری نظر رکھتا ہے اور ان پر کھلے دل سے ہنستا ہے ۔ وہ اپنی اپیل صرف ذہانت طبع کی بنیادوں پر ہی کرتا ہے پھر بھی اپنے آئینہ دل کو غبار آلود نہیں ہونے دیتا ۔ وہ مختلف النوع افراد ، جماعتوں اور پیشوں سے صحیح طور پر واقف ہوتا ہے اور ان کی بوالعجبیوں کو اپنے مزاح کا نشانہ بناتا ہے ۔ وہ اپنے کرداروں کے بے تکے اور کمزور پہلوؤں کو توڑ مروڑ کر مبالغہ آمیزی کے ساتھ مضحکہ خیز انداز میں پیش کرتا ہے ۔

اردو شاعری میں طنز و مزاح ولی دکنی سے لے کر عہد حاضر تک کے شعراء کے یہاں نظر آتا ہے ۔ چنانچہ ولی زہاد ریاکار کو یوں ہدف ملامت بناتا ہے

حقیقت سوں تری مدت ستی واقف ہیں اے زاہد
عبث ہم پختہ مغزاں سوں نہ کر اظہار خامی کا

○

تجھ زلف سیہ مست کے دیکھے ستی زاہد
تجھ زلف کے کوچے میں ایماں بسر آوے

ولی کے بعد اگر ہم شہنشاہ سخن میر تقی میر کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کے یہاں بھی شیخ و واعظ پر پھبتیاں ملتی ہیں مثلاً

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانہ میں
جبہ خرقہ کرتا ٹوپی مستی میں انعام کیا

○

قسمت تو دیکھ ! شیخ کو جب لہر آئی تب
دروازہ شیرہ خانہ کا معمور ہو گیا

میر کے ہم عصر سودا نے اس موضوع پر ایک اور قدم آگے بڑھایا ہے ۔ انہوں نے طنز کے وار کرنے میں صرف ہجو نگاری تک ہی نہیں اکتفا کی بلکہ اس راہ میں کالم گلوچ کو بھی روا رکھا ہے ۔ جس کا ایک ادنی سا کرشمہ ہم ان کی مشہور مسدس جس کا پہلا مصرعہ ہے " ضاحک کی اہلیہ نے جب ڈھول گھر رکھایا " میں ہم دیکھ سکتے ہیں " سودا نے بھی شیخ و برہمن کو نہیں بخشا ہے بلکہ ان کے پردے میں انہوں نے ہندو اور مسلمان دونوں کے کردار و عمل پر بڑے تیکھے وار کر کے ان کے زہد ریائی کا پردہ فاش کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو

دیں شیخ و برہمن نے کیا یار فراموش
یہ سبحہ فراموش وہ زنار فراموش

○

جب پھونکئیے ناقوس صنم خانہ ، دل شیخ
کعبہ کا ترے وجد میں دیوار و در آوے

اس تجزیئے کا یہ مطلب نہیں کہ اردو شعراء نے صرف شیخ و برہمن پر ہی اپنی طنزیہ توجہ مرکوز رکھی اور ان کے پیش نظر کوئی دوسرا موضوع نہیں تھا جس پر وہ اپنی جودت طبع کا مظاہرہ کر سکتے ۔ لیکن سودا کے ماقبل ولی اور خسرو کے ہم عصر میر جعفر زٹلی کے کلام کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس اعتبار اور شدت سے انہوں نے اس طرز شاعری کو برتا ہے اسی کی بدولت وہ زٹل گویا زٹلی مشہور ہوئے اور اس لفظ سے ان کو اس قدر شہرت ملی کہ گویا زٹلی ان کے نام کا جزو ہے ۔ جعفر نے صنف نازک کے ساتھ اپنے تلخ تجربات اپنے مخصوص انداز میں بڑی صاف گوئی سے بیان کئے ہیں کہ لطف مزاح کے ساتھ ساتھ ان کے اشعار غور و فکر کا سامان بھی مہیا کرتے ہیں ۔ چند بند ملاحظہ ہوں ۔

(۱)

جورو لڑا کا گر بود
پر خوف و ڈراں گھر بود
وہ گھر سدا ابتر بود
اس گھر سے گنگا پار بہ

(۲)

جو نار چھلے چھال میں
سسکی بھرے ہر حال میں
کالا تو ہے کچھ دال میں
از قرب او زنہار بہ

(۳)

جو انڈ ہو کاجل کرے
چوئے چندن پرمن دھرے

مہندی   لگا   اٹھن   کرے
برگرتو نش   طوار   پہ

اس کے بعد مصحفی اور انشا نے اس موضوع کو اپنایا اور خوب کیچڑ اچھالی ہے ان کی شاعری میں طنز کم مزاح کی فراوانی ہے۔ جراءت بھی اس قبیل سے تعلق رکھتے تھے ان کے یہاں بھی ہنسی اور ٹھٹھول بہت زیادہ ہے۔ ان سب ہی میں باہم دیگر معرکہ آرائیاں ہوتی رہتی تھیں اور ایک دوسرے کو زچ کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ اس کے علاوہ اور کوئی صحتمند مقصد ان کے پیش نظر نہیں تھا۔ مصحفی کے شعر

تھا مصحفی بہ مایل گریہ کہ پس از مرگ
تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

کو سن کر انشا نے فوراً اس پر یوں تضمین کی

تھا مصحفی کانا جو چھپانے کو پس مرگ
رکھے ہوئے تھا آنکھ پر تابوت میں انگلی

مصحفی کا یہ شعر بھی ملاحظہ کے قابل ہے

سرمشک کا ہے تیرا تو کافور کی گردن
نے موئے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن

اس شعر کا انشا نے یوں بخیہ ادھیڑا ہے

توڑوں گا خم بادۂ انگور کی گردن
رکھ دوں گا وہیں کاٹ کے اک حور کی گردن

مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا ایسا ثقہ اور مولوی بھی تفنن طبع پر آتا ہے تو ناصح سے یوں ہم کلام ہوتا ہے۔

یہ تو کہیئے کہ حضرت ناصح
آپ انسان ہیں کہ بندر ہیں

اسی زمرے کے حضرت ریاض خیرآبادی بھی ہیں۔ جن کا یہ شعر بھی ملاحظہ کے لائق ہے

اک ٹیپ دی تھی حضرت زاہد کے اے ریاض
اب ہاتھ مل رہے ہیں کہ اچھی پڑی نہیں

اور علامہ اقبال نے تو زاہد و شیخ کے ان کے اقوال و افعال میں تضاد اور زہد ریائی کا ہمیشہ پردہ فاش کیا ہے۔

یہ پیران کلیسا و حرم اے وائے مجبوری
صلہ ان کی کد و کاوش کا ہے سینوں کی بے نوری

امید حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے
ہیں

ابتداء میں طنز و مزاح کا یہ سلسلہ صرف ہنسی مذاق یا تفنن طبع کے اسباب ہی فراہم کرتا تھا اس کے علاوہ طنز نگاری کا اور کوئی تعمیری یا صحت مند مقصد سمجھ میں نہیں آتا۔ آخرکار طنز و مزاح کے افق شاعری پر اکبر الہ آبادی (۱۸۴۶ء - ۱۹۲۱ء) کے روپ میں ایک نیا آفتاب طلوع ہوا جس نے اپنے کلام کو ایک بامقصد اور مفید طنز کا پیکر عطا کیا۔ انہوں نے ملک و قوم کے گھناونے اور رستے ہوئے ناسوروں پر نہایت کارآمد نشتر لگاکر باتوں باتوں میں اصلاح معاشرے کی خاطر تعلیمی، دینی، سماجی، نقائص کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے لیکن ایسی چابکدستی سے کہ ان کے نصائح نہ کبھی تلخ ہوتے ہیں اور نہ ان کا مذاق سوقیانہ بلکہ اس کی تہہ میں ادب آموز سچائیاں چھپی ہوتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ایک ایسے طرز کی بنا ڈالی جس کے وہ خود ہی موجد تھے اور خود ہی خاتم بھی اکبر کے اس طرز خاص کی نقل نہ صرف یہ کہ محال ہے بلکہ ناقابل رسائی بھی۔ انہوں نے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی اور سب ہی میدان کے وہ قابل شہسوار نظر آئے۔ اکبر کی طنزیہ شاعری کو ہم مندرجہ ذیل اقسام میں موضوع کے اعتبار سے تقسیم کر سکتے ہیں۔ مثلاً مذہب سیاست تہذیب نو پردہ اور تعلیم نسواں اور ظرافت یا طنز محض ایک موقع پر مسلمانوں کی مذہب کی طرف سے صرف نظر پر یوں لے دے کی ہے۔

داڑھی خدا کا نور ہے بے شک مگر جناب
فیشن کے انتظام صفائی کو کیا کروں

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے
کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن

مسلمانوں کی یہ کیفیت بھی ان کے پیش نظر ہے

مصیبت میں بھی اب یاد خدا آتی نہیں ان کو
دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

لیکن اس پر بھی وہ مایوس نہیں ہیں اکبر کی نگاہ میں اب بھی ایک امید کی کرن ایسی ہے جو قوم مسلم کو خواب غفلت سے بیدار کر دینے کی صلاحیت لئے ہوئے ہے۔

بے نمازوں میں ہیں اور اس پہ شرماتے نہیں
یہ غنیمت ہے کوئی ٹوکے تو گرماتے نہیں

یا یہ شعر بھی

آج بنگلے میں میرے آئی تھی آواز اذاں
جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

اکبر کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ان سے قبل کے زمانے میں تو لوگ پابند صوم و صلواۃ تھے لیکن تعلیم جدید نے تو یہ رنگ جمایا ہے کہ موجودہ نسل دین سے بیزار ہوتی جارہی ہے اور تعلیم کا یہ حال ہے کہ

ٹرخا دیا ہر اک کو مغرب نے پاس کرکے
سید بھی کورے نکلے برسوں مساس کرکے

اکبر پردہ کے سخت حامی تھے اور تعلیم نسواں صرف مذہبی شعار کے برت سکنے کی حد تک وہ مناسب سمجھتے تھے نہ کہ ایسی تعلیم جو عورتوں کے دامن حیا کو داغدار بنادے۔ ملاحظہ ہو۔

پردہ اٹھتا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں
حوریں کالج میں پہونچ جائیں گی غلمان تو ہیں

غریب اکبر نے بحث پردہ کی کی بہت کچھ مگر ہوا کیا
نقاب الٹ ہی دی اس نے کہکر کہ کر ہی لے گا مرا موا کیا

نظر میں تیرگی ہے اور رگوں میں ناتوانی ہے
ضرورت کیا ہے پردے کی جہاں بجھے کا پانی ہے

اس لئے تعلیم نسواں وہ ان حدود میں روا رکھتے تھے۔

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

دوا ہے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

ذی علم و متقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم
استاد اچھے ہوں مگر استاد جی نہ ہوں

ورنہ اکثر اس مغربی طرز تعلیم کا یہ ثمرہ بھی نظر آسکتا ہے۔

تمام شہر میں بیوی کا دوستانہ ہوا
کلب ہوا مرا گھر یا غریب خانہ ہوا

ہمارے ملک میں ہوتا ہے کیا تعلیم نسواں سے
بجز اس کے کہ باوا اور بھی گھبرائیں اماں سے

مجھ سے بیگم نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

اکبر ایک کٹر قسم کے پابند شرع انسان تھے پھر بھی ان مشاغل سے الگ ہٹ کر فرنگیوں کا سرزمین ہند پر تسلط انہیں برداشت نہ تھا لیکن جب قوم کو جدید رنگ میں رنگا ہوا دیکھتے ہیں تو اس طرح کف افسوس ملتے نظر آتے ہیں۔

سینت کس مصروف کاردیں بقلب مطمئین
یک فنافی اللہ نرست دک فنافی الثارین

فرنگیوں کے بڑھتے ہوئے قدم اور عزائم دیکھ کر انہیں ہندوستان کی آزادی ایک امر محال سا لگتا ہے۔ اس لئے کہ پوری قوم بے حس ہوکر رہ گئی ہے اب اس کے نزدیک اقدار و روایات اور عزت نفس قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔

نہ تیر افگنی ہے نہ وہ حکمرانی
نہ وہ وضع ملت نہ قرآن خوانی

اور دوسری طرف فرنگیوں کی یہ سازشیں ہیں

کامیابی کا سودیشی پر ہر اک. دربستہ ہے
چونچ طوطا رام نے کھولی مگر پربستہ ہے

اور پھر قوم کو اس کے جمود پر یوں غیرت دلاتے ہیں

یہ دال لب گنگ کبھی گل نہیں سکتی
کلوکے پٹاخے سے بلا مل نہیں سکتی

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلواروں کو
جب توپ مقابل ہے تو اخبار نکالو

آخر میں چند متفرق اشعار بھی ملاحظہ کے لئے پیش ہیں جن میں اکبر کی ظرافت طبع کے جوہر نمایاں طور پر موجود ہیں۔

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور یہ فرمادیا
آپ بی اے پاس ہیں اور بندہ بی بی پاس ہے

دوزخ کے داخلہ میں نہیں ان کو عذر کچھ
فوٹو کوئی لگادے جو ان کا بہشت میں

نہیں پرسش کی کہ دل میں الفت اللہ کتنی ہے
یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے

کیا پوچھتے ہو اکبر شوریدہ سر کا حال
خفیہ پولیس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

وہ بھلا کسی کی بات مانے ہیں
بھائی سید تو کچھ دیوانے ہیں

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

حقیقت یہ ہے کہ کم استعداد شعر فہمی رکھنے والوں کے لئے تو اکبر کے اشعار صرف ہنسی اور مزاح ہیں لیکن نگاہ نکتہ شناس ہیں وہ اپنے دامن میں معنویت کا بسیط سمندر لیے ہوئے ہیں۔ اکبر کا طنز اس بدلے ہوئے سماج کی دین ہے جب اہل ہند مغربی تعلیم و تہذیب کے اس قدر دلدادہ ہوگئے تھے کہ انگریز بننا اور بابو کہلانا باعث فخر سمجھتے تھے۔ غرضیکہ مغربیت کی گہری چھاپ ان کے دل و دماغ پر لگی ہوئی تھی۔ اب نہ دین کا وہ تصور باقی تھا اور نہ مادر وطن کے لئے وہ تڑپ۔ ہر طرح کے اثرات غلامی ان کی ذہنیت پر طاری تھی۔ ایسے میں اکبر نے اپنے پرجوش اشعار میں انگریزی تہذیب اور انگریزی سماج کا جیسا خاکہ اڑایا ہے وہ کسی مولوی کے وعظ سے ہرگز ایسا اثر پذیر نہیں ہو سکتا تھا انہوں نے اپنے گرد و پیش کے ماحول پر سخت لعن طعن کی اور اس بدلے ہوئے سماج کا ذمہ وہ انگریز قوم کو سمجھتے تھے اس لئے مغربی تہذیب کے اس درخت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی انہوں نے اپنے اشعار کے وسیلے سے سعی بلیغ کی اور اس میں انہوں نے مصلحت وقت کا قطعی لحاظ نہیں رکھا چنانچہ اس قدامت کی بناء پر پوری پبلک ان کا ساتھ نہ دے سکی۔ اکبر ترقی تہذیب کے منکر نہ تھے۔ لیکن ترقی کا مذہب سے متصادم ہونا انہیں کسی حال میں برداشت نہیں تھا۔ لیکن بایں ہمہ ان کی شہرت اور کمال فن پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ بلکہ کوئی فرد یا جماعت ایسی نہیں ہے جو ان کے فن اور اس کی اثر آفرینی کی قائل نہ ہو۔ احترام مذاہب و قوم ان کا نصب العین اور طرہ امتیاز ہے اور اس کو ہم ان کی شاعری کی شان نزول کہہ سکتے ہیں۔

سرکش

عین رشید

بازکی طرح جھپٹا وہ برہم فرشتہ
اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑے ہوئے اس سے بولا
"میں تمہارا فرشتہ ہوں سن لو
اپنے سارے فرائض تم انجام دو گے
میری مرضی ہے یہ
سیہ کاروں، غریبوں، احمقوں سے
ہمیشہ پیار کرنا تم ہمیشہ پیار کرنا
تاکہ جب آئیں انسانیت کے مسیحا
فتح کا سُرخ قالین ان کے لئے
اپنے اخلاق سے تم بُنو
اس سے پہلے کہ تم خود سے بیزار ہو
اس کی عظمت سے دل کو منور کرو
اوج عشرت ہے یہ اوج عشرت ہے یہ
دیرپا، دیرپا، دیرپا، دیرپا"

درسِ الفت میں مشغول وہ رب زدہ
اپنے انداز سے پیار کرتا رہا
اور خدا جانتا ہے کہ دورانِ درس
ایک مظلوم منکر کا ننھا سا دل
اس فرشتے کی مٹھی میں تڑپا کیا
پر وہ کمبخت انسان اس سے مسلسل یہ کہتا رہا
جاؤ کہہ دو کہ مجھ سے نہیں ہوگا یہ
نہیں ہرگز نہیں، نہیں، ہرگز نہیں!

کون ہے تو؟

مینا رشید

راز کی ساری باتیں تجھ سے کرلوں میں
پھر بھی جی کا حال چھپاؤں
کون ہے تو ؟

سایہ میرا مجھ کو دیکھ کے بھاگے ہے
پھر بھی میرے ساتھ رہے ہے
کون ہے تو ؟

شرم سے سر جھک جائے جب بھی آئے تو
پھر بھی دل کے پاس رہے ہے
کون ہے تو ؟

ابھی تری قربت ہی زیست کا باعث ہے
پھر بھی تجھ سے ڈر ہی لگے ہے
کون ہے تو ؟

تیری سانسوں کا موسم ہی موسم ہے
تیروں کا موسم ہی لگے ہے
کون ہے تو ؟

تجھ کو دیکھ کے پیار سے دل بھر آئے کبھی
دو بجے لمحے جی لرجے ہے
کون ہے تو ؟

تجھ کو دیکھ کے خشک ہوجائیں ہونٹ کبھی
باتیں کرنے کو دل ترسے
کون ہے تو ؟

تیرے من کی باتیں من کی باتیں ہیں
پھر بھی من کی بات نہ سمجھے
کون ہے تو ؟

جھک کے جب بھی دیکھوں اپنی لگتی ہے
پھر بھی مجھ سے دور رہے ہے
کون ہے تو ؟

گیارہویں اور آخری قسط

ترجمہ: ف۔ س۔ اعجاز

صرف ایک خواب؟

عرض مترجم: "خوابوں کے اسرار" کا سلسلہ یہاں ختم کیا جاتا ہے جس ذہنی سطح کے قارئین کے لئے یہ پیش کیا گیا اس نے اسے پسند کیا۔ ناقدین جانتے ہیں کہ اتنی معیاری اور منفرد چیزیں پیش کر کے ہم دراصل اپنے لئے نقصان کو دعوت دیتے ہیں۔ ترجمے کا فن کبھی کبھی تو اتنا کٹھن ثابت ہوتا ہے کہ دماغ جلا کر رکھ دیتا ہے۔ کچھ اپنی طبیعت مشکل پسند واقع ہوئی ہے۔ میں نے ہمیشہ ادب میں کسی نہ کسی قلت کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ خوابوں سے متعلق اتنا بھرپور اور مستند لٹریچر انگریزی سے ترجمہ کر کے پیش کیا۔ اس ترجمے میں بہت دشواریاں پیش آئیں۔ مختلف وجوہات کی بناء پر اسے پورا کرنے میں ۶ سال ضرور لگ گئے۔ سکون اور اضطراب کے خوابوں کا تجزیاتی اور نظریاتی مطالعہ کرتے کرتے اور انگریزی سے اس امریکی کتاب "The Secrets of Dreams" کے چودھویں ایڈیشن کا اپنی زبان میں ترجمہ کرتے کرتے مجھے از سر نو علم ہوا کہ انسانی دماغ کو جس قدر سائنس سمجھ چکی ہے اس سے بہت زیادہ ابھی اس کا سمجھنا باقی ہے۔ خواب انسانی دماغ کا انفرادی، سماجی اور تاریخی فعل ہے۔ مولوی، پنڈت اور تانترک تعویذوں اور منتروں کے ذریعہ بھولے بھالے اور لاعلم انسانوں کو خوابوں کی تعبیر بتا کر اور انہیں تباہی کے اندیشے میں مبتلا کر کے اپنے روزگار چلاتے ہیں۔ اس کتاب کے گزشتہ ابواب میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ سائنس خود خوابوں کے سلسلے میں مذہبی نظریوں کو قدر و تصدیق کی نظر سے دیکھتی ہے۔ لیکن خوابوں کے ان "کرشمہ بازوں" کو مذہبی اپروچ کا بھی علم نہیں۔ میں نے برسوں لوگوں کو تعویذ لیتے دیتے دیکھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ لوگ مولویوں، عاملوں اور کاملوں کی تجاویز پر فوری عمل کرنے کے لئے خود کو آمادہ پاتے ہیں۔ انہیں آگے پیچھے کے علم کا تجسس نہیں ہوتا۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ جہالت اور لاعلمی ہمارے اجتماعی اور انفرادی شعور کا حصہ بن چکی ہے جس نے خوابوں کی تشریحات کے سلسلے میں ۹۵ فیصد اکثریت کو صرف بھٹکایا ہے۔ جو علم سائنسی تحقیق نے فراہم کیا ہے لوگ اسے قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ کیونکہ سائنس جہاں علم فراہم کرتی ہے وہاں آدمی سے اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ وہ اس علم کے مطابق عمل کرے۔ میں اپنے آپ کو اگر نمونے کے طور پر پیش کروں کہ میں ایک ایسا شخص ہوں جس نے اس کتاب کے علم کو کسی حد تک اپنے اندر سمو لیا جس نے مجھے اپنے خوابوں کے ذریعہ ذات اور کائنات کی تھوڑی بہت معروضی اور عقلی تفہیم کی صلاحیت بخشی اور میرے دماغ کو ہر خواب کے بعد فوری گمراہی سے بچا لیا تو عام لوگ مجھے مزاحاً "نمونہ" کہکر فرحت محسوس کریں گے اور بس۔ لیکن جن لوگوں کو اس موضوع سے علمی دلچسپی ہوگی وہ سائنس کی گہرائی میں اترنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ ترقی یافتہ ——— بلکہ مجھے کہنا چاہیے کہ تعلیم یافتہ قومیں جن میں مصوری کی خاص قدر پیدا ہو چلی ہے وہ آہستہ آہستہ علوم خواب سے آشنا ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

انشاء کے ذریعہ جن خاص لوگوں نے یہ مضامین پڑھے ان میں سے کچھ لوگ میرے مقصد کی گہرائی تک بھی پہنچ گئے۔ یعنی ادب کے ناقد کے لئے کوئی سبجکٹ بیکار نہیں ہوتا۔ خواب کا وسیع مطالعہ کرنے کے بعد اگر آپ شاعری اور افسانے کا وہ حصہ دوبارہ پڑھیں جو شعراء اور افسانہ نگاروں نے خوابوں کے بارے میں راست لکھا ہے یا پس منظر کے طور پر اپنی تخلیق کا علامتی یا واقعاتی جزو بنایا ہے تو آپ پر نہ صرف نئے اسرار کھل جائیں گے بلکہ کئی نئے تخلیقی اور معنوی دریچے بھی وا ہو سکتے ہیں۔ قریب کی مثالیں لیجئے۔ اختر الایمان کی کئی نظموں اور جیسا کہ مجھے میرے قارئین نے بتایا سریندر پرکاش کے کئی افسانوں تک صحیح رسائی کے لئے اس قسم کے ادب کی ضرورت ہے۔ لیکن میری رائے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سبجکٹ کو کسی نہ کسی شکل میں کالج اور یونیورسٹی

کے ادبی نصاب میں داخل کیا جائے ۔ کبھی سعادت نصیب ہوئی تو "خواب اور شاعروں کا تخلیقی عمل" کے عنوان سے چند شعراء کا تجزیہ پیش کروں گا اور کچھ اپنی بھی بیان کروں گا۔

چاہتا ہوں کہ ذہین قارئین اپنی تازہ ترین اور مجموعی رائے سے مجھے مطلع فرمائیں۔

ف - س - اعجاز

اس مقام تک آتے آتے آپ اس نتیجہ پر پہنچے ہوں گے کہ آپ جو کچھ خواب میں دیکھتے ہیں اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں اور کم سے کم درجن بھر طریقوں سے اس کی تفسیر بھی کر سکتے ہیں ۔ یہ درست ہے کہ آپ کو کسی بھی شبیہہ کے امکانات کو ٹٹولنا اور تولنا پڑتا ہے ۔ کیا یہ ایک علامت ہے ؟ کیا یہ جنسی یا دوسری قسم کی شبیہہ ہے ؟ جب آپ نے خواب میں ان شبیہوں کو دیکھا تو کیا محسوس کیا اور اب ان کے بارے میں سوچ کر کیسا محسوس کرتے ہیں ؟

زیادہ امکان اس کا ہے کہ آپ کے جوابات میں ایک تطبیق پائی جائے گی ۔ خاص طور پر جب آپ خواب کے مقصد کے قریب آرہے ہوں گے تو ایسا ہونے کی قوی امید ہے ۔ اگر آپ کسی خواب کے بارے میں "نظریہ" قائم کریں گے تو فوراً آپ کو پتہ چلے گا کہ خود آپ کے باطن میں کیا چھپا ہوا ہے بکواس ہے یا کچھ اور ۔ لیکن آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ آپ کسی پرانے خواب کو دوبارہ پلٹ آنے یا " جگہ سے بے جگہ " ہونے کا حکم نہیں دے سکتے ۔ اور اس طور پر آپ کوئی نتیجہ نہیں نکال پائیں گے ۔ جب آپ اپنے دماغ میں ایک تھوڑی سی کھٹک یا معدے میں ایک چبھن سی محسوس کریں اور کوئی آواز آپ سے کہے "ہاں ایسا ہے!" اس وقت اس بارے میں آپ کا شک رفع ہو جائے گا ۔ خواب کی تفسیر کی صحیح قدر صرف اس وقت متعین کی جا سکتی ہے جب آپ اپنے بارے میں سچائی کو ماننے اور اسے تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں ، ورنہ نہیں

الہام

صدیوں کی تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ انسان نے خوابوں کو اپنی زندگی کی دولت کی تعمیر کے لئے کئی طرح استعمال کیا ہے ۔ نیند کے ان تجربات کی مدد سے کتنی فتوحات یا کامیابی ممکن ہوئی ہیں ۔ آپ اپنے بارے میں خوابوں کی بدولت کچھ نہ کچھ جان لیتے ہیں اور اگر خوش نصیبی کا دامن وسیع ہو تو خارجی دنیا کے بھی کئی اسرار آپ پر ظاہر ہو جاتے ہیں نیند میں جب دماغ اطلاعات چھانٹتا رہتا ہے اور جاری امور معلومہ (INPUT OF DATA) میں کمی واقع ہو جاتی ہے اس وقت دو اور دو چار ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے ۔

آرکیمیدس نے غسل خانہ سے نہاتے نہاتے ایک جست لگائی اور چلایا تھا "اوہ، مل گیا!" یہ کہانی ہر کوئی جانتا ہے ۔ اس نے اچانک ہی ٹھوس چیزوں کا حجم ناپنے کا طریقہ اتنے سے مشاہدے سے حاصل کر لیا تھا کہ ایک ٹھوس چیز پانی کا کتنا حجم کاٹتی ہے ۔ اس وقت وہ عالم استراحت میں تھا اور ظاہر ہے اس کے دماغ کا شعوری حصہ اس کی کوئی مدد نہیں کر رہا تھا لیکن اس عالم نیند میں اس مسئلے کا حل اس کے ہاتھ آگیا جس نے کئی ہفتوں بلکہ مہینوں سے اسے پریشان کر رکھا تھا۔

نائلز بہر (NIEHLS BOHR) مشہور ڈینش ماہر طبیعیات کی مثال اور بھی جدید ہے ۔ جب وہ ایک طالب علم تھا تو اس نے ایک غیر معمولی طور پر صاف ستھرا خواب دیکھا جس میں ایک سورج تھا جو جلتی ہوئی گیس کا بنا ہوا تھا جس کے گرد سیارے طواف کر رہے تھے یہ سیارے بلب کے نازک اور پتلے تاروں میں پروئے ہوئے تھے ۔ نیند سے بیدار ہو کر اس نے غور کیا کہ اس خواب نے اسے ایٹم کی ساخت سمجھا دی ہے ۔ اس سے اسے ایٹمک فزکس میں مزید تحقیق کی تحریک ملی ۔ بہرحال ایسی الہامی اڑانیں ہمیشہ سائنسی تجدیدات کی کھوج خبر نہیں دیتیں۔

ایلیاز ہاوے (ELIAS HOWE) ایک امریکی تھا جو پہلی بار ایک سلائی مشین تیار کرنا چاہتا تھا ۔ اس نے خواب میں کیا دیکھا کہ اسے وحشیوں نے قید کر لیا ہے اور ان کے بادشاہ نے اسے حکم دیا ہے کہ وہ ایک مکمل سلائی مشین ایجاد کرے ۔ ورنہ اپنا انجام سمجھ لے اس نے لگاتار کوششیں کیں مگر ناکام رہا ۔ اس کی بدقسمتی سامنے آگئی ۔ وحشیوں نے اپنے بھالے اٹھا کر اس کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔

اچانک لیلیاز نے دیکھا کہ تمام بھالوں کی انیوں میں آنکھ جیسے سوراخ تھے۔ جب وہ جاگا تو اس نے سمجھ لیا کہ اس خواب نے وہ راز اس پر کھول دیا ہے جس کی تحقیق میں وہ برسوں سے لگا ہوا تھا۔ مشین میں دھاگے کو ایک سوئی کے ناکے سے لازماً گزرنا پڑتا ہے۔ کتنی معمولی سی بات تھی لیکن سلائی مشینوں کے ڈیزائن میں کتنا بڑا انقلاب لے آئی۔

فریڈرک کیکولے (FRIEDERICH KEKULE) کے خواب کا انکشاف بہت مشہور ہے۔ اس نے بینزن رنگ (BENZENE RING) یعنی بینزن کے ذرے یا سالمہ (MOLECULE) کی جوہری ساخت (ATOMIC STRUCTURE) پر دھاوا بول دیا۔ یہ ایک خواب کے سبب ممکن ہوا جس میں اس نے ایک سانپ کو دیکھا جو اپنی دم چبا رہا تھا۔ اس فوری اور درست ترین تحقیق نے اسے سائنسدانوں کے سامنے ایک تقریر کرنے پر مجبور کر دیا جس میں اس نے یہ ایک فقرہ بھی کہا:

" شریف لوگو، ہمیں خواب دیکھنے کا طریقہ سیکھنا چاہیے۔ اس کے بعد ہی شاید ہم حقیقت تک پہنچ سکیں گے "

تھامس ایڈیسن، ٹیلی فون کا موجد، خواب کی افادیت کا اس حد تک قائل تھا کہ اس نے دن میں کام کے اوقات کے درمیان بھی قیلولہ کی عادت ڈالی لی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ کئی بہترین اور نئے خیالات اور نئی ایجادات کے پیغامات اسے عالم غنودگی میں موصول ہوتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ایسے تجربات لوگوں کو جاگتی زندگی میں بھی حاصل ہوتے ہیں۔ وجدان کا ایک لمحہ، سچائی کا اچانک ہاتھ آنے والا ایک پل بھی سائنسی تحقیق کا ہی ایک ذریعہ ہے، اگرچہ یہ سست رفتار ہو سکتا ہے لیکن ماہرین کو جو بات لبھاتی ہے وہ یہ کہ ایک خواب کے دوران جو لاشعوری دماغ سے نکلنے والے کئی پیکروں اور شبیہوں کا اجتماع ہوتا ہے وہ دنیا کی کارگزاری کے اندر تک اتر جانے اور اس سے کچھ باہر نکال لانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

خواب اور آرٹ

نہ صرف سائنس کی دنیا میں بلکہ آرٹ میں بھی خواب اپنا رول ادا کرتے ہیں۔ فرائڈ نے ایک بار کہا تھا کہ یہ میں نہیں ہوں بلکہ شاعر ہے جو لاشعور کو دریافت کرتا ہے تاریخ میں آرٹ اور ادب میں تمثیلوں سے مالا مال ہوتے رہتے ہیں جو تخلیقی ذہنوں میں جنم لیتی رہی ہیں۔

شیکسپیئر اکثر اپنے کرداروں کے ذریعہ خوابوں کو بیان کر کے دراصل ان کی ذہنی صورت حال کو سامنے لاتا ہے۔ لیڈی میکبتھ (Lady Macbeth) اس ذہن کی چلتی پھرتی ڈرامائی تصویر ہے جو اپنی خطاؤں کے احساس سے بوجھل ہے۔ اس کے ہاتھ دھونے کا عمل اس کی اس خواہش کا غماز ہے کہ وہ اپنے گناہ دھونا چاہتی ہے۔ رچرڈ (RICHARD III) بادشاہ بوسورتھ (BOSWORTH) کی جنگ سے پہلے ایک بھیانک خواب دیکھتا ہے۔ مانو اس کا لاشعور اسے خواہش اقتدار کے المناک اور بے پناہ نتائج دیکھنے پر مجبور کر رہا ہے۔ شیکسپیئر یہ جتانے میں حق بجانب ہے کہ کنگ رچرڈ کا خوف اس کی ذات کے اندر ہے یا اس کی اقتدار کی ہوس اور اس ہوس کی لائی ہوئی تباہی کے دکھ کے مابین کشمکش میں پنہاں ہے۔

ورڈسورتھ نے خواب کی بشارت کی بدولت کئی نظمیں لکھیں اس نے ایک بار کہا " میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ایک خواب میں جیا ہوں "۔

کالرج کی نظم KUBLA KHAN خواب کی پیداوار ہے اگرچہ شاعر خود افیونی تھا۔ اس سے شاید اس کے مخیلہ پر بھی اثر پڑتا رہا ہوگا۔

جولئیس ورنے کی " TWENTY THOUSAND LEAGUES UNDER THE SEA " یقیناً اس کی تحقیق ہے کہ زیر آب زندگی میں ینگ (JUNG) کی کہنہ رو (ARCHETYPAL) مخلوقات نیز ہر شکل اور قد کی بلائیں کس طرح بسا کرتی ہیں۔

CHARLOTTE BRONTE نے بچپن کے بارے میں لکھے گئے اپنے کلاسیکی ناول "JANE EYRE" میں خوابوں کو تاثیر کے اضافہ کے نکتہ نظر سے استعمال کیا ہے۔ ایک ننھی بچی کے خوابوں کی شبیہات کے ذریعہ مصنفہ نے تنہائی، خوف اور مایوسی کو جس طرح ہم تک پہنچایا وہ کیفیت لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ اقتباس دیکھیں:

" ایک احساس جیسے میں نے ایک ڈراؤنا کابوس دیکھا ہو اور میرے سامنے ایک بھیانک سرخ روشنی جھمک رہی ہو جس پر موٹی سیاہ سلاخوں کے سائے پڑ رہے ہوں۔ میں نے آوازیں بھی سنیں۔ ایک

کو کھلی آواز میں کوئی کچھ کہہ رہا تھا اور شاید ہوا کے تند جھونکوں یا پانی کے ریلوں سے اس کا دم گھٹتا جا رہا تھا: احتجاج ۔ بے یقینی اور خوف اور دہشت کے احساس کا غلبہ تھا جس نے میری صلاحیتوں کو ابہام میں ڈال دیا"۔

یہ بچپن کے معمولی خوف کی مستند اور موثر تفصیل ہے جس کا تجربہ شاید شار لے بر ان کو خود کبھی ہوا ہو ۔ جس کی وجہ سے وہ اتنی اچھی تحریر لکھنے کے قابل ہوئی ۔

بالاتر حقیقت(SURREALISM)

فرائڈ کے نظریات کی اشاعت کے بعد کئی مصوروں نے لاشعوری دماغ کے خیالات پر انحصار کرنا شروع کر دیا ۔ انہوں نے سوچا کہ انہیں بھی شخصیت و کردار کا اس نئے رخ سے جائزہ لینا چاہیے ۔ SURREALIST MOVEMENT کی تصاویر نے خوابوں کے اس انوکھے انداز کو جس طرح برتا اس کی مثال کسی دوسری نسل یا دوسرے مکتب فکر کے مصوروں میں نہیں ملتی ۔ SURREAISM کا صحیح آغاز ۱۹۲۰ء کے دہے میں فرانس میں ہوا ۔ اس کی تعریف اس کے بانیوں میں سے ایک ادیب آندرے بریتن (ANDRE BRETON) نے اس طرح کی کہ یہ ذہنی آنکھ سے آرٹ پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے ۔ بریتن بھی کئی دیگر ماہرین کی طرح یہ سوال اٹھاتا تھا کہ کیا خواب زندگی کے بنیادی مسائل حل کرنے میں کارگر نہیں ہو سکتے"

خوابوں کی تصویروں کو رنگوں میں گرفتار کر کے سرریلسٹوں نے لاشعوری دماغ کی تھاہ اور زرخیزی کو دریافت کرنے میں لوگوں کی کافی مدد کی ہے ۔ ان کے فن نے لوگوں پر آشکارہ کیا ہے کہ حقیقت یا واقعیت کی کئی قسمیں اس ایک قسم کے علاوہ بھی ہیں جسے ہم عرصہ بیداری میں دیکھتے ہیں ۔ سرریلزم نے ہمیں ایک نئی آگہی تک پہنچایا ہے جس کی بدولت شعوری / عقلی ذہن اور لاشعوری طاقتوں کے مابین ایک آہنگ قائم ہوا ہے ۔ اس لفظ سرریلزم کے معنی بھی بالاتر حقیقت کے ہیں جو شعور کی ایک نئی سطح ہے جہاں شعور اور لاشعور دونوں کی تکمیل ہو رہی ہے ۔

سلولائیڈ خواب
(CELLOLOID DREAMS)

بالاتر حقیقت کے پرستاروں نے اس امکان کو دریافت کرنے کے لئے نہ صرف یہ کہ مصوری کے عمل سے فائدہ اٹھایا بلکہ متحرک فلم کو اس کی ترسیل کے لئے ایک موثر اور لچکدار وسیلہ قرار دیا ۔ خاص کر فرانسیسی ادیب ژاں کاکشیو (JEAN COCTEAU) اور فلم ہدایت کار رینے کلائر (RENE CLAIR) یا اسپین کے فلم ہدایت کار لوئی بنویل (LOUIS BUNUEL) نے اس وسیلے کو کارگر ثابت کر دکھایا ۔ بنویل تو اب تک شاندار سرریلسٹ فلمیں تخلیق کر رہا ہے جو جدید خیالات سے مطابقت رکھتی ہیں ۔ کئی دیگر فلم ہدایت کاروں نے خوابوں کی ممتاز ترین خصوصیات کو بروئے کار لاکر ذہنی افعال کو کامیابی کے ساتھ واضح کیا ہے ۔ خوابوں پر مبنی ابتدائی فلمیں زیادہ تر متحرک فنتاسی کے دائرے میں محدود رہا کرتی تھیں ۔ ٹھیک اس طرح جیسے کئی خواب محض تکمیل خواہش کی حدود سے باہر نہیں نکل پاتے ۔ خواتین کا ردولف ویلنٹینو یا کلارک گیبل کی چھاتی سے چمٹ کر سسکیاں بھرنا یا مردوں کا لورپٹاینگ یا جین بارلو پر جھکے جانا اور وجیہہ مردوں کے لئے کشتئ خواب کی رمز آج بھی بدستور قائم ہے ۔ لیکن بعد میں ڈائرکٹروں نے خوابوں کے اسلوب کی گہرائی میں اترنا شروع کر دیا ۔

وارداتوں یا واقعوں کا بے ربط ہونے کا عمل فلم کے پردے پر بہت اچھی طرح دکھایا جا سکتا ہے ۔ ان میں بہترین کوششیں ان فلموں میں دیکھی گئیں ALAIN RESNAIS کی فلم Last Year in Merienbad ، FELLINII کی فلم 8½ اور "جولیٹ آف دی اسپیرٹس" انتونیونی کی فلم "بلواپ"
انگمر برگمین کی فلم "وائلڈ اسٹرابیریز"
مزید یہ فلمیں بھی غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں:

2001 : A Space Odyssey
Yellow Submarine
Barbella A Clock Work Orange

ان تمام فلموں میں ایسی سیکوئنسز ہیں جو پورے طور پر خواب کے تجربات کی مجنونانہ اور تیرتی ہوئی " متبادل حقیقت " (Floating Reality) کی عکاسی کرتی ہیں ۔ ناظرین اس فلمی تکنیک کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اگر وہ دیکھیں کہ ایک شخص ابھی فلاں جگہ تھا اور ابھی فلاں مقام پر کھڑا ہے ۔ مثلاً اگر ابھی وہ ایک

بچے پر مسکرا رہا ہے اور اگلے سیکنڈ وہ اس بچے کو گاڑی سے کچلتے ہوئے دیکھنے لگا ہے جیسا کہ فلم "سنڈے: بلڈی سنڈے" میں رونما ہوا۔ تو ناظرین فوراً یہ سمجھ لیتے ہیں کہ پہلا منظر اس واقعہ کو دکھا رہا ہے جو حقیقتاً رونما ہو رہا ہے جب کہ اگلے ہی سکنڈ میں جو کچھ تصور کیا جا رہا ہے اس کی نمائش ہو رہی ہے۔

فلم میں خواب کی تکنیک کا لازمی خاصا یہ رہا ہے کہ اب تک پردہ سیمیں پر صرف اس طرز کی نقالی کی جا سکی ہے جو دماغ عالم نیند میں اپناتا ہے۔ لیکن آرٹ میں ایک بالکل نئی تحریک نے جنم لیا ہے جو شعوری نقالی اور دماغ کے لاشعوری افعال کی خلیج کو پاٹ دینا چاہتی ہے لاشعوری دماغ کی کارگزاری کو منظرعام پر لانے کے لئے وہ تخیلی ادویہ کا سہارا لیتی ہے جس سے دماغ چھل اور نظر دھوکے کی عادی ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے تجربے کے خطرات بالکل ظاہر نہیں۔ لیکن بعض لوگ اس کے نتائج سے اتنی خوشی اور حیران کن سرور حاصل کر لیتے ہیں کہ انہیں یہ خطرہ مول لینا اچھا لگتا ہے۔ فلم 2001 کے آخری منظر میں دماغ کی دیواروں کے ٹوٹنے کا احساس گرفت میں لایا گیا ہے۔ دیگر مثالوں کے لئے "سپرفارمنس" یا "ایزی رائڈر" نامی فلموں کے حوالے مناسب ہیں۔ موجودہ پاپ کلچر میں دماغ کی کھلی اور بے لگام حرکات کا مشاہدہ کیا جائے تو ہم اس کی مسلسل مصروفیت کا بھی جائزہ لے سکیں گے۔ چاہے مصنوعی طور پر ابھرنے والی شبیہوں کو دیو قد بنایا جائے یا نہ بنایا جائے آپ کسی بھی ریکارڈ کی دکان میں جائیے اور وہاں لانگ پلے ریکارڈوں کے کور ملاحظہ فرمائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان پر ایسے ڈیزائن یا فوٹو چھپے ہوئے ہیں جن میں انوکھی انوکھی چیزیں ایک دوسرے کے مقابل کھڑی ہوئی ہیں۔ پس منظر میں قدرتی مناظر اور خواب کے ہر مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والی روایتی علامات اور تشبیہات بکھری پڑی ملیں گی۔

آج کی تحقیق

کئی ماہرین نفسیات کا عقیدہ ہے کہ دماغ ایک فلٹر کا کام دیتا ہے۔ یہ ہمارے "مافوق الفطرت حقیقت" کے ادراک کو روکتا ہے جو اس کی حد تک خوابوں اور منشیات کے اثرات میں دکھائی دیتا ہے۔ عہد حاضر کی تحقیق اس دوسری حقیقت کی جانب رواں نظر آتی ہے۔ لیکن دماغ کی قوت کی انتہا کا کسی کو پتہ نہیں ہے۔ یہ آدھی رات کے الہامات کیا محض یونہی ہونے والی باتیں ہیں؟ کیا خوابوں کو زیادہ سے زیادہ علم جاری کرنے کا وسیلہ بنایا جا سکتا ہے؟ تفتیش کا یہ تمام علاقہ نفسیاتی تحقیق کا میدان تصور کیا جاتا ہے۔

مستقبل کے بارے میں پیش گوئی

مطالعہ کا ایک خاص پہلو خوابوں کی پیش قیاسی ہے۔ ہزاروں کیس ایسے ہیں جن میں لوگوں نے نیند کے دوران مستقبل کے واقعات دیکھے ہیں۔ ایک معمولی واقعہ ناول نگار جے۔ پی۔ پریسٹے کا سنئے۔ اس نے ۱۹۲۰ء کی دہائی میں ایک مفصل خواب دیکھا کہ وہ ایک بالکونی کی اگلی صف میں بیٹھا مدھم، خوبصورت اور رنگین عینک میں سے کچھ دیکھ رہا ہے تقریباً دس سال بعد اس نے امریکہ کے سفر کے دوران گرانڈ کینئین کا بھی دورہ کیا۔ کینئین صبح تڑکے دھند کے غبار میں لپٹی ہوئی تھی جب یہ دھند چھٹی تو اس کے سامنے کولوراڈو کے جاذب نظر قدرتی مناظر پھیلے ہوئے تھے۔ معاً پریسٹے نے اس مقام کو پہچان لیا کہ یہی اس کے خواب کی فضا تھی۔

ایسے لاتعداد واقعات ہیں کہ لوگ خوابوں میں اخبار کی سرخیاں پڑھتے ہیں جن میں زلزلے یا کسی دوسری آفت کی خبر چھپی ہوتی ہے۔ جب کہ یہ زلزلہ یا تباہی بعد میں رونما ہوتی ہے۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے درمیان مائیں ایسے خواب بکثرت دیکھتی تھیں کہ ان کے بیٹے مار ڈالے گئے ہیں اور بعد میں ایسا ہو جایا کرتا تھا۔ ایسے پیش بدر کہ خوابوں کی آسان تشریح تو ہر وقت ممکن ہے۔ اگر ایک شخص یہ جانتے ہوئے خواب سے بیدار ہو جائے کہ کچھ گڑ بڑ واقع ہو گئی ہے تو ممکن ہے کہ اس کا دماغ کسی آگہی کا بے پناہ احساس رکھتا ہو جو اس کی نیند میں بھی در آیا ہو اور اسے بدترین صورتحال سے بچنے کی تنبیہہ کر رہا ہو۔ یہ صورتحال اس حالت سے ملتی جلتی ہے جس میں کوئی بم کے دھماکے یا ایولانشے (Avalanche) کی تباہی سے بال بال بچ نکلتا ہو۔ کئی دیگر واقعات محض تفکر اور اتفاق (Coincidence) کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لیکن ناقابل فہم خواب جن میں ایسے واقعات نظر آتے ہیں جن کا رونما ہونا بعید از قیاس ہوتا ہے یا جن میں واقعات اس ڈھنگ سے نظر آتے ہیں کہ انہیں نفسیاتی گتھی تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے، ایسے خواب بہت گہرے سوالات اٹھاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ہم جسے وقت کی گردش کہتے ہیں وہ صرف واقعات کی ترتیب کا نام ہو۔ غالباً مستقبل کے واقعات کو ان کے رونما ہونے سے پہلے ہی جانا جا سکتا ہے۔

اسی طرح کیا ہم ماضی بعید کے بارے میں بھی صاف ستھرا علم حاصل کر سکتے ہیں؟

ماضی کو دوبارہ جینے کا عمل

کسی اور شخص کی ماضی کی زندگی کے بارے میں حتی کہ اس سے وابستہ ناموں اور جگہوں کے بارے میں دیکھے گئے خواب بھی دلچسپی کا موضوع بنے ہیں۔ ایک شخص نے نپولین کے عہد میں کسی بحری بندوق باز کی سابقہ زندگی کے تجربات اپنے خواب کے وسیلے سے دہرائے۔ اس کی تفصیل اتنی درست تھی کہ ارل ماؤنٹبیٹن نے اسے بحری فوج کی تاریخ بیان کرتے وقت ثبوت کے طور پر استعمال کیا۔ موجودہ عرصہ میں ایک خاتون مسز اسمتھ نے تیرہویں صدی کے Toulouse کی ایک لڑکی کی مکمل زندگی کے حالات اپنے خواب میں دیکھے۔ جی۔ بی۔ پریسٹے کی طرح مسز اسمتھ نے بھی ایک چھٹی کے سفر کے دوران اپنے خواب کے مناظر کی بازیافت کی۔

خواب ایک ذریعہ ابلاغ

امریکہ کے دو ڈاکٹروں مونتاگ المین اور اسٹینلے کرپنر یہ دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ عالم خواب میں لوگوں کی ٹیلی پیتھی یا غیر معمولی ادراک کی صلاحیت کافی بڑھ جاتی ہے۔ عام طور پر تیز حسیات کے لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ لیکن ایسا شاید اس لئے ہوتا ہے کہ نیند میں اس طور پر چیزوں کا درک حاصل کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

یہ تجربات گویا ایک قسم کا "ایجنٹ" مقرر کرلیتے ہیں جو ایک خاص تصویر یا خیال پر اپنی توجہ مرکوز کرلیتا ہے اور اس نے ارتکاز کو ایک سوئے ہوئے آدمی کے دماغ میں کسی موضوع کے بھیس میں داخل کردیتا ہے۔ موضوعی خواب ایک تصویر یا خیال گھڑلیتا ہے۔ ڈاکٹروں نے ان تصاویر و خیالات کی صاف شکلیں پہچاننا شروع کردی ہیں۔ جس طرح معمولی خواب انسانوں اور ان کے مسائل کے بارے میں ہوتے ہیں اسی طرح خواب کی بہترین تصویریں یا خیال بھی ان ہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر ایجنٹ کھانے پینے یا ایک خوبصورت عورت کی مرکزیت قائم کرنے پر مامور ہے تو خواب دیکھنے والا اس موضوع کی صاف تصویر دیکھ سکتا ہے۔

آخر ان تجربات کے نتائج کتنے صحیح ہوتے ہیں؟ ایک مثال ہے۔ ایک ایجنٹ مونیٹ نامی مصور کی پینٹنگ دیکھ رہا تھا۔ تصویر کا عنوان تھا Corn Poppies۔ ایک پھولوں بھرا میدان تصویر کا پس منظر تھا اور پیش منظر میں ایک عورت بچے کے ساتھ محو خرام تھی۔ ایجنٹ نے دماغ میں جو کچھ داخل کیا وہ رات خواب میں پودوں، خوش لباس عورت اور ایک بچے کی شکل بن کر نمودار ہوا۔ اب یہاں دیکھئے کہ اس ایجنٹ کے لئے ہوئے پیغام کے بالکل متوازی خواب دیکھنے والے نے ہر چیز کا نظارہ کیا۔ ایسے سیکڑوں امتحانات سے المین اور کرپنر نے کئی چونکادینے والے نتائج برآمد کئے ہیں۔

کابوس یا رات کا ڈراؤنا خواب کسی اور شخص کی زندگی کے سچے اور ڈراؤنے واقعہ کا ابلاغ بھی ہوسکتا ہے۔ ماضی کے واقعات سے ایسے طاقتور انسانی جذبات جڑے ہوئے ہوسکتے ہیں کہ وہ سدا قائم رہ جائیں اور کسی دوسرے کا ذہن انہیں "اچک" لے۔ سیکڑوں سال بعد بھی ایسا کوئی کیس ہوسکتا ہے۔ شاید ہم کبھی اس ذریعہ کو مفید طور پر استعمال کرنا سیکھ جائیں۔

اپنے خوابوں کو اتفاق پر چھوڑ دیجئے

مستقبل میں خواب کی تحقیق کے لئے اتفاق (Chance) کا از سر نو جائزہ لینا ضروری ہوسکتا ہے۔ کتنی بار آپ کو ایسے غیر معمولی اتفاق (Coincidence) کا تجربہ ہوا۔ آپ ایک ایسے دوست کو خواب میں دیکھتے ہیں جس سے برسوں آپ کی ملاقات نہیں ہوئی۔ اور اگلی صبح آپ کے پاس اس شخص کا خط چلا آتا ہے۔ عموماً آپ ایسی صورتحال کو رد کردیتے ہیں۔ لیکن جدید نفسیاتی تحقیق نے یہ ثابت کردیا ہے کہ لاشعور کے چاہنے پر ایسے اتفاقات "قصداً" رونما ہوسکتے ہیں۔

یہ دلچسپ بات ہے کہ پینٹنگز میں لاشعوری ذہن کی بازیافت کے لئے بالاتر حقیقت کے پرستاروں (SURREALISTS) نے بھی ترکیب اتفاق کو آزمایا ہے۔ جو کچھ بھی باہمہ اور ایک ساتھ کینوس پر یوں اجاگر ہوجائے جیسے کسی حادثے کی طرح اچانک رونما ہوگیا ہو، ہوسکتا ہے اس کا کوئی لاشعوری مفہوم بھی ہو۔ مصور پال کلی (Paul klee) نے ایک بار کہا تھا کہ میرا مقصد یہ ہے کہ میں اتفاق کو لازمی بنادوں۔ ان خیالات کی روشنی میں یہ بات بالکل مہمل نہیں لگتی۔

مستقبل کیا رکھتا ہے

خوابوں کی صحیح تفہیم اب شروع ہورہی ہے۔ ہمیں اب بھی اس کا پتہ لگانا ہے کہ دماغ اپنی شبیہات کس طرح منتخب کرتا ہے۔ نام نہاد قدیم دماغوں کی کارگزاری کا مہذب دماغوں کی کارگزاری سے موازنہ

کر کے یہ معلوم کرنا ہے کہ دونوں میں کتنا فرق ہے اور کتنی یکسانیت ہے۔

بچوں اور بالغوں کے خواب دیکھنے میں کیا فرق ہے؟ کیا زندہ مخلوقات کے فرق مراتب یا پادریوں اور ملاؤں کے زیر اثر رہنے والے نظام سے کوئی ایسا ارتقائی سسٹم جنم لے چکا ہے جس سے زندہ مخلوقات نے خواب دیکھنے کا طریقہ سیکھ لیا ہو؟ دواؤں اور نشیلی چیزوں کا دماغی افعال، خواب کے فعل اور حسیاتی طریقے پر کیا اثر پڑتا ہے؟

یہ تمام سوالات ابھی تک جواب طلب ہیں۔ اس کے باوجود خواب کی بڑی قدر و اہمیت کو ماہرین اور عوام دونوں ہی تسلیم کرتے ہیں۔ بعض تجزیہ کاروں نے تو یہاں تک مشورہ دیا ہے کہ اگر خاندانوں کے مابین خوابوں کی ادلا بدلی شروع ہو جائے یا اگر سیاستداں اور کاروباری لوگ اپنے رات کے تجربات پر غور و فکر کو معمول بنالیں تو زندگی بہت ترقی کرلے گی۔ ممتاز امریکی ماہر نفسیات ایرک فروم نے کئی بار اس کی وکالت کی ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں خواب کی تشریحی کلاسیں شروع کی جانی چاہئیں۔ چنانچہ قارئین حضرات خواب دیکھتے رہیئے چونکہ آپ کی شخصیت کے بعض اہم ترین پہلو ان ہی میں ظاہر ہوتے ہیں اور ان ہی سے کئی بیش قیمت اور مفید ترین خیالات نے جنم لیا ہے۔

فلموں میں اپنے کیریئر کی گولڈن جوبلی منانے والے

دلیپ کمار کی کہانی

جی ایم جگنو

۱/ ۷، اچھاتا والی گلی، کلکتہ ۷۰۰۰۱۲

دلیپ کمار نے فلموں میں اپنے شاندار اور یادگار کیریئر کی گولڈن جوبلی منائی ہے ۔ پچاس سال کی اس مدت میں انھوں نے تقریباً ساٹھ فلموں میں کام کیا ۔ اس دوران انھیں آٹھ مرتبہ " داغ " " آزاد " " دیوداس " " نیا دور " " کوہ نور " " لیڈر " " رام اور شیام " اور " شکتی " کے لیے بہترین اداکار کا فلم فئر ایوارڈ ملا ۔ انھیں ہر طبقہ کے ناظرین کا بھرپور پیار ملا ۔ امیتابھ بچن کے بموجب " مجھے تعجب ہوتا ہے کہ دلیپ صاحب ہر کردار میں اپنے آپ کو اتنی آسانی سے کیسے ڈھال لیتے ہیں ۔ " دیوداس " ہو یا " مدھومتی " ہو یا " گنگا جمنا " اپنے کردار کے ساتھ وہ پورا پورا انصاف کرتے ہیں ۔ ان کے ہر کردار میں غضب کا توازن ہوتا ہے ۔ "

چالیس سال کے دوران دلیپ کمار کے سینکڑوں انٹرویوز اور بیانات کے اقتباسات منتخب کر کے انھیں دلیپ کمار کی زبان عطا کی ہے ۔ آئیے اسے پڑھ کر آپ بھی لطف اٹھائیے

میں جب جب ماضی کے سمندر میں یادوں کا جال پھینک کر اسے اوپر کھینچتا ہوں تو کتنے سارے بیش قیمتی واقعات کا ذخیرہ میرے ہاتھ لگتا ہے کہ میں کچھ نہیں پاتا کہ ان میں سے کسے اپنے دل و دماغ میں سجا کر رکھوں اور کسے دوبارہ اس سمندر میں ڈبودوں

میں ۱۱/ دسمبر ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوا ۔ ہمارے خاندان میں کل ملا کر تیرہ بچے تھے ۔ ہم پشاور کے ایک چھوٹے سے محلے خداداد میں پلے بڑھے ۔ میں ہمارے خاندان کا تیسرا بیٹا اور چوتھی اولاد تھا ۔ میرے والد ٹھیٹھ پٹھان تھے ۔ لمبے چوڑے ، تگڑے ---- شاید وہ مجھے بہت کمزور سمجھتے تھے ۔ اسی لیے ہم دونوں کے مابین ایک طرح کی خاموشی ، ان بن پیدا ہوگئی اور جوان ہونے تک میں اپنے خول میں سمٹتا گیا ۔ یہ سمجھ لیجیے کہ میں کافی شرمیلا اور جھینپو ہوگیا بچپن کی کچھ یادیں آج بھی میرے دل میں تازہ ہیں ----- مجھے یاد آرہا ہے ---- میں بہت ہی چھوٹا ہوں ۔ مجھے دودھ لینے کے لیے بازار بھیجا گیا ہے ----- یکایک راستے میں افراتفری مچ جاتی ہے --- لوگ بدحواس سے چیخ چلا رہے ہیں ۔ گلی میں ایک پاگل کتا کھڑا ہے --- میں گھبرا جاتا ہوں اور الٹے پاؤں واپس بھاگتا ہوں ---- بھیڑ کی بھگدڑ کے بیچ سے نکل کر کتا میری طرف لپکتا ہے --- میرے داہنے ہاتھ میں بھیانک درد ہورہا ہے ---- میں دودھ کا برتن وہیں پھینک کر روتا ہوا گھر کی طرف دوڑ لگاتا ہوں ۔ کتے نے میری کہنی کے نیچے کاٹا ہے اور گھاؤ میں خون کی دھار بہہ رہی ہے -----

O

محرم کا دن ---- سب سے بڑے تہواروں میں سے ایک ۔ لوگ رو رہے ہیں ۔ اپنی چھاتیاں پیٹ رہے ہیں اور اوپر والے سے دعا کر رہے ہیں ۔ اس چیخ و پکار کے اوپر ایک عورت کا رونا پیٹنا کانوں

فلم "انداز" میں راج کپور اور نرگس کے ساتھ

"مدھومتی" میں وجینتی مالا کے ساتھ

"مغل اعظم" میں مدھوبالا کے ساتھ

میں گونج اٹھتا ہے ۔ وہ رو رہی ہے اپنے بچی حادثے کی وجہ سے ۔ اس کے چار ہٹے کٹے بیٹے ایک ٹرک حادثہ میں دم توڑ چکے ہیں ۔ ان کی ننگ دھڑنگ لاشیں میدان میں پڑی ہیں ۔۔۔

○

میں ابھی کوئی چھ سات سال کا ہوں ۔ اور کابل گیٹ پر موجود اپنے چچا کی دکان سے واپس جارہا ہوں ۔ اچانک گلیوں میں بھاگ دوڑ مچ جاتی ہے ۔ اس سے قبل کہ میں کچھ سمجھ سکوں انگریز سپاہی آکر لوگوں پر گولیاں برسانے لگتے ہیں ۔ میں سڑک کے کنارے ایک گھر کی دیوار کی آڑ میں چھپ کر کھڑا ہوجاتا ہوں ۔ ڈر کے مارے میری حالت خراب ہے ۔۔۔۔۔۔۔

اچانک ایک سپاہی میرا گریبان پکڑ کر مجھے باہر کھینچ لیتا ہے اور میرے گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیتا ہے ۔ میں زمین پر لڑھک جاتا ہوں ۔ پھر اٹھ کر ہوا سے باتیں کرتا ہوا گھر کی طرف بھاگتا ہوں ۔۔۔ لوگوں کی چیخ و پکار اب بھی کانوں میں گونج رہی ہے ۔۔۔۔۔

○

بچپن میں ایک دفعہ میں پانی میں ڈوبتے ڈوبتے بچا تھا ۔ دو بار میرا چہرہ جھلس گیا تھا ۔ ایک بار بچھو نے ڈنک مارا تھا ۔ ان حادثوں کو بھی میں بھول نہیں پایا ہوں ۔

○

مجھے وہ قصہ بھی آج تک یاد ہے جو میرے ابا سرور خان نے مجھے سنایا تھا جب میں سات سال کا تھا ۔ وہ قصہ پشاور کے ایک آدمی سے متعلق تھا ۔ جسے لوگ چچا غنی کے نام سے پکارتے تھے ۔ چچا غنی میرے ابا کے پھلوں کے باغیچوں کی دیکھ بھال کرتے تھے ۔ مجھے یاد ہے میں جب بھی پشاور میں ہوتا تھا چچا غنی کے ساتھ ضرور کھیلتا تھا ۔ ایک دن میں نے اور میرے بھائیوں نے چچا غنی کو ایک پیڑ سے زنجیروں سے بندھا پایا ۔ جوں جوں دن گزرتے گئے ۔ چچا غنی کمزور ہوتے گئے اور ایک دن انھوں نے دم توڑ دیا ۔

میرے ابا نے مجھے بتایا کہ چچا غنی پورنیما کی رات کو پھلوں کے باغیچے میں ان مسافروں کی تلاش میں جاتے تھے جو رات گزارنے کے لیے وہاں آرام کرنے آتے تھے ۔ چچا غنی ایسے لوگوں کا گلا چیر دیتے تھے اور اس میں سے پھوٹتی خون کی پھوار کو دیکھ کر انھیں ایک عجیب طرح کی خوشی ملتی تھی ۔ اس حرکت کی انھیں لت پڑ گئی تھی ۔ پھر تو حال یہ ہوگیا کہ جب تک وہ کسی مسافر کا گلا چیر کر اس میں سے رستے خون کی پھوار نہ دیکھ لیتے انھیں چین نہ آتا ۔ آخر ایک دن پریشان ہوکر انھوں نے میرے ابا اور چچاؤں سے کہا کہ وہ انھیں باغیچے کے ایک پیڑ سے زنجیروں سے باندھ دیں ۔

○

بچپن کی یادوں میں میں اپنے مرحوم بھائی ایوب کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کو کبھی نہیں بھول پاؤں گا ۔ ایک دن گھوڑ سواری کرتے ہوئے وہ گھوڑے کی پیٹھ پر سے گر پڑے اور بری طرح گھائل ہوگئے ۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی ۔ اور بمبئی میں لمبے عرصے تک ان کا علاج ہونا بے حد ضروری تھا چونکہ کرافورڈ مارکیٹ میں ابا کا پھلوں کا جماجمایا کاروبار تھا ۔ سو انھوں نے ناگ دیوی اسٹریٹ میں ہم لوگوں کے لیے ایک گھر کرائے پر لے لیا اور ہمارا پورا خاندان اس وقت تک کے لیے بمبئی آگیا جب تک کہ ایوب اچھے نہ ہوجائیں ۔ مگر جلد ہی ڈاکٹروں نے بتایا کہ بمبئی کی نم آب و ہوا کی وجہ سے ایوب کے جلد ٹھیک ہونے میں اڑچن آرہی ہے ان کی صلاح پر ہم ناسک کے پاس دیولالی میں رہنے چلے گئے ۔

ایوب کے ساتھ رہ کر ان کے پیار ، ان کی قابلیت ، ان کے صبر ، کام اور سوچ میں اچھائی کی جیت جیسے خیالات اور دیگر خوبیوں کا میرے دل پر گہرا اثر پڑا ۔ آگے چل کر زندگی کے تئیں میرا جو نظریہ بنا اس میں ایوب کے خیالات کا بہت بڑا ہاتھ تھا ۔

○

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی ۔ ہمارا بنگلہ ملٹری کے قبضے میں آگیا اور ہمیں واپس بمبئی آنا پڑا ۔ میرا داخلہ انجمن

اسلامیہ ہائی اسکول میں کرادیا گیا۔

اسکول کے بعد میں ولیم کالج گیا۔ وہاں فٹ بال کے میدان میں میں نے خوب نام کمایا۔ میری شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ تب خالصہ کالج نے مجھ سے درخواست کی کہ میں وہاں داخلہ لے لوں میں نے وہی کیا۔ مگر خالصہ کالج مجھے کچھ زیادہ ہی پرہجوم لگا۔ ایک اور پریشان کرنے والی بات یہ تھی کہ وہاں کئی بڑی خوبصورت لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں۔ میں بے حد شرمیلا اور سب سے دور دور ہی رہتا تھا۔ جیسا کہ کالج کے زمانے میں لڑکوں کے ساتھ ہوتا ہے، کئی لڑکیوں کی طرف میرا رومانی جھکاؤ بھی ہوا مگر دل ہی دل میں وہ رشتے شروع ہوئے اور وہیں ختم ہوگئے۔ دل کی بات زبان پر لانے کی ہمت ہی کہاں تھی؟ مجھے یاد ہے میں ایک سینئر اسٹوڈنٹ کے ساتھ کالجوں کے مابین شطرنج کا فائنل میچ کھیل رہا تھا۔ اسی دوران کالج کی ایک لڑکی آکر ہمارے پاس بیٹھ گئی۔ شکل و صورت سے وہ انتہائی سنجیدہ اور خاموش طبیعت کی لگتی تھی۔ میں نے کبھی اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ میں اس کی موجودگی سے اس قدر بوکھلا گیا کہ کھیل کے دوران میری توجہ کھیل پر نہیں رہی اور فائنل میچ ہار گیا۔

میں ہی نہیں، کالج میں اور بھی ایسے کئی لڑکے تھے جو لڑکیوں سے بات کرنے میں جھجکتے تھے۔ ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے سے گھبراتے تھے۔ ہم لوگوں نے اپنا الگ گروپ بنالیا۔ ہم سب مل کر ایسے لڑکوں کا مذاق اڑاتے تھے جو لڑکیوں سے گھل مل کر رہتے تھے۔ سچی بات تو یہ تھی کہ ہم جلتے تھے۔ لیکن اوپر سے ہم یہ کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے تھے کہ ان میں ذرا بھی شرم و حیا نہیں ہے جب ہی تو وہ لڑکیوں کے آگے پیچھے دم ہلاتے نظر آتے ہیں۔

○

اگی کو میں جب جب دیکھتا۔ میرے دل میں ایک اور لڑکی کی یادیں ڈوبنے ابھرنے لگتیں۔ صرف وہی ایک ایسی لڑکی تھی جس کے ساتھ میں رابطہ قائم کرسکا تھا۔ میرے خیال میں آدمی زندگی میں صرف ایک دفعہ عشق کرتا ہے اگی اور اس لڑکی کے پیار اور پھٹکار دونوں میں ہی ایک طرح کی نرمی تھی۔ برسوں پہلے میں ان دونوں کو کھو چکا ہوں۔

دل کے کسی گوشے میں اب بھی خالی پن محسوس کرتا ہوں وہ ایک ایسا حصہ ہے جس پر میں نے پوری طرح سے پردہ ڈال دیا ہے۔ دنیا کی تیکھی نظریں وہاں تک پہنچنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتیں۔

ہر عورت پیدائشی اداکارہ ہوتی ہے۔ اداکاری اس کے مزاج کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ اصل زندگی میں وہ اس کا بھرپور استعمال کرتی ہے۔ وہ اپنے اردگرد موجود لوگوں کو خوش رکھتی ہے اپنے والد، اپنے شوہر، اپنے بھائی، اپنے بیٹے سب کو..... وہ ان سب کی برائیوں، ان کی کمیوں کو نظرانداز کرتی رہتی ہے اور دنیا کو یہی جتاتی ہے کہ وہ بہت خوش ہے اور خدا کی بنائی ہوئی سب سے بے فکر تخلیق ہے اسی لئے جب کوئی عورت اسٹیج پر یا پردے پر اپنے فن کے جوہر دکھاتی ہے تو اس کی قابلیت نکھر کر سامنے آتی ہے۔

○

میرے ابا چاہتے تھے کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں مگر پڑھائی لکھائی سے زیادہ فٹ بال اور کرکٹ میں میری دلچسپی زیادہ تھی۔

جب میں جونیئر بی ایس سی کررہا تھا تو ابا نے مجھ سے پھلوں کے کاروبار میں ان کی مدد کرنے کے لئے کہا۔ میں ان سے جڑ گیا اور وہ مجھے پھلوں کے سودے کرنے کے لئے شہر سے باہر بھیجنے لگے۔ وہ اپنا کام پوری ایمانداری سے کرتے تھے مگر کاروبار کے دوران اٹھایا ان کا ایک جوکھم گھاٹے کا سودا ثابت ہوا۔ اور ہمارا خاندان پیسے پیسے کا محتاج ہوگیا۔ ہم پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

ان ہی دنوں ایک دوپہر مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ ان دنوں میں پونہ میں آرمی کینٹین کے منیجر کی حیثیت سے کام کررہا تھا

کلکتہ میں وزیر زراعت (مارکنڈے) حکومت مغربی بنگال کی طرف سے دلیپ کمار کے اعزاز میں "ہوٹل تاج بنگال" میں دی گئی ایک دعوت میں دلیپ کمار نے انشاء کا بابری مسجد نمبر ریلیز کیا اور اپنی پر زور خطابت سے سامعین کے دلوں کو گداز کر دیا۔
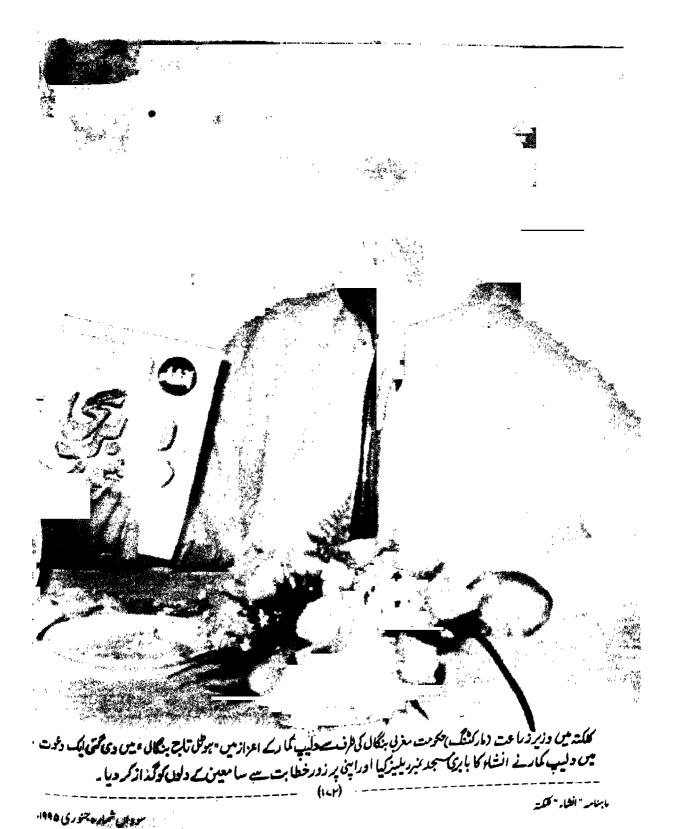
میری تنخواہ ۳۶ روپے ماہوار تھی اور مجھے اپنا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا ۔ کینٹین کے پیچھے ایک سوئمنگ پول تھا ۔ گرمی سے نجات پانے کے لئے وہاں نہانے کے لئے آنے والے فوجیوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی ان میں سے کئی لوگ اپنے ساتھ سنترے اور پھل لیکر آیا کرتے تھے اپنے مینیجر سے اجازت لے کر میں نے وہاں ایک بڑی میز رکھوادی اس پر چادر بچھا کر میں نے اس پر سنترے اور دیگر پھل رکھ لئے اور اسے پھلوں کی چھوٹی سی دکان کی شکل دیدی ۔ اس دکان پر میری کل لاگت ۴۰ روپے آئی تھی ، دوپہر تک میں ۲۲ روپے کا منافع کما چکا تھا میری اٹھارہ سال کی عمر کو دیکھتے ہوئے اتنی کمائی بری نہیں تھی ۔ مگر بعد میں فوجی شعبہ کے راشن منصوبہ کی وجہ سے میری دکان بری طرح چوپٹ ہو گئی ۔

ایک دفعہ پھلوں کے سودے کے سلسلے میں مجھے نینی تال بھیجا گیا ۔ وہاں میری ملاقات دیویکا رانی سے ہوئی ۔ تب مجھے اس بات کا گمان بھی نہ تھا کہ وہ مجھے میری زندگی کا سب سے بڑا موقع دیں گی میں دیویکا رانی سے ملا ۔ ہندوستانی سنیما کی اس پہلی خاتون کے ساتھ اپنے انٹرویو کو میں کبھی نہیں بھول سکتا ۔

" آپ نے کبھی اسٹیج پر کام کیا ہے ؟ "

" نہیں میڈم "

" کیا آپ ایکٹینگ کرنا چاہیں گے ؟ "

" جی میڈم "

" کیا آپ سگریٹ پیتے ہیں ؟ "

" نہیں میڈم "

" کیا آپ اردو اچھی طرح بول سکتے ہیں ؟ "

" جی ہاں میڈم "

اور دیویکا رانی کے ساتھ گزارے ان چند لمحوں نے میری تقدیر ہی بدل دی ۔ ایک دن میرے پاس ان کا بلاوا آگیا دو گھنٹوں کے اندر ہی میں نے ۵۰۰ روپے ماہوار کے حساب سے معاہدے پر دستخط کردیے ۔ ہر سال اس رقم میں ۲۵۰ روپے کا اضافہ بھی طے تھا

دیویکا رانی کو فلموں کے لحاظ سے میرا نام یوسف خان ٹھیک نہیں رہا تھا ۔ انہوں نے میرے سامنے تین نام رکھے ۔ جہانگیر ، واسودیو اور دلیپ کمار ۔ ان میں سے کوئی ایک نام چننے کے لئے مجھ سے کہا ۔ " دلیپ کمار " میرے منہ سے نکلا ۔ چونکہ کوئی بھی میرا نیا نام نہیں جانتا تھا ۔ اس لئے میں دوسروں سے آسانی سے یہ کہہ کر بچ سکتا تھا کہ یہ دلیپ کمار کون ہے میں نہیں جانتا ۔

○

میری پہلی فلم " جوار بھاٹا " کی شوٹنگ فوراً ہی شروع ہوگئی میری یہ فلم ناکام رہی ۔ حالانکہ اس میں میری اداکاری کی تعریف کی گئی تھی ۔ میری دوسری فلم " پرتیما " تھی ۔ لیکن وہ بھی بری طرح ناکام رہی ۔ تیسری فلم " ملن " کا بھی وہی حشر ہوا ۔ پھر نوشاد صاحب کی سفارش پر واڈیا مووی ٹون نے مجھے اپنی فلم " میلہ " کے لئے سائن کرلیا ۔ اس فلم میں نرگس میری ہیروئن تھیں ۔ ۱۹۴۸ء کی بات ہے " میلہ " کو زبردست کامیابی ملی ۔ اس کے بعد آئی " شہید " اس میں میرے ساتھ کامنی کوشل تھیں ۔ اس فلم نے بھی باکس آفس پر تہلکہ مچا دیا ۔ پھر میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا ۔

ٹریجیڈی کنگ کا ٹائٹل مجھ پر چسپاں ہوا محبوب خان کی فلم " انداز " سے ۔ اس فلم کے بعد میرے پاس " عشق میں ناکام نوجوان کے رول کی لائن لگ گئی ۔

ہلکی پھلکی اداکاری کرنے کی سمت میں فلم " آزاد " میری پہلی کوشش تھی ۔

ان ہی دنوں بمل رائے میرے پاس " دیوداس " کی پیشکش لے کر آئے ۔ اس فلم میں میری اداکاری کی بے حد تعریف ہوئی اور اس کے لئے مجھے بہترین اداکاری کا فلم فیئر ایواڈ بھی ملا ۔ " دیوداس " کے بعد بمل دا نے مجھے " مدھومتی " میں لیا ۔ اس فلم کو بھی زبردست مقبولیت اور کامیابی حاصل ہوئی اور مجھے ایک اور فلم فیئر ایوارڈ ملا ۔

مگر ٹریجیڈی کنگ کی امیج مجھ پر بری طرح حاوی ہونے لگی

تھی اور اس کی وجہ سے میں بھی طور پر کافی پریشان رہنے لگا تھا۔ میں بھی انجانے ہی اس بات پر یقین کرنے لگا تھا کہ میں بڑی بڑی تکلیفیں اٹھانے کے بعد دم توڑ دینے کے لئے ہی پیدا ہوا ہوں۔

اور ایک وقت ایسا آیا جب میں اپنے آپ سے لڑنے لگا مجھے یاد ہے۔ ان دنوں میں لندن میں تھا۔ وہاں میں ایک ڈاکٹر کے پاس گیا۔ جس نے مجھے وہاں کی جانی مانی ہرلی اسٹریٹ کے ایک بڑے دماغی امراض کے ماہر کے پاس بھجوایا۔ اس ڈاکٹر نے ساڑھے تین گھنٹے تک میری بات سنی۔ ان ساڑھے تین گھنٹوں میں میں نے اپنے دل کا سارا ابخار نکال دیا۔ میں جو اس سے کہنا چاہتا تھا، میں نے کہہ دیا۔

" اس طرح کی ذہنی اتھل پتھل سے زندگی کے کرشموں سے نبرد آزما ہونے کی بے پناہ طاقت ملتی ہے۔ اسی کی بدولت فنی، سماجی اور مذہبی کاموں میں انسان کامیابی کی بلندیاں چھوتا ہے "۔ اس نے مجھ سے کہا۔

میں نے ڈاکٹر بولف کے ساتھ دو تین سال کا عرصہ گزارا۔ اور ڈاکٹر ڈبلیو۔ ڈی نکل کے ساتھ تین سال کا انہوں نے مجھے کامیڈی رول کرنے کا مشورہ دیا۔

٥

• بالی ووڈ کی فلم " لارنس آف عربیہ " کے لئے اس کے جانے مانے ڈائریکٹر ڈیوڈ لین کی بیوی لیلا نے مجھ سے شریف کا کردار نبھانے کا آفر کیا۔ (جسے بعد میں اس رول کو عمر شریف نے کیا)۔ میں نے ڈیوڈ سے بھی بعد میں اس بارے میں بات کی۔ میں نے وہ کتاب بھی پڑھ رکھی تھی مگر فلم کی اسکرپٹ میں اس کردار کی اہمیت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ڈیوڈ بھی اس کردار کے سلسلے میں مطمئن نہیں تھے۔ مجھے یاد ہے اس وقت ڈیوڈ " دی برج آن دی ریور کوئی " کے لئے بنائے گئے پل کے سٹ کے پاس بیٹھے تھے۔ انہیں اسی وقت فلم کی اسکرپٹ الیک گینیز کو سنانے کے لئے انگلینڈ روانہ ہونا تھا۔ اور اسکرپٹ ان کے پاس تیار ہی نہیں تھی۔ سو وہ کافی جلد بازی میں تھے انہوں نے مجھ سے کہا کہ میرا رول فلم میں اچھا ہی ہوگا مگر مجھے لگا کہ کہیں فلم میں میرے رول کے ساتھ ناانصافی نہ ہو جائے کیونکہ میں نے کئی بار دیکھا تھا کہ ایشیائی اداکاروں کے ساتھ بالی ووڈ کی فلموں میں اکثر سوتیلا برتاؤ کیا جاتا ہے مجھے ڈر تھا کہ اگر ویسا ہو گیا تو اس سے ہندوستان میں میری فلموں کا مارکیٹ بھی متاثر ہوگا۔ خیر جب وہ فلم ریلیز ہوئی تو اس رول میں عمر شریف نے اپنی اداکاری کا سکہ جمالیا۔

میں نور جہاں بھابی کے کافی قریب تھا۔ مجھے یاد ہے وہ اکثر میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کرتی تھیں کہ انہیں کتنی کم عمر کے لڑکے کے ساتھ ہیروئین کا رول کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ پہلے بھی اتنی ہی ہنس مکھ اور خوش مزاج تھیں جتنی کہ آج ہیں۔

کامنی اپنے کام میں بڑی ماہر تھیں۔ جب تک میں دوسری ریہرسل کرتا وہ ٹیک دینے کے لئے تیار ہو جاتی تھیں۔

وجینتی مالا نے ڈانسنگ اسٹار کے روپ میں کام کرنا شروع کیا تھا مگر جلد ہی اداکارہ کے روپ میں بھی وہ کافی منجھ گئیں۔ وہ بڑی ہی محنتی تھیں۔

آپ کو شاید یہ جان کر تعجب ہوگا مگر اپنے ساتھ کام کرنے والی سب اداکاراؤں میں نلنی جیونت کے ساتھ کام کر کے مجھے سب سے زیادہ مزہ آیا۔ وہ وقت کی بے حد پابند تھیں۔ وہ اپنی اداکاری میں ایک نئی جان ڈال دیتی تھیں۔ پہلی بار کی ریہرسل میں ہی ان کی اداکاری کمال کی ہوتی تھی، نرگس، مدھوبالا اور مینا کماری کے ساتھ کام کر کے بھی مجھے مزہ آیا۔ سائرہ کے ساتھ بھی میری خوب جمتی تھی۔

" مغل اعظم " میں کام کرنا میرے لئے بہت بڑا چیلنج تھا۔ اس فلم میں شہزادے سلیم کا رول میرے کیریئر میں میل کا پتھر ثابت ہوا شاید بہت کم لوگ اس بات کو جانتے ہیں کہ میں نے " دیوداس " اور " مغل اعظم " میں ایک ہی وقت میں کام کیا۔ دونوں فلموں کی

شوٹنگ ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور ان کی فلور ایک دوسرے سے صرف ۵۰ فٹ کے فاصلے پر تھی۔

میں جان بوجھ کر اپنی فلموں کی ریلز میں لمبا وقفہ رکھتا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب میں ایکٹنگ سے بور ہونے لگا میں ایکٹنگ کے علاوہ کچھ اور بھی کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے میں نے پروڈیوسر بننے کا فیصلہ کیا۔ "گنگا جمنا" کی اسکرپٹ بالکل صحیح وقت پر میرے ہاتھ آئی۔ آج بھی میری نظر میں "گنگا جمنا" میری بہترین فلموں میں سے ایک ہے۔ سنسر نے اس فلم میں ۱۸۰ کٹ بتائے تھے وہ پورا سال ہی بڑا تناؤ میں گزرا۔ اس سال سرکار سے بھی میری کافی جھڑپ ہوئی۔ تب سے میں نے نوکر شاہی سے کوئی رشتہ نہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

○

اپنے آپ کو خوش رکھنے کے لئے الگ الگ قسم کی چیزوں میں ہاتھ ڈالنا میرے لئے ضروری تھا۔ حالانکہ "رام اور شیام" "دل دیا درد لیا" اور بعد میں "آدمی" جیسی میری فلمیں بھی ہٹ رہیں۔ اس کے باوجود میں زندگی میں ایک طرح کا خالی پن محسوس کر رہا تھا میں نے اپنی فلم "بیراگ" کے کچھ گنے چنے مناظر کی ڈائریکشن بھی کی تھی۔ پوری فلم میں نے اس لئے ڈائریکٹ نہیں کی کیونکہ تب مجھ میں پوری فلم ڈائریکٹ کرنے کی قابلیت نہیں تھی۔

○

فلم ناظرین مجھے تین دہوں سے درد بھرے مایوس نوجوان کے کردار میں پسند کر رہے تھے۔ ساٹھ اور ستر کے دہے کے آخر میں میں نے "رام اور شیام"، "گنگا جمنا" اور "سنگھرش" جیسی فلموں میں کام کیا۔ ان فلموں میں کام کرکے مجھے بڑا ہی مزہ آیا۔ ان فلموں کو کامیابی بھی ملی مگر فلموں میں کام کرنے کی للک دم توڑتی جارہی تھی سب کچھ اتنا دہرایا ہوا باسی لگنے لگا تھا کہ میں نے فلموں سے تقریباً سنیاس ہی لے لیا۔

○

اپنے فلم کیریر کے دوران میں نے طرح طرح کے رول کئے ہیں "شہید" میں انقلابی، جوگن، سنگدل، ہلچل" اور "مدھومتی" میں عاشق، "گنگا جمنا" میں سماج کے مظالم سے تنگ آکر ڈاکو بننے والا شخص "رام اور شیام" اور "داستان" میں دوہرے رول "بیراگ" میں ٹریپل رول، "لیڈر" میں صحافی، "کرانتی" میں انقلابی "شکتی" میں فرض شناش پولیس آفیسر "ودھاتا" میں جرائم پیشہ گروہ کا سرغنہ اور "کرما" میں جیلر۔

مجھے "شکست" میں کام کرکے بڑا اچھا لگا۔ "دیوداس" اور "فٹ پاتھ" میں کام کرنے میں بھی بڑا مزہ آیا۔ "مغل اعظم" میں اپنے رول پر مجھے کڑی محنت کرنی پڑی۔ اس میں میرے مکالمے بڑی ہی کٹھن اردو میں تھے۔

○

میرے ایک بچہ بھی پیدا ہوا تھا مگر پیدا ہوتے ہی اس نے دم توڑ دیا۔ ویسے ہمارے خاندان میں کافی بچے ہیں۔ سچ کہوں تو میرے اندر بھی ایک نٹ کھٹ، ضدی اور شیطان بچہ چھپا ہوا ہے اور وقت بے وقت اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔

○

سماجی کاموں سے میں کبھی پیچھے نہیں ہٹا۔ جب کچھ عرصہ پہلے بنگال میں سیلاب آیا تھا تو میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر سیلاب زدگان کے لئے چندہ جمع کیا تھا۔ لوگوں نے میری کوشش کی سراہنا کی تھی۔

مگر جب بھی میں حالات کے مارے مسلموں، بے گھر، ایک ایک پیسے کے لئے محتاج مسلموں کی مدد کے لئے چندہ جمع کرتا ہوں جن مسلموں کی سرکار نے مدد نہیں کی ان کی طرف سے آواز اٹھاتا ہوں۔ مسلمانوں کے خلاف کئے جانے والے مظالم کے بارے میں آواز بلند کرتا ہوں تو مجھے فرقہ پرست قرار دیا جاتا ہے میں تو صرف اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں نیک انسان کے طور پر زندگی گزارنی ہے۔

ایک مرتبہ مجھے غیر ملکی جاسوس کہہ کر بھی بدنام کیا گیا تھا ۔ اس کی وجہ بھی بہت چھوٹی سی تھی ۔ کلکتہ میں ایک نوجوان پکڑا گیا تھا جس نے بمل رائے ، محبوب خان اور میرے نام کا تذکرہ کیا تھا اس الزام میں ، میں برباد بھی ہو سکتا تھا میرے گھر میں ٹرانسمیٹر ڈھونڈنے کے لئے تلاشی بھی لی گئی ۔ کتنا بے بنیاد اور بے ہودہ الزام تھا وہ!

مولانا آزاد ، فخر الدین علی احمد ، معین الحق چودھری اور سبھی قومی اور مذہبی لوگوں سے میرے خاندان کے قریبی تعلقات رہے ہیں ۔

○

مجھے نابیناؤں کی قومی ایسوسی ایشن کے لئے کام کرنے میں جنگ کے دوران ہونے والی بیواؤں ، ناندیڑ ، مالیگاؤں میں لڑکیوں کی انجمنوں اور بچوں کے ہسپتالوں کے لئے چندہ اکٹھا کرنے میں زیادہ سکون ملتا ہے ۔ کچھ عرصہ پہلے ہی ہم نے ایک کرکٹ کھلاڑی کے لئے ۲.۲۵ لاکھ روپے کی رقم جمع کی تھی ۔ اس طرح میں فلاحی کاموں میں اپنے آپ کو مصروف رکھتا ہوں ۔

○

میری طبیعت اس وقت بگڑی جب میں پونے میں ایک ٹریفک جام کے دوران پھنس گیا ۔ میں وہاں ایک تقریب میں شامل ہونے کے لئے گیا تھا ۔ وہاں کار ہی میں میری طبیعت خراب ہونے لگی ۔ گیس میرے پھیپھڑوں میں سمانے لگی ۔ میرے سینے میں درد ہونے لگا ۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں ڈوبتا جارہا ہوں ۔ ویسے بھی میں برطانیہ جانے ہی والا تھا ۔ میں نے انجی اوگرافی کروائی ۔ ڈاکٹر نے کہا گھر جاؤ ۔ احتیاط سے کام لو اور روزانہ ورزشیں کرو ۔

○

میری فلم " کلنگا " جانے مانے ادیب ویریندر سنہا کی کہانی پر مبنی ہے ان کے اور نئے مصنف بلدیو گل کے ساتھ بیٹھ کر میں نے فلم کی کہانی پر کافی محنت کی ۔ اگر میری مرضی کے مطابق اسکرپٹ تیار نہیں ہوتی تو میں " کلنگا " شروع کرتا ہی نہیں ۔

" کلنگا " کی کہانی سوشل ہے ۔ فلم کا نام میں نے اپنے ایک دوست کے نام پر رکھا ہے ۔ جس کے ساتھ میں کبھار جم خانہ میں بیڈمنٹن کھیلتا ہوں ۔ کلنگا کہانی ہے ایک ہائی کورٹ کے جج کی جس نے دو شادیاں کی ہیں ۔ جن سے اس کے چار بیٹے ہیں ۔ یہ ان سب کے آپسی ٹکراؤ کی کہانی ہے ۔ پھر کس طرح جج کے بڑے بڑے آدرش اپنی پہلی شادی سے ہونے والے تین بیٹوں کی کرتوتوں کے آگے دم توڑتے ہیں یہ کہانی اسی بارے میں ہے ۔ جج کی پہلی بیوی پر اسرار حالات میں مری ہوئی پائی جاتی ہے ۔ اس کا چوتھا بیٹا اس کی دوسری بیوی سے ہے ۔

اس فلم میں اپنے سبھی اداکاروں مینا کشی ششادری ، راج ببر رادھا سیٹھ ، راج کرن ، کرن کمار ، شلپا شروڈکر اور روپا گنگولی سے مجھے بھرپور تعاون مل رہا ہے ۔

○

لوگ کہتے ہیں کہ بمبئی میں جو کچھ ہوا وہ فرقہ وارانہ فساد تھا میں یہ بات نہیں مان سکتا ۔ ابتدا میں جو کچھ ہوا وہ صرف لوٹ اور بلوہ تھا ۔ سیاسی لوگوں نے تین چار دنوں کے بعد اس لوٹ مار کو فرقہ وارانہ فساد کا رنگ دے دیا ۔ چونکہ لوگ مجھے ایک سماجی اور ذمہ دار شخصیت سمجھتے ہیں اور میں بمبئی کا شیریف بھی رہا ہوں ۔ ہندو ، مسلم ، پارسی ، سکھ ، عیسائی سب میرے چاہنے والے ہیں اور مصیبت و ابتلاء میں مجھ سے مدد کی توقع رکھتے ہیں ۔ لہذا میرے تینوں ٹیلی فون فساد کے دوران مصروف رہا کرتے تھے ۔ مظلومین اور حاکم سے برابر فون پر رابطہ رہا کرتا تھا ۔ ایک خاتون نے مجھے آدھی رات کو فون کیا اور بتایا کہ میرے بیٹے کو مار ڈالا گیا ہے اور میرے شوہر کو فسادیوں نے پکڑ لیا ہے ۔ میری بہو اسے بچانے کے لئے آگے بڑھی تو اسے زخمی کردیا گیا ۔ میرے گھر کو آگ لگائی جارہی ہے ۔ ہر طرف آگ ہی آگ ہے ۔ دلیپ کمار کچھ کرو ۔ " میں نے

فائر بریگیڈ اور پولیس کو فون کرکے خبردار کیا۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملا۔ "اچھا آتے ہیں۔" اس عورت نے پھر فون کیا "دلیپ کمار کچھ کرو۔" میں نے اسے تسلی دی اور بتایا کہ پولیس اور آگ بجھانے والے تمہاری مدد کو پہنچنے والے ہیں ۔۔۔ دو چار دن بعد اسی عورت کا پھر فون آیا۔ اس نے کہا۔ "میری آواز پہچان رہے ہو دلیپ کمار؟ میں وہی عورت ہوں جس نے تجھے اس رات فون کیا تھا۔" میں نے اطمینان کا سانس لیا اور اس خاتون سے کہا۔ "خدا کا شکر ہے آپ بچ گئیں۔" خاتون نے جواب دیا "میں تو بچ گئی لیکن تیرے لئے اللہ سے دعا کرتی ہوں دلیپ کمار تیرا گھر بھی اسی طرح جلے اور تیرے بھی بچے اسی طرح مرجائیں۔ میرا اب اس دنیا میں کوئی نہیں رہا۔"
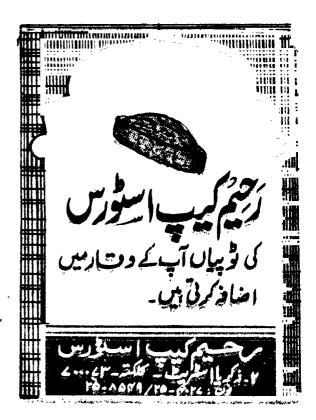
○

تبصرۂ کتب

تبصرے کے لئے ہر کتاب کی ۲ جلد یں آنا ضروری ہیں

نام کتاب: بہار کی پسماندہ مسلم آبادیاں

مصنف: جابر حسین

سن اشاعت: ۱۹۹۴ء

ناشر: بہار فاؤنڈیشن، لوہیا نگر، پٹنہ

قیمت: دس روپے

مبصر: ف ۔ س ۔ اعجاز

پروفیسر جابر حسین اقلیتی کمیشن بہار کے چیرمین ہیں ۔ ان دنوں کئی صوبوں میں اقلیتی کمیشن قائم ہیں ۔ لیکن اقلیتی کمیشن بہار کے چیرمین نے ایک ۶۴ صفحات کی یہ کتاب مرتب کر کے مسلم اقلیت کے مسائل سے اپنی واقفیت کا ثبوت بہم پہنچادیا ہے ۔ اگرچہ مصنف نے بہار کے مسلمانوں میں سے پسماندہ اور پسماندہ ترین طبقوں تک اپنی تحریر کا دائرہ محدود رکھا ہے لیکن یہ بات اس کے حق میں جاتی ہے کہ اسے بہار کی مسلم اقلیت کے پسماندہ لوگوں کے مسائل ، ان کے تاریخی کوائف اور موجودہ حیثیتوں کا وافر علم اور شعور حاصل ہے ۔ ہم میں سے بیشتر لوگ ہر آئے دن کلہیامزدوروں ، شیر شاہ آبادی مزدوروں ، چوڑی سازوں ، سلائی کامگاروں ، بنکروں ، سبزی فروشوں اور روئی دھنیوں سے ملتے ہیں ۔ لیکن ان سے ہمارا سابقہ بس کاروباری لین دین اور پیشے تک محدود رہتا ہے ۔ اب جب کہ سماج کے یہ پچھڑے ہوئے طبقے ترقی کی جانب گامزن ہیں اس حالت میں ایک ماہر سماجیات و عمرانیات ان کے اسباب پسماندگی اور وجوہات پیش رفت سے بہت دیر تک صرف نظر نہیں کر سکتا جبکہ ہماری مرکزی حکومت اور کم و بیش تمام صوبائی حکومتیں ہر آئے دن چھوٹی جاتیوں اور اجڈ قبائلیوں کی اٹھائی ہوئی تحریکوں پر مناسب غور و خوض کرنے کے لئے مجبور اور آمادہ نظر آتی ہیں اور جہاں کسی تغافل کا شکار برادری کی طرف سے اس کے مطالبات کے لئے اٹھنے والی آواز میں شدت اور تیزی آتی ہے متعلقہ حکومت اس برادری کے مسائل کی صحیح گرفت اور ان کے حل کے لئے ایک کمیشن مقرر کرنے میں دیر نہیں لگاتی ۔ لیکن ان مسائل کی تفہیم اور ان کے باوقار حل میں کتنا وقت برباد ہو جاتا ہے اس کا احساس کم لوگوں کو ہوتا ہے ۔ ان مسائل کا اہم ترین پہلو کلہیا ، شیر شاہ آبادی ، شیشہ گر ، سلائی کامگار (ادریسیہ) بنکر ، راعین ، گدی اور منصوری گروہوں سے متعلق وہ انکشافات ہیں جو اعداد و شمار کی صورت میں پیش کئے جاتے ہیں ۔ جابر حسین نے ان برادریوں سے متعلق جابجا اعداد و حقائق فراہم کئے ہیں لیکن کئی مضامین میں یہ معلومات فراہم کردہ نہیں ہیں ۔ اس کے باوجود مصنف نے اس کا التزام کیا ہے کہ تمام قارئین کی نظر میں بہار کے پسماندہ ترین مسلمان لوگوں کے انسانی مسائل ایک ایسی قدر مشترک بن کر ابھر آئیں جسے دیکھ کر اور سمجھکر ان پچھڑے ہوئے طبقات کے افراد سے ہمدردی کی جاسکے اور سماج میں انہیں ایک باعزت مقام دلوانے اور ان کے درجات بلند کرنے کے لئے نیک خصلت انسان صف آرا ہو سکیں ۔ یہ اچھا ہوا کہ اتنی بڑی مسلم آبادی کے پچھڑے ہوئے لوگوں کا تناسب بہ تناسب گوشوارہ فراہم کر دیا گیا اور اس پر بھی روشنی ڈالی گئی کہ بہت زیادہ پسماندہ طبقات کی مسلم عورتیں اور بچے خود ترقی یافتہ مسلمانوں کی نظر حقارت کا بھی شکار ہیں ۔ کیونکہ آدمی کی پیشہ ورانہ تخصیص ہندوستانی سماج میں بلا امتیاز مذہب و ملت ایک جیسی ہے اور اسکی جانب انسانی برتاؤ کے تحقیر آمیز یا آبرومندانہ طریقے تاریخی فرد گذاشتوں اور مادی صلاحیتوں پر مبنی ہوتے ہیں ۔

یہ تحریریں پٹنہ کے کثیر الاشاعت اردو روزنامہ "قومی تنظیم" اور ہندی روزنامہ "نو بھارت ٹائمز" میں مارچ تا مئی ۹۴ء میں شائع ہو چکی ہیں ۔ اگر اس پتلی سی کتاب میں ہر مضمون کے ساتھ متعلقہ برادری کی چند تصاویر بھی شائع کر دی جائیں تو یقیناً مصنف کے اثر تحریر میں دوگنا اضافہ ہو جاتا ۔

ایسے کتابچے تو اقلیتی کمیشنوں کو رائے عامہ کا صحیح جائزہ لینے کے لئے اپنی جانب سے شائع کر کے مفت تقسیم کرنا چاہئیں ۔ یہ وقت کی ضرورت ہے ۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ایسی تحریروں میں کشادگی اور واضح مقصدیت پیدا کی جائے تاکہ یہ تجزیہ نگار کا جزو عمل قرار دی جاسکیں ۔

نام کتاب: اجالوں کا سلسلہ (شعری مجموعہ)

مصنف: رویندر جین

سن اشاعت: ۱۹۹۴ء
ناشر: اندر کرن پبلی کیشنز، بلندرہ، بمبئی
ملنے کا پتہ: مانویندرا اپارٹمنٹس ۱۶-روڈ
باندرہ بمبئی ۴۰۰۰۵۰
قیمت: ۵۰ روپیے
مبصر: ف۔ س۔ اعجاز

"اجالوں کا سلسلہ" رویندر جین کا شعری مجموعہ ہے۔ رویندر جین نامور سنگیت کار اور گمنام شاعر ہیں۔ اگرچہ فلموں کے گیت بھی لکھتے رہے ہیں۔ ان کے بعض گیت بہت مقبول بھی ہوئے ہیں۔ لیکن زیر تبصرہ مجموعے میں شامل ان کی مختلف قسم کی غزلوں، مسلسل غزلوں نظموں اور گیت نما نظموں سے ان کے ادبی مزاج اور شعری صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ بچپن علی گڑھ کے ماحول میں گزرا۔ بڑے بھائی ڈاکٹر دھنیہ کمار جین ساہتیہ رتن اور "جین کوی اور پراکرت بھاشا" پر ڈاکٹریٹ حاصل کر چکے ہیں۔ پتا پنڈت اندر منی جین وید شاستری تھے۔ پہلے بھجن سبھاؤں میں اور بعد میں اپنے دوستوں کے ہمراہ مشاعروں اور کوی سمیلنوں میں سامع کی حیثیت سے شرکت کرتے رہنے سے رویندر جین کو سنگیت اور شاعری سے شغف پیدا ہو گیا۔ بینائی کمزور ہونے کے سبب کتابیں سن کر اپنا شوق پورا کرتے ہیں۔ کلام کو تحریری شکل دینے کے لئے بھی شاید اپنے کسی دوست یا اپنی رفیقہ حیات ودیا جین کی مدد لیتے ہوں گے جو ہندی کی مشہور شاعرہ نرملا جین کی بیٹی ہیں۔ شاعر نے پیش لفظ میں اقرار کیا ہے کہ اس کے مزاج کی تجسیم میں اس کے اپنے ماحول، ہم مجلس احباب اور اس کی اپنی موسیقی سے وابستگی حرف حرف میں حصہ دار ہیں۔

مجموعے میں رویندر جین کے بارے میں ان کے ہم مجلس احباب کی بھی آراء بھی شامل ہیں۔ انمیں قمر جلال آبادی، قاسم قریشی، قتیل راجستھانی، کیلاش چندر ناز، رئیس الزماں خاں رئیس نے شاعر کی ذاتی خوبیوں اور شعری صلاحیتوں کا اجاگر کیا ہے۔ قاسم قریشی کے بقول سنگیت سمراٹ اور شاعر نوشاد اور حضرت مجروح سلطانپوری بھی رویندر جین کی شاعری کو سراہتے ہیں۔ کرشن بہاری نور نے رواروی میں کچھ لکھ مارا ہے (بمبئی سے ان کی ٹرین چھوٹنے میں چند منٹ باقی تھے)

رامانند ساگر نے شاعر کو سرسوتی پتر اور جینئیس سے تعبیر کیا ہے۔ خادم ادب حسرت جے پوری نے بقلم خود شاعر اور اس کی شاعری کا معقول جائزہ لیا ہے۔ نقش لائلپوری اور ڈاکٹر اندو متی بشنوئی کی رائیں عالمانہ اور بھرپور ہیں۔ انہیں مجموعے میں ابتداء میں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن مرتبین نے تمام آراء کو غلط جگہیں دی ہیں۔

ایک شاعر اخبار و رسائل میں چھپے بغیر اچانک ایک مجموعہ کلام لے کر نمودار ہو جائے تو اس کے بارے میں معقول رائے دینا مشکل ہوتا ہے جب کہ صاحب دیوان باثروت بھی ہو۔ رویندر جین اپنے حوصلے اور فوق جاہی اور اپنے دیگر دوستوں کی مدد سے کتاب منظر عام پر لے آئے۔ غزلوں میں اچھے اچھے اشعار مل جاتے ہیں۔ نمونے ملاحظہ فرمائیں

اپنے انداز سے ہر ایک نے کوشش کی ہے
ہاں مگر وقت نے کب سب پہ نوازش کی ہے
اس کے حصے میں ستائش بھی ہے جھوٹی جس نے
کچھ نہیں کرکے تمنائے ستائش کی ہے
ہم عبادت کا صلہ پائیں تو پائیں کیسے
ہم نے سجدے نہیں سجدوں کی نمائش کی ہے

یا

جو مذہبوں کے مسائل پہ اختلاف کریں
میں ان کے ساتھ نہیں ہوں مجھے معاف کریں

جس شاعر نے اختلاف، معاف، شگاف، انحراف وغیرہ قوافی خوبصورتی اور ذمہ داری سے نبھا ہے اسی شاعر نے نظم "ماں" میں دودھ کا قافیہ (موجود) باندھا ہے۔ اسی طرح خو، لہو، آبرو، گفتگو قوافی باندھنے والے شاعر کے ایسے اشعار قاری کے دامن نگاہ کو بری طرح الجھا لیتے ہیں۔

کون سی راہ سے بڑھتیں آگے
کون سے موڑ پہ ٹھہر جی لیں

رند مانے ہے چاہی نہ چاہی تری
ساقیا کج رہی کج کلا ہی تری
یہ تو سہرا تو اپنے ہی سر باندھ لے
دوسرا کیا کرے گا تباہی تری
تو کہے ہاں تو ہاں، تو کہے نا تو نا

وہ ترسے جو کریں واہ واہی تری

الفاظ اور تراکیب کے غلط استعمال سے بچا جاسکتا تھا۔ جن دوستوں کے تعاون سے یہ مجموعہ کلام منصہ شہود پر آیا ہے وہ ایسی غلطیوں کی نشاندہی کر سکتے تھے۔ احتیاط برتی جاتی تو "اجالوں کا سلسلہ" میں غزلوں کی تعداد کم ہو جاتی مگر حاصل کلام اور اندوختہ کے طور پر ایسے معیاری اور مرصع اشعار بچ جاتے۔

براہ علم و ادب روٹیاں تلاش نہ کر
تو فن کو فن ہی سمجھ کاسہ۔ معاش نہ کر
ہے راز راز اگر ایک تک رہے محدود
کہ دل کا راز کبھی ذہن پر بھی فاش نہ کر
نراش ہوکے نہ جانے وہ شخص کیا کرلے
جو تجھ سے آس لگائے اسے نراش نہ کر
تضیع وقت سمجھ ان کی ہم نشینی کو
نہ روح جن سے ملے ان میں بود و باش نہ کر
بشر تو کیا ہے خدا کا بھی مت سوالی بن
خودی کو اپنی کہیں صاحب فراش نہ کر
کوئی اٹھالے کوئی پھینک دے کوئی بلنٹے
زمانے والوں کے ہاتھوں میں خود کو تاش نہ کر

یہ فصاحت و بلاغت اور عصری حسیت کے لئے یہ طرز ادا یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ رویندر جین وہ شاعر ہیں جن کی پہنچ میدان ادب میں دور تک ہے۔ ان شعری محاسن کے علاوہ شاعر کو اس کے اعلیٰ نصب العین کے لئے مبارکباد دینی چاہیے جس کے تحت اس نے "اجالوں کا سلسلہ" قارئین کے لئے دراز کیا ہے۔ وہ نصب العین مصنف کے الفاظ میں یہ ہے۔

"میرے اس مجموعے سے اگر قاری میں تعمیر و خدمت دنیا اور آخرت کا کوئی جذبہ جاگ جائے تو بڑی کامیابی سمجھوں گا"۔

شاعر کا مقصد اعلیٰ اور ارفع ہے۔ ورنہ آج کل آخرت کی فکر کسے ہوتی ہے۔

نام کتاب: سماج کی یہ بیٹیاں (افسانے)
مصنف: نیاز قومی
سن اشاعت: ۱۹۹۴ء
قیمت: ۱۰۱ روپیے
ملنے کا پتہ: آل انڈیا میرا اکاڈمی، مقبول لاری منزل اولڈ سٹی، اسٹیشن۔ لکھنو

مبصر: ف۔ س۔ اعجاز

نیاز قومی نے ۱۹۵۵ء سے اب تک ۱۰۱ عدد افسانے تحریر کئے ہیں جو ان کے اس افسانوی مجموعے میں شامل ہیں جس کا نام انہوں نے "سماج کی یہ بیٹیاں" رکھا ہے۔ یہ عنوان انہوں نے کہنہ مشق ترقی پسند مشاعر وامق جونپوری کی شہرہ آفاق نظم "مینا بازار" سے مستعار لیا ہے جس کا اعتراف کتاب کی پشت پر کیا گیا ہے۔

اگر مصنف کا ۳۹ سال کا تحریری سرمایہ یہی ہے تو اس صبر و ضبط پر اسے مبارکباد دینا مبصر کا پہلا فرض ہے۔ اس کم سخنی کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ نیاز قومی کی بے نیازی سے اب کتنے ہی قارئین کو نیازمندی کا شرف حاصل ہوگا۔ ۵۵ء سے لے کر ۹۴ء تک یہ افسانہ نگار ایک سیدھ میں چل رہا ہے۔ اس کا موضوع بنت حوا کے مسائل ہیں۔ معاشرے میں قدم قدم پر عورت کو اپنا کچھ کھونا پڑتا ہے۔ کہیں جسم، کہیں عزت، کہیں شناخت۔ معاشرے میں عورت کے بے آبرو اور بے وقعت ہونے سے کئی طرح کے خلل اور ناہمواریاں پیدا ہوئی ہیں۔ یہ تمام تر ایک انسانی بحران ہے۔ عورت کا مقام سماج میں وہ نہیں ہے جو ہونا چاہیے۔ افسانہ نگار کو سماج میں عورت جس جس روپ میں نظر آئی اسے اس نے اپنی پرخلوص کوشش سے اجاگر کیا ہے۔ عورت کا استحصال اور ناجائز استعمال ہزاروں ڈھنگ سے ممکن ہے۔ ایسے کیس کم ہوتے ہیں جن میں لڑکی یا عورت اپنی ہی ہوسناکی سے مغلوب ہوکر اپنی جنس کا سودا کرلیتی ہو۔ عورت کو برا بنانے یا اس کے برا بن جانے کے عام اسباب اس کی اقتصادی کمزوری، مردوں کی بدچلنی، امراء کی دولت مندی بے راہ روی اور لذت پرستی بتائے جاتے ہیں۔ لیکن عورت کے زیر ہونے کی وجوہات میں خاص وجہ صنف مرد کے مقابل اس کے تئیں سماج کے ہزاروں سال پرانے معتقدات اور معاشرتی نظام میں صنف نازک پر مردوں کی حاکیت اور غلبہ ہے۔ سماجی معتقدات کے زیر اثر خود عورتوں کا یہ رویہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مردوں سے کمتر اور ان

کی محکوم تصور کرتی ہیں ۔ جب کہ مردوں کے کنٹرول میں چلنے والے معاشرے میں ایسے مجرمانہ رویے اور رجحانات نمایاں ہیں جن کی تسکین مجبور اور بھولی بھالی لڑکیوں کی زندگی سے کھیل کر ہوتی ہے ۔ لیکن اس کے لئے صرف مردانہ جبلت کو ہی ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے ۔ صنف نازک کی بدحالی کا سبب کسی حد تک اس کی اپنی جبلت بھی ہے ۔ مثلاً نیاز قومی کے افسانے "تن اجلے من میلے" میں اچھی بیگم کی اپنے نیک چلن اور نیک دل ادھیڑ عمر شوہر بابو میاں کے بارے میں بدگمانی اس کے شوہر کی جان لے لیتی ہے ۔ ۵۲ سالہ اچھی بیگم پانچ جوان بیٹوں کی ماں ہونے کے باوجود سنبھلے ہوئے حسن کی مالک ہے ۔ اور اس بات کو برداشت نہیں کرپاتی کہ اس کا شوہر ایک حسین و کم سن نوکرانی کو بیٹی کا درجہ دے ۔ اسی طرح ایک بیانیہ کہانی "تماشا درپن کا" کی ناخواندہ عورت کو اس کے افسانہ نگار شوہر کی کہانی کے فرضی نسائی کردار شک اور وسوسے میں ڈال دیتے ہیں ۔ جس سے وہ گھر میں الگ تھلگ ہوکر رہ جاتی ہے اور اس کا حسن قبل از وقت مرجھا جاتا ہے ۔

نیاز قومی کی ان تھوڑی سی کہانیوں کی سبھی عورتیں ناخواندہ پس منظر سے تعلق رکھتی ہیں ۔ ان میں تعلیم یافتہ عورتیں بھی ہیں جو اگرچہ اپنے پسندیدہ مردوں کے ساتھ مستقبل کے سفر پر روانہ ہوئیں مگر ہمسفری کے تلخ اور غیر متوقع تجربات نے انہیں اکیلا چھوڑ دیا ۔ "تعلیم منزل" کی استانیاں مس جان ، رئیس باجی اور انو اپنی پرنسپل اوشا کو بظاہر تنقیدی نگاہ سے دیکھتی ہیں لیکن یہ طے ہے کہ ان سبھوں کے چہروں کو ایک دن جوان العمر پرنسپل اوشا کی طرح سخت اور کرخت ہوجانا ہے ۔ "موسم کی بات" میں ایک جاہل میاں بیوی کے اکھڑ اور جھگڑالو آپسی رویے کا ایک پرسکون اور تعلیم یافتہ میاں بیوی کے ناآسودہ تعلق سے موازنہ کیا گیا ہے ۔ لیکن مصنف جن کرداروں پر فدا ہے وہ وہ عورتیں ہیں جو مردوں کے ظلم و ہوس کی چکی میں پسنے کے بعد مردوں کے مقابل ایک نئی طاقت لے کر نمودار ہوتی ہیں ۔ جن کے ہاتھوں میں درگا دیوی کا بل اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ وہ پولیس کے محکمہ میں چھوٹی یا بڑی ملازمت پالیتی ہیں ۔ جن کے جسموں پر خاکی وردی ان کے رعب کا اظہار اور سینوں پر ان کے نام کا بلہ ان کی شناخت کی ضمانت اور ہاتھوں میں ہتھیار ظلم اور استحصال کے خلاف جنگ کے لئے ہمہ وقت تیاری کا اعلان ہے ۔ ایسے کردار نیاز قومی کے افسانوں میں کہیں ضرورت کے تحت کہیں بلا ضرورت در آئے ہیں ۔ جہاں بلا ضرورت کسی کہانی میں ایسے کردار داخل ہوتے ہیں اس کا سبب شاید یہ ہو کہ مصنف کو ایک مقصد کے تحت یک صنفی کرداروں کے بارے میں پہلے سے طے شدہ اپنے دماغی فیصلے سنانا تھے ۔ وہ کہانی میں صرف اس لئے نمودار ہوگئے کہ اس کے ذہن میں وہ برسوں سے مضطربانہ چل پھر رہے تھے کہ کب اس کی کہانی میں داخل ہونے کی ان کی باری آئے گی ۔ لیکن یہ "مہندی بھرے پاؤں" ایک ایسی کہانی ہے جس میں صحیح کردار تقریباً صحیح جگہ نظر آتے ہیں گاؤں کے کسان کی بیٹی کانسٹبل کماری ہملا ، سلونی ، گوکل کی بیٹی رادھا ، چندا اور تارا اور کامنی یہ وہ عورتیں ہیں جنہیں مردوں نے ہوس کا نشانہ بنایا اور لوٹا لیکن بعد میں وہ پولیس کی ملازمت میں آگئیں اور حاوی ہوگئیں ۔ یہ کہانی انشاء عالمی اردو افسانے میں شائع ہوچکی ہے ۔ دراصل یہ کہانی ایک مفروضہ ہے کہ اگر طاقت عورت کے اختیارات میں شامل ہوجائے تو کس طرح وہ اپنا تحفظ خود فراہم کرسکتی ہے اور مردوں کی جارحیت سے بچ سکتی ہے ۔ اس میں کیا شک ہے کہ حالیہ برسوں میں عورت کی امیج کافی تبدیل ہوگئی ہے ۔ ایسا لگتا ہے مصنف کو رضیہ سلطانہ ، چاند بی بی ، رانی جھانسی جیسے پرغضب تاریخی کرداروں نے کافی متاثر کیا ۔ اور اب وہ ہر عورت کو زرہ بکتر اور لوہے کا خود پہنے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے ۔ بہرحال موجودہ زمانے میں کرن بیدی نے عورتوں کو اس قدر متاثر ضرور کیا ہے کہ اب وہ پولیس فورس میں داخل ہوکر اونچے مرتبوں پر فائز ہونے لگی ہیں ۔ یہ بڑی سماجی تبدیلی ہے ۔ لیکن پھولن دیوی جیسی ڈاکو اور کرن بیدی جیسی آئی پی ایس کو ایک جیسی اہمیت دے کر کیا ہم ایک اور سماجی بھول کے مرتکب نہیں ہو رہے ہیں؟

مناسب ہوگا اگر نیاز قومی کے سادہ دلکش اسلوب اور مختصر نویسی کے فن کا بھی اقرار کرلیا جائے ۔ کہانیوں میں انشائیہ کی آمیزش ظاہر ہے ۔ "تن کے بھیدی" انشائیہ نما کہانی ہے مگر انشائیہ کے طور پر کامیاب ہے اور بات سے بات بنائی گئی معلوم ہوتی ہے ۔ ایک بات بیشتر کہانیوں میں مشترک ہے ۔ وہ یہ کہ کہانی کئی چھوٹے چھوٹے حصوں پر مشتمل ہے ۔ جن سے ناقد یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ یہ کہانیاں لکھی گئی ہیں یا develop کی گئی ہیں ۔ چونکہ ایک کہانی اوسطاً ساڑھے تین سال میں مکمل ہوئی اس لئے گمان یہی ہے کہ وقفے وقفے سے الگ الگ حصے تحریر کئے گئے ہوں گے جیسے شاعر کبھی نامکمل غزل کو برسوں میں مکمل کرپاتا ہے ۔ افسانے میں ہم اسے مونتاژ (Montage) کا عمل

کہتے ہیں ۔ اس ترکیب کا بہترا استعمال خواجہ احمد عباس کے یہاں ہوا ہے کیونکہ وہ ادیب کے علاوہ فلم نگار بھی تھے اور ایک ہی کہانی کے مختلف ابواب / مناظر کو آخری سکوئنس میں تکمیل تک پہنچانے کے ہنر سے واقف تھے ۔

نیاز قومی کا ایک افسانہ "ایک بچہ میری ساس کا" جو فکر اور معیار کے اعتبار سے سب سے جدا ہے ایک ہی منظر اور ایک ہی نشست میں ایک اجنبی مرد اور ایک گلوکارہ کے درمیان مکالمہ آرائی کے ساتھ مکمل ہوا ہے افسانہ نگار کی طبع جولاں اور قلم کی روانی کا پتہ دیتا ہے ۔ اس افسانے کا بحث یہ ہے کہ ایک عورت کے نکتہ نظر سے سارے مرد پاگل ہیں یا بچے ۔ اس گفتگو کو فرائیڈ کے اس نظریہ سے انگیز کیا گیا ہے کہ "لڑکپن کی ایک عمر وہ بھی ہوتی ہے کہ جب بچہ اپنے اور اپنی ماں کے درمیان اپنے باپ کو بھی برداشت نہیں کرتا ۔ اس کی بچکانی فطرت کا عکس مردوں کے دل و دماغ پر قائم رہتا ہے کہ عورت کسی کی محبوبہ ہو یا بیوی، کوئی دوسرا مرد اس کے قریب ہو تو ان پر قیامت گزر جاتی ہے" ۔

ایسے افسانے دانشوری کو عیاری کی سطح سے معصومیت کی سطح پر لے آتے ہیں اور انسانی مزاج کی تفہیم میں معاون ثابت ہوتے ہیں ۔ امید ہے نیاز قومی اپنے افسانوں کے لئے آئندہ ایسے اور نئے زاویے تلاش کریں گے ۔ کیونکہ ہمیں بہت سارے انفرادی مجرمانہ رویے پولیس کے سراغرسانوں اور جاسوسی ناول نگاروں کے لئے چھوڑ دینا چاہئیں اور خود ابن آدم اور بنت حوا کے بہت سارے معصومانہ احوال کی خبر حاصل کرتے رہنا چاہیے ۔ کتنی خوش گوار حیرت ہوگی جب نیاز قومی اپنی اگلی کتاب کا عنوان رکھیں گے "سماج کی وہ بیٹیاں" ۔

نام کتاب: تلاش آگہی

مصنف: میر غضنفر علی باقری

سن اشاعت: ۱۹۹۳ء

ناشر کا نام: درج نہیں ہے

قیمت: مفت

ملنے کا پتہ: کیپ فٹ پلازا، چادرگھاٹ اسکول لین عابد شاپ، حیدرآباد

مبصر: ڈاکٹر ظفر محمودانی (کلکتہ)

"تلاش آگہی" کے شاعر باقری کی شاعری نہ حدیث رنگ و بو ہے اور نہ داستان طرب بلکہ ملک اور قوم کے لئے مفید اور کارآمد بننے کا پیغام ہے ۔ پورے مجموعہ میں انہوں نے سماج و افراد اور اس کے گرد و پیش کا بھرپور تجزیہ کرکے اس پر کھل کر بحث کی ہے ۔ ایسی شاعری جو ماحول کی عکاس اور سماج کی ترجمان ہو یا جو مسائل حیات سے بحث کرتی ہو ۔ اپنے عہد کی دستاویز ہوتی ہے ۔ پرعافیت حیات کے جو یا ملک و قوم کے لئے کارآمد شہری بننے کا جذبہ اور آگہی یا واقفیت رموز و اسرا کی فکر ان کا موضوع شاعر ہیں ۔ باقری ایک حساس اور فکر مند دل رکھتے ہیں چنانچہ قسام ازل کی کرشمہ سازیوں یا ناہمواریوں پر ان گہری نگاہ پڑتی ہے جس پر اظہار حیرت کرنے کے علاوہ اس راز کو جان لینے کے لئے فکر مند ہوتے ہیں ۔ گرد و پیش میں پھیلی ہوئی بدعنوانیاں ان کو مغموم کرتی ہیں اور اس کا سبب وہ اتحاد باہمی کے فقدان کو قرار دیتے ہیں ۔ مختلف پیشوں سے منسلک افراد مثلاً نرس، ٹیلیفون آپریٹر، سکریٹری، ٹائپسٹ یا ریسپشنسٹ کے استحصال پر بے قرار ہو جاتے ہیں اور کسی طرح اسے دور کرنے کے لئے فکر مند ہوتے ہیں اس تناظر میں پورے ملک میں طبقہ نسواں پر ہونے والے جبر سے ان کی پیشانی پر فکر اور نفرت کی شکنیں ابھر آتی ہیں ۔ یا پھر بابری مسجد کا المیہ ہو یا فرقہ وارانہ فسادات ان سب کی تہہ میں وہ کسی کو معصوم نہیں گردانتے بلکہ ہندو مسلمان دونوں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں ۔ ساتھ ہی وہ قائدین ملک کو نہیں معاف کرتے بلکہ ان کو تاہیوں پر انہیں للکارتے ہیں ۔ انسانی مسائل کے دوش بدوش باقری مسائل گرد و پیش مسائل ملک و قم کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں ۔ چنانچہ مجاہدین آزادی سے متاثر بھی نظر آتے ہیں اور کھل کر ان کی کوششوں کے مناظر میں ان کی تعریف کرتے ہیں ۔ جدید شاعری جو بہ الفاظ دیگر ایک مردہ لے سے زیادہ وقیع نہیں ہے اس لئے کہ اس میں شعر کے وہ عناصر ترکیبی جو اس کے حسن و کشش کے ضامن ہوتے ہیں ان کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی ۔ یہ ایسے راز کی طرح ہے جو نہ سمجھ میں آتا ہے نہ سمجھایا جا سکتا ہے ۔ ردیف و قافیہ سے الگ ہٹ کر بھی فکر انگیز اشعار کہے جا سکتے ہیں لیکن جدید شاعری اس سے عاری نظر آتی ہے یہی سبب ہے کہ باقری نے یہ اسلوب نہیں اپنایا ہے ۔ اس طرح وہ ہر شاعر کو آپ بیتی ہی نظم کرنے کی تلقین کرتے ہیں ۔ جس نے کرب نہ جھیلا ہو، جس نے فراق یار میں انتظار کی سرد راتیں نہ کاٹی ہوں، جس

نے خود بھوک کا لطف نہ اٹھایا ہو باقری اسے حقدار نہیں سمجھتے کہ وہ ایک لفظ بھی اس بابت زبان پر لائے۔ اور اسی لئے خود بھی اس کرب میں پہلے مبتلا ہوتے ہیں بعد میں اس کا ذکر کرتے ہیں اور اسی روش کے دوسروں سے متقاضی بھی ہوتے ہیں۔

تلاش آگہی کی زبان صاف سادہ اور رواں دواں ہے۔ دور از کار تشبیہات متروک محاورات یا استعارات سے اپنے کلام کو پیچیدہ نہیں بننے دیا ہے۔ باقری اساتذہ فن کے کلام سے بھی متاثر نظر آتے ہیں بعض مقامات پر غالب و اقبال اور حافظ کی خوشہ چینی کا احساس ہوتا ہے تو کہیں خیام کی ہلکی سی تھرتھراہٹ بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ انکا کلام تصنع و تکلف، معاملہ بندی اور ابہام گوئی سے پاک اور منزہ ہے۔ یہی شاعری کار آمد شاعری کہے جانے کا پورا پورا حق رکھتی ہے۔

نام کتاب: نشاط آرزو

مصنف: مومن خاں شوق

سن اشاعت: ۱۹۹۴ء

قیمت: ۴۰ روپیے (۲۰ ریال / ۱۰- امریکی ڈالر)

ملنے کا پتہ: حسامی بک ڈپو، چار کمان، حیدرآباد - ۲

مبصر: ڈاکٹر ظفر قدوائی (کلکتہ)

تبصرہ قاری اور شاعر کے درمیان ایک مفاہمہ ہے۔ اسی روشنی میں مومن خان شوق کی شاعری کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔

زیر نظر مجموعہ "نشاط آرزو" شوق کی تیسری ادبی کاوش ہے۔ اس کے صفحات ۵ تا ۱۶ پر تقریظ و دیباچہ ہے۔ ۱۷ اور ۱۸ صفحہ پر شوق نے خود "اپنا بیان" لکھا ہے۔ بقیہ صفحہ ۱۹ تا ۱۲۸ ان کے رشحات قلم مختلف اصناف کے پیرائے میں محیط ہیں۔

نشاط روح ان کے حسیات کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ قدم قدم پر بکھری ہوئی سچائیوں کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی شاعری میں عصری آگہی اور اصلاح معاشرہ کی فکر کا پر خلوص حوصلہ نظر آتا ہے اور اس جادہء دشوار گزار میں "کبھی نہ تھکنے کے عزم" کے ساتھ ہر خشک و تر میں امید کا دامن نہایت ہمت و پامردی سے تھامے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چونکہ ان کے جذبے میں صداقت، کوششوں میں سچی لگن اور اپنی سعی جمیل پر انہیں مکمل اعتماد ہے اس لئے ان کے یہاں آس کا پہلو بھی بہت نمایاں ہے۔ دوسروں کی یاسیت اور محرومی سے اگر ایک طرف فکر مند ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ وہ کچھ کر دکھانے کی دھن بھی رکھتے ہیں۔ شوق اپنے ماحول کے عکاس اور سماج کے ترجمان بھی ہیں۔ ہر طرف پھیلی ہوئی بدامنی اور بگڑے ہوئے حالات بلکہ "جلتی ہوئی حیات" کے باوصف نوجوانوں کی بے حسی اور بے فکری سے بے چین نظر آتے ہیں۔ بسا اوقات یہی کربناکی ان کے کلام میں یاسیت کا پہلو اجاگر کرتی ہے۔ لیکن یہ یاسیت ان کی مایوسی کا اعلان نہیں بلکہ ان نامساعد حالات کی نشاندہی کرتی ہے جس سے وہ نبرد آزما ہیں۔ شوق درد مند دل رکھتے ہیں لیکن غم پرست نہیں۔ بلکہ بہتر حالات "اچھا ماحول" پر عافیت زندگی کے جویا اور اس کے لئے کوشاں ہیں۔ زندگی کی اعلیٰ قدروں کا احترام حیدرآباد کی خوش خلقی کی روایت جس کی بناء پر انہوں نے اسے شہر مروت سے تعبیر کیا ہے، کی تاراجی اور پامالی کا اظہار "نشاط آرزو" میں انہوں نے کھل کر کیا ہے۔ جو ان کے بنیادی رجحان سے عبارت ہے۔ شوق کی شاعری کی لے دبی ہے جو اقبال نے کبھی چھیڑی تھی۔ لیکن ان کے یہاں وہ طنطنہ وہ بلند آہنگی نہیں اور نہ لفظوں کا وہ حسین ملبوس ہے۔ جس سے اقبال کی شاعری مزین و معمور ہے پھر بھی شوق کے یہاں اس کے مدھم سروں کا ہمیں احساس ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں روزمرہ کی زبان، مناسب الفاظ، سہل الادا محاورات و تراکیب کے جوہر قدم قدم پر نمایاں ہیں۔ حقیقتاً وہ سہل ممتنع کے شاعر ہیں۔

شوق نے ہندی الفاظ کا برمحل استعمال اور ان کا انتخاب نہایت سلیقہ سے کیا ہے جس سے اشعار کی شگفتگی اور نکھر گئی ہے۔ اپنے گیتوں میں انہوں نے ہندی شاعری کی روایت سے کسب فیض کیا ہے۔ جس سے ان میں بارہ ماسہ کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

ابوالکلام آزاد، جواہر لعل نہرو پر لکھی گئی نظمیں شوق کی ان سے بھرپور عقیدت کی مظہر ہیں۔ بعض مقامات پر صحیح قافیہ نہ برتنے کی بھول بھی کر بیٹھے ہیں مثلاً صفحہ ۴۸ پر کھلتی، لگتی، بستی، بنتی قوافی کے ساتھ ٹھہری اور رکھی قوافی باندھے ہیں۔ اس طرح صفحہ ۹۴ پر درج قطعہ میں بیت اول کے قوافی دیکھتا اور گھولتا کے برخلاف مصرعہ آخر میں سلسلہ قافیہ لکھنا اچھا نہیں لگتا۔

نام کتاب: چٹکیاں (افسانے اور مضامین)

مصنف: سائیں سچا

سن اشاعت: ۱۹۹۴ء

ناشر: ودیاکتاباں فورلاگ (سویڈن)

طابع اور ہندوستان میں تقسیم کار: انشاء پبلی کیشنز

۲۵-بی زکریا اسٹریٹ - کلکتہ ۷۳

قیمت: ۷۰ روپیے (ہندوستان میں)

مبصر: ڈاکٹر معظز "منظر" پروفیسر اقبال چیئر کلکتہ یونیورسٹی

یہ واقعی نئی کہانیاں ہیں - گلابی پیاز کی خوبصورت پوٹی جیسی ان کہانیوں سے مختلف جنہیں نئی بنانے کے لئے کہانی کار علامت کی پرتیں ڈالتا ہے اور ان پرتوں کو اتارتے ہوئے قاری کی آنکھوں میں لفظی آنسو تو آجاتے ہیں لیکن پرتوں کے اترنے پر کہانی کا مغز ہاتھ نہیں آتا سائیں سچا نے مغز رکھنے والی پر تیلی کہانیاں تخلیق کی ہیں!

ان کہانیوں کو پڑھیے تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ یہ انوکھے اسلوب کی بیساکھیوں پر نہیں چلتیں نہ رنگ برنگے بھڑک دار لفظی ملبوسوں کے سہارے قاری کی توجہ منعطف کرنے کی سعی کرتی ہیں یہ سچ مچ نئی کہانیاں ہیں جنہیں پرانا لباس پہنادیئے یا بکینی میں گھمایئے ہر حال میں نئی رہیں گی کیونکہ ان کا مواد نیا ہے - موضوعات نئے ہیں - نت نئے تجربات اور لحہ بہ لحہ رنگ بدلتی دنیا کے پیچیدہ نقوش سے ان کہانیوں کا تانا بانا ایسی فنکاری کے ساتھ بنا گیا ہے کہ جدید ہوتے ہوئے بھی ان کی دلکشی، ان کی افسانویت اور ان کی لطیف واقعیت میں کوئی جھول نہیں پڑتا - ان میں کہیں انوکھے جنسی احساسات کا کھلا ڈلا اظہار اور نفسیاتی پیچیدگیوں کی عکاسی کی گئی ہے - (گیلی، بااور ہے، تو کہیں منٹو کی طرح انسانی فطرت کے وہ روشن پہلو اجاگر کیے گئے جو درندہ صفت آدمیوں میں بھی موجود ہوتے ہیں (تشنہ لب) کہیں اس خیال کو کہانی کا جامہ پہنا دیا گیا ہے کہ سیاسی جبر سے انسان اپنا نام تو تبدیل کر سکتا ہے لیکن عقیدے اور تہذیبی سائیکی اس تبدیلی کا اثر قبول نہیں کرتے (گرد) کہیں ایڈز جیسی ہولناک بیماری پر گفتگو کرتے ہوئے ملک میں سیاسی انتشار اور اخلاقی انحطاط پر مرثیہ قلم بند کیا گیا ہے - اور کہانی کے نام پر خالص طنزیہ قلم بند کر دیا گیا ہے (خلیفہ شفیق، کرسی) اور کچھ کہانیوں میں ایک ہی زندگی کے حسین دلکش، ہولناک اور بھیانک متعدد چہرے رکھنے والے روپ بیک نگاہ دیکھے جاسکتے ہیں (چھلاوا، بے رحم) - القصہ چٹکیاں " میں شامل آٹھ مختصر کہانیوں میں سائیں سچا ایک اچھے اور توجہ طلب افسانہ نگار کی شکل میں جلوہ گر ہے -

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ سائیں سچا انوکھے اسلوب کی بیساکھیوں پر اپاہج کہانیاں نہیں چلاتے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ان کی کہانی اسلوب کی دلکشی سے یکسر عارضی ہوتی ہے - "چھلاوا" " بے رحم" " بااور ہے " میں بھرپور افسانویت بھی ہے اور طرز نگارش کی ندرت بھی -

میں سائیں سچا کو افسانہ نگار کے علاوہ ایک اچھے مترجم کی حیثیت سے بھی پہچانتا رہا ہوں کہ انہوں نے سوئیڈش سے اردو اور اردو سے انگریزی میں اچھے تراجم پیش کیے ہیں - پیش نظر کتاب میں انہیں مضمون نگار کی حیثیت سے دیکھ کر مجھے انبساط آمیز حیرت ہوئی - یہ تینوں مضامین (شمالی یوروپ میں اور ناخواندگی اور پاکستان اور مردانہ تسلط) ان کی وسعت مشاہدہ اور فکری بصیرت کے غماز ہیں -

سائیں سچا کی ادھ گدرے امرود جیسی نیم پختہ زبان کہانیوں میں کہیں راجندر سنگھ بیدی کی طرح خوشگوار اور اکثر گوارا محسوس ہوتی ہے لیکن مضامین میں کھٹکتی ہے - قاری کو بہر حال یہ ملحوظ رکھنا ہوگا کہ یہ چیزیں زبان کے مرکزی علاقوں سے بہت دور رہتے ہوئے قلمبند کی گئی ہیں -

ماہنامہ انشاء کا "انشاء عالمی اردو افسانے" نمبر

مصطفیٰ کریم

5, Campion Close,

Scarborough, YO 130 QJ (U.K)

وہ جریدہ جو شاید اکتوبر یا نومبر ۹۲ء میں شائع ہوا کیا اس کی افادیت اب بھی باقی ہے اور کیا اس پر کسی قسم کی رائے زنی اب بھی ضروری ہے ؟ اور یہ وجہ ہے کہ دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں ہے۔ اور اس نکتے پر بھی مجھے اصرار ہے کہ ---- وہی ہے جس کی تازگی اور تاثر میں کبھی کمی نہیں ہوتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ---- فن کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ چونکہ ایسا آرٹ بار بار تخلیق نہیں ہوتا۔ ادارت بھی تخلیقی عمل ہے۔ مدیر نہ صرف ادیبوں میں گوہر نایاب کو تلاش کر کے اسے رسالے میں یکجا کرتا ہے بلکہ وہ نئی فکر اور جستجو کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔

مجھے انشاء کا عالمی افسانہ نمبر گزشتہ سال نومبر یا اکتوبر میں ملا تھا اور میں نے اسی وقت جلد ہی اسے پڑھ ڈالا۔ رسالے میں ۷۳ افسانے تھے۔ ان میں لگ بھگ ۶۶ کہانیاں اچھی تھیں۔ یعنی ایسی کہ انہیں ایک عام قاری بغیر کسی اکتاہٹ کے پڑھ سکتا تھا۔ نیز یہ بھی مجھے خیال آیا کہ اس کے ذہن میں اچھے افسانوں کا جو معیار ہے اس معیار پر یہ کہانیاں پوری اتریں یہ بھی حقیقت تھی کہ مدیر انشاء نے جو اداریہ اس جریدے میں لکھا وہ بھی نہایت ہی موزوں تھا۔ بہترین کتابت و طباعت، ہر افسانے کے ساتھ ف۔ س۔ اعجاز کا موزوں شعر اور تصویر جو شعری اور عکسی سطح پر افسانوں کی وضاحت کرتی تھی۔ وہ خوبیاں تھیں جنہیں میں نے ماضی میں کبھی نہیں دیکھا ہے اور نہ ہی کسی سے سنا ہے۔ ایک دلچسپ نکتہ یہ بھی تھا کہ کتاب کے دلکش بک مارک پر لکھا تھا "یہ کتاب آرام چاہتی ہے" انشاء عالمی افسانہ نمبر کی غیر معمولی اہمیت کا احساس کچھ یوں بھی زیادہ ہوا چونکہ یہ شمار کلکتہ سے نکلا تھا۔ اردو مختصر افسانے کے حوالے سے کلکتہ شہر کی وہ شناخت ممکن نہیں جو لاہور اور بمبئی کو حاصل ہے۔ اس وجہ سے بھی شہر کلکتہ سے انشاء عالمی افسانہ نمبر کا اجراء مجھے بہت اہم محسوس ہوا۔ اتنا کچھ لکھنے کے بعد بھی بات نہیں بنتی اور اس جریدے کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ اس رسالے میں مجھے آٹھ کہانیاں شاہکار محسوس ہوئیں۔ جب میں نے انہیں گزشتہ سال پڑھا تو میں نے اپنی روح میں وہی ہلچل محسوس کی جسے میں نے زندگی کے موڑ پر (کرشن چندر) اپنے دکھ مجھے دیدو (راجندر سنگھ بیدی) نیا قانون (سعادت حسین منٹو) چوتھی کا جوڑا (عصمت چغتائی) آفندی (غلام عباس) میبل لینڈ (اپندر ناتھ اشک) سرخ مکان (مسعود شاہد) پرمیشر سنگھ (احمد ندیم قاسمی) لال دھرتی (دیوندر ستیارتھی) کاش میں لڑکا ہوتی (سنتوکھ سنگھ سکھوں) کو پڑھنے کے بعد کی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ آج بھی میں ان افسانوں کو اگر پڑھوں گا تو مجھے جمالیاتی سطح پر اسی اضطراب کا احساس ہوگا۔ اور یہ سچ ہے کہ اس مضمون کو لکھنے کی غرض سے انشاء کی ان بہترین کہانیوں کو ابھی حال میں جب دوبارہ پڑھا تو بالکل اس طرح متاثر ہوا جیسا کہ گزشتہ سال۔

کسی فن کو عظیم کہہ دینے سے فنکاری کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ تنقید کا تقاضہ ہے کہ کسی فن کو اچھا یا برا کہنے کے لئے وجوہات بھی پیش کی جائیں جو نہایت مشکل کام ہے۔ مگر معاملہ کسی سائنٹفک نکتے کا ہو تو دشواری نہیں ہوتی۔ مثلاً آپ ہائیڈروجن کے دو ایٹمس کو آکسیجن کے ایک ایٹم کے ساتھ جوڑیں تو پانی بن جائے گا۔ مگر آپ نبض کو گنیں اور ساتھ ہی دل پر کان رکھیں تو نبض کی رفتار وہی ہوگی جو دل کی دھڑکن کی۔ اس طرح آپ صرف نبض کو گن کر دل کی تیز یا سست رفتاری کی درست اطلاع دے سکتے ہیں۔ ادب میں یہ ممکن نہیں۔ فلسفہ بھی اس منزل پر سائنس سے مات کھا جاتا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ سائنس کے مقابلے میں ادب کی اہمیت ثانوی ہے۔ سائنس کیمیائی، طبعی اور حیاتی سطح پر کائنات کی راز کشائی کرتا ہے تو ادب اس راز کشائی کی حسیات کو بے نقاب کرتا ہے۔ دراصل ادب اس راز کشا یا انسان کی جمالیاتی تاریخ ہے۔ اس تاریخ سازی میں موسیقی، مصوری، سنگ تراشی اور فلمیں بھی حصہ لیتی ہیں۔ لیکن یہ فنون ادب کی طرح کسی ایک ملک یا قوم سے ماورا ہو کر کسی دوسرے ملک یا قوم کے لئے بھی اہم نہیں ہو جاتیں چیخوف، ٹالسٹائی، ترجنیف کو جو اہمیت غیر یورپی ادب، افسانہ اور ناول میں حاصل ہے وہ روسی موسیقی، مصوری، یا سنگ تراشی کو حاصل

نہیں ہو سکی ۔ یہی نکتہ فرنچ افسانہ نگار موپساں اور فرنچ فنون کی بابت بھی درست ہے ۔ مصوری اور سنگ تراشی اپنے مخصوص اسلوب کی وجہ سے کسی خاص مقام کی پابند ہوتی ہیں ۔ اور اس مقام تک ہر کس و ناکس نہیں پہنچ سکتا ۔ ہر ملک کی موسیقی اس ملک کی عوامی موسیقی سے پھوٹتی ہے ۔ جس طرح کسی ایک ملک کے رہنے والوں کی زبان دوسرے ملک کے عوام کی زبان سے مختلف ہوتی ہے ۔ اس طرح ملکوں کی موسیقی کے درمیان بھی اختلاف ہوتا ہے کسی ایک ملک کی موسیقی کو کسی دوسرے ملک کی موسیقی میں ہم نہیں ڈھال سکتے ۔ لکھا ہوا لفظ انسان کی بات چیت کی تحریری شکل ہے ۔ انسان گفتگو صرف دوسروں سے نہیں کرتا بلکہ اس کا زیادہ وقت خود کلامی میں گزرتا ہے ۔ یہ کلام اس دنیا میں ہوتا رہتا ہے جو کسی ایک انسان کے دل میں محدود نہیں بلکہ ہر انسان کے دل و دماغ میں پھیلی ہوئی ہے ۔ اور اس کلام کی بازگشت ہر انسان کی داخلی دنیا میں ہوتی رہتی ہے ۔ ادیب کے کان اسی دنیا پر لگے ہوتے ہیں ۔ وہ جن صداؤں کو سنتا ہے انہیں وہ تحریر کرتا ہے ۔ اس کی تحریر اپنی مخصوص طرز ہونے کے باوجود کسی دوسری طرز تحریر میں منتقل کی جا سکتی ہے ۔ ادب کی آفاقیت کا راز اسی نکتے میں ہے ۔

اگر ادب آفاقی ہے تو اس میں مختصر افسانے کو کونسا مقام حاصل ہے ؟ کیا یہ شاعری اور تنقید کے مقابلے میں کمتر ہے ۔ جیسا کہ مجھ سے کبھی ایک نقاد نے کہا (یہی بات برطانیہ کے ایک ناکامیاب شاعر نے بھی کہی ہے) ظاہر ہے ایسی بات ایک نقاد ہی کہہ سکتا ہے اسے ان آزمائشوں کا پتہ نہیں جن سے افسانہ نگار گزرتا ہے ۔ جیسے ایک سطر لکھنے کے لئے پانچ سطور لکھ کر کاٹنے پڑتے ہیں ۔ اور اس دور کے بہترین نقاد شہزاد منظر کے بقول افسانہ نگاری کے مقابلہ میں تنقید آسان ہے ۔ افسانہ نگار کا حوصلہ نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ کسی شاعر کی طرح عوام کے جذبات کو اپنے افسانوں سے بھڑکا دے ۔ عوامی شاعری آج کے بعد کل اپنا تاثر کھو دیتی ہے ۔ اچھی نظم یا غزل کی طرح افسانہ بھی تخلیقی کرب طلب کرتا ہے ۔ اس فن کو بھی حساس سنجیدہ قاری کی ضرورت ہوتی ہے ۔ نثر ہونے کی وجہ سے افسانوں کی تہہ داریاں اور آہنگ شاعری سے مختلف ہوتی ہیں ۔ مختصر افسانہ اگر تنقید ، ناول اور شاعری سے بہتر نہیں تو ان فنون سے کمتر بھی نہیں ہے ۔ اچھی اور بری شاعری ، ناول یا تنقید کی طرح افسانہ بھی اچھا اور برا ہوتا ہے ۔

ہم جب تسلیم کر لیتے ہیں کہ ادب کے ایک فن کی حیثیت سے مختصر افسانہ انسان کی حسیات سے ہم آہنگ ہے تو ہمیں یہ بھی یقین کر لینا چاہئیے کہ انسان کے جذبات پر دوسرے انسان کے جذبات بھی مسلسل اثر انداز ہوتے ہیں ۔ اس طرح انسان کا رشتہ نہ صرف اس کے معاشرے بلکہ اس کے ملک اور دنیا کی تاریخ سے بھی جڑا ہوتا ہے ۔ اسی لئے جب دور دراز ملکوں سے انشاء میں لکھے ہوئے افسانوں نے مجھے متاثر کیا تو انسان کی فکری وسعت کا شدید احساس بھی مجھے ہوا ۔ اس وسعت میں یکسانیت نہیں بلکہ مسرور کن ست رنگ ہے ۔ انسانی رشتوں کی دردمندیاں ، عذاب اور دکھ کھلا پن ہے ۔ اور ان رشتوں کے کھیلنے والے انسانی کردار کے مختلف پہلو ہیں ۔

جیتندر بلو پشاور میں پیدا ہوئے ۔ ۴۷ء میں انہیں ترک وطن کر کے ہندوستان جانا پڑا اور اب لندن میں آ بسے ہیں ۔ ان کا طویل افسانہ " فرار " لاولد میاں بیوی کی لاولدیت کے عذاب سے فرار کا فسانہ ہے ۔ خاوند ہندوستانی ہے جو لندن میں کسی انگریزی اخبار سے منسلک ہے ۔ اس کی بیوی اسٹیلا جو کبھی بہت حسین تھی اب ماں نہ بننے کے غم میں اپنے حسن میں دلچسپی کھو بیٹھی ہے ۔ گو اسے اپنے خاوند سے محبت نہیں رہی اور وہ اسے علیحدہ ہو جانے کی اجازت بھی دیتی ہے ۔ لیکن خاوند الگ نہیں ہوتا اور اس کی محبت میں بھی کوئی کمی نہیں آتی ۔ جس کی وجہ اس کی درمیانہ عمری ہے اور اس تنہائی اور معاشرے سے کٹ جانے کا خوف ہے جو انگریز بیوی سے جدا ہو جانے کے بعد اسے میسر ہوتی ۔ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ اس کی بیوی اب بھی اسے چاہتی ہے میاں بیوی پارٹیوں میں جا کر اپنا دل بہلاتے ہیں ۔ اور ایک پارٹی میں خاوند غیر عورت کے ساتھ شراب کے نشے میں ہم بستری کرتا ہے ۔ دوسرے دن جب وہ شرمندگی کا اظہار کرتا ہے تو اسے جان کر غم ہو جاتا ہے کہ اس کی بیوی پر اس کی بیوفائی کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے ۔ اسے اب سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی کہ ان کی زندگی ایک موت سے فرار کی کیفیت رہی ہے ۔ اور اسے ہنرمند مصنف اس جملے سے ظاہر کرتا ہے:

" یہ سنتے ہی اس نے زور سے ایکسلیٹر دبایا اور گاڑی چشم زدن میں ہوا سے باتیں کرنے لگی ۔ لیکن میں نہ تو ہوا کے ساتھ تھا نہ اس کے ساتھ اور نہ ہی اپنے ساتھ میں تو بس ایک بے جان سی شے بن کر رہ گیا تھا " ۔

تمام افسانے میں فارسی ، عربی اور سنسکرت کے حسین الفاظ کا استعمال جس سلیقے سے کیا گیا ہے وہ قابل داد ہے ۔ جذبات کی شدت کو عیاں کرنے کے لئے جیتندر بلو نے شعلہ صفت اور شعلہ رو جنوں کا انتخاب کیا ہے ۔ اور یہ ان کا مخصوص اسلوب بھی ہے ۔

پٹنہ، ہندوستان میں مقیم ذکیہ مشہدی کا افسانہ "فضلو بابا نخ نخ" وہ المیہ ہے جو دل کو مسوس دیتا ہے۔ اور اس کے اسلوب میں بھی مصنف کی فنکاری نمایاں ہے۔ قصہ گو ایک بچی کی شکل میں اپنے گاؤں کے بزرگوں کی گود میں دبکی کہانی سنتی نظر آتی ہے۔ وہ بچی جب بڑی ہونے لگتی ہے تو پس منظر میں چلی جاتی ہے اور یکہ بان فضلو مرکزی کردار کی حیثیت سے نمایاں ہوتا ہے۔ اس کے یکہ کی گھوڑی کا نام رام دلاری ہے۔ چونکہ فضلو نے اسے رام لکھن کاکا سے اس وقت خرید اتھا جب رام لکھن کی دو مہینے کی بیٹی جس کا نام رام دلاری تھا فوت ہوئی تھی۔ فضلو بابا رام دلاری پر نہ خود غصہ کرتے ہیں اور نہ کسی دوسرے کا غصہ برداشت کرتے ہیں۔ جانور سے محبت فضلو بابا کے ان دل موہ لینے والے جملوں میں نمایاں ہے:

"کاہو۔ آج سبیرے گھانس نہیں کھائے رہیو ٹھیک سے"۔

"دیکھو بڑکی اماں۔ ایکا کچھ نہ کہو۔ ہم کو گریا لیتو چاہے"۔

اور یہ بڑکی اماں جب بھی یکے میں بیٹھتی ہیں تو فضلو بابا کو جھڑکیاں دیتی رہتی ہیں۔ جس میں غصہ اور نفرت نہیں بلکہ وہ مشفقانہ سلوک ہے جسے چار دہائی پہلے تک بزرگ اپنی اولاد یا وہ جو انہیں اولاد کی طرح عزیز ہوتے تھے ان پر روا رکھتے تھے۔ فضلو بابا کے دل میں بھی بڑی اماں کے لئے انتہائی عقیدت، احترام اور محبت ہے۔ جس کا پتہ بڑکی اماں کی وفات کے بعد چلتا ہے۔ فضلو بابا کوئی گریہ یا فریاد نہیں کرتے لیکن ان کا غم پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ تیجے کے دن سب نے کھانا کھایا۔ لیکن فضلو اپنے برتن سرکا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچی زمین پر ان کے آنسوؤں کا گول نشان دیر تک گیلا رہا۔ فضلو کو اس گھرانے اور اس کے اڑوس پڑوس کے بچے بھی عزیز ہیں۔ وہ انہیں سیر کرانے لے جاتا ہے اور کبھی واپس آنے کے بعد اگر بچے یا بچی کے گھر والے نہیں ہوتے تو وہ نگہبان بن کر اس وقت تک بیٹھا رہتا ہے جب تک کے والدین نہیں آجاتے۔ جب رام دلاری اور بڑکی اماں فضلو بابا کی زندگی سے رخصت ہو گئیں تو فضلو دماغی طور پر ماؤف ہونے لگتے ہیں۔ ماؤفی کی حالت میں وہ اکثر رام پیاری کو یاد کرتے سنائی دیتے ہیں چونکہ وہ ماں کی طرح ان کی کفالت کرتی تھی۔ فضلو مصنف کے مائیکے کا ایک کردار ہے۔ مصنف اپنا مائیکہ چھوڑ چکی ہے اور وہاں گئے ہوئے اسے تین برس ہو رہے ہیں۔ فون سے خیریت اور خبریں ملتی رہتی ہیں۔ ایک دن جب وہ فون کرتی ہیں تو انہیں خبر ملتی ہے۔ بے وقوف قرض ادھار کرکے بدایوں روانہ ہو گیا۔ فضا ان دنوں ایسی ہی خراب تھی۔ بدایوں اسٹیشن پر جو مسافر اردو کے نام پر ٹرین سے کھینچ کر مارے گئے ان میں فضلو بھی تھا۔ لاش بھی گھر نہ آسکی۔

فضلو نہیں بلکہ ایک تہذیب کو مارنے کا شدید غم فاضل مصنف کے ان الفاظ میں پنہاں ہے۔ ضرور اسکی حیران و پریشان روح آسمانوں کے درمیان چکراتی گھومتی ہوگی اور پوچھتی ہوگی "ہمکا کاہے مار دیو بھیا۔" نادان افسانہ نگاروں کی طرح فضلو کی موت پر ذکیہ مشہدی نے کوئی آہ و بکا نہیں کی ہے۔ انکے بیان میں ایک ٹھیراؤ ہے۔ ایسی خود پابندی ہے جو افسانے یا ناول کا بہترین فن مانا جاتا ہے۔ فضلو بابا نخ نخ میں قدیم داستان طرازی اور مختصر افسانے کا بہترین امتزاج ہے اور پوربیا زبان کی بے مثال چاشنی۔

کرداروں کے مکالمے سے انکی شخصیت کے پہلوؤں کو نکھارنا افسانہ اور ناول کا بھی ہنر ہے۔ اور اسکی بہترین مثال پشاور سے زیتون بانو کا افسانہ "لوہے کے چنے" ہے۔ کہانی ایک مفلوک الحال بچے کی ہے جسکی عمر دس سال سے بھی کم ہے۔ دوسرا کردار مریم ہے۔ جسکی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور جو لاولد ہے۔ مریم اور بچے میں کوئی رشتہ نہیں۔ پھر بھی دونوں ایک دوسرے کی جانب کھنچتے ہیں۔ بچے کو کوڑے کرکٹ میں غذا تلاش کرتے دیکھ کر مریم اسے اپنے گھر لے آتی ہے اور کھانا پینا فراہم کرتی ہے۔ بچپن اس معصومیت کا نام ہے جس میں صحیح اور غلط کے درمیان فرق محسوس نہیں ہوتا اور انسان یا معاشرے کے ستم کا شکار ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ لوہے کے چنے میں بچہ توتلا ہے اسلئے اسکی معصومیت اور بھی متاثر کرتی ہے۔ بچے سے بڑا اسکا ایک بھائی بھی ہے۔ جسکی عمر بھی دس سال سے کم ہے۔ دونوں بھائی سڑکوں پر پھینکی ہڈیوں کو جمع کرکے فروخت کرتے ہیں۔ یہی انکی اور انکے دیگر بھائی بہنوں کی گزر اوقات کی صورت ہے۔ توتلے بچے کو برابر اپنے بڑے بھائی کی فکر رہتی ہے۔

"میں تو اپنے بھائی کو بھامیاں کہہ کل بلاتا ہوں۔ مجھ سے بلا ہے۔ ابھی تو دش بلس کا نہیں ہوا ہے۔

لوژے نہیں لکھتا ہے۔ یہ شلبت دے آتا ہوں۔ وہ پی لے گا۔"

اور بچے کا بڑا بھائی گو بخار کی گرمی سے پیاسا ہے۔ لیکن روزے نہیں رکھنے کی وجہ سے مریم کے سامنے آنے سے شرماتا ہے۔ اسے اپنے گناہ کا

احساس ہے ۔ اسی لئے وہ مریم کے سامنے نہیں آتا ۔ مریم انسانیت کے جذبے سے سرشار بچے کو اچھی غذا دیتی ہے ۔ وہ جب بھی اسکے گھر میں آتا ہے ۔ مریم اسکے آرام کا ہر طرح خیال رکھتی ہے ۔ اچانک ایک دن باتوں باتوں میں مریم کو علم ہوتا ہے کہ بچہ اور اسکے سارے بھائی بہن اسکے خاوند کی پہلی بیوی سے ہیں ۔ گو مریم بے قصور ہے اور خاوند نے جو ظلم کیا ہے اس سے بے خبر رہی ہے ۔ پھر بھی وہ خود کو قصوروار سمجھ کر زار و قطار روتی ہے ۔ اسکا رونا اسکی انسانیت کی دلیل ہے ۔ افسانے کا کلائیکس لاشعوری طور پر آتا ہے ۔ اسے بہترین افسانوی اسلوب سمجھنا چاہیے ۔

سویڈن سے سائیں سچا نے جس افسانے کو تحریر کیا ہے وہ محض چند لمحوں پر محیط ہے ۔ ان چند لمحوں میں جس کردار کی تصویر ابھرتی ہے اس میں وہ ظالم بھی ہے اور مظلوم بھی ۔ کہانی میں ایک ہی کردار ہے ۔ لیکن وہ بہت سارے کرداروں کا نمائندہ ہے ۔ انکا جنہوں نے خلیج کی حالیہ جنگ میں عراق پر شدید بمباری کی اور بے شمار شہریوں کو مارا ۔ اور اس کی بھی وہ نمائندگی کر رہا ہے جو ایسے مہلک اسلحات ایجاد کرتا ہے ۔ اور اس طرح وہ اپنے آپ کو فنا کر رہا ہے ۔ افسانے میں سرریلزم (SURREALISM) قاری کے تاثر کو شدید کرتی ہے ۔ اس افسانے کا نام " نیک اور بد " ہے ۔ جسکی کشمکش ابد سے ازل تک جاری رہتی ہے ۔ سائیں سچا نے بڑی خوبی سے ادبی سطح پر اسکی وضاحت کی ہے ۔

موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے ناروے میں مقیم سعید انجم کا افسانہ " عقاب " نفیس ترین ہے ۔ اس صدی میں ہندوستان اور پاکستان سے جس پیمانے پر ہجرتیں ہوئی ہیں اسکی تاریخ میں مثال نہیں ملتی ۔ عقاب میں اسی ہجرت کا المیہ ہے ۔ اوسلو میں نارویجین زبان کے مترجم عثمان کو ہسپتال میں بلایا جاتا ہے اور اسے ایک نفسیاتی مرض کے پاکستانی مریض کے اردو میں لکھے ہوئے خط کو نارویجین زبان میں ترجمہ کرنے کے لئے کہا جاتا ہے ۔ خط میں مریض نے اپنی بیوی کی شکایت لکھی ہے جسے ناروے میں شدید بیگانگی کا احساس ہے اور وہ خود کو اس حد تک اجنبی سمجھتی ہے کہ بچہ جننے کے لئے پاکستان جانا چاہتی ہے ۔ خاوند بذات خود نارویجین معاشرے میں جذب ہو جانا چاہتا ہے ۔ لیکن بیوی اس سے اختلاف کرتی ہے اور لڑتی جھگڑتی رہتی ہے ۔ خط نامکمل ہے اور مریض مر چکا ہے ۔ عثمان جب خط کے بقایا صفحات طلب کرتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ مریض کی بیوی ایک نارویجین خاتون ہے جس سے مریض نے درخواست کی ہے کہ مرنے کے بعد اسے ناروے میں دفن کیا جائے لیکن ہسپتال کے ڈاکٹر کو مریض نے تاکید کی کہ اسے اسکی میت دفنانے کے لئے پاکستان روانہ کی جائے ۔ تب یہ انکشاف ہوتا ہے کہ شدید بیگانگی کا شکار خود مریض تھا اور اپنے بیمار ذہن میں اپنی بے وجود بیوی کو بیگانہ قرار دیتا رہا ۔ در حقیقت مریض " بیمار " نہیں ہے ۔ اسکی کیفیت ان نارمل مہاجروں جیسی ہے جنکے دل و دماغ ہر وقت اس ملک میں لبے رہتے ہیں جہاں سے وہ ہجرت کر کے آئے ہیں ۔ سعید انجم بہترین فلمی ہدایت کار ہیں اور انکی فلم BEYOND THE SEVEN SEAS بین الاقوامی مقابلوں میں انعام بھی حاصل کر چکی ہے ۔ افسانہ " عقاب " میں انکا جمالیاتی تخیل پوری تابناکی سے جلوہ افروز ہے ۔

دسویں صدی میں عرب فلسفی ابو حیان نے کہا تھا کہ خطاطی انسان کے دماغ کا ہیرا ہے ۔ کاتب اسی فن کے ماہر سمجھے جاتے ہیں ۔ اردو کے کاتب جس تنگدستی میں زندگی گزارتے ہیں وہ سبھی جانتے ہیں ۔ شعیب احمد کاف مرحوم کا حیدرآباد ، ہندوستان سے لکھا ہوا افسانہ ایسے ہی ایک کاتب کی داستان ہے ۔ جسے کسی اردو پریس کا مالک اتنے پیسے بھی نہیں دیتا کہ کاتب اپنے چھوٹی بیٹی کی شادی کر سکے ۔ یہاں تک کہ اسکا بونس بھی کسی نہ کسی بہانے کاٹ لیا جاتا ہے ۔ کاتب ایک نیک اور مذہبی انسان ہے اس میں مذہبی تحمل اور امن پسندی ہے ۔ ملک میں فرقہ وارانہ فساد ہو رہے ہیں اور کاتب اپنے محلے کی مسلمان اکثریت کو ہندوؤں پر ظلم و ستم کرنے سے منع کرتے رہتے ہیں ۔ ہندو مسلم فساد کو روکنے کی جو کمیٹی کوششیں کر رہی ہے ۔ اسکے ارکان ایک دن کاتب کو بلا کر لے جاتے ہیں اور امن کی خاطر پوسٹر لکھنے کے لئے کہتے ہیں ۔ کاتب بڑے عزم اور حوصلے سے ساری رات پوسٹر لکھنے میں صرف کرتا ہے ۔ جب وہ صبح کو واپس آتا ہے تو اسے اپنی بیوی ، سسرال سے آئی ہوئی بڑی بیٹی اور اسکا ایک سال کا بچہ مردہ ملتے ہیں ۔ انہیں فسادیوں نے کاتب کی غیر موجودگی میں بے رحمی سے قتل کر دیا ہے ۔ اس غم میں کاتب تڑپ تڑپ کر چھ دنوں بعد مر جاتا ہے ۔ اسکی وفات کے بعد اسکے پریس کا مالک تعزیتی جلسے میں مگر مچھ کے آنسو بہاتا ہے ۔ کاتب کا ایک دوست جو اس جلسے میں موجود ہے اس سے یہ سماں برداشت نہیں ہوتا ۔ وہ مداخلت کرتا ہے اور سامعین سے درخواست کرتا ہے کہ انہیں اگر کاتب کی موت کا سچ مچ غم ہے تو وہ کاتب کی چھوٹی بیٹی کے لئے کوئی دولھا تلاش کر دیں ۔ یا اسکی شادی کے لئے کچھ سرمایہ دیں ۔ چھ مہینے کے بعد کاتب کے دوست کے پاس صرف ڈیڑھ سو روپے کی رقم جمع کرادی جاتی ہے ۔ اس افسانے میں جذبات کے اظہار پر وہ قابو نہیں جو ناول اور افسانے میں اہم نکتہ تسلیم کیا گیا ہے ۔ پھر بھی جو المیہ اس افسانے میں ہے وہ انتہائی تاثراتی ہے ۔ شعیب احمد کاف

کے اس افسانے کو مدیر انشاء نے عالمی افسانہ نمبر کے لئے مصنف کی دوبارہ درخواست پر انتخاب کیا۔ جب اس کے چھپنے کی نوبت آئی تو مصنف اس جہان فانی سے کوچ کر چکا تھا۔

اردو میں بہت کم ہی ایسے افسانے ہونگے جن میں عورت مرد کے رشتے میں جنسی پہلو نمایاں نہ ہوں۔ قارئین کو ان رشتوں پر جنسی افسانوں میں یا تو ہوس کی طلب ملے گی یا ایک دوسرے کو اپنا کر میاں بیوی بن جانے کی خواہش۔ لیکن ایک ایسا معاشرہ جس میں عورت اور مرد کے ملنے جلنے پر پابندیاں نہ ہوں اس میں باہمی احترام اور خیر خواہی کے وہ رشتے قائم ہوسکتے ہیں جن میں جنسی تشنگی کی کشش نہیں ہوتی۔ لندن میں لبنی صفیہ صدیقی کا۔ " بن پتی کا پودا " ایک ایسے ہی رشتہ کا افسانہ ہے۔ لطیف اشاروں سے مصنف نے جس طرح کردار سازی کی ہے اور کرداروں کے خد و خال کو نمایاں کیا ہے اسے بہترین فنکاری کہنا پڑتا ہے۔ خاص طور پر وہ ادھیڑ عمر مرد جو معاشرے کے ہاتھوں پٹ چکا ہے جسکی ذمہ دار بہت بڑی حد تک اسکی انا بھی ہے۔ اس جیسا کردار مجھے اردو افسانے میں پہلے کبھی نظر نہیں آیا۔

آج جبکہ مذہبی ماضی پرستی کا جنون دنیا میں ہر سو پھیل رہا ہے۔ ایسی فضاء میں خاص طور پر ہندوستان سے کملیشور کا افسانہ "مریم" قابل داد ہے اکثر عورت و مرد اپنی بہترین خوبیوں کے باوجود جب میاں بیوی بنتے ہیں تو انکی آپس میں نہیں بنتی اور اسکا انجام طلاق ہوتا ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ طلاق کے بعد جب ملتے ہیں تو ایک دوست کی طرح ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ مریم نیکی اور پاکیزگی کا وہ استعارہ ہے جو افسانے کی ہیروئن شاہین کے روپ میں جلوہ گر ہے۔ اپنے پچھلے خاوند سے علیحدگی کے بعد بھی شاہین دہلی آتی رہتی ہے جہاں اسکی پہلی شادی سے اسکا پانچ سالہ بچہ دفن ہے۔ دہلی میں وہ اپنی ان قریبی عزیزہ کے یہاں ٹھہرتی ہے جنکے بھائی سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ جب شاہین نے دوسرے شادی کی تو اسکی کوکھ میں پہلے خاوند سے دو مہینے کا بچہ تھا۔ جسے اسے اپنے نئے خاوند کے حکم سے ضائع کرانا پڑا۔ شاہین کی دوسری خاوند سے بھی جدائی ہوگئی۔ کراچی میں اسکے ماموں مہاجر و غیر مہاجر کے فساد میں مارے گئے ہیں اور اسکے خاوند کا بھائی ڈرگ کے الزام میں لاہور کے کسی جیل میں قید ہے۔ دہلی میں شاہین کے والد دفن ہیں اور کراچی میں اس کے چچا۔ وہ دھرتی جو صدیوں سے ایک تھی اسکے ٹکڑے ہوجانے کے بعد اس سے صدیوں کا رشتہ اب بھی قائم ہے۔ میں اب سندھی تہبند اور لکھنوی طرز کا کرتا پہنتی ہے۔ اس نے ایک سندھی بچے کو گود لے لیا ہے جسکے والدین سندھ کے فرقہ وارانہ فساد میں مارے گئے ہیں۔ ہندوستان میں آئے دن فساد ہو رہے ہیں۔ ملک آزاد ہوچکا ہے، ٹوٹ چکا ہے لیکن شعیہ، سنی ناہمواری جوں کی توں ہے اور اس نے اس نفرت کو جنم دیا ہے جسکی وجہ سے ہندو، مسلمان، یا مہاجر غیر مہاجر بن کر ایک دوسرے کو نیست و نابود کر رہا ہے۔ یہ تمام واردات اور کرداروں کی اندرونی دنیا بے انتہا حسین اور تہہ دار جملوں میں بیان ہوئے ہیں۔ یہی مختصر افسانے کی شان ہے۔

" فنون " کی وجہ سے میں محمد منشا یاد کے افسانوں سے متعارف ہوا ہوں انشاء میں انکا افسانہ " نظر کا دھوکہ "، لطیف طنز، انوکھے کردار اور انکا مزاج نیز افسانے کے پس منظر نے منشایاد کی تخلیق کو یادگار بنا دیا ہے۔

عالمی افسانہ نمبر میں چند افسانے عبرت ناک بھی ہیں۔ ان کے خالق ترقی اور غیر ترقی پسند ہیں۔ قارئین کو انہیں عبرت حاصل کرنے کے لئے پڑھنا چاہیے تاکہ انہیں معلوم ہوجائے کہ خراب افسانے کی کتنی قسمیں ہیں۔ ان کی تعداد کم ہے۔ اس وقت فاشزم مذہبی اور قومی جنونیت کی شکل میں ہر طرف انسانیت کو فنا کر رہی ہے۔ ایسی حالت میں ادب ہی وہ ہتھیار ہے جس سے اسکا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ یہی وہ فن ہے جس میں ادیب اپنے عقائد سے ماورا ہو کر انسانیت کی بقا کے لئے سینہ سپر ہوجاتا ہے اور اپنی تخلیق کو انسانیت کے شراروں سے بھر دیتا ہے۔ انشاء کے عالمی افسانہ نمبر میں ایسے ہی شراروں کی حرارت ہے۔ اس جریدے کے مدیر ف۔ س۔ اعجاز قابل مبارکباد ہیں۔

مذکورہ نمبر ادارہ انشاء سے ۱۵۰ / روپے (اندرون ملک) یا ۲۵ امریکی ڈالر (بیرون ملک) کے عوض حاصل کیا جاسکتا ہے۔

مسابقتی قیمتوں پر آپ کے محدود وقت کے لئے خاص طور پر تیار کئے گئے پیکیج ٹور

ساؤتھ ایسٹرن ریلوے نے کلکتہ سے آپ کے اڑیسہ کے سفر کو یادگار بنانے کے لئے او۔ٹی۔ڈی۔سی۔ سے مل کر تین پرجوش پیکیج ٹور کی پیشکش کی ہے۔

◄ کلکتہ ـ بالاسور چاندی پور پنچا لینگسور ریمونا ـ کلکتہ (سنیچر ـ اتوار) دام: ۳۲۰ روپے ـ ڈبل کے لئے ۳۹۰ روپے ـ سنگل کے لئے	◄ کلکتہ ـ بھوبنیشور کونارک ـ پوری نندا کانن ـ کلکتہ (جمعہ ـ سوموار) دام: ۵۲۰ روپے ـ ڈبل کے لئے ۶۰۱ روپے ـ سنگل کے لئے	◄ کلکتہ ـ پوری کونارک ـ بھوبنیشور نندا کانن کلکتہ (جمعہ ـ اتوار) دام: ۵۶۰ روپے ـ ڈبل کے لئے ۶۶۰ روپے ـ سنگل کے لئے

۳ سے ۱۲ سال کے بچوں کے لئے ۵۰ فی صد

پیکیج میں شامل ہیں:- ہوڑہ سے سکنڈ کلاس سلیپر کا دو طرفہ ٹرین کرایہ، ہوٹل میں رہائش، تبادلہ اور لگزری کوچ سے ۵ مقامات کی سیر مع گائڈ سروس، زائد خرچ پر ایرکنڈیشنڈ کلاس ٹرین کے خصوصی انتظامات۔

تفصیلات اور بکنگ کے لئے
ریجنل مینیجر
O.T.D.C. Limited..
او۔ ٹی۔ ڈی۔ سی۔ لمیٹڈ
حکومت اڑیسہ کا ٹورسٹ آفس
۵۵ لینن سرانی کلکتہ ۱۳۔۷۰۰۰ ۔ فون: ۲۴۴۳۶۵۲

O.T.D.C Limited
او۔ ٹی۔ ڈی۔ سی۔ لمیٹڈ
پنتھ نواس (اولڈ بلاک)
لیوس روڈ بھوبنیشور ۷۵۱۰۱۴

ساؤتھ ایسٹرن ریلوے

بہ اشتراک
او۔ ٹی۔ ڈی۔ سی۔ لمیٹڈ
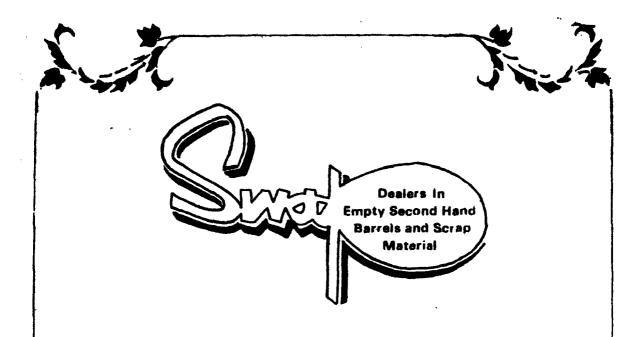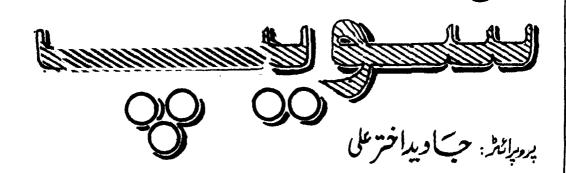
تمام راستے ہیں۔ آپ کی خدمت پر

PRESSMAN

میٹرو ریلوے، کلکتہ

اِس گڈمڈ شہر کے ساتھ تال میل بنائے رکھنا واقعی مشکل ہے

"اپنی بے داغ صحت، قاعدگی کے ساتھ موجود ملازمین، اپنی خوشگوار سجاوٹ اور پابندی کے لئے نیک نامی کے باوصف اور موسیقی، ٹیلی ویژن اور متحرک سیڑھیوں کے ساتھ میٹرو کے لئے واقعی یہ مشکل ہے کہ وہ مذکورہ گڈمڈ شہر کے ساتھ تال میل بنائے رکھے۔

میٹرو جذبات ابھارتی ہے ـــــ نہ صرف اپنے ملازمین میں بلکہ اپنے برتنے والوں میں بھی۔ ایک کلکتہ باسی سرنگ کی دنیا میں اترتے ہی اپنے اندر ایک خاص تبدیلی محسوس کرنے لگتا ہے۔ سرنگ کے اوپر جھگڑوں اور آلودگی سے اس کی بے اعتنائی اچانک ختم ہوجاتی ہے۔ یک بہ یک بہت زیادہ صفائی و ستھرائی سامنے آجاتی ہے! اچانک اس کے ارد گرد ایک ترتیب کا احساس پیدا ہوجاتا ہے اور جس خوبی پر اس شہر میں آئے ہوئے بیرونی لوگ اپنا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ کلکتہ کے خالص انداز میں شد و مد سے اس کی مدافعت بھی کرنے لگتے ہیں۔"

انڈیا ٹوڈے

It's now or never,
join the New Year Fever
FREE!
A VIP Suitcase
with every purchase
of CTV
ONIDA
Neighbour's envy. Owner's pride.
* Brought to you by ONIDA dealers
Offer valid in Calcutta and Suburbs

ہمدرد

سنکارا کے استعمال سے:

آپ اور آپ کے خاندان کی صحت اور
خوش حالی کے لیے
ہر موسم کا سدابہار ٹانک سنکارا

cinkara

جو پئے
سکندر

ہر روز
دو چمچے
دو بار

سنکارا جگائے جینے کی امنگ

ہم بھارت کے عوام
ہم بھارت کے عوام متانت و سنجیدگی سے عزم کرتے ہیں کہ
بھارت کو ایک مقتدر، سماج وادی، غیر مذہبی عوامی جمہوریہ
بنائیں اور اس کے تمام شہریوں کے لئے حاصل کریں
انصاف سماجی، معاشی اور سیاسی
آزادیٔ خیال، اظہار، عقیدہ، دین اور عبادت
مساوات بہ اعتبار حیثیت اور موقع
اور ان سب کے بعد
اخوت کو ترقی دیں جس سے فرد کی عظمت اور قوم کے اتحاد اور
سالمیت کا تعین ہو۔
اپنی آئین ساز اسمبلی میں آج چھبیس نومبر ۱۹۴۹ء کو
یہ آئین ذریعہ ہٰذا اختیار کرتے ہیں، وضع کرتے ہیں
اور اپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں

روزوں میں
خاص طور پر اپنی صحت کا خیال رکھیے !
روح کی پاکیزگی کے ساتھ جسمانی قوت کو قائم رکھنا بھی لازمی ہے!
عام دنوں کے برعکس رمضان المبارک میں روزہ داروں کے معمولات میں بہت زیادہ اُتھل پُتھل
ہوجاتی ہے ۔ سونے جاگنے اور کھانے پینے کے اوقات مختلف ہوجاتے ہیں ۔ بعض غیر مناسب
رسم و رواج کے سبب افطار و سحر میں بے اعتدالیاں بھی ہوتی ہیں ۔ اس کے نتیجہ میں قبض ؛ اسہال ،
معدہ میں جلن ، صفرا کی زیادتی ، ضعفِ اعصاب ، پیاس کی شدت ، جسمانی خشکی ، طبیعت میں چڑچڑاپن ،
تھکن ، نیند نہ آنا اور دردِ سر وغیرہ جیسی شکایات پیدا ہو سکتی ہیں ۔
سنکارا
روزہ داروں کے لیے تغذیہ کی خرابی سے بچاؤ کا وسیلہ بھی ہے اور علاج بھی
سنکارا روزہ داروں کے لیے ایک ایسا بیش بہا تحفہ ہے ، جس کا کوئی بدل نہیں ہے ۔ یہ جسم کے ہر حصّہ کو غذائی مواد کی وہی رَسد بہم پہنچاتا ہے ، جو قدرتی طور پر
اُسے درکار ہے اور اس کے نتیجہ میں بدن کی زائل شدہ قوت تیزی سے بحال ہوتی ہے ۔
سنکارا تمام لازمی بنیادی عناصر ، جڑی بوٹیوں اور قدرتی وٹامنوں کا ایسا بے مثال ٹانک ہے ، جو رمضان المبارک کی خصوصی عبادات اور
ریاضات کے لیے بروقت آپ کو چاق چوبند بناتا ہے ۔
یہ دوسرے بہت سے ٹانکوں کے برعکس الکحل سے پاک ہے اور الکحل کا استعمال طبّی اور مذہبی نقطۂ نظر سے جائز نہیں ۔
رمضان المبارک میں طاقت کے خیال سے معدہ کو غیر ضروری چیزوں سے نہ بھریے ۔ بحالیِ قوت کے لیے سنکارا بہت کافی ہے ۔ اس کے استعمال سے آپ کو
بھرپور توانائی بھی حاصل ہوگی اور آپ غیر مناسب اخراجات سے بھی بچیں گے ۔ یوں بھی بازار میں دستیاب دوسرے ٹانکوں کے مقابلہ میں سنکارا کی قیمت کم ہے ۔
رمضان المبارک میں سنکارا کے اوقات استعمال : افطار اور سحر کے وقت روزانہ تراویح کے بعد ۔
طریقۂ استعمال : تنہا یا پانی یا دودھ میں ملا کر ۔
مقدارِ خوراک : بڑوں کے لیے ۲۰ ملی لٹر یا دو بڑے چمچے برابر ،
بچوں کو ۱۵ ملی لٹر یا ایک چمچہ برابر اور
بوڑھے روزہ دار ۶۰ ملی لٹر یا چار بڑے چمچے برابر ۔
cinkara
ہمدرد
لازمی بنیادی عناصر ،
جڑی بوٹیوں اور قدرتی
وٹامنوں کا نادر مرکب
سنکارا
عالمی ٹانک ۔ ہر موسم میں سب کے لیے

عید مبارک

انشاء

فہرست

جلد: ۱۰
۱۹۹۵ء عید نمبر
شمارہ: ۳-۴

مشرقی ہند کا بہترین اور سب سے زیادہ شائع ہونے والا دلچسپ ادبی معلوماتی اور تفریحی رسالہ

مدیر: ف. س. اعجاز

عید نمبر کی
قیمت: ۸/ روپے
زر سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے
بیرونی ممالک سے ۱۲ پونڈ/ ۱۷ امریکی ڈالر

عید نمبر

صفحہ نمبر

منظومات

برطانوی ممبران رقومات برٹش پوسٹل آرڈر سے روانہ فرمائیں۔ اس میں کمیشن کی بچت ہوتی ہے۔ چیک/ڈرافٹ پر نام کرکے انشاء پبلیکیشنز کے سوا کچھ نہ لکھیں۔

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:
ماہنامہ "انشاء"
۲۵- بی، زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳
فون: ۲۵-۴۹۱۶

ڈرافٹ چیک اور رقومات صرف "انشاء پبلیکیشنز" کے نام ہی بھیجا کریں۔

کفتی (اداریہ)

چراغوں کو ڈر ہے یہ تم جانتے ہو

وہ نبیوں میں جو سب سے اونچے ہوتے ہیں
جو عرشِ معلیٰ پہ پہنچے ہوئے ہیں
جو سارے حجابوں کو سنتے ہوئے ہیں
وہ قول و عمل میں جو سچے ہوئے ہیں

اُنہی کا اجالا ہے نورِ ازل میں
اُنہی کا ہے آہنگ سازِ غزل میں
اُنہی کی رعونت ہے شاہی محل میں
اُنہی کا ہے بل سب غریبوں کے بل میں

وہ جن سے خدا کی خدائی ہوئی ہے
کہانی اُنہی کی سنائی ہوئی ہے
یہ تقدیر ان کی لکھائی ہوئی ہے
جو کاوش میری روشنائی ہوئی ہے

وہ پارس ہیں سونا بناتے ہیں سب کو
ہدایت کی راہیں دکھاتے ہیں سب کو
وہ بخشش کا مژدہ سناتے ہیں سب کو
یقیناً وہ جنت دلاتے ہیں سب کو

نہ خورشید دیکھوں نہ مہتاب دیکھوں
میں جلوہ جو دیکھوں تو نایاب دیکھوں
خزاں میں چمن کو میں شاداب دیکھوں
شہِ انبیاء کا حسیں خواب دیکھوں

سنانا ہے کچھ ان کو خوابوں میں پاکر
یہ کہنا ہے دستِ دعا کو اٹھاکر
یہ کہنا ہے ناسور اپنا دکھاکر
رسولِ خدا کچھ ہماری شفا کر

نبی جی تمہارے ہیں ہم نام لیوا
زمانے کی جانب سے الزام لیوا
ہمیں گر بتاؤ، ہو تم کام لیوا
کہ ساقی ہو تم اور ہم جام لیوا

ہوا تیز تر ہے، یہ تم جانتے ہو
چراغوں کو ڈر ہے، یہ تم جانتے ہو
رہِ پُرخطر ہے، یہ تم جانتے ہو
کہ ہاتھوں میں سر ہے، یہ تم جانتے ہو

سدا منہ کی کھاتے ہیں ہم جیتے جیتے
فقط ہار جاتے ہیں ہم جیتے جیتے
بہانے بناتے ہیں ہم جیتے جیتے
یہ آنسو بہاتے ہیں ہم جیتے جیتے

خود اپنی ستائی ہے امت تمہاری
خودی چاہتی ہے حفاظت تمہاری
جو لوح و قلم ہیں امانت تمہاری
تو قسمت ہماری ہے، قسمت تمہاری

زمیں کے مکینوں کو پستی ہے بھولی
کہ ناچیز ذرّوں کو ہستی ہے بھولی
ہمیں فقر و فاقہ کی مستی ہے بھولی
محمد ہمیں حق پرستی ہے بھولی

ہمیں علم دو، حوصلہ دو، نظر دو
جو منزل پہ لے جائے، اذنِ سفر دو
فنا ہوں یہ راتیں، ہمیں اک سحر دو
جو زندہ ہیں ہم تو ہمیں یہ خبر دو
وگرنہ تو مجہول سارا جہاں ہے

نسیم عزیزی
۳۲۔ بیلیلئیس روڈ، ہوڑہ / ۷۱۱۱۰۱

جو اب کے عید آئی تو!

یہ سچ ہے روشنی میں غسل کرتی تھیں کئی گلیاں
منور تھیں کئی سڑکیں
ہماری مسجدوں میں رونقیں پھر لوٹ آئی تھیں
فضاؤں میں اتر آئی تھی اک بارات نغموں کی
مگر روشن سی گلیوں میں
کئی اک گھر بھی ایسے تھے
مکینوں نے جہاں رکھے تھے روزے سب
مگر ان کو
نہ افطاری، نہ ہی سحری میسر تھی
وہ خالی پیٹ کرتے تھے
عبادت اپنے مولا کی
بڑے صبر و رضا سے منتظر تھے عید کے لیکن
جو آئی عید تو دل ہو گیا پر خوں
ضرورت پوری بچوں کی
نہ کر پانے کسی صورت
شکایت ان کو خالق سے نہیں تھی اک ذرا پھر بھی
وہ اپنی غمزدہ خاموش آنکھوں سے
جدھر بھی دیکھتے ان کو
اندھیرا ہی اندھیرا بس نظر آتا
کہ جس کی زد میں رنگ و روشنی بھی تھی.
خوشی کے سارے نغمے بھی
مگر حیرت بڑی ہم پر ہوئی ان کو
جو اس طوفاں کی آمد سے سراسر بے خبر ٹھہرے
قیامت کی گھڑی ان پر جو آئی تھی
ذرا سی ایک آہٹ بھی
سماعت کو ہماری چھو نہ پائی تھی
ہم اپنی اپنی دنیا میں
مساوات و محبت کے انوکھے درس کو بھولے
مہذب قوم کے افراد کہلا کر
اعزہ اور اقارب کی رفاقت میں
خوشی کے ان گنت لمحے
نثار اک دوسرے پر کر کے شاداں تھے
مگر اے مالک و مولا!
بہاتی تھیں وہ آنکھیں خون کے آنسو
زباں تھی گنگ، خاموشی تکلم تھی
خصوصی اہتمام عید کر کے ہم ہوئے نازاں
مسرت کی ہزاروں محفلیں آراستہ کر کے
منائی عید عشرت سے
خدائے برتر و بالا میں اتنا کہنا چاہوں گا
جو اب کے عید آئے تو
ہر اک گھر میں چراغاں ہو
خوشی ہر دل میں رقصاں ہو
ہماری عید تب ہوگی

میٹرو عید

(ہندوستان کی پہلی سُرنگ ریل کلکتہ میٹرو ریلوے نے اپنی تیاری کے آخری مراحل تیزی سے اور پیش از وقت طے کرلئے۔ اس موقع پر میٹرو ریلوے کے لئے ایک شاعر کا تحفہ)

۱۹- فروری ۱۹۹۵ء

ف ۔ س ۔ اعجاز

میٹرو شہر کے دل میں داخل ہوئی

ٹوٹے پھوٹے ہوئے شہر کے راستوں سے گزرتے ہوئے
ہانپتے کانپتے
اِک کثیف اور آلودہ ماحول سے
جس گھڑی صاف ستھری چمکدار سیڑھی کو طے کرکے ہم
بدحواسی میں اُلجھے ہوئے گرتے پڑتے قدم
لے کے پاتال نگری میں داخل ہوئے
حُسن کی ایک دیوی نے چونکا دیا
جگمگاہٹ نے آنکھوں کو خیرہ کیا
اور سانسوں میں اِک تازگی بھر گئی
دل نے پوچھا کہ کیا یہ کوئی خواب ہے
ہم نے دانتوں سے اُنگلی میں کاٹا تو سچ کا یقیں آگیا
سب تھکن مِٹ گئی ، بدحواسی گئی
آج زیرِ زمیں حُسن ہی حُسن ہے !
سخت محنت
ذہانت
ارادہ ، طلب
اور حُسنِ طلب کام آہی گیا
شہر والوں کی پوری اُمنگیں ہوئیں
صبر کا میٹھا پھل آج سب کو مِلا
کیوں نہ فرہاد کے تیشے کو چوم لیں
جس کے ہاتھوں کی محنت نے جادو کیا

میٹرو شہر کے دل میں داخل ہوئی

سہمے گھبرائے قدموں کو چلنے کا تھوڑا سلیقہ مِلا
ہر مسافر کے ہونٹوں پہ پیغام ہے
"عید کا دن ہے یہ
عید کا دن ہے یہ"

اِطلاع :- میٹرو ریلوے کا سنگ بنیاد آنجہانی وزیرِاعظم اندرا گاندھی نے ۱۹۷۲ء میں جس وقت رکھا تھا تو اس کے پراجکٹ کا تخمینہ ۱۴۰ کروڑ روپے تھا ، اور اب دسمبر میں جب یہ منصوبہ مکمل ہوگا تو اس کی لاگت ۱۶۰۰ کروڑ روپے ہوگی۔ ۲۲ سال کلکتہ کے شہریوں نے میٹرو سُرنگ کی کُھدائی کے سبب سخت الجھنیں برداشت کیں۔

انشاء کا آئندہ شمارہ

اسکنڈے نیویائی ادب نمبر ہوگا

اس کی ضخامت ۴۵۰ صفحات کا اعلان کیا گیا تھا اور مجوزہ قیمت اندرون ملک ۳۰۰ روپے تھی۔ بیرون ملک ۵۰ امریکی ڈالر۔ لیکن اب ضخامت بڑھ کر ۶۰۰ صفحات ہوگئی ہے جبکہ قیمت بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک یہ ہے۔

اندرون ملک	:	۳۰۰ روپے
برطانیہ میں	:	۲۰ پونڈ
ناروے، ڈنمارک، سوئیڈن اور دیگر مغربی ممالک میں	:	۴۰ امریکی ڈالر

ہمیں احساس ہے کہ ہمارے ملک میں ۳۰۰ روپے کا شمارہ خریدنا لوگوں کیلئے مشکل ہے لیکن ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ باذوق قارئین کے لئے اس قیمت پر خاص نمبر مہنگا نہیں ہے۔ یہ کئی کتابوں سے بہتر اور کئی کتابوں کے برابر ثابت ہوگا۔ اس کی قیمت بنام "انشاء پبلی کیشنز" پیشگی روانہ فرمائیں۔ نمبر پسند نہ آنے پر آپ بحفاظت لوٹا سکتے ہیں اور قیمت واپس لے سکتے ہیں۔

یہ خاص نمبر برصغیر اور اسکنڈے نیویائی ممالک کے درمیان ایک ثقافتی اور سفارتی رابطے کا پل ثابت ہوگا اور اپنی نوعیت کا پہلا اردو کام ہے۔ مدیر انشاء نے اسے تین سال کی سخت محنت اور تحقیق سے مرتب کیا ہے اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو آزمایا ہے۔ ادباء، اساتذہ، ریسرچ اسکالروں اور لائبریریوں وغیرہ سے مدیر انشاء کی خصوصی التماس ہے کہ اس انتہائی اہم علمی و ادبی مرقع کو حاصل کرنے میں دیر نہ لگائیں کیونکہ یہ محدود تعداد میں شائع کیا جا رہا ہے ایسے شماروں کی اشاعت ناشر کے لیے گھاٹے کا سودا ہوتا ہے۔ لیکن ہم نے ایک خطرہ مول لیا ہے۔ صرف اردو کی محبت میں اور اس کے دائرۂ ادب کو وسعت دینے کی غرض سے چھ ملکوں پر مشتمل شمال مغربی کرۂ ارض جسے اسکنڈے نیویا کہا جاتا ہے، اس کا اصل مہجری اردو ادب اور اوریجنل مقامی ادب کے منتخب اور بھرپور شہ پاروں کا اردو ترجمہ جب آپ کی نظر سے گزرے گا تو آپ کے ذہن و دل میں نئے دریچے کھل جائیں گے۔ جی ہاں! "اسکنڈے نیویائی ادب نمبر"، سچ مچ ایک تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔ "انشا عالمی اردو افسانے نمبر" کے بعد اکیسویں صدی کی جانب اردو ادبی صحافت کا ایک اور ٹھوس قدم ہے!۔

ذرا ہمت کیجیے گا اور اسے خرید لیجیئے گا۔ انشاء اللہ مارچ کے چوتھے ہفتے میں یہ نمبر ریلیز ہوگا۔ (ادارہ)

اسوہ محمدی کی جامعیت

تحریر :خورشید احمد

اس دنیا کی بنیاد ہی اختلاف عمل پر ہے ۔ باہمی تعاون اور مختلف پیشوں اور کاموں ہی کے ذریعے یہ دنیا چل رہی ہے ۔ اس میں بادشاہ یا رئیس،جمہور اور حکام بھی ضروری ہیں اور محکوم، مطیع اور فرماں بردار رعایا بھی ۔ امن و امان کے قیام کے لیے قاضیوں اور ججوں کا ہونا بھی ضروری ہے ۔ اور سپہ سالاروں کا بھی، غریبوں، دولت مندوں، عابد و زاہد، سپاہی و مجاہد، اہل و عیال، دوست احباب، تاجر و سوداگر، امام اور پیشوا، سب ہی کا ہونا ضروری ہے ۔ غرض اس دنیا کا نظم و نسق ان کی مختلف اصناف کے وجود اور قیام پر ہی موقوف ہے ۔ اور ان تمام اصناف کو اپنی اپنی زندگی کے لیے عملی مجسمے اور نمونے کی ضرورت ہے ۔

اسلام ان تمام انسانوں کو سنت نبوی صلعم کی دعوت دیتا ہے ۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ مختلف طبقات انسانی کے لیے اپنے پیغمبر کی عملی سیرت میں نمونے اور مثالیں رکھتا ہے جو ان میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ ہدایت کا چراغ بن سکتا ہے ۔ اسلام کے صرف اسی نظریے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلعم کی سیرت میں جامعیت ہے ۔ یعنی انسانوں کے ہر طبقے اور صنف کے لیے اس سیرت پاک میں نصیحت پذیری اور عمل کے لیے درس اور سبق موجود ہیں ۔

اصناف انسانی کے بعد دوسری جامعیت خود ہر انسان کے مختلف لمحوں کے مختلف افعال کی ہے ۔ ہم چلتے پھرتے بھی ہیں ۔ اٹھتے بیٹھتے بھی ہیں ۔ کھاتے پیتے بھی ہیں ۔ سوتے جاگتے بھی ہیں ۔ لین دین بھی کرتے ہیں ۔ ہنستے بھی ہیں روتے بھی ہیں ۔ پہنتے بھی ہیں اتارتے بھی ہیں، سیکھتے بھی ہیں، سکھاتے بھی ہیں، سوتے بھی ہیں مارتے بھی ہیں، کھاتے بھی ہیں اور کھلاتے بھی ۔ عبادت و دعا بھی کرتے ہیں اور کاروبار بھی ۔ مہمان بھی بنتے ہیں اور میزبان بھی ، ہم کو ان تمام امور کے متعلق جو ہمارے مختلف افعال جسمانی سے تعلق رکھتے ہیں، عملی نمونوں کی ضرورت ہے جو ہم کو ہر نئی حالت کے پیش آنے پر ایک نئی ہدایت کا سبق اور نئی رہنمائی کا درس دیں ۔

ان افعال کے بعد ، جن کا تعلق اعضا سے ہے ، وہ افعال ہیں جن کا تعلق دل و دماغ سے ہے ۔ اور جن کی تعبیر ہم اعمال قلب یا جذبات اور احساسات سے کرتے ہیں ۔ ہر آن ،ہم ایک نئے قلبی عمل یا جذبہ یا احساس سے متاثر ہوتے ہیں ۔ ہم کبھی راضی ہیں کبھی خوش ہیں ، کبھی غم زدہ ، کبھی مصائب سے دوچار ہیں اور کبھی نعمتوں سے مالا مال ، کبھی ناکام ہوتے ہیں اور کبھی کامیاب ، ان سب حالتوں میں ،ہم مختلف جذبات کے ماتحت ہوتے ہیں ۔ اخلاق فاضلہ کا تمام تر انحصار ان ہی جذبات اور احساسات کے اعتدال اور باقاعدگی پر ہے ۔ ان سب کے لیے ،ہم کو ایک عملی سیرت اور نمونے کی حاجت ہے ۔

عزم ، استقلال ، شجاعت ، صبر ، شکر ، توکل ، رضا بہ تقدیر ، مصیبتوں کی برداشت ، قربانی ، قناعت ، استغنا ، ایثار ، جود ، تواضع ، خاکساری ، غرض ، نشیب و فراز ، بلند و پست تمام اخلاقی پہلوؤں کے لیے ، جو مختلف انسانوں کو مختلف حالتوں میں یا ہر انسان کو مختلف صورتوں میں پیش آتے ہیں ، ہم کو عملی ہدایت اور مثال کی ضرورت ہے ، مگر وہ کہاں مل سکتی ہے ؟ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس!

ایک ایسی شخصی زندگی جو ہر طائفہ انسانی اور ہر حالت انسانی کے مختلف مظاہر میں ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہو صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے ۔ اگر دولت مند ہو تو مکے کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو ، اگر غریب ہو تو شعب ابی طالب کے قیدی اور مدینے کے مہمان کی کیفیت سنو ، اگر بادشاہ ہو تو سلطان عرب کا حال پڑھو ، اگر رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو ، اگر فاتح ہو تو بدر و حنین کے سپہ سالار پر نگاہ دوڑاؤ ، اگر تم نے شکست کھائی ہے تو معرکہ احد سے عبرت حاصل کرو ، اگر تم استاد اور معلم ہو تو صفہ کی درس گاہ کے معلم مقدس کو دیکھو ، اگر شاگرد ہو تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماؤ ، اگر واعظ اور ناصح ہو تو مسجد مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو ، اگر تنہائی و بے کسی کے عالم میں حق کی منادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہو تو مکے کے بے یار و مددگار نبی کا اسوہ حسنہ تمہارے سامنے ہے ۔ اگر تم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیر اور مخالفوں کو کمزور بنا چکے ہو تو فاتح مکہ کا نظارہ کرو ، اگر اپنے کاروبار اور دنیاوی جدوجہد کا نظم و نسق درست

کرنا چاہتے ہو تو بنی نضیر، خیبر اور فدک کی زمینوں کے مالک کے کاروبار اور نظم ونسق کو دیکھو، اگر یتیم ہو تو عبداللہ و آمنہ کے جگر گوشے کو نہ بھولو، اگر بچہ ہو تو حلیمہ سعدیہ کے لاڈلے بچے کو دیکھو، اگر تم جوان ہو تو مکے کے ایک چرواہے کی سیرت پڑھو، اگر سفری کاروبار میں ہو تو بصرے کے کارواں سالار کی مثالیں ڈھونڈو۔ اگر عدالت کے قاضی اور پنچایتوں کے ثالث ہو تو کعبے میں نور آفتاب سے پہلے آنے والے ثالث کو دیکھو، جو حجر اسود کو کعبے کے ایک گوشہ میں کھڑا کر رہا ہے، مدینے کی کچی مسجد کے صحن میں بیٹھنے والے منصف کو دیکھو جس کی نظر میں شاہ و گدا، امیر و غریب برابر تھے۔ اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہ اور عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنھما کے مقدس شوہر کی حیات پاک کا مطالعہ کرو۔ اگر اولاد والے ہو تو فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا کے باپ اور حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنھما کے نانا (صلی اللہ علیہ وسلم) کا حال پوچھو، غرض تم جو کوئی بھی ہو اور کسی حال میں بھی ہو تمہاری زندگی کے لیے نمونہ، تمہاری سیرت کی درستی و اصلاح کے لیے سامان، تمہارے ظلمت خانہ کے لیے ہدایت کا چراغ اور رہنمائی کا نور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کبریٰ کے خزانے میں ہر وقت اور ہمہ دم مل سکتا ہے۔ اس لیے طبقہ انسانی کے ہر طالب اور نور ایمانی کے ہر متلاشی کے لیے صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہدایت کا نمونہ اور نجات کا ذریعہ ہے۔

غرض ایسی کامل و جامع ہستی جو اپنی زندگی میں ہر نوع اور ہر قسم، ہر گروہ اور ہر صنف انسانی کے لیے ہدایت کی مثالیں اور نظیریں رکھتی ہو، وہی اس لائق ہے جو غیظ و غضب اور رحم و کرم، جود و سخا اور فقر و فاقہ، شجاعت و بہادری اور رحم دلی و رقیق القلبی، خانہ داری، اور خداوانی، دنیا اور دین دونوں کے لیے، ہم کو اپنی زندگی کے نمونوں سے بہرہ مند کر دے۔ جو دنیا کی بادشاہی کے ساتھ آسمان کی بادشاہی کی بشارت دے۔ اور دونوں بادشاہتوں کے قواعد و قوانین اور دستور العمل کو اپنی زندگی میں برت کر دکھادے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا میں صرف عفو و درگزر، معافی اور نرمی انسانیت کی تکمیل کے سب سے بڑے ذریعے ہیں۔ بلکہ فقط یہی ذریعے ہیں۔ اس لیے جس ہستی میں صرف ایک بھی پہلو ہو وہی انسانیت کی سب سے بڑی مصلح اور محسن ہے۔ لیکن ہمیں یہ بتاؤ کہ انسان کے اخلاق میں کیا فقط یہی قوتیں ودیعت ہیں یا اس کے مقابل کی قوتیں بھی ہیں۔ ایک انسان میں دیکھو تو ہر قسم کے فطری جذبات مثلاً غصہ اور کرم، محبت اور عداوت، خواہش و قناعت، انتقام اور عفو وغیرہ موجود ہیں۔ اس لیے ایک کامل معلم وہی ہو سکتا ہے جو انسانیت کے ان تمام قویٰ اور جذبات میں اعتدال پیدا کر کے ان کے صحیح مصرف کو متعین کرے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی زندگی کفر کے خلاف غیظ و غضب کا ولولہ پیش کرتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات بت شکنیوں کا منظر دکھاتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کفار سے جنگ و جہاد، شاہانہ نظم و نسق اور اجتماعی دستور و قانون کی مثال پیش کرتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی صرف خاکساری، تواضع، عفو و درگزر اور قناعت کی تعلیم دیتی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی شاہانہ اولوالعزمیوں کی جلوہ گاہ ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام کی حیات صبر و شکر کا نمونہ ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام کی سیرت ندامت و انابت اور اعتراف کی مثال ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی قید و بند میں بھی دعوت حق اور جوش تبلیغ کا سبق ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی سیرت گریہ و بکا، حمد و ستائش اور دعا و زاری کا صحیفہ ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی زندگی امید، خدا پر توکل اور اعتماد کی مثال ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کو دیکھو کہ اس میں نوح اور ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ، سلیمان اور داؤد، ایوب اور یونس، یوسف اور یعقوب علیہم السلام سب کی زندگیاں اور سیرتیں سمٹ کر آگئی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام قانون لے کر آئے، حضرت داؤد علیہ السلام دعا اور مناجات لے کر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام زہد و اخلاق لے کر۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قانون بھی لائے، دعا و مناجات بھی اور زہد و اخلاق بھی۔ ان سب کا مجموعہ الفاظ و معنی میں قرآن اور عمل میں سیرت محمدی ہے۔

اب سیرت محمدی کی جامعیت کا ایک اور پہلو دیکھیے۔ دنیا میں دو قسم کی تعلیم گاہیں ہیں۔ ایک وہ جہاں صرف فن سکھایا جاتا ہے۔ جیسے کوئی میڈیکل کالج ہے، کوئی انجینئرنگ کالج ہے، ایک آرٹ اسکول ہے، ایک تجارت کا مدرسہ ہے۔ ان میں سے ہر مدرسہ اور تعلیم گاہ صرف ایک ہی قسم کے طالب علموں کا انتظام کر سکتی ہے۔ میڈیکل کالج سے صرف ڈاکٹر نکلیں گے۔ قانون کے مدرسے سے قانون داں تیار ہوں گے۔ تجارت کی تعلیم گاہ سے صرف تجارت کے واقف کار پیدا ہوں گے۔ علم و فن کے مدرسے کی خاک سے صرف اہل علم اور اہل فن اٹھیں گے۔ لیکن کہیں کہیں بڑی بڑی

یونیورسٹیاں ہوتی ہیں۔ یہ دوسری قسم کی تعلیم گاہیں ہیں جو اپنی وسعت کے مطابق ہر قسم کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتی ہیں۔ ان کے احاطے میں ڈاکٹری کا کالج بھی ہوتا ہے اور صنعت و حرفت کا مدرسہ بھی۔ طلبہ مختلف دیار سے آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق، مناسبت طبع اور استعداد کے مطابق ایک ایک کالج یا مدرسے کا انتخاب کرلیتے ہیں۔ پھر وہاں فوجوں کے جنرل اور سیاسی، عدالتوں کے قاضی اور قانون داں اور ماہر سب ہی پیدا ہوتے ہیں۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صرف ایک ہی تعلیم، ایک ہی پیشہ اور ایک ہی علم کے جاننے والوں سے انسانی سوسائٹی کی تکمیل نہیں ہوسکتی بلکہ ان سب کے مجموعے سے وہ کمال کو پہنچتی ہے اور پہنچ سکتی ہے۔ اگر صرف ایک ہی علم اور ایک ہی پیشے کے ماہرین سے تمام دنیا معمور ہوجائے تو اس تمدن و تہذیب کی مشین فوراً بند ہوجائے۔ اور انسانی کاروبار یک قلم مسدود ہوجائے۔ یہاں تک کہ اگر دنیا صرف زہد پیشہ خلوت نشینوں سے بھر جائے تب بھی وہ اپنی تکمیل کے درجے کو نہیں پہنچ سکتی۔ اب اس معیار سے مختلف انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتوں پر آپ غور کریں اور تعلیم انسانی کی ان درس گاہوں کا جائزہ لیں جن کے اساتذہ انبیاء رہے ہیں تو پہلے تو کہیں دس دس، بیس بیس، کہیں ساٹھ ستر، کہیں سو دو سو، کہیں ہزار دو ہزار کہیں پندرہ بیس ہزار طالب علم ملیں گے۔ لیکن جب مدرسہ نبوت کی آخری تعلیم گاہ کو دیکھیں گے تو آپ کو ایک لاکھ سے زیادہ طالب علم بہ یک وقت نظر آئیں گے۔ پھر اور دوسری نبوت کی تعلیم گاہوں کے طلبہ کو اگر جاننا چاہیں کہ وہ کہاں کے تھے؟ کون تھے؟ کیسے تیار ہوئے؟ اور ان کے اخلاق و عادات، روحانی حالات، اور دیگر سوانح زندگی کیا تھے؟ اور عملی تربیت کے عملی نتائج کیسے ثابت ہوئے؟ تو آپ کو ان سوالات کا کوئی جواب نہیں مل سکتا۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درس گاہ میں آپ کو ہر چیز معلوم ہوسکتی ہے۔ اس کے ہر ایک طالب علم کا نام و نشان، حالات و سوانح، نتائج تعلیم و تربیت، ہر چیز تاریخ اسلام کے اوراق میں ثبت ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ اس درس گاہ کو آفاقی اور عالم گیر کہیے، کہ ہر ملک، ہر قوم، ہر وطن اور ہر خانوادے کا باشندہ عملاً اس میں داخل ہے۔ کیوں کہ اس میں داخلے کے لیے رنگ و روپ ملک و وطن، قوم و نسل اور زبان و لہجے کا سوال نہ تھا بلکہ وہ دنیا کے تمام خانوادوں، تمام قوموں، اور تمام زبانوں کے لیے عام تھی۔ پھر اس درس گاہ کی حیثیت و درجہ ملاحظہ کیجیے کہ اس جامع اور عمومی درس گاہ اور عظیم الشان یونیورسٹی میں ذوق، مناسبت طبع اور استعداد کے مطابق ہر ملک کے لوگوں کو، ہر قوم کے افراد کو الگ تعلیم ملتی ہے۔ ایک طرف عقلائے روزگار، اسرار فطرت کے محرم، دنیا کے جہاں بان اور ملکوں کے فرماں روا اس درس گاہ سے تعلیم پاکر نکلتے ہیں۔ دوسری طرف ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جن کے فاتحانہ کارناموں کی دھاک آج بھی زمانے پر بیٹھی ہوئی ہے۔ تیسری طرف وہ بیسیوں صحابہ ہیں جنہوں نے صوبوں اور شہروں کی کامیاب حکومت کی۔ چوتھی طرف علما اور فقہا کی صف ہے۔ پانچویں صف عام ارباب روایت و تاریخ کی ہے جس میں سینکڑوں صحابہ ہیں جو احکام و وقائع کے ناقل اور راوی ہیں۔ چھٹی جماعت اہل صفہ کی ہے، جن کے پاس سر رکھنے کے لیے مسجد نبوی کے چبوترے کے سوا کوئی جگہ نہ تھی۔ بدن پر کپڑوں کے سوا دنیا میں ان کی کوئی ملکیت نہ تھی۔ وہ دن کو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے، ان کو بیچ کر خود کھاتے، کچھ راہ خدا میں دیتے اور رات طاعت و عبادت میں بسر کرتے۔ یہاں وہ لوگ بھی نظر آتے ہیں جن کے مانند آسمان کے نیچے ان سے زیادہ حق گو کوئی پیدا نہ ہوا۔ ایک اور طرف بہادر کارپردازوں اور عرب کے مدبرین کی جماعت ہے تو ایک جماعت حق کے شہیدوں اور بے گناہ مقتولوں کی ہے جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانیں قربان کیں مگر حق کا ساتھ چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے۔

غور کا مقام ہے! یہ وہی وحشی عرب، وہی بت پرست عرب، وہی بد اخلاق عرب ہیں۔ یہ کیا انقلاب ہوگیا تھا؟ ایک امی کی تعلیم جاہل عربوں کو عاقل، روشن دل، روشن دماغ اور مقنن کیوں کر بنا گئی؟ ایک یتیم پیغمبر کا ولولہ۔ تبلیغ کس میرس عربوں کو سپہ سالار اور بہادر بناکر زور و قوت کا خزانہ کیسے عطا کر گیا؟ جو خدا کے نام سے بھی آشنا نہ تھے، وہ ایسے شب زندہ دار، عابد، متقی اور طاعت گزار کیوں کر ہوگئے؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات انسانی کمالات اور صفات حسنہ کا ایک کامل مجموعہ تھی اور یہ سب ان ہی کی جامعیت کی نیرنگیاں اور جلوہ آرائیاں تھیں۔ گویا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک آفتاب عالم تاب تھا، جس سے اونچے پہاڑ، رتیلے میدان، بہتی نہریں، سرسبز کھیت، اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق تابش اور نور حاصل کرتے تھے یا ابر باراں تھا جو پہاڑ اور جنگل، میدان اور کھیت، ریگستان اور باغ ہر جگہ برستا تھا۔ اور ہر ٹکڑا اپنی اپنی استعداد کے مطابق سیراب ہو رہا تھا۔ اور قسم قسم کے درخت اور رنگا رنگ کے پھول اور پتے جم رہے تھے۔ اور اُگ رہے تھے۔

اورنگ آباد ایک مشہور مقام ہے اس کے قرب و جوار میں اجنتا اور ایلورا کے غار واقع ہیں ۔ لیکن یہ حقیقت نظر انداز کر دی گئی ہے کہ اورنگ آباد خود تعمیراتی عجائب کا مجموعہ ہے جن میں سب سے زیادہ دلچسپ اس کا اسلامی طرز تعمیر ہے ۔ اس کی مسجدیں ، مقبرے اور درگاہیں سیکڑوں کی تعداد میں ہیں ۔

دولت آباد میں جامع مسجد
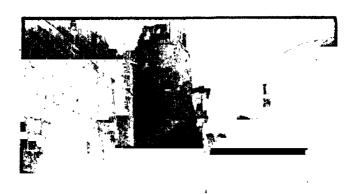
قلعہ دولت آباد بارہویں صدی میں یا دو بادشاہت کے عرصہ میں تعمیر ہوا ۔ اولاً اس کا نام دیواگری تھا ۔ بعد میں جب محمد بن تغلق نے ۱۳۲۷ء میں اپنا دارالخلافہ یہاں منتقل کیا تو اس کا نام دولت آباد رکھ دیا ۔

اسلامی طرز تعمیر کا عجائب گھر اورنگ آباد

انگریزی تحریر : کارمین کاگل (Carmen Kagel)
ترجمہ : انشاء
تصاویر : کیکی شیٹھ

قابل دید تاریخی مقامات کے معاملے میں اورنگ آباد کا نام ہندوستان کے نقشہ پر تو ایک زمانے سے موجود ہے ۔ مگر اس کی حیثیت محض ایک مرکز کی سی رہی ہے جہاں پہونچنے کے بعد اجنتا اور ایلورا کے لئے سفر کی تیاریاں شروع کی جاسکتی ہیں ۔ سیاح اس شہر کے ارد گرد کے ماحول کو دیکھ کر اسے ہمیشہ نظرانداز کرتے رہے ۔ بے تکی عمارتوں اور کھنڈروں کے پرے انہیں کبھی جھانکنے کا موقع نہیں ملا ۔ ورنہ دکن پلیٹو کا یہ حصہ قدرتی پس منظر اور حسین تاریخی عمارتوں کی دولت سے کسی بھی اعتبار سے کم مالامال نہیں ۔

دکن پلیٹو کا یہ حصہ کافی ابھرا ہوا مگر مسطح ہے ۔ ڈھلوان میں املی اور آم کے کافی تناور پیڑ ہیں جن کی شاخیں ہر طرف گھیرا ڈالے ہوئے ہیں ۔ دریائے خم اس شہر کے حسن میں اور بھی اضافہ کرتا ہے جو ٹھیک اس کے بیچوں بیچ گزرتا ہے ۔ سیاح جب اس شہر کے اندر داخل ہوتے ہیں تو انہیں اوراق پارینہ کی تصویریں مقبرے میناروں اور حسین عمارتوں کے کھنڈروں کی شکل میں نظر آتی ہیں اور پھر اورنگ آباد ان کے لئے عجائبات کا خزانہ بن جاتا ہے ۔

اسلام خان کا مقبرہ غالباً پہلی تاریخی عمارت ہے جسے دیکھ کر شوق دید میں اضافہ ہوتا ہے ۔ اسلام خان شاہ جہاں کے عہد میں دکن کا صوبہ دار تھا ۔ اس کی موت کے بعد ایک شاندار مقبرہ تعمیر کیا گیا جس کے دو بڑے گنبد ہیں اور کافی فاصلے سے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں ۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر شہر کا آبی ذخیرہ ہے جو بلدیاتی تکنیک کے معاملے میں زمانہ وسطیٰ کا تجربہ ہے ۔ آبی ذخیرہ مقامی زبان میں "گئوکھ" کہلاتا ہے ۔ یہ چاروں طرف سے گھری ہوئی عمارت ہے جس کے اندر ایک گائے کا مجسمہ ایستادہ ہے جس کے کھلے ہوئے دہانے سے ہر وقت پانی بہتا رہتا ہے ۔ تقریباً سو گز کی دوری پر ایک انتہائی حسین عمارت ہے جسے لوگ راجہ جے سنگھ کی چھتری کہتے ہیں ۔ یہ راجپوت سردار بیکانیر کا رہنے والا تھا ۔ اورنگ زیب کے سپہ سالار کی حیثیت سے اس نے دکن میں اہم کارنامے انجام دیئے ہیں ۔ اس کی تعمیر کردہ عمارت چھتری راجپوت کے طرز تعمیر کا ایک خاص نمونہ ہے ۔ اس کے ٹھیک مخالف سمت میں مقبروں کے سلسلے ہیں جن کے سفید گنبد دوپہر کی دھوپ میں آنکھیں چکاچوند کرنے کے لئے کافی ہیں ۔

اورنگ آباد کی قدیم آبادی والے علاقوں میں صرافہ بازار اور جون بازار تنگ رہگذر اور حسین عمارتوں کے لئے کافی اہم سمجھے جاتے ہیں ۔ چوبی محراب اور ستون اپنے نقش و نگار کی ندرت کی بناء پر عہد پارینہ کی حسین داستان نظر آتے ہیں ۔ مسلم آبادی کا ایک علاقہ "بوہرہ کٹرہ" اس طرح کی عمارتوں کی وجہ سے خاص کشش رکھتا ہے ۔ اسی طرح ہندو آبادی کا ایک علاقہ "کاسو پاریکھ" احمد آباد کی تاریخی عمارتوں اور حسین محلات کا نقشہ پیش کرتا ہے ۔ دراصل گجرات سے آکر یہاں آباد ہونے والے کاریگروں کی بستی تھی تقریباً ۱۶۶۰ء سے یہاں ان کی آمد شروع ہوئی تھی ۔ انہوں نے صوبہ داروں، سپہ سالاروں اور حکمرانوں کے لئے ایک سے بڑھ کر ایک حسین عمارتیں تیار کیں اور ساتھ ساتھ اپنی رہائش کے لئے مکانات بھی تعمیر کئے جو ایک خاص طرز تعمیر اور کاریگری کا نمونہ ہیں ۔

اورنگ آباد کی اہمیت اسلامی طرز تعمیر کی وجہ سے کافی زیادہ ہے جس میں مسجدیں، مقبرے اور صوفیائے کرام کے

اسلامی طرز تعمیر جیومیٹرک اصولوں پر مبنی ہے اور محرابوں گنبدوں ستونوں اور میناروں کی خصوصیت کے لئے مشہور ہے۔ پیچیدہ ہندو طرز تعمیر کے برخلاف یہ سادگی کے لئے قابل توجہ ہے۔

شہر اورنگ آباد میں جمعہ مسجد

اورنگ زیب کی سب سے زیادہ متاثرکن یادگار جس کے سبب اورنگ آباد سب سے زیادہ جانا جاتا ہے "بی بی کا مقبرہ" ہے جو اس نے اپنی بیوی دلرس بانو کی یاد میں تعمیر کروایا۔ آگرہ کے تاج محل کے ماڈل پر اسے بنایا گیا۔ گرچہ ناپ میں یہ اس کا آدھا ہے۔

پر شکوہ مزارات شامل ہیں ۔ اس طرح کی عمارتوں کی تعداد سو سے اوپر پہونچ جاتی ہے ۔ ان عمارتوں کو حسین محراب، نازک تراش کی جالیوں ، بلند و بالا گنبدوں اور شاندار میناروں سے سجایا گیا ہے ۔ اسلامی طرز تعمیر کا یہ نمونہ ہندوستان میں ایک خاص انداز سے وجود میں آیا ۔ ایشیاء، ایران اور افغانستان سے آنے والے مسلمان حکمراں اپنے ہمراہ خاص تہذیب لے کر ہندوستان آئے تھے ۔ ہندوستانی تہذیب و تمدن کی آمیزش سے ایک خاص رنگ پیدا ہوا جو تعمیرات کی شکل میں ظاہر ہے اور اسلامی طرز تعمیر کا نمونہ سمجھا جاتا ہے ۔ اورنگ آباد میں خالص ہندوستانی طرز تعمیر کے نمونے چھتری اور جھروکہ جیسی عمارتوں کی شکل میں موجود ہیں ۔ چھتری دراصل ایک گنبد نما عمارت ہے جو ستونوں پر قائم ہے ۔ جھروکہ کی تعمیر میں حسین جالیوں سے خاص کام کیا گیا ۔ اسلامی طرز تعمیر کی اصل خوبی اس کی سادگی ہے جس میں ایک خاص قسم کا وقار جھلکتا ہے ۔ اس کے برعکس ہندو طرز تعمیر کی خصوصیت اس کی پیچیدہ کاریگری ہے ۔

اسلامی طرز تعمیر میں قرآنی آیات کو تزئین کاری کے لئے استعمال کیا گیا ہے جس سے عمارتوں کا حسن دوبالا ہوگیا ہے ۔ ہندوستانی طرز تعمیر نے بھی اس اثر کو قبول کیا ہے ۔ ہندو کاریگروں نے قرآنی آیات کی کمی کو پرندوں اور جانوروں کی تصویروں سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے یا پھر پیچیدہ بیل بوٹوں سے کام لیا گیا ہے ۔

اورنگ آباد کا شمار ہندوستان کے قدیم شہروں میں ہوتا ہے ۔ دکن میں ریاست احمد نگر کے حکمراں مرتضیٰ نظام شاہ کے وزیر ملک عنبر نے ۱۶۱۰ء میں اس شہر کی بنیاد ڈالی تھی ۔ ملک عنبر حبشی تھا جسے بغداد میں غلاموں کے بازار سے خریدا گیا تھا ۔ یہ شخص عجیب و غریب ذہانت اور صلاحیتوں کا مالک تھا ۔ اس زمانے میں یہاں مختصر سی دیہاتی آبادی تھی ۔ ملک عنبر نے منصوبہ بند طریقے پر اسے آراستہ کرنے کی کوشش کی مگر ۱۶۲۱ء میں مغل فوجوں کے ہاتھوں اسے کافی نقصان پہونچا ۔ بعد میں ملک عنبر کے بیٹے فتح خاں نے اس کی از سر نو تعمیر شروع کی اور اپنے نام کی مناسبت سے اس کا نام فتح نگر رکھا ۔ اتفاق سے ۱۶۳۳ء میں مغل فوجوں نے یہاں سے قریب میں دولت آباد پر قبضہ کرلیا ۔ اس کے بعد یہ علاقہ بھی مغل حکومت کا حصہ بن گیا ۔ اورنگ زیب نے یہاں اپنی زندگی کا کافی حصہ گزارا ہے ۔ شاہ جہاں کے زمانے میں وہ یہاں گورنر کی حیثیت سے مقیم رہا ۔ حکمراں بننے کے بعد بھی اس نے تقریباً بیس سال اس شہر میں گزارے اور آخرکار ۱۷۰۷ء میں اس کا یہیں انتقال ہوا ۔ اورنگ زیب نے اپنے نام کی مناسبت سے اس شہر کا نام اورنگ آباد رکھا ۔ کافی عرصے تک اورنگ آباد جنگ و جدال کا مرکز بنا رہا ۔ ۱۷۲۴ء میں نظام الملک آصف جاہ نے یہاں اپنی خود مختار حکومت قائم کی مگر کچھ دنوں بعد اس نے حیدرآباد کو اپنی حکومت کا مرکز بنالیا ۔ اورنگ آباد کو ترقی دینے میں جن شخصیتوں نے اہم کردار ادا کیا ہے ان میں ملک عنبر اور اورنگ زیب کے بعد آصف جاہ کو قابل ذکر مقام حاصل ہے ۔

اورنگ آباد شہر میں مسجدوں کی مجموعی تعداد ایک سو پچاس سے بھی زائد ہے ۔ ملک عنبر نے ۱۶۱۲ء تک یہاں آٹھ مسجدیں تعمیر کرائی تھیں جس میں جامع مسجد کا حسن و شباب اب بھی لوگوں کو محو حیرت کردیتا ہے بعد میں اورنگ زیب کے زمانے میں مسجدوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا ۔ کسی زمانے میں جامع مسجد سے متصل ایک خوبصورت باغ بھی تھا جس کے آثار اب بھی موجود ہیں ۔ مسجد کے احاطے میں ایک وسیع صحن ہے جس کے وسط میں پانی سے بھرا ایک بڑا سا حوض ہے ۔ صحن کے تین جانب مسافروں کے ٹھہرنے کے لئے کمرے بنے ہیں ایک جانب بلند چبوترے پر مسجد ہے جو منقش چھجے اور محراب دار ستونوں کے ساتھ عجیب دلکشی پیدا کرتی ہے ۔ مسجد کی تعمیر میں فن تعمیر کی خاص ترکیبوں کا استعمال کیا گیا ۔ اس کا ثبوت مسجد کے اندر پچاس ستون ہیں جو ایک دوسرے سے برابر فاصلے پر کھڑے ہیں ۔ مسجد کا اندرونی حصہ سادگی اور پرکاری کا نمونہ ہے اور انتہائی پرسکون ماحول بن جاتا ہے ۔

ملک عنبر کی تعمیر کردہ دیگر عمارتوں میں "چتا خانہ" ہندو نوازی کی علامت بتایا گیا ہے ۔ سادھو اور سنتوں کی محفلیں یہاں منعقد ہوا کرتی تھیں ۔ اس عمارت کے اندر گائے کا ایک مجسمہ بھی موجود ہے ۔ بعد میں اورنگ زیب نے اس عمارت کو سرائے میں تبدیل کردیا ۔ کچھ دنوں کے بعد یہ عمارت چوری محل کے نام سے مشہور ہوگئی اور اب اسے اورنگ آباد کے ٹاؤن ہال کا درجہ حاصل ہے ۔ یہ عمارت ایک مضبوط حالت میں ہے اس کی دیواریں ایک میٹر چوڑی ہیں ۔ دیواروں پر چڑھائے گئے پلاسٹر اب بھی
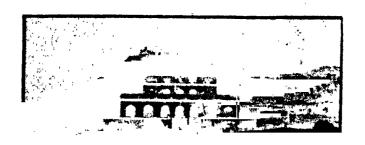
سنہری محل

سنہری محل بند پل کھنڈ کے ایک حکمران نے بنایا تھا جو اورنگ زیبؒ کا خدمت گار تھا۔ اس کا یہ نام اس کی سنہری تصاویر کی وجہ سے پڑا جو کبھی اس کے اندر سجی رہا کرتی تھیں۔ اب اس کے اندر Archaelogical Survegy of India کا شعبہ قائم ہے۔

سنہری محل کا صدر دروازہ
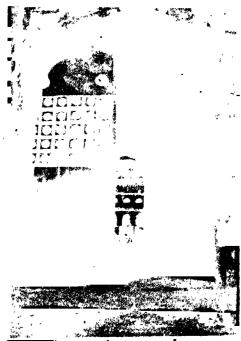
بعض حصوں پر اپنی اصل حالت میں موجود ہیں - ملک عنبر نے یہاں اپنا محل بھی تعمیر کرایا تھا مگر اب اس کی کوئی نشانی نہیں پائی جاتی -

ملک عنبر نے جس انداز سے اورنگ آباد شہر کو آباد کرنے کی کوشش کی اور اس کے لئے جو منصوبے بنائے وہ بھی کسی عجوبے سے کم نہیں - آج سے تقریباً ساڑھے تین سو برس قبل اس نے شہر کو پانی سپلائی کرنے کا پروجیکٹ بنایا تھا - چٹانوں کو تراش کر اس نے دریائے خم سے ایک نہر نکالی تھی - یہ نہر ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر جاکر ختم ہوتی تھی - اس جگہ اس نے ایک بڑا حوض تعمیر کرایا تھا جو ایک محفوظ عمارت کے اندر تھا - یہ آبی ذخیرہ گنو ملکھ کے نام سے آج بھی مشہور ہے - اس ذخیرے سے پائپ لائن نکالی گئی تھی جو ہر محلے میں ایک منبع تک پہونچ کر ختم ہو جاتی تھی - پائپ لائن اینٹوں کے جڑاؤ سے تیار کی گئی تھی - جو اب بھی موجود ہے اور لوگ اس سے پانی پیتے ہیں -

اورنگ زیب نے اس شہر کو وسعت دینے اور اس کی اہمیت کو بڑھانے میں سب سے نمایاں کردار ادا کیا - اس شہر کو مرہٹہ حملہ آوروں سے محفوظ رکھنے کے لئے ۱۶۸۲ء میں حصار بندی کا کام شروع کیا - پورے شہر کے گرد اس نے ساڑھے چار میٹر بلند دیوار تعمیر کرائی جو دس کلو میٹر کے احاطے میں پھیلی ہوئی تھی - اہم مقامات پر اس دیوار پر سوراخ بنائے گئے جس سے توپوں کے ذریعہ گولے پھینکنے میں آسانی ہوتی تھی - چند مقامات پر نصف دائرے کی شکل میں قلعہ نما عمارتیں تعمیر کی گئیں جو حملہ کے وقت مورچوں کا کام کرتی تھیں - شہر پناہ کی فصیل میں باون دروازے تھے اب صرف اکیس دروازوں کی نشانیاں موجود ہیں - شمال جنوب، مشرق اور مغرب کے چار دروازے تعمیراتی شان و شوکت کا مظاہرہ کرتے ہیں - تمام دروازے محراب دار ہیں اور کواڑ کافی وزنی لکڑیوں سے بنائے گئے ہیں - ان دروازوں کے علاوہ ایک دروازہ ملک عنبر کا تعمیر کردہ ہے جس کے ستونوں پر ابردار دلفریب نقاشی کی گئی ہے - بیجاپور میں گول گنبد کی تعمیر میں یہی تزئین کاری موجود ہے -

اورنگ زیب نے اپنے زمانہ قیام میں ایک محل تعمیر کرایا تھا جو کافی بلند مقام پر واقع ہے اس بلندی کو اس نے تین مختلف سطحوں میں تقسیم کیا تھا - سب سے بلندی پر زنانہ محل اور زنانہ مسجد کی عمارتیں تھیں - اس کے بعد کے مرحلے میں شاہی مسجد تعمیر کی گئی تھی جو لال قلعہ کی موتی مسجد سے مشابہ ہے نچلی سطح پر رہائش گاہیں، پھر اس کے نیچے گھوڑے اور ہاتھیوں کے اصطبل تھے -

اورنگ زیب کی تعمیر کردہ عمارتوں میں بی بی کا مقبرہ، اپنے حسن اور ندرت کی بناء پر سب سے اہم ہے - یہ مقبرہ ملکہ دلرس بانو کی آخری آرام گاہ ہے - اس کی تعمیر ۱۶۵۳ء میں شروع ہوئی اور پانچ سال میں مکمل ہوئی - ملکہ کی زندگی میں یہ مقبرہ تعمیر ہوا اور وہ خود تمام کاموں کی نگرانی کرتی رہیں - یہ مقبرہ تاج محل کے طرز پر تعمیر کیا گیا - مگر جسامت کے اعتبار سے آدھا ہے - مقبرہ تین جانب دیواروں سے گھرا ہے - اندرونی احاطہ باغ کی طرح ہے اور ٹھیک اس کے وسط میں مقبرہ کی عمارت واقع ہے - اسے بلند چبوترے پر تعمیر کیا گیا ہے - اس میں تین گنبد ہیں مرکزی گنبد کافی بڑا ہے - تاج محل کی طرح چار بلند مینار ہیں - باغ کی منصوبہ بندی میں نہروں اور پھول کی کیاریوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے - مقبرہ تک جانے والے راستے پر بڑی خوبصورتی سے منقش اینٹیں بچھائی گئی ہیں - سنگ مرمر کا استعمال صرف مناسب مقامات پر کیا گیا ہے - مقبرہ کے اندر ہشت پہلو جالی دار گھیرے کے اندر قبر تعمیر کی گئی ہے - سنگ مرمر کی جالیاں ایک خاص فضا پیدا کرتی ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں - مقبرہ کے دوسری جانب ایک مسجد ہے جس پر باری تعالیٰ کے ننانوے نام بڑی خوبصورتی کے ساتھ تحریر کئے گئے ہیں اور تزئین کاری کا اعلیٰ نمونہ نظر آتے ہیں - مسجد کے اندر صفیں رنگین پتھروں سے اس طرح منقش انداز میں بنائی گئی ہیں کہ پہلی نظر میں جانماز کا دھوکہ ہوتا ہے ایسا لگتا ہے گویا ہر نمازی کے لئے الگ الگ جانماز بچھائی گئی ہو - مجموعی طور پر بی بی کا مقبرہ تعمیری اعتبار سے انتہائی اہم ہے اور دکن میں اسلامی طرز کی عمارتوں میں اسے سب سے بلند درجہ حاصل ہے -

اسلامی طرز تعمیر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسے نہروں اور باغات سے آراستہ کیا جاتا ہے جس سے انتہائی حسین ماحول پیدا ہوتا ہے اور پرلطف فضا قائم ہوتی ہے - عمارتوں میں نہروں کا استعمال خاص معنی رکھتا ہے - نزول اسلام صحرائے عرب میں ہوا جہاں کے لوگ پانی کی قلت کے شکار تھے - قرآن میں اہل اسلام کے لئے جنت میں بے فکر زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا جس کے ساتھ کثرت سے نہروں کا ذکر ہے - صحرائے عرب کے
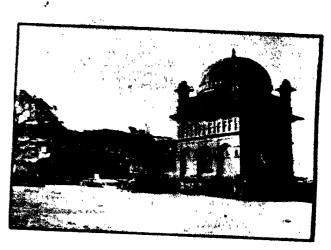
خلدآباد کو " روضہ " یا " مقبروں کا باغ " بھی کہتے ہیں ۔ اس کے مقابر کے طرز تعمیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعمیرات یہاں کے صوفیوں کے لیے سب سے اونچا اعزاز ہیں ۔ امراء اور بادشاہوں کے بعد صوفیاء کی یادگاریں قائم ہیں ۔ ملک عنبر کا مزار خلدآباد میں دیکھا جاسکتا ہے ۔
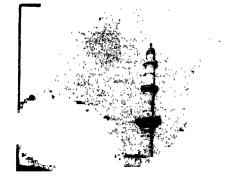
دولت آباد سے گزرتے ہوئے ایک بحری جہاز کے تاجر نے بانئے جہاز کی شکل کی تعمیر کی ۔

اسلامی فن تعمیر میں روشنی کے گزر کا خاص خیال رکھا جاتا تھا ۔ سنگ مرمر کی جالیوں سے چھن چھن کر ٹکڑا ٹکڑا نور برآمد ہوتا تھا یا پھر روشنی کو عمارت کے پتھر جذب کر لیا کرتے تھے ۔ مغل تعمیرات میں روشنیوں کا کھیل خاص وصف سمجھا جاتا ہے ۔ یہاں دولت آباد قلعہ کے اندر چاند مینار ملاحظہ فرمائیں ۔

لوگوں کے لئے ہنروں کا تصور حرارت پیدا کرنے کے لئے کافی ہے ۔ اسلامی تہذیب کے فروغ کے ساتھ ساتھ ہنروں کو بھی فروغ حاصل ہوا ۔ بصرہ اور بغداد سے لے کر اصفہان ، شیراز ، لاہور ، کشمیر ، آگرہ اور اورنگ آباد تک اسلامی طرز کی جتنی عمارتیں تعمیر ہوئیں ان میں ہنروں اور باغات پر خاص توجہ دی گئی ہے ۔ مجموعی طور پر یہ سب یکجا ہوکر دلفریب حسن پیدا کرتے ہیں جو اسلامی طرز کی عمارتوں کی جان ہے ۔ اورنگ آباد کا چار باغ اس تصور کا پروردہ تخلیقی عمل ہے جس میں جنت کے باغات کی جھلکی پیش کی گئی ہے ۔ "چار باغ" میں ہنروں کا استعمال انتہائی معنی خیز انداز میں کیا گیا ہے اور تصوف کے رموز بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

اسلامی طرز کی عمارتوں کی دوسری خوبی اس کے اندرونی حصوں میں روشنی کا انتظام ہے ۔ عمارت کے اندرونی حصوں کو خوبصورت جالیوں سے اس طرح مزین کیا گیا ہے کہ اس سے جہاں عمارتوں کا حسن دوبالا ہوتا ہے وہیں انتہائی دلفریب روشنی بھی حاصل ہوتی ہے جس کا دل و دماغ پر پرلطف اثر پڑتا ہے ۔

اورنگ آباد کی دلچسپ عمارتوں میں ایک پن چکی بھی شامل ہے ۔ اسے کئی مرحلوں میں تعمیر کیا گیا ہے ۔ ایک بلند مینار بنایا گیا ہے جس سے ایک حوض میں پانی گرایا جاتا ہے ۔ حوض کے اندر لوہے کا ایک پنکھا لگا ہے جو پانی کے گرنے سے خود بخود حرکت کرنے لگتا ہے اور اس کے سہارے متصل چکی بھی گڑگڑاہٹ کے ساتھ چلنے لگتی ہے ۔

یہاں کی دیگر تعمیرات میں صوفیائے کرام کے مزارات فن تعمیر کے حسین نمونے ہیں ۔ شاہ سید پلنگ پوش نقشبندی اور ان کے جاں نثار مرید باباشاہ مسافر کے مزارات ایک ہی جگہ تعمیر کئے گئے ہیں ۔ مزارات کا حسن گنبد ، محراب اور ستونوں کی وجہ سے ہے جس کی تزئین کاری میں نفاست کا مظاہرہ کیا گیا ہے ۔ مزار کے گنبد سرخ پتھروں سے تعمیر کئے گئے ہیں جو اپنا جواب آپ ہیں ۔ مزار کے احاطے میں ایک مدرسہ اور سرائے بھی موجود ہے ۔ دیگر مزارات میں حضرت شاہ نوری حموی کا مزار اپنی تزئین و آرائش کے لئے خاص طور پر مشہور ہے جس کے دروازے چاندی سے بنائے گئے ہیں ۔

اورنگ آباد بازار کے چوک پر ایک شاندار مسجد موجود ہے جو مسجد شاہ گنج کے نام سے مشہور ہے ۔ اسے بلند چبوترے پر تعمیر کیا گیا ہے مسجد چوبیس ستونوں پر قائم ہے ۔ گنبد انتہائی شاندار ہے جس کے حاشیے پر کنول کے پتوں جیسے بیل بوٹے بنائے گئے ہیں ۔ اورنگ آباد سے متصل دوسرے تاریخی شہر خلدآباد اور دولت آباد کا حسن و جمال اس داستان کے دوسرے رنگین باب کا درجہ رکھتا ہے ۔

اورنگ آباد ، خلدآباد اور دولت آباد دراصل ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں ۔ مجموعی طور پر بائیس کلومیٹر کی وسعت میں یہ تینوں شہرآباد ہیں ۔ خلدآباد میں ممتاز شخصیتوں اور صوفیائے کرام کے مزارات کثرت سے موجود ہیں اور یہی اس کی شہرت کی وجہ ہے ۔ دولت آباد کا اصل نام دیوگری ہے بارھویں صدی عیسوی میں یہ حکمرانوں کا پایہ تخت تھا ۔ سلطان محمد بن تغلق نے ۱۳۲۷ء میں اپنا دارالحکومت دہلی سے دیوگری منتقل کیا تھا اور قلعے کا نام دولت آباد رکھا تھا ۔ دولت آباد قلعے کی تعمیر میں زبردست تکنیک اور اصول حرب کو مدنظر رکھا گیا ہے ۔ اس قلعے کا دفاعی پہلو کافی اہم ہے اور حملہ آوروں کو گمراہ کرنے کے لئے کئی چیزیں موجود ہیں ۔ مثلاً ایک مصنوعی پل ، گمراہ کن سرنگ ، ذہن میں بوکھلاہٹ پیدا کرنے والے دروازے اور دیواریں وغیرہ ۔ قلعے کی حفاظت کے لئے تین سو سے زاہد توپیں آج بھی موجود ہیں ۔ قلعے کے اندر ایک مینار ہے جو اپنی بلندی کی وجہ سے چاند مینار کہلاتا ہے ۔ اس کی تین منزلیں ہیں اور ہر منزل پر برآمدے بنے ہوئے ہیں ۔ عہد مغلیہ میں تعمیر کردہ چینی محل خوبصورت رنگین ٹائلوں سے مزین ہے دولت آباد میں اس کے علاوہ بھی متعدد قابل ذکر عمارتیں ہیں جن کی اپنی تاریخی اور تعمیری اہمیت ہے ۔ تاہم حسین عمارتوں کے معاملے میں دولت آباد پر خلدآباد کو فوقیت حاصل ہے ۔

خلدآباد دراصل مزارات اور مقبروں کا شہر ہے ۔ یہاں کی سب سے اہم عمارت شہنشاہ اورنگ زیب کا مقبرہ ہے ۔ یہ مقبرہ اپنی شان و شوکت کی وجہ سے نہیں بلکہ سادگی کی وجہ سے خاص اہمیت کا حامل ہے ۔ تختے پر سادہ سی تحریر کندہ تھی جس میں روئے مزار کو سنگ مرمر سے ڈھکنے اور سایہ کرنے کی ممانعت تھی ۔ یہ چوبی تختہ آج بھی ایستادہ ہے ۔ مگر ۱۹۲۱

میں نظام حیدرآباد اور لارڈ کرزن کے ایما پر مزار کو چاروں طرف سے مرمر کی حسین جالیوں سے گھیر دیا گیا ہے۔ موجودہ حالت یہ ہے کہ سر پر کھلا آسمان ہے مگر قبر سفید چادر سے ڈھکی ہوئی ہے۔ قبر کی سادگی کے پس پردہ ایک روایت کارفرما ہے۔ وہ یہ کہ اورنگ زیب کی موت کے وقت اس کی ذاتی تحویل میں دو طرح کی رقم تھی۔ ایک رقم چودہ روپے بارہ آنے پر مشتمل تھی جو اس نے ٹوپیاں تیار کرکے حاصل کی تھی اور دوسری رقم ساڑھے تین سو روپے پر مشتمل تھی جسے اس نے قرآن مجید کے نسخے تحریر کرکے بطور اجرت حاصل کیا تھا۔ اورنگ زیب نے اپنی موت سے قبل یہ وصیت کی تھی کہ اس کی قبر کی تعمیر پر ٹوپیوں کی اجرت سے حاصل ہونے والی رقم خرچ کی جائے۔ قرآن مجید کے نسخے کے سلسلے میں اس نے جو رقم حاصل کی تھی اس کے بارے میں اسے یہ شبہ تھا کہ کہیں نسخے میں کوئی غلطی نہ رہ گئی ہو۔ ایسی صورت میں اس کے ذریعہ حاصل ہونے والی رقم کو اپنے لئے درست نہیں سمجھ رہا تھا۔ لہذا وفات کے بعد اس کی وصیت پر عمل کیا گیا۔

شہنشاہ اورنگ زیب کی قبر سے ذرا فاصلے پر اس کے بیٹے اعظم شاہ کا شاندار مقبرہ موجود ہے جس کے اندر اس کی بیوی کی قبر بھی موجود ہے۔ پورا مقبرہ اور اس کی دیواریں سنگ مرمر کے سالم ٹکڑوں سے تعمیر کی گئی ہیں اور اعلیٰ کاریگری کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ اورنگ زیب کی قبر سے قریب ہی سلسلہ چشتیہ کے آخری بزرگ حضرت زین الدین چشتی کی درگاہ ہے۔ درگاہ کی تعمیر میں اعلیٰ کاریگری کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ اس کے دروازے چاندی کے اور چوکھٹ رنگین پتھروں سے بنائے گئے ہیں۔ زین الدین چشتی کے پیرو مرشد حضرت برہان الدین چشتی کی درگاہ ٹھیک سامنے ہی سڑک کے اس پار ہے۔ اس درگاہ کی شان و شوکت کسی اعتبار سے کم نہیں۔ درگاہ سے باہر ایک چٹان پر چاندی کی چند گولیاں بکھری ہوئی ہیں جسے دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ گویا چٹان کو چیر کر نمودار ہوئی ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک روایت یہ بتائی جاتی ہے کہ حضرت برہان الدین کے وصال کے کچھ دنوں بعد ۱۳۴۴ء میں دکن میں زبردست قحط پڑا۔ ان کے عقیدت مند اور مریدین پریشان ہوکر درگاہ پر حاضر ہوئے اور التجا کی۔ اس کے بعد دوسری صبح ان ہی پتھریلی چٹانوں پر پودے اگے ہوئے نظر آئے جو خالص چاندی کے تھے۔ چٹانوں سے چپکے ہوئے ٹکڑے آج بھی ویسے ہی موجود ہیں جیسے مٹی کے اندر جڑیں پیوست ہوتی ہیں۔

حیدرآباد خود مختار حکومت کے بانی آصف جاہ اور ان کی اہلیہ کا مقبرہ بھی یہیں ہے ان کے مقبرے کی شان و شوکت بھی قابل دید ہے۔ بلند چبوترے پر سنگ مرمر کی عمارت اور سنگ سرخ کی جالیاں عجب بہار دکھاتی ہیں۔ خلدآباد میں اس طرح کی سینکڑوں داستانیں دفن ہیں۔ صوفیا کرام کے مقبروں میں ایک اہم مقبرہ حضرت خواجہ ممتاز الدین زر زاری، زر بخش دولھامیاں کا ہے۔ انہیں حضرت نظام الدین اولیا کی قربت حاصل تھی اور انہیں کی خدمت میں رہا کرتے تھے۔ مگر پیر و مرشد کے حکم پر انہوں نے دکن میں اپنا ٹھکانہ بنایا۔ ان کی زندگی سے متعلق بھی حیرت انگیز داستانیں موجود ہیں جنہیں لوگ آج بھی دہرایا کرتے ہیں۔

شہر اورنگ آباد کے بانی ملک عنبر اور اس کے افراد خاندان کے مقبرے بھی خلدآباد میں دیکھے جاسکتے ہیں جو فن تعمیر کے اعتبار سے اپنا نمونہ آپ ہیں۔ ملک عنبر کے مقبرے سے متصل اس کی اہلیہ، بیٹے اور بہو کے مقبرے ہیں۔ یہ مقبرے بلند چبوترے پر تعمیر کئے گئے ہیں۔ مقبروں کے گنبد شان و شوکت کے مظہر ہیں۔ سنگ مرمر کی حسین جالیاں اعلیٰ تزئین کاری کی جان ہیں۔ ان مقبروں اور درگاہوں کے درمیان گولکنڈہ کے آخری حکمراں تانا شاہ کا وسیع مقبرہ بھی موجود ہے جسے دیکھ کر دلوں میں اسلامی فن تعمیر کی عظمت کا سکہ بیٹھ جاتا ہے۔

ف۔ س۔ اعجاز
کی آئندہ کتابیں

* اونچے مکانوں کے قریب
(غزلیات)

* موقف
(مضامین)

* خوابوں کے اسرار
(نفسیاتی مضامین)
(انگریزی سے ترجمہ)

* نظموں کا مجموعہ

○ اگر آپ انشاء
کے دوست ہیں تو

اس کی توسیع اشاعت

میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیجئے
اور اسے نقصان سے بچاتے رہیے
اگر انشاء بند ہو گیا تو ....؟

پروین شاکر

"خوشبو" کی شاعرہ پروین شاکر

ف۔ س۔ اعجاز

آہ! پروین شاکر ایک کار حادثے کی شکار ہو کر قبل از وقت اس دنیا سے چل بسی۔ ہم اس کی بے وقت موت پر گہرے رنج اور دکھ کا اظہار کرتے ہیں۔

جذبات اور احساسات اس کی غزلوں اور نظموں میں ایک چلبلی ادا اور سبک قدموں سے در آتے تھے اور الفاظ اس کے شعروں میں اپنے لئے ایک نئی ترتیب ڈھونڈ نکالتے تھے۔ اس نے ایک فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنے تجربات کو صداقت کے ساتھ بیان کرتی رہے گی۔ چنانچہ اس کا تخلیقی عمل اس کے اس فیصلے اور عزم کا آخری وقت تک ساتھی بنا رہا۔ شاید یہی سبب ہے کہ پروین شاکر وہ پہلی اردو شاعرہ ہے جو اپنی شاعری میں سے ایک لڑکی یا ایک عورت کا روپ لے کر برآمد ہوئی ہے۔ وجودی سطح پر وہ مرد کی نصف بہتر کے طور پر نمودار ہوئی ہے اور اس کی باوصف گھر اور کائنات کے نصف پر اپنا حق طلب کرتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطالبہ بہت حد تک اپنے جائز حدود میں رہا ہے۔ کیونکہ نہ صرف وہ اپنی حدیں پہچانتی ہے بلکہ ہوش و خرد انہیں تسلیم بھی کرتی ہے یا اس کا ثبوت یہ ہے کہ اپنے شعری مجموعہ "خوشبو" کی شاعری میں پروین شاکر اپنے نصف بہتر، نصف گھر اور نصف کائنات پر اپنا تسلط قائم کرنے کا سرکش رجحان نہیں رکھتی۔ مفاہمت و سپردگی، مسرت اور آنسو میں رضاکارانہ حصہ داری اور شرکت کی ضرورت کا احساس شاعری کی جذباتیت اور معقولیت پسندی کے مابین اکثر ایک خوبصورت توازن اور عدل قائم کرنے میں کارگر ثابت ہوا ہے۔ شاید یہی سبب ہو کہ اس کی اداسی اور مغمومیت محرومی اور نوحہ بننے سے بچی رہ گئی۔

تجربے کے اظہار میں صداقت پسندی نے پروین شاکر کی شاعری کو جو لہجہ عطا کیا وہ اردو شاعری میں اب تک نیا ہے۔ یعنی عورت عورت کے صیغے میں بات کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ سخن کے پردے میں پروین شاکر کا لہجہ بناوٹی (یعنی مردانہ) نہیں ہے۔

ہمارے شعری ادب میں عورت میں یہ جرأت پہلے کہاں ہوتی تھی۔ عورت کو یہ اعتماد اور اعزاز محض دو چار ادیباؤں اور شاعراؤں نے بخشا ہے۔ آج کتنی ہی شاعرات ایسی پائی جاتی ہیں جو مشاعروں میں تو مقبول ہیں مگر درحقیقت شعر کہنے کی صلاحیت سے محروم ہیں وہ ترنم کہیں سے چراتی ہیں، کلام کہیں سے لاتی ہیں۔ اور پھر پروین شاکر کے رنگ میں کہنے والی شاعرات بھی تعداد میں کم نہیں ہیں۔ مگر ناقدین کی داد تو ہمیشہ اصل کے حصے میں آتی رہی ہے۔

معصومیت، الھڑپن، چنچلتا، ہنسنے رونے کے خاص انداز، پسیج جانے کی کیفیت، زچ کر دینے والی ضدیں، والہانہ محبت اور قربت کے دلنشیں لمحات، جگنوؤں کو دن میں پکڑنے کا تجسس، تتلیاں گرفتار کرنے کا ارمان، موسمی تغیرات کے زیر اثر آجانے کی امنگ، چاند کو چھونے کی کلک، خوشبوؤں میں لپے خواب دیکھنے کی آرزو، چوڑیوں اور دوپٹوں کے پہننے اوڑھنے کے نازک خیالات، دھوپ اور سائے کے پیچھے دوڑنے کی بیتابی ان سب باتوں نے پروین کی شاعری کو رومانیت اور دلکشی دے دی ہے۔ اور اس کے لفظوں کو نرم اور لچکدار بنا دیا ہے۔ لیکن کئی لوگ اس لچک سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ دراصل یہ لچک اس طرح کی ہے جو ایک تیرانداز اپنا نشانہ درست کرتے وقت اپنی کمان میں پاتا ہے۔ ایک دو نہیں بیسیوں نظمیں اور نجانے کتنے غزلیہ اشعار ایسے ہیں جنہیں مشاق تیرانداز کی طرح شاعرہ نے اپنی فنی کمان کی خمیدگی اور لچک سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کامیاب تیروں کی طرح سینۂ ہدف میں اتار دیا ہے۔ اور فرد اور کائنات کے مختلف پہلوؤں کو انفرادی اور معاشرتی نفسیات کی تفہیم اور تجزیے کے ذریعہ اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

پروین شاکر کے اٹھ جانے سے جو خلاء پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا مشکل ہے۔

دریچۂ گل سے

پروین شاکر

گریزپا لمحوں کی ٹوٹتی ہوئی دہلیز پر، ہوا کے بازو تھامے، ایک لڑکی کھڑی ہے اور سوچ رہی ہے کہ اس سے آپ سے کیا کہے۔ برس بیتے، گئی رات کے کسی ٹھہرے ہوئے سناٹے میں اس نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ اس پر اس کے اندر کی لڑکی کو منکشف کر دے۔ مجھے یقین ہے، یہ سن کر اس کا خدا اس دعا کی سادگی پر ایک بار تو ضرور مسکرایا ہوگا! (کچی عمروں کی لڑکیاں نہیں جانتیں کہ آشوب آگہی سے بڑا عذاب زمین والوں پر آج تک نہیں اترا) پر وہ اس کی بات مان گیا۔ اور اسے چاند کی تمنا کرنے کی عمر میں ذات کے شہر ہزار در کا اسم عطا کر دیا گیا!

شہر ذات۔ کہ جس کے سب دروازے اندر کی طرف کھلتے ہیں اور جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں!

بات یہ نہیں کہ فصیل شہر جاں کی زرد بیلوں پر کبھی کسی کا جمال، صورت سحاب نہیں اترا، یا اس شہر کی گلیوں میں زندگی نے خوشبو نہیں کھیلی۔ یہاں تو ایسے موسم بھی آئے کہ جب بہار نے آنکھوں پر پھول باندھ دئے تھے اور حصار رنگ سے رہائی دشوار ہو گئی تھی۔ مگر جب ہوا کے دل میں برہنہ شاخیں گڑ جائیں تو بہار کے ہاتھوں سے سارے پھول گر جاتے ہیں!

انہی پھولوں کی پنکھڑیاں چنتے چنتے، آئینہ در آئینہ خود کو کھوجتی یہ لڑکی شہر کی اس سنسان گلی تک آ پہنچی ہے کہ مڑ کر دیکھتی ہے تو پیچھے دور دور تک کرچیاں بکھری ہوئی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اس نے اپنے عکس کو جوڑنے کی سعی نہیں کی۔ کی! ۔ پر اس کھیل میں کبھی تصویر دھندلا گئی اور کبھی انگلیاں لہولہان ہو گئیں! "خوشبو" اسی سفر کی کہانی ہے! حیران آنکھوں، شبنمیں رخساروں اور اداس مسکراہٹ والی اس لڑکی کو اعتراف ہے کہ یہ کہانی نئی نہیں ہے (اور یہی کیا، دنیا کی کوئی کہانی نئی نہیں ہے۔ یہ تو ہمارے اندر کا کہانی کار ہے جو اس کو ایسا سندر بنا دیتا ہے کہ سنسار کا من موہ لے!)

پھر خود کو پانے کی جستجو میں اپنا آپ کھو دینا تو بڑی پرانی بات ہے۔ پر ہے بہت سچی اور ناگزیر!

ندرت جذبوں کے جمال کا میعار نہیں ہوا کرتی۔ جذبے کا حسن تو اس کی سچائی ہے اور اظہار کی دلکشی اس کا اعتماد ہے۔ سو یہ لڑکی بھی جب آپ سے بات کرے گی تو اس کی پلکیں بے شک بھیگی ہوئی ہوں گی۔ لیکن ذرا غور سے دیکھیے گا۔ اس کا سر اٹھا ہوا ہے!

رات کے پیاسے ہاتھوں سے اپنے خوابوں کا خالی جام کس نے واپس لیا ہے اور پھر اس صورت میں کہ جب وہ شکستہ بھی ہو! کرچیاں آنکھوں میں چبھی رہ جاتی ہیں۔ جن سے نئے دن کے سورج کی کرنوں کا ٹکراؤ، حد نگاہ تک رنگوں کے جال بچھاتا رہتا ہے۔ اور چشم خوں بستہ، آنے والی رات لہو ٹپکنے تک، اس فریب سرور میں رہتی ہے کہ آزار گیا! اس خوش گمانی کا زہر جب تن بدن میں کھل جائے، تو جسم کے شجر پر ایک موسم بڑی دیر تک ٹھہر جاتا ہے۔ زخموں کے، پھول بننے کا موسم!

ہوا نے جب پھول کو چوما تو خوشبو نے جنم لیا۔ خوشبو جو کھلتی ہوئی کلی کی مسکراہٹ بھی ہے اور مرجھاتے ہوئے شگوفے کا نوحہ بھی، جو ہوا کی سانسوں میں اتر کر، خزاں نصیب درختوں کی مسیحائی کرتی ہے اور اس عمل میں خود جان سے بھی گزر جاتی ہے، خوشبو جو محبت کی طرح ہفت آسماں، دوستی کی طرح مہرباں، نیکی کی طرح یاد رہنے والی اور رفاقت کی طرح دکھ بٹانے والی ہے، جو بچپن کی سہیلی کی طرح جلتے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیتی ہے اور ماں کی طرح، پل بھر میں، وجود کے سارے دکھ چن لیتی ہے!

مگر۔ جس کا مقدر وحشت ہے!

جس کے ماتھے پر ہوا کی انگلیوں نے بے سروسامانی لکھ دی ہے!

جس کا کوئی گھر نہیں!

جس کی زندگی کوچہ نوردی ہے، آبلہ پائی ہے، پریشاں بدنی ہے!
اور جسے تھک کر کسی دیوار سے ٹیک لگانے، کسی چھاؤں میں آنکھیں موندلینے کی اجازت نہیں!
کہ سفر اس کا تعاقب کر رہا ہے۔

وجود کو جب محبت کا وجدان ملا تو شاعری نے جنم لیا۔ اس کا آہنگ وہی ہے جو موسیقی کا ہے کہ جب تک سارے سر سچے نہ لگیں۔ گلے میں نور نہیں اترتا!۔ دل کے سب زخم لو نہ دیں تو حرف میں روشنی نہیں آتی!

وجود کے سر تیور بھی ہوتے ہیں اور کومل بھی۔ تیور سر عذاب لاتے ہیں اور کومل خواب!۔ کبھی چیخ۔ کبھی کراہ۔ کبھی سسکی۔ اور کبھی گفتگو، کبھی سرگوشی اور کبھی محض خود کلامی!۔ "خوشبو" کی اونچی آواز آپ کو شاید ہی سنائی دے۔ کہ عذابوں کی پذیرائی کرتے ہوئے بھی اس لڑکی کے ہاتھوں میں گلاب ہی رہے۔ مگر لہجے کی اس صبا فامی سے پہلے ایک رات ضرور آتی ہے۔ اپنی آگ میں جل بجھنے کی رات!۔ کہ اندر کی آگ خام ہوئی تو کوئلہ۔ اور باہر کی تپش سے بڑھ گئی تو نقش سویدا، ہشت پہلوی ہیرا بن کر جگمگا اٹھا!

کچھ کم گوش یہ کہتے ہیں کہ اس لڑکی کی شاعری میں سوائے بارش کی ہنسی، پھولوں کی مسکراہٹ، چڑیوں کے گیتوں اور اس کی اپنی سرگوشیوں کے اور کچھ نہیں۔!

اگر زندگی سے محبت کرنا جرم ہے تو یہ لڑکی پورے غرور کے ساتھ اپنے جرم کا اعتراف کرتی ہے۔ نیم خوابی کا فسوں بڑی دیر سے ٹوٹتا ہے۔ پر جب ایسا ہوا تو روزن زنداں سے آنے والی، اجنبی سیاہ بخت سرزمینوں کی ہوا کے آنسوؤں کو اس نے اپنی پلکوں پر محسوس کیا ہے۔ ان کا نمکین ذائقہ اس کی شہد آشنا زباں نے چکھا ہے، لیکن جو لڑکی بسنت بہار کی نرم ہنسی میں بھیگ چکی ہو، اسے خزاں سے دکھ تو ہو سکتا ہے۔ عناد نہیں!۔ جس کے اکیلے گھر میں شریر چڑیا کا گیت چہرے اگا چکا ہو، اسے سناٹے سے وحشت تو ہو سکتی ہے، نفرت نہیں!

ہاں۔ ضرور کہیں زمین بدصورت بھی ہوگی۔ مگر اس نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔ ماں سے محبت کرتے ہوئے اس کا چہرہ نہیں دیکھا جاتا!

محبت جب تقاضائے جسم و جاں سے ماوراء ہو جائے تو الہام بن جاتی ہے۔ حسن جب لطافت کی آخری حدوں کو چھو لے تو خوشبو بن جاتا ہے۔ خوشبو حسن کی تکمیل ہے! اس سے کوئی سخن فہم یہ نہ جانے کہ اس لڑکی کو تکمیل حسن کا دماغ ہے۔ تکمیل حسن کا خیال صرف اسے زیب دیتا ہے جس نے تخلیق حسن کی۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ آپ سے بکھرنے سے پہلے یہ لڑکی "خوشبو" کا تعارف پورے اعتماد سے کرا رہی ہے۔ اس لئے کہ تخلیق کے تمام لمحوں میں وہ صرف اپنے وجدان کے سامنے جواب دہ تھی اور اس کے وجدان نے اس کے کانوں میں یہی سرگوشی کی ہے کہ وہ لمحہ آگیا ہے جب وہ "خوشبو" کا ہاتھ ہوا کے ہاتھ میں دے سکتی ہے!

بقیہ ایڈز ---

جلد میں خارش، منہ اور حلق کا مرض، پھولے ہوئے غدود۔

ہندوستان میں ایڈز کے پہلے مریض کا سراغ ۱۹۸۶ء میں ملا تھا۔ تب سے جنوری ۱۹۹۴ء تک ہندوستان کی مختلف ریاستوں اور مرکزی خطوں سے تقریباً ۱۴۰۰۰ ایچ آئی وی سیرو پازیٹو اور ایڈز کے ۷۰۰ کیسوں کا سراغ مل چکا ہے۔ ان کیسوں کے معاملے میں مہاراشٹر اور تاملناڈو سرفہرست ہیں۔ ان کے بعد باری آتی ہے پنجاب، چنڈیگڑھ، دہلی اور کیرالا کی۔ مغربی بنگال میں تاحال ایڈز کے ۱۸ اور ایچ آئی وی سیرو پازیٹو کے ۱۵۱ معاملات روشنی میں آچکے ہیں۔

ایڈز کا پھیلاؤ روکنا ہم سبھوں کا فرض ہے۔ انسانیت، محبت اور توجہ کے بل بوتے پر پھیلتی پھولتی ہے۔ ہمیں اپنے چہیتوں کی زندگی نہیں لینی چاہیئے۔ ہمیں ہر حال میں ان کا تحفظ کرنا چاہیے۔

پروین شاکر کے بارے میں۔۔۔

اردو کے گلستان فن میں پروین کے نام سے، جو ایک نئی کلی چٹکی ہے اس نے فضا کو نئی مہکاروں سے معمور کر دیا ہے۔ پروین جذبے کی شدت اور شائستگی کی شاعرہ ہے۔ جذبے کا سچا، کھرا اور خوبصورت اظہار اس کی شاعری کا کرشمہ ہے۔ نہ وہ اپنے آپ کو فریب دیتی ہے اور نہ اپنے قاری سے کچھ چھپاتی ہے۔ اس نے محبت کے جذبے کی حیرت انگیز تہذیب کی ہے۔ پروین نے اس پامال موضوع کو رفعت بخشی ہے اور اس کی قدامت کو جدت میں بدل دیا ہے۔ ساتھ ہی اس نے اپنے اس پسندیدہ موضوع کو اپنے لیے خول نہیں بنالیا ہے بلکہ اس کا دلآویز فن ہمہ وقت چار سو نگراں رہتا ہے۔ چنانچہ پروین کی آواز کے زیر و بم میں روح عصر کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ اردو شاعری میں یہ ہر لحاظ سے ایک نئی آواز ہے۔ منفرد، جمیل اور مستقبل گیر آواز!

احمد ندیم قاسمی

جب میں نے "خوشبو" کے درون سے روشنی کی کرنوں کو پھوٹتے دیکھا تو حضرت عمر فاروقؓ کا وہ تبصرہ یاد آگیا جو انہوں نے امراء القیس کی شاعری پر کیا تھا" وہ اندھے مضامین کو بینا بنادیتا ہے"
پروین کی بیشتر نظمیں اس کی اپنی ذات، اس کے محبوب اور اس کی پھیلی ہوئی کائنات کا مطالعہ، تذکرہ اور صحیفہ ہیں۔ ان نظموں میں بے حد پھیلاؤ اور بے حد ارتکاز ہے۔ یہ یکجائی آپ کو آسانی سے کسی اور جدید فن کار کے ہاں نہیں ملے گی۔
پروین کی غزل میں غزل کے "پیکر" کا احساس ہے۔ اس کی ایک وجہ پروین کی نسوانی بصیرت ہو سکتی ہے جس نے غزل کو ایک کومل لڑکی کے روپ میں دیکھ لیا ہے۔ اب پروین اور اس کے بعض ہم عصروں کے ہاتھوں غزل اپنے پیکر کی پاسداری کے باوصف ایک نیا روپ دھار رہی ہے۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی

زندگی کے بے حس بنادینے والے روزمرہ سے چند لمحے بچاکر، آپ کبھی کسی کنج عافیت میں سکون سے بیٹھے ہیں؟ اور پھولوں پر منڈلاتی، ٹھہرتی، پنکھ جوڑتی اور کھولتی تتلی کو غور سے دیکھا ہے؟ اس کے نرم، نازک، سبک پروں پر پھیلتی، ایک دوسرے میں گھلتی، رنگوں کی لکیروں کو کانپتے دیکھا ہے؟۔ پروین شاکر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "خوشبو" اس ہولے سے تھراتے ہوئے تیتری کے پنکھ کا ہی دوسرا نام ہے۔
پروین کے شعروں میں لوک گیتوں کی سی گمبھیر سادگی اور لے بھی ہے اور کلاسیکی موسیقی کی نفاست اور نزاکت بھی۔ اس کی نظمیں اور غزلیں بھولپن اور SOPHISTICATION کا دلآویز سنگم ہیں۔ یہ تر و تازہ نظمیں "خوشبو" کے اوراق میں پھولوں کی طرح تو بکھری ہیں، مگر یہ جنگلی خودرو پھول نہیں۔ ایسے پھول ہیں کہ باغبان نے برسوں کی ریاضت سے جن کی نشو و نما کی ہے۔

فہمیدہ ریاض

اردو ادب میں سچے نسائی محسوسات اور جذبوں کی شاعری بہت کم ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری شاعرات نے آنکھیں بند کر کے اردو زبان اور شاعری کے مروجہ آہنگ کی پیروی کی ہے جب کہ اس آہنگ کا بنیادی ڈھانچہ مردوں کا ترتیب دیا ہوا ہے۔ پروین کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنی خوبصورت، نرم و نازک اور فوارے کی طرح ابھرتی اور پھیلتی ہوئی شاعری کے ذریعے اردو کے شعری اسالیب میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے۔ پروین کی شاعری میں آپ کو عورت سے زیادہ ایک لڑکی کی آواز سنائی دے گی۔ ایک ایسی لڑکی کی آواز، جو خوبصورت پھول چننا بھی جانتی ہے اور انہیں گلدان میں سجانا بھی۔

امجد اسلام امجد

چاند رات

گئے برس کی عید کا دن کیا اچھا تھا
چاند کو دیکھ کے اس کا چہرہ دیکھا تھا !

فضا میں کیٹس کے لہجے کی نرماہٹ تھی
موسم اپنے رنگ میں فیض کا مصرعہ تھا

دعا کے بے آواز ، الوہی لمحوں میں
وہ لمحہ بھی کتنا دلکش لمحہ تھا

ہاتھ اٹھاکر جب آنکھوں ہی آنکھوں میں
اس نے مجھ کو اپنے رب سے مانگا تھا

پھر میرے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر
کتنے پیار سے میرا ماتھا چوما تھا

ہوا ! کچھ آج کی شب کا بھی احوال سنا
کیا وہ اپنی چھت پر آج اکیلا تھا ؟

یا کوئی میرے جیسی ساتھ تھی ، اور اس نے
چاند کو دیکھ کر اس کا چہرہ دیکھا تھا

غزل

چہرہ میرا تھا ، نگاہیں اس کی
خامشی میں بھی وہ باتیں اس کی

میرے چہرے پہ غزل لکھتی گئیں
شعر کہتی ہوئی آنکھیں اس کی

شوخ لمحوں کا پتہ دینے لگیں
تیز ہوتی ہوئی سانسیں اس کی

ایسے موسم بھی گزارے ہم نے
صبحیں جب اپنی تھیں ، شامیں اس کی

دھیان میں اس کے یہ عالم تھا کبھی
آنکھ مہتاب کی ، یادیں اس کی

رنگ جوئندہ وہ ، آئے تو سہی !
پھول تو پھول ہیں ، شاخیں اس کی

فیصلہ موجِ ہوا نے لکھا !
آندھیاں میری ، بہاریں اس کی

خود پہ بھی کھلتی نہ ہو جس کی نظر
جانتا کون زبانیں اس کی

نیند اس سوچ سے ٹوٹی اکثر
کس طرح کٹتی ہیں راتیں اس کی

دور رہ کر بھی سدا رہتی ہیں
مجھ کو تھامے ہوئے باہیں اس کی

آشیرباد

پھر مسیحائی دستگیر ہوئی
چن رہی ہے تمہارے اشکوں کو

کس محبت سے یہ نئی لڑکی
میرے ہاتھوں کی کم سخن نرمی

دکھ تمہارے نہ بانٹ پائی مگر
اس کے ہاتھوں کی مہربانی کو

میری کم ساز آرزو کی دعا
اور یہ بھی کہ اس کی چارہ گری

عمر بھر ایسے سر اٹھاکے چلے
میری صورت کبھی نہ کہلائے

زخم پر ایک وقت کی پٹی !

پروردہ

لوگ کہتے ہیں ان دنوں چپ ہے
میرا قاتل
کہ اس کے خنجر کو
دھونے والی کنیز
چھپ چھپ کر
اب لہو کو زباں سے چاٹتی ہے!

پروین شاکر کی منتخب شاعری

(صفحہ ۳۱ تا ۳۶)

رفاقت

سبز موسم کی بے حد خنک رات تھی
چنبیلی کی خوشبو سے بوجھل ہوا
دھیمے لہجوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی
ریشمیں اوس میں بھیگ کر
رات کا نرم آنچل بدن سے لپٹنے لگا تھا
ہار سنگھار کی نرم خوشبو کا جادو
جواں رات کی سانس میں گھل رہا تھا
چاندنی، رات کی گود میں سر رکھے ہنس رہی تھی
اور میں سبز موسم کی گلنار ٹھنڈک میں کھوئی ہوئی
شاخ در شاخ
اک تیتری کی طرح اڑ رہی تھی
کبھی اپنی پرواز میں رک کے نیچے جو آتی تو احساس ہوتا مجھے
شبنمی گھاس کا لمس پاؤں کو کتنا سکون دے رہا ہے!
دفعتاً

میں نے ٹی-وی کی خبروں پہ موسم کی بابت سنا
ترے شہر میں لو چلی ہے
ایک سو آٹھ سے بھی زیادہ حرارت کا درجہ رہا ہے
مجھے یوں لگا

میرے چاروں طرف آگ ہی آگ ہے
ہوائیں جہنم سے آنے لگی ہیں
تمازت سے میرا بدن پھنک رہا ہے
میں اس شبنمی روح پرور فضا کو جھٹک کر
کچھ اس طرح کمرے میں اپنے چلی آئی
جیسے کہ اک لمحہ بھی اور رک جاؤں گی تو جھلس جاؤں گی!
پھر بڑی دیر تک
تیرے تپتے ہوئے جسم کو
اپنے آنچل سے جھلتی رہی
تیرے چہرے سے لپٹی ہوئی گرد کو
اپنی پلکوں سے چنتی رہی

رات سونے سے پہلے
اپنی شب خوابیوں کا لبادہ جو پہنا
تو دیکھا
مرے جسم پر آبلے پڑ چکے تھے!

غزل

ڈسنے لگے ہیں خواب مگر کس سے بولیے
میں جانتی تھی، پال رہی ہوں سنپولیے!

بس یہ ہوا کہ اس نے تکلف سے بات کی
اور ہم نے روتے روتے دوپٹے بھگولیے

تیری برہنہ پائی کے دکھ بانٹتے ہوئے
ہم نے خود اپنے پاؤں میں کانٹے چبھولیے

"خوشبو کہیں نہ جائے" یہ اصرار ہے بہت
اور یہ بھی آرزو کہ ذرا زلف کھولیے

تصویر جب نئی ہے نیا کینوس بھی ہے
پھر طشتری میں رنگ پرانے نہ گھولیے

گئے موسم میں جو کھلتے تھے گلابوں کی طرح
دل پہ اتریں گے وہی خواب عذابوں کی طرح

راکھ کے ڈھیر پہ اب رات بسر کرنی ہے
جل چکے ہیں مرے خیمے ، مرے خوابوں کی طرح

ساعت دید کے عارض ہیں گلابی اب تک
اولیں لمحوں کے گلنار حجابوں کی طرح

وہ سمندر ہے تو پھر روح کو شاداب کرے
تشنگی کیوں مجھے دیتا ہے سرابوں کی طرح

یاد تو ہوں گی وہ باتیں تجھے اب بھی لیکن
شلیف میں رکھی ہوئی بند کتابوں کی طرح

کون جانے کہ نئے سال میں تو کس کو پڑھے
تیرا معیار بدلتا ہے نصابوں کی طرح

شوخ ہوجاتی ہے اب بھی تری آنکھوں کی چمک
گاہے گاہے ترے دلچسپ جوابوں کی طرح

○○○

بارش ہوئی تو پھولوں کے تن چاک ہوگئے
موسم کے ہاتھ بھیگ کے سفاک ہوگئے

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہوگئے

لہرا رہی ہے برف کی چادر ہٹا کے گھاس
سورج کی شہ پہ تنکے بھی بے باک ہوگئے

بستی میں جتنے آب گزیدہ تھے سب کے سب
دریا کے رخ بدلتے ہی تیراک ہوگئے

○○○

دھنک دھنک مری پوروں کے خواب کردے گا
وہ لمس میرے بدن کو گلاب کردے گا

قبائے جسم کے ہر تار سے گزرتا ہوا
کرن کا پیار مجھے آفتاب کردے گا

جنوں پسند ہے دل اور تجھ تک آنے میں
بدن کو ناؤ ، لہو کو چناب کردے گا

میں سچ کہوں گی ، مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا ، اور لاجواب کردے گا

انا پرست ہے اتنا کہ بات سے پہلے
وہ اٹھ کے بند مری ہر کتاب کردے گا

سکوت شہر سخن میں وہ پھول سا لہجہ
سماعتوں کی فضا خواب خواب کردے گا

اسی طرح سے اگر چاہتا رہا پیہم
سخن وری میں مجھے انتخاب کردے گا

مری طرح سے کوئی ہے جو زندگی اپنی
تمہاری یاد کے نام انتساب کردے گا !

دھیان

ہرے لان میں
سرخ پھولوں کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی
میں تجھے سوچتی ہوں
مری انگلیاں
سبز پتوں کو چھوتی ہوئی
تیرے ہمراہ گزرے ہوئے موسموں کی مہک چن رہی ہیں
وہ دلکش مہک
جو مرے ہونٹ پر آکے ہلکی گلابی ہنسی بن گئی ہے!
دور اپنے خیالوں میں گم
شاخ در شاخ
اک تیتری، خوشنما پر سمیٹے ہوئے، اڑ رہی ہے
مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے
جیسے مجھ کو بھی پر مل گئے ہوں!

آنگنوں میں اترا ہے ، بام و در کا سناٹا
میرے دل پہ چھایا ہے میرے گھر کا سناٹا

رات کی خموشی تو پھر بھی مہرباں نکلی
کتنا جان لیوا ہے دوپہر کا سناٹا

صبح میرے جوڑے کی ہر کلی سلامت تھی
گونجتا تھا خوشبو میں رات بھر کا سناٹا

اپنی دوست کو لے کر تم وہاں گئے ہوگے
مجھ کو پوچھتا ہوگا رہگزر کا سناٹا

خط کو چوم کر اس نے آنکھ سے لگایا تھا
کل جواب تھا گویا لمحہ بھر کا سناٹا

تو نے اس کی آنکھوں کو غور سے پڑھا قاصد !
کچھ تو کہہ رہا ہوگا اس نظر کا سناٹا

ooo

کمالِ ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اس کی دلہن سجاؤں گی

سپرد کرکے اسے چاندنی کے ہاتھوں میں
میں اپنے گھر کے اندھیروں کو لوٹ آؤں گی

بدن کے کرب کو وہ بھی سمجھ نہ پائے گا
میں دل میں روؤں گی ، آنکھوں میں مسکراؤں گی

وہ کیا گیا کہ رفاقت کے سارے لطف گئے
میں کس سے روٹھ سکوں گی ، کسے مناؤں گی

اب اس کا فن تو کسی اور سے ہوا منسوب
میں کس کی نظم اکیلے میں گنگناؤں گی

وہ ایک رشتۂ بے نام بھی نہیں لیکن
میں اب بھی اس کے اشاروں پہ سر جھکاؤں گی

بچھا دیا تھا گلابوں کے ساتھ اپنا وجود
وہ سو کے اٹھے تو خوابوں کی راکھ اٹھاؤں گی

سماعتوں میں گھنے جنگلوں کی سانسیں ہیں
میں اب کبھی تری آواز سن نہ پاؤں گی

جواز ڈھونڈ رہا تھا نئی محبت کا
وہ کہہ رہا تھا کہ میں اس کو بھول جاؤں گی !

اعتراف

جانے کب تک تری تصویر نگاہوں میں رہی
ہو گئی رات ترے عکس کو تکتے تکتے
میں نے پھر تیرے تصور کے کسی لمحے میں
تیری تصویر پہ لب رکھ دیے آہستہ سے!

کشف

ہونٹ بے بات ہنسے
زلف بے وجہ کھلی
خواب دکھلا کے مجھے
نیند کس سمت چلی
خوشبو لہرائی مرے کان میں سرگوشی کی
اپنی شرمیلی ہنسی میں نے سنی
اور پھر جان گئی
میری آنکھوں میں ترے نام کا تارہ چمکا!

کانچ کی سرخ چوڑی

کانچ کی سرخ چوڑی
مرے ہاتھ میں
آج ایسے کھنکنے لگی
جیسے کل رات شبنم سے لکھی ہوئی
ترے ہاتھ کی شوخیوں کو
ہواؤں نے سردے دیا ہو!

مقدر

میں وہ لڑکی ہوں
جس کو پہلی رات
کوئی گھونگھٹ اٹھا کے یہ کہہ دے
میرا سب کچھ ترا ہے، دل کے سوا!

آج ملبوس میں ہے کیسی تھکن کی خوشبو
رات بھر جاگی ہوئی جیسے دلہن کی خوشبو
پیرہن میرا مگر اس کے بدن کی خوشبو
اس کی ترتیب ہے ایک ایک شکن کی خوشبو

ooo

تتلیوں کی بے چینی آبسی ہے پاؤں میں
ایک پل کو چھاؤں میں، اور پھر ہواؤں میں
جن کے کھیت اور آنگن ایک ساتھ اجڑتے ہیں
کیسے حوصلے ہوں گے ان غریب ماؤں میں
صورت رفو کرتے، سر نہ یوں کھلا رکھتے
جوڑ کب نہیں ہوتے ماؤں کی رداؤں میں
آنسوؤں میں کٹ کٹ کر کتنے خواب گرتے ہیں
اک جوان کی میت آرہی ہے گاؤں میں
اب تو ٹوٹی کشتی بھی آگ سے بچاتے ہیں
ہاں کبھی تھا نام اپنا بخت آزماؤں میں
صرف اس تکبر میں اس نے مجھ کو جیتا تھا
ذکر ہو نہ اس کا بھی کل کو نارساؤں میں
اپنی غم گساری کو مشتہر نہیں کرتے
اتنا ظرف ہوتا ہے درد آشناؤں میں

ooo

ایک شعر

لو! میں آنکھیں بند کیے لیتی ہوں، اب تم رخصت ہو
دل تو جانے کیا کہتا ہے، لیکن دل کا کہنا کیا!

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

وہ کہیں بھی گیا، لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

تیرا پہلو ترے دل کی طرح آباد رہے
تجھ پہ گزرے نہ قیامت شبِ تنہائی کی

اس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
روح تک آگئی تاثیر مسیحائی کی

اب بھی برسات کی راتوں میں بدن ٹوٹتا ہے
جاگ اٹھتی ہیں عجب خواہشیں انگڑائی کی

○○○

شدید دکھ تھا اگرچہ تری جدائی کا
سوا ہے رنج ہمیں تیری بے وفائی کا

جو میرے سر سے دوپٹہ نہ ہٹنے دیتا تھا
اسے بھی رنج نہیں میری بے ردائی کا

ردا چھنی مرے سر سے مگر میں کیا کہتی
کٹا ہوا تو نہ تھا ہاتھ میرے بھائی کا

ملے تو ایسے رگ جاں کو جیسے چھو آئے
جدا ہوئے تو وہی کرب نارسائی کا

میں سچ کو سچ بھی کہوں گی، مجھے خبر ہی نہ تھی
تجھے بھی علم نہ تھا میری اس برائی کا

نہ دے سکا مجھے تعبیر خواب تو بخشے
میں احترام کروں گی تری بڑائی کا

صرف ایک لڑکی

اپنے سرد کمرے میں
میں اداس بیٹھی ہوں
نیم وا دریچوں سے
نم ہوائیں آتی ہیں
میرے جسم کو چھو کر
آگ سی لگاتی ہیں
تیرا نام لے لے کر
مجھ کو گدگداتی ہیں
کاش میرے پر ہوتے
تیرے پاس اڑ آتی
کاش میں ہوا ہوتی
تجھ کو چھو کے لوٹ آتی
میں نہیں مگر کچھ بھی
سنگ دل رواجوں کے
آہنی حصاروں میں
عمر قید کی ملزم
صرف ایک لڑکی ہوں!

ٹوٹی ہے میری نیند مگر تم کو اس سے کیا!
بجتے رہیں ہواؤں سے در تم کو اس سے کیا!

تم موج موج مثل صبا گھومتے رہو
کٹ جائیں میری سوچ کے پر تم کو اس سے کیا

اوروں کا ہاتھ تھامو، انہیں راستہ دکھاؤ
میں بھول جاؤں اپنا ہی گھر، تم کو اس سے کیا

ابر گریز پا کو برسنے سے کیا غرض
سیپی میں بن نہ پائے گہر، تم کو اس سے کیا!

لے جائیں مجھ کو مال غنیمت کے ساتھ عدو
تم نے تو ڈال دی ہے سپر تم کو اس سے کیا

تم نے تو تھک کے دشت میں خیمے لگا لیے
تنہا کٹے کسی کا سفر، تم کو اس سے کیا!

○○○

لمحات وصل کیسے حجابوں میں کٹ گئے
وہ ہاتھ بڑھ نہ پائے کہ گھونگھٹ سمٹ گئے

خوشبو تو سانس لینے کو ٹھہری تھی راہ میں
ہم بدگمان ایسے کہ گھر کو پلٹ گئے

ملنا ـ دوبارہ ملنے کا وعدہ ـ جدائیاں
اتنے بہت سے کام اچانک نمٹ گئے

روئی ہوں آج کھل کے بڑی مدتوں کے بعد
بادل جو آسمان پہ چھائے تھے، چھٹ گئے

کس دھیان سے پرانی کتابیں کھلی تھیں کل
آئی ہوا تو کتنے ورق ہی الٹ گئے

افسانہ

سہاگ

ضیا حسنی

آفاق منزل رابعہ کی زندگی کی طرح اُجاڑ اور سنسان ہے۔ سچ ہے جہاں انسان نہیں رہتا وہاں دوسری مخلوق بس جاتی ہے۔ نہ جانے کیوں اسے حویلی کہا جاتا ہے؟ آثار بتلاتے ہیں کہ کبھی یہ عمارت بلند رہی ہوگی لیکن اب راہ گیر اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ یہی اس دنیا کی ریت ہے ہمیشہ سے چڑھتے ہوئے سورج کی پوجا ہوتی ہے۔ ہاں! بات آفاق منزل کی ہو رہی تھی اب اس میں کئی بلیوں نے اپنا گھر بنا لیا ہے اور وسیع و عریض دالان میں کہیں کہیں چمگادڑ لٹکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ دن ڈوبتے ہی آس پاس کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دیتی ہے اور بلیاں مسلسل روتی ہیں تو فضا بڑی سوگوار بن جاتی ہے اور ایسی ہیبت طاری ہوتی ہے کہ ایک ایک لمحہ گزارنا دشوار ہو جاتا ہے۔ رابعہ ایسے ہیبتناک ماحول میں کتنے دن گزار چکی ہے۔ جس طرح چمگادڑ ایک کونے سے دوسرے کونے تک اڑا کرتے ہیں اسی طرح رابعہ ادھر سے اُدھر گشت لگاتی ہے۔ کبھی بے مقصد ہال سے نکل کر برآمدے میں آتی ہے پھر دوڑتی ہوئی صدر دروازے تک چلی جاتی ہے۔ کوٹھری میں بوسیدہ اور زنگ آلودہ سامان کا انبار لگا ہوا ہے وہ کوٹھری میں چلی جاتی ہے ادھر کا سامان اُدھر رکھتی ہے اور پھر ان چمگادڑوں کی طرح لٹک جاتی ہے وہ تقریباً پندرہ برسوں سے اسی طرح لٹکی ہوئی ہے۔

آفاق تحصیلدار نے برسوں پہلے اس حویلی کو بنایا تھا۔ وہ زمیندار تھا لیکن تحصیلداری نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ مکان جگمگا اٹھا۔ خاندان کے متعدد افراد، نوکر خادمائیں اور مہمان ہر وقت اس گھر میں بیس پچیس آدمی رہتے تھے۔ دن میں عید رات میں شب برات کا سا سماں رہتا تھا۔ دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی افسر یا معزز دوست رونق افروز ہوتا۔ آفاق میزبانی کر کے ان سے فائدہ حاصل کرنے کا گر بھی جانتا تھا۔ ان کو انٹرٹین کرنے اور دل بہلانے کا ہر جتن کر لیتا تھا۔ تحصیلداری کو بخوبی نبٹا کر گھر واپس آ گیا تھا اور ماش کی سپیدی کے برابر بھی کالا دھبا نہ لگا تھا۔ انسان کو ذرا سا اطمینان ملتا ہے اور وہ پُرسکون ہو کر دن گزارنے لگتا ہے تو وہ اپنی اور بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے صدیوں تک رہنے بسنے کے منصوبے بنانے لگتا ہے وہ سوچتا ہے کہ اسی طرح خوشی خوشی زندگی گزرتی رہے گی تو اسے نہ تو زلزلے کے جھٹکے محسوس ہوتے ہیں نہ سیلاب کے ریلے بڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور نہ انقلاب کی دستک چونکاتی ہے۔ آفاق خوش حال زندگی گزار رہا تھا۔ روزانہ مرغ و ماہی اکباب اور فیرنی سے دسترخوان سجتا تھا۔ اس کی نازک طبیعت جب کبھی بوجھل ہوتی تو خمیرہ ابریشم اور جوارش جالینوس کھا کر

طبیعت بحال کر لیتا تھا۔ ایک بچی گوالیار میں اپنی سسرال میں خوش حال زندگی گزار رہی تھی۔ جوان بیٹے بھوپال اور حیدرآباد میں جا بسے تھے اور معقول تنخواہ پاتے تھے۔ آفاق کو تنہائی کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی تو وہ ساٹھ باسٹھ سال کی عمر میں جواں عیال تک سکی درست ایک بیوہ کو بیاہ کر گھر لے آیا۔ پہلے دوستوں اور من چلے ساتھیوں سے دل بہلاتا تھا اور ریڈیو کے نغموں میں کھویا رہتا تھا اب جو چاند ایسی بیوی گھر آ گئی تو گھر میں جی لگنے لگا اور اسے یوں محسوس ہوتا جیسے خزاں میں بہار آ گئی ہو۔ رابعہ اسی بیوی کے بطن سے پیدا ہوئی تھی۔ رابعہ سیانی ہو چلی تھی تب تک اُسے آفاق کی سرپرستی حاصل رہی۔ اُن دنوں بھی گھر میں ایک ملازمہ گھریلو کام انجام دیتی تھی اور ایک نوکر سودا سلف لاتا تھا اسی دوران میں آفاق کی محبوب بیوی اچانک مر گئی اور اب وہ اس چٹان کے سرکتے ہی خود کو بے سہارا محسوس کرنے لگا اور بے تکلف دوستوں سے کہہ اُٹھتا۔ "یار! لطف زندگی جاتا رہا"

اور ایک دن وہ رابعہ کو وفا شعار ملازم شبراتی کے حوالے کر کے ابدی نیند سو گیا۔ اس نے دو تین برس رابعہ پر اس طرح نگاہ رکھی جیسے ایک ماں اپنی بچی پر رکھتی ہے مجال نہیں کوئی غیر شخص اندر آ جائے۔ اگر کوئی سائل دستک دیتا تو وہ خود جا کر اُس سے ملتا اور اُس کی ضرورت پوری کر دیتا تھا۔ رابعہ کے سوتیلے بھائی بٹوارے کے بعد کراچی اور لاہور منتقل ہو گئے تھے اور اب اتنے بڑے ملک میں رابعہ کا شبراتی کے علاوہ کوئی پرسانِ حال نہ تھا وہی باغ اور کھیتوں کی نگہداشت کرتا۔ بازار سے ضروری چیزیں لاتا اور رابعہ کے چہرے پر دکھ اور درد کی ایک لکیر بھی پھیلنے نہیں دیتا تھا۔ رابعہ کو اناج اور بسر اوقات کے لئے روپے باغ اور کھیتوں سے مل جاتے تھے۔ ایک مہربان شخص ونود نے دوڑ دھوپ کر کے یہ جائیداد بچائی تھی ورنہ سب متروکہ جائیداد مان کر کسٹوڈین کے حوالے کر دی جاتی۔ یہ ونود بابو فوج میں کیپٹن تھے اور اب قصبہ میں پنشن لے کر امیرانہ زندگی گزار رہے تھے بڑے آدمی تھے۔ آفاق کو وہ چچا کہتے تھے اور زندگی بھر ان سے نگاہ جھکا کر ملے اور جب ان کے سامنے پہنچے تو عزت و احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ جب رابعہ کو کوئی ضرورت درپیش ہوتی تو وہ بے اختیار ونو بھائی کو یاد کرتی اور وہ دوڑ کر اس کی ضرورت پوری کر دیتے۔ بٹوارے نے ملک میں فرقہ پرستی کا زہر بو دیا تھا جس کے سبب سے لوگ فاصلے سے چلنے کے عادی ہو گئے تھے اور باہمی ہمدردی اور یک جہتی کا خوشگوار منظر دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن اب بھی ونود جیسے فراخدل اور روشن خیال افراد اپنے خلوص اور محبت کے پیام دیئے جا رہے تھے۔ عام طور پر قصبہ کا حال ایسا تھا کہ چین چھپٹ ہو گئی تھی کیونکہ دو آدمی کا صبح سے شام کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ اگر ونود کی سرپرستی نہ ہوتی تو رابعہ کی جگہ پر کسی زور دست کا قبضہ ہو جاتا۔ باغ اور کھیت کبھی اس کے ہاتھ سے نکل جاتے۔ شبراتی

ماہنامہ انشاء کلکتہ

بندی، غنڈہ گردی اور نحوست کار سیاتیوں کو دیکھ کر لرز لرز اٹھتا تھا اور دن دن اپنی گرتی ہوئی صحت اور گھٹتی ہوئی طاقت کو محسوس کر کے اُلجھ پڑتا اور ایک دم کہہ اٹھتا۔

"رابعہ بی بی تمہارا کیا ہوگا؟ تمہیں اللہ کے حوالے کئے دیتا ہوں"

ایک دن وہ سیدھا دلنو دبابو کے گھر چلا گیا اور اُن سے گہری فکر مندی اور مایوسی کے عالم میں بولا۔

"بابوجی! میں کنارے کھڑا ہوں کسی دن مر جاؤں گا۔ رابعہ بی بی کا کیا ہوگا؟"

"مجھے رابعہ کا دھیان ہے۔ آفاق چچا نے مرتے مرتے مجھے یہ کام سونپا تھا۔ میں اس کے ہاتھ پیلے کرنے کے لئے برابر سوچ رہا ہوں۔ ایک لڑکا نیاز مجھے سردی کے ایام میں ملا تھا۔ وہ بمبئی میں کسی کارخانے میں ملازم ہے۔ اس کے چہرے سے سکون اور اطمینان جھلکتا ہے۔ میں نے اس کے باپ سے شادی کے بارے میں بات کی تھی تو وہ راضی ہو گیا۔ وہ گرمی میں کھیتوں کے کٹنے کے زمانے میں آئے گا اور پندرہ دن رہ کر واپس جائے گا تب ہی رابعہ سے اس کا نکاح کرادوں گا۔ تم مایوس اور فکر مند نہ ہو۔"

"بابوجی! آپ نے ایک کانٹا نکال دیا۔ یہ تو رہ رہ کر میری سوچ میں چبھتا تھا اور ٹیس دیتا تھا۔"

دلنو دبابو قول کے دھنی تھے جو بات کہہ دیتے اُسے پورا کرکے دم لیتے تھے۔ شبراتی اناج اکٹھا کر کے گھر لا رہا تھا۔ گرمی دھوم مچا رہی تھی لُو کے جھکڑ چل رہے تھے۔ دھول اُڑ رہی تھی۔ گاؤں میں تھریشر چل رہے تھے۔ اناج اور بھوسے کے انبار جگہ جگہ دکھائی دے رہے تھے۔ شبراتی اندر اندر ٹوٹ رہا تھا لیکن فرض سے کوتاہی اُسے کسی نوع پسند نہ تھی۔ اس لئے وہ مضبوط ارادے اور ہمت سے دوڑ دوڑ کر کام کر رہا تھا۔ ایک دن وہ گیہوں کی بوری کاندھے پر لادے کھلیان سے گھر آ رہا تھا کہ اُسے نیاز دکھائی دیا۔ وہ اُسے حویلی لے آیا اور رابعہ سے بولا۔

"نیاز میاں بیٹھک میں بیٹھے ہیں شربت بنا دو بی بی!"

وہ شرماتی ہوئی شربت بنانے لگی اور دل میں سوچ رہی تھی کہ شبراتی چچا کتنی محبت کرتے ہیں کتنا ٹوٹ کر چاہتے ہیں لو! یہ اب نیاز کو گھر لے آئے اور شربت بھی پلا رہے ہیں۔

یہ سوچتے ہوئے جیسے کسی نے گدگدا دیا اور وہ گردن جھکائے رہ رہ کر ہنستی رہی۔

پھر اسی شام کو وہ دلنو دبابو سے ملا اور خوشامدانہ انداز میں کہنے لگا۔

"میں نیاز میاں کو حویلی لے گیا تھا۔ شربت پلایا۔ اب آپ اللہ کا نام لے کر رابعہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیجئے۔ لڑکا مجھے بھلا لگ رہا ہے"

پھر جلتی تپتی ایک شام کو محلے کی مسجد میں رابعہ کا نکاح ہو گیا۔ دلنو دبابو کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑتی تھی اور شبراتی کو تو یوں لگا جیسے اُس کے سر سے بوجھ اتر گیا ہو اور دوسرے دن جب اس نے کمرے سے ہلکی ہلکی سرگوشیاں اُبھرتی ہوئی سنیں تو اسے دلی مسرت ہوئی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس گھر میں پھر سے بہار آگئی۔ رابعہ کی شادی کو ابھی دو مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ اچانک شبراتی لقمۂ اجل ہو گیا۔ رابعہ کو اس کی مفارقت بے حد کھلی اُسے یوں لگا جیسے اس کا مربی اور سرپرست دنیا سے اُٹھ گیا ہو۔ اس کا جنازہ گھر سے جا رہا تھا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

نیاز بمبئی چلا گیا تھا اور وہاں سے پچاس روپے ہر ماہ بھیج دیتا تھا اور سال میں ایک دو بار وطن آجاتا۔ تھوڑے دنوں رہ کر چلا جاتا۔ وقت نے ایک معتبر شخص کو حویلی میں جگہ دے دی تھی۔ رابعہ کو اس کے خاندان کی موجودگی میں تنہائی محسوس نہ ہوتی تھی۔ ایک دن اچانک دلنو د رابعہ کے گھر پہنچا تو اس کا بدن بخار سے پھنک رہا تھا اور اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ دلنو د رابعہ کی درد اور کرب میں ڈوبی ہوئی آواز کو سن کر تڑپ اُٹھا۔

"آپ اتنی بیمار اور کمزور ہو گئی ہیں۔ میں ابھی ڈاکٹر کو بھیجتا ہوں!"

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر آگیا۔ اُس نے دیکھا اور نسخہ لکھ دیا۔ اب روزانہ دلنو د کا نوکر آجاتا اور رابعہ کا حال پوچھتا اور دوائیں پہنچا دیتا تھا۔

کئی دنوں کے بعد دلنو د رابعہ کو دیکھنے آیا تو اُسے اطمینان ہوا۔ وہ تندرست ہو گئی تھی اور لپک لپک کر بات کر رہی تھی لیکن اُس کے چہرے سے وہ خوشی اور اطمینان ظاہر نہیں ہو رہا تھا جو پانچ چھ برسوں کی شادی کے بعد اُبھرنا چاہئے بلکہ جہاندیدہ دلنو د نے دورانِ گفتگو تعلقات کی ناہمواری اور کسی قدر کشیدگی کا کرب محسوس کیا۔ وہ رابعہ کا چہرہ دیکھتے ہی اور اس کا حال دریافت کرتے ہی معاملہ کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔

"بہن! میں نے یہ رشتہ تمہاری بھلائی اور تمہارے خوشگوار مستقبل کے لئے کیا تھا لیکن لگتا ہے تمہیں آرام نہیں ہے"

"دلنو د بھیا! میں دکھ جھیلنے کے لئے پیدا ہوئی ہوں۔ ابّا نے شروع ہی میں ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ بھائی اپنے بیوی بچوں کو لے کر پاکستان سدھار گئے جیسے میں کوئی ان کی سگی نہ تھی۔ شبراتی چچا کے سائے میں دن گزار رہی تھی تو وہ بھی چل بسے۔ اِن سے ہمیشہ ان بن رہتی ہے اور میں محسوس کرتی ہوں کہ شاید میں اکیلی رہ جاؤں گی!"

"جب تک میں زندہ ہوں تمہیں پریشان اور مایوس نہ ہونے دوں گا بہن!"

دلنو د نے ایسی بات کہہ تو دی لیکن وہ بجھا بجھا اور اُداس اپنے گھر پہنچا دن بھر اُسے اپنے بھرے پُرے گھر میں عجیب سی الجھن محسوس ہوتی رہی۔ وہ رہ رہ کر ایسا محسوس کرتا کہ جیسے اس کا کوئی ذاتی نقصان ہو گیا ہو۔ اس کے بعد اس نے نیاز کو سدھارنے کے کئی جتن کئے۔ اُس نے ڈھلتی عمر میں بمبئی کا سفر کیا اپنے دوستوں سے مل کر نیاز کو سمجھانے کی کافی کوشش کی اور اس سے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ بمبئی چھوڑ کر وطن آجائے تو وہ اُسے دھندا کرنے کے لئے موٹی رقم دیدے گا اس سے وہ رابعہ کے ساتھ اچھی زندگی گزار سکے گا لیکن وہ اس پر آمادہ نہیں ہوا۔ پھر اس نے گھر واپس پہنچ کر اُس کے باپ کو بلایا اور رابعہ کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرنے کے لئے اُکسایا، لیکن وہ بھی بیٹے کی طرح کوئی ذمہ داری لینے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ اُس نے کہا۔ "یہ ذمہ داری نیاز کی ہے۔ میں عمر کی اس منزل سے گزر رہا ہوں کہ مجھے خود لڑکوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ میں کیسے دوڑ بھاگ کر سکتا ہوں؟"

تھوڑے دنوں نیاز رابعہ کو ماہوار رقم دیتا رہا پھر وہ بالکل بے خبر ہو گیا۔ اسی دوران دلنو د کو یہ بھی پتہ چلا کہ نیاز نے چالاکی سے رابعہ کے باغ اور کھیتوں کو اپنے والد کے نام فرضی بیع نامے کے ذریعے سے منتقل کرا دیا ہے۔ یہ سارا کام ہوشیاری اور چالاکی سے اس طرح کیا گیا کہ آہٹ بھی نہ ہوئی۔ اس افسوس ناک خبر کو سنتے ہی دلنو د کو جھٹکا سا لگا پھر جب تک اس کی زندگی کا چراغ جلتا رہا اس کی روشنی رابعہ کے گھر پہنچتی تھی۔ ایک دن یہ سہارا بھی نہ رہا اور وہ بھی اکیلی اور تنہا رہ گئی۔

اب رابعہ کو چاروں طرف اندھیرا دکھائی دیتا تھا اور وہ کبھی اتنا دبیز ہو جاتا کہ

وہ ڈرتے ڈرتے آگے قدم بڑھاتی تھی اور ایک دن وہ اسی طرح اندھیرے میں مایوسی ہراساں اور تفکرات کی گہرائی میں ڈوبی ہوئی بیٹھی تھی کہ روشنی کی ایک کرن دکھائی دی۔ اُسے ڈاک سے ایک مختصر خط ملا تھا جس میں یہ اطلاع درج تھی۔

سوگنباش پتا چلنے یہ تحریر چھوڑی ہے۔ "بہن رابعہ کی دیکھ بھال کرتے رہنا۔ اُن کی گذر بسر کے لئے بازار کی دکانوں میں سے ایک کا کرایہ سو روپے ماہوار انہیں بھجواتے رہنا اور کوئی سنکٹ آئے تو اس کے علاوہ بھی سہایتا کرنا۔ دیکھو! میں نے وچن دیا ہے اس میں فرق نہ آئے اور کہیں رابعہ یہ نہ سوچے کہ اس سنسار میں اس کا کوئی پُرسان حال نہیں ہے۔"

اب رابعہ اس ڈور کو پکڑے دن گزارنے لگی۔ اس دوران میں ملک میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ضروری چیزوں کی قیمتیں آسمان کو چھونے لگیں عام آدمی سسک سسک کر جینے لگا۔ اب رابعہ کے لئے یہ رقم بھی کافی نہیں ہوتی تھی وہ سر ڈھکتی تو پیر کھل جاتے اور پیر ڈھکتی تو سر کھل جاتا تھا لیکن وہ بھلے باپ کی بیٹی تھی اس لئے خاموشی سے دن گزار رہی تھی اور اس کے لامتناہی مشکلات اور مصائب کا کسی کو علم نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن قصبے کے ایک با اثر آدمی نے اسے بلوایا اور ہمدردانہ انداز میں اس سے بولا۔

"بہن! تمہارا حال مجھ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ تم اکیلی تنہا اتنی بڑی حویلی میں رہتی ہو۔ میں اس کا ایک حصہ ایسے آدمی کو دلوادوں گا جو تمہارے مکان کی مرمت بھی کرائے گا اور اس سے ملا ہوا ایک نیا مکان بنوا دے گا جس کا تمہیں ہر ماہ کرایہ ملے گا تمہیں تنہائی محسوس نہ ہوگی"

"میں کوئی کام ستیش بابو کے مشورہ کے بغیر نہیں کرتی۔ ونود بابو نے مجھے ہمیشہ بہن کی طرح مانا اور ستیش ان کے لڑکے ہیں وہ مجھے بھی بیگم کہتے ہیں۔ وہ کہہ دیں گے تو میں اجازت دیدوں گی۔"

رابعہ نے ایسی بات کہی اور لے آئے گھر آ گئی۔ اُس آدمی نے زبردستی ملے ہوئے مکان پر قبضہ کر لیا اور وہاں نیا مکان بنوا لیا جس میں کبھی ایک انجان شخص آکر ٹھہر جاتا ہے مشہور ہے وہ نامی بدمعاش ہے۔ جس شخص نے تمہیں بلایا تھا اس کا ایک گروہ ہے اور وہ اس کا سرغنہ ہے۔ لوگ اس کے ہتھکنڈوں سے ڈرتے ہیں حد تو یہ ہے کہ حلقے کا پولس انسپکٹر بھی اس پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ اس سے پہلے اس کے کئی ہم رتبہ ذمہ داروں نے اُسے قانونی شکنجہ میں کسنا چاہا لیکن وہ ناکام رہے اور بڑے افسروں نے اُسے بچا لیا۔ یہ شخص بدمعاشوں کو ٹھہراتا ہے اور اُن سے حسب منشاء کام لیتا ہے۔ رابعہ نے یہ ساری باتیں سنیں تو سہم گئی اور جب ستیش چھٹی منانے گھر آئے تو رابعہ نے مکان چھننے کی پوری روئیداد سنا دی۔

بہر خیر ستیش کے حلقۂ احباب میں تعلیم یافتہ مہذب اور صلح جو افراد تھے لہٰذا اُنہوں نے جواب دیا۔

"ان سے قانونی لڑائی ہوسکتی ہے اور ان سے کسی طرح نبٹا نہیں جاسکتا لیکن مقدمہ دائر کرنے کے بعد اس کی پیروی بڑی مشکل ہے اور یہ زور دست آپ کو چین سے بیٹھنے نہ دے گا۔ اس لئے خاموشی بہتر ہے۔"

ماہنامہ انشا، کلکتہ

رابعہ کھیت اور باغ پہلے ہی گنوا بیٹھی تھی اب مکان کا ایک حصہ چھین لیا گیا تو وہ بہت غمگین ہوئی لیکن کیا کر سکتی تھی صبر کرکے بیٹھ گئی۔ ستیش کی مجبوری کو وہ سمجھتی تھی اور وہ اس کے جواب سے بدظن نہیں ہوئی۔

رمضان کا مبارک مہینہ جیسے ہی آتا تو گاؤں سے کافی تعداد میں مرد اور عورتیں قصبے میں آجاتی تھیں اور چند عورتیں حویلی میں بھی آکر ٹھہر جاتی تھیں۔ اُن میں سے ایک عورت "کلو" بڑی باتونی اور تیز طرار تھی۔ وہ متمول لوگوں کے گھروں میں جاتی اور چکنی چپڑی باتیں کرکے اور مصائب اور پریشانیوں کی فرضی داستان سنا کر کپڑے اور موٹی موٹی رقمیں اینٹھ لاتی تھی۔ اب کی رمضان آیا تو اس نے ایک لمحہ ضائع نہیں کیا فوراً ہی رابعہ کے گھر پہنچ کر اپنے دھندے میں لگ گئی۔ وہ جس گھر میں جاتی بیس پچیس روپے سے کم نہ لیتی اور کہیں سے وہ سو اور دو سو بھی لے لیتی تھی۔ اس دوڑ دھوپ کے بعد اُس نے تین ہزار روپے اور کئی جوڑے کپڑے وصول کر لئے تھے۔ اِدھر رابعہ کو جو رقم ستیش بابو سے ملتی تھی وہ نہ مل سکی تھی وہ کسی علمی مجلس میں شرکت کی غرض سے امریکا گئے تھے اور واپسی پر وہ اپنے بچے سے ملنے لندن بھی چلے گئے تھے وہ وہاں میڈیکل تعلیم کے سلسلہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ غرض وطن پہنچنے میں کئی مہینے لگ گئے۔

رمضان کی ستائیسویں تاریخ تھی رابعہ روزہ رکھے ہوئے تھی۔ محلہ کی ایک خاتون نے افطاری بھجوادی تھی اور اُس نے گھر میں دال روٹی پکالی تھی اور وہ مایوسی کے عالم میں بیٹھی ہوئی غیر یقینی مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ کلو آتے ہی بولی۔

"رابعہ بی بی! کافی روپے اور ڈھیروں سامان مجھے مل گیا ہے اب میں اپنے گھر چلی جاؤں گی۔"

رابعہ سوچ کی گہرائی سے اُبھرتی ہوئی بولی۔

"جاؤ! خدا حافظ"

"بی بی! میں نے تم سے کئی بار کہا لیکن تم گھر سے نکلتی نہیں ہو۔ اگر تم دو تین دن میرے ساتھ چلتیں تو تمہیں بھی اچھی کمائی کرادیتی۔ یہ سہالک کے دن ہوتے ہیں جو پلک جھپکتے ہی گزر جاتے ہیں۔"

"تمہیں مبارک رہے، میں نے کبھی ہاتھ نہیں پھیلایا کلو!"

اسی دوران میں ایک آواز آئی۔

"رابعہ بی بی! ستیش بابو نے پانچ سو روپے بھجوائے ہیں اور وہ عید کے دن آئیں گے"

یہ ستیش کا نوکر تھا جو روپے دے کر واپس جا رہا تھا۔ ●●

USE
PHILIPS
&
BONUS
LUNGIES
لاکھوں کی پسندیدہ
KHIZAR & CO.
Bonus
HANDLOOM TEXTILES
PHILIPS
فلپس مارکہ اور بونس مارکہ
لنگیاں استعمال کیجیے
KHIZAR & CO.
RABINDRA SARANI,
CALCUTTA-700 073

ستارے چمک رہے ہیں

اقبال حسن آزاد
شاہ کالونی
شاہ زبیر روڈ
مونگیر 811201

مدرسے سے بچوں کے زور زور سے پڑھنے کی آوازیں آرہی تھیں ۔ اس کے کان اندر سے آتی ہوئی آوازوں پر لگے تھے اور وہ بے خیالی میں اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو جنبش دے رہا تھا ۔ اس کے دائیں ہاتھ میں مانو پوری دنیا تھی ۔ گول گول سی ۔ پورے چاند جیسی ۔ دراصل اس کے ہاتھ میں ایک روٹی تھی ، پوری کی پوری ۔ بائیں ہاتھ کی پشت سے ناک پونچھتے ہوئے اس نے روٹی کے ایک سرے کو دانتوں سے کاٹا اور پھر اسے مزے لے لے کر چبانے لگا گویا زندگی کا سارا رس اس کی زبان پر سمٹ آیا ہو ۔ روٹی حالانکہ سوکھ چلی تھی پھر بھی اس کے لئے ضروری تھی ۔ کیونکہ آج صبح اٹھنے کے بعد اسے یہ پہلی شئے میسر آئی تھی جسے وہ اپنے سوکھے اور پچکے ہوئے پیٹ میں ڈالنے میں کامیاب ہو سکا تھا ۔ وہ مدرسے کی دیوار سے لگ کر بیٹھا تھا ۔ اندر بچے جو کچھ بھی پڑھتے وہ بھی ان الفاظ کو دہراتا رہتا اور اس طرح گویا وہ بھی ان پڑھنے والے بچوں میں شامل تھا اور پھر روز کی طرح مدرسے میں چھٹی ہو گئی ۔ سارے بچے اس طرح نکل کر بھاگے گویا جیل سے رہائی ملی ہو ۔ وہ ان دوڑتے بھاگتے بچوں کو دیکھتا رہا اور ہنستا رہا ۔ جب سب بچے چلے گئے تو اس کا دھیان پھر اپنے ہاتھ میں دبی روٹی کی جانب چلا گیا ۔ اس نے پھر ایک ٹکڑا دانتوں سے کاٹا ۔ وہ ایک ڈھیلی ڈھالی ہاف پینٹ اور پھٹی پرانی میلی کچیلی سی بش شرٹ پہنے ہوئے تھا ۔ نوالہ چباتے چباتے اس کی نظر سامنے بیٹھے کتے پر پڑی ۔ اس کے منھ میں بھی ایک روٹی تھی جسے وہ تیزی کے ساتھ نگلنے میں مشغول تھا اپنی تھوتھنی کو دو تین بار دائیں بائیں جھٹکنے کے بعد وہ پوری روٹی حلق سے اتارنے میں کامیاب ہو گیا ۔ اس کے بعد اس نے اپنی لمبی زبان نکال کر ہونٹوں پر پھیری گویا ناشتہ ختم کرنے کے بعد اس کی آسودگی کو محسوس کر رہا ہو ۔ کتے کو اس طرح روٹی نگلتے دیکھ کر وہ اپنی روٹی کھانا بھول گیا اور بڑی دلچسپ نظروں سے اسے دیکھنے لگا ۔ کتا اپنی روٹی ختم کرنے کے بعد دم ہلاتا ہوا اس کے پاس آکھڑا ہوا اور اس کی روٹی پر نظریں جماکر " کوں کوں " کرنے لگا ۔ اس نے زمین پر جھک کر ایک چھوٹا سا ڈھیلا اٹھایا اور اسے کتے پر دے مارا ۔ کتا دم دبا کر بھاگ کھڑا ہوا ۔ اس نے بچی کچی روٹی سمیٹ کر اپنے منھ میں ٹھونسی اور بے فکری سے چلتا ہوا اپنے گھر کی جانب بڑھ چلا ۔ اس کا گھر مٹی اور گارے کا بنا ہوا تھا ۔ کھپریل کی چھت تھی اور ایک بڑا سا آنگن اور دو طرف دالان تھے ۔ دالان کے کونے میں ایک گھڑا رکھا رہتا تھا اور اس کے اوپر المونیم کا ایک ٹیڑھا میڑھا گلاس اوندھا دھرا رہتا تھا ۔ اس نے گلاس سیدھا کر کے اسے گھڑے کے اندر ڈبایا اور پھر پانی بھرے گلاس کو منھ سے لگاکر غٹاغٹ پینے لگا ۔ پانی پی چکنے کے بعد اس نے ایک آدھی ادھوری ڈکار لی اور ایک ہاتھ سے منھ پونچھتے ہوئے اور دوسرے سے گری جارہی پینٹ کو سنبھالتے ہوئے طاق کی جانب بڑھا ۔ طاق پر پاؤڈر کا ایک پرانا ڈبہ رکھا تھا جسے وہ کوڑے پر سے اٹھا لایا تھا ۔ اس ڈبے میں وہ گولیاں رکھا کرتا تھا ۔ ڈبے سے گولیاں نکالتے وقت اس کی نظر طاق کے ایک کونے میں پڑی کتاب اور سلیٹ پر چلی گئی ۔ یہ کتاب اور سلیٹ اس کی منجھلی بہن کی تھی جو اس سے عمر میں دو تین سال بڑی تھی ۔ وہ اپنی چیزیں بہت سنبھال کر رکھتی تھی ۔ آج سے لگ بھگ سال بھر پہلے اس کے باپ نے یہ دونوں چیزیں اسے لاکر دی تھیں ۔ وہ رشید صاحب کے یہاں کام کیا کرتی تھی ۔ کام کرنے کے ساتھ ساتھ وہ رشید صاحب کی بیگم سے پڑھا بھی کرتی تھی ۔ مگر سال بھر میں وہ چند صفحات کی اس کتاب کو ختم نہیں

کر سکی تھی ۔ ویسے یہ پڑھائی لکھائی تو ایک بہانہ تھا اس کے باپ کو تو ان بیس روپیوں سے غرض تھی جو ہر ماہ اسے تنخواہ کے طور پر ملتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک وقت کا ناشتہ بھی ۔ اس وقت اپنی بہن کی کتاب اور سلیٹ دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں ۔ اس کی بہن کبھی بھی اسے اپنی کتاب اور سلیٹ چھونے نہیں دیتی تھی ۔ البتہ جب کبھی وہ کتاب کھول کر اپنا سبق زور زور سے دہراتی تو وہ غور سے سنا کرتا ۔ اس کی بہن تو بار بار رٹنے کے باوجود اپنا سبق بھول جاتی تھی مگر اسے پورا سبق یاد ہو گیا تھا اور جب کبھی اس کی بہن پڑھتے پڑھتے اٹکتی تو وہ دور بیٹھا لقمہ دے دیتا ۔ اس کی بہن چڑ جاتی اور اسے مارنے کو دوڑتی ۔ وہ بھاگ کر اپنی ماں کے پیچھے چھپ جاتا ۔ مگر اس وقت آس پاس بہن نظر نہیں آرہی تھی ۔ اس نے گولیاں ڈبے میں واپس رکھ کر کتاب اٹھالی ۔

" کھبردار جو میری کتاب کو چھوا تو " پتہ نہیں وہ کہاں سے ٹپک پڑی تھی ۔ اس نے جھٹ اس کے ہاتھ سے کتاب چھین لی ۔ وہ کھسیا کر اسے منہ چڑانے لگا ۔ اس کی بہن نے اسے مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو وہ دوڑ کر اپنی ماں کے پاس چلا گیا ۔ اس کی ماں دالان کے ایک کرے میں بیٹھی بیڑی کے پتے کاٹ رہی تھی ۔ پاس ہی اس کا سب سے چھوٹا بھائی دنیا میں اپنے آنے کا ماتم کر رہا تھا ۔ پاس پڑی کھٹیا پر اس کی دادی کھانس رہی تھی اور اس کی سب سے بڑی بہن بجھے ہوئے چولہے سے راکھ نکالنے میں مشغول تھی ۔ اس کا باپ اپنا رکشہ لے کر بچوں کو اسکول پہنچانے گیا ہوا تھا ۔ دونوں کو لڑتا دیکھ کر ماں وہیں سے چلائی ۔

" کا کر رہا ہے ؟ دن بھر ادھر ادھر بورا تا رہتا ہے ۔ پڑھنا لکھنا ساڑھے بائیس " ۔ وہ ٹھٹھک کر رک گیا ۔

پڑھنا لکھنا ؟ کیسا پڑھنا لکھنا ! اس کے پاس نہ تو کتاب ہی ہے نہ سلیٹ اور نہ پنسل ۔ نہ ہی وہ کسی مدرسے میں جاتا ہے ۔ وہ تو جب کبھی اس کی بہن زور زور سے اپنا سبق یاد کرتی ہے تو وہ بس سنا کرتا ہے ۔ یا رب ، دل دے ، سن لے ، مت ڈر ، چپ رہ ۔ یا پھر کبھی میدان میں کھیلتے کھیلتے وہ کسی لکڑی سے زمین پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے لگتا ہے جیسی آڑی ترچھی اس کی اور اس کے گھر والوں کی زندگیاں تھیں ۔ کبھی کبھی اپنے باپ کے رکشے پر اسکول جاتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر اس کا دل بھی مچل اٹھتا ۔

" ابا ابا میں بھی پڑھوں گا ، میں بھی اسکول جاؤں گا " ۔ اور اس کا باپ ایک بے معنی سی ہنسی ہنس دیتا ۔ اسے یاد آتا کہ اس کے دل میں بھی پڑھنے لکھنے کا ارمان تھا مگر وہ کبھی بھی اسکول نہ جاسکا ۔ اس نے اپنے بڑے بیٹے کو پڑھانا چاہا مگر جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا ، زندگی اور اس کی ضرورتوں کو سمجھتا گیا ویسے ویسے اس کا دل پڑھائی لکھائی سے اچاٹ ہوتا گیا اور آخر ایک دن وہ کلکتہ چلا گیا جہاں اب وہ مزدوری کرتا ہے ۔ اسے پتہ تھا کہ اس لڑکے کے پیر بھی ایک دن رکشہ کے پیڈل پر جائیں گے یا اس کے ہاتھ بیڑی کے پتوں میں الجھ جائیں گے یا پھر اینٹ پتھر ڈھونے کا کام کرنے لگیں گے اس لئے جب تک اس کا معصوم بچپن آزاد تھا وہ اسے جی بھر کے کھیلنے کودنے کے مواقع دینا چاہتا تھا ۔ بعد میں پھر یہ سب کہاں ......

" سن ! آج وکیل صاحب کے یہاں سے کھانا آئے گا ۔ ان کی اماں کی برسی ہے آج ۔ " ماں کی آواز سن کر وہ خیالوں کی دنیا سے لوٹ آیا ۔ اچھا تو اسی لئے آج گھر میں چولہا نہیں جلا ہے ۔ لیکن ابھی تو دوپہر ہونے میں کافی دیر ہے ۔ اس نے پھر اپنی گولیاں نکالیں اور انہیں پینٹ کی جیب میں رکھ کر باہر نکل کھڑا ہوا ۔ میدان میں کئی لڑکے کھیل رہے تھے وہ بھی ان میں جا شامل ہوا ۔ کافی دیر تک وہ گولیاں کھیلتا رہا مگر نہ جانے کیوں کھیل میں اس کا دل نہیں لگا ۔ آدھے ادھورے من سے ، دوسرے بچوں کو کھیلتا دیکھ وہ بھی ان میں شامل ہو گیا تھا مگر جلد ہی اکتا گیا ۔ کھیل چھوڑ کر وہ گھر جانے کے لئے کھڑا ہوا تو پتہ نہیں کہاں سے کسی پھٹی ہوئی کتاب کا ایک ورق ہوا میں کٹی پتنگ کی طرح ڈولتا ہوا اس کے پیروں میں آکر لپٹ گیا ۔ اس نے جھک کر وہ کاغذ اٹھایا ۔ اس پر چند تصویریں بنی ہوئی تھیں ، گائے ، بندر اور بھالو کی ۔ اور ان کے بغل میں کچھ لکھا ہوا تھا ۔ وہ سمجھ گیا کہ ان تصویروں کے سامنے جو کچھ بھی لکھا ہوا ہے وہ ان جانوروں کے نام ہیں ۔ وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور پھر ایک لکڑی کی مدد سے کاغذ پر چھپے ہوئے حروف کو زمین پر اتارنے کی کوشش کرنے لگا ۔ وہاں کی مٹی صاف تھی اور قدرے نم بھی ۔ اس نے اس سوکھی لکڑی سے اس نم مٹی کو زرخیز کرنا شروع کیا ۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ کاغذ پر چھپے ہوئے حروف کو زمین پر جوں کا توں اتارنے میں کامیاب ہو گیا ۔ اپنی اس کامیابی پر وہ دل ہی دل میں مسکرا اٹھا ۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مختلف زاویوں سے اپنے ہاتھ کی لکھی تحریر کو دیکھنے لگا ۔ وہ اپنے اس عمل میں اس قدر مگن تھا کہ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب اس کا دوست فرزو اس کے پاس آکھڑا ہوا تھا ۔ اس کی نظر فرزو پر پڑی تو وہ چہک کر بول پڑا ۔

" دیکھو ! یہ میں نے لکھا ہے ۔ " مگر فرزو کو ان باتوں سے کوئی

دلچسپی نہ تھی۔ اس نے یونہی اس کے کارنامے پر ایک نظر ڈالی اور پھر پچھلی شام ٹی۔ وی پر دکھائی گئی فلم کے متعلق باتیں کرنے لگا۔ یوں تو اڑوس پڑوس کے کئی گھروں میں ٹی۔ وی سیٹ موجود تھے مگر کوئی بھی ان لڑکوں کو اپنے گھر میں ٹی۔ وی دیکھنے نہیں دیتا تھا۔ البتہ شمیم صاحب کی ٹی۔ وی ان کے ڈرائنگ روم میں تھی اور کھڑکی کے باہر سے اس پر جاری پروگرام کو کافی حد تک دیکھا جاسکتا تھا۔ جب کبھی ان کے گھر سے ٹی۔ وی کی آواز آتی تھی لڑکے ایک ساتھ ان کی کھڑکی سے چپک جاتے۔ ان میں کبھی کبھی آپس میں لڑائی بھی ہو جاتی۔ کبھی شمیم صاحب یا ان کی بیگم ڈانٹ کر ان لڑکوں کو بھگادیتیں۔ پھر بھی آدھا ادھورا پروگرام وہ لوگ دیکھ ہی لیتے تھے۔ فخرو سے بات کرتے اسے بھوک لگنے لگی تھی مگر دوپہر ہونے میں ابھی بھی دیر تھی۔ اچانک اس کی نظر مدرسے سے آتے ہوئے رکشے پر پڑی۔ رکشہ اس کا باپ چلا رہا تھا۔ اپنے نحیف و لاغر جسم کو وہ ایک بار دائیں، جھکاتا پھر بائیں۔ اور رکشہ کسی مریل ٹٹو کی طرح دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا۔ رکشے پر ڈاکٹر صاحب کا بیٹا عرفان بیٹھا تھا۔ لگتا ہے آج پھر عرفان کی ممی شاپنگ کرنے چلی گئی ہیں اور اس کے گھر میں تالا لگا ہوا ہے۔ جب کبھی عرفان کی ممی گھر نہیں ہوتیں اس کا باپ اسے لے کر اپنے گھر چلا آتا اور جب وہ واپس آجاتیں تو اپنے نوکر کو بھیج کر اسے بلوالیتیں۔ رکشہ قریب آیا تو وہ رکشے کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔ گھر کے قریب پہنچ کر اس کے باپ نے رکشہ روکا اور پھر عرفان کو گود میں اٹھا کر نیچے اتارا۔ کتنا اچھا لگتا ہے عرفان گول مٹول سا بھرا بھرا۔ اس نے جلدی سے اس کا بیگ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں تھام لیا اور عرفان اپنے ہونٹوں پر ایک مالکانہ مسکراہٹ لئے اس کے آگے آگے چلتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ دالان میں پڑے پلنگ پر عرفان بیٹھ گیا تو اس نے اس کا بیگ اس کے بغل میں رکھ دیا۔ عرفان نے اپنا بیگ کھول کر ٹفن باکس نکالا۔ ٹفن باکس دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ عرفان نے ٹفن باکس کھولا، اس میں ایک ادھ کھایا کیک و کریم بسکٹ اور ایک سالم مٹھائی رکھی تھی۔

"لے کھالے"۔ عرفان نے گویا اس کی سات پشتوں کو شرمندہ کرتے ہوئے کہا۔ پہلے تو وہ ہچکچایا مگر جب عرفان نے دوبارہ اسے کھانے کو کہا تو اس نے ایک ایک کر کے سبھی چیزیں اپنے پیٹ میں اتار لیں۔ اس نے گھڑے سے پانی نکال کر پیا اور پھر عرفان کے پاس آبیٹھا۔ عرفان نے اپنے بیگ سے ایک کاپی نکالی اور اسے دکھاتے ہوئے بولا۔

"دیکھ آج مجھے کاپی میں اسٹار ملا ہے"۔ اس نے دیکھا کہ پورے صفحے پر کچھ لکھا ہوا تھا اور اوپر سرخ قلم سے ایک ستارا بنا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کاپی چھونی چاہی تو عرفان نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔

"چھوؤ مت، پھٹ جائے گی تو ممی ماریں گی"۔ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ جیسے ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ کاپی پر ایک حسرت بھری نظر ڈالتے ہوئے اس نے دھیرے سے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ عرفان نے سلیقے سے پھر کاپی اپنے بیگ میں رکھ دی۔ اسے لگا جیسے بیگ کے اندر کتابیں اور کاپیاں نہ ہوں بلکہ چاند اور سورج بند ہوں اور وہ انہیں دیکھنے سے معذور ہے۔ کبھی کبھی اسے لگتا جیسے کوئی اس کے کانوں میں کہہ رہا ہو "پڑھ پڑھ"۔ وہ آواز کی سمت مڑ کر دیکھتا تو اسے روشنی کی ایک ہلکی سی کرن نظر آتی۔ اسے محسوس ہوتا جیسے وہ اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہو اور وہ روشنی اسے اپنی جانب بلا رہی ہے مگر اس کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوں اور وہ چاہ کر بھی اس روشنی تک نہیں پہنچ پا رہا ہو۔ اس کے خیالوں کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب اس کے باپ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"آج کھانا نہیں پکایا گیا؟"

"آج کھانا وکیل صاحب کے یہاں سے آئے گا"۔ اس کی ماں نے جواب دیا۔

"اچھا تب تک میں ایک دو سواری اور دیکھ لیتا ہوں"۔ اتنا کہہ کر وہ باہر نکل پڑا۔ پھر اس کے کانوں میں بڑی بہن کی آواز آئی۔

"میں چچی کے یہاں جارہی ہوں"۔

پھر اس نے اپنی دادی کی آواز سنی۔ وہ شاید کچھ کہہ رہی تھی۔ غالباً اسے بھوک لگی تھی۔ اس نے اپنی ماں کی جھلائی ہوئی آواز سنی۔

"جب آئے گا تو تم کو بھی ملے گا۔ بس اب چپ رہو"۔ اس کی دادی خاموش ہوگئی۔ اسی دوران ڈاکٹر صاحب کا نوکر آپہنچا۔

"چلئے عرفان بابو، آپ کی ممی مارکٹ سے آگئی ہیں"۔ اس نے عرفان کا بیگ اور واٹر بوتل سنبھال لیا۔ عرفان کے چلے جانے کے بعد اسے بڑا خالی خالی سا محسوس ہونے لگا۔ وہ وہیں پلنگ پر بیٹھا رہا۔ چند ثانیوں بعد اس کی ماں تام چینی کی دو بڑی رکابیاں اس کے پاس رکھ گئی۔

"دیکھ! میں بیڑی کا پتا لانے جارہی ہوں۔ جیسے ہی اذان ہووے کھانا لانے کے لئے چلے جیو"۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ماں اسی کی منجھلی بہن کو لے کر باہر نکل گئی۔ اس کی بہن نے اس کے چھوٹے بھائی کو

گود میں اٹھا رکھا تھا جو اب بھی بھوک سے چلائے جارہا تھا ۔ دادی بڑبڑاتے بڑبڑاتے غالباً غنودگی کے عالم میں چلی گئی تھی ۔ پورا گھر ایک بے نام سی خاموشی کی چادر میں لپٹ گیا ۔ اداسی کی ایک تیز لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی ۔ پلنگ پر بیٹھا بیٹھا وہ بے دلی سے ٹانگیں ہلاتا رہا تھا ۔ کافی دیر تک ، صبح چھ بجے جس وقت گلی کا نل کھلتا اس کی ماں اسے جھنجھوڑ کر جگا دیتی اور وہ آنکھیں ملتا ہوا پتیلی اٹھائے نل کی جانب بڑھ جاتا ۔ اس کا باپ رات کی بچی ہوئی روٹی کھا کر یا کبھی بغیر کھائے ہی رکشہ نکال کر بچوں کو اسکول پہنچانے کے لئے نکل پڑتا ۔ اس کی ماں بیڑی کے پتوں کو لے کر بیٹھ جاتی ۔ بڑی بہن گھر میں جھاڑو دیتی ۔ منجھلی اپنی کتاب اور سلیٹ بغل میں داب کر کام پر چلی جاتی جہاں کتاب اور سلیٹ ایک کونے میں رکھ کر وہ کام میں جٹ جاتی ۔ یہاں چھوٹا بھائی رونا شروع کر دیتا اور اس کی دادی اپنے پوپلے منھ سے اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگتی ۔ آج کی صبح بھی روز جیسی ہی تھی ۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آج جب وہ پانی بھرنے کے بعد گلی میں نکلا تو رفیق صاحب کی بیگم نے اسے ایک روٹی تھما دی تھی اور ایک روٹی گلی میں بیٹھے ہوئے کتے کی جانب اچھال دی تھی ۔ پہلے روٹی ، پھر کیک ، بسکٹ اور مٹھائی ۔ اسے اپنا پیٹ اور دنوں کی بہ نسبت بھرا بھرا سا محسوس ہوا ۔ ابھی اسے بھوک بھی نہیں لگ رہی تھی ۔ اس نے اپنے بدن کو اینٹھ کر ایک انگڑائی لینے کی کوشش کی تو اس کی نظر پھر کتاب اور سلیٹ سے جا ٹکرائی ۔ بڑا سنہری موقع تھا ۔ اس وقت گھر میں سوئی ہوئی دادی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا نہ باپ ، نہ ماں ، نہ بہن ۔ اس نے جھٹ طاق پر سے کتاب اٹھائی اور کتاب کا پہلا صفحہ کھولا ، ا ، ب ، ت ، ث ۔ یہ چار حروف تو وہ جانتا ہی تھا اس نے دھیرے دھیرے پڑھنا شروع کیا ۔ ا ، ب ، ت ، ث ۔ ا ، ب ، ت ، ث ۔ ایسے لگا جیسے حروف خوش ہو کر مسکرا رہے ہیں وہ بھی دھیرے سے مسکرا پڑا ۔ پھر اس نے شہادت کی انگلی باری باری سے ایک ایک حرف پر پھیری ۔ ا ، ب ، ت ، ث ، پھر دوسری بار ، پھر تیسری بار ۔ اسے لگا جیسے وہ بھی یہ سب کچھ لکھ سکتا ہے ۔ اس نے سلیٹ اٹھائی ، پہلے اسے اپنی ہتھیلی سے پونچھا اور پھر پنسل کو انگلیوں میں داب کر اس نے کتاب سے حروف نقل کرنے شروع کئے ۔ ا ، ب ، ت ، ث ۔ ایک بار ، دو بار ، تین بار ۔ پھر وہ جیسے سب کچھ بھول بیٹھا ، رکشہ کھینچتے ہوئے کمزور باپ کو ، بیڑی کے پتے کاٹتی ہوئی مرجھائے چہرے والی ماں کو ، لڑتے جھگڑتے بھائی بہنوں کو ، رات دن کھانستی دادی کو اور ہر وقت روتے ہوئے چھوٹے بھائی کو ، ساتھ ہی ساتھ اپنے دوستوں اور گولیوں کو بھی ۔ وہ بار بار سلیٹ پونچھتا اور نئے سرے سے لکھتا ۔ ا ، ب ، ت ، ث ۔ پتہ نہیں کب تک وہ تاریکی کی اس دبیز چادر کو چاک کرنے کی کوشش کرتا رہا اور پتہ نہیں کب تک وہ اپنے اس مقدس مشغلے میں غرق رہتا اگر اچانک اس کے کانوں میں ماں کی چلاتی ہوئی آواز نہ آتی ۔

" تے یہاں بیٹھا بیٹھا کا کر رہا ہے ؟ اذان کب کی ہو گئی ۔ بہرا ہو گیا ہے کا ؟ " اس کی آواز میں غصہ تھا ، جھنجھلاہٹ تھی ، کھانا نہ مل پانے کا ڈر تھا ، آشنا کا تھی ۔ پھر اس نے بڑی بے رحمی کے ساتھ اسے مارنا شروع کیا ۔ ساتھ ہی ساتھ وہ زور زور سے بولے جا رہی تھی ۔ اسی وقت اس کا باپ گھر میں داخل ہوا باپ کو دیکھ کر وہ تیزی سے دوڑتا ہوا اس کے قدموں سے لپٹ گیا ۔

" کا ہے لا مار رہی ہے ، کا بھیں ہے ؟ "

" پوچھو اسی سے ۔ بول کے گئی تھی کہ وکیل صاحب کے یہاں سے کھانا لے آئیو اور ای یہاں بیٹھا پڑھ رہا ہے ہو نہہ بڑا آیا پڑھنے والا "

اس کے باپ کی نظریں جھک گئیں ۔ غالباً وہ اپنے آنسو چھپا رہا تھا ۔ پھر اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا ۔ اس ننھے سے بچے نے سر اوپر اٹھایا ۔ بوڑھے اور کمزور باپ نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں بے شمار ستارے چمک رہے ہیں ۔

میں تھک چکی ہوں

تسلیم نیازی
عالم نگر، برنپور
آسنول ۷۱۳۳۲۵
(مغربی بنگال)

یاتو مجھ پر اسے ترس آیا تھا یا اس نے سوچا دوسرے کے آگے غم کا اظہار کر دینے سے جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ یا پھر وہ تھک چکا تھا جھوٹ بولنے کی سکت اس میں باقی نہ رہی تھی۔

وہ جھوٹ بڑی صفائی سے بولتا تھا۔ اس کے بال اتنے سفید نہ تھے جتنا اس کا جھوٹ۔ وہ کہتا تھا، اس نے شادی نہیں کی ہے تو صرف اس لئے کہ اس نے شادی نہیں کی ہے۔ اس کے خیال میں شادی کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ جس پر سنجیدگی سے سوچا جاتا۔

اتھلا دکھتا تھا لیکن اپنے اندر ہی اندر وہ بہت دور تک تھا۔ میں نے جب بھی اس کے اندر ڈوبنے کی کوشش کی مجھے اپنی سانسوں کی رسد کم پڑتی محسوس ہوئی اور تہہ کو چھونے سے پہلے ہی مجھے لوٹ آنا پڑا۔ حالانکہ چہرے پر جھریاں اُگ آنے کے موسم میں بھی اس کی آنکھوں میں چوپال کی چہل پہل تھی۔ کہانی بھی ہوگی۔ سو وہی آج انڈے سے چوزے کی طرح خود ہی نکل آئی!

"صاف صاف کہو، خط کہاں سے آیا ہے..... کس نے بھیجا ہے؟ پہیلیاں بوجھنے کا وقت میرے پاس نہیں ہے"۔ میں نے اسے خود ہی کھلتے دیکھا تو اپنے تجسس کو چھپائے رکھنا ہی بہتر سمجھا۔

"یہ خط میرے آبائی گاؤں سے آیا ہے۔ مکتوب نگار کا نام صبیحہ ہے"۔ اس کے منہ سے کسی لڑکی کا نام سن کر میرا تجسس کلبلانے لگا۔ "کیا لکھا ہے اس نے؟" میں نے اپنی مصنوعی بے پروائی برقرار رکھی۔

"وہ تمہیں بعد میں بتاؤں گا کہ مکتوب نگار سے میرے تعلقات کی نوعیت جانے بغیر اس کا نوشتہ تمہیں الجھن میں ڈال دے گا"۔ اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ لیکن مجھے لگا اس کی جھولی آج بھی خالی ہے اور اس نے بھیڑ اکٹھی کر کے دوائیاں بیچنے والا انداز اپنایا ہے۔ لیکن تب تک میرا تجسس پٹارے سے نکل کر پھن کاڑھ چکا تھا اور اس نے بھی بین بجانا شروع کر دیا تھا۔

"صبیحہ میری بھولی تھی۔ دبلی پتلی گوری چٹی سی ایک بے حد شوخ و طرار لڑکی۔ تمام تر معصومیتوں کے ساتھ میرا بچپن اس کی قربت میں گزرا تھا۔ اس واقعے سے میری ذہنی رغبت خواہ جو بھی رہی ہو لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک روز گڈے گڑیا کی شادی کے دوران میں نے اس سے کہا تھا "صبی، میں تجھ سے شادی کروں گا!" وہ مجھے کوستی ہوئی بھاگ گئی تھی۔

صبی تب اس دور سے گزر رہی تھی جب اس کے آگے جوانی تھی اور پیچھے لڑکپن۔ وہ اپنے بچپن سے زیادہ قریب تھی۔ پھر بھی انچاہے ڈھنگ سے کھنچی چلی جا رہی تھی، جوانی کی طرف بے چاری صبیحہ۔ ایک ایسی دنیا اسے آواز دے رہی تھی جہاں اس کی ساری شوخیاں، ساری معصومیتیں چھین لی جانے والی تھیں، اس کے پر کاٹ دیے جانے والے تھے پھر اسے اڑنے کا حق ملنے والا تھا۔

اپنے ابا کی جاں فشانیوں اور اماں کی پریشانیوں کا احساس اسے تھا بھی اور نہیں بھی تھا۔ کچی نیند میں اچانک آنکھ کھل جانے والی کیفیت میں مبتلا کسی شخص کی طرح تب صبیحہ نہ سوئی ہوئی تھی نہ جاگی ہوئی۔ وہ اپنے اندر باہر تیزی سے ظاہر ہوتی ہوئی تبدیلیوں پر حیرت زدہ بھی تھی اور پچھ کچھ

لڑکپن کی پونجی سے آسودہ بھی ۔ ماشہ بھر کی بے چاری صبی کو تولا بھر ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی ۔ لیکن ایسے والدین کو جن کے ہاں بیٹیاں تو ہوتی ہیں، انہیں لے دے کر بیاہنے کے وسائل نہیں ہوتے، رائی بھی پہاڑ سی دکھتی ہے ۔
صبیحہ کے والد پیشے سے حکیم تھے ۔ گاؤں میں سرکاری ہسپتال کے قیام کے بعد سے تو جیسے ان کی حکیمی ٹھپ ہی پڑ چکی تھی ۔ کھیتی بھی اتنی نہیں تھی کہ سالوں بھر کھایا جاسکتا ۔ اس پر پیراڈ سی کھڑی ایک پر ایک چار لڑکیاں ۔ تقدیر کی کھرل میں امید کی بوٹیاں کوٹتے کوٹتے تدبیر کے ہاتھوں میں آبلے پڑگئے ۔ ایسی حالت میں اگر انہوں نے اس کی بڑی بہن کی جگہ صبیحہ کا رشتہ طے کر لیا تو کیا برا کیا ۔ صبیحہ کا خوبصورت ہونا اس کے لئے بھلے ہی عذاب ہو مگر دیکھنے والیوں کے لئے جیسے وہ عنقا تھی ۔ بڑی بہن کو دیکھنے آئیں اور صبیحہ کو پسند کر لیا ۔ وہ اس در ناسفتہ کو کسی بھی قیمت پر حاصل کرنے کو تیار تھیں ۔ ٹوکنے والے اپنا سامنہ لے کر رہ گئے ۔ انہوں نے تو بھری محفل میں کہہ دیا کہ وہ اسے خود جوان کرلیں گی! اس کے علاوہ انہوں نے صبی کی بڑی بہن کی شادی کے پورے خرچ کا بیڑا بھی اٹھالیا تھا ۔
وقت میرے ساتھ زیادہ دنوں تک سنجیدہ نہ رہا ۔ ابھی میرے دودھ کے سارے دانت بھی نہ ٹوٹے تھے کہ اماں پر موت ٹوٹ پڑی ۔ چالیسویں سے پہلے ہی ابا نے دوسری شادی کرلی اور ایسے بدلے کہ ان کے رہتے میں یتیم ہوگیا ۔ چچازاد بھائیوں نے مجھے کلکتے میں ایک صاحب کے یہاں اس شرط پر رکھوادیا کہ میں گھر باہر کا کام کردیا کروں گا ۔ کھانے کے ساتھ پڑھائی کا خرچ بھی مل جائے گا ۔ صبی اپنے سسرال چلی گئی اور میں کلکتہ ۔ میں اپنی زندگی سنوارنے میں ایسا جٹا کہ گاؤں سے میرا رشتہ ہی ٹوٹ گیا" ۔
وہ یکایک خاموش ہوگیا ۔ شاید وہ برس کر کھل چکا تھا لیکن اس کی ہیروئن صبیحہ کے خط کے تناظر میں اس کی بات ابھی ادھوری ہی تھی ۔ میرے ٹوکنے سے پہلے ہی وہ پھر گویا ہوا ۔ صبی سے میری وابستگی بڑی عجیب رہی ۔ نہ میں نے کبھی اس کی کمی محسوس کی اور نہ کبھی اسے فراموش کرپایا ۔ اس کی بھولی صورت مجھے کبھی نہ بھولی ۔ ایک روز تو میرا یہ باؤلا پن انتہا پر پہنچ گیا ۔
ہارڈنگ پارک کے قریب ایک انجان لڑکی کو دیکھ کر میرے منہ سے بے ساختہ نکل پڑا ۔ "صبی"!
وہ ٹھٹھک گئی میں ایک دم سے سٹپٹا گیا ۔ شرمندگی کے احساس سے پسینہ آگیا ۔
"آپ نے مجھے پکارا؟" وہ میرے قریب آچکی تھی ۔ میں نے اسے بغور دیکھا ۔ بالکل صبی جیسی ہی تھی وہ ۔ وہ نقوش، وہ رنگ، وہی آواز!
"معاف کرنا مجھے غلط فہمی ہوگئی" ۔ میں نے اس سے معذرت چاہی ۔
پھر آپ نے صبی کہہ کر کیسے پکارا؟
ویسے میری ماں کا نام بھی صبی ہے ۔ وہ مجھے حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی ۔
تو کیا یہ لڑکی صبی کی بیٹی ہے! میں نے اپنے دل ہی میں کہا ۔
"تمہاری ماں ان دنوں کہاں ہے؟" میں نے اپنا شک دور کرلینا ضروری سمجھا ۔
"وہ سامنے والی بس میں" ۔ اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا ۔ میں مسحور سا اس کے پیچھے پیچھے چل دیا ۔ صبیحہ کی صباحت تقریباً ختم ہوچکی تھی ۔ وہ اتنی بدل چکی تھی کہ اسے پہچان پانا مشکل ہو رہا تھا ۔ اس کے کالے بال سفید ہو رہے تھے اور اس کے سرخی مائل گورے چہرے پر سیاہی چھا رہی تھی ۔ آنکھیں باڑھ کے پانی کی طرح گدلا گئی تھیں اور ہونٹ خشک پتے کی طرح بدرنگ ہوگئے تھے ۔
"میں شاداب ہوں" ۔ میں نے گفتگو میں پہل کی ۔
"ارے شاداب تم! اف! میں تمہیں پہچان بھی نہ پائی، اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ۔ میں بھی تمہیں پہچان نہ پاتا اگر اس نے میری مدد نہ کی ہوتی، میں نے اس کی بیٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو حیرت زدہ سی ہماری باتیں سن رہی تھی ۔
"یہ میری بیٹی عارفہ ہے ۔ تمہارے بچے بھی تو جوان ہوگئے ہوں گے ۔ اس نے جیسے میری دکھتی رگ کو دبادیا ۔
"میں نے شادی ہی نہیں کی ہے تو بچے کہاں سے آئے ۔ خیر چھوڑو تم آج کل کہاں ہو؟ میں نے اپنی طرف سے اس کا دھیان ہٹانے کی کوشش کی ۔
میری بات سن کر وہ سوچ میں ڈوب گئی ۔

"تم آج کل کہاں ہو ؟؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"آں، میں..... میں وہیں ہوں جہاں پہلے تھی۔ اپنے گاؤں میں، اس نے جیسے چونکتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم تو اپنی سسرال میں رہتی تھیں!" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ سسرال میں تو میں دو برس ہی رہی۔ عارفہ پیٹ ہی میں تھی کہ میں بیوہ ہو گئی۔ میرے سوتیلے بیٹوں کو اپنے بوڑھے باپ کی دوسری شادی پر اعتراض تو پہلے ہی سے تھا۔ ان کی موت کے بعد انہوں نے اپنے جذبات کا کھل کر اظہار کیا۔ مجھے سسرال کو خیرباد کہنا پڑا۔ ان کی جائیداد سے ہمیں ایک رتی بھی نہ ملی۔ مقدمے کا فیصلہ بھی ان ہی کے حق میں ہوا۔ ظالموں کو اس معصوم پر بھی ترس نہ آیا۔ وہ منہ ڈھانپ کر سسکنے لگی۔ مجھ پر تو جیسے ہتھوڑے برسنے لگے۔

"صبی!" میری چیخ نکل گئی۔ صبی نے زندگی کا سفر کتنی جلد طے کر لیا تھا۔ اس نے ہندوستانی عورت کے تقریباً سارے فرائض انجام دے دیئے تھے۔ شوہر کے گھر بھی رہی تھی، ماں بھی بنی تھی۔ اور بیوہ بھی ہو گئی تھی۔ وہ جیسے ایک انوکھے مقابلے میں شریک ہوئی تھی۔ اسے ایک تیز رفتار گاڑی کے پیچھے باندھ دیا گیا تھا اور سیٹی بجادی گئی تھی۔ اب اسے دوڑنا تھا یا گھسٹنا۔ وہ دوڑ رہی تھی اور دوڑ رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ کہہ دوں "صبی" مجھے اپنے غم میں شریک کر لو۔ مجھ سے شادی کر لو۔ میں تو جیسے آج تک تمہارا ہی منتظر ہوں۔ لیکن اتنا کہنے کی ہمت میں اپنے اندر مجتمع نہ کر سکا اور وہ ایک بار پھر مجھ سے چھوٹ گئی۔

گھر آکر اس کا دکھ مجھے کچھ زیادہ ہی تڑپانے لگا۔ آخر کار جب اس کے آنسوؤں سے خود کو لاتعلق رکھ پانا میرے لئے ناممکن ہو گیا تو میں نے اسے ایک خط لکھ بھیجا۔ جس میں میں نے بچپن کے اپنے اسی ایک وعدے کی تجدید کر دی۔ "صبی میں تجھ سے شادی کروں گا!"

اس کی پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے جھلملانے لگے۔ ان جھیلوں پر پرندے میں نے پہلی بار دیکھے تھے۔ بھرائی ہوئی آواز میں اس نے اپنے خط کا جواب بھی پڑھ کر سنا دیا۔

مورخہ : یکم جنوری ۱۹۹۴ء

استھانواں، نالندہ

بہار ۸۰۱۱۰۱

عزیزی شاداب   سلام و رحمت

تمہارا خط ملا   شکریہ!

مجھے یاد ہے یہ ایک جملہ تم نے مجھے تب بھی کہا تھا جب میں بالکل چھوٹی سی تھی اور آج اسی جملے کو تم نے لکھا بھی تو ایسے وقت میں جب میں بوڑھی ہو گئی ہوں!

بیس ۲۰ سال سے میں مسلسل دوڑ رہی ہوں۔ مجھ میں اب سکت باقی نہیں، میں تھک چلی ہوں، شاداب!

مجھے آرام مل جاتا اگر عارفہ کا ہاتھ تم تھام لیتے!

فقط

صبیحہ

ڈاکٹر سکندر صاحبہ سالم
(برطانیہ)

رشتوں کا تقدس

ریل بیس (۲۰) منٹ کی تاخیر سے آرہی تھی۔ پلیٹ فارم پر انسانی جسموں کا ہجوم تھا۔ ایک دوسرے سے ٹکراتے گرتے پڑتے ایسے چل رہے تھے جیسے چکی میں اناج کے دانے، ہجوم کی کثرت میں گرمی کی شدت سے بہنے والے پسینے کی بو سے اس کا جی متلا اُٹھا!

اچانک پلیٹ فارم پر ہلچل اور بھی بڑھ گئی۔ آنے والی ریل کے ساتھ ساتھ لوگ آگے کی طرف بھاگنے لگے۔

اس کی سیٹ درجہ اول ایرکنڈیشنڈ بوگی میں پہلے ہی بک تھی۔ قلی نے اس کا سامان رکھا۔ اس نے قلی کو دس کا نوٹ دے کر رخصت کیا۔ اپنا کوٹ اتار کر کھونٹی پر ٹانگا۔ اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے ٹائی کی گرفت کو گردن پر ڈھیلا کیا۔ ڈبہ میں وہ اکیلا تھا۔

ریل چل چکی تھی

ٹھنڈے کمرے میں گہرا سانس لیا۔ چند لمحوں کو سکون تو محسوس کیا لیکن جیل جیسی محصوری اور تنہائی اچھی نہ لگی۔ کھڑکی کھول کر سر باہر نکالا۔

صبح کے اُجالے میں حدِ نظر تک آسمان کی نیلاہٹ نکھر آئی تھی۔

دودھیا اور سرمئی بادل کے ٹکڑے اس نیلاہٹ کو اور حسین بنا رہے تھے۔

کتنا حسین ہے اس کے ملک کا آسمان! اس کا اپنا ملک جسے چھوڑے ہوئے اسے تہائی صدی گزر چکی تھی۔

آج تک اس حسن کا اندازہ ہی نہ کیا تھا!

پھر اسے سوکھی زمین پر بارش کے گرتے قطروں سے اٹھتی ہوئی سوندھی خوشبو کی یاد آگئی۔ وہ خوشبو جس سے برسوں محروم رہا تھا۔ تازہ صاف ہوا میں سانس لیا تو وہ اپنے دکھوں سے بے نیاز ہو گیا۔ وہ ناامیدی اور مایوسی دور ہوئی جو اس پر مسلط ہو چکی تھی۔

امید کی نئی کرن اس پر مسکرا دی!

گاڑی کی رفتار تیز ہو چکی تھی!

حدِ نظر تک پھیلی آسمان کی نیلاہٹ ابھرتی صبح کے سورج کے ساتھ ساتھ اور بھی نکھرتی جا رہی تھی۔ کسی تکنیکی خرابی کی وجہ سے ریل ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔

اس کو خیال آیا۔ حرکت، حرارت اور روشنی کی دنیا تو اپنی جگہ حقیقت ہے لیکن اس کے پار کیا ہے؟ گھپ اندھیرا! موت اور ویرانی؟ جہاں تخلیق قوت پھر خوشی کا کوئی پھول نہ کھلا سکے، کچھ اس کے دل کی طرح! لیکن اس کے دل میں تو کبھی کبھی امید کی کرن روشن ہو جاتی، کسی چھوٹے سے ٹوٹے ہوئے ستارے کی مانند...! جو خود شکستہ ہو کر اطراف کے گھپ اندھیرے کو کچھ دیر کے لئے روشن کر جائے۔

بے اختیار مسکرا دیا....!

گاڑی تیزی سے رواں تھی۔ کہاں جانا ہے؟ کہاں؟ ہے کوئی منزل؟

وہیں چلتے ہیں جہاں میرا گھر تھا۔ جہاں شاید آج بھی میری ماں دہکتے کوئلوں کو راکھ میں دبائے میرے لئے گرم روٹی بنا کر دینے کے لئے کھانے پر میرا انتظار کر رہی ہوگی؟ کچھ وقت گزارنے کا بہانہ تو ہو ہی جائے گا۔ روح میں زندگی کی لہر دوڑے نہ دوڑے جسم تو ہیجان سے سرائیت ہو کر زندگی کے ایک اور دن کو برداشت کرے گا۔

پھر نہ جانے کتنے ایسے ہی دن اسے یاد آگئے۔ ہارے دن جو تھک کر گزر جاتے اور شکست کا احساس چھوڑ جاتے۔ آخر وہ مقام آ ہی گیا جسے لوگ اس کا گھر کہتے ہیں۔ یہاں اس کو رکنا ہے ایک وقفے کے لئے ایک مقصد کے لئے۔

عجب سناٹا چھایا تھا ہر سو۔ صحن کے باہری حصہ میں بنے چولہے میں چند کوئلے جو بجھے تھے اور راکھ.... جو برسوں سے انتظار کرتے کرتے سرد ہو چکی تھی! اس کی نگاہیں ماں کے شفیق وجود کو تلاش کرتی ہوئی آخر کے بڑے کمرے تک پہنچ گئیں۔ کمرے میں نواڑ کے بنے پلنگ پر سفید شفاف چادر آج بھی بچھی تھی۔ اس پر کڑھے گلاب جیسے آج بھی تازہ تھے۔ اسے یاد آگیا اس کی ماں نے اپنے ہاتھوں سے کشیدہ کی تھی۔

ایک لمبی سرد آہ کی! ان دنوں کی گنتی میں وہ ہارے دن جو تھک کر گزر جاتے اور شکست کا احساس چھوڑ جاتے ایک اور دن کا اضافہ ہو گیا!

نڈھال وہ پلنگ پر ڈھیر ہو گیا۔

ماضی! اُف خدایا....! گزرے وقت کے پچھتاوے....

سب ہی کچھ تو یاد آگیا۔

تیس سال قبل تعلیم کے لئے، بہتر مستقبل کے لئے اس سے اس کا ملک، اس کا بچپن، بچپن کی معصومیت اور اس معصومیت کے ساتھی اس کی ماں اور باپ سب ہی کچھ تو چھڑوا کر اسے بھیج دیا گیا تھا۔ آگے سے روشنی لانے!

چلا گیا ماں کی دعائیں اور نصیحتوں کو ساتھ لے کر۔

سوچنے لگا۔ سنتا تھا ماں کی دعائیں تو رائیگاں نہیں جاتیں کبھی مقبولیت کے در سے نہیں ٹھکرائی جاتیں، پھر کیوں! پھر کیوں اس کے حق میں یہ دعائیں مقبول نہ ہو سکیں؟ اس کا یہ سفر آج تہائی صدی کے بعد بھی شکست خوردہ فوج کے سپاہی کی طرح کیوں ہے جس نے اپنا سب کچھ ہار دیا ہو۔

کیا اس نے اپنی کامیابیوں کے لئے کوشش نہ کی... کہاں غفلت ہوئی؟

اب اپنے آپ کو بے قصور اور مجبور محسوس کیا۔ کہنے لگا میرے لئے تو میرے گھر کے راستے مسدود کر دیئے گئے۔ وہ گھر جہاں میری ماں کا راج تھا۔ جس جنت میں میرے فرشتہ صفت بہن بھائی رہتے تھے۔ اس جنت کے صحن میں میرے والد نے ایک دیوار بنا دی جسے لوگ میری ماں سے اس کی سوکن کہتے تھے" میری ماں کا دل ٹوٹ گیا پھر بھی یہ صدمہ میری ماں نے تو برداشت کر لیا مگر مجھ سے یہ سہا نہ گیا۔ جب ہی طے کیا واپس اس اجڑے شہر تمنا میں نہ جاؤں گا۔

لیک بوجھ دل پہ لئے پھرتا رہا۔ جسم تو بھرپور جوانی کی طاقت سے تنا تھا پر دل پر تنہائی کا جو بوجھ تھا اٹھائے نہ اٹھتا تھا۔ تنہائی اور نا امیدی کے اندھیروں کو روشن کرنے کے لئے جلتے شعلوں کا سہارا لے گیا۔ اور پھر آج تک ان شعلوں کی لپیٹ سے نکل نہ پایا۔ اس گرداب میں پھنسا رہا جب تک نکال نہ دیا گیا۔ مغرب کا زہر اس طرح سرایت کر چکا تھا کہ کوئی تریاق کام نہ آیا! قانون نے بھی تو انصاف نہ کیا۔ اس کا اپنا خون... سب کچھ تو اس سے جدا ہو گیا۔

اسے ایسا لگا جیسے وہ ایسا پنچھی ہو جس کے بال و پر نوچ دیئے گئے ہوں۔ اچانک اس کے جسم میں اپنے بچھڑے بچوں کی یادیاں بن کے دوڑ گئیں۔ خیالوں میں اپنے بچے کے سر کو سینے کے قریب بھینچ لیا۔ پھر ایک کراہ کے ساتھ تخیل سے باہر آیا۔ یہ سب کیوں! میں تو اپنے سب رشتے، تمام بندھن توڑ کر آ گیا تھا۔ اب پھر اکیلا تھا کسی بھی رشتہ کی قید سے آزاد!

کاش ماں ہوتی۔ اس کی گود میں سر چھپا کر لیتے آنسو بہانا چاہتا تھا یہاں تک کہ دکھوں سے لٹے میلے دل کی کثافت چاندی کی سفیدی میں ڈھل جاتے۔ ماں کی گود میں سر رکھ کر زندگی کا سفر ختم کر دینا چاہتا تھا۔ بہت تھک چکا تھا! روزمرہ کی حریفانہ کشمکش کو مسکراہٹ اور خوش اخلاقی کے ڈھونگ سے آزاد کر دینا چاہتا تھا۔

پھر یاد آ گئے ایسے ہی کتنے اور دن جو ہیجان سے بھرے اور تھکے ہارے گزر جاتے اور دل کو بے چین چھوڑ جاتے

چھٹی کا دن تھا۔ طبیعت بوجھل تھی۔ سوچا سمندر کے ساحل پہ بنے شہر کے سب سے خوبصورت ہوٹل میں چل کر کافی پی جائے۔ ورانڈے میں کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ گرم گرم کافی منگا کر چسکیاں لینے لگا۔ گردشِ ایام میں پہلی بار ماضی اور حال سے بیگانہ... ہر تناؤ سے خالی!

اچانک ایک پانچ چھ سال کے بچے کی آواز کان میں آئی۔ امی ڈر لگ رہا ہے"

کس سے ڈرتے ہو بیٹا؟

سمندر کی لہروں سے امی

سمندر کی لہروں سے کیا ڈرنا! پھر میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔

اُسے یاد آ گئی ایک پرانی بات... ان دنوں کی جو بچپن کے ساتھ بیت گئے تھے مگر اسی وقت سے ایک ڈر اور نہ معلوم سے خوف اس کا اعتماد اور سکون کے گرد اندھیروں کا ہیولا کئے رہتے۔

پھر یاد آ گئی جاڑے کی اندھیری لمبی راتوں کی۔ جب ماں کو پکار کر کہتا۔ اندھیرے میں ڈر لگتا ہے ماں! تو وہ جواب دیتی... سو جاؤ بیٹا میں تمہارے پاس تو ہوں۔

یہ انجانے خوف اور ماں کے محافظ وجود کا مبہم تصور بچپن ہی سے اس کے تخیل کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا آ رہا تھا۔ ایک خوبصورت اور معصومیت کا ہیولا ذہن میں اُبھرا... معصومیت اور ممتا کا پیکر!

سمندر کی لہروں سے کیا ڈرنا اور پھر میں جو تمہارے ساتھ ہوں بیٹا! آواز کی کشش اور لہجہ کے اعتماد نے اس کے تخیل کو گھیر لیا۔ بیتابی سے اٹھا، نظر دوڑائی۔ وہاں اب کوئی نہ تھا۔ آ کر کرسی پر ڈھیر ہو گیا!

کس کا انتظار ہے اب مجھے!

اور پھر میں تو زندگی کی بخشی محرومیوں کو اس ابدی زندگی کے عوض دینے کا وعدہ کر چکا ہوں جو ویسے تو وقت معین پر اٹل ہے۔ مگر میں انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ حق جو خالق حقیقی کو حاصل ہے تخلیق کو مٹا دینے کا میں منت و سماجت سے دعاؤں سے اور پھر بھی نہیں تو چند سکوں کے عوض حاصل کر ہی لونگا۔ ابدی سکون کے لئے۔ آخر ان گنت چھوٹے چھوٹے ستارے بھی تو ٹوٹ جاتے ہیں۔ بس ذرا سی روشنی دکھا کر آسمانوں میں تحلیل ہو جاتے ہیں بے نشان منزل کی طرف! پھر میری کیا حیثیت ہے اس لامحدود کائنات میں!

ناشتہ کی خواہش فنا کے منصوبوں پر غالب آ گئی۔ وہ کھانے کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ بیرے کو ناشتہ کا حکم دے کر صبح کا اخبار دیکھنے لگا۔ چند قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ایک پانچ چھ سال کے بچے کے ساتھ وہی دلکش آواز تھی۔ نظریں اٹھیں۔ ایک پیکر تھا حسن کا۔ اس مشرقی حسن کے نور سے اس کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ پھر نجانے کتنے مانوس اور حسین چہرے کھوتے ہوئے بچپن کے ارمان۔ سب ہی تو یاد آنے لگا اور اس کے تخیل میں پھول ہی پھول کھل اٹھے، سفید، گلابی اور کاسنی پھول....!

سوچنے لگا یہ سحر تھا یا اس کے درخشاں مستقبل کی پیش گوئی؟

بچے نے سنترے کے رس کا گلاس ختم کرتے ہوئے کہا "امی اب نہانے چلیں نا سمندر میں" "ہاں چلو" کہتی ہوئی بچے کا ہاتھ تھام کر وہ اٹھی اور چلی گئی!

بلاوجہ اس نے اپنے اندر اداسی محسوس کی۔ سوچنے لگا خیالوں کی یہ انجانی راہیں ایسی پگڈنڈی کی طرف نہ لے جائے جس کی تعبیر بھی تنہائی ہو۔

باہر برآمدے میں غیر معمولی حرکت اور ملی جلی گھبرائی سی آوازیں آرہی تھیں۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو لوگ ساحل کی طرف دوڑ رہے تھے۔ یہ بھی جلدی سے ادھر چلا گیا۔ وہی بیکر خیال تھی۔ دیوانگی سے ہر آنے والے سے کہتی تھی "آپ کو تیرنا آتا ہے؟ میرے بچے کو سمندر سے نکال لیجئے سمندر کی لہروں میں پھنس گیا ہے۔"

تیزی سے سمندر میں کود گیا۔ کافی جدوجہد کے بعد بچے کو نکال لایا۔ بچہ بیہوش تھا۔ ہوٹل کی گاڑی میں بیہوش بچے کو دونوں اسپتال لے کر چلے گئے۔ سارے راستے کوئی بات نہ ہوئی سوائے تسلی اور امید کے چند الفاظ کے! اور پھر اس کو احساس ہوا ایک جذبہ کا... یہ محبت تو نہ تھی مگر اس سے مشابہ کوئی جذبہ نہ تھا۔ بچے کو ہوش آچکا تھا۔ بچے کی پیشانی کو چومتے ہوئے کہنے لگی "آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں گی؟ آج آپ نہ ہوتے تو کیا ہوتا؟"

سوچا یہ لمحہ تحلیل ہو گیا اور کون جانے پھر کبھی تشکیل پائے یا نہ پائے۔ قریب آکر بولا۔ وجود کا کوئی ایسا حصہ بھی ہے جسے تکمیل کے لئے کسی دوسرے کی ضرورت ہوتی ہے اور جب تک وہ حصہ اُسے مل نہ جائے وجود اس کی جستجو میں بھٹکتا رہتا ہے۔

چونک کر اس کو دیکھا اور بولی۔ سچ کہا! ہے تو کوئی حصہ؟ پھر دونوں مسکرا دیئے۔ شگفتہ شعاعوں نے غیریت کی خنکی کو کچھ دور کر دیا۔ پھر ایک نے دوسرے کو دیکھا۔ تعلق کے چھپے احساس نے دلوں میں چھائے اندھیروں کو روشنی میں تحلیل کر کے لبوں سے مشتہر کر دیا۔

پھر ملنے کا وعدہ کر کے وہ چلا گیا...!

راستہ بھر سوچتا رہا۔ کیا تھا اس سراپے میں جو میری بھٹکتی تمنا کو تسکین دے سکے کچھ بھی تو نہیں؟ زندگی کی کون سی محرومی کس آس کے سہارے اس عورت سے متمنی تھی کہ اس کی طبیعت کی بے چینی کو قرار سے بدل دے!

اگلے روز سمندر کے کنارے بنے شاپنگ مال میں وہ وقت گزارنے کو چلا گیا۔ ہر خیال سے خالی نظر آئی وہ۔ پھولوں کی دکان میں داخل ہو رہی تھی۔ غیر اختیاری جذبے نے اسے بھی وہاں جانے پر اکسایا۔ ایک پھولوں کی ٹوکری خرید کر مڑی تو اس نے ہاتھ سے ٹوکری لے لی! کہنے لگی، یہ تو میں اٹھا ہی سکتی ہوں۔ مسکرائی اور دونوں آگے بڑھ گئے۔

مسکراہٹ ایسی جو یقین کو سمت دلا کر محکم کر دے۔

تنہائی نہ معلوم کس شخص کو قریب لائی تھی اسے نے اکسایا! کہنے لگا چلئے سامنے مصنوعی جھیل پہ بنے ریستوران میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ دونوں کھڑکی کے پاس والی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ہلکی بارش کے قطرے مصنوعی جھیل کے ٹھہرے پانی میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ کہنے لگی۔ بڑی خوبصورت جگہ چنی ہے۔

خاموشی سے گلدان سے ایک کلی نکالی اور اس کے بالوں میں لگا دی وہ مسکرائی، جھیل کے پانی میں ڈوبتے سورج کا عکس آگ سی بھڑکا رہا تھا۔ بولی۔ پھولوں کی قربت ہو تو چین سا آجاتا ہے ورنہ زندگی ایسی جیسے سنگت سے خالی بنا بینا کے تار! اجڑے رشتے! بازاروں میں دوش بدوش چلتے راہی! کبھی محرم بھی ہوتے ہیں؟

کہنے لگا۔ انسان تنہا ہے اس وقت تک جب تک کسی کی مدد پر آمادہ نہ ہو جائے۔

بولی۔ پھولوں سے محبت ہے آپ کو؟

چہرے پر تناؤ اور لہجہ میں تلخی لا کر بولا۔ روحانی خوشی سے اس کا کیا تعلق؟

لمحہ بھر چپ رہی پھر بولی۔ میرے نزدیک خوشی بالادستی نہیں غیر مشروط محبت ہے۔ پھر نہ جانے کب وہ اٹھی اور چلی گئی۔

کچھ دیر جانے والی کے لفظوں میں ڈوبا رہا۔ پھر شرمندہ سا ہوا اس پست زندگی کی ذلت پر جس نے غیر اخلاقی جواز ڈھونڈنے پر اکسایا تھا۔

دونوں متمنی تھے ان جذبوں کے جو روحانی ادراک سے اجاگر ہو جاتے ہیں۔

سوچتا رہا کیا مشترک احساسات پائیدار رشتوں کی ضمانت ہو سکتے ہیں۔

پائیدار رشتوں کا تقدس تو جسمانی تصرّف کی کیفیت سے بہت اعلیٰ ہے۔

سوچنے لگا کیا حقیقت ایک بار پھر زندگی کو خواب دکھاتی ہے۔ محبت کا ایک اٹوٹ روحانی رشتہ منسلک زندگی کی اعلیٰ قدروں سے تصور پر چھا گیا۔

ذہن سے ایک بوجھ اتر گیا۔ خوشبو مہکی۔ وہ اٹھا اور اس طرف مڑ گیا جہاں وہ رہتی تھی۔

●●

بقیہ: آپ کی ڈاک ...

بھدی اور وسیم مینائی شاہجہاں پوری نے منظم سازش کے تحت اس قسم کا اقدام اٹھایا ہے۔ اس سے قبل ناز قادری صاحب کے سسرالی بھائی صفدر امام صاحب نے صلاح الدین پرویز کے ناول Identity Card پر انعام ملنے کی مخالفت میں ایک کتاب لکھ دی جس میں گوپی چند نارنگ کی ادبی سیاست پر بھرپور وار کیا گیا ہے۔ پورے تاریخی شواہد کے ساتھ اس کتاب میں ایسے راز بھی شامل ہیں جن تک عام لوگوں کی رسائی ممکن نہیں۔ بہرحال تحقیق کا معاملہ ہے۔ اس سلسلے میں قمر رئیس صاحب کو بدنام نہیں کیا جا سکتا۔

سید احتشام الدین، مونگیر

ہر قدم کا رہنما.........
آرام کی سچّی پہچان
۶ ماہ کی گارنٹی۔
ہماری دوسری پیش کش:
• جنتا فوم
• جنتا ہوائی
JRI
تیار کردہ:
جنتا ربر انڈسٹریز
کلکتہ - ۴۶ ۷۰۰۰
نیلے رنگ میں بھی دستیاب ہے

انشائیہ

تمنا مظفر پوری
گودارو ملس، گیا ۸۲۴۱۱۸

"لفظ "میں" واحد متکلم ہے اور اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ سامنے والے کے مقابلے سامنے آچکا ہے۔ اس لفظ کے ادا کرنے میں تکبر اور غرور کی جھلک ملتی ہے۔ اگر مخاطب سے بات کرتے وقت آپ بار بار "میں" کا استعمال کرتے ہیں تو یہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ آپ اپنی اہمیت جتاتے ہوئے مقابل پر چھا جانے کی کوشش کر رہے ہیں اور اسے ہیچ سمجھتے ہیں اور خود کو ہمہ دان سمجھتے ہیں لیکن یہی لفظ "میں" طنز و مزاح نگاروں کے نزدیک انکساری عاجزی بلکہ بیوقوفی کی علامت ہے۔

طنز و مزاح نگار جب لفظ "میں" لے کر اپنی بات شروع کرتا ہے تو وہ خود کو بیوقوف اور احمق بنا کر فرد اور سماج کی برائیوں اور غلطیوں کو اجاگر کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے وہ اپنے کو احمق بیوقوف تک بنا لیتا ہے۔ پھر اس کی حماقت سے اور اس کی نگارش سے قاری خوش ہوتا ہے، تعریف کرتا ہے۔ اگر قاری کے دماغ شریف میں یہ بات آجائے کہ لفظ "میں" کا مخاطب صیغۂ حاضر میں قاری ہے تو اس کی تمام خوشی زائل ہو جائے اور وہ صاحب نگارش پر ڈنڈے لے کر ٹوٹ پڑے لیکن وہ کبھی ایسا نہیں سمجھ سکتا کیونکہ طنز و مزاح نگار کا لفظ "میں" چاشنی میں ڈوبا ہوتا ہے جس سے قاری کو احساس بھی نہیں ہوتا اور وہ کڑوی گولیاں طنز و مزاح کے ہاتھوں چپ چاپ خوشی خوشی کھا لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کڑوی سے کڑوی اور سخت سے سخت بات کہہ دینے کے باوجود طنز و مزاح نگار کو جوابی کارروائی سے بچنے کے لئے کسی ڈھال کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ "میں" ہی ڈھال کا کام کرتا ہے۔ اگر مخاطب کو "میں" کے میٹھے میں گالیاں بھی دے دیتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے، واہ واہ کرتا ہے اور تحسین آمیز جملے سے نوازتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک مشہور و معروف طنز و مزاح نگار ایک ایسی پگڈنڈی سے جا رہا تھا جو ایک مقام پر تنگ تھی اور صرف ایک آدمی ہی وہاں سے ایک وقت میں گزر سکتا تھا۔ اس مقام پر دوسری جانب سے ایک بد دماغ شخص بھی آپہنچا۔ اب معاملہ یہ تھا کہ کسی ایک کو پگڈنڈی کی مینڈھ سے نیچے اترنا ضروری تھا تاکہ دوسرے کو آگے بڑھنے کے لئے راستہ مل سکے۔ طنز و مزاح نگار سے دوسرے شخص کی نظر ملی تو اس نے "میں" کے غرور میں کہا۔

"میں کسی بیوقوف کے لئے راستے سے نہیں ہٹتا۔"

"لیکن میں تو ہٹا کرتا ہوں" طنز و مزاح نگار نے بڑی سادگی سے جواب دیتے ہوئے پگڈنڈی کی مینڈھ سے نیچے اتر کر جگہ دے دی۔

یہاں پر "میں" کا تکبر اور بیوقوف کون ہے۔ یہ بات صاف ہو جاتی ہے۔

طنز و مزاح ایک عجیب صنف ہے۔ کوئی نئی تخلیق شائع ہوئی اور لوگ تعریف پر اتر آئے حالانکہ طنز و مزاح نگار تعریف کے قابل نہیں ہوتا بلکہ ملامت کے قابل ہوتا ہے کیونکہ وہ فرد اور سماج کی کمزوریاں اور برائیاں ہی پیش کرتا ہے جو "میں" کی چاشنی میں ڈوبے رہنے کی وجہ سے قاری سمجھ نہیں پاتا۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ قاری کو اس کی کہی بات سمجھ میں نہیں آتی ورنہ وہ تخلیق کار کے سر پر سوار ہو جاتا اور داد کے بدلے بیداد سے نوازتا ہے لیکن جب کبھی طنزیہ و مزاحیہ نگارش قاری کی سمجھ میں آجاتی ہے تو منہ بسور لیتا ہے اور تلملا جاتا ہے۔

اس تمہید کے بعد میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ بھی یہی کچھ مشکلیں پیش آتی رہتی ہیں کیونکہ میرے قاری ذہین اور ذی حس ہیں لہٰذا ادھر میری تخلیق شائع ہوئی ادھر میرے دشمن پیدا ہونے لگتے ہیں۔ ان کا اور میرا مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ سامنا مجھے نہ صرف اپنے قاری سے کرنا پڑتا ہے بلکہ بسا اوقات اپنے گھر والوں سے بھی۔ کبھی اپنی بیگم صاحبہ کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو کبھی میرے بچے گھبرا کر میرے تخلیقی عمل پر خجل ہوتے ہیں۔ بیگم صاحبہ محسوس کرتی ہیں کہ ان کی کمزوریاں اور غلطیاں بر سر عام کرتا ہوں جسے پڑھ کر پڑوسن اور رشتہ دار ان کا مذاق اڑا سکتی ہیں۔ بچے خجل ہوتے ہیں کہ ان کے دوست و احباب کیا سوچیں گے کہ وہ انہی طنز و مزاح نگار کے لڑکے ہیں جن کے گھر کا فلاں واقعہ شائع ہوا ہے جو بڑا ہی مضحکہ خیز یا نازیبا ہے حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔ طنز و مزاح نگار صرف اپنے گھر کی بات نہیں لکھتا وہ اپنے گھر کے پردے میں سماج اور دوسرے لوگوں کی بات لکھتا ہے۔

میں نے ایک مضمون "گھر سے لیڈر تک" میں لکھا تھا کہ "طنز و مزاح نگاری دشمنی مول لینے کے مترادف ہے"۔ اس مضمون میں اپنے تجربے اور مشاہدے کے حوالے سے میں نے عام لوگوں اور عورتوں کے عادات و اطوار کا ذکر کیا تھا اور مثال پیش کی تھی لیکن مضمون کی اشاعت کے ساتھ ہی پریشانیاں مجھے گھیر کر کھڑی ہو گئیں۔ چچی، خالہ، بھائی، بہن، رشتہ دار اور محلے کے لوگ مجھ سے ناراض ہو گئے۔ ہر شخص اسی ایک مضمون کو پڑھ کر یہ سمجھنے لگا کہ میں نے ان کے خلاف مہم چلائی ہے۔ ان کی برائیوں کا بھانڈا پھوڑا ہے۔ حالانکہ ان میں ایک بھی واقعہ میرے علم میں ان لوگوں سے تعلق نہیں رکھتا تھا بلکہ عام بات کو میں نے قلم بند کیا تھا۔

ایک بار میں نے عورتوں کی نفسیات پر ایک مضمون "بیگم کا گھریلو بجٹ" لکھا۔ مضمون شائع ہوا تو قارئین نے سمجھا کہ یہ میرے گھر کی بات ہے اور خوب چٹخارے لیتے۔ کچھ عورتوں نے خوش ہو کر پڑھا اور میری بیگم کی فضول خرچی کا مذاق اڑایا۔ پاکٹ کا مضمون شائع ہوا تو لوگوں نے یہ سمجھا کہ میری بیوی پاکٹ کی صفائی میں ماہر ہے جبکہ میری جیب خود خالی رہتی ہے

ماہنامہ انشاء کلکتہ

ایک ہی واقعہ میرے گھر سے تعلق نہیں رکھتا تھا صرف دوسروں کے عتاب سے بچنے کے لئے خود پر لے لیا تھا۔ ایسے کلمات جو کبھی میرے گھر سے تعلق نہیں رکھتے پھر بھی بیگم صاحبہ اسے پڑھ کر مجھ سے ناراض ہو جاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ میں ان پر غلط الزام لگایا کرتا ہوں اور دوسروں کو خوش کرنے کے لئے خواہ مخواہ ہمیں بدنام کرتا ہوں۔

یہاں تو لفظ 'میں' سے جہاں تکبر اور غرور کا احساس ہوتا ہے وہاں یہ ہم طنز و مزاح نگاروں کے لئے ایک بہترین ڈھال ہے۔ ساتھ ہی انکساری، عاجزی اور اکثر بیوقوفی کی علامت بھی ہے۔ ہم طنز و مزاح نگار اس کی آڑ لے کر بڑے سے بڑا کام نکال لیتے ہیں۔ جو بات کھل کر نہیں کہہ سکتے 'میں' کی آڑ میں آسانی سے کہہ دیتے ہیں۔

جب کوئی مزاحیہ شاعر مائیک پر آتا ہے تو سامعین اس کا تخلص سن کر اور اسے دیکھ کر ہنس پڑتے ہیں حالانکہ اس کا چہرہ مضحکہ خیز نہیں ہوتا۔ جب مزاحیہ شاعر اپنا کلام سناتا ہے تو لوگ خوب محظوظ ہوتے ہیں ادھر وہ مسکین صورت بنا کر 'میں' کی آڑ میں یعنی اپنی بیوی کی شہ زوری کا قصہ بیان کرتا ہے تو سامعین خوب داد دیتے ہیں۔ زور زور سے قہقہہ لگاتے ہیں۔ حالانکہ شاعر کے کلام کا مرکزی کردار صرف بیوی ہوتی ہے جو کسی کی بھی ہو سکتی ہے۔ مزاحیہ شاعر اپنے کلام میں سماج اور فرد کی برائیوں کا ذکر کرتا ہے جو دراصل مزاح نہیں ایک طمانچہ ہوتا ہے۔

میں کی آڑ میں دوسروں کو برا یا بیوقوف کہنے کا ایک اور واقعہ سن لیجئے۔

ایک بھانڈ جو اپنی مضحکہ خیز حرکتوں اور جملہ بازیوں سے لوگوں کو خوش کرتا تھا اور روزی روٹی کماتا تھا۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ وہ ایک کنجوس رئیس کے ہاں پہنچا۔ اپنے مضحکہ خیز کارنامے سے اس نے رئیس اور اس کے مصاحبوں کو خوش کر دیا۔ جاڑے کا زمانہ تھا۔ رئیس نے خوش ہو کر اسے ایک پرانا کمبل انعام میں بخشا لیکن بھانڈ صرف ایک پرانے کمبل پر خوش نہ ہوا۔ اس کا ایک ساتھی کمبل کو الٹ پلٹ کر غور سے دیکھنے لگا۔ اس طرح الٹ پلٹ کر دیکھنے پر اس کے دوسرے ساتھی نے پوچھا۔ "ارے کیا دیکھ رہا ہے؟"

پہلے نے جواب دیا۔ اس میں ایک جگہ پر نواب حیدر علی خاں لکھا ہے جبکہ سرکار کا نام نصیر حیدر علی خاں ہے۔ لفظ نصیر کہاں ہے ڈھونڈ رہا ہوں"۔ اتنا سنا تھا کہ دوسرا بھانڈ بھڑک کر بولا: "ارے بیوقوف وہ اس کمبل میں کہاں ملے گا۔ یہ تو ان کے پر دادا حضور کا نام ہے یہ کمبل ان کا ہی تبرک ہے"۔

یہاں پر بھانڈ نے اپنے ساتھی کو بیوقوف بنایا تھا مگر دراصل یہ اس رئیس پر برجستہ چوٹ تھی کہ اس نے بہت ہی پرانا اور بوسیدہ کمبل بخشش میں دیا ہے۔

ہاں تو جناب میں لفظ 'میں' کا ذکر کرتے کرتے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ دراصل یہ لفظ 'میں' ہے ہی بڑے کام کا۔ لوگ اس کی بھول بھلیاں میں کھو جاتے ہیں۔ لیکن جناب میں مزید 'میں' کی تعریف کرنا نہیں چاہتا ورنہ آپ کہیں گے۔ یہ کیا 'میں میں' کی رٹ لگا رکھی ہے اور پتہ نہیں اس 'میں' میں کون سی بات آپ کے خلاف پڑ جائے۔

فارم نمبر ۴

۱۔ مقام اشاعت: کلکتہ

۲۔ وقفہ اشاعت: ماہنامہ

۳۔ پرنٹر: ف۔ س۔ اعجاز

• قومیت: ہندوستانی

• پتہ: ۶/اے کنائی سیل اسٹریٹ کلکتہ ۷۳

۴۔ پبلشر: ف۔ س۔ اعجاز

• قومیت: ہندوستانی

• پتہ: ۲۵ بی زکریا اسٹریٹ کلکتہ ۷۳

۵۔ ایڈیٹر: ف۔ س۔ اعجاز

• قومیت: ہندوستانی

• پتہ: ۲۵ بی زکریا اسٹریٹ کلکتہ ۷۳

۶۔ ساجھیدار: (کوئی نہیں) واحد ملکیت۔ میں ف۔ س۔ اعجاز

اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست اور صحیح ہیں۔ دستخط: ف۔ س۔ اعجاز

مقصود الٰہی شیخ
کے خوبصورت افسانوں کے تین مجموعے
وطن کی زبان میں ہم وطنوں کے مسائل، خاکِ وطن کی جھلکیاں۔ کہنہ مشق عکّاسِ وطن کے
قلم سے تھری ڈائمنشنل لفظی منظر کاری۔
اردو افسانہ نگاری کی روایت میں پیش رفت اور وقت کے تقاضوں کے مُطابق نکھار۔
”اردو کے افسانہ نگاروں میں ... آدھوں کو اردو نہیں آتی جبکہ مقصود الٰہی شیخ کو
اس زبان پر پورا عبور حاصل ہے جس میں وہ کہانی لکھتے ہیں۔“ احمد ندیم قاسمی
پتھر کا جگر
(تیسرا ایڈیشن)
ماہنامہ افکار کراچی نے لکھا ”زندگی کے تضاد پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ تخلیق اور کربِ تخلیق سے آگاہ ہیں۔“
احمد ندیم قاسمی نے لکھا ”مقصود الٰہی شیخ نے کہانی سنانے کے فن میں اپنی طرف سے چند اضافے بھی کئے ہیں۔“
PRICE £3.95
Plus Postage & Packing £1.00
برف کے آنسو (دوسرا ایڈیشن)
آگے بگولے افسانے
”مشاہدات کے نئے نئے خیابانوں تجربات کی سرزمینوں، حوالوں کے بادلوں اور احساسات کے گہرے سمندروں کی طرف“ (سید ضمیر جعفری)
”اس فن میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ کہانیاں بہت کامیاب اور خوبصورت ہیں“ (بانو قدسیہ)
PRICE £4.50
Plus Postage & Packing £1.00
جھوٹ بولتی آنکھیں
”مقصود الٰہی شیخ کے اندر ایک بڑا افسانہ نگار چھپا بیٹھا ہے“
صہبا لکھنوی
مجموعے کی ہر کہانی مُنفرد
اچھوتی اور دل کے تاروں کو چھوتی ہے۔
PRICE £3.95
Plus Postage & Packing £1.00
Order all three for ONLY £9.95 plus Postage and Packing £1.50
uthor's Gift to the Newspaper : All proceeds to help improve "Ravi" Newsweekly.
RAVI NEWSPAPERS LTD,
BRADFORD

ایڈز کے مہلک مرض سے بچنا آپ کے اختیار میں ہے

خبردار! ہوشیار!! اس سے دور رہیں۔ یہ آپ کو اور آپ کے بچے کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے اس موذی کا نام ہے ایڈز۔

ایڈز اس صدی کا صحت کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا ہے جو نہایت تیزی سے پوری دنیا میں پھیل رہا ہے۔ دیگر کسی بھی مرض کا پھیلاؤ کبھی بھی اس قدر برق رفتاری کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ اب تک ۱۴ ملین افراد اس مرض کے شکار ہو کر موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔ یومیہ ۵۰۰۰۰ افراد اس کے مریض بنتے ہیں۔ صحارا سے منسلک افریقہ کے علاقے اور جنوب مشرقی ایشیاء میں اس کے مریضوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

ایڈز کا کوئی علاج نہیں لیکن اس سے بچا ضرور جا سکتا ہے۔ اس کے انفکشن کا پھیلاؤ روکنے کی اہم ترین اور موثر حکمت عملی ہے عوام کو اس کی تفصیلات سے آگاہ کرنا تاکہ مزاج میں ایسی مثبت تبدیلیاں پیدا ہو سکیں کہ لوگ جنسی بے راہ روی سے دور رہیں اور خطرات سے بچیں۔ ایڈز کے مریضوں کی پریشانیوں پر روشنی ڈالنے سے بہتر یہ ہے کہ ہم اس مرض سے متعلق معلومات میں اضافہ کریں۔ یہ بات زیادہ سود مند ہوگی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایڈز کیا ہے؟ ایڈز ایک نپٹنے والی بیماری ہے جو ایچ آئی وی نامی وائرس سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سے جسم میں بیماریوں سے مدافعت کی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، ہمارے خون میں سفید اور سرخ رنگ کے خلیات موجود ہیں۔ عام حالات میں جب جراثیم ہمارے خون میں داخل ہوتے یا داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو سفید خلیات ان کا مقابلہ کرتے اور انہیں ہلاک کر دیتے ہیں لیکن ایچ آئی وی خون میں داخل ہو کر سفید خلیات کو تباہ کر دیتے ہیں جس سے قوت مدافعت ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے جیسے سفید خلیات مارے جاتے ہیں جسم کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔

ہر وہ فرد جس کے جسم میں ایڈز کا وائرس موجود ہے وہ دوسروں کو اس کا شکار بنا سکتا ہے۔ یہ اس صورت میں پھیلتا ہے جب متاثر شخص کا خون مادہ منویہ یا رحم سے خارج ہونے والا مادہ کسی صحتمند انسان کے خون یا جسمانی خلیات سے ملتا ہے۔ جنسی اختلاط کی صورت میں جب ایک پارٹنر اس کا شکار ہو تو دوسرا پارٹنر اس اختلاط کی وجہ سے ایڈز کا شکار ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ ایڈز کے مریض کے خون کسی دوسرے شخص کے جسم میں ڈالنے سے یا اس کی شکار ماں سے بچے تک پھیلتا ہے۔ زہریلی سوئیاں یا دیگر آلات بھی ایچ آئی وی وائرس پھیلانے کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔

ایڈز کے وائرس سے کیسے بچا جائے؟ یہ غلط تصور عام ہو گیا ہے کہ ایڈز کے مریضوں کا سماجی بائیکاٹ کیا جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایڈز کے جراثیم ہاتھ ملانے، ایک ساتھ رہنے، ساتھ میں کھیلنے یا یکجا کھانے سے نہیں پھیلتے ہیں۔ نہ ہی یہ ہوا، پانی، اشیائے خوردنی، کیڑے مکوڑے یا مچھروں کے کاٹنے، یا برتنوں، پیالوں، فرنیچروں کے ذریعہ پھیلتے ہیں۔

انسدادی اقدامات - جنسی اختلاط صرف اپنے شوہر، بیوی یا ایک ایسے پارٹنر کے ساتھ کریں جس کے جسم میں ایچ آئی وی وائرس نہ ہو۔ اگر یہ پتہ ہو کہ آپ کا پارٹنر ایڈز کا مریض ہے تو ربڑ کی مانع حمل تھیلی (کنڈوم) کا استعمال کریں۔ پیشہ ور عورتوں یا ان کے ساتھ اختلاط رکھنے والوں سے جنسی ملاپ نہ پیدا کریں۔ انجکشن اس وقت تک نہ لیں جب تک یہ بات یقینی نہ ہو جائے کہ آلات کو نتھار لیا گیا ہے۔ اس بات کو یقینی بنائیں کہ ختنہ یا دیگر آپریشن کے لئے آلات کو ابال لیا گیا ہو یا انہیں نتھار اگیا ہو۔

کیا رحم مادر سے ایڈز پھیلتا ہے؟ جی ہاں، وضع حمل یا ولادت کے دوران ماں کے جسم سے ایڈز کا مرض بچے میں منتقل ہو سکتا ہے۔ جب کسی عورت کو پتہ یا شبہ ہو کہ اسے ایڈز ہے تو اسے حاملہ ہونے سے گریز کرنا چاہیے۔ علاوہ ازیں ماں کے دودھ میں بھی تھوڑی مقدار میں ایچ آئی وی وائرس پایا گیا لیکن اس ذریعہ سے بچے تک اس موذی مرض کے پہونچنے کا امکان کم ہے۔ ماؤں کو چاہیے کہ وہ بچوں کو اپنا دودھ پلائیں کیونکہ اس سے بچے دیگر امراض سے محفوظ رہتے ہیں۔

بالغ افراد میں ایڈز کی طبی علامتیں کیا ہوتی ہیں؟ اس کی بڑی علامتوں میں جسمانی وزن دس فیصد سے کم ہو جانا، ایک ماہ سے زائد عرصہ تک شدید قسم کا ڈائریا اور ایک ماہ سے زائد عرصہ تک متواتر بخار کا رہنا شامل ہیں۔ دیگر علامتیں یہ ہیں: ایک ماہ سے زائد عرصہ تک متواتر کھانسی ہونا،

بقیہ ص ۲۹ پر

فلم ساز، آر کے۔

نفاست فی الذات

بھارت بھوشن

راج کپور ہندوستانی فلمی صنعت کے بلاشبہ سب سے بڑے قابلِ پذیرائی منتظم اور نفاست فی الذات قسم کے فلم ساز تھے۔ "آر کے" ان کی شناخت تھا اور اس کے تحت نہ صرف یہ کہ انہوں نے اپنی فلمیں بنائیں اور ان میں کام کیا بلکہ وہ خود ان کی کٹر یونٹ بھی کرتے تھے تاکہ مکمل طور پر ایک بے عیب فلم نمائش کے لئے تیار ہوسکے۔ وہ موسیقی کے دل دادہ تھے اور خود بھی ایک ہمہ پہلو گلوکار تھے اور بغیر کسی دقت کے وہ کسی بھی ساز کو بجا سکتے تھے۔ اسی سے اس بات کی صراحت ہوتی ہے کہ ان کی فلموں میں کیوں قبول عام کی سند حاصل کرنے والی موسیقی کا رچاؤ ہوا کرتا تھا۔

تاہم ہدایت کار آر کے کا سب سے بڑا اثاثہ اداکار آر کے تھا۔ یہ اداکار' ہدایت کار کے ذہن کا راز دار تھا۔ اس لئے وہ ہدایت کار کی سوچ کو بہت پر اثر انداز میں اپنی اداکاری سے پردۂ سیمیں پر پیش کرتا تھا اور اس میں ہدایت کار کی سوچ کی تمام تر تفصیلات کا بھرپور عکس ہوا کرتا تھا۔ مثال کے طور پر میرا نام جوکر میں' جو عظیم سوانحی شاہ کار تھا' ہدایت کار آر کے نے فلم کے پہلے سین کی تشکیل ایک خوبصورت اور انوکھے انداز میں کی۔ سین اس طرح تھا۔

راج کپور سرکس کے سٹیج پر دوسرے مسخروں کے ساتھ ایک مسخرے کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ یکایک دوسرے مسخرے اس پر جھپٹ پڑتے ہیں اور انہیں ایک عارضی قسم کے آپریشن ٹیبل پر لٹا دیتے ہیں۔ اور ایک دوسرا مسخرا جو ڈاکٹر کا کردار ادا کرتا ہے' ان کے دل کی جراحی کرتا ہے کیونکہ ہمارا ہیرو بیماری دل میں مبتلا پایا جاتا ہے۔ مرض کی صحیح تشخیص کرنے کے لئے ڈاکٹر ان کا دل ہی باہر نکالتا ہے۔ ڈاکٹر کو یہ دل بہت بڑا دکھائی دیتا ہے۔ نہ صرف اتنا ہی بلکہ دل مزید پھیلتا جا رہا ہے اور اس قدر کہ ڈاکٹر کو محسوس ہوتا ہے کہ پھیلتے پھیلتے ایک دن وہ اتنا بڑا ہو جائے گا کہ پوری دنیا اس میں سما جائے گی۔ دیکھتے دیکھتے یہ دل غبارے کی طرح اڑنا شروع ہوجاتا ہے اور پھر سرکس کے خیمے کی چھت کو جا لگتا ہے جہاں اس میں چھید ہوجاتا ہے اور وہ نیچے کی طرف آنا شروع ہوجاتا ہے۔ جلد ہی زمین پر گرکر یہ دل چھتڑے چھتڑے ہو جاتا ہے۔ یہ ڈاکٹر اور اس کے ساتھیوں کی پریشانی کا سبب بن جاتا ہے۔ انہیں یہی سمجھ نہیں آتا کہ مریض کے ساتھ انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ ڈاکٹر دم بخود ہے۔ ایسے میں بیمار آر کے" آپریشن ٹیبل سے اچھل کر نیچے آجاتا ہے اور ڈاکٹر سے جو اپنے پاجامے

میرا نام جوکر

ایک رومانی منظر فلم شری 420 سے
'جس دیش میں گنگا بہتی ہے' کا ایک معصوم دیہاتی

تصاویر: جیس ایڈ بیور

فلم آوارہ کا ایک رومانی منظر۔ بشکریہ: جیمس اینڈ نیولز
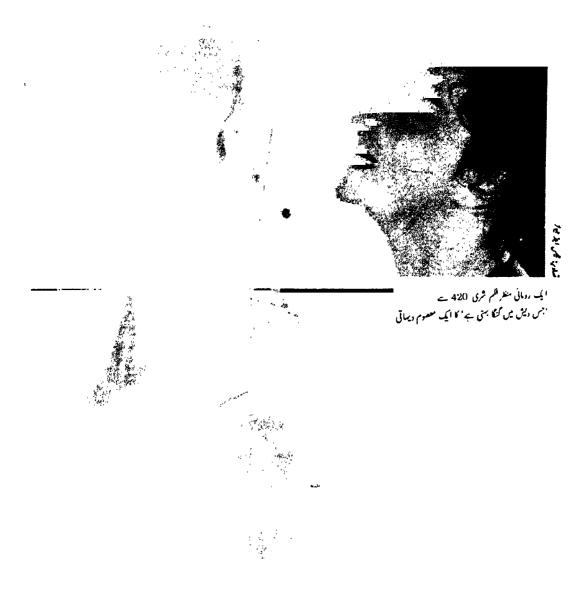
میں سکڑا ہوا ہے' سوال کرتا ہے کہ وہ اسے اس کا دل لوٹائے۔ ڈاکٹر سے کوئی جواب نہ پاکر وہ ناظرین سے مخاطب ہوتا ہے۔"

اس مقام پر آکر ہدایت کار مسخرہ پن دہا یکدستی کے ساتھ فلم کے مجموعی پلاٹ کا نصہ بنانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ پھر ناظرین کی پہلی صف کو جس میں تین ایسی خواتین بھی ہوتی ہیں' جو ایک یا دوسرے وقت پر اس کی زندگی میں آئی ہوتی ہیں' مخاطب کرکے ہمارا مریض ہیرو' اپنے دل کی واپسی کا سوال کرتا ہے۔ وہ ان میں سے ہر خاتون سے سوال کرتا ہے کہ کہیں اس نے اس کا دل تو نہیں لیا ہے۔ اس سوال کے بہ ظاہر معنی کے علاوہ اس کا ایک تمثیلی تناظر بھی ہے۔ ان میں سے کسی سے کوئی جواب نہ پاکر وہ اپنے دل کے مرے ہوئے ٹکڑوں میں جھانکنے لگتا ہے۔

پہلی شکل جو دل کے ان ٹکڑوں میں ابھرتی ہے' وہ اس کے اسکول کی استانی کی ہے جس نے اسے ایام طفولیت میں راہ دکھائی تھی۔ اور اِس طرح فلم اس پس منظر میں شروع ہوجاتی ہے۔

یہ پورا منظر نہایت باریک بینی کے ساتھ سوچا گیا تھا' یہ اداکار راج کپور ہی تھے جنہوں نے ایک عاشق دل شکستہ کی دکھ بھری داستان پُرتاثر انداز میں اپنی بے پناہ اداکاری سے سامعین تک پہنچا کر میدان مار لیا۔

تاہم یہ عمدہ فلم سینما کے شائقین کا دل موہ نہیں سکی اور باکس آفس پر ناکام ثابت ہوئی۔ اس کے دو سبب تھے۔ ایک یہ کہ پانچ گھنٹے تک چلنے والی یہ فلم بہت طویل تھی اور ناظرین میں اتنا صبر نہیں تھا کہ وہ سینما ہال کے اندھیرے میں پانچ گھنٹے تک بیٹھے رہیں۔ دوسرا یہ کہ ناظرین ایک رحم طلب ہیرو سے ناخوش ہو رہے تھے۔ ہیرو کا رحم طلب ہونا آر کے فلموں کا ہمیشہ بنیادی تصور رہا ہے۔ ناظرین بہت وقت تک اپنے ہیرو کو ختم نہ ہونے والی تکالیف اٹھاتے دیکھنے کے روا دار نہیں تھے۔ نتیجہ: "میرا نام جوکر" ایک ناقابلِ تلافی نقصان ثابت ہوئی۔ راج کپور جنہوں نے وہ سب کچھ اس فلم کے داؤ پر لگایا تھا جو ان کے پاس تھا' دل برداشتہ ہوگئے۔ لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ کوئی کم درجے کا انسان ان حالات میں جن سے راج کپور دو چار ہوئے' ٹوٹ کر رہ جاتا۔ لیکن راج کپور راج کپور تھے۔ وہ بدلے کی بھاؤ تاکے ساتھ شد و مد سے "بوبی" لے کر آئے۔ بوبی تیرھویں سے انیسویں سال تک

کے بچوں کی محبت کی کہانی ہے۔ یہ فلم اپنے وقت کی سب سے زیادہ پسندیدہ اور تجارتی اعتبار سے کامیاب فلم ثابت ہوئی۔ راج کپور واپس قابل ذکر فلم سازوں کی فہرست میں آگئے۔ اس کے بعد انہوں نے "رام تیری گنگا میلی" بنائی۔ اس فلم کا مرکزی خیال یہ دکھانا تھا کہ شہروں میں پلے لوگ کیسے معصوم پہاڑی لوگوں کو ورغلا کر مقدس گنگا کو اپوتر کرتے ہیں۔ اس فلم نے بھی روپیہ بنانے کا ریکارڈ توڑ دیا اور اسے بھی بے حد پسند کیا گیا۔

راج کپور بلاشک و شبہ ایک ماہر فن تھے، جنہیں سینما کے میڈیم کا پورا پورا ادراک تھا۔

ہندوستانی سینما کے فروغ میں ان کی زندگی بھر کی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے راج کپور کو 1987ء کے دادا صاحب پھالکے انعام سے سرفراز کیا۔ جب مئی 1988ء میں انہیں اس انعام سے نوازنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں، راج کپور بہت علیل تھے۔ دمہ کے مرض نے انہیں بے حال کیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے آڈی ٹوریم میں صدر جمہوریہ ہند سے انعام حاصل کرنے آسکے۔

چونکہ راج کپور ڈائس پر آنے کے لئے چند زینے بھی چڑھنے کی حالت میں نہیں تھے، اس لئے سابقہ صدر جمہوریہ، آر وینکٹا رامن نے اپنے بڑے پن کا ثبوت دیتے ہوئے اور تمام ضوابطِ مدارات کو نظر انداز کرتے ہوئے خود ڈائس سے نیچے آکر راج کپور کو ان کی نشست میں بیٹھے بیٹھے انعام سے نوازا۔ اس کے فوراً بعد وہ پھر کبھی نہ اٹھنے کے لئے ڈھیر ہوگئے۔ انہیں آڈی ٹوریم سے ہسپتال لے جانا پڑا اور کچھ دنوں بعد جب ڈاکٹر بے بسی کے ساتھ ان پر نظر رکھے ہوئے تھے، انہوں نے آخری سانس لیا۔

لیکن راج کپور مرے نہیں۔ کیوں کہ راج کپور جیسے فنکار مرتے نہیں۔ وہ حصارِ وقت کے قیدی نہیں ہوتے۔ وہ ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔

راج کپور راشٹرپتی آر وینکٹ رامن سے دادا صاحب پھالکے ایوارڈ لیتے ہوئے۔

دادا صاحب پھالکے ایوارڈ لینے کے فوراً بعد راج کپور ایسے ڈھیر ہوئے کہ پھر کبھی اٹھ نہیں پائے۔

ایس۔ کے۔ شا

بشکریہ "ہندوستانی ناظر"

عشق، انا، مخمور سعیدی

کیول سوری
۲۴۱۷ کوچہ نبگش
دریا گنج
نئی دلی ۔ ۱۱۰۰۰۲

[مخمور سعیدی کی شاعری کے کئی پہلو ہیں ۔ فاضل مصنف نے اس مضمون میں صرف ایک پہلو اجاگر کیا ہے ۔
مدیر]

اپنے نئے شعری مجموعہ "دیوار و در کے درمیان" میں اپنا مختصر سا تعارف کراتے ہوئے مخمور سعیدی نے لکھا ہے ۔

" عملی زندگی میں اکثر میں نے خسارے کے سودے کئے ہیں لیکن اس پر میں کبھی پچھتایا نہیں" ۔ مجھے یہ پڑھ کر واقعی حیرت ہوئی کہ جس مخمور سعیدی کو کم و بیش پینتیس برس سے میں جانتا ہوں اس نے اپنی شخصیت کو idealise کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ، وہ ایک سیدھے سادے عام آدمی کی طرح اپنے فیصلوں کی کامرانیوں پر خوش ہوتا رہا ہے اور غلط فیصلوں کے نتائج پر کڑھتا بھی رہا ہے پچھتاتا بھی رہا ہے ۔ ہواؤں میں اڑنا نہ اس کی زندگی نے سیکھا ہے اور نہ اس کی شاعری نے ۔ زمین سے ان دونوں کا رشتہ بے حد گہرا اور اٹوٹ ہے ۔ اور میرے نزدیک یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے ۔ پچھتاوے سے بے نیاز ہونے کا دعویٰ کرتے وقت وہ شاید بھول گیا کہ عام لوگوں کی نسبت شاعر اور ادیب کے لئے مبالغہ آرائی سے کام لینا اتنا آسان نہیں ہوتا کہ سچائی تک پہنچنے کے لئے قاری کو تگ و دو نہیں کرنی پڑتی کیونکہ اس کی اپنی تخلیقات ہی اسے بے لباس کر دیتی ہیں ۔ ثبوت کے طور پر میں مخمور کے متعدد اشعار کا حوالہ دے سکتا ہوں لیکن یہاں میں صرف "دیوار و در کے درمیان" ہی پر اکتفا کروں گا ۔

خلا میں ڈوبتی سی آہٹیں تھیں کچھ جنہیں ہم نے
سفر میں ساتھ رکھا ، منزلوں کا آسرا جانا

تم کہ مقروض لمحے لمحے کے
کسی لمحے کا قرض اتارا بھی ؟

اس مجموعے میں شامل دو نظمیں "ایک فریب خوردہ کردار کا دکھ" اور "چڑیا" ایک ایماندار اور حساس انسان کی اوڑھی ہوئی ندامت اور بے بنیاد پچھتاوے کی نشاندہی کرتی ہیں ۔ پہلی نظم کا آغاز یوں ہوتا ہے ۔

تیرے گھر کے باہر اس نے
اپنے نام کی تختی لگادی
یہ نہیں دیکھا
کس کس کی آہٹ پر جاگے
دروازے ان دالانوں کے !
ریشم کے سرسراتے پردے
عنواں ہیں کن افسانوں کے !

نظم کا اختتام ندامت اور پچھتاوے کے احساس کے ساتھ یوں ہوتا ہے :

تیرے گھر کے باہر اس نے
اپنے نام کی تختی لگادی
وہ اندھا تھا
اپنے کئے پر شرمندہ تھا

مندرجہ بالا نظم میں ایک ایسے گھر کا ذکر کیا گیا ہے جس کے در و دیوار سجانے میں نہ جانے کس کس کا ہاتھ تھا۔ اس کی رنگین فضا کی رونق نہ جانے کس کس بازار سے چل کر وہاں تک پہنچی تھی۔ اور اس کے دالانوں کے دروازے نہ جانے کتنی آہٹوں پر کھل گئے تھے۔ لیکن ایک آہٹ جب اس کی شامل ہوتی ہے تو وہ مارے ندامت کے چیخ اٹھتا ہے۔

"وہ اندھا تھا
اپنے کئے پر شرمندہ تھا"

دوسری نظم "چڑیا" میں وہ اپنی اس غلطی پر پچھتاتا نظر آتا ہے جو اس سے سرزد بھی نہیں ہوئی۔ اپنی کھڑکی پر بیٹھی ہوئی ایک ننھی منی چڑیا کو دیکھ کر وہ اسے پیار بھری نظروں سے چومتا ہے اور اس کے دل میں ایک معصوم سی (چڑیا جیسی ہی) خواہش جنم لیتی ہے کہ وہ اس چڑیا کو اٹھا کر اپنے دل کے پنجرے میں رکھ لے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے نرم و نازک پروں والی چڑیا، پھر پھر کرتی، آکاش کی طرف پرواز کر جاتی ہے۔ اس کے اوجھل ہوتے ہی اسے یہ احساس ستانے لگتا ہے۔

سوچ رہا ہوں
میرا وحشی کٹھور ارادہ
اس نے جس دم بھانپا ہو گا
ننھا منا سا دل اس کا
کتنے زور سے دھڑکا ہو گا!

مجھے یقین ہے میری اس تردید کو پڑھنے کے بعد مخمور سعیدی مجھ سے کہے گا۔

"دیکھ کیول سوری! میری مراد یہ نہیں تھی۔ میں نے تو اپنی عملی زندگی اور مادی نقصانات کا ذکر کیا تھا"۔

اور میں کہوں گا۔

"کون سی عملی زندگی اور کون سے نقصانات؟ ساری زندگی یا تم عشق کرتے رہے ہو یا شاعری۔ لوہے کی تجارت تو تم نے کبھی کی نہیں۔۔ ہم لوگوں نے زندگی کے سارے اہم فیصلے جذباتی سطح پر کئے ہیں جذباتی زندگی جی ہے۔ یہی ہماری عملی زندگی ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ میری بات سن کر اس کے سرخ و سپید چہرے اور ذہانت سے چمکتی ہوئی آنکھوں پر دھند کی ایک ہلکی سی لکیر پھیل جائے گی اور وہ دھیرے سے کہے گا۔

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو"۔

اس کے مزاج میں "خیال خاطر احباب" کی اس قدر آمیزش اس کی شخصیت کو ایک عجب سی جاذبیت عطا کرتی ہے جسے محسوس کر کے میں از سر نو سوچنے پر مجبور ہو جاؤں گا کہ کیا واقعی میں ٹھیک کہہ رہا تھا۔

"دیوار و در کے درمیاں" کا کینوس ہمارے ذہن میں ایک ایسے شخص کا پرتو ابھارتا ہے جو نہ صرف عشق کرتا ہے بلکہ اسے زندگی کرنے کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ عشق کے معاملے میں اس کا رویہ سرسری یا Flirtation کا نہیں ہے۔ وہ یہ کام بڑے خلوص، بڑی صدق دلی بلکہ سادہ دلی سے کرتا ہے۔ اس کا عشق کہیں عبادت بن جاتا ہے اور کہیں صرف ایک شخص کی وجہ سے ساری کائنات سے پیار کرنے کا وسیلہ۔ وہ اسے خود آگہی کے لئے بھی استعمال کرتا ہے اور اجاڑ، بے کار زندگی کو بامعنی اور بامقصد بنانے کے لئے بھی۔ زندگی کی تاریک راہوں کو روشن کرنے کے لئے اگر وہ محبوبہ کے تصور سے اجالے مستعار لیتا ہے تو اس تصور کی خاطر دیوانگی کی آخری حدوں کو چھو لینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ آیئے اس کے چند اشعار کی مدد سے اس کے عشق کو رسوا کرنے کی کوشش کریں۔

عبادتوں میں گنی جائے مے کشی میری
لیا ہے ہاتھ میں ساغر ترے حوالے سے

ooo

گداز عشق سے پہلے بہت کٹھور تھا دل
ہوا ہے موم یہ پتھر ترے حوالے سے

ooo

ہے دوپہر کے تند بگولوں کو کس کی آس؟
پچھلے پہر کی نرم ہواؤں میں کون ہے؟

ooo

کس کے فروغ سے ہے معانی کی آب تاب
لفظوں کی بے چراغ گپھاؤں میں کون ہے؟

ooo

بہت دنوں میں خود اپنے کو میں نے پہچانا
بہت دنوں میں لیا آج میرا نام اس نے

ooo

اسے جو ساتھ نہ لائے بہار کا موسم
مرے چمن میں نہ آئے بہار کا موسم

○○○

ہم سے راتوں کے سلگنے کا سبب پوچھتے ہو ؟
ہم نے دیکھا ہے سرشام سنورنا اس کا

○○○

اس کی پیشانی پہ روشن آیتیں
اس کے چہرے پر خدا کا نور ہے

○○○

کوئی گنہ بھی گنہ نہیں جو روحوں کو سرشار کرے
وہ میرے ہاتھوں کی عبادت تیرا بدن جب چھولوں میں

○○○

بارش ہو نغمات کی مجھ پر جب اس کی آواز سنوں
جی یہ چاہے اس بارش میں جنم جنم تک بھیگوں میں

○○○

بن گیا دوست اک شخص اپنا یہاں
ہاں کسی شخص سے دشمنی اب نہیں

○○○

مرے خیال سے روشن تو ہیں دلوں کے افق
جو تو نہیں ہے تو یہ روشنی ادھوری ہے

○○○

لہو کا رنگ بھی بھردوں اب اس کی چاہت میں
وہ کہہ گیا ہے کہ تصویر ابھی ادھوری ہے

○○○

اگر کوئی تری دیوانگی پہ ہنستا ہے
تو غالباً تیری دیوانگی ادھوری ہے

کہا جاتا ہے کہ عشق کی سب سے انمول دین وہ لمحے ہوتے ہیں جو روح کو نئی وسعتوں ، نئی رفعتوں سے روشناس کرتے ہیں ۔ Elevation کے ایسے ہی لمحوں کا اتنا خوبصورت اظہار کبھی کبھار ہی نظر آتا ہے ۔

فضا رنگوں بھری اور میں فضا میں
مہک بن کر بکھرتا جارہا ہوں
مری دنیا اور اتنی خوبصورت !
ابھی میں کس سے مل کر آرہا ہوں ؟

اس میں شک نہیں کہ مخمور سعیدی جب عشق کرتا ہے تو ٹوٹ کر کرتا ہے تاہم اس سلسلے میں بھی ایک کڑی ایسی ہے جو اسے اردو شاعری کے ہجوم عاشقاں میں ایک نیا چہرہ ، ایک نئی پہچان دیتی ہے اور وہ ہے ٹوٹ کر چاہتے ہوئے بھی چاہے جانے کی تمنا ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس سے پہلے اس تمنا کا اردو شاعری میں اظہار نہیں ہوا ۔ یقیناً ہوا ہے مگر ایسی شدت سے نہیں ۔ ایسی خود سر تمناؤں کا مخمور کے یہاں ہونا اور بھی حیرت کی بات ہے کیونکہ ٹونک ہی کی دھرتی کے پروردہ اس کے پیش رو شاعر اختر شیرانی بالکل مختلف روایت چھوڑ گئے تھے ۔ عشق ان کے نزدیک یک طرفہ عمل تھا ۔ یہ ان کا شیوہ ہی نہیں شاید مجبوری تھی ۔ ان کے نغموں کی کسک سے اگر سلمیٰ ، عذرا یا ریحانہ کی پلکیں نہیں بھیگتیں تو اس بے اعتنائی سے وہ دل برا نہیں کرتے ۔ دراصل ایسی کوئی امید وہ اپنی شاعری کے نہاں خانے میں درآنے ہی نہیں دیتے ۔ بالکل ویسے ہی جیسے سنگتراش مورتیاں تراشتے ہوئے اس بات کی کبھی توقع نہیں کرتا کہ اس کی تراشی ہوئی آنکھوں میں اسے دیکھ کر شرارت یا مستی کی مے چھلکنے لگے گی یا اس کی پروردہ مرمریں باہنیں اس کے شانوں کی ردا بن جائیں گی ۔ "چند لمحے عذرا کے ساتھ" میں ایک شعر ہے ۔

"مری حسرت بوسہ کو ناز سے ۔" بری بات ہے " کہہ کے بہلا گئی ۔"

بہل جانے کی ایسی آمادگی دیکھ کر یہ خیال آتا ہے کہ اگر عذرا نے اتنا بھی نہ کہا ہوتا تو بھی وہ بہل جاتے ۔ لیکن مخمور سعیدی کے یہاں معاملہ دگر گوں ہے ۔ ایسی ہی ایک خواہش کی ناآسودگی کا ذکر اس کی نظم " رد عمل " میں ہے اس کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے ۔

جلتے سلگتے ان لمحوں میں
جانے کہاں سے
میرے لبوں پر
چاہت کی شبنم میں بھیگے لفظ آاترے
میں نے تم سے کہا اچانک
میری آنکھوں پر بوسہ دو !
تم نے میری جانب دیکھا
اور اپنے شاداب لبوں سے
طنز کے تیز دہکتے نشتر

پھینکے مجھ پر
رات کے وہ آسیبی لمحے گزر چکے ہیں
اب وہ جہنم سرد ہے لیکن
اس کی تپش نے
میں نے تمہارے نام کے جتنے خواب
سجائے تھے آنکھوں میں
سب کو جلاکر راکھ کیا ہے

یہ ردعمل شدید ہی سہی تاہم گوشت پوست کے عام آدمی کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ چاہے جانے کی خواہش اس کے مزاج میں رچ بس جانے کی وجہ سے اس کی سوچ کا حصہ بن گئی ہے۔ اس کا اظہار اس کی شاعری میں اکثر ملتا ہے۔

اس کا سایہ ہو جب اک ابر گریزاں کی طرح
تم بھی مخمور پھر آوارہ ہوا ہو جانا

○○○

کرگیا مجھ کو مرے حال سے بدظن، اکثر
اپنے ماضی سے وہ اخلاص جتانا اس کا

چاہنے اور چاہے جانے کے معاملے میں اس کا حساس ذہن کس قسم کی شرکت گوارا نہیں کرپاتا خواہ وہ ذہنی سطح ہی پر کیوں نہ ہو۔ اگر کبھی اسے یہ گمان گزرتا ہے کہ اس کا ہمسفر تصور میں بھی کسی سے ہمکلام ہے تو اس کے پندار کی یہ شکست گہری اداسیوں کا سبب بن جاتی ہے۔ اس کیفیت کا انتہائی خوبصورت اظہار اس کی نظم "شکست" میں ہوا ہے

ترا ہنستا ہوا چہرہ غزل گاتی ہوئی آنکھیں
مرا سرمایہ ہستی، مرے پندار کی مستی
مگر میں اپنے اس پندار سے خود ہار جاتا ہوں
مخالف بھیڑ میں خود کو تہی مایہ سا پاتا ہوں
جب اس ہنستے ہوئے چہرے پہ کچھ انجان سے سائے
(میں جن سے ناشناسا ہوں)
گھنے، گہرے دھندلکوں کی نقابیں ڈال دیتے ہیں
غزل گاتی ہوئی آنکھوں میں کچھ بے نام سے موسم
(جو مجھ سے دور گزرے ہیں)
اچانک لوٹ آتے ہیں

چاہے جانے کی اس تمنا کا ہی دوسرا نام شاید انا ہے۔ لیکن یہاں اس کی وہ بگڑی ہوئی شکل نہیں ہے جس کی وجہ سے انا کا ذکر آتے ہی طبیعت مکدر ہونے لگتی ہے۔ اس کے برعکس مخمور کے یہاں تو یہ ایک ایسے صاف ستھرے مثبت رویہ کے طور پر سامنے آتی ہے جو نہ دوسروں کے لئے تکلیف دہ ہے اور نہ اس کی اپنی شخصیت کی شکست و ریخت کا سبب بنتا ہے۔ دھنک کے رنگوں کی طرح اس کی انا کے بھی کئی رنگ ہیں۔

حسن سے لگاؤ اس کی فطرت ہی سہی، اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم۔ مگر وہ لوح جہاں پہ حرف مکرر، بن کر نہیں جی سکتا۔

محو ہوجائے دل سے نقش انا
وہ نظر اتنی دل نشیں بھی نہیں۔

○○○

وہ بے رخی بھی مرا حاصل طلب ٹھہرے
کہ مختلف جو ترے التفات عام سے ہو
نگار وقت! تری دل ربا اداؤں میں
کوئی ادا، کہ جو منسوب میرے نام سے ہو

"دیوار و در کے درمیاں" کو پڑھتے ہوئے عشق اور انا کے علاوہ بھی کئی اہم پہلو دعوت فکر دیتے ہیں۔ مثلاً روایات اور رشتوں سے گہری وابستگی، ان کے دھندلانے یا ٹوٹنے کا کرب جو قدم قدم پر اس کے پاؤں کی زنجیر بنتا رہا ہے۔ لیکن اس شاعری کے پس منظر میں مخمور سعیدی کے کردار کا یہ پہلو کھل کر سامنے آتا ہے کہ وہ کسی شیریں کی ابرو کے اشارے پر تیشہ اٹھاکر بے ستوں کا جگر چیرنے کے لئے نکل پڑے گا لیکن شرط یہ ہوگی کہ اس کی محبوبہ کی پلکیں بھی اس کے تصور سے بوجھل رہیں۔ اور اگر اسے کبھی احساس ہوا کہ اس کی شیریں کے خوابوں کے آئینے میں اس کے خدوخال دھندلا رہے ہیں تو اس کے تیشے کی فلک شگاف آواز کوہسار کے دامن کی وسعتوں میں غرق ہوجائے گی۔ میری خواہش ہے کہ بھلے شہری کے خدوخال بدلتے رہیں (نہ جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ مہربان لمحے، کی رضیہ اور ہے اور ردعمل کی کلو پترا اور) مخمور کے ہاتھوں کے آبلوں سے تیشے کی شناسائی برقرار رہے کہ یہ اب تک اردو شاعری کے لئے بڑی کارگر ثابت ہوئی ہے۔

تبصرہ کتب

کتاب کا نام : "حسرت موہانی"
مصنف : ڈاکٹر خلیق انجم
صفحات : ۳۰۴ ۔ قیمت پچاس روپے
تبصرہ نگار : ڈاکٹر سید تبارک علی

مولانا حسرت موہانی پہلے مسلمان مجاہد آزادی اور صحافی تھے جنہیں برطانوی حکومت نے ۱۹۰۸ء میں بغاوت کے الزام میں گرفتار کرکے دو سال قید بامشقت کی سزا دی اور ان پر پانچ سو روپے جرمانہ عائد کیا۔ وہ تین بار جیل گئے۔ جنگ آزادی کی جدوجہد میں جن لوگوں نے اپنا سب کچھ قربان کردیا ان میں حسرت موہانی کا نام بھی شامل ہے۔ افسوس ہے کہ حسرت موہانی کو جنگ آزادی کی تاریخ اور تاریخ ادب اردو میں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ حسرت پر مضامین تو کافی تعداد میں لکھے گئے۔ لیکن انہیں مستقل موضوع بناکر بہت کم کتابیں لکھی گئیں۔ حسرت پر احمرلاری، عارف ہسوی، ایم حبیب خاں اور عتیق صدیقی مرحوم کی کتابیں قابل ذکر ہیں۔ پچھلے دنوں پبلیکشن ڈویژن کی جانب سے حسرت موہانی پر ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب شائع ہوئی ہے جو حسرت موہانی پر ایک وقیع اور جامع کام ہے۔

اس کتاب میں حسرت کے مکمل سوانح بیان کئے گئے ہیں اور حسرت کی ادبی اور سیاسی زندگی کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ جنگ آزادی کی ایک اہم شخصیت حسرت موہانی کی شریک حیات نشاط النساء بیگم بھی تھیں اور بقول ڈاکٹر خلیق انجم وہ پہلی مسلم مجاہد خاتون تھیں جنہوں نے جنگ آزادی کا علم بلند کیا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ بیان بھی قابل توجہ ہے کہ اگر ہندوستان کی عظیم خواتین پر کوئی کتاب لکھی جائے تو بیگم حسرت موہانی کے ذکر کے بغیر وہ کتاب مکمل نہیں ہوگی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے پہلی بار بیگم حسرت موہانی کے تفصیلی حالات لکھے ہیں اور جنگ آزادی میں ان کے رول پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلی بار بیگم حسرت موہانی کی تصویر بھی شائع کی ہے جو غالباً ان کی واحد تصویر ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم اردو کے ممتاز اور معتبر محقق ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے تحقیقی کام کو پوری ذمہ داری کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچاتے ہیں۔ وہ اخذ نتائج کے سلسلے میں نہ کسی قسم کی عجلت بازی کا ثبوت دیتے ہیں اور نہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار اردو کے صف اول کے گنے چنے محققین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اب تک جو بھی تحقیقی کارنامے انجام دیے ہیں اس اعتبار سے ان کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی ہے۔ تحقیق سے ان کو خاص شغف ہے اس لئے تنقید کے شعبے میں بھی انہوں نے متنی تنقید کا انتخاب کیا ہے اور "خطوط غالب" اور "آثار الصنادید" اور "مرقع دہلی" کو از سرنو ترتیب دے کر ایک مثال قائم کی ہے۔ حسرت موہانی پر ان کی زیر نظر کتاب اس روایت کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جو قدر کی نگاہ سے دیکھنے کے لائق ہے۔

نام کتاب : بیاد مجلس اقبال
مرتب : پروفیسر آفاق احمد
تبصرہ : ڈاکٹر مختار الدین احمد (بریڈ فورڈ، برطانیہ)

کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز بھوپال کے سیمناروں میں پڑھے گئے مقالات کی تیسری جلد پروفیسر آفاق نے مرتب کرکے اسی ادارے سے شائع کی ہے۔ کتاب کا انتساب بابائے اقبالیات جناب ممنون حسن خاں کے نام ہے۔ پیش لفظ بھی ممنون حسن خاں کا لکھا ہوا ہے۔ حرف آغاز پروفیسر آفاق کے قلم سے ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ علامہ اقبال پہلی بار ۹ / مئی ۳۱ء میں بھوپال تشریف لائے تھے اس کے بعد جنوری ۳۵ء سے اپریل ۳۶ء تک تین بار اور بھوپال میں قیام پذیر ہوئے۔ علامہ کے اعلیٰ حضرت نواب حمید اللہ خاں والئ بھوپال سے دوستانہ تعلقات تھے اور "ضرب کلیم" کو علامہ نے نواب صاحب کے نام سے منسوب کیا تھا۔

زیر نظر مجموعے میں مشہور اقبال شناس پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا مضمون "اقبال اور پریم چند" شامل ہے جس میں انہوں نے اقبال اور پریم چند کے افکار و نظریات کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اقبال کی خطوط نگاری پر اظہار خیال کیا ہے۔ "کلام اقبال کی پیروڈی" ڈاکٹر سیدہ جعفر کا مضمون ہے ان کے علاوہ عبدالمغنی، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر امیر اللہ خاں، شاہین شیخ سلیم احمد، پروفیسر عبدالقوی دسنوی، ڈاکٹر سید حامد حسین، پروفیسر فضل تابش اور کئی

دیگر دانشوروں کے مقالات شامل ہیں۔

حاصل کتاب مضامین جناب ممنون حسن خان نے " اقبال کی فیضانی یادوں کے سائے " اور " یاد رفتگاں " کے نام سے لکھے ہیں۔ خود ممنون حسن خاں صاحب کا تعارف شیخ سلیم احمد نے کرایا ہے جو یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ آخر میں ممنون حسن خاں کے نام علامہ اقبال اور چند دیگر مشاہیر کے خطوط بطور ضمیمہ کے شامل ہیں جو تمام اقبال دوستوں کے لئے بیش بہا تحفہ ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہندوستان سے علامہ اقبال پر شائع ہونے والے اکثر مضامین کا انداز کچھ عذر خواہانہ سا معلوم ہوتا ہے لیکن اس کتاب کی یہ خوبی ہے کہ بیشتر مضامین معروضی نقطہ نظر رکھتے ہیں جیسے فضل تابش کا مضمون " وطن اقبال کی نظر میں " خالص معروضی پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں چند بالکل نئے عنوانات ہیں جنہیں اب سے پہلے نہیں لکھا گیا تھا۔ اقبال اکیڈیمی بھوپال اور پروفیسر آفاق احمد اور جناب ممنون حسن خان شکریئے کے مستحق ہیں جنہوں نے بھوپال میں مشعل اقبال کی روشنی پھیلائی ہے اور اتنی جامع کتاب کی اشاعت فرمائی ہے۔

امید ہے اقبال اکیڈیمی اسی طرح اقبال اور اردو کی خدمت جاری رکھے گی۔

ملنے کا پتہ: آل انڈیا علامہ اقبال ادبی مرکز، سنسکرت بھون، بھوپال (مدھیہ پردیش)

نام کتاب :آب نیساں

شاعر :فرید پربتی

صفحات :۱۳۶

سنہ اشاعت :۱۹۹۱ء

ناشر :فرید پربتی، سری نگر (کشمیر)

مبصر :عاصم شہنواز شبلی، کلکتہ

آب نیساں مقبول اور جواں سال شاعر فرید پربتی کی غزلوں / نظموں اور چند رباعیوں پر محیط دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ حامدی کاشمیری، جاوید آذر، بلراج کومل، پریم کمار نظر اور مظہر امام کے علاوہ سات دیگر فنکاروں کی آرا بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔ ان تمام لوگوں کی اختلاف کرتی ہوئی رایوں سے قطع نظر کتاب کا مطالعہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ فرید پربتی کا مزاج اور لفظوں کا انتخاب گو کہ کلاسیکی اور تہذیبی عناصر سے مملو ہے لیکن زبان کا استعمال اور اظہار و بیان انہیں نئی غزل کا شاعر بناتا ہے یہی وجہ ہے کہ فرید پربتی کی شاعری میں عصر حاضر کی تلخیاں، محرومیاں غزل کے قالب میں ڈھل کر اظہار و اسلوب کا ایک نیا راستہ بناتی ہیں۔ وہ نہ صرف منظر کو سرسری نظروں سے دیکھتے ہیں بلکہ منظرنامے پر بھی ان کی گرفت بہت مضبوط رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مشاہدات و احساسات کو الفاظ میں ڈھالنے کے فن سے واقف ہیں۔ فرید کی غزلوں میں اردو غزل کی مترنم کلاسیکیت، فنی روایات کی پختگی اور ایک ہلکی تبدیلی کا احساس موجود ہے۔ درحقیقت فرید پربتی متانت، سلاست، شستگی، برجستگی کے ساتھ ساتھ غم جاناں اور غم دوراں کو اپنی غزلوں میں سموتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جو میری گفتگو کو اعتبار بخشیں گے۔

سلگتے خواب خریدے ہیں نیند کے بدلے
یہ کاروبار پرانا نیا نیا سا لگا

اکثر دکھا رہا تھا مجھے آسماں کے خواب
آخر گیا ٹپک کہ زمیں پر وہ بے درنگ

فرصت جو ملے خود سے ملاقات بھی ہوگی
دیوار کے سایوں سے نئی بات بھی ہوگی

خریدوں گا میں اب سایہ کہاں پر
کہ بکتی دھوپ ہے ایک ایک دکاں پر

لباس ہے سلوٹوں سے عاری
دلوں کے تیور مگر ہیں ویراں

برسا تو سارا شہر بہاکر ہی تھم گیا
چھایا جو آسماں پہ تھا ٹکڑا سحاب کا

ان کے سر ہیں اور سنگ کودکاں
دیکھ لے اب حالت شوریدہ گاں

ان اشعار کا مطالعہ اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ فرید پربتی محض تفنن طبع کے لئے نہیں بلکہ کسی مقصد کے پیش نظر شعر کہہ رہے ہیں۔ ذات کی کشتیوں کا گلہ، موجودہ زمانے کا آشوب اور عہد حاضر کی شکست و ریخت فرید کی شاعری کا حصہ ہیں۔ لیکن ایک بات کی داد دینی پڑے گی کہ شعریت کہیں بھی مجروح نہیں ہوئی ہے بلکہ غزلوں کا حسن

اور تازگی پر جگہ کار فرما ہے۔ ایک چیز جس نے مجھے بے حد متاثر کیا کہ
فرید پرچی کو زبان و بیان اور عروض و آہنگ (جو آج کے بیشتر شعرا کے
یہاں مفقود ہیں) سے اچھی طرح واقفیت ہے۔ اس کے علاوہ فرید مشکل
اور کھردری زمین پر بھی بڑی آسانی سے اپنے قدم جمائے گزر جاتے ہیں۔
"آب نیساں" میں سات عدد نظمیں بھی شامل ہیں۔ نظم "الیسان من کم
شدعد" پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ فرید نظم بھی اچھی کہہ سکتے ہیں۔ کچھ
رباعیاں بھی اس کتاب میں شامل ہیں جس کا دیباچہ شمس الرحمن فاروقی
کی رباعی پر مشتمل ہے کتاب کی طباعت و کتابت عمدہ ہے کتاب کی
قیمت کہیں بھی درج نہیں ہے۔

نام کتاب : قوام العقائد
حضرت نظام الدین اولیاؒ کے چشم دید حالات زندگی
مترجم : پروفیسر نثار احمد فاروقی
قیمت : ۴۰ روپے
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ اردو، بازار دہلی نمبر ۶
تبصرہ نگار : رئیس الدین فریدی

زبان پہ بارے خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ ان اہل صوفیائے کرام اور
سلسلہ چشتیہ کے ان کبائر عظام میں سے ہیں جن کے اذکار سے تاریخ ہند
منور ہے اور قیامت تک منور رہے گی اور ان کا چشمہ فیض رہتی دنیا
تک جاری و ساری رہے گا۔ ان کے حالات زندگی اور ملفوظات سب
سے بڑا منارہ نور ہیں اور رہیں گے۔ اس لئے مقام مسرت ہے کہ ان
کے حالات زندگی اور فلسفہ ملفوظات کے معتبر ترین مجموعے کو جو ان
کے خلیفہ حضرت شمس العارفین خواجہ الدینؒ کی زبان فیض ترجمان سے
سن کر ان کے پوتے حضرت محمد جمال الدین قوام نے ان کی نگرانی میں
لکھ کر قوام العقائد کے نام سے ۷۵۵ ہجری مطابق ۱۳۵۴ء میں بزبان
فارسی مرتب کیا اور اسے بڑی کوشش سے تلاش کر کے جناب فاروقی نے
اس کو بڑی خوش اسلوبی سے اردو کا جامہ پہنا کر صاحبان ذوق اور طلب
گار ان فیض روحانی و اخلاقی کی خدمت میں پیش کر دیا ہے اس کتاب کے
فارسی متن کے بارے میں فاضل مترجم کا بیان واجب الاظہار ہے کہ

ہندوستان میں اس کا صرف ایک ہی قلمی نسخہ ہے جو حیدر آباد کی عثمانیہ
یونیورسٹی کے کتب خانے کی زینت ہے اور اس طرح دنیا کے تاریخی
ہیرے کوہ نور سے زیادہ قیمتی ہے۔ لہذا اس کے اردو ترجمے کی اشاعت
کو بھی بیش قیمت ہی کہہ سکتے ہیں نوع انسان کی ہدایت اور بصیرت کے
لئے احادیث رسولؐ اور واقعات سیرت کی تحصیل اور تحریر کا کام وصال
پر کافی مدت گزر جانے کے بعد شروع ہوا تھا مگر اس کی تقلید میں بزرگان
دین اور صوفیائے کرام کے حالات زندگی اور ملفوظات کی تدوین کا کام
ان کی حیات طیبہ ہی میں ہونے لگا تھا یا وصال کی مختصر مدت کے بعد اور
اس موضوع پر معتبر اور نیم معتبر صدہا کتابیں دائرہ تحریر و اشاعت میں
آچکی ہیں جن میں سے کچھ امتداد زمانہ کی نذر ہو گئیں۔ کچھ کمیاب ہو گئیں
ان ہی میں سے قوام العقائد بھی ہے۔ جو اس وجہ سے درجہ اعتبار کی مالک
ہے کہ یہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ایک ایسے معتقد، مرید اور خلیفہ
کی روایت کی ہوئی ہے جو برسوں ان کی خدمت میں حاضر رہے تھے اور
ان کی نگرانی ہی میں قلم بند ہوئی تھی۔ زیر تبصرہ کتاب فاضل مترجم کے
اس موضوع پر حاوی پر حاوی مقدمے سے شروع ہوتی ہے۔ پھر اصل
کتاب کے دیباچے کا ترجمہ ہے اور اس کے بعد نو ابواب میں بچپن اور
تحصیل علم اور بابا فرید الدین گنج شکر سے بیعت کا حال ہے۔ پھر علماء کی
خدمت میں حاضری اور مریدی و خلافت بخشی کے واقعات ہیں جن میں
کرامات، حسن سلوک اور اصلاح اخلاق کا بہت کچھ سامان موجود ہے۔
چھٹا باب حضرت کے ارباب اقتدار سے تعلقات کی نوعیت کا مظہر ہے
خصوصاً سلطان علاء الدین خلجی اور اس کے بیٹوں کی شیخ سے عقیدت اور
شیخ کی ان کو انسانیت اور دین کے راستے پر لانے کی حکیمانہ کوشش کا۔ یہ
بات خاص طور پر بغور قابل مطالعہ ہے کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے
کہ صوفیائے کرام عوام کی کیسی خدمت کرتے تھے اور شہنشاہوں کو بھی
اس کا سبق دیتے تھے جو صوفیائے کرام کا خاص منصب تھا۔ مگر حیرت کی
بات یہ ہے کہ اس باب میں یا پوری کتاب میں حضرت نظام الدینؒ کے
سب سے چہیتے، ہم راز اور وسیلہ اصلاح سلاطین و امراء حضرت امیر خسرو کا
کہیں نام تک نظر نہیں آتا۔ آٹھویں باب میں بھی نصیحت و ہدایت کے
بہت سے گہرپائے آبدار کے ساتھ کسب حلال اور حصول و صرف آمدنی
کے متعلق بھی اصول شافی اور ہدایات کافی موجود ہیں۔ جن کی روح یہ
ہے کہ انسان کو کسی سے خود کوئی چیز مانگنی نہیں چاہیے جو بے طلب ملے
ضرورت مندوں پر تقسیم کر دینا چاہیے مگر تحفہ ہدیے ایسی ہیں جن کو آمدنی

کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے ۔ یعنی زکوہ، امامت، اذان، درس، کتابت، سوال (فتوی)، تعلیم، ختم خوانگان (فاتحہ و نیاز وغیرہ) اسی طرح آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ بھی نہیں قبول کرنا چاہیے ۔

ان ہدایات اور اصولوں پر عمل کرنا دنیا داروں کے لئے تو مشکل ہے پھر بھی حسب توفیق فائدہ اٹھانے سے کون روک سکتا ہے ۔ صاحب ترجمہ نے جو خود بھی فاروقی اور فریدی ہیں کتاب کو اغلاط اور شکوک کتابت سے پاک رکھنے کی سعی بلیغ کی ہے یہاں تک کہ اسمائے معرفہ پر بڑی احتیاط سے اعراب بھی لگائے ہیں ۔ اس لئے ساری کتاب پڑھنے پر بھی صرف صفحات ۱۱۵ اور ۱۱۶ پر ایک نام مشکوک نظر آیا ۔ یہ نام کئی جگہ قیر بک تحریر ہونے کے بعد آخری میں توقیر بک ہو گیا اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے ۔ لاریب کہ جناب نثار احمد فاروقی نے جو عربی فارسی اور اردو کے مانے ہوئے عالم، مصنف، مولف اور مترجم ہیں قوام العقائد کی اردو میں اشاعت کا انتظام کر کے بڑی قابل داد علمی و ادبی خدمت انجام دی ہے اور اصحاب ذوق کو اس کی عملی قدر کر کے ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہونے میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے ۔

خامیوں پر مفصل اور بے باکانہ روشنی ڈالی ہے جن میں ہر قسم کے جنسی تعلقات بھی شامل ہیں ۔ حد تو یہ ہے کہ اپنے آزاد منش والد کو بھی معاف نہیں کیا ہے ۔

طرز، تحریر، زیادہ تر شگفتہ ہے مگر بعض مقامات پر قلم کو بے لگام کرنے سے بھی نہیں چوکے ہیں ۔ یہی حال خود اپنا بھی کیا ہے ۔ بعض مقامات پر لفظی کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں جن سے مستند اہل قلم کو بچنا ضروری ہوتا ہے تاکہ نوآموز اور کم استعداد مغالطے میں نہ پڑیں ۔ اس کے چند نمونے جو سرسری مطالعے کا نتیجہ ہیں حسب ذیل ہو سکتے ہیں ۔ (دلیغون) دگیون، تازیہ (تعزیہ) قلابہ (قلادہ) کتارا (کتارا اعلی کا مکمل) دہی جلیبی (دودھ جلیبی) قیمض (قمیص) نبھانا (نباہنا) حاجرہ (باجرہ) پھر سے (پھر) بجرا (بجرا) وغیرہ ۔ اس میں شک نہیں کہ کتاب دلچسپ اور معلومات افزا ہے اور ہماری سماجی کمزوریوں کو اچھی طرح اجاگر کرنے کی وجہ سے اصلاحی بھی ہو سکتی ہے ۔

نام کتاب : دیواروں کے بیچ
مصنف : ندا فاضلی
صفحات : دو سو کے قریب، مجلد، مع گرد پوش، کاغذ، کتابت، طباعت معیاری، قیمت ۴۰ روپے
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ ۔ دہلی و بمبئی اور دوسرے اشاعت گھر
تبصرہ نگار : رئیس الدین فریدی

ندا فاضلی (مقتدی حسن) شاعر اور ادیب کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں انہوں نے "ملاقاتیں" کے بعد دوسری نثری تصنیف "دیواروں کے بیچ" کے عنوان سے پیش کی ہے ۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حقیقت بھی ہے اور افسانہ بھی ۔ یعنی آپ بیتی ناول کے طرز پر لکھ کر نئے طرز کی بنیاد ڈالی ہے ۔ ان کا تعلق گوالیار، دہلی، بھوپال اور بمبئی سے رہا ہے اس لئے ان تمام مقامات کے جو ادبی مرکز بھی ہیں اس صدی کے وسط کے علمی، سماجی، مذہبی، اخلاقی حالات اور رسوم و رواج کی حقیقت پسندانہ ہی نہیں بلکہ عالمانہ اور روشنی طبع پر مبنی نگارش طرازی کی ہے اور سیکڑوں عوام اور خواص کی خوبیوں اور

کی نیک خواہشات
سبھوں کے لئے!

شہباز حسین رسالتقدیر، آبج کالج پرنسپل ضیاء الحسن نعیمی، انفاس سہتا پروفیسر معین الدین ڈاکٹر صابقہ ذکی، ڈاکٹر مصباح الدین علوی، ڈاکٹر شمیم افروز دیسی وغیرہ نے بھی شرکت کی۔

اسلم جمشید پوری

کلکتہ میں ۸۰ء کے بعد کے شاعروں کا خصوصی مشاعرہ

مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ کی لٹریری سب کمیٹی کے زیر اہتمام ۳۰ر اکتوبر کی شام کلکتہ میں اپنی نوعیت کا پہلا مشاعرہ ہوا جس میں ۸۰ء کے بعد کے شعراء و شاعرات نے حصہ لیا اور ممتاز و معتبر شاعروں نے بحیثیت سامعین شرکت کی۔ مشاعرے سے قبل ڈاکٹر مظفر حنفی نے ۸۰ء کے بعد کے شاعروں کو اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ جبکہ جناب انجم عظیم آبادی، جناب رونق نعیم نے اس مشاعرے کے تعلق سے اظہار خیال کیا اور پروفیسر سلیمان خورشید نے خیر مقدمی کلمات پیش کئے۔ ۸۰ء کے بعد کے شاعروں پر مشتمل قرعہ اندازی کے ذریعہ جناب خورشید بدر صدر مشاعرہ قرار پائے جبکہ شگفتہ یاسمین غزل (نیوز ریڈر کلکتہ دوردرشن) اور کلکتہ ریڈیو سے وابستہ زرینہ زریں نے نقابت کے فرائض انجام دیئے۔ درج ذیل شعراء و شاعرات نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ خورشید بدر (صدر مشاعرہ) زرینہ زریں، شگفتہ یاسمین غزل (نقیب مشاعرہ) فہیم انور، بلند اختر شہودی، فراغ روہوی، شعیب احمد شورش، مشتاق ہاشمی، شاہد فردمی، ڈاکٹر سلطان ساحر، فیروز مرزا، نسیم عزیزی، نور تسلیمی، کلیم آزاد، عرفان رشید، وکیل علیمی، نسیم منان (ناظم)، شفیق شائق، ارشاد آرزو اور محمد عالم آفاقی اور اکبر حبیبی۔

ممتاز عارفی لٹریری سکریٹری

شملہ میں بزم افسانہ و مشاعرہ

بزم ادب ہماچل (رجسٹرڈ) اور انجمن ترقی اردو (ہند) ہماچل شاخ کے اشتراک سے ۲۶ر نومبر کو کیپٹ بھون شملہ میں دو سادہ سی ادبی تقریبات منعقد کی گئیں۔ پہلی نشست بزم افسانہ پر مشتمل تھی اور دوسری نشست مشاعرہ آراستہ کی گئی۔

بزم افسانہ کی شمع جناب سریندر ناتھ ورما آئی اے ایس، کمشنر سکریٹری ہوم ڈپارٹمنٹ ہماچل سرکار نے روشن کی۔ صاحب موصوف خود ایک اعلیٰ ادیب ہونے کے علاوہ انجمن ترقی اردو (ہند) ہماچل شاخ کے صدر بھی ہیں۔ نظامت کے فرائض جنرل سکریٹری ڈاکٹر شباب للت نے سر انجام دیئے۔ اس نشست میں چار افسانے پڑھے گئے اور درجن بھر نقادوں نے ادبی افسانوں پر تنقید و تبصرہ کرکے بحث میں سرگرم حصہ لیا۔ افسانہ پیش کرنے والوں میں جناب پریم عالم نے سب سے پہلے اپنا افسانہ "حوا کی بیٹی" پڑھا، اجیت سنگھ نے "قومی جھنڈا" اور بہار شملوی نے اپنا افسانہ "آشیرواد" پیش کیا۔ شرکائے بزم میں ممتاز و معروف اور صف اوّل کے کہانی کار اور شاعر جناب شرون کمار ورما بھی شامل تھے جن کا افسانہ "پلیگ" سامعین اور ناقدوں دونوں کے لئے جذب و کشش کا مرکز بنا۔ اس افسانے کے تیکھے طنز اور مزاحیہ پٹ نے سب کو متاثر کیا جس کے ذریعہ آج کے سیاسی اور سماجی نظام کی دین مختلف مسائل اور عوام کے استحصال کی اس کہانی میں تصویر کشی کی گئی ہے۔

ایک روز قبل ہی پنجاب کی صوبائی سرکار نے شرون کمار ورما کو شرومنی ساہتیہ کار ایوارڈ دینے کا اعلان کیا تھا۔ اس کامیابی اور اعزاز پر ورما کو بزم کی جانب سے مبارکباد پیش کی گئی۔ بحث میں حصہ لینے والوں میں ستیندر شرما، اخلاق حسین آثر، ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن (لیکچرر اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر سولن)، جگدیش شرما، تلسی رمن ایڈیٹر "دیپاشا" کرشن کمار طور، شرون کمار ورما، صدر بزم ایس این ورما، شانتی سروپ مسافر آئی، ریٹائرڈ سیشن جج، نثار شملوی اور ڈاکٹر شباب للت کے نام قابل ذکر ہیں۔

تصویر میں مائیک پر زرینہ زریں (بائیں سے) جناب انجم عظیم آبادی، ڈاکٹر مظفر حنفی، خورشید بدر (صدر مشاعرہ)، جناب رونق نعیم تشریف فرما ہیں۔
فوٹو: عالمگیر احمد

بزم مشاعرہ میں صدر مشاعرہ جناب سی آر بی للت ڈائرکٹر محکمہ السنہ و ثقافت نے شمع روشن کی۔ شرکائے مشاعرہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ شرون کمار ورما، امرتسر دہلی سے بلراج حیرت، سولن سے ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی، دھرم سالہ کے کرشن کمار طور، سولن کے امر سنگھ فگار، شوق شملوی، نثار شملوی، پرنسپل سُرجیت سنگھ بخشی، پریم عالم، پروفیسر خالد ناز تدواتی، جگدیش شرما، ڈاکٹر شباب للت اور صدر مشاعرہ سی آر بی للت شامل تھے۔

(کرشن کمار طور)

فرید آباد میں ہرچرن چاؤلہ کو استقبالیہ

انجمن ادبستانِ سخن حیدرآباد نے ناندیڑ سے تشریف لائے ہوئے ادیب جناب ہرچرن چاؤلہ کے اعزاز میں ۱۸ دسمبر ۹۶ء کو ایک خصوصی نشست کا اہتمام کیا جس میں انہوں نے جناب دید راج ڈوٹبہ کے افسانوی مجموعے "سنہلا پھول" کا اجرا فرمایا۔ اس موقعہ پر صدر انجمن جناب واسدیو ساہنی طالب کے جناب دید راج ڈوٹبہ کے فن اور شخصیت پر اظہار خیال کے بعد جناب ہرچرن چاؤلہ اور جناب دید راج ڈوٹبہ نے اپنے افسانے پیش کئے اور شعراء حضرات نے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا۔

مرسلہ : ہیرانند سوز

۹ نومبر کو سرونج میں سہ ماہی "انتساب" کے "وقار فاطمی نمبر" کا اجراء حاجی انیس دہلوی ایڈیٹر "فلمی ستارے" (دہلی) کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ نیچے تصویر میں اجراء کار حاجی انیس دہلوی کے دائیں جانب سیفی سرونجی مدیر انتساب۔

مشتاق انجم کے افسانوی مجموعہ "بے گھری" کی رونمائی

۸ دسمبر کو کلکتہ میں جواں سال افسانہ نگار جناب مشتاق انجم کے افسانوی مجموعہ "بے گھری" کی تقریب رونمائی ڈاکٹر ظفر اوگانوی کی صدارت اور جناب انجم عظیم آبادی کی نقابت میں منعقد ہوئی۔ کتاب کا اجراء منفرد افسانہ نگار جناب انیس رفیع کے ہاتھوں انجام پایا۔ پروفیسر سلیمان خورشید نے مشتاق انجم کے افسانوں میں میلانات عصری مسائل اور ارتقاء کے حوالے سے بتایا کہ "بے گھری" میں آج کے بدلتے ہوئے حالات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ افسانہ نگار فیروز عابد نے مشتاق انجم کے افسانوں کا افسانوی انداز میں تجزیہ کیا۔ ڈرامہ نگار ظہیر انور نے کہا کہ مشتاق انجم کے افسانوں میں آج کا افسانہ نگار بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ کلکتہ کے استاد شاعر جناب قیصر شمیم نے کہا کہ مشتاق انجم نے اپنی کہانیوں میں ان سچائیوں کو پیش کیا ہے جو دیکھی یا سنی یا پڑھی ہوئی یا جھیلی ہوئی ہیں۔ جناب انیس رفیع نے کہا کہ مشتاق انجم نے اپنے افسانوں کے ذریعے روایتوں کا بھی پاس رکھا ہے اور جدید افسانے کے تقاضے کو بھی پورا کیا ہے۔ صدر جلسہ ڈاکٹر ظفر اوگانوی نے کہا کہ افسانے کا فن غزل کا فن ہے۔ افسانے کے فن میں منظر نگاری، ماحول کی شناخت اور اس کے مسائل کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کرنے کا فن مشتاق انجم کا خاصہ ہے۔ ان کے علاوہ خالق عبداللہ، معصوم شرقی، نعیم انیس، شمشیر عالم صاحبان نے مضامین پڑھے۔

ماہنامہ انشاء کلکتہ

بائیں سے : "بے گھری" کے مصنف کو اجراء کار انیس رفیع کتاب کی پہلی جلد پیش کرتے ہوئے

رپورٹ : ممتاز عارفی (کلکتہ)

شاہجہاں پور میں ایک شام رشید حسن خاں کے نام

پچھلے عرصہ عالمی شہرت یافتہ ناقد، محقق اور دانشور عالی جناب رشید حسن خاں کے اعزاز میں ایک شعری نشست بر مکان شاہد رضا منعقد ہوئی۔ نشست کی صدارت رشید حسن خاں نے فرمائی۔ موصوف نے اپنے صدارتی خطبے میں شاعری کی موجودہ صورت پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ نئی نسل کا شاعر فکر کی توانائی اور بیان میں ندرت کی خواہش سے محروم نہیں ہے بلکہ اس کا المیہ یہ ہے کہ وہ چند مجبوریوں کے تحت خیال کو فوراً نظم کر دیتا ہے جس کے سبب اس کی فکر اس کے جذبے سے ہم آہنگ نہیں ہونے پاتی۔

پروگرام کے آغاز میں حضرت خالد علوی اور سید احمد سحر نے مہمان خصوصی (رشید حسن خاں) کی گلپوشی فرما کر ان کا استقبال کیا۔ نظامت کے فرائض مشہور شاعر جناب اختر شاہجہاں پوری نے انجام دیئے۔ جن شعراء نے کلام پڑھا ان کے نام درج ذیل ہیں۔

خالد علوی، شاغل دہلوی، ساغر وارثی، حامد میناٸی، رونق مسعود، نور خان نور شاہجہاں پوری، شاہد رضا، سید احمد سحر، حسرت کمالی، ملک اسمٰعیل، اختر شاہجہاں پوری۔

مرسلہ : انتخاب عالم

محروم میموریل لٹریری سوسائٹی کا قیام

جموں، برصغیر کے نامور شاعر تلوک چند محروم کی یاد میں جموں کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے چند روز قبل محروم میموریل لٹریری سوسائٹی قائم کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس کا اب باقاعدہ قیام عمل میں آگیا ہے۔ انگریزی روزنامہ کشمیر ٹائمز جموں کے چیف ایڈیٹر شری وید بھسین نے سوسائٹی کا باضابطہ افتتاح کیا۔ اس موقع پر انہوں نے محروم صاحب کی شخصیت اور شاعری کو بھرپور خراج تحسین ادا کیا۔

پدم شری پروفیسر رام ناتھ شاستری نے مالک رام کی تالیف "افکار محروم" کی رسم اجرا ادا کی اور اپنی تقریر میں محروم صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ محروم صاحب صرف بڑے شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک قابل تعریف استاد بھی تھے۔ وہ ایک عالم باعمل تھے اور انہوں نے بقول عبدالمجید سالک مرحوم ہندوستان اور پاکستان کی دو نسلوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کی ہے۔

ڈاکٹر ظہور الدین پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی جموں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ میں لڑکپن ہی سے محروم کی شاعری کا پرستار رہا ہوں اور یہی سبب ہے کہ ایم اے کے بعد جب میں نے ایم فل کے لئے مقالہ لکھا تو "محروم کی شاعری" پر تھا۔ آج بھی میں محروم صاحب کی شاعری کا دلدادہ ہوں اور مجھے خوشی ہے کہ محروم صاحب کی زندۂ جاوید نظم "نورجہاں کا مزار" ہماری یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔

حاضرین جلسہ میں پروفیسر شام لال کالڑا (عابد پیشاوری) محمد اسد اللہ وانی عابد مناوری، ڈاکٹر ضیاء الدین، ڈاکٹر نصرت ضیاء الدین، ڈاکٹر شہاب عنایت ملک، راج کمار چندن اور مسز جگن ناتھ آزاد کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ پرتپال سنگھ بیتاب نے جلسے کی کارروائی کو نہایت خوبصورتی سے چلایا۔

(مرسلہ: راجکمار چندن)

تذکرۂ ماہ و سال (جلد دوم)

اپنے پیش رو مرحوم و مغفور مالک رام کی تذکرہ نویسی کے کام کو آگے بڑھاتے ہوئے ان کی کتاب تذکرۂ ماہ و سال کی دوسری جلد مرتب کی جا رہی ہے۔ مملکت خداداد پاکستان اور دنیا کے تمام گوشوں میں رہنے والے اہل قلم (ادیب، شاعر، نقاد، محقق، مؤلف وغیرہم) مطلوبہ معلومات خوشخط تحریر میں مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال فرمائیں۔ قلمی نام، اصلی نام، ولدیت، تاریخ و مقام پیدائش، تعلیم، صنف، تصنیف ادبیت۔

مرحوم اہل قلم کے لواحقین/دوست احباب مذکورہ بالا معلومات کے علاوہ تاریخ و مقام وفات کا اضافہ کر کے ارسال فرمائیں۔

سید معراج جامی
صدر بزم تخلیق ادب پاکستان کراچی
۲۱/ قصبہ کالونی، منگھو پیر روڈ، کراچی ۷۵۸۰۰۔ پاکستان

۱۔ وقار مانوی ۳۰۳۹ سوئی شیلا گلی، ترکمان گیٹ۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶
۲۔ ظفر اقبال ظفر۔ ۱۷۰ رخیلدار۔ فتح پور یوپی ۲۱۲۶۰۱
۳۔ انجم عباسی ۔ بی-۲۱، بندوق والا بلڈنگ، جیل روڈ، ناسک بمبئی ۴۰۰۰۰۹

آپ کی ڈاک

● آپ نے مغربی بنگال اردو اکیڈمی کی ناقص کارکردگی کے سلسلہ میں اداریہ میں تحریر کیا ہے اور آخر میں اس کی سالانہ گرانٹ ۵۰ لاکھ روپے کرنے کی درخواست وزیر اعلیٰ جیوتی باسو سے کی ہے یعنی آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کی سالانہ گرانٹ بہت کم یا ناکافی ہے۔ ایسے میں اکیڈمی کی ناقص کارکردگی کی کیا شکایت؟ جب گرانٹ ہی نہیں تو کام کہاں سے ہو؟

ضرورت ہے کہ تمام اردو والے حکومت سے گرانٹ بڑھانے کا مطالبہ کریں جب گرانٹ خاطر خواہ ملنے لگے اور اس کے بعد اکیڈمی کی کارکردگی بہتر نہ ہو، تب اکیڈمی کے بارے میں سخت و سست کہنا حق بجانب ہوگا۔

عطا عابدی، نئی دہلی

● ستمبر کا اداریہ "اخبار کی بیٹی تسلیمہ نسرین" خوب رہا۔ اس بار افسانے متاثر نہ کرسکے صرف پروفیسر اقبال احمد/خالد سہیل کا افسانہ "والدہ" پسند آیا۔ آصف فرخی کا سفرنامہ "دوسری جنگوں کا وقت" اچھا لگا۔ مضمون "یونان کے فلسفی" معلوماتی ہے۔ غزلوں میں رزاق آکسر، عاصی کاشمیری، ڈاکٹر سجاد سید، عرفان بنارسی، خالد عبادی، شاہد رضا و طاہر تلہری کی غزلیں خوب لگیں۔ تبصرۂ کتب میں محترم شہود عالم آفاقی صاحب کا انداز پسند آیا۔

بدنام بشر، پاکوڑ (بہار)

● ستمبر اور اکتوبر کے شمارے ایک ساتھ موصول ہوئے۔ تخلیقات کا انتخاب بہت معیاری ہے۔ کیدار ناتھ شرما کا افسانہ قابلِ ستائش ہے۔ آصف فرخی کا سفرنامہ کافی معلوماتی ہے۔ عزیز غازی پوری کی غزل اچھی ہے مگر ان کا ایک شعر ہے

رہنے کو رہ رہا ہوں میں پکّے مکان میں
لیکن کہاں سکون جو مٹی کے گھر میں تھا

میرے شعر

دیوار و در محل کے مجھے ڈس رہے ہیں آج
اب وہ سکون کہاں ہے جو مٹی کے گھر میں تھا

کا چربہ ہے۔ میری غزل جس میں مذکورہ شعر ہے آزاد ہند (کلکتہ) اور آسنسول (پٹنہ) میں شائع ہو چکی ہے۔ طاہر تلہری صاحب نے اپنی غزل میں لفظ "المیہ" کو فعولن کے وزن پر باندھا ہے جبکہ اس کا وزن فعلاتن ہے۔ موصوف کے مقطع کے شعر میں شاید "محیط" لفظ کی کتابت ہونے سے رہ گئی ہے ★ شباب للت کی غزل شمارے کی روح ہے اور فن کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔

معراج احمد معراج، کلٹی (مغربی بنگال)

★ **از مدیر:** جی ہاں۔ یہ کتابت کی غلطی ہے۔ جب آپ اتنا شعور رکھتے ہیں تو ایسی باتوں کی گرفت کیوں کرتے ہیں۔ صرف سطحی عروضی تنقید پر کسی شاعر کی کم قدری کرنا غلط بات ہے۔ آج کل ایسے راسلے بہت لکھے جا رہے ہیں۔ اب ہم ان کی اشاعت آئندہ شمارے سے بند کر رہے ہیں۔

● نومبر دسمبر کے شمارہ میں جناب خورشید ملک کا خط پڑھ کر سخت حیرانی ہوئی۔ انہوں نے لکھا ہے: "میں جناب رام پرکاش کی یہ غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں کہ تقسیم ملک کے بعد پاکستان سے آنے والوں کو یہاں والوں نے سینے سے لگا لیا ہے" لیکن انہوں نے کوئی دلیل اس بارے میں نہیں دی ہے۔ اس میں غلط فہمی کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ میں نے نہایت مخلصی اور دیانت داری سے اپنے احساسات اور جذبات پیش کئے ہیں کہ جب "یہ فیصلہ کر لیا کہ مستقل یہیں رہنا ہے تو اس کے بعد ایک لمحے کے لئے بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ ہم مہاجر یا پناہ گزین ہیں اور حکومت اور مقامی لوگوں نے بھی ہمیں یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ ہم غیر ملک سے آئے ہیں"۔ یہ میرے اپنے ذاتی احساسات کی بات ہے اور میرے سب دوست رشتہ دار اور پاکستان سے آئے زیادہ تر لوگ ایسا ہی محسوس کرتے ہیں۔ یہ ہمارا فیصلہ ہے۔ جناب خورشید ملک صاحب ہمارے نجی احساسات کے بارے میں کیسے فیصلہ دے سکتے ہیں۔ آگے وہ لکھتے ہیں: "یہ دیگر بات ہے کہ ان کو پناہ گزین نہیں کہا جاتا۔ پنجابی ضرور کہا جاتا ہے"۔ پنجابی ان کو مہاجر یا پناہ گزین الفاظ کے بجائے یا اس معنی میں نہیں کہا جاتا جیسا کہ خورشید ملک صاحب کا مطلب ہے۔ بلکہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ پنجاب سے آئے ہیں اور ان کی مادری زبان پنجابی ہے اور پنجابی تو مشرقی پنجاب کے مقامی باشندوں کو بھی کہا جاتا ہے اور مہاجرین میں تو سندھی، بنگالی اور صوبہ سرحد و بلوچستان سے آئے لوگ بھی شامل ہیں انہیں کیا کہا جاتا ہے؟ کم از کم مہاجرین یا پناہ گزین تو نہیں کہا جاتا۔ جیسا کہ پاکستان میں ہندوستان سے جانے والوں کو اب بھی کہا جاتا ہے؟ مقامی لوگوں کے مہاجرین کو دل سے قبول کر لینے کے میرے دعوے کو غلط ثابت کرنے کے لئے انہوں نے کوئی ٹھوس دلیل دینے کے بجائے اُلٹا مہاجرین پر الزام لگایا ہے کہ وہ اپنی الگ شناخت بنائے رکھنا چاہتے ہیں اور اگر ان کی یہ بات سچ بھی مان لی جائے کہ پاکستان سے آئے لوگ اپنی الگ شناخت بنائے رکھنا چاہتے ہیں تو اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ مقامی لوگوں نے انہیں قبول نہیں کیا ہے۔

وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ "ان لوگوں کی الگ کالونیاں دیکھنے سے ہی پتہ چلتا ہے کہ وہ ہم لوگوں سے الگ تھلگ رہنا پسند کرتے ہیں"۔ میں خورشید ملک صاحب کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہ "الگ کالونیاں" شرنارتھیوں کی خواہش یا مرضی کے مطابق نہیں بنائی گئی تھیں بلکہ اس وقت کے حالات کا تقاضا تھا۔ تقسیم ملک کے وقت پاکستان سے آنے والے ہندو سکھ پہلے مشرقی پنجاب آئے اور زیادہ تر وہیں مسلمانوں کے چھوڑے ہوئے مکانوں میں بس گئے اور باقی آگے دہلی، یوپی کے شہروں اور ملک کے کچھ اور بڑے شہروں میں پہنچ گئے۔ ان کی عارضی اور فوری رہائش کے لئے گورنمنٹ نے کھلے میدانوں میں خیمے و شامیانے لگا دیئے یا ان کو دوسری جنگ عظیم میں بنی فوجی بیرکوں خالی بارکوں میں جگہ دی اور بعد میں ان کو مستقل طور پر بسانے کے لئے انہی ریفیوجی کیمپوں کی جگہ پر کوارٹر بنا کر دیئے یا پلاٹ الاٹ کر دیئے۔ اس لئے "الگ کالونیاں" مہاجرین نے نہیں بنائیں، گورنمنٹ نے بنائی تھیں اور اس میں ان کی مرضی اور خواہش کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس پہلی آبادکاری کے بعد جو کالونیاں بڑے شہروں میں کوآپریٹیو سوسائٹیوں یا پرائیویٹ ہاؤسنگ بورڈ نے بنائی ہیں ان میں مہاجر و مقامی

لوگ ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔

الگ شناخت کے سلسلے میں ایک اور بات بھی انہوں نے لکھی ہے۔ "آج تک وہ اپنے ہی لوگوں میں شادی بیاہ کرتے ہیں" یہ صرف انہی کی خصوصیت نہیں ہے۔ سارے ہندوستان میں اور کئی غیر ممالک میں بھی عام لوگوں میں اپنی جان پہچان، اپنی ذات برادری کے لوگوں اور اپنے ہی حلقۂ زبان میں شادی بیاہ کرنے کی روایت ہے۔ ہندوستان میں سولہ بڑی اور کئی چھوٹی زبانیں بولنے والے لوگ ہیں اور وہ سب زیادہ تر اپنے حلقۂ زبان میں ہی اور اپنی ہی ذات کے اندر بیاہ شادی کرنا پسند کرتے ہیں۔ ہندوؤں میں چار بڑی ذاتیں ہیں لیکن ہر ذات میں سینکڑوں چھوٹی چھوٹی ذات برادریاں ہیں اور بیاہ شادی عموماً محدود چھوٹی برادری کے اندر ہی ہوتے ہیں۔ ہندوؤں میں ہی کیوں عیسائیوں میں بھی کیتھولک پروٹسٹنٹ اور دوسرے گرجوں کے پیروکار اپنے ہی چرچ والوں کے درمیان اور اپنے ہی حلقۂ زبان میں شادی کرنا پسند کرتے ہیں اور اسلام جیسے ذات پات سے اوپر اٹھے اور مساوات والے مذہب کے پیرو بھی اپنے ہی فرقہ شیعہ، سنّی، بوہرہ، انصاری، قریشی، اشرفی وغیرہ میں اور اپنے ہی حلقۂ زبان کے اندر شادی بیاہ کرنا پسند کرتے ہیں۔ اونچی ذات والے مسلمان بھی عام طور پر نیچی ذاتوں سے رشتہ نہیں کرتے۔ یہ عام روایت ہے۔ لیکن میں خورشید ملک صاحب کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مقامی اور مہاجر پنجابیوں کے بیچ بیاہ شادی کا عام رواج ہے۔ کیونکہ ایک ہی ذات برادری کے لوگ دونوں طرف موجود ہیں۔ میرے سامنے بیسیوں ایسی مثالیں ہیں اور یہ میں ذاتی علم کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ یہ مثالیں میرے قریبی رشتہ داروں اور دوستوں کے کنبوں کی ہیں۔

اور اب تو اس بدلتے وقت میں کافی لوگ ذات برادری اور حلقۂ زبان سے باہر بھی شادیاں کرنے لگے ہیں اور اگر خورشید ملک صاحب کے پاس ".... پاکستان میں یہاں سے گئے لوگوں کی شادیاں وہیں کے لوگوں میں ہوتی رہی ہیں یہ کی مثالیں ہیں"۔ تو یہاں بھی ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ میری اپنی سگی بڑی بہن کے ایک لڑکے نے مہاراشٹرین لڑکی اور ایک لڑکی نے مہاراشٹرین لڑکے سے شادی کی ہے۔ جن کی مادری زبان مراٹھی ہے اور یہ شادیاں ماں باپ کی مرضی سے اور مذہبی ریت رواج کے مطابق ہوتی ہیں۔

ادارہ کا یہ لکھنا۔ " دراصل مہاجر کا فتنہ کھڑا کرنے والے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے کوشاں ہیں اور پھر کچھ ادھر سے ہوا بھی دی جارہی ہے"۔ حقیقت سے آنکھیں بند کرنے کے مترادف ہے۔ کراچی اور حیدرآباد سندھ کے مقامی اور مہاجر لوگوں کے درمیان نفرت اور تناؤ اور لڑنے بڑے پیمانے پر دنگے فساد جن میں اب تک ہزاروں جانیں جاچکی ہیں کیا صرف سیاسی مقاصد کے حصول" اور" ادھر سے دی جارہی ہوا" کا ہی نتیجہ ہیں۔ یا اس بات کا نتیجہ ہیں کہ مقامی پاکستانیوں نے مہاجرین (مشرقی پنجاب سے گئے مسلمانوں کو چھوڑ کر) کو دل سے قبول نہیں کیا اور ان کو غیر ملکی ہی سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مسلم لیگ یا پیپلز پارٹی میں شامل ہونے کے بجائے مہاجرین کی بہت بڑی اکثریت نے اپنی خود کی پارٹی مہاجر قومی محاذ بنالی ہے۔ جس کے نمائندے ایم پی اے، ایم این اے مرکزی و صوبائی اسمبلیوں میں موجود ہیں۔ کیا خورشید ملک صاحب ہندوستان میں کسی ایک ایم پی یا ایم ایل اے کا نام بتا سکتے ہیں جو اپنے آپ کو صرف اور خصوصی طور پر شرنارتھیوں کا نمائندہ کہتا ہو کبھی انہوں نے شرنارتھیوں اور مقامی لوگوں کے بیچ بڑے پیمانے پر دنگوں کی خبر سنی ہے؟ وہ پنجاب اور ہریانہ (جہاں پاکستان سے آئے ہوئے لوگوں کی اکثریت آکر بسی ہے) کسی شہر میں چلے جائیں۔ ان کے لئے مقامی اور مہاجر پنجابیوں میں

تمیز کرنا مشکل ہوجائے گا کیونکہ اُن کا رہن سہن، ریتی رواج اور لباس وزبان ایک ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں ایسا نہیں ہے۔ یوپی اور بہار کے مسلمانوں کا تہذیب وتمدن اور زبان پاکستان کے مقامی باشندوں سے مختلف ہے۔

اس سلسلے میں میں جناب خورشید ملک کی مزید یاددہانی کے لئے ستمبر کے انشاء میں ہی چھپے جناب رئیس الدین فریدی مدیر روزنامہ ہند کلکتہ کے مکتوب کے چند الفاظ دہرانا چاہتا ہوں۔

"۔۔۔۔ جو اردو والے پاکستان کی خاطر خون بہانے اور گھر لٹوانے کے بعد مشرقی ومغربی پاکستان گئے تھے وہ ۴۵ سال بعد بھی اجنبی ہی بنے ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مزید تباہ وبرباد کئے جارہے ہیں وجہ صرف یہ ہے کہ ان کی زبان اردو ہے اور وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتے۔ پنجاب والوں نے تو تقسیم کے وقت ہی اردو والوں کو جگہ دینے سے انکار کردیا تھا اور ان میں سے جو تین لاکھ آدمی بنگلہ دیش میں پڑے ہوئے ہیں ان کو جگہ دینے کے لئے آج بھی تیار نہیں ہیں۔ تمام ہندوستانیوں کو بھیڑ بکری بنا کر سندھ میں بھر دیا گیا ہے اور عزت وآبرو کے دشمن ہو رہے ہیں۔ ان سے انگریز ہی غنیمت ہیں کہ وہ اردو والوں کا کچھ نہ کچھ حق تو مان رہے ہیں"

اس سلسلے میں مجھے مولانا ابوالکلام آزاد کی وہ پیغمبرانہ پیشن گوئی بھی یاد آتی ہے جو انہوں نے ۱۹۴۷ء میں پاکستان جانے والے ایک گروپ کے ساتھ گفتگو میں کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔

"آپ مادرِ وطن چھوڑ کر جارہے ہیں۔ آپ نے سوچا اس کا انجام کیا ہوگا؟ آپ کے اس طرح فرار ہوتے رہنے سے ہندوستان میں رہنے والے مسلمان کمزور ہو جائیں گے اور ایک ایسا وقت بھی آسکتا ہے جب پاکستان کے علاقائی باشندے اپنی اپنی جداگانہ حیثیتوں کا دعویٰ لے کر اُٹھ کھڑے ہوں۔ بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچ اور پٹھان خود کو مستقل قومیں قرار دینے لگیں۔ کیا اُس وقت آپ کی پوزیشن بن بلائے مہمان کی طرح نازک اور بے کسانہ نہیں رہ جائے گی؟ ہندو آپ کا مذہبی مخالف تو ہو سکتا ہے۔ قومی اور وطنی مخالف نہیں۔ آپ اس صورت سے نمٹ سکتے ہیں مگر پاکستان میں آپ کو کسی وقت قومی اور وطنی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑ جائے گا جس کے آگے آپ بے بس ہو جائیں گے۔"

آخر میں میں جناب خورشید ملک صاحب سے نہایت ادب سے گزارش کروں گا کہ آنکھیں کھول کر حقیقت کا سامنا کریں اور میری "غلط فہمی" دور کرنے کے بجائے اپنی "خوش فہمی" دور کرنے کی کوشش کریں۔

رام پرکاش کپور، وفاق (ہماچل پردیش)

● انشاء کے حالیہ شمارے میں نارنگ کے خلاف مضمون کی شمولیت پسند نہیں آئی۔

کاش اس نوعیت کے اشتعال انگیز مضامین و مکتوبات سے گریز کیا جائے۔

تسلیمہ نسرین پر چھاپے خطوطات جس مظلومیت ذہنی کے آئینہ دار ہیں۔ اس نے ہندوستان پر ظلم کے شواہد پیش کئے ہیں۔ انہاگاندگی حیات ہوتیں تو جگہ شرپسند نقیبوں کو اسلم سیلانی کرکے لانا مدیا ہوتا۔ پاکستان میں مہاجرین پر جو ظلم و استبداد روا رکھے گئے ہیں اردو پریس اس پر کیوں خاموش ہیں۔

میرے خلاف کینیڈا کے ایک شخص کا ناروا مکتوب شامل کرنا کیا ضروری تھا جس بقول بدست انقلاب رہا ہوں (دیا دد مئی ۹۳)

تاراچرن رستوگی ، گرباٹ

● گفتنی "تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا" بڑھا بلکہ بہت ہی خوب لکھا ہے، جتنی داد دوں کم ہے۔ آپ نے مسلمانوں کے معاشرتی، معاشی، سیاسی، دینی غرضیکہ زندگی کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتے ہوئے گفتنی میں ان کا تجزیہ پیش کر دیا۔ ریزرویشن کے ہم قائل کو مسلمانوں کے حق میں خطرناک ہونے کا اشارہ جس طرح آپ نے دیا ہے مسلمانوں کے کسی دانشور (نام نہاد) نے نہیں دیا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ نے دینی (اسلامی) نقطۂ نظر سے اس کے خراب اور ذلت آمیز ہونے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ واقعی مسلمان، جس کی وصف بیانی میں خود قرآن کہہ رہا ہے کہ "تم ہی غالب رہو گے، اگر تم سچے مومن ہو" وہ بھلا پست و پس ماندہ ہو سکتا ہے؟

آپ نے بڑا ہی صحیح اندازہ لگایا کہ بہوجن سماج پارٹی مسلمانوں کی بڑی اقلیت کو پس ماندہ ثابت کر کے اکثریت کے خلاف اپنے فائدے کے لئے لڑوانا چاہتی ہے۔ آپ کا یہ فرمانا بھی درست (صد فیصد) ہے کہ فسادات میں پس ماندہ لوگ ہی مسلمانوں کو زیادہ اذیت پہنچاتے رہے ہیں۔ اعلیٰ ذات کی قومیں تو صرف بھڑکانے کا کام کرتی رہی ہیں۔

ص۲ کا آپ کا وہ جملہ "اکثر دیکھا گیا ہے کہ مسلمان امیدوار تحریری مقابلے تو پاس کر گئے لیکن انٹرویو میں فیل ہو گئے" کو "فیل کر دیئے گئے" پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

اس لئے کہ نوکریوں کے معاملے میں اکثر یہی صورت پیش آتی رہی ہے۔ میرا ایک بھانجہ پ۔ ۲۔ ی۔ کے لئے ایک جگہ پہنچا۔ دوڑ میں رکاوٹوں بھرے جال نکلنے میں عارضی دیوار کود جانے میں اول آیا (پانچ سو لڑکوں میں)، اونچائی، سینہ کی چوڑائی، وزن وغیرہ میں بھی پورا اترا لیکن جب نام مسلمان کا دکھائی دیا تو اسے انٹرویو میں فیل کر دیا گیا۔ یہ کہہ کر کہ تمہاری بینائی ٹھیک نہیں ہے حالانکہ وہاں بینائی ٹیسٹ نہیں کی گئی تھی، خیر!

خدا سے دعا ہے کہ اس "گفتنی" کو تمام مسلمانوں کے لئے ذریعۂ خیر بنا دے۔ آمین

سید یحییٰ نشیط ، کلگاؤں

● آپ کے انہماک اور محنتوں کی بنا پر انشاء ملک و بیرون ملک کے قارئین کے وسیع حلقوں کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ اس اہم رسالے کے لئے بین الاقوامی ترتیب نمبر کا حصول بھی یقیناً خوش آئند ہے۔ ایک مستحسن پہلو یہ بھی ہے کہ انشاء دیگر قابل ذکر ادبی رسائل کی طرح شعر و ادب کی رفتار کا اشاریہ تو ہے ہی مگر اس کے علاوہ یہ سیاسی، سماجی اور معاشرتی افکار کی ترجمانی اور عصری رجحانات کی ترسیل کے تقاضے بھی پورا کرتا ہے، اور ان موضوعات پر اہم مضامین و مباحث سے آراستہ ہوتا ہے۔

آپ کا خوابوں کے متعلق انگریزی سے ترجمہ کردہ مضامین کا سلسلہ پچھلے شماروں سے بڑی دلچسپی اور توجہ سے پڑھا جا رہا ہے۔ اس طرح کی نگارشات اردو رسائل میں کم کم ہی چھپتی ہیں۔

عبدالاحد ساز ، بمبئی

● قارئین کے خطوط اور بھی رسائل میں شائع ہوتے ہیں لیکن "آپ کی ڈاک" کے عنوان سے مستقل کالم انشاء کی ایسی خصوصیت ہے جو کہیں اور نہیں پائی جاتی۔ لیکن معاف کیجئے بعض اوقات کچھ باتیں قلم کار حضرات کی دل آزاری اور قارئین کی بدمزگی کا باعث بن جاتی ہیں، خصوصاً جب کوئی صاحب قلم برداشتہ ہو کر غزلوں کا پوسٹ مارٹم کرنے لگتے ہیں۔ ان کی مکتبی قسم کی تنقید نگاری کو دیکھ کر اردو ادب کی بیکسی و لاچاری پر ترس آنے لگتا ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور ہم ایطائے جلی اور ایطائے خفی اور سبب و وتد کے چکر میں پڑے ہوتے ہیں۔ عروض کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم، زبان و بیان کے قواعد سے بھی کسی کو انکار نہیں بشرطیکہ معترض پر اعتراضات کا جنون سوار نہ ہو۔ الفاظ کی اصوات کا عرفان اتنا آسان نہیں جو ہر کسی کو حاصل ہو جائے۔ معترض کو نسیم شاہجہاں پوری کے جن جن مصرعوں پر اعتراض ہے وہ مصرعے خود معترض کے گھڑے ہوئے مصرعوں سے بہتر ہیں۔ مثلاً

نسیم شاہجہاں پوری ۔ ؎ ہزار رنج سہی آؤ ہم گلے مل لیں
احسان علی شاکر ۔ ؎ ہیں لاکھ رنج تو کیا، چاہئے گلے ملنا

ہزار رنج اور ملنے میں جو نغمہ (ease ?) ہے وہ معترض کے مصرعہ میں نہیں۔ کیا معترض کی نظر مَن اور عمّا اور یجعل لکم پر نہیں گئی؟ اول الذکر دونوں الفاظ اصل میں مِن مَن اور عن ما ہیں جنہیں تنافر صوتی کی وجہ سے مَن اور عمّا میں بدلا گیا ہے۔ اسی طرح نسیم صاحب کے مصرعہ میں "آج جی بھر" میں جس شوق و اشتیاق کا اظہار ہوا ہے وہ معترض کے تجویز کردہ مصرعے سے غائب ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ شعر کہتے وقت جو جذبہ کارفرما تھا معترض کے اعتراض اور اصلاح کے وقت نہیں تھا۔

لندن کے اطہر راز صاحب کو فضا ابن فیضی کے "خنجر کھلا رکھنے" اور "آئینہ آشنا ترچھا رکھنے" پر اعتراض ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ الفاظ کے لغوی معنی کے علاوہ اُن کی ایک فضا بھی ہوتی ہے جو الفاظ اور جذبہ کے ہم آہنگ ہونے پر پیدا ہوتی ہے۔ جذبے کی فراوانی سے لفظوں میں معنی و مفہوم کی کچھ سمتیں ابھر آتی ہیں جو سپاٹ ذہنوں پر آشکار نہیں ہوتیں۔ فضا ابن فیضی کے مصرعوں پر اعتراض اسی کم روی کا غماز ہے۔ واقع ہو کہ الفاظ جذبہ میں ڈھل کر لغت سے سیدھا ربط نہیں رکھتے۔ احساسات کی دنیا سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ یہی حال دیگر اعتراضات کا ہے۔ طوالت کے خیال سے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

شاعری میں یوں بھی دو اور دو چار کا فارمولا نہیں چلتا۔ قواعد کی رُو سے کسی خامی کے باوجود شعر تندرست و توانا ہو سکتا ہے اور زبان و بیان کے شکنجے میں بری طرح جکڑا ہوا شعر بالکل مدقوق، زندگی سے عاری ہو کر رہ جائے یہ ممکن ہے۔ بعض حضرات جو واقعی عروض داں ہیں وہ بھی بہت سی باتوں میں درگذر کا رویہ اپناتے ہیں جس سے نئی نسل کو اپنے طور پر سوچنے سمجھنے کا موقع ملے۔ مدیر انشاء کو ایسے خطوط شائع کرنے کے بارے میں سوچنا ہوگا صرف متعلق

سے دامن بچانے سے کام نہیں چلے گا۔

ایک خاص بات عرض کرنا ہے وہ یہ کہ شمس الرحمٰن فاروقی کو جس سبب خفیف نظر انداز کیا تو اس سے ان کی ناقدانہ عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مراسلہ نگار کے جوالے کی ضرورت نہ تھی میں چاہتا تھا کہ یہاں پر صفیر عنوان چشتی کی چند سطور پیش کر دوں۔ ہوا یوں تھا کہ فاروقی صاحب نے صغیر النساء بیگم کے بارے میں لکھا تھا کہ انہیں عروض پر کامل دستگاہ حاصل ہے اس پر عنوان چشتی لکھتے ہیں۔

"شمس الرحمٰن فاروقی پر بے خبری کا لیبل تو نہیں لگایا جا سکتا لیکن میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کے مطالعے کے بغیر رائے دی ہے۔ اگر انہوں نے اس کتاب کو پڑھ لیا ہوتا تو یقیناً صغیر النساء بیگم کو کامل دستگاہ رکھنے کی سند نہ دیتے۔"

(کتاب نما نومبر ۱۹۸۵ء)

عنوان چشتی کی تحریر کو خوش عقیدگی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ حق ادب ہے اس سے مراسلہ نگار کو سبق لینا چاہئے۔ میں پھر یہی کہوں گا کہ تنقید عروض و قواعد میں قید نہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا ادب کھلی فضا میں سانس لے تو تنقیدی شعور کو بھی بند ڈبوں سے نکالنا ہوگا۔

اعجاز صاحب یہ تسلیمہ نسرین بھی عجیب چیز ہے۔ دیکھئے تارا چرن رستوگی کو آپ کی صحافت مشکوک نظر آنے لگی۔ ابھی پورا شمارہ نہیں پڑھ سکا ہوں۔ عبدالقوی ضیاؔ کی چھ غزلیں ایک ساتھ پڑھنے کو ملیں۔ ایسا لگا کہ آپ نے پورے صفحہ پر پھیلتے رنگا رنگ سجا دیئے ہیں۔ ہر غزل نئے تیور اور انوکھے بانکپن کے ساتھ تسکینِ ذوق کا سامان لئے نظر آتی ہے۔ ضیاؔ صاحب اور آپ دونوں ہی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

شکیل گوالیاری، بوہارڑہ لشکر گوالیار (۴۷۴۰۰۱)

● شمارہ دسمبر میں "گفتنی" کے تحت آپ نے بڑی اہم اور ضروری باتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک سچے ادیب کے قلم سے ایسی باتیں نہ صرف کاغذ کی دنیا کو تحریک دیتی ہیں بلکہ پڑھنے والوں اور معقولیت کی سوجھ بوجھ رکھنے والوں کے منجمد خیالات میں ہل چل اور تحفظ اور بیداری کا جذبہ پیدا کرنے میں معاون بنتی ہیں۔ آج ہندوستان جن حالات سے گزر رہا ہے اس کی جانکاری ہر عام و خاص کے لئے ضروری ہے لیکن کچھ لوگ جان کر انجان بنے بیٹھے ہیں۔ کچھ جھیل کر چپ ہو بیٹھے ہیں اور کچھ جھیلنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ مسلمان ان تینوں سطحوں پر خود کو حالات کے حوالے کر چکے ہیں لیکن پھر بھی خاموشی کا زیور پہنے بیٹھے ہیں اور اگر کسی سطح پر کہیں سے کوئی آواز بھی ابھرتی ہے تو ہمارے نام نہاد لیڈر (جنہوں نے گزشتہ ۴۷ برسوں میں نہ معلوم کتنے مسلمانوں کو زندگی سے محروم کر دیا اور خود پر ایک خول بھی آنے نہ دیا) یا تو اس آواز کو اپنی قوت سے دبا کر دیتے ہیں یا پھر حکومت کے سامنے اس آواز کو باغی بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔

ہم تحفظ (ریزرویشن) اور بنیادی حق کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ مسجد جیسی پاک اور دینی جگہ چھین جانے کے بعد بھی ہم تحفظ، ریزرویشن اور حق کی بات کرتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ یہ باتیں کسی شعبے میں سیاست سے خالی نہیں۔ اور اس تقاضے میں ایک ذی شعور انسان یا عام آدمی کی ضرورت شامل ہے لیکن پھر اس بار سیاسی لیڈر اس سوال کا ہاتھ ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ کوئی بتلائے کہ کیا یہ چاہا جا سکتا ہے کہ کوئی مسئلہ اسلام سے ختم ہو جائے یا کوئی تقاضا ایکدم سے

ماہنامہ انشاء کلکتہ

پیدا ہو جاتے ہیں؟۔ بالکل نہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جب تک بیوقوف زندہ ہے ہوشیار کبھی بھوکا نہیں مر سکتا۔ اور یہ مثل ہر الیکشن کے وقت ہم پر صادق آتی ہیں۔ پھر الیکشن قریب ہے بلکہ سیاسی بازیگر اپنے اپنے دھندے پر لگ بھی چکے ہیں۔ ایسے وقتوں میں ہمیں کیا کرنا ہے یہ ہم اکثر بھول جاتے ہیں۔ ان لیڈروں اور پارٹی ورکروں سے ہمیں کوئی شکایت نہیں کیونکہ ان کی سرشت میں یہ بات شامل ہے۔ شکایت تو ان حضرات سے ہے جو ہماری قیادت کر رہے ہیں۔ ہماری مانگوں اور تقاضوں کو اپنے کاندھے پر لادے ہوئے اپنا پیٹ اور دوزخ بھر رہے ہیں۔ کل تک یہ بات بھی گوارا تھی کہ چلو کسی بہانے یہ لوگ جی تو رہے ہیں لیکن حالیہ دنوں میں ایسے لیڈروں نے اپنا دوہرا چہرہ ایکدم ننگا کر دیا۔ کئی اخباروں اور اردو رسالوں میں اپنی بیہودہ تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ ثابت کر دیا کہ انسان پیدائشی لالچی تو ہوتا ہی ہے ساتھ ہی ساتھ قومی، ملی اور مذہبی غدار بھی ہو سکتا ہے۔ میں کھلے الفاظ میں موجودہ اسپیکر (اسمبلی بہار) کی طرف اشارہ کر رہا ہوں جنہوں نے الفاظ اور جملوں کی نوک سے مسلمان کے جذبات کو کرید لیا ہے۔ شیخ، سید اور پٹھان کی کھل کر مخالفت اور دیگر ذات کی طرفداری میں بڑی دور کی بات کہی ہے۔ آپ سے بات نہیں بنی تو ان کے داماد مسٹر اعجاز جو ماشاء اللہ ایک ڈاکٹر بھی ہیں ان کی تقریروں اور تحریروں نے آپسی اتحاد کو توڑ دینے کے لئے بھرپور یلغار کی ہے۔ تو ایسی صورت میں کیا امید رکھی جا سکتی ہے کہ ہم آپسی مورچے پر کاندھے سے کاندھا ملا کر چیلنج کے قابل رہ سکیں گے۔ ذات کی لڑائی کا آخر مقصد کیا ہے؟۔

انشاء کے مشمولات میں ہر تخلیق کی اپنی اپنی انفرادیت ہے۔ افسانے اچھے لگے لیکن شعری حصہ کچھ پھیکا پھیکا نظر آیا۔ خاص نمبروں کا شدت سے انتظار ہے۔ امید ہے اس خط کو پوری صداقت سے چھاپیں گے۔

مسرور قیصر، مونگیر

● صہبا اختر کی رباعی کے ساتھ سرورق کی تصویر رنگین اور بامعنی لگی۔ مسلمانوں کے لئے طارق تحفظ کے سلسلے میں لکھا گیا اداریہ گفتنی "تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا" عصری، سیاسی، سماجی، اقتصادی، ماحولیاتی ضرورت کے مطابق ہے۔ آج دنیا بھر کے سارے مسائل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے بحث طلب ہیں اور اختلاف کی بھی گنجائش نکلتی ہے۔

بدیسی سرمایہ کاری کے دور میں "مسلمان" کس طرح شامل ہوں اور اس کے لئے انہیں کیا کچھ کرنا ہوگا؟؟۔ اس کی وضاحت ہونی چاہئے!! ایسے ادارے کھلنے چاہئیں جو ہمیں آنے والے دور کی ضرورت کے مطابق کارآمد، باصلاحیت، ہنرمند اور فعال بنائیں۔ مقصود الٰہی شیخ کے مجموعے کیسے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ مہربانی کر کے آگاہ کریں۔

شرون کمار ورما کی کہانی "وہ چلی گئی" اردو کے افسانوی ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ کہانی کے مطالعے سے شرون کمار کی تخلیقی صلاحیت کے ساتھ ساتھ زبان دانی کا پتہ چلتا ہے کہ وہ بیانیہ انداز کی کتنی خوبصورت کہانی کہہ سکتے ہیں۔ کہانی میں زبان کا فنکارانہ استعمال منشا اور ضیاء الدین کے بعد شرون کمار کے یہاں ہوا ہے۔ اور جنس کا تخلیقی و جمالیاتی اظہار علامتی انداز میں ہوا ہے۔ البتہ کہانی میں دو جگہ غیر فطری پن کا احساس ہوتا ہے۔ جناب وسیم مینائی کا مضمون "گوپی چند نارنگ۔ کردار اور گفتار اپنے خطوط کے آئینے میں" پڑھ کر شاید لوگ یہی کہیں گے خورشید ملک

شاہجہاں

بقیہ صفحہ

یہ ہے سپنوں کا ایک
متحرک بھارت

مسافر ریل کے ڈبے میں سوار ہیں۔ اسٹیشنوں پر مسافروں کا چڑھنا اترنا جاری ہے۔ یہاں پر مختلف زبانوں اور خیالات و عقائد کا ملاپ ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کیلئے اس متحرک ڈبے میں ہر دھرم اور زبان ہمخیال بن جاتے ہیں۔ اور ایک متحد ہندستان کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ نیت نئے اور مختلف الخیال اور مختلف اللسان لوگوں کے اس میل جول سے ریل کے ہر ڈبے میں ایک نئی زندگی کروٹ لینے لگتی ہے۔

پوربی ریلوے

دوستی سے بھرپور ذریعۂ سفر

RM 5693 ER

مشرقی ہندوستان کا بہترین اور واحد بین الاقوامی اردو رسالہ

ماہنامہ اِنشاء کلکتہ

جلد : ۱۰	مئی ۱۹۹۵ء	شمارہ : ۵

مدیر: ف۔ س۔ اعجاز

فہرست

فی شمارہ : ۸ روپے
زر سالانہ : ۹۰ روپے
مغربی ممالک سے : ۱۲ پونڈ یا
۲۰ ، امریکی ڈالر

رقومات بذریعہ منی آرڈر/بینک ڈرافٹ/چیک صرف "انشاء پبلی کیشنز" کے نام میں روانہ فرمائیں ورنہ قابل قبول نہ ہوں گی۔ برطانیہ سے BPO کے ذریعہ رقومات بھیجی جائیں۔

ماہنامہ اِنشاء اِنشاء پبلی کیشنز
خط و کتابت، مضامین بھیجنے اور ترسیل زر کا پتہ :
۲۵۔بی، زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳، ۷۰۰۰، فون: ۲۵۔۴۶۱۶

میٹرو شہر کے دل میں داخل ہوئی

۱۹ر فروری ۱۹۹۵ء کو سنٹرل، گریش پارک اور سودا بازار اسٹیشنوں کے افتتاح کے ساتھ میٹرو خدمات جنوب میں چاندنی چوک سنٹرل حصے میں اور شمال میں شیام بازار۔ سودا بازار۔ گریش پارک تک آپہنچی ہیں۔ گریش پارک اور سنٹرل کے بیچ صرف ایک اسٹیشن۔ مہاتما گاندھی روڈ۔ کا بقیہ ۱۶۸ کلومیٹر کا فاصلہ اسی سال میں عبور کرنے کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

سفری خدمات اب جنوب میں ٹالی گنج اور سنٹرل نیز شمال میں دمدم اور گریش پارک کے درمیان پوری طرح عمل میں ہیں۔

- سوموار تا سنیچر ٹرینیں صبح ۸ بجے سے چلا کریں گی اور اتوار کو ۳ر بجے سہ پہر سے دونوں حصوں میں چلیں گی۔
- گریش پارک سے آخری ٹرین ۹.۱۵ بجے شب اور سنٹرل سے ۹.۲۲ بجے شب چھوٹے گی۔
- دمدم۔ گریش پارک حلقے میں ٹرین ۱۲ تا ۴ بجے دن میں ۱۵ منٹ کے وقفے سے چلے گی اور اتوار کو ۲۰ منٹ کے وقفے سے چلے گی۔
- ایک طرف کا کرایہ ۵ کلومیٹر تک ۲ر روپئے ہے اور ۵ کلومیٹر سے زائد مگر ۱۰ کلومیٹر تک ۳ر روپیہ ہے۔

مسافروں کی خدمت میں

IPB
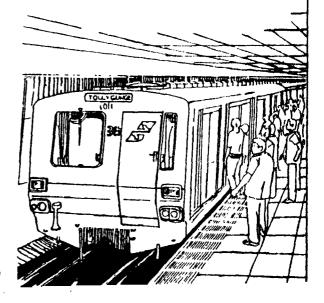
نیا صارفی سماج

(ایشوریا پیپسی لہریں)

مغربی سماج اب ہمارے لئے تیزی سے قابل تقلید بنتا جارہا ہے ۔ روس میں اشتراکیت کے زوال اور سقوط ماسکو اور خلیجی جنگ سے امریکہ کی بربریت کے بعد اب بڑے ملکوں میں آپسی ٹکراؤ کی جگہ تعاون اور بقائے باہم کی حکمت عملی نے لے لی ہے ۔ صرف عالم اسلام میں چیچنیا اور بوسنیا ظلم کی بھٹی میں جل رہے ہیں اور انسانیت کے لئے ناسور بنے ہوئے ہیں ۔ امریکہ نے جاپان کی قابل رشک صنعتی ترقی سے مرعوب ہوکر اپنی سیاست کو نیا رخ دے دیا ہے ۔ امریکی تجارتی فلسفہ حیرت انگیز طور پر تیسری دنیا کے دماغ میں بستا جارہا ہے ۔ اس وقت ین (Yen) کا پلڑا ڈالر سے بھاری ہے اور امریکہ اپنے استحکام کے لئے تجارتی فروغ کی مہم کوششوں میں لگا ہوا ہے ۔ اس نے ایشیاء میں ہندوستان کو سب سے زیادہ زرخیز خطہ مان لیا ہے ۔ اور بڑی چالاکی سے ہندوستان کے کانگریسی وزیر خزانہ اور اقتصادی مسیحا من موہن سنگھ کو لبرلائزیشن (Libera~lisation) کی حکمت عملی کا گرویدہ بنادیا ہے ۔ لطف کی بات ہے کہ چند مہینوں پہلے تک مغربی بنگال کی مارکسی حکومت اور بعض دیگر غیر کانگریسی صوبائی حکومتیں کانگریس کی اس فراخدلانہ پالیسی اور کثیر قومی سرمایہ کاروں کی آمد کے خلاف بری طرح احتجاج کرتی رہی ہیں اور ڈنکل تجاویز منظور کرنے پر مرکز کے خلاف بعض سرکاری بند بھی مناچکی ہیں لیکن اب اپوزیشن کی مرکز کے ساتھ وہ مخالفانہ یا مخاصمانہ روش باقی نہیں رہی ۔ جس کے نتیجے میں غیر ملکی سرمایہ کاروں کے لئے پورے دیش نے اپنی بانہیں کھول دی ہیں ۔

ہندوستان کی نئی مجوزہ صنعتی تنصیبات روایت کے برخلاف صرف میٹروپولیٹن شہروں میں محدود نہیں ہوں گی بلکہ اس کے لئے گردونواح میں ذیلی شہروں تک صنعت وتجارت کا دائرہ پھیلایا جارہا ہے تاکہ بڑھتی ہوئی آبادی اور مجوزہ صنعتی ترقی کو بہتر طور پر ایک دوسرے کا متحمل بنایا جاسکے ۔ نئی برقی مصنوعات کا پھیلاؤ ، راستوں اور پلوں کی تعمیر ، ذرائع سفر میں جدت کاری اور نجی کاری ، ماحولیاتی آلودگی کے خلاف بیداری ، کمپیوٹر تعلیم...... یہ سب چیزیں ہمارے یہاں اکیسویں صدی کی شروعات تک بہت عام ہوجائیں گی ۔ دور جدید ایک نئی سوسائٹی کے ماڈل کی تیاری میں صرف ہورہا ہے ۔ سال دو سال پہلے جن دکانوں کے سیل کاؤنٹر پر لکھا ہوتا تھا :

In God we trust, rest strictly cash

یا جہاں وہ مزاحیہ کارٹون چسپاں ہوتا تھا جس میں ایک موٹا دکاندار بصد اطمینان اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چروٹ کا کش لے کر کہتا ہے " میں نے اپنا مال نقد بیچا " ۔ دوسری طرف اسی کارٹون میں ایک سوکھا مریل لٹا پٹا دکاندار عالم بدحواسی میں اپنا سر پیٹ کر کہتا ہے " ہائے میں نے سارا مال ادھار بیچ دیا ، میں لٹ گیا " ۔ اب ان دکانوں کے شوکیسوں پر رنگ برنگے اسٹیکر چسپاں ہوتے ہیں جن پر تحریر ہوتا ہے " ہم فلاں فلاں بنکوں کے کریڈٹ کارڈ قبول کرتے ہیں " لہٰذا اپنا کریڈٹ کارڈ دکھایئے ، بل پر دستخط کیجئے اور باعزت طور پر ادھار خریداری کرکے اپنے دولت خانے تشریف لے جایئے ۔ اب وہ دن بھی چلے گئے جب شاعر قرض کی پیتا تھا اور کہتا تھا

قرض کی پیتے تھے لیکن دل میں کہتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

آج غالب زندہ ہوتا تو اس کا سکہ نہ سہی تو کریڈٹ کارڈ کسی نہ کسی بار میں ضرور چل جاتا ۔ بیچارہ غالب وقت سے پہلے مرگیا!
مطلب یہ کہ اب ہندوستان کے بڑے شہروں کے افراد کو یہ احساس دلایا جارہا ہے کہ تم سماج میں ایک مرعوب کن حیثیت کے مالک بن سکتے ہو

اس کے لئے تمہارے پاس تیار کیش نہ ہو تو رنج کی بات نہیں ہے۔ تمہیں صرف اتنا کرنا ہو گا کہ ایک کریڈٹ کارڈ لینا ہو گا۔ تمہارے بل کی ادائیگی کی صلاحیت کے مطابق کریڈٹ کارڈ پر تمہیں آسان شرط پر ادھار ملتا رہے گا۔ چنانچہ کھاؤ، پیو اور موج کرو۔ کریڈٹ کارڈ ہی وہ شے ہے جو مغرب کے صارفی سماج میں انقلاب لائی ہے۔ اور اب ہمارے لئے باعث کشش بنتی جارہی ہے۔ یقیناً جب کریڈٹ کارڈ کرنسی کا قابل انحصار نعم البدل بنے گا تو صارفین میں اپنا سماجی مرتبہ اونچا کرنے کا خیال پیدا ہو گا اور وہ اپنے بلوں کی بروقت ادائیگی کی عادت اپنانے لگیں گے۔ یہ اچھی بات ہے۔ اب تو طبی جانچ اور علاج کی فیس اور بیمہ کی رقم بھی کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ ادا کی جاسکتی ہے۔ صرف اپنی مالی صلاحیت پر آپ کا اپنا اعتماد پکا ہونا چاہیے۔ لیکن ہندوستانی معاشرے کو اچھی طرح صارفیت پرست بنانے کے لئے مادی آسائشوں کے ساتھ جنسی لذتوں کا اسیر بھی بنایا جارہا ہے۔ ہر قسم کی پروڈکٹ کی فروخت کے لئے جو پبلسٹی پروگرام بنایا جاتا ہے اس میں ماڈل گرل کی زبردست گنجائش رکھی جاتی ہے، چاہے گنجائش زبردستی نکالنا پڑے۔ آپ گھر میں بیٹھے ہیں۔ اچانک دروازے کی گھنٹی بجتی ہے۔ آپ دروازہ کھولتے ہیں تو ایک عورت آپ کو بسکٹ، ٹوتھ پیسٹ، بریزئر یا پینٹی یا ویکیوم کلینر کا نمونہ دکھاتی ہے اور آپ کو پھسلاتی ہے کہ آپ اس سے کچھ خرید لیں۔ عورت کے بارے میں وہ تصور بالکل بدل چکا ہے جو اب سے پندرہ سال پہلے تھا۔ پریہ تندولکر نے ایک ٹی وی سیریل "رجنی" میں جس قسم کا کردار ادا کیا تھا وہ مثبت اور تعمیری تھا۔ اس کے ذریعہ اس نے محروم اور دبی کچلی ہندوستانی عورت میں ایک جرأت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ عام ہندوستانی عورت کی ایک بنیادی اور انسانی ضرورت تھی۔ اس قسم کی تصویریں مرد اور عورت اور عورت اور سماج کے مابین ایک توازن اور انصاف قائم کرنے کا سبب بنتی ہیں۔ آپ نے کپڑا دھونے کی ایک خود کار مشین کا اشتہار ملاحظہ فرمایا ہو گا جس میں ایک پنجرے کی قیدی، بیوی پنجرہ توڑ کر آسمان کی خوبصورت نیلاہٹوں میں آزادی کے ساتھ اڑتی چلی جارہی ہے جب کہ واشنگ مشین میں گھر بھر کے کپڑے دھل رہے ہیں۔ ظاہر ہے اب عورت صرف گھریلو معاملات اور کپڑے دھونے اور باورچی خانے میں کھانا پکانے کی ذمہ دار نہیں رہ گئی ہے۔ وہ بیوی ہونے کے علاوہ کسی دفتر میں ملازمت بھی کر سکتی ہے یا کاروبار بھی کر سکتی ہے۔ اپنی عورت کے لئے جبر و مشقت کے ماحول سے رہا ہونے کا تصور خود روشن خیال مرد کے لئے بھی راحت رساں ہوتا ہے۔ چنانچہ اب عورت کا ایک نیا کردار ہمارے سامنے لایا جارہا ہے۔ اور کم سے کم ہمارے بڑے شہروں میں عورت کا تازہ ترین روپ مغربی تصور سے زیادہ قریب ہونے لگا ہے۔ عورت کا حسن اور اس کا جسمانی اثاثہ بڑی عیاری کے ساتھ تجارتی اداروں کے تصرف میں آنے لگا ہے۔ سشمیتا سین حسینۂ کائنات اور ایشوریا رائے حسینۂ عالم قرار دی گئیں۔ ایک ہی سال میں مغربیوں نے یکے بعد دیگر دو ہندوستانی حسیناؤں کے چار چاند لگادیئے۔

تمام میڈیا کی نظریں ان دو گلیمرس دوشیزاؤں پر ہیں۔ وہ کیا کھاتی ہیں، کیا پیتی ہیں، کیا پہنتی ہیں، کیا فرماتی ہیں، ان کے کیا ارادے ہیں ان کے تعلق سے ان باتوں کی بھرمار اخباروں میں ہوتی ہے۔ جب یہ حسینائیں حسن کے مقابلے جیت کر اپنے وطن لوٹیں تو کس کس طرح ان کی پذیرائی نہیں ہوئی تھی۔ سشمیتا سین نے تو نئی دہلی میں بگھی پر قومی ترنگا لہراتے ہوئے سفر کیا (جو ایک جرم تھا)۔ حد یہ کہ جن سن رسیدہ وزیروں اور عالی مقام ہستیوں کے لئے ناتوانی اور ضعف کے سبب ان حسیناؤں کے تاج کی جگمگاہٹ اور چہروں کی تابانی کو اپنے جھری دار پپوٹوں میں سنبھال کر رکھنا دشوار تھا وہ بھی ان سے ملے۔ مدر ٹریسا جو ہندوستان میں عیسائی مت کی سب سے بڑی سربراہ مانی جاتی ہیں نے بھی کلکتہ میں سشمیتا سین کو خاص طور پر وقت ملاقات دیا جب کہ ۱۳/ اپریل ۹۵ء کو مہاویر جینتی کے دن جینی عورتوں نے احتجاج کیا کہ ہندوستانی ناریوں کو ایسے مقابلہ حسن میں حصہ لینے سے روکا جائے۔ ظاہر ہے ہندوستانی لڑکی کا عالمی حسن کا مقابلہ جیتنا قومی نقطۂ نگاہ سے کوئی اعزاز نہیں سمجھا جائے گا۔ ہندوستان کے کلچر اور تہذیب کا عرفان اہل مغرب کو بھی ہے۔ یہاں عورت ماں، بہن، بیٹی، بہو ہر طور پر ایک الگ تھلگ اور برتر مقام رکھتی ہے۔ اہل مغرب ایکبار اسکولوں اور کالجوں کی لڑکیوں کے ذہنوں سے عورت کا وہ باعظمت تصور مٹادیں اور نئی عورت کا پسندیدہ تصور کہہ کر سشمیتا سین اور ایشوریا رائے کے پیکر ان کے خیال و خواب میں بسادیں تو پھر ہمارے گلی کوچوں میں ایک سے ایک نئی تجارتی بہاریں جو بن دکھاتی پھریں گی۔ سرمایہ دار مغرب اپنی جنسی نفسیات کے علم کو بڑی مہارت سے ہمارے صارفین کے ذہنی غسل کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ عورت کا تصور مسخ کر کے کروڑوں نوجوانوں کو نئی عادات کا غلام بنانا مقصود ہے۔ اس کے بعد لذت اور جسمانی آسودگی کے انوکھے سامان بازار میں لائے جائیں گے (آنے بھی لگے ہیں)۔

پچھلے دنوں پیپسی (Pepsi) کمپنی نے اس بات کی تشہیر پر لاکھوں روپے خرچ کئے کہ پیپسی کے شوقین اگر حسینۂ عالم ایشوریا رائے سے اپنے

گھر پر ملاقات کرنا چاہتے ہوں تو اپنا مقدر آزمائیں ۔ جس کا نام قرعہ اندازی میں نکلے گا اشوریا کلکتہ اس خوش نصیب کے گھر پہنچ گی اور اس کے ساتھ پیپسی نوش کرے گی ۔ لیجے صاحب ۔ ملکہ حسن کی اوقات دیکھئے ۔ کہ جو پیتا وہی سکندر ۔ ایشوریا نے جیتنے والے کے گھر پوری پیپسی ٹیم اور پولیس کے حفاظتی دستے کے ساتھ حاضری دی کہ لو جی پیپسی پی لو ، تمہارے گھر آگئی ہوں ۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ کلکتہ کے عام اور خاص کسی مقام پر نہ لوگوں نے ایشوریا کو دیکھنے کے لئے بے تابی ظاہر کی اور نہ اسے دیکھ کر چونکے ۔ اب بھلا من چاہی لڑکی کے ساتھ صرف پیپسی پینے میں اور وہ بھی سکیورٹی دستے کی موجودگی میں کسی کو کیا چارم ہو سکتا تھا ۔ ہاں خوش بختوں کو حسینہ عالم کے ساتھ اکیلے پیپسی پینے کے علاوہ کچھ پکوڑے و کوڑے کھانے تک کی مہلت دی جاتی تو انہیں زندگی بھر یاد رہتا کہ کبھی سر پر ہما کا سایہ پڑا تھا ۔ لیکن جس ماحول میں ایشوریا کے ساتھ پیپسی پینے کا موقع ہاتھ آیا اس میں تو شاید کسی کی آنکھیں ہی خاموشی سے اس شعر کا مفہوم ادا کر پائی ہوں

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں

قصہ مختصر ، ہندوستانی معیشت کے دروازے پر وہ حیرت انگیز تبدیلیاں دستک دے رہی ہیں جو ہماری بنیادی ثقافتی قدروں کا صفایا کر ڈالیں گی ۔ ٹکنالوجیکل انقلاب تک تو بات ٹھیک تھی لیکن یہ تبدیلیاں ہندوستانی صارفین کا ظرف ، اس کا مقدر ، اس کا ذوق شوق شاید سب کچھ بدل ڈالیں ۔ اس کے ہوش و حواس پر ابھی کچھ اور بجلیاں گرنے کا انتظار کیجئے ۔ ذرا پیپسی پیجے اور ٹھنڈے ٹھنڈے سوچئے ، ٹکنالوجی سے اس انقلاب کی آواز اور تجلی کتنی شیریں اور کتنی ہوش ربا ہے !

اسکنڈے نیویائی ادب نمبر

وعدے کے مطابق ماہنامہ انشاء کا " اسکنڈے نیویائی ادب نمبر " پیش کر دیا گیا ۔ ۶۲۰ صفحات کا ضخیم اور مصور رسالہ جن قارئین تک پہنچ چکا ہے انھوں نے اسے پاکر ہمارے لئے انوکھے جذبہ ، تشکر اور سرشار محبت کا اظہار کیا ہے ۔ ہماری ذاتی اپیل پر باذوق ادیبوں اور فن شناسوں نے اس خصوصی نمبر کو حاصل کرنا شروع کر دیا ہے اور ملک بھر سے سینکڑوں انشاء نوازوں نے نمبر مل جانے کے بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر یا بنک ڈرافٹ ارسال فرمائی ہے ۔ دیگر اصحاب کے آرڈر مع پیشگی رقومات موصول ہو رہے ہیں ۔ اس خاص نمبر کی قیمت اندرون ملک ۳۰۰ روپے اور بیرون ملک ۳۰ امریکی ڈالر یا ۲۰ برطانوی پونڈ ہے ۔

" اسکنڈے نیویائی ادب نمبر " کی اشاعت اردو صحافت کے لئے ایک نیا تجربہ تھی ۔ اس نمبر کے مواد کی فراہمی ، ترتیب ، تزئین ، کتابت اور پروسیسنگ نے ہماری صلاحیتوں کا بہت سخت امتحان لیا ہے ۔ اس قسم کا خاص نمبر پیش کرنے کے لئے برسوں کی محنت ، خلوص ، تحقیق اور جانفشانی کے علاوہ لاکھوں روپے کا سرمایہ درکار ہوتا ہے ۔ اور ذہنی اور مالی جھٹکے سہنے کے لئے بڑے کلیجے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ بہرحال تجربات آدمی کو مکمل بناتے ہیں اور ہر تجربے کے بعد ، ہم خود کو پہلے سے زیادہ نامکمل پاتے ہیں ۔

" اسکنڈے نیویائی ادب نمبر " کے بارے میں قارئین کے تاثرات قدرے تاخیر سے شائع ہو پائیں گے ۔ جولائی کے آخر تک تمام موصولہ ایکسپورٹ آرڈروں کی تعمیل ہوگی اور گمان ہے کہ ستمبر ۹۵ء کے بعد یہ ایڈیشن نایاب ہو جائے گا ۔ اس لئے جو لوگ اسے خریدنا چاہیں اپنا آرڈر مع پیشگی رقم بنام " انشاء پبلی کیشنز " جلد از جلد روانہ کر دیں ۔

ہمارا آئندہ خاص ضخیم نمبر " **نیاز فتحپوری نمبر** " ہے ۔ اس کی اشاعت سے پہلے اپنے حوصلوں اور سرمائے کی بازیابی کا انتظار کرنا پڑے گا ۔ کوشش یہ ہوگی کہ نیاز فتحپوری نمبر کا ایک سستا ایڈیشن نکالا جائے ۔ حالانکہ کاغذ ، کتابت اور طباعت کی گرانی کے سبب آج کل سستا ایڈیشن بھی دو سو روپے سے کم کا نہیں ہوتا ۔ پھر بھی ، ہم چاہتے ہیں کہ اس کی قیمت بہت کم رکھی جائے ۔ اس کے لئے بہت جلد ہم ایک خاص اسکیم شروع کریں گے جس سے قارئین فائدہ اٹھا سکیں ۔

کیا مسلمانوں کو مہاراشٹر سے نکل جانا پڑے گا ؟

غلام قیوم وارثی
کلکتہ

کیا بھارتیہ جنتا پارٹی کا اب دہلی پر بھی قبضہ ہوگا؟ گجرات اور مہاراشٹر کے الیکشن میں حیرت انگیز کامیابی کے بعد اب اسی طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگی ہیں ۔ اس کامیابی کے ساتھ دو باتیں منسلک ہیں ۔ ایک تو یہ کہ وزیر اعظم نرسمہاراؤ کی زیر قیادت کانگریس پارٹی مفلوج ہوتی جارہی ہے ۔ دوسری یہ کہ اقلیت دشمنی اور ہندو پرستی کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی ہے کہ اب ہندوستان پر بی جے پی کی حکومت قائم ہونے کے امکانات تاریک نہیں رہے ۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد کانگریس نے ملک میں ایک ایسا نظام حکومت قائم کرنے کی کوشش کی جو مذہب اور فرقہ پرستی سے بالاتر ہو ۔ اس مقصد کے لئے جمہوری قوانین بنائے گئے اور دستور ہند میں تمام فرقے اور مذاہب کے لوگوں کے لئے مکمل آزادی کی ضمانت دی گئی ۔ کانگریس حکومتیں مسلسل چالیس برس تک اس پالیسی کو بنیاد بناکر عمل پیرا رہیں ۔ مگر جہاں تک ملک کے عوام کے مزاج کو تبدیل کرنے کا معاملہ ہے اس میں کانگریسیوں کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی ۔ اس کی سب سے بڑی وجہ فرقہ پرستوں کو کھلی چھوٹ ہے ۔ اکثریتی گروہ کے فرقہ پرست لیڈروں اور تنظیموں کے خلاف کبھی بھی سخت رویہ نہیں اپنایا گیا ۔ بلکہ سنگین سے سنگین جرم کے بعد بھی آنکھیں موندلی گئیں ۔ یہ نرم گوشہ فرقہ پرستی کی نشوونما کے لئے نہایت پر فضا ثابت ہوا ۔ نتیجے میں فرقہ پرستی پروان چڑھتی گئی ۔ فرقہ پرستوں نے الزامات سے بچنے اور اپنے تحفظ کی غرض سے کئی کئی تنظیمیں بنالیں ۔ ہر گروہ نے الگ الگ پروگرام پیش کئے جس کا بنیادی مقصد اقلیت دشمنی کے علاوہ کچھ نہیں تھا ۔ اسی گروہ نے بالکل منصوبہ بند طریقے پر بابری مسجد کو شہید کیا ۔ اس کے بعد صرف فرقہ پرستوں کے درمیان ہی نہیں بلکہ وسیع ہندو آبادی میں ان کا وقار اور بھی بلند ہوگیا ۔

مہاراشٹر شروع ہی سے فرقہ پرست تحریکوں کا مرکز رہا ہے ۔ بمبئی میں ہمیشہ خلفشار کی گونج سنی گئی ہے ۔ ان تنظیموں نے بمبئی کے حالیہ فرقہ وارانہ فساد میں جس کردار کا مظاہرہ کیا ہے اس سے زمانہ قدیم کی بربریت کی یاد پھر سے تازہ ہوگئی ۔ **مہاراشٹر میں کانگریسی حکومت کے خاتمے اور بی جے پی ، شیوسینا مخلوط حکومت کے اعلان کے بعد مسلمانوں کے خوف وہراس میں اور بھی اضافہ ہوا ہے ۔ الیکشن میں کامیابی کے بعد شیوسینا لیڈر بال ٹھاکرے کی جانب سے مسلمانوں کے لئے خلاف آئین انتباہ کھلی فرقہ پرستی کے کسی نئے باب کی تمہید ہے ۔ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ کانگریس لیڈر شپ کی جانب سے کوئی آواز بلند نہیں کی گئی ۔ ایسا لگتا ہے کہ سبھوں کو سانپ سونگھ گیا ہو ۔ یا پھر بھارتیہ جنتا پارٹی کی ہندو فرقہ پرستی کی مقبولیت کے آگے نرسمہاراؤ اور ان کی ٹولی خود کو اخلاقی مجرم سمجھ کر خاموش ہوگئی ہے ۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہونچانے میں ان کی جانب سے براہ راست کوئی کام نہیں ہوسکا جب کہ بھارتیہ جنتا پارٹی باآسانی اکثیریتی فرقے کا ہیرو بن گئی ۔**

کیا ہندوستان کے اکثیریتی فرقہ کے لوگ واقعی مسلمان دشمن ہیں ؟ بات سمجھ میں نہیں آتی ۔ مہاراشٹر ہندوستان کی سب سے ترقی یافتہ ریاست ہے اور بمبئی ہندوستان کا سب سے مہذب شہر ۔ اس شہر کی آبادی میں نصف سے زاہد دیگر ریاستوں کے لوگ شامل ہیں جن میں مسلمانوں کی بھی اچھی

خاصی تعداد ہے ۔ صنعتی اور تجارتی سرگرمیاں اس قدر شباب پر ہیں کہ لوگوں کو آپس میں مل بیٹھنے اور خرافات سننے کی فرصت نہیں ملتی ۔ ایسے حالات میں لوگوں کے ذہن میں فرقہ پرستی کا گھر کر لینا کافی اہم بات ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں عام سطح پر تنگ نظری کا خاتمہ نہیں ہوا ہے ۔

آج کا ہندوستان کافی مہذب ہے ۔ سیاست، تجارت، صنعت، تعلیم، تحقیق اور تہذیب کے فروغ میں ہمارے قدم کافی دور پہونچ چکے ہیں ۔ جب ہم اتنے تہذیب یافتہ نہیں تھے ۔ تعلیم، تجارت اور صنعت میں کافی پیچھے تھے ۔ اس زمانے میں ہمارے اندر فرقہ پرستی کا شائبہ بھی نہیں تھا ۔ لیکن اب ہم جتنی ترقی کرتے جارہے ہیں اتنے ہی فرقہ پرست ہوتے جاتے ہیں ۔ کیا یہ فرقہ پرستی ہماری مادی ترقی کی دین ہے یا کسی نے فرقہ پرستی کے فروغ کا ذمہ لے رکھا ہے ؟

معاملہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں فرقہ پرستی کے فروغ کے لئے باقاعدہ پروجیکٹ قائم ہیں ۔ دیگر پروجیکٹوں کی طرح اس پر بھی کثیر سرمایہ کاری کی جارہی ہے ۔ فرقہ پرست نظریات کے فروغ کے لئے تمام اہم زبانوں میں اخبارات نکالے جارہے ہیں جس سے عوامی سطح پر فرقہ پرست نظریات کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے ۔ اب انسانیت سوز باتوں کو بھی لوگ حق بجانب سمجھنے لگے ہیں ۔ صرف یہی نہیں، اس کی تحریک پیدا کرنے والے اب عوامی ہیرو ہیں ۔ دانشوروں کے قلم خریدنے کا سلسلہ جاری ہے ۔ ہندوستان کی تاریخ بار بار نئے سرے سے تحریر کی جارہی ہے جس میں مسلمانوں کے خلاف ایسی باتیں لکھی جارہی ہیں جس کا مقصد نفرت پھیلانے کے سوا کچھ نہیں ۔ اسلام دشمنی پر رسائل، جرائد اور کتابوں کی کمی نہیں ۔ صرف یہی نہیں بعض اوقات بڑے بڑے قلمکاروں کو اسلام دشمن تحریروں کے لئے راغب کیا جاتا ہے اور کافی بڑی بڑی رقمیں پیش کی جاتی ہیں ۔

جس ملک میں نفرت کی پرورش اور فروغ کے لئے باقاعدہ منصوبہ بند پروجیکٹ قائم ہو وہاں بھارتیہ جنتا پارٹی اور اس قبیل کی دیگر تنظیموں کی مقبولیت کوئی حیرت انگیز بات نہیں ۔ کانگریس کے غیر مقبول ہوجانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے ۔ کمیونسٹ پارٹی جیسی ترقی پسند تنظیمیں بھی اس وجہ سے ناکام ہوتی چلی گئیں ۔ ایک تو یہ کہ کمیونسٹوں نے جو نظریہ پیش کیا وہ ہندوستانی مزاج کے بالکل برعکس تھا ۔ بورژوا اور پرولتاری طبقے ہندوستان میں بھی موجود ہیں ۔ کمیونسٹ ان دونوں طبقوں کے لوگوں کے درمیان وہ منافرت نہیں پھیلا سکے جو فرقہ پرست تنظیموں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کیا ۔ نتیجے کے طور پر مہاجن، صنعت کار اور تاجروں کی برادری پورے وقار کے ساتھ آج بھی زندگی گزار رہی ہے ۔ جہاں تک مزدور اور ملازمت پیشہ طبقہ کے استحصال کا معاملہ ہے تو آج تک اس میں بھی کوئی خاص کمی نہیں ہوئی ۔ کمیونسٹوں کو ہندوستان میں مذہب پرستی اور فرقہ پرستی کے خلاف کافی بڑھ چڑھ کر مہم چلانے کی ضرورت تھی ۔ اس معاملے میں انہوں نے صرف زبانی جمع خرچ سے کام لیا ۔ لہذا ہندوستان کے کسی بھی علاقے میں ان کی کوئی بنیاد نہیں قائم ہوسکی ۔

مغربی بنگال میں کمیونسٹ راج کو اب بیس برس ہوجائیں گے ۔ بظاہر مغربی بنگال ایک کمیونسٹ ریاست نظر آتی ہے ۔ مگر حقیقت حال کچھ اور ہے ۔ یہاں کے کمیونسٹوں نے مذہب پرستوں اور بورژوا طبقہ سے سمجھوتہ کرلیا ہے جسے کمیونسٹ نظریے کے سراسر خلاف سمجھا جاتا ہے ۔ انہیں اس سے ایک فائدہ ضرور پہونچا ہے کہ کمیونسٹ حکومت قائم ہوگئی ہے ۔ مگر جہاں تک عوامی مزاج کی تشکیل کا معاملہ ہے اس میں یہ سو فیصد ناکام ہیں ۔ لہذا آنے والے دنوں میں یہاں کوئی بھی حکومت آسانی سے قائم ہوسکتی ہے اور کسی قسم کا نظریاتی تنازعہ نہیں کھڑا ہوسکتا ۔

فرقہ پرست نظریات کے فروغ میں بھارتیہ جنتا پارٹی، شیوسینا، وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل وغیرہ نے کبھی کسی سے سمجھوتہ نہیں کیا ۔ اس لئے کہ فرقہ پرستی ہی ان کی میراث ہے ۔ اس سے الگ ہوکر ان کی حیثیت اور شناخت ختم ہوجاتی ہے ۔ اشتعال انگیز تقریروں اور انسانیت سوز پالیسی کی بنیاد پر ان تنظیموں نے ہندو عوام کے سرپرست کی جگہ حاصل کرلی ہے ۔ جنتادل جیسی تنظیموں نے کچھ دنوں تک ایک طرح کی معتدل سیاسی فضا قائم

کرنے کی کوشش کی تھی مگر فرقہ پرستی کے پھیلتے زہر کے آگے ان کے لیے خود کو محفوظ رکھنا دشوار ہو گیا۔

بھارتیہ جنتا پارٹی نے پچھلے کئی پارلیمانی انتخابات کے دوران بڑی تیزی کے ساتھ سیڑھیاں طے کی ہیں اور ہر نئے الیکشن میں اس کی طاقت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ اتر پردیش میں اس کے ۵۰ ممبران پارلیمنٹ ہیں مدھیہ پردیش میں ۱۲، گجرات میں ۲۰، راجستھان میں ۱۲، مہاراشٹر میں ۵، بہار میں ۵، دہلی میں ۵، کرناٹک میں ۴، ہماچل پردیش میں ۲، آسام میں ۲، آندھرا پردیش میں ایک، دمن اور دیو میں ایک ممبر ہیں۔ لوک سبھا میں بھارتیہ جنتا پارٹی نے ۵۴۲ میں سے ۳۵۴ سیٹوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حقیقی معنوں میں ہندوستان پر بھارتیہ جنتا پارٹی کا راج ہے۔ نرسمہا راؤ حکومت ایک طرح کی ماتحت حکومت ہے جو بھارتیہ جنتا پارٹی کے اشاروں پر چل رہی ہے۔ بابری مسجد کے انہدام اور اس کے بعد کے ہولناک واقعات پر حکومت کی خاموشی اس بات کا کھلا ثبوت ہے۔

چھ ماہ بعد ہونے والے پارلیمانی الیکشن کے لئے اعلیٰ سطح پر تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔ صنعتی اعتبار سے دو ترقی یافتہ ریاستوں مہاراشٹر اور گجرات پر قابض ہونے کے بعد بی جے پی کے حوصلے کافی بلند ہیں۔ لہٰذا اب ملک گیر سطح پر الیکشن لڑنے کے منصوبے بنائے جارہے ہیں۔ حالانکہ بی جے پی نے سیاسی میدان میں اب تک جو کامیابی حاصل کی ہے اس کے لئے اسے قوم سے طول طویل وعدوں کی ضرورت نہیں پڑی جیسا کہ دیگر سیاسی تنظیموں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ بلکہ صرف بابری مسجد کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے عزم پر پارلیمنٹ میں اسے واحد پارٹی کے طور پر اکثریتی حیثیت حاصل ہو گئی۔

بابری مسجد کا انہدام بھارتیہ جنتا پارٹی کا سب سے اہم پروجیکٹ تھا۔ اسے عملی شکل دینے کے لئے ہندو دھرم کی قدیم روایت، ملک کے قانون اور دستور کو جس کٹرپن کے ساتھ پامال کیا گیا اس کے بعد ان کی طرف سے انسانیت نوازی کی کوئی توقع نہیں رہ جاتی۔ بمبئی سے شائع ہونے والے انگریزی اخبارات کافی حد تک سیکولر بنیادوں پر افسوسناک واقعات کی تفصیل پیش کرتے رہے تھے۔ مگر شہر میں فرقہ وارانہ فسادات کے بعد ان کی بری طرح خبر لی گئی۔ یہاں تک کہ خاتون رپورٹروں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ شیو سینا کا مراٹھی اخبار "سامنا" ان تمام صحافیوں کو نشانہ بناتا رہا جو اپنے انداز فکر کی وجہ سے سیکولر نظر آتے ہیں۔ اس اخبار میں ایسے صحافیوں کو انتہائی غلیظ گالیوں سے نوازا گیا اور ایسے نازیبا کلمات استعمال کیے گئے جنھیں عام طور پر ضبط تحریر میں لانا باعث شرم سمجھا جاتا ہے۔

فرقہ پرستی کے میدان میں صرف مردوں کو آگے نہیں بڑھایا جارہا ہے۔ بلکہ اس مقصد کے لئے خواتین کی الگ تنظیم قائم کر دی گئی ہے جس میں متوسط اور نچلے طبقے کی خواتین کی کثیر تعداد شامل ہے۔ انہیں تعصب، اسلام دشمنی اور فرقہ پرستی کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔ مہاراشٹر میں بی جے پی کی حکومت قائم ہونے پر ایک خاتون دانشور نے کافی اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ اس نے امید ظاہر کی ہے کہ نئی حکومت میں خواتین کو تعصب کا سبق پوری کامیابی کے ساتھ پڑھانے کے مواقع حاصل ہوں گے شیو سینا لیڈر بال ٹھاکرے نے خواتین کی مکمل آزادی کی بانگ لگائی ہے اور یہ اعلان کیا ہے کہ اب بمبئی میں خواتین بلاخوف و خطر ایک جگہ سے دوسری جگہ آجا سکتی ہیں۔ خواتین کی آزادی کا دعویٰ اس بات کی دلیل ہے کہ شیو سینا کے سائے میں عورتیں یقیناً محفوظ نہیں تھیں۔ وقت بے وقت گھر سے باہر نکلنا عورتوں کے لئے دشوار تھا۔ اب اس تاثر کو ختم کرنے کے لئے اعلانات کئے جارہے ہیں۔ شیو سینا لیڈروں کو خواتین کے احترام اور وقار کا کتنا لحاظ ہے اس کا اندازہ تنظیم کی ترجمانی کرنے والے اخبار "سامنا" کی تحریروں سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس اخبار میں خاص طور پر سیکولر اور جمہوریت پرست خاتون صحافیوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے اور ان کی شان میں اس قدر رکیک کلمات استعمال کئے جاتے ہیں کہ ایک مہذب انسان کی ساری ہمت و جرأت جواب دے جاتی ہے۔

اب تو معاملہ کچھ اور آگے بڑھا ہے۔ بال ٹھاکرے نے اعلان کیا ہے کہ اب مہاراشٹر میں داخل ہونے والے کسی بھی نوواردکو راشن کارڈ جاری نہیں کیا جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ دیگر ریاست کے لوگوں کو اب مہاراشٹر میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ مہاراشٹر کے غریب طبقہ کے لوگوں کو اس پالیسی کا حامی بنالیا گیا ہے۔ ان سے یہ کہا جارہا ہے کہ اس پالیسی سے غریب طبقہ کے لوگوں کو خاص طور پر فائدہ پہونچے گا۔ چیزوں کی قیمتیں گھٹ جائیں گی اور خورد و نوش کے سامان آسانی سے حاصل ہونے لگیں گے۔

سب سے زیادہ سنگین معاملہ مسلمانوں کا ہے ۔ مہاراشٹر میں سکونت اختیار کرنے والے اور بمبئی میں آباد ہونے والے مسلمانوں کو طرح طرح کی دھمکیاں دی جارہی ہیں ۔ فٹ پاتھوں اور گلیوں پر حکومت کرنے والا ہر لفنگا شیوسینا لیڈر ہے جسے مسلمانوں میں خوف وہراس پھیلانے کے لئے استعمال کیا جارہا ہے ۔ بلکہ نئی حکومت کے قیام کے بعد بال ٹھاکرے نے تو مسلمانوں کو مہاراشٹر خالی کرنے کا حکم دے دیا ہے ۔ اس طرح کی باتیں دستور ہند کے منافی ہیں ۔ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ بال ٹھاکرے نے مسلمانوں کو دھمکی دے کر شخصی آزادی کو چیلنج کیا ہے جس کی دستور ہند میں مکمل ضمانت دی گئی ہے ۔

حیرت تو یہ ہے کہ اس طرح کی دھمکیوں پر نرسمہاراؤ حکومت نے کسی معصوم بچے کی طرح چپ سادھ رکھی ہے معاملہ یہ ہے کہ دستور ہند کے محافظوں کو فرض شناسی سے زیادہ اقتدار سے دلچسپی ہے ۔ اقتدار پر قابض رہنے کے لئے وہ ہر قیمت چکانے کو تیار ہیں ۔ بابری مسجد اور مسلمانوں کا بلیدان تو اس معاملے میں کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا ۔ ان حالات میں نرسمہاراؤ ٹولی کے ایک مسلمان وزیر کے اندر جوش و خروش پیدا ہوا ۔ یہ مسلمان وزیر ہیں جعفر شریف ۔ انہوں نے مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے بال ٹھاکرے کے بیان پر سخت غم و غصے کا اظہار کیا ہے ۔ نرسمہاراؤ حکومت سے مداخلت کی درخواست کی ہے ۔ بال ٹھاکرے کو ٹاڈا آئین کے تحت گرفتار کرنے اور مقدمہ دائر کرنے کی بھی اپیل کی ہے ۔ ایسا لگتا ہے جعفر شریف نرسمہاراؤ سے بھی زیادہ معصوم ہیں ۔ جو حکومت بابری مسجد کے انہدام کے واقعے پر خاموش رہی وہ مہاراشٹر سے مسلمانوں کے نکلنے کے حکم پر کب لب کشائی کرسکتی ہے ۔ جعفر شریف نے دراصل ایک روایتی لیڈر ہونے کا ثبوت دیا ہے ۔ علم سیاست میں ایک نقطہ " احتجاج " ہوا کرتا ہے ۔ موقعہ مصلحت دیکھتے ہوئے انہوں نے مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے اس کا استعمال کیا ہے ۔

مرکزی وزیر کے مخصوص اختیارات ہوتے ہیں ۔ قومی مسائل پر وہ پوری وزارتی ٹولی کو نہ صرف غور و خوض کرنے بلکہ براہ راست عملی طریقہ کار اختیار کرنے پر مجبور کرسکتا ہے ۔ مسئلے پر اختلاف کی بنا پر وہ چاہے تو احتجاجاً اپنے عہدے کو بھی خیرباد کہہ سکتا ہے ۔ دیگر مصلحت اندیشوں کی طرح جعفر شریف کو بھی اپنی کرسی عزیز ہے جس برادری کے لوگوں نے انہیں اس اعلیٰ و ارفع مقام تک پہونچایا ہے انہیں وہ احتجاجی کلمات سے زیادہ کے مستحق نہیں سمجھتے ۔

مغربی بنگال کے ایک مسلمان وزیر کلیم الدین شمس نے بھی جعفر شریف کے ساتھ ہی ہانک لگائی ہے ۔ بال ٹھاکرے کی مسلمان دشمنی کو چیلنج کرتے ہوئے انہوں نے شدید غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے ۔ بیچارے اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہیں ؟ اس لئے کہ عملی طور پر کچھ کرنے کے لئے قربانی پیش کرنے کی ضرورت ہے بڑھاپے میں قربانی پیش کرنے کے حوصلے یوں بھی سرد پڑجاتے ہیں ۔ یہ تو نوجوانوں کا حصہ ہے ، انہیں آگے بڑھنا چاہیے ۔

مہاراشٹر میں بی جے پی اور شیوسینا مخلوط حکومت کے قیام کے بعد جہاں مسلمانوں میں خوف و انتشار پھیل گیا ہے وہیں بعض حلقوں میں اطمینان کا اظہار کیا جارہا ہے ۔ مثلاً بمبئی میں علماء کونسل کے سکریٹری مولانا عبدالکشمیری کا کہنا ہے کہ بال ٹھاکرے آخر کو ایک سمجھدار انسان ہیں ۔ ان سے یہ توقع ہے کہ مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہونچانے کی کوششوں سے باز رہیں گے ۔ بی جے پی شیوسینا کے چند سرکردہ لیڈروں کا بھی یہی خیال ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ راجستھان میں بی جے پی کی کامیاب حکومت کو مسلمانوں کے سامنے مثالی حکومت کے طور پر پیش کیا جائے گا اور مسلمانوں کو بی جے پی کی حمایت کرنے کی ترغیب دی جائے گی ۔ ان لیڈروں کا کہنا ہے کہ آئندہ پارلیمانی الیکشن میں بی جے پی کے انتخابی منشور میں مذہبی معاملات نہیں بلکہ خالص سیاسی معاملات ہوں گے ۔ معاملات کچھ بھی ہوں ۔ ہندوستان پر بی جے پی حکومت کے قیام کے امکانات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ بی جے پی کی قومی پالیسی اس مقام کو چھولینے کے بعد ہی کھل کر سامنے آئے گی ۔

نسیم سحر
جدہ (سعودی عرب)

غزل

اماں کس کو میسر ہے سمندر ہو کہ ساحل ہو
ہمیں تو اک برابر ہے، سمندر ہو کہ ساحل ہو

وہی وحشت کا منظر ہے سمندر ہو کہ ساحل ہو
ہماری آنکھ پتھر ہے، سمندر ہو کہ ساحل ہو

اب ان پلکوں پہ آنسو جم گئے ہیں تو یہ لگتا ہے
کہ ان آنکھوں کے اندر ہے سمندر ہو کہ ساحل ہو

کٹاؤ کا عمل ان ساحلوں پر کب سے جاری تھا
سو اب سب کچھ سمندر ہے، سمندر ہو کہ ساحل ہو

کنارے کے ادھر ہونا ادھر ہونا برابر ہے
وہی اپنا مقدر ہے سمندر ہو کہ ساحل ہو

ہمیں اب فیصلہ کرنا ہے کوئی اپنے بارے میں
سبھی کچھ یوں تو ازبر ہے سمندر ہو کہ ساحل ہو

ہمیں اک جنگ لڑنی ہے نتیجہ اس کا ہو کچھ بھی
وہ دشمن کا ہی لشکر ہے سمندر ہو کہ ساحل ہو

ہمیں دیکھو کہ سمٹے ہیں ہم اپنے آپ میں کیسے
مگر آپے سے باہر ہے سمندر ہو کہ ساحل ہو

نسیم اس بے ستارہ رات میں ایسا تو ہونا تھا
بس اک تاریک چادر ہے سمندر ہو کہ ساحل ہو

سید عطا جالندھری
(برمنگھم، برطانیہ)

غزل

گزرے لمحوں کا زخم تازہ ہے
وقت نے کب پلٹ کے دیکھا ہے؟

اس کی ہر بات ہے جداگانہ
کون کہتا ہے وہ بھی ہم سا ہے!

اب یہ حیرانیٔ نظر کیسی؟
جو تھا بویا وہی تو کاٹا ہے

آسماں سے نہیں کوئی افتاد
غم کا پودا زمیں سے اگتا ہے

کوئی تو کاش اتنا سمجھا دے
میرے اندر یہ شور کیسا ہے؟

توڑ کر رکھ دیا ہے غربت نے
یہ مسافت تو جان لیوا ہے

جس نے جاں کو دئے ہیں سارے غم
ہاں وہی جان سے بھی پیارا ہے

اپنے حصے کی حسرتیں چن لو
وقت کا کیا عطا بھروسہ ہے!

○

۳ نظمیں

مظفر حنفی
پروفیسر اقبال چیئر
کلکتہ یونیورسٹی

قرض

رفعت سروش
(نئی دہلی)

کیا بچا ہے!
چند سانسیں
اک بدن عمر رواں کی چیرہ دستی کا شکار
عمر گزری حادثات نو بہ نو سے کھیلتے
ہر طرف آلام کا ہے اژدہام
اور کیا جانے ابھی کتنے مصائب پر لکھا ہے میرا نام
ہے مگر خستہ بدن میں
اک دل بے اختیار
جس کی وسعت بے کنار
آرزوؤں کے بھنور ہیں اور امیدوں کے سراب
اک مسلسل اضطراب
اب بھی تم آجاؤ گر
دیدہ و دل فرش راہ
کیا خبر یہ چند سانسیں ہی ادا کر دیں وہ قرض
جو ابھی باقی ہے میری روح پر

رنگین زاویے کا بیان

چیختے رنگوں کی اک پرشور وادی میں
حضور !
رقص کے دوران
وہ مجھ سے ملا تھا
اس نے میری مانگ میں تارے بھرے تھے
منہ پہ مل دی تھی شفق
لوگ اندھے ہیں
جو کہتے ہیں کہ اس نے
مجھ سے منہ کالا کیا تھا

○

وصل کی سوغات

شکر ہے منہ میں کسی کے
تو کوئی خالی ہات
کسی کی لاش سے الجھی ہیں
دیر سے چھ سات
ہر ایک کرتی ہے
اک دوسرے کو سونگھ کے بات
تمام جسم پہ پھیلی ہے
چیونٹیوں کی برات
تمہارے ہجر کی رات !!

○

بہت ساری عورت

(تسلیمہ نسرین کے پرستاروں کے نام)

سناتی ہے شوہر کو
آجا ری نندیا
سجاتی ہے رانوں پہ
ماتھے کی بندیا
اسی غم میں مدقوق سے زرد زرد
بہت ساری عورت کے
تھوڑے سے مرد

عادل صدیقی

قومی اتحاد۔ آج کے تناظر میں

قومی ایکتا یا قومی یک جہتی کے عمل کی رفتار میں کیسے کر تیزی لائی جائے یہ ایک بہت بڑا سوال بن گیا ہے؟ اس امر کے پیش نظر کہ افتراق اور انتشار پسندی کی قوتیں فرقہ پرستی اور علاقہ پرستی کی صورت میں اپنا ناپاک سر ابھار رہی ہیں اس سوال کا شدید صورت اختیار کرنا قدرتی بات ہے۔ بدقسمتی سے ہماری ترقی اور کامیابی بعض طاقتوں کے لئے حسد کا باعث بن گئی ہے اور وہ ہمیں کمزور بنانا چاہتی ہیں۔ ہمیں نہ بھولنا چاہئے کہ آج بھارت میں جتنے مسلمان آباد ہیں اتنے افراد خود پاکستان، جو کہ اسلامی ملک ہے، میں نہیں ہیں، انہیں بھارت کے دوسرے شہریوں کی مانند مساوی حقوق حاصل ہیں۔ کسی ایک گروپ یا فرقے کے خلاف نفرت پیدا کرنا ہمارے ملک کے مفاد کے منافی ہیں۔ یہ وہی کام ہے جو ہمارے دشمن چاہتے ہیں کہ ہم کریں۔ فرقہ پرستی ہمارے ملک و قوم کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے۔

بھارت میں سیکولرزم کو اسی لئے قبول کیا گیا تھا کہ وہ جمہوریت کی نشو و نما کے لئے ایک بنیاد کا کام دے گا۔ سیکولر بھارت مذہب یا خدا کی عبادت کے متعدد طریقوں سے ہم کو دور نہیں کرتا، البتہ وہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی ایک مذہب کے لوگ بھارت کے کسی حصے کو اپنے ہم مذہبوں کی اجارہ داری بنا لیں اور تمام دوسرے لوگوں کو اپنے علاقے کی شہری حدود سے باہر نکال دیں۔

اتحاد کی راہ کی رکاوٹیں

قوم پرستوں اور دیش واسیوں کو اکثر اس بات سے شدید دکھ پہنچتا ہے کہ ہندوؤں، عیسائیوں، سکھوں اور مسلمانوں کی صفوں میں ایسے سماجی عناصر موجود ہیں جو انتشار پسند اور پھوٹ ڈالنے کی غرض سے ذات پات پر مبنی نظام کو ہوا دینا چاہتے ہیں۔

درحقیقت ذات پات اکثر اتنا ہی بڑا انتشار پسندانہ عنصر ثابت ہو گیا ہے جتنا بڑا مذہبی ناروا داری، انتخابی مہم، اقتدار کی بھوک اور جمہوری طرز حکومت سے اٹھائے جانے والے ناجائز فوائد سے ذات پات کے غلبے، ذاتوں کی باہمی رقابت اور باہمی ناروا داری کو ہمیشہ ہی بہت زیادہ بڑھاوا ملا ہے۔ مذہب یا ذات پات کی بنیاد پر کٹر پن قومی اتحاد کا عظیم ترین دشمن ہے کسی بھی مذہب کے غلبے کی صورت عوام کی آزادی کی نفی ہے جو جمہوری نظام کے مزاج سے میل نہیں کھاتی۔ "مقامی علاقہ مقامی لوگوں کا ہے اور انہیں روزگار میں ترجیح دی جائے" ایسے گمراہ کن نعروں سے لوگ قومی اتحاد، یک جہتی اور سیکولرزم کو برقرار رکھنے سے متعلق اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہو سکتے ہیں۔

قومی یکجہتی سے مراد قومی سطح پر یکسانیت لانے سے نہیں ہے قومی یک جہتی قومی اتحاد بھی نہیں بلکہ اس کا ایک نتیجہ ہے۔ قومی یک جہتی محض ہندوستان کا ہی مسئلہ نہیں امریکہ میں مذاہب اور بحران کی شاخیں ہندوستان سے بھی زیادہ ہیں۔ ملائشیا اور سنگاپور میں تین ممتاز اور نمایاں نسلی طبقات ہیں۔ افریقی ملک کیمرون میں ہندوستان کی بہ نسبت زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لہٰذا بیشتر ملکوں میں یہ مسئلہ ہے کہ آبادی ملی جلی ہے، ان کے مقاصد مشترک ہیں، نظریات مشترک ہیں اور ذمہ داریاں نیز درپیش مسائل مشترک ہیں۔ بھارت ایک وسیع و عریض ملک ہے آبادی کے اعتبار سے چین کے بعد اسی کا نمبر آتا ہے یہاں بہت سے مذاہب ہیں، جو اختلافات کا موقع فراہم کرتے ہیں، کبھی کبھی یہ اختلافات پرتشدد ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان میں زبانیں بھی پرتشدد اختلافات کا ذریعہ بنی ہیں جیسا کہ ہندی بولنے والی آبادی اور غیر ہندی علاقوں کی آبادی یا کنڑ اور مراٹھی بولنے والوں کے درمیان اختلافات یا گوا مراٹھی اور کونکنی زبانوں کے بولنے والوں کے درمیان اختلافات۔ زبان، مذہب اور ثقافت کی بنیادوں پر اختلافات بھارت جیسے وسیع و عریض ملک میں غیر معمولی نوعیت نہیں رکھتے، ہندوستان کی آبادی تقریباً ایک ارب نفوس پر مشتمل ہے۔ اس کے باوجود ہمارے درمیان بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ ہمارا قومی ترانہ ایک ہے۔ ہمارا ترنگا جھنڈا ہے۔ ہم سب یوم جمہوریہ، یوم آزادی، گاندھی جینتی مل جل کر مناتے ہیں۔ ہم سب مل کر پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں اور مقامی اداروں کے انتخابات لڑتے ہیں۔ اس طرح قومی یک جہتی نے ایک ایسے نظام کی صورت اختیار کر لی ہے جو مختلف طرح کے اختلافات کی موجودگی میں ملک کو ایک رشتہ میں منسلک رکھتا ہے اور بحیثیت ایک قوم ہمارے فروغ میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جو اپنے مذہبی ثقافتی تنوع کے باوجود مشترک نصب العین اور ذمہ داریاں رکھتا ہے۔

آج ملک ایک بحران سے گزر رہا ہے۔ انتشار پسند عناصر اپنا کام کر رہے ہیں۔ دراصل ہم اس وقت تاریخ کے ایک نازک موڑ پر کھڑے ہیں اور ہمارے مستقبل کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم کیا راستہ اپناتے ہیں۔ جواہر لال نہرو کو اپنی غیر معمولی فہم، فراست اور دور اندیشی کی بدولت پہلے ہی سے ان مشکلات اور چیلنجوں کا علم ہو گیا تھا جو آج اتنی بڑی اور خوفناک شکل اختیار کر کے ہمارے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی دور اندیشی سے سیکولرزم کے آدرشوں کے لئے وقف ایک سوشلسٹ اور جمہوری پبلک کی حیثیت سے بھارت کی ترقی اور عوام میں ایک سائنسی مزاج پیدا کرنے کے منصوبے بنائے تھے۔

معقولیت پسندانہ طرز فکر

ہمارے آئین میں ایسی دفعات موجود ہیں جن سے ہندوستانی معاشرے کی مختلف برائیوں مثلاً قدامت پسندانہ اعتقادات اور رسم و رواج مذہبی جنون اور ذات پات، طبقاتی یا گروہی سیاست کے احکام کی آنکھ بند کرکے تعمیل وغیرہ کو جدید خیالات و افکار کی مدد سے دور کیا جاسکے۔ البتہ سوال صرف آئین کے سیکولر کردار پر صدق دلی سے عمل درآمد کا ہے۔ آج کے سماجی و معاشی بحران میں اپنائیت میں یقین نہ رکھنے والا کوئی بھی شخص قومی یک جہتی جیسے مسائل پر بحث کے خیال کو ایک بے سود علمی مشق قرار دے سکتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پر عمل آوری کے لئے لوگوں کے دل و دماغ میں گھس کر لڑنا ہوگا تاکہ ان میں جذبۂ خیرسگالی پیدا کیا جاسکے، خواجہ احمد عباس نے کہا تھا کہ مذہبی رواداری کو بڑھانا اور فرقہ داریت کم کرنا آسان کام نہیں، اس کے لئے نفرت کی جگہ محبت، تنگ نظری کی بجائے روشن خیالی، قدامت پرستی اور از کار رفتہ اور معقولیت سے عاری اعتقادات کی جگہ سائنسی شعور اور سائنسی مزاج کو فروغ دینا ہوگا۔ پنڈت نہرو نے اپنے دوست ڈاکٹر سید محمود کو لکھا کہ:

"کوئی بھی ملک یا قوم جو غیر استدلالی اور غیر معقولیت پسندی نیز قدیم طرز فکر اور ذہنیت کی غلام ہے، ترقی نہیں کرسکتی۔"

مشترکہ مفادات

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے اقتصادی نظام اور اس سے ہونے والے فائدوں میں سب کو شریک کیا جائے۔ مذہب، زبان، علاقہ، ذات کو سیاست کی بنیاد نہ بنایا جائے۔ آبی وسائل کو تمام بھارت کے لئے مشترکہ ملکیت قرار دیا جائے تاکہ تمام صوبے فائدہ اٹھائیں۔ کام کے حق کی ضمانت، جو آئین میں دی گئی ہے۔ اس پر موثر طریقے سے عمل درآمد کیا جائے۔ تاریخی کتب پر نظرثانی کی جائے۔ ہم محض چھوت، شکست، اختلافی موضوعات کا ہی مطالعہ نہ کریں بلکہ معلوم کریں کہ ہمارے مذہب، علاقے، ذات کے علاوہ اور کون سی ثقافتی اقدار ہم کو ایک قوم کے طور پر جوڑتی ہیں۔

مختلف ریاستوں کے درمیان علاقہ، زبان اور پانی کے بارے میں تنازعات ہوں یا عبادت گاہوں کے بارے میں جو قضیے ہوں، ان کا فیصلہ عدالتوں سے کرایا جائے اور پھر ان فیصلوں کا احترام کیا جائے۔

قومی یک جہتی کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ مذہب ذات پات، چھوت چھات، زبان، قبائلی آبادی کی تشکیل اور علاقائی عدم توازن کے بارے میں عوام الناس کے دلوں میں مشترکہ جمہوری اور حب الوطنی پر مبنی شعور بیدار کیا جائے، عوام کے دلوں میں یہ بات بٹھا دینی ضروری ہے کہ یہ ملک بنیادی طور پر ایک ہے اور رنگارنگی کا حامل ہے۔ اس میں رواداری کی بڑی صلاحیت ہے باہر سے آنے والی قومیں ہندوستان کا حصہ بن چکی ہیں۔ اقلیتی طبقوں کی فرقہ واریت اور اکثریتی طبقوں کی فرقہ واریت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ ہندو مسلمان سکھوں کے تعلقات کے ضمن میں سیاسی فائدوں کے تحت تشدد اور منافرت پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ عوام اکثر بے روزگاری اور مواقع کی عدم دستیابی سے تنگ آکر مایوس ہوتے ہیں۔ یہ دل شکستگی انہیں اکثر تشدد کی راہ پہ لے جاتی ہے اور یہ اقتصادی نابرابری کے سبب ہے۔

یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ آج جب دنیا سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں حیرت انگیز کامیابیوں کے ساتھ اکیسویں صدی کی جانب بڑھ رہی ہے دنیا کے بہت سے حصوں میں مذہبی کٹرپن اور قدامت پرستی تیزی سے سر ابھار رہی ہے اور اس بات کا ڈر پیدا ہوگیا ہے کہ کہیں راہ ترقی پر بڑھتے ہوئے قدم پیچھے کی جانب نہ مڑ جائیں ہندوستانی معاشرہ نوعیت کے اعتبار سے گوناگونی کا مظہر ہے۔ یہ بہت سی نسلوں اور مذہبوں والا ملک ہے لیکن ہمارے مشترک سماج میں نسلی عنصر زیادہ نمایاں نہیں تاہم مذہبی شناخت بہت قوی ہے۔ ایک نیم جاگیرانہ سماجی ڈھانچہ میں مذہبی شناخت کی تلاش کی جارحانہ کوشش سماج کو منتشر کرنے کا یقینی طریقہ ہے اور اگر ایسا ہوتا رہا تو عوامی زندگی پر اس کے بھیانک اثرات مرتب ہوں گے۔ ان خطرات کے پیش نظر ہمارے دانشوروں کو آئین کی اساس سیکولرزم پر قائم کرنی پڑے گی۔ ہندوستانی جمہوریہ کے قیام کے ۴۴ ویں برس میں مذہبی کٹرپن اور قدامت پرستی اور ملک کے ٹکڑے کی طرف لے جانے والی وجوہات کا تجزیہ بتاتا ہے کہ ہم نے اپنے آئین پر صدق دلی سے عمل نہیں کیا ہے اور اسی وجہ سے ہماری جمہوریت کو طرح طرح کے خطرات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ہندوستان کی حکومت کو اس سے پہلے کبھی اتنے منظم چیلنجوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ فرقہ پرستی، قدامت پرستی اور ظلمت پسندی کے سبب فروغ پا رہی ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام کو عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے میں مکمل کامیابی نہیں ملی ہے۔

ہمارے سیاسی نظام میں چھوٹے چھوٹے سیاسی گروہ جن کی تشکیل ذات، فرقے، علاقے یا مذہب کی تنگ بنیادوں پر ہوئی ہمیشہ سے ہی موجود رہے ہیں۔ ان گروہوں نے اپنے محدود نظریے کے ساتھ سیاسی زندگی میں حصہ لینے کا اپنا حق جتانے اور اپنی ایک علیحدہ شناخت پیدا کرنے کے لئے لوگوں کے سفلی جذبات کو بھڑکایا۔ چوں کہ قومی سیاسی اسٹیج پر ان کا کوئی رول نہیں ہے، اس لئے انہوں نے اپنے علاقائی دائرے میں اپنا ایک اہم مقام بنانے کی کوشش کی ہے ایسے گروہوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے فرقہ پرستی اور ذات پات کے نظام کو ہوا ملی اور وہ باعث تشویش بن گئی، ان گروہوں کی اجتماعی سرگرمیوں سے سیکولرزم کو مضبوط بنانے کی کوششوں کو سخت دھکا لگا ہے۔ ان گروہوں کی سرگرمیوں کا سب سے تشویشناک پہلو یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ ملک کے سماجی ڈھانچے کو کمزور کر رہے ہیں اور دوسری طرف ملک کے دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ شریمتی اندرا گاندھی نے اپنی جان کی عظیم قربانی ملک کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے ہی دی تھی۔

قومی یک جہتی کا مسئلہ ایک اور نقطۂ نظر سے سماجی اور اقتصادی مسئلہ ہے۔ اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ پوری دنیا سے متعلق ہماری آئیڈیالوجی ہمارے نظریات اور ہمارا انداز فکر کیا ہے۔ جب تک دنیا میں اقتصادی استحصال اور سماجی ناانصافی چلتی رہے گی اس وقت تک غریبی، ناخواندگی، جہالت اور احساس شکست خوردگی بڑھتا رہے گا۔

ہماری صدیوں پرانی زندگی یہ بتاتی ہے کہ ہم ہندوستان میں متحدہ قومیت کے نظریے کے ذریعے سے ہی پنپ سکتے ہیں آج ہمارے ملک میں مذہب کے نام پر انتہائی غیرمذہبی حرکتیں سرزد ہو رہی ہیں جن سے ملک اور قوم کا سراسر نقصان ہے آپسی میل جول، بھائی چارہ ہماری زندگی کی اساس ہے۔ یہی وہ اساس ہے جس کے بل بوتے پر ہم نے ملک کو آزاد کرایا اور یہی باہمی اتحاد ملک میں پرسکون زندگی اور آئندہ نسل کی ترقی کا ضامن ہے، ذرا ذرا سی بات کی آڑ لے کر آپسی اتحاد کو خراب کرنا اور آپس میں لڑنا بعید از فہم ہے جس سے یہ واضح ہے کہ یہ کام ان مٹھی بھر لوگوں کا ہے جو اپنے ذاتی مفادات کی خاطر

بقیہ صفحہ پر

ملکہ معظمہ

مصطفیٰ کریم

(U. K.)

صبح سے رات کے آغاز تک سنسان گھر میں گونجتی آواز کو نائلہ نے سچ تسلیم کرلیا۔ وہ ہیولے جو گھر کی ساکت، منجمد اور بے جان دیواروں سے نکل کر اس کے پاس آجاتے تھے، ان کی باتوں پر بھی اس نے یقین کرلیا۔ سب نے کہا وہ برطانیہ کی ملکہ معظمہ تھی اور نائلہ نے اسے صحیح تسلیم کرلیا۔ رات کے وقت جب وہ نیند کی تلاش میں گھنٹوں کروٹیں بدلتی رہتی، خاوند کے خراٹوں کو بھیڑیے کا غرانا سمجھتی تو یہی صدائیں یہی ہیولے اس کی حفاظت کو آتے۔ اسے مانچسٹر سے لندن اڑا کر لے جاتے۔ وہاں بکنگھم پیلس میں اسے سنوارتے۔ اس کے سر پر ہیروں سے جگ مگ کرتا تاج سجاتے اور وہ محل کی بالکونی پر سے نیچے کھڑی عوام کے نعروں کا ہاتھ کی ہلکی جنبش سے جواب دیتی۔ یا کہیں تخلیے میں اسے جاکر بٹھا دیتے۔ جہاں وہ مخملیں کوشنز سے سجی سنگ مرمر کے تخت پر بیٹھی ہوتی۔ کچھ فاصلے پہ مرمریں ستونوں کے پاس سفید گاؤن میں ملبوس ایک جوان عورت بربط بجا رہی ہوتی۔ چھت اور ستونوں پر سرخ گلاب کی لتیں چڑھی ہوتیں۔ فرش پر گلاب پھول بکھرے ہوتے اور سامنے حوض کے نیلگوں پانی میں ننھے ننھے بچے تیر رہے ہوتے۔ یا اس کا دربار سجا ہوتا جہاں انگلستان کا وزیر اعظم جون میجر اور دیگر ملکوں کے سربراہ اس کے سامنے مؤدبانہ کھڑے ہوتے۔

اور ابھی کچھ دیر پہلے سرخ وردی میں ملبوس سپاہی ان کے سروں پر لہراتی کلغیاں، سفید گھوڑوں پر سوار، اسے سیلوٹ کرتے ہوئے گزرے تھے۔ اسے بتایا گیا کہ پرنس چارلس اسے سلام کرنے آرہا ہے۔ اس کے استقبال کے لئے نائلہ خود کو سنوار رہی تھی، خزاں کے ابر آلود، مرجھاتے ہوئے بے کیف دن میں نائلہ کو رونق کا احساس ہونے لگا تھا۔

ایسا پہلے بھی ہوا تھا۔ اسی طرح اچانک، برسوں کی تنہائی کے بعد۔ ان سنسان شب و روز کی گردشوں کے بعد جس میں اس کی نگاہ خاوند پر رات گئے پڑتی جب وہ دکان سے واپس آتا اور کھانا کھانے کے بعد بستر میں اس کے جسم پہ دھاجوکڑی مچانے کے بعد اس کی جانب سے منہ پھیر کر سو جاتا اور بیٹا اسکول سے آنے کے بعد کمرے میں بند فٹبال اور کرکٹ کے میچ ٹی وی پر دیکھتا رہتا اور اس بیزار کن زندگی سے نجات پانے کے لئے مقامی ٹیکنیکل کالج میں ہیئر ڈریسنگ کا کورس کرنے کے بعد جب وہ امتحان میں ناکامیاب ہوگئی تھی تو ان سب اذیتوں کے بعد وہ جن صداؤں کو بے معنی قرار دیتی رہی تھی جن ہیولوں کو وہ وہم سمجھتی رہی تھی۔ وہ سب کے سب اچانک بامعنی ہوگئے اور وہم حقیقت بن گیا۔

اور ایک دن جب اس کے گھر میں عید کی دعوت تھی اور گھر مہمانوں سے بھرا تھا تو نائلہ نے اعلان کیا کہ وہ ملکہ معظمہ ہے۔ اس کے خاوند جمیل نے سنی ان سنی کردی۔ لے سے نائلہ کہہ کر مخاطب کیا اور قورمہ لانے کے لئے کہا۔ کچن سے واپسی پر نائلہ نے قورمے کا پیالہ اپنے خاوند پر دے مارا۔ خوش قسمتی سے اس کے سر کے بجائے سینے پر لگا۔ جمیل کے کوٹ اور قمیص پر شوربے کے بڑے بڑے دھبے ابھر آئے۔ سارے مہمان سکتے میں آگئے۔ سب ہی دوست تھے۔ لیکن معروف زندگی کی وجہ سے ان سے ملنا کبھی کبھی ہوتا تھا۔ جمیل سہما ہوا اپنی بیوی کو تک رہا تھا۔ ان کے بیٹے نوید کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ مضطرب "اماں... اماں" کہہ کر نائلہ کو خبردار کر رہا تھا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں غصہ تھا۔ وحشت اور بیگانگی تھی۔ اس اچھے بھلے گھر کو کیا روگ لگ گیا، کچھ مہمانوں نے سوچا، پھر سب رخصت ہوگئے۔ بعد میں ڈاکٹر آیا۔ نائلہ کو دوائیں دی گئیں، انجکشن لگائے گئے۔ اسے اسپتال کے سائیکی ایٹرک وارڈ میں جانا پڑا۔ وہاں جمیل کو ڈاکٹر نے بتایا نروس بریک ڈاؤن ہے مستقبل میں مرض کیا شکل لے گا کہنا مشکل ہے۔ دھوپ چھاؤں کے کھیل میں نائلہ کب تک سایوں میں گھری رہے گی بتانا آسان نہیں۔ نائلہ کی حالت کی سنگینی کو کم کرنے کے لئے تشبیہ اور استعارے میں ڈاکٹر نے جمیل کو سمجھایا۔ نائلہ کو بس یہی یاد تھا کہ اس کے خاوند نے اس کے خلاف سازش کی تھی اور اسے بے گھر کردیا تھا۔ وہ کب گھر واپس آئی اور کیوں آئی وہ نہیں سمجھ سکی تھی۔ وہ بھلی چنگی تھی اس کے خاوند نے اس پر ظلم کیا تھا۔ نائلہ نے ڈاکٹر کو ساری باتیں بتائی تھیں۔ پھر بھی شنوائی نہیں ہوئی۔ کچھ دنوں بعد جب اسے احساس ہونے لگا کہ وہ ملکہ معظمہ نہیں بلکہ عام انسان ہے، کسی کی بیوی ہے اور ایک لڑکے کی ماں ہے تو اسے اسپتال سے گھر واپس بھیج دیا گیا۔ وہ پھر اپنے گھر کے کاموں میں مشغول ہوگئی۔ گھر کی صفائی اور کھانا پکانا، شوہر اور بیٹے کے کپڑوں میں استری کرتی۔ ہر روز ایک جیسے کام، ایک جیسی مصروفیت تھکا دینے والی، بیزار کن، جس میں کسی نئی سوچ کی ضرورت نہیں تھی جس سے فرار ممکن نہیں تھا۔

اور ایک دن جب بیٹا چلا گیا تو نائلہ کو یاد بھی نہیں رہا کہ وہ کیوں گیا اور کہاں گیا۔ دواؤں اور ہر شب کی بے خوابیوں کی وجہ سے نائلہ کی آنکھوں کے سامنے دھواں دھواں رہتا اور ذہن پر ہر وقت تھکان سی ہوتی۔ خاوند اور بیٹا کدھر سے آتے ہیں اور کدھر چلے جاتے ہیں اسے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بیٹے کے جانے کے بعد نائلہ کو محسوس ہوا کہ وہ شئے جس پہ اس کا سہارا تھا وہ کھوگئی۔ وہ جیسے دیکھ کر اس کی کوکھ میں جلن ہوتی تھی اور در و دیوار سے آنے والی صدائیں دور چلی جاتی تھیں۔ وہ ایک تڑپ جو اس کے اصل وجود کو برقرار رکھتی تھی، سب کچھ گم ہوگیا۔ نائلہ کو دواؤں سے نفرت ہوگئی۔ وہ بیتابانہ مکان میں اوپر نیچے کسی تلاش میں جاتی۔ کمروں میں کچھ ڈھونڈتی پھرتی۔ کبھی گیریج میں جاتی اور کبھی باغ میں

اور بج بلوسس کی جھاڑیوں کے پیچھے کھو یا سٹک کی جستجو میں ناکامیاب مداخلاتی، پھر دیواروں سے صدائیں قریب آگئیں۔ اس کے اردگرد ہیولے مؤدبانہ پھرنے لگے۔ ایسا ہی دن آج تھا۔

نائلہ نے آئینے میں اپنے عکس کا جائزہ لیا۔ گردن میں سونے کا بھاری نکلس اور سچے موتیوں کا وہ ہار جسے اس کا خاوند سعودی عرب سے اس کے لئے لایا تھا۔ بازوبند کلائی میں کڑے اور چوڑیاں، سبھی سونے کی بنی، پیشانی پر جھومر، آنکھوں پر نقلی سیاہ پلکیں، انگلیوں پر لمبے لمبے نقلی نوکدار ناخن، لپ اسٹک سے ہونٹ تربوز کی قاشوں کی طرح سرخ اور جسم پر دمکتی گلابی ساری۔

"پرنس چارلس اب ملکۂ معظمہ کو دیکھ کر خوش ہوگا۔" نائلہ سنجیدگی سے بولی اور ساتھ ہی اس کی نگاہ خاوند کی تصویر پر پڑی جو سنگار میز پر تھی۔ چوڑی پیشانی، متبسم آنکھیں اور متبسم لب جیسے وہ کچھ بولنا چاہتا ہو۔ خوشی سے۔

"یہ کیسے میرے سامنے بغیر اجازت چلا آیا؟" نائلہ غصے میں بولی اور اس نے تصویر کو ڈسٹ بن میں پھینک دیا جس میں اس کے ٹوٹے ہوئے بالوں کا گچھ، لپ اسٹک سے داغدار ٹیشو پیپر اور دوائیں بھی پڑی تھیں۔

آئینے میں اپنے علاوہ نائلہ کو اپنے بیٹے نذیر کا عکس نظر آیا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ زرد چہرہ، حیران سیاہ آنکھیں، نیلی جینز سے باہر نکلی سفید چوڑ قمیص۔

"کہاں تھے تم؟ ناشتہ کیا ہے؟" نائلہ بولتی ہوئی پیچھے مڑی۔

کمرے کا دروازہ بند تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

"پھر چھپ گئے؟ اپنی ماں سے کوئی اس طرح بھاگتا ہے؟" نائلہ نے شکایت کی اور کمرے میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ اٹھ کر وارڈروب کے اندر اور اس کے پیچھے جھانکا۔ نذیر کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔

"تنویر! تنویر!" نائلہ زور سے پکاری۔ خالی مکان میں اس کی چاہت بھری آواز بیتاباز گونجی۔ اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ اس کمرے میں گئی جو نذیر کے لئے مخصوص تھا۔ فرش پر کاغذ بکھرے تھے۔ میز پر نہ کتابیں تھیں اور نہ ہی پنسلیں اور بائرو۔ وارڈروب کے پٹ کھلے تھے اور وہ ہینگر خالی تھے جن پر نذیر کے کپڑے لٹکے رہتے تھے۔ شلف پر وہ پرانا نیلا سوئٹر تھا جسے برسوں پہلے نائلہ نے نذیر کے لئے بنا تھا۔ کمرے میں وہ سوٹ کیس بھی نہیں تھا جسے ساتھ لے کر نذیر سفر کیا کرتا تھا۔ نائلہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس کے غصے اور گھبراہٹ میں اضافہ ہوگیا۔ وہ دھڑ دھڑ کرتی تیز سیڑھیوں پر نیچے اتری۔

لاؤنج میں جمیل بیٹھا تھا۔ بیوی کو اس طرح بنے ٹھنے دیکھ کر اس کی ابرو میں حیرت سے تنیں۔ صرف سہرے کی کمی تھی ورنہ نائلہ اسی دلہن کی طرح بنی ٹھنی تھی جسے اس نے بیاہ کے دن دیکھا تھا۔ اس وقت اس کا جسم موٹاپے کی طرف مائل نہیں تھا۔ دہری ٹھوڑی نہیں تھی۔ نکیلی ناک موٹے گالوں کی وجہ سے اپنا حسن نہیں کھو بیٹھی تھی۔ مسلسل افسردہ اور پریشان رہنے کی وجہ سے ماتھے پر شکنیں نہیں تھیں اور نہ ہی کنپٹی پر بال سفید تھے۔ نائلہ کے سنورنے کی وجہ جمیل جلد سمجھ گیا۔ اس کے چہرے پر شکست کی راکھ پڑ گئی۔ وہ سوچنے لگا نہ جانے ڈاکٹر کب آئے گا۔ عین ممکن ہے نائلہ کو پھر ہسپتال لے جانا پڑے۔ کیا معلوم وہاں کب تک اس کا رہنا ہو اور آئندہ اس کا کیا حال ہوگا۔ اس کے ساتھ زندگی کیسے کٹے گی۔

"نذیر کو تم نے کہاں چھپایا ہے؟"

"نذیر کا داخلہ لندن کے میڈیکل کالج میں ہوگیا ہے۔ وہ وہیں پڑھ رہا ہے۔ جانے سے پہلے وہ تم سے ملا تھا۔" جمیل نے بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"جھوٹ بولتے ہو تم۔ تمہیں ملکۂ معظمہ کے سامنے جھوٹ بولنے کی ہمت کیسے ہوئی؟"

نائلہ کی آنکھیں پھیل کر بڑی ہوگئی تھیں۔ ان میں نفرت تھی۔ غصہ تھا۔

"میں نے غلط نہیں کہا ہے۔ تم دوا کھا لو پھر حقیقت تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔"

"میں کیوں دوا کھاؤں۔ دوا کی تمہیں ضرورت ہے۔ مجھے جلد نذیر سے ملنا چاہئے ورنہ تمہیں سولی پر چڑھا دوں گی۔" نائلہ کی کمر پر دونوں ہاتھ تھے اور وہ بڑی سنجیدگی سے دھمکی دے رہی تھی۔

جمیل خاموش ہوگیا اور بے دلی سے اخبار کی ورق گردانی کرنے لگا۔ نائلہ ایک کمرے سے دوسرے میں گئی۔ جہاں اس کے قدموں کی آوازیں گونجتی رہیں۔ دیر تک۔ پھر وہ تھک کر ڈائننگ روم میں آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ سامنے میز پر بریانی، قورمہ، کباب، سلاد اور سوئیاں سبھی تھیں۔ پرنس چارلس کے لئے وہ گزشتہ رات دیر تک کھانا بنانے میں مصروف رہی تھی۔ اس نے خود صبح سے اب تک کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ پھر بھی اسے بھوک نہیں تھی۔ ایک بےچینی۔ شدید گھبراہٹ اور شوہر سے نفرت اسے چین لینے نہیں دے رہی تھی۔

جمیل سے رہا نہیں گیا وہ نائلہ کے پاس آیا اور اس کی پشت پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر بولا۔

"تم نے صبح ناشتہ بھی نہیں کیا ہے۔ میز پر اتنا سارا کھانا پڑا ہے۔ اسی میں سے کچھ کھا لو۔" نائلہ نے جمیل کا ہاتھ جھٹک دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کھانا پرنس چارلس اور نذیر کے لئے۔ میرے یا تمہارے لئے نہیں۔ میں نادر کے یہاں جا رہی ہوں۔ نذیر وہیں نادر کے بیٹے کے پاس ہوگا۔" یہ کہہ کر نائلہ نے ہال میں کھونٹی پر ٹنگے گرم کوٹ کو اتار کر پہنا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

جمیل اسے جاتے بےبسی سے دیکھتا رہا۔ اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ نائلہ کو روکے۔ وہ اگر سڑک پر لڑنے لگتی اور چیخ پکار کرنے لگتی پھر محلے والے کہتے کہ یہ ایشیائی سڑک پر ہنگامے کرتے ہیں۔ یہ سوچ کر جمیل رک گیا۔ اس کے دوست نادر کا گھر پاس ہی تھا۔ جمیل نے وہاں فون کیا۔

"ہلو" مسز نادر کی آواز آئی۔

"بہن۔ نائلہ کی طبیعت پھر خراب ہوگئی ہے۔ وہ آپ کے گھر میں نذیر کو تلاش کرتی ہوئی گئی ہے۔ میں نے سوچا آپ کو خبردار کر دوں۔"

"شکریہ جمیل بھائی۔ ڈاکٹر نے انہیں اب تک ایڈمٹ نہیں کیا ہے؟"

"جی۔ وہ اب آنے والا ہے۔ میں اسی کا انتظار کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر اگر آگیا تو میں نائلہ کو آپ کے پاس سے لے آؤں گا۔ اچھا خدا حافظ۔" جمیل نے فون رکھ دیا۔

جو سڑک نادر کے گھر کو جاتی تھی وہ ٹینس کورٹ کے پاس سے گزرتی تھی۔ نائلہ ٹینس کورٹ کے پاس آکر رک گئی۔ نذیر یہاں شام کے وقت ٹینس کھیلا کرتا تھا۔ یہاں سے گزرتے ہوئے اگر کبھی بیٹے کو ٹینس کھیلتے دیکھتی تو رک کر اس کا کھیل دیکھتی رہتی۔ ٹینس کورٹ میں ادھیڑ عمر کے مرد و عورت کھیل رہے تھے۔ نائلہ سڑک پر کھڑی کھلاڑیوں کے درمیان اپنے بیٹے کو تلاش کرتی رہی۔ خزاں کے خنک دن میں ہوا خنک تھی۔ لیکن نائلہ سردی سے بےپرواہ کھیلنے والوں کو تکتی رہی۔ راہگیر بنی سنوری نائلہ کو حیرت سے تکتے ہوئے گزر گئے۔ کبھی کبھی،

گرڈ شارٹ کی آواز ٹینس کورٹ سے آجاتی لیکن وہ آواز جس سے نائلہ آشنا تھی، وہ نہیں آتی۔ وہ ناکام وہاں سے واپس پھری اور پاس کے مکان کا دروازہ جاکر اس نے کھٹکھٹایا۔ ایک پست قد ایشیائی عورت نے دروازہ کھولا۔

"آیئے نائلہ بہن۔ آپ تو بڑی اسمارٹ لگ رہی ہیں۔ آیئے نا اندر۔" مسز نادر بولتی ہوئی پیچھے ہٹی تاکہ نائلہ اندر آجائے۔

"مسز نادر۔ نذیر آپ کے بیٹے کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ اسے بلا دیجئے۔ میں اسے پرنس چارلس سے ملانا چاہتی ہوں۔" نائلہ نے ہال میں داخل ہونے کے بعد کہا۔

مسز نادر کے سنجیدہ چہرے پر شگفتگی آگئی۔ انہوں نے اپنی مسکراہٹ کو ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ یہاں نہیں ہے۔ میرا بیٹا اور نذیر اب مختلف شہروں کی یونیورسٹیز میں پڑھ رہے ہیں۔ آپ کو یقین نہ آئے تو گھر کی تلاشی لے لیں۔"

کسی خیال کے تحت نائلہ کھڑی مسز نادر کو گھورتی رہی۔ جو اپنا چھوٹا سر تاسفانہ آہستہ آہستہ ہلا رہی تھی۔ نائلہ کو خیال تھا کہ شاید اس کی آواز سن کر نذیر کسی کمرے سے باہر نکل آئے۔ لیکن ہال میں کھلنے والے دروازوں سے کمروں کا خالی پن جھانک رہا تھا۔ نائلہ نے ایک قہر آلود نگاہ مسز نادر پر ڈالی اور اپنے گھر واپس آگئی۔ بند دروازے پر اس نے زور سے دستک دی۔ جمیل نے دروازہ کھولا۔ اس کے ہاتھ میں فون کا ریسیور تھا۔

"تمہارے بیٹے کا فون آیا ہے۔ تم بھی بات کر لو۔"

نائلہ نے لپک کر جمیل کے ہاتھ سے فون چھین لیا۔

"نذیر! تم کہاں چھپے ہوتے ہو؟ یہاں آؤ میرے پاس۔"

"اماں آپ کو پتہ ہے میں کہاں ہوں۔ میں پڑھائی چھوڑ کر نہیں آسکتا۔ آپ دوا کھا لیں۔"

بیٹے کی ملتجی آواز دوسری جانب سے آئی۔

"میں کیوں دوا کھاؤں۔ میں بیمار نہیں۔ تم آؤ میرے پاس فوراً۔ نہیں تو میں پرنس چارلس سے شکایت کر دوں گی۔"

"اماں۔ پلیز۔ آپ بیمار ہیں۔ آپ سمجھتی کیوں نہیں۔ آپ بار بار ہسپتال جائیں گی تو پھر وہیں کی ہو رہیں گی۔ اماں دوا کھا لیجئے۔ اماں۔ اماں۔ پلیز۔" نذیر کی آواز گھبرائی ہوئی تھی۔ یہ جاننا مشکل نہیں تھا کہ وہ ماں کے غم میں رو رہا تھا۔

"دوا؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ چلا ہے ملکہ معظمہ کو حکم دینے۔" نائلہ ڈپٹی اور اس نے ڈائل پر فون زور سے پھینک دیا۔

●●

آنچل میں دودھ آنکھ میں پانی

نیاز قومی ایم اے علیگ
مقبول لاری منزل
اولڈ سٹی اسٹیشن لکھنؤ

زیبا کی پلکوں پر جھلملاتے ہوئے ستارے ایک ایک کر کے اس طرح برس رہے تھے جیسے گلاب کی پنکھڑی پر شبنم ۔ غم و غصہ کی بھڑکتی آگ سے تمتایا ہوا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ کر انگارے کی مانند سرخ ہو رہا تھا ۔

ہچکیوں کے پیچ و خم میں نہ جانے کب اس کی آنکھ جھپک گئی ۔ وہ کوئی اجنبی نہیں تھا بچپن سے دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کھیلے بڑھے تھے اور جیسے جیسے عمر کی دہلیز پر چڑھتے گئے ایک دوسرے کو چاہنے بھی لگے تھے ۔ مگر یہ تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اسلم اس کے وجود کی شفاف جھیل میں کھلے ہوئے کنول پر ہاتھ ڈال دے گا ۔

زیبا کے دل میں اسلم کے لئے آہستہ آہستہ بستی ہوئی چاہت ایک دم نفرت میں بدل گئی تھی مگر اس بارے میں اس نے اپنی زبان بند رکھنا ہی مناسب سمجھا اور دل و دماغ کی بھول بھلیاں میں الجھ کر اپنا غم غلط کرتی رہی ہوا کے جھونکے کی طرح کہاں سے کہاں پہونچ گیا...... ! اور نہ جانے کب چمپئی کی شاخ جیسی زیبا کے تن بدن میں بھرپور جوانی کی خوشبو بس گئی ۔ ادھر اسلم بھی کالج کی ڈگریوں کا بوجھ لادے گھر لوٹا ۔ تو زیبا کی طرف اس کے قدم بے اختیار اٹھ گئے ۔

" خالہ جان ! زیبا نظر نہیں آرہی ہے "

" بیٹا اب وہ شرماتی ہے تمہارے سامنے آتے " اسلم زیر لب مسکرا کے رہ گیا ۔ مگر اسے کیا معلوم کہ زیبا کے دل میں اس کے تئیں دبا ہوا نفرت کا کانٹا اس کا نام سن کر اور بھی چبھنے لگا تھا ۔

اسلم نے زیبا کے ساتھ جو نازیبا حرکت کی تھی اسے تو وہ کب کا بھول چکا تھا ۔ اس کے لئے وہ کوئی ایسی بات بھی نہ تھی نجانے کتنے جسموں کے چمن سے اس نے کلیاں چننے کی دست درازی کی ہوگی ۔ خوب رو ، خوش پوش اور صحت مند لڑکا تھا ۔ لڑکے تو پیدائشی حق سمجھتے ہیں اس طرح کی چھچھوری حرکتیں کرنا ۔

زیبا کو دیکھے بغیر لوٹنے کی کسک نے اسلم میں اور بھی تشنگی پیدا کر دی تھی ۔ بے چین ہو کر سیدھا اپنی ماں کے آغوش میں سر ڈال کر مچل ہی تو گیا ۔ آناً فاناً اسلم اور زیبا کی نسبت طے ہو گئی ۔

کئی سال پہلے زیبا نے اپنے پڑوس میں مستیا کی دوکان سے ایک خوبصورت سی گڑیا اٹھا کر پوچھا تھا ۔

" میری پیاری گڑیا میرے ساتھ چلوگی میرے گھر ؟ " مگر گڑیا خاموش تھی ۔

" بیٹی ! اچھی گڑیا بولتی نہیں ہے ۔ تمہیں پسند ہے تو اسے شوق سے لے جاؤ اپنے ساتھ " ۔ اور مستیا نے گڑیا ڈبے میں رکھ کر زیبا کے حوالے کر دی ۔

جس طرح مستیا نے زیبا کو گڑیا دی تھی اسی طرح ماں نے زیبا کو ڈولے میں بٹھا کر اسلم کے حوالے کر دیا ۔

آخر کار زیبا کی زندگی میں وہ رات بھی آئی جس سے ہر لڑکی کا مقدر وابستہ ہے ۔ جس رات کے لئے لڑکیاں کیسے کیسے ریشمی سپنے بنتی رہتی ہیں ۔ عروسی سج دھج سے دمکتے اور مہکتے ہوئی ۔ سیج پر سہمی ہوئی زیبا اس طرح بیٹھی تھی ۔ جیسے کسی پرندے کے پر کاٹ کر بے بس کر دیا گیا ہو ۔ وہ کچھ اس احساس میں غرق ہوئی جا رہی تھی کہ اس کے جسم کا روپہلا سکہ گندی انگلیوں کے نشان سے آلودہ ہو ۔ اور یہ خیال اسے اور بھی کرب میں مبتلا کر رہا تھا کہ جن بازوؤں کی گرفت میں وہ بن پانی کے مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی ان ہی ہاتھوں نے تو ایک دن اس کے موتی جیسے وجود کو بے آب کر دیا تھا ۔ وہ بے اختیار رو پڑی ۔ وہ روتی اور سسکتی رہی اور اسلم نے ہنستے کھیلتے پوری رات کاٹ دی ۔

زیبا کے دل سے نفرت کا کانٹا تو نکل گیا مگر ابھی وہ خود بیزاری کی کیفیت سے نکل نہیں پائی تھی۔ اسلم سے آنکھ ملاتے ہوئے اب بھی اسے اپنی بے مائیگی کا احساس دامن گیر ہو جاتا۔

اسلم نے زیبا کو اپنی زندگی میں اتنی ہی اہمیت کے ساتھ وابستہ رکھا جیسے چاندی کا نقشین گلاس پانی پینے کے بعد سلیقے سے ایک مخصوص مقام پر رکھ دیا جاتا ہے کہ دوبارہ پیاس لگنے پر فوراً ہاتھ آجائے۔ اس نے زیبا کو صرف پانی کے گلاس کی حیثیت دے رکھی تھی مگر خدا نے اس کے اندر دودھ کے فوارے کی سبیل پیدا کر دی تھی۔

زیبا ماں بن گئی۔ ایک چاند جیسا بیٹا اس کے سینے پر مچلنے لگا۔ منے سے اٹکھیلیاں کرتے وقت وہ خوب ہنستی مسکراتی اور کبھی کبھی تو اسے تھپکی دے کر سلاتے وقت گنگنانے بھی لگی تھی۔ اسلم سے جو بھی گلے شکوے تھے سب ایک ایک کر کے وہ بھلاتی چلی گئی۔ بے زاری اور بے اعتنائی اب رواداری میں بدل گئی تھی۔

دودھ پیتے پیتے منا اکثر اپنا ہاتھ زیبا کے جمپر میں ڈال کر دوسری طرف غبارے سے کھیلنے لگتا۔ اور زیبا کو اسلم کی پرانی حرکت یاد آجاتی۔ مگر اب نفرت یا غصے کا عنصر نہیں ہوتا بلکہ ایک ذرا تلخی کے ساتھ مسکراتی ہوئی بچے کا ہاتھ جھٹک کر کہتی۔

"ہٹ۔ یہ کیا ---؟ شریر کہیں کا آخر بیٹا کس کا ہے؟"

"کیا بات ہے؟ کیوں میرے بیٹے کا بہانہ بنا کر مجھے کوس رہی ہو؟" زیبا اسی تلخ مسکراہٹ کا سہارا لے کر آخر کار اپنے دل میں برسوں سے دبے ہوئے درد کی داستان زبان پر لے ہی آئی۔

اسلم ایک زوردار قہقہہ لگاتا ہوا باہر چلا گیا۔ اور زیبا سمجھ گئی کہ شاید جنسی چھچھوراپن مردوں کے خمیر میں شامل ہے۔

ایک روز نجانے کہاں سے آیا تھا۔ کچھ کھویا کھویا سا تھا اسلم۔ گھر میں آتے ہی بستر پر لیٹے ہوئے منے کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔ شاید اپنے دل کا چور چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ منا رو پڑا۔

"اچھا بھلا سو رہا تھا۔ آپ نے بے وجہ ہی رلا دیا"۔ کہتی ہوئی زیبا نے منے کو اپنی گود میں لیا تو وہ فوراً چپ ہو گیا۔ لیکن اس بیچ زیبا کی نگاہ کو اسلم کی سفید شیروانی کے بٹن میں الجھے ہوئے کچھ سیاہ لمبے بال نظر آہی گئے۔ اور کندھے پر سرخ بندی کا دھبہ بھی دیکھا اس نے۔

"یہ کیا ہے۔؟ کس کے گیسو میں الجھ کر یہ زلفوں کے تار کی نشانی اپنے سینے سے لگا رکھی ہے؟"

"اب تم مجھ سے ایک ایک بال کا حساب مانگو گی؟ یہ ہمت؟" بات ختم کرتے کرتے اسلم نے زیبا کے منہ پر ایک طمانچے کی مہر لگا دی۔

زیبا ایک کونے میں جاکر سو سو دریا آنسو بہانے لگی۔ منا بھی رو پڑا تو اسے آنچل میں چھپا کر دودھ پلانے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی

"بڑا ہو کر میرا بیٹا بھی اگر اپنے باپ جیسا نکلا تو میں اپنا دودھ نہیں بخشوں گی اسے"

زیبا اپنی کوکھ سے جنمے بیٹے کا مستقبل سوچ کر لرز سی گئی اور سوچنے لگی کہ مردوں کی ذات میں ایک خواہ مخواہ کا اضافہ کرنے کے بجائے۔ کاش! اس نے اپنی ہی جیسی ایک بیٹی کو جنم دیا ہوتا۔!

لیکن بیٹی کا بھی کیا مستقبل؟

شاید وہ بھی زندگی بھر اپنے خون جگر کو نچوڑ کر آنکھوں سے ڈھلکتے آنسو۔ اور سینے میں مچلتے دودھ سے اپنا آنچل تر کرتی رہے۔!

انور شیخ
مدیر "لبرٹی"
کارڈف (برطانیہ)

غزل

آئی نہ مجھے راس مری سحر بیانی
سنتے ہیں ترے ظلم کی سب مجھ سے کہانی

مخمور اگرچہ تھی مئے جور و جفا سے
کافی ہے صلہ ہم کو تیری یاد جوانی

ارزاں تو کیا پیار کو خود ہم نے وفا میں
کیوں شکوہ ؟ نہ گر سمجھیں وہ الفت کی گرانی

یارب نہ مرے زخم کو مرہم ہو میسر
اب ایک یہی ہے بتِ کافر کی نشانی

ہر ایک نہیں موت کے آئین کی زد میں
کچھ ایسے ہیں جو مرکے بھی ہوتے نہیں فانی

انور نہ ہو نالاں کہ جو ناکام ہیں سجدے
وہ بت نہیں جو جانیں محبت کے معانی

غزل

سبھی نالاں ، یہ سب تیرے فدائی
عجب گن ہے کمالِ بے وفائی

تمہارا روٹھنا طرز خدائی
کہ مجھ کو بندگی اس نے سکھائی

تری یادوں میں کھوکر بھول بیٹھا
ترا جور و ستم ۔ دردِ جدائی

فقیری سے تھی انور ہم کو نفرت
محبت نے سکھادی اب گدائی

محبوب دلشکن

ذوق و ندرت کا گلستاں تم ہو
میرے سپنوں کا تو جہاں تم ہو

تم بہاروں کا تحفۂ رنگیں
روح ایماں ، سرور جاں تم ہو

فصلِ گل کی تمہی ہو شادابی
بلبلوں سے بھی خوش بیاں تم ہو

عالمِ حسن کی ہو تم ملکہ
ناز و غمزہ کی کہکشاں تم ہو

مہ وشوں کے نہ سر جھکیں کیوں کر
مہ وشی کا تو آسماں تم ہو

نازکی ، دلکشی و رعنائی
لطف و مستی کا کارواں تم ہو

ذکر جب ہو شبابِ ہستی کا
سب یہ کہتے ہیں کیا جواں تم ہو

جس پہ میں نے جھکایا سر اپنا
سب سے اونچا وہ آستاں تم ہو

پھر بھی نامہرباں ہو تم مجھ پر
کیا کیا میں نے سرگراں تم ہو

صید الفت کبھی نہ بھاگ سکے
اس حقیقت کی رازداں تم ہو

اعجاز تابش ۔ ناگور

غزل

آج ہر آنکھ ہوئی کس لیے اندھی ، معلوم ؟
سب کی نظروں کو ہے بس اپنی ہی ہستی معلوم ؟
جن کی آنکھوں میں مہکتے ہیں شگوفے غم کے
ان کو ہوتی ہے ہر اک رات اندھیری معلوم
دل کی حالت ہے وہی ان سے ملاقات کے بعد
جیسے گھر جاتی ہے طوفان میں کشتی معلوم ؟
ان کو چاہیں ، انہیں پوجیں ، انہیں دل میں رکھ لیں
دل کو ہوتی ہے یہی بات بھلی سی معلوم
تجھ سے بچھڑے ہوئے اک عمر ہوئی ہے لیکن
اب بھی ہوتی ہے مجھے تیری کمی سی معلوم
جب برستے ہیں تیری یاد کے بادل دل پر
مجھ کو ہوتی ہے ہر اک شام گلابی معلوم
جی میں آتا ہے زمانے کو سنادیں تابش
جب بھی ہوتی ہے کوئی بات سنہری معلوم

ناہید کیفی
S/6/102 ۔ اردلی بازار، وارانسی کینٹ

غزل

ہر عمارت ستم و جور کی ڈھا دی جائے
یا ہر اک رسم محبت ہی مٹا دی جائے
یاد بھی فرقہ پرستی کی نہ باقی ہو کہیں
لاش گنگا میں تعصب کی بہادی جائے
آگ پلتی ہو جہاں اہل گلستان کے لئے
ایسی جو شاخ نشیمن ہو جلادی جائے
جس کی تعمیر میں انساں کا لہو شامل ہو
ایسی تعمیر ہو کوئی بھی وہ ڈھادی جائے
ان بہاروں سے تو بہتر ہے گلستاں میں خزاں
دامن گل سے جو شعلوں کو ہوا دی جائے
مانگ کر بھیک میسر ہو اجالا جس کو
ایسی جو شمع جلائے وہ بجھا دی جائے
مذہب و ملت و بتخانہ و کعبہ ناہید
جو بھی ہو قید محبت میں اٹھا دی جائے

عرش منیر عرشی
۲۱۔ کنوز فرلین ۔ کلکتہ ۔ ۲۱

غزل

اس طرح خوابوں میں آنا چھوڑدے
مجھ کو یوں پاگل بنانا چھوڑدے

زخم دے کر یہ جہاں ہوتا ہے خوش
مجھ پہ کیوں پتھر چلانا چھوڑدے

فکر کو اب پختہ کاری میں بدل
ریت پر یہ گھر بنانا چھوڑدے

تو کہیں یہ دل کی دولت کھو نہ دے
دیکھ اب پنچھی اڑانا چھوڑدے

ہو نہ جائے تیری بدنامی کہیں
راز دل عرشی بتانا چھوڑدے

قاسم ندیم
۹/۵۵ گونڈی ۔ بمبئی ۔ ۴۳
لوئس کالونی

سیاہ رات

میں نے کل رات
اک خواب سجایا تھا
مجھے یقیں ہے
ایسے خواب ہر کوئی سجاتا ہے
زندگی کی ساری رنگینیاں
سر جھکائے کھڑی ہیں
میرے روبرو
عطا ہو گیا ہے جیسے انہیں بدن
ہلکی سی مسکراہٹ ہے
ان کے چہروں پر
جس طرح خورشید کی پہلی کرن
جگمگاتی ہے
ہر اک کلی پر
مسکراہٹ ابھر آتی ہے
اس گھڑی فکروں اور پریشانیوں کا
نام و نشاں نہ تھا
میرے قریب ریشہ دوانیوں کا
پر فریب جہاں نہ تھا
صبح دم جب آنکھ کھلی
کینوس بھی تھا غائب
ہر تصویر تھی دھندلی سی
ذہن کے رگ و ریشے میں
اک سیاہ رات میں ہی
زندگی جی لی میں نے
اب تعبیر کی ضرورت ہے نہ تعدوین کی
اب نئے خورشید کی طلب ہے نہ تنویر کی
تو ہی بتا، اے شناسا
یہ کیسی مے پی لی میں نے

جیالعل دت رفیق
(لندن)

غزل

یہ مانا تیرا جلوہ چار سو تھا
کبھی پنہاں کبھی تو روبرو تھا

کسی کی آرزو کا کھیل ہے سب
نہ عالم میں تھا اور اے دل نہ تو تھا

جو آئے آشنا تو وائے قسمت
تہی تھا جام اور خالی سبو تھا

نہ جانے جستجو ٹھہری کہاں پر
کہ ذوقِ جستجو بے آبرو تھا

سناتا کس کو شکوے اور گلے میں
کہ تیرے بن نہ کوئی روبرو تھا

تمنا تھی بہاروں کی مجھے بھی
نگہ میں جب گلوں کا رنگ و بو تھا

زمیں کیونکر نہ ہوتی سرخ یارب
مری آنکھوں میں تو دل کا لہو تھا

تلاش جستجو وہم و گماں تھی
رفیق ناز تیرے روبرو تھا

خاں نثار غازی پوری
16, Armenian Street
(Top Floor)
Calcutta - 700001

غزل

بالکونی دیکھ کر جھانسے میں یار آہی گیا
مچھروں نے اس قدر کاٹا بخار آہی گیا

سر نہ کیوں سہلائیں ململ کا دوپٹہ دیکھ کر
سادگی پر مولوی صاحب کو پیار آہی گیا

ایک پل میں ساری بے چینی رفوچکر ہوئی
سر پہ ڈنڈا کیا پڑا دل کو قرار آہی گیا

جس میں کتے کی ادا دیکھی اسی پر مر مٹی
دم ہلائی قیس نے لیلے کو پیار آہی گیا

اس کی چوتھی کی خبر پہنچی مرے تیجے کے دن
دیر سے آیا مگر پیغام یار آہی گیا

ڈاک بنگلے میں مناؤں عیش کیا بیگم کے ساتھ
خود نہیں آیا مگر صاحب کا تار آہی گیا

جتنے گھر گھسنے تھے سب پھاٹک پہ بیٹھے رہ گئے
پھاند کر دیوار آنگن میں نثار آہی گیا

بخش لائلپوری (لندن)

۲ غزلیں

(۱)

برنگ مزاح ڈاکٹر انعام الحق جاوید کی نذر

یہ کس کوٹھے سے میرا یار دیرینہ اٹھا لایا
کبھی مینا اٹھا لایا کبھی نینا اٹھا لایا

پتا تسنیم و کوثر کا جو پوچھا میں نے واعظ سے
یہ حضرت میکدے سے ساغر و مینا اٹھا لایا

کہا جو میں نے بہرے سے خضر در کا ہے مجھ کو
وہ میری رہبری کو ایک نابینا اٹھا لایا

گیا لیلیٰ کو اغوا کرنے جب اک شب میاں مجنوں
وہ عجلت میں مگر لیلیٰ کا بوزینہ اٹھا لایا

عدالت نے کہا پھانسی لگا دو اک منسٹر کو
مگر جلاد کابینا کی کابینا اٹھا لایا

نگاہ ناز کی بجلی کا پوچھا تھا اثر ہم نے
وہ سوز عشق میں جلتا ہوا سینہ اٹھا لایا

جب اس نے اپنے چوبارے کی کھڑکی بند کی مجھ پر
میں کھڑکی کھولنے کے واسطے زینہ اٹھا لایا

نہ مجھ سے ہو سکی جب زلف جانانہ کی پیمائش
کسی منشی سے لکھوا کر میں تخمینہ اٹھا لایا

جسے کچھ پھول چننے کے لئے بھیجا تھا گلشن میں
وہ سبزی کی دکاں سے بخش پودینہ اٹھا لایا

(۲)

دیواروں میں در نکلیں گے
قید میں بال و پر نکلیں گے

باد صبا کے ہر جھونکے پر
شاخ سے برگ و بر نکلیں گے

شب کی سیاہی ماند پڑے گی
جب نالے شب بھر نکلیں گے

سوزش غم کی آگ میں جل کر
شعر گہر بن کر نکلیں گے

اہل ستم سے ہاتھ ملاؤ
اہل ستم کے ڈر نکلیں گے

یہاں بھی حق کی بات چلے گی
تیغ بدست نڈر نکلیں گے

بانجھ زمینوں کو گرماؤ
سایہ دار شجر نکلیں گے

لاکھ کرو تم دار کو اونچا
دار سے اونچے سر نکلیں گے

ادرک کی جمع ادراک

استاد بنے آپ مگر خاک بتایا
ادرک کی جمع پوچھی تو ادراک بتایا

جس کام سے ہوتا رہا حضرت کو منافع
اس کام کو میرے لئے ناپاک بتایا

دوچار دفع مجھ سے اکیلے میں الجھ کر
بیگم نے پڑوسن کو خطرناک بتایا

جو طے شدہ قیمت ملی دلہن کے یہاں سے
دلہا کے اقارب نے اسے پاک بتایا

ہر سال جو بہتی رہی رک رک کے مسلسل
مرزا نے اسی آنکھ کو غمناک بتایا

مرزا کھونچ، نیاٹولہ، بتیا - ۸۴۵۴۳۸

آس کا دامن

جی ایم جگنو
۱/۱۷ اچھاتا والی گلی
کلکتہ ۷۰۰۰۱۲

رات کے سناٹے نے پورے گاؤں کو اپنی آغوش میں چھپالیا تھا۔ میں اس کے پاس چنار کے ایک موٹے سے تنے سے لگ کر بیٹھا تھا۔ پتوں سے آتی ہوئی چاند کی دودھیا روشنی ہم پر عجیب عجیب سے سائے ڈال رہی تھی اور اس روشنی میں اس کے چہرے کی جھریاں نمایاں طور پر واضح ہو رہی تھیں۔ وہ مجھے اپنی کہانی سنا رہا تھا اور جب کبھی وہ سانس لینے کو رک جاتا تو مجھے عجیب سی نظروں سے گھورنے لگتا تھا۔ نہ جانے کیوں؟ دراصل اب اس کی بینائی بھی اس کی جوانی کی طرح اس کا ساتھ چھوڑ چلی تھی۔ باتیں کرتے کرتے یکایک اس کی آنکھوں کی چمک بجھ سی جاتی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا" بابوجی ایسی ہی چاندنی رات تھی۔ زعفران کے شگوفے اسی طرح کھلے ہوئے تھے۔ میں ابھی جوانی میں قدم رکھ ہی رہا تھا کہ کسان بن گیا۔ ان ہاتھوں سے میں نے زعفران کی کتنی ہی فصلیں اگائی ہیں اور پھول چنے ہیں۔ کتنے ہی من زعفران سکھا کر میں ٹھیکیداروں کے یہاں چھوڑ آیا ہوں۔ لیکن آج مجھے اتنا بھی حق نہیں کہ ان کھیتوں میں کھلے ہوئے شگوفوں کو جی بھر کر دیکھ سکوں۔ شاید ان کھیتوں کا دستور رہی یہی ہے۔ آج یہ کون نہیں جانتا ہے کہ انہی کھیتوں میں کام کرنے والا جس نے اپنی زندگی کے سولہ سال زعفران کے کھیتوں کو اپنے خون سے سینچ سینچ کر خوشنما بنایا وہ تین دنوں سے بھوکا ہے۔ میں نے ان کھیتوں کی خوش حالی کے لئے کیا نہیں کیا۔ جب میری شانتی مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں بھی نالے میں کود کر جان دے دوں تب کیا یہی کھیت نہ تھے جن کے لئے مجھے زندہ رہنا پڑا۔ ان کھیتوں کے لئے میں نے پردیسیوں سے جھگڑا نہیں کیا جو ان نرم نرم، زرد زرد اور خوشنما پھولوں کو پیروں تلے روندتے تھے۔

لیکن میں تم سے بابوجی یہ سب کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ تم مجھ سے زعفران کی کہانی سننا چاہتے ہو اور جب میں تمہیں زعفران کی کہانی سنانے لگتا ہوں تو تم کہانی ادھوری چھوڑ کر چلے جاتے ہو۔ اس وقت مجھے روحانی تکلیف ہوتی ہے۔ میری آتما تڑپ اٹھتی ہے۔ میرا بوڑھا دل رو اٹھتا ہے اور میں یہ فیصلہ کر لیتا ہوں کہ اب کسی کو میں کہانی نہیں سناؤں گا۔ لیکن دوسرے ہی دن جب کوئی پردیسی مجھ سے کہانی سنانے کو کہتا ہے تو میں سب کچھ بھول کر اسے کہانی سنانے لگتا ہوں..... اور پھر وہ بھی کہانی ادھوری چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ نہ جانے تم لوگ میری پوری کہانی کیوں نہیں سنتے؟

لیکن میں باتوں میں الجھ کر جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ بوڑھا ہوں نا! اور بھوکا بھی۔ تمہارے پاس کچھ کھانے کا سامان تو ہوگا ہی۔ جب میں کہانی ختم کر دوں تو مجھے ایک روٹی دیتے جانا۔

تم شانتی کے بارے میں پوچھ رہے تھے نا؟ شانتی ہمارے گاؤں کی حسین تتلی تھی۔ بالکل زعفران کے پھول کی طرح پیاری لیکن وہ تھی بڑی مغرور۔ گاؤں کے نوجوان بھی اسے ترچھی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ لیکن کیا مجال کہ کسی نے اس کی طرف آنکھ بھی اٹھائی ہو۔ میں بھی اسے صرف دل ہی دل میں پوجتا تھا۔ لیکن سامنے کچھ کہنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی یہ اور بات ہے کہ میں سب سے تگڑا گبرو تھا۔

ایک دن میں کھیتوں کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ مجھے دور سے ایک سایہ آتا دکھائی دیا۔ سایہ جب نزدیک آگیا تو میں نے چلا کر پوچھا۔ "کون ہے؟" جواب ملا۔ "میں ہوں شانتی"۔ اور جب میں نے شانتی کا نام سنا تو کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ حیرت کی بات بھی تھی۔ شانتی میرے پاس تھی اور چاندنی جوان تھی۔

"شانتی تم اس وقت؟"۔ میں نے پوچھا وہ چپ چاپ مجھے دیکھتی رہی "بولو نا شانتی۔"

"میں تم سے ملنے آئی ہوں بھولا۔" اور پھر مجھ پر جیسے کسی نے گھڑوں نشہ انڈیل دیا ہو۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد ہم دونوں اسی طرح کئی بار ملے اور پھر...... میری شانتی سے شادی ہو گئی۔ لیکن شادی کے دو سال بعد ہی وہ مجھے اور ننھی سیما کو چھوڑ کر چلی گئی۔

سیما میری بچی تھی۔ وہ بڑی خوبصورت تھی۔ اس کی آنکھیں بھی شانتی کی طرح ہی وحشی سی تھیں۔

کیا کہا۔ میری آنکھوں میں آنسو! ہاں سیما کی یاد ایسی ہے کہ اس کا نام لیتے وقت میں ان آنسوؤں کو روک نہیں سکتا۔ سیما کی یاد میرے لئے ناقابل فراموش غم ہے۔ سیما کو کون بتائے کہ اس کا بوڑھا باپ اس کے لئے اب بھی خون کے آنسو بہاتا ہے اور اس کے لئے...... صرف اس کے لئے ابھی تک زندہ ہے اور پھر بھی بھوکا ہے۔

بابوجی۔ سیما جوان تھی اور خوبصورت تھی۔ اسے سب کی نظریں ٹٹولتی تھیں۔ دور دور سے آنے والے سیاح بھی اسے پیاری نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ایک بھیانک رات کو جب جھینگر سوراخوں میں چھپ رہے تھے کوئی پردیسی اسے اڑا کر لے بھاگا۔ تب سے آج تک میں آس کا دامن تھامے اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ بھلا ہو اس بوڑھے چنار کا جو مجھے رات دن پناہ دیتا ہے۔ کسی گاؤں والے کو مجھ بوڑھے پر ترس آتا ہے تو وہ شام کو دو روٹیاں مجھے دے جاتا ہے۔ لیکن پچھلے تین دنوں سے مجھے کوئی نہیں پوچھتا۔ نہ جانے کیوں؟

تمہیں نیند آرہی ہے شاید؟ لیکن مجھے نیند نہیں آتی۔ مجھے ان زعفران کے کھیتوں میں سیما کا کنوارہ خون للکارتا دکھائی دیتا ہے۔ نہ جانے کب کیا ہوگا۔ کچھ دنوں سے میں ایک خوف سا محسوس کر رہا ہوں۔ سنا ہے گاؤں کے لوگ بھی بھوک سے تڑپ رہے ہیں۔ یہ بھی بڑی حیرت کی بات ہے۔ ان کھیتوں کی مٹی سے سونا اگانے والے کسان بھوکوں مریں۔ ان کے بچے ٹکڑے ٹکڑے کو ترسیں۔ جو دوسروں کو ہزاروں اور لاکھوں کا فائدہ دیتے ہیں اس کے بدلے انھیں کیا ملتا ہے گالیاں اور بھوک!

یہ بھوک آج کل عام کیوں ہو گئی ہے؟ ہم جب بچے تھے تو اتنی بھوک تو نہ تھی۔ لیکن آج یہ دھرتی ہمارا خون چوس کر ہی خوش ہوتی ہے۔ آج گاؤں کے ننھے ننھے بچے جب اپنی بھوکی آنتوں سے کلبلا کر آکاش کی طرف اپنی معصوم نگاہیں اٹھاتے ہیں تو کیا یہ آکاش تھرا نہیں اٹھتا ہوگا؟

اب یہ بوڑھا آسمان کتنا ظالم بن گیا ہے بابوجی۔ کیا تمہارے دیش میں بھی بھوک ہے؟

یہ نہیں سننا چاہتے ہو تو لو ایک دوسرا واقعہ سناتا ہوں۔ ارے تم تو اونگھنے لگے۔ لیکن میں جاگ رہا ہوں۔ میرا رواں رواں جاگ رہا ہے اور میں اس عالم میں بھی راتوں کو ان کھیتوں کی رکھوالی کرتا ہوں۔ ان کھیتوں میں میرے باپ دادا نے کام کیا تھا۔ یہ کھیت میں نے جوتے ہیں۔ تم انھیں اب مجھ سے چھین نہیں سکتے۔ ان کے لئے میری جوان سیما کا کنوارہ خون بھینٹ چڑھا ہے۔

میری شانتی ان کھیتوں میں ہی کام کرتے کرتے مر گئی ہے اور میں بھی انہی کھیتوں کی بدولت اس حال کو پہنچ گیا۔ آج لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں یہ زعفران پاگل ہے۔ میں اب بھی کسان ہوں۔ ایک بھوکا کسان۔ ایک باپ بھی اپنی بیٹی کا، جسے رات کے اندھیرے میں کوئی پڑوسی اڑا کر لے گیا ...... ارے تم جانے لگے۔ اب تو میری کہانی کا تھوڑا سا حصہ باقی ہے دیکھو پردیسی ایک منٹ اور ٹھہرو۔ تم ادھوری کہانی چھوڑ کر اس لئے جا رہے ہو کہ کہیں کہانی پوری ہونے پر تمہیں ایک روٹی نہ دینا پڑے۔ لیکن میں تم سے روٹی نہیں مانگتا۔ صرف میری کہانی کا آخری حصہ سن لو۔ اسے اب ادھورا نہ چھوڑ دو۔

لیکن میں واقعی بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی وحشت بڑھتی جارہی تھی اور میں اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ میں اسے یہ کیسے بتاتا کہ میں ہی وہ پردیسی ہوں جو اس کی سیما کو لے کر بھاگ گیا تھا۔

نصف پتھر

قمر جہاں

پروفیسر شعبہ اردو

سندروتی مہیلا کالج، بھاگلپور

ایک پرندہ، بالکل تنہا پرندہ ہوا میں اڑتا چلا جا رہا تھا..... پرندہ اڑتا ہوا، سفید بادلوں کو چیرتا ہوا، نہ جانے کس سمت کھو گیا تھا..... ؟ اب اس کے سامنے خلا ہی خلا تھا..... وہ دیر سے اس اڑتے ہوئے پرندے کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی، پرندہ کس قدر تنہا ہے کاش اس کا کوئی ساتھی ہوتا تو آسمان کی اس نیلی وسعت میں تیرتے ہوئے اسے کتنا لطف آتا..... کبھی سوچتی کاش! وہ بھی کوئی پرندہ ہوتی، کھلی فضا میں اڑنے میں کتنا لطف آتا ہوگا..... کاش! وہ بھی اڑ سکتی، پھر وہ اپنے پائوؤں میں پڑی زنجیر کو دیکھتی، اس کے قدم تو کسی داستانی پری کی طرح پتھر کے سے ہو رہے ہیں، وہ بھی تو نصف پتھر بن چکی ہے۔ بھلا اس کی قسمت میں اڑان کہاں..... ؟

گھڑی کی سوئیاں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں اور وہ پیچھے، بہت پیچھے چلی جا رہی تھی۔ ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی "کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ جب میں گھر میں داخل ہوں تو..... " وہ اپنے خیالوں کی دنیا میں کھو کر یہ بھول گئی تھی کہ گھڑی کیا بتا رہی ہے وہ تو وقت کی چہار دیواری کو آج پھاندنے کا ارادہ رکھتی تھی مگر ابھی تو وہ ذرا سا ادھر سے ادھر نہ ہوئی تھی کہ اس کے پانوؤں کی زنجیر جھنجھنا اٹھی..... ، " باؤلی ہو گئی ہو کیا، وہ آگئے ہیں، تمہیں ہی ڈھونڈ رہے ہیں..... " ایک ہمدرد نسوانی آواز نے اسے ٹہوکا دیا..... " بائی جی! وہ مجھے نہیں آپ کو بھی تو کھوج سکتے ہیں..... " ان کاموں کے لیے تو وہ کسی کو بھی بلا سکتے ہیں..... " مگر اس نے زبان سے کچھ بھی نہ کہا اور خاموشی سے اندر داخل ہو گئی تھی..... کمرے میں گرج دار آواز گونج رہی تھی ... " آپ نے اب تک کپڑے بھی نہیں تبدیل کئے ہیں۔ پارٹی کا وقت ہو رہا ہے..... صاحب لوگ آگئے ہوں گے..... دیر کرنا آپ کی عادت بن چکی ہے..... اف میں نہیں سمجھ پایا تھا کہ آپ کیسے سڑے دماغ کی عورت ہیں..... "

ذرا سی دیر میں اس کی پیشانی پر سینکڑوں بل آگئے تھے اور ناک بھی ناگواری سے سکڑ گئی تھی۔

" میں ابھی..... ابھی فوراً تیار ہو جاتی ہوں..... " وہ کٹھ پتلی کی طرح اس کے اشارے پر ناچ رہی تھی..... بن سنور کر جب وہ اس کے ساتھ اسکوٹر پر پیچھے بیٹھی تو اسے لگا کہ اس کی بھی کچھ اہمیت ہے..... سماج میں لوگ اسے بھی کسی نام سے جانتے ہیں..... خود اس کے اپنے نام سے نہ سہی مگر کسی کے حوالے سے تو وہ اپنی ایک پہچان رکھتی ہے..... ایک عورت کے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی ہے۔ وہ آج واقعی بہت خوش تھی۔ بہت کم وقفے میں بڑے سلیقے سے بن سنور گئی تھی..... گہرے سبز رنگ کی ساڑھی میں سیاہ بلوز خوب جچ رہا تھا۔ ہلکے سے میک اپ نے اسے جانِ محفل بنا دیا تھا" ۔ وہ اس احساس سے جھوم رہی تھی۔ وہ بھی اس کی پرکشش شخصیت کی نظری نظر میں داد دے رہا تھا مگر جب وہ گھر واپس آئی تو پھر اس کا مزاج برہم تھا " آپ کو ذرا بھی سلیقہ نہیں ہے، میں نے آپ کا تعارف اپنے بڑے صاحب سے کرایا مگر آپ نے ان پر ایک دقیانوسی عورت کا تاثر چھوڑا۔ بھلا وہاں لتنے لمبے گھونگٹ کی کیا ضرورت تھی ؟ بالکل جاہل اور ان پڑھ ہیں آپ..... کبھی شہر میں مہذب لوگوں کے درمیان رہنے کا ہنر ہی آپ کو نہیں معلوم ہو سکا..... "

وہ حیران تھی کہ آخر اس سے غلطی کہاں ہوئی اور اگر اسے وہاں اپ ٹو ڈیٹ عورت کی ریہرسل کرنی تھی تو ڈائریکٹر نے اسے پہلے ہی کیوں نہ ہدایت دے دی تھی..... اس نے ناگواری کے ساتھ کہا " تو تم مجھ سے کیا چاہتے تھے، تم نے پہلے کیوں نہ بتا دیا..... " ایک ہی بات کو بار بار کیا کہا جائے۔

ایک اچھی بیوی کو تو اپنے خاوند کے ہر اشارے کو سمجھنا چاہیے۔"
اس نے بڑی معصومیت سے پوچھ ہی لیا؟" اور ایک اچھے خاوند کی پہچان کیا ہے جناب..... ؟" اگرچہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری ہوئی
تھی مگر اس جملے کی معصومیت سے گزر کر وہ اسے اپنے اوپر صریحاً طنز سمجھ بیٹھا اور ایک کڑوے سے بول سے ماحول کی ساری رنگینی کو کڑوا کر دیا۔
"اوہ! تو اب آپ کی یہ ہمت ہو گئی ہے کہ آپ مجھے اچھے خاوند کی تمیز سکھا رہی ہیں..... " "آپ تو برا مان گئے، میں نے تو مذاقاً کہا تھا" ۔ مگر اس
کی رنجش تمام رات برقرار رہی..... شاید اس جملے کے اندر چھپی ہوئی سچائی کو وہ بھی شدت سے محسوس کر رہا تھا اور اس آئینہ میں اپنے آپ کو عریاں پا رہا
تھا۔

اس واقعہ کو مہینوں گزر گئے ۔ اس کے صاحب کو یہ دقیانوسی عورت اتنی اچھی لگی تھی کہ اب وہ بار بار خود سے، اس کے گھر آنے لگا تھا۔ وہ
اپنے خاوند کو اس بات کی اطلاع بھی دیتی رہی مگر وہ تو جیسے مرد تھا ہی نہیں..... اسے تو صرف اپنی شہرت، ناموری اور ظاہری عزت سے دلچسپی تھی...
صاحب کا اپنے گھر آنا وہ بہت بڑی بات سمجھتا تھا۔
ایک شام جب اس نے تیز قہقہوں کے درمیان صاحب کی آنکھوں میں اس مخصوص چمک کو دیکھا جو شکاری کو دام میں لانے سے پہلے شکاری کی
آنکھوں میں عود کر آتی ہے تو وہ تلملا اٹھا، صاحب کے سامنے تو وہ بھیگی بلی بنا رہا مگر ان کے رخصت ہوتے ہی وہ شیر کی طرح دہاڑنے لگا ۔ ایک زبردست
جھٹکے سے اس نے بیوی کا بازو پکڑ کر گھر سے باہر دھکا دے دیا اور دروازہ تیزی سے بند کر دیا ۔ بند ہوتے ہوئے دروازے کی آواز کے ساتھ ساتھ اس کی
گرج دار آواز گونج رہی تھی ۔ "حرام زادی، چھنال ۔ جا رہ اسی کے ساتھ...."
وہ دیر تک دروازے سے چمٹی کھڑی رہی ۔ شام کے دھندلے منظر میں آج پھر اسے وہ پرندہ یاد آ رہا تھا جو تنہا بالکل تنہا کھلی فضا میں اڑان بھر رہا
تھا...... وہ سوچ رہی تھی اس کے دل کے اندر بھی ایک زخمی پرندہ پھڑپھڑا رہا ہے، نہ معلوم وہ پرندہ پنجرہ ڈھونڈتا ہے یا کھلی فضا میں اڑنا چاہتا ہے۔؟
وہ کوئی فیصلہ نہ کر پا رہی تھی ۔ بہت دیر سے کھڑے کھڑے اس کے قدم تھک چکے تو وہ اپنے انگوٹھے کے ناخن سے زمین کریدنے لگی اور یہ محسوس کر کے
اسے سخت حیرت ہوئی کہ آج اس کا نصف پتھر کا دھڑ بھی حرکت میں آ رہا ہے۔
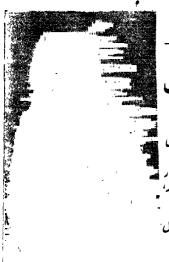
ڈاکٹر اختر بستوی
صدر شعبہ اردو
گورکھپور یونیورسٹی
گورکھپور (یو۔پی) ۲۷۳۰۰۹

تحفۂ نایاب

خیالِ شعر میں ڈوبا ہوا تھا میں اک شب
دماغ و دل پہ تھے حاوی تصوراتِ ادب

غنودگی نے اچانک کیا کچھ ایسا وار
کہ ہوگئی مرے ہوش و خرد پہ نیند سوار

پھر اس کے بعد بہ اندازِ خاص ایک پری
جہانِ خواب سے آئی دکھانے جلوہ گری

حسیں لبوں پہ تبسم کا رنگ بکھرائے
جوان آنکھوں میں شوخی کے جام چھلکائے

وہ آئی اور یہ بولی کہ "شاعرِ بیتاب!
میں تیرے واسطے لائی ہوں تحفۂ نایاب

یہ ایسی چیز ہے پاکر جسے ترے اشعار
بنیں گے جلد ہی بے مثل عالی شہکار"

تھماکے مجھ کو وہ تحفہ ہوئی پری رخصت
اور اس کے ساتھ ہی جاتی رہی مری غفلت

کھلی جو آنکھ تو کچھ بھی نہ ہاتھ میں دیکھا
بس اک پرانے سے ٹوٹے ہوئے قلم کے سوا

اسحاق ملک
حیدرآباد۔۲۴ (اے۔پی)

غزل

ایک تبسم سے کیا ہوگا
غم نہ ہمارا ہلکا ہوگا

آپ کا جلوہ جلوہ ہوگا
دیکھنے والا رسوا ہوگا

یہ تو بتا اے رسمِ محبت
کون یہاں پر کس کا ہوگا

آج تو ہے ہلکی شیرینی
کل تو نمک بھی پھیکا ہوگا

ایسی گھڑی بھی آئے گی اک دن
درد نہ میرا میرا ہوگا

تم سے بچھڑ کر دل میں ہمارے
زلزلہ ہوگا، جھٹکا ہوگا

جانِ تصور اس کو بناؤں
چاند سا جس کا مکھڑا ہوگا

اتنی بڑھے گی جان کی سختی
زہر پئیں تو میٹھا ہوگا

دور ملک وہ جتنے ہوں گے
اتنا تعلق گہرا ہوگا

نور جہاں نوری (لندن)

غزلیں

وہ عجب غیر ہے جو دل میں مکیں لگتا ہے
مسندِ عشق پہ سجادہ نشیں لگتا ہے

اس کے ماتھے پر قمر، آنکھوں میں جھلمل تارے
وہ زمیں پر ہے مگر دور کہیں لگتا ہے

پیکرِ دوست اگر صاف نظر آجائے
آئینۂ دل کا حسیں اور حسیں لگتا ہے

دل کی گہرائی میں جب رنگ بکھر جاتے ہیں
نور کا سیلِ رواں زیرِ زمیں لگتا ہے

ہوتو جاتی ہوں کبھی میں بھی شریکِ محفل
دل مرا اور کہیں اور کہیں لگتا ہے

قیدِ ہستی ہے اگر روح نکل جاتی ہے
تھامنے والا مجھے اور قریں لگتا ہے

دل کے آئینہ میں **نوری** جو نظر آتا ہے
غنچہ غنچہ اسی پیکر کا امیں لگتا ہے

وہ بے وفا تھا مگر بے وفا لگا ہی نہیں
نہیں نہیں مجھے اس سے کوئی گلہ ہی نہیں

خزاں نے چاک کیا گل کا پیرہن ایسے
بہاریں آتی رہیں پھر بھی وہ سلا ہی نہیں

دعا کے باب میں کیسی تمیز دشمن و دوست
دعائے خیر سے بہتر کوئی دعا ہی نہیں

کہاں ملا تھا وہ کیسے جدا ہوا ہم سے
یہ ذکر ہم نے کسی سے کبھی کیا ہی نہیں

میں دنیادار سہی مصلحت سے عاری ہوں
کسی کے سامنے یہ سر کبھی جھکا ہی نہیں

اسے بھلانا بھی چاہا مگر نہ بھول سکے
جدا بھی ہو کے وہ دل سے جدا ہوا ہی نہیں

تمام عمر چلی ریگ زارِ الفت میں
کسی کے پیار کا سایا کبھی ملا ہی نہیں

لگا کے قہقہہ چاہا چھپاؤں غم **نوری**
اداسی لوٹ کے آئی تو غم چھپا ہی نہیں

طاہر تلہری
صدر بازار، تلہر (یو پی)

غزل

کانوں میں شہد گھولئے کچھ کہہ کے لب سے آپ
چاندی کی مورتی کی طرح چپ ہیں کب سے آپ
بیٹھے ہیں خود تو چین سے کوئے گناہ میں
ہم کو ڈرا رہے ہیں خدا کے غضب سے آپ
آنکھیں جھکی ہوئی ہیں وفور خمار سے
کیا اٹھ کے آئے پہلوئے بنت عنب سے آپ
کوئی ہجوم لالہ رخاں ہو کہ بزم شعر
ممتاز ہر جگہ نظر آتے ہیں سب سے آپ
طاہر بتان دہر سے پھر کیوں یہ ارتباط
بیعت تو ہو چکے ہیں رسول عرب سے آپ

ڈاکٹر اسلم ثاقب
رائے کوٹ روڈ، مالیر کوٹلہ، (پنجاب)

غزل

عجیب خواب ان آنکھوں نے رات دیکھا تھا
تمہارے گھر پہ ہواؤں کا سخت پہرا تھا
یقین کون کرے میری بے گناہی کا
امیر شہر تو سب کی نظر میں سچا تھا
اسے خلوص نے مجبور کردیا ورنہ
میرے خیال میں ہر بات میں وہ تم سا تھا
نبھا رہا تھا وہ اب صرف دوستی شاید
وہ تیرے دل کی ہر اک بات کو سمجھتا تھا
جسے بھرم تھا بلندی کا وہ کبھی ثاقب
زمیں پہ ٹوٹ کے تارے کی طرح بکھرا تھا

کلیم اختر
ہریاٹولہ، گیا (بہار)

غزل

ظاہر سب ہے رخ پہ دیکھ
عیب ہے دل کے اندر دیکھ
کیسے بات بنے گی اب
چل کر سب کے تیور دیکھ
خوش فہمی میں کیوں رہتا ہے
دل ہے ان کا پتھر دیکھ
اپنے اپنے ظرف کی بات !
تو اپنوں کے نشتر دیکھ
مٹھی بھر دولت کی خاطر
آگ لگی ہے گھر گھر دیکھ
ذرہ سورج بن سکتا ہے
اختر جاگ ، مقدر دیکھ

سکندر عرفان
رامیشور نگر، کھنڈوہ (ایم۔پی)

غزل

پھر سے موسم کے بدلنے لگے تیور مولا
اس کے شر سے رہے محفوظ مرا گھر مولا
لوگ کہتے ہیں سیہ رات کو روز روشن
کیسے کرلوں میں غلط بات پہ باور مولا
میری ہر شاخ سے پھولوں کی ہوئی ہے بارش
جب بھی آئے ہیں مری ذات پہ پتھر مولا
مفلسی دی ہے مجھے ، تیرا کرم ہے لیکن
لوگ ہنستے ہیں مرے حال پہ اکثر مولا
تشنہ کامی مرے ہونٹوں کا مقدر تو نہیں
بھیجدے ان کے لئے اب تو سمندر مولا
سر بلندی مری اس وقت بھی قائم ہی رہی
تیغ پر جب وہ اٹھا لائے مرا سر مولا

سعید رحمانی
دیوان بازار (کٹک)

غزل

میری بربادی پہ مائل نیت طوفان ہے
میں سمجھتا ہوں مگر تقدیر کا فیضان ہے
لمس کی خوشبو تصور میں بسی ہے آج تک
کچھ حسیں پھولوں کا مسکن یاد کا گلدان ہے
رونق گیتی فریب حسن کا منظر لگے
اب یہی میری شکست ذات کا عرفان ہے
بے گناہی جن کی نظروں میں گنہ سے کم نہیں
ان کے ہاتھوں میں ابھی انصاف کی میزان ہے
ٹوٹ جائیں گی کسی دن ضبط کی ساری حدیں
حادثوں کی زد میں مبہم آج کا انسان ہے
ہم تو رکھ لیں گے سعید اپنی وفاؤں کا بھرم
دیکھنا ہے ان کے وعدوں میں کہاں تک جان ہے

ساغر ملک
وڈولی ۔ اچاٹ ، ۴۲۱۳۱۲ ۔
تھانے (مہاراشٹر)

دیوانہ

جیون کے اس چوراہے پر
کتنے کنکر، کتنے پتھر
پھیلے ہوئے تھے
بکھرے ہوئے تھے
میں نے سوچا
پاؤں کسی کا
زخمی ہوگا
خون بہے گا
میں نے اپنا خون جلا کر
چوراہے کو صاف کیا
"دل سوزی کا یہ پھل پایا
دیوانہ کہلایا"

سلسلے کی آخری قسط

یونان کے فلسفی ۴

اپی قورس (EPICURUS)

پروفیسر ایش کمار
1054, Sector VA
Bokaro Steel City - 827006 (Bihar)

سقراط کے بعد ہمشہ کے لئے فلسفے کا اہم ترین مسئلہ یہ بن گیا کہ خوشی کیسے حاصل ہو سکتی ہے ۔ افلاطون اور ارسطو نے بھی اپنے اپنے عقائد کے مطابق اس مسئلے کے حل پیش کئے ۔ جو دو مختلف اور متضاد طبیعتوں کے عکس تھے ۔ یا یوں کہئے کہ ایک ہی سکے کے دو رخ تھے بات وہی تھی ۔ صرف دو مختلف پہلوؤں پر زور دیا گیا تھا ۔ اسی طرح ان کے بعد بھی سقراط کے شاگرد دو مختلف جماعتوں میں بٹ گئے ۔ ایک نے نفس پرستی پر زور دیا اور دوسرے نے ضبط نفس پر ۔ ایک نے کہا کہ شکست کو لذت کی آغوش میں فراموش کر دو ۔ دوسرے نے کہا کہ شکست کو صبر و استقلال کے ساتھ قبول کرو ۔ ان دونوں جماعتوں میں بھی اتنا فرق نہیں تھا جتنا عام طور پر خیال کیا جاتا ہے ۔ ایک طرف لذت ایسی ہے جس میں ضبط ہے ۔ دوسری طرف ضبط ایسا ہے جس میں لذت ہے ۔ دونوں کے مطابق اصلی خوشی سکون قلب میں ہے ۔

دونوں فرقے ایک ہی وقت میں پیدا ہوئے ۔ سکے کے دو رخ الگ الگ نہیں رہ سکتے ۔ پہلے فرقے کی بنیاد اپی قورس (پیدائش ۳۴۱ موت ۲۷۰ ق ۔ م) نے ڈالی ۔ اس لئے اس فرقے کا نام اپی قوریہ پڑ گیا ۔ حیرت کی بات ہے کہ لذت کے فلسفے کی بنیاد ایک ایسے شخص نے ڈالی جو اپنی ذاتی زندگی میں ایک فقیر کی مانند تھا اور جسمانی لذات سے کوسوں دور ۔ یا یوں سمجھئے کہ فلسفہ کی تاریخ میں کسی اور لفظ کے معنی اتنے غلط نہیں لئے گئے ۔ جتنے اپی قوریہ کے جو عام طور پر عیاشی کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے ۔

ابتدائی زندگی

اپی قورس کا باپ مدرس تھا جس نے اس کے دل میں ظلم کے خلاف سخت نفرت پیدا کر دی ۔ اس کی ماں جادو کے ذریعے بیماریوں کا علاج کیا کرتی تھی ۔ وہ بچپن میں اپنی ماں کے ساتھ مختلف مریضوں کے گھروں میں جاتا تھا ۔ اس سے اس کے دل میں علاج اور دیگر تمام توہمات کے خلاف بھی نفرت ہو گئی ۔ بچپن سے ہی اس فلسفے کا شوق تھا ۔ ایک دن اس کے استاد نے سبق کے دوران میں کہا کہ دنیا اختلال (Chaos) سے پیدا ہوئی ۔ اس نے پوچھا ۔ اختلال کہاں سے پیدا ہوا استاد خاموش ہو گیا ۔ شاگرد نے ارادہ کر لیا کہ وہ بڑا ہو کر اس سوال کا جواب تلاش کرے گا ۔

تکلیف نے فلسفی بنا دیا

کسی وجہ سے اپی قورس کے والدین ایتھنز سے نکال دیئے گئے ۔ اور ایشائے کوچک میں جا بسے ۔ تکلیف فلسفے کی ماں کہی جاتی ہے ۔ اپی

قورس دنوں میں ہی فلسفی بن گیا۔ اور واپس جاکر ایتھنز کے ایک باغ میں اپنا مدرسہ قائم کر دیا۔ جہاں جلد ہی اس کے دوستوں، شاگردوں اور مداحوں کا ایک بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا۔ اس میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ غلام اور طوائف تک کو انکار نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے ابیقورس بہت بدنام ہو گیا۔ اگرچہ بدنامی کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ اس کے شاگرد اس پر دل و جان سے فدا تھے۔ اور دیوتا کی طرح اس کی پرستش کرتے تھے۔

زندگی نہایت سادہ تھی۔ جو کی روٹی اور پانی ان کی عام خوراک تھی۔ یہاں تک کہ پنیر بھی ایک ضیافت خیال کی جاتی تھی۔ مرغن اور لذیذ خوراک بالکل ممنوع تھی۔ کیونکہ ایسی خوراک لذت نہیں بلکہ بدہضمی پیدا کرتی ہے۔ ابیقورس کے لئے زندگی کی خوشی سادہ روٹی، پانی اور فلسفہ کی شراب پر منحصر تھی۔

ابیقورس نے کوئی تین سو کتابیں لکھیں۔ جو تقریباً تمام گم ہو چکی ہیں۔ صرف چند خطوط اور ایک دو کتابوں کے حصے باقی ہیں۔ جن کی طرز تحریر ہمت شکن ہے۔ ابیقوری فلسفہ کی مستند کتاب لیوکر لبیش (Lieuokarlabish) کی نظم Dererumnatune ہے جو فلسفہ اور شاعری کا مرکب ہے اس میں نہایت دقیق مسئلہ نہایت جذباتی الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ خدا کو انسان کی بھی طاقتوں سے محروم اور انسان کو خدا بنایا دیا گیا ہے یہ منکر جماعت کی بائبل کہی جاتی ہے۔

اس فلسفے کی رو سے دنیا کو کسی عادل یا رحیم خدا یا دیوتاؤں نے نہیں بنایا۔ یہ قدرت کا کھیل ہے۔ دنیا مادی ہے۔ صرف دو چیزیں حقیقت رکھتی ہیں۔ ایک ذرے یا جواہر (Atoms) اور دوسرے خلا میں ان کی حرکت۔ جواہر ازلی اور ابدی ہیں۔ ان کو کسی نے نہیں بنایا۔ ہمیشہ ایک جیسے رہتے ہیں۔ ان میں کمی زیادتی یا تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ وہ ہمیشہ نیچے کی طرف متوازی خطوط میں محدود خلا میں حرکت کرتے ہیں۔ اسی سے تمام کائنات کا ظہور ہوا ہے۔ حرکت خود بخود ہوتی ہے۔ حرکت دینے والی کوئی طاقت نہیں۔ دیوتا خود انہی جواہرات سے بنے ہیں۔ ہاں ان کی ساخت لطیف ترین ذروں سے ہوتی ہے اس لئے وہ لافانی ہیں۔ اور زندگی کی کشمکش اور رنج و راحت سے تعلق نہیں رکھتے رحم و غضب بھی ان کی صفت میں نہیں اور نہ ان کو انسان سے کچھ غرض ہے۔ اس لئے انسان کو دیوتاؤں کا کچھ خوف نہیں ہونا چاہیئے۔ ان کی پرستش یہی ہے کہ انسان ان کی پیروی کرے۔ اور اپنی زندگی کو ان کی طرح پر لذت بنائے۔

اسی طرح انسانی روح بھی جسم کی طرح مادی اور فانی ہے۔ گو جسم سے زیادہ لطیف۔ روح جسم میں اس طرح رہتی ہے جیسے گھڑے میں پانی۔ موت کے وقت روح کے ذرات منتشر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ جسم ہی ان کو قائم اور مرتب رکھتا ہے۔ جسم کے بغیر نہ حس ہے نہ فکر۔ نہ یادداشت نہ زندگی۔ چونکہ روح جسم کے ساتھ مرجاتی ہے۔ اس واسطے موت کے بعد ہمارے لئے کسی قسم کا ڈر نہیں۔ نہ موت کا ڈر ہے۔ کیونکہ موت، ہم تک پہنچ نہیں سکتی۔ جب ہم ہوتے ہیں موت نہیں ہوتی جب موت ہوتی ہے، ہم نہیں ہوتے۔ موت کے بعد نہ نیکی کا بدلہ ہے، نہ بدی کی سزا، نہ بہشت کی کشش نہ روح کا ڈر۔ موت ہمارے لئے رہائی کا پیغام ہے۔ جو ہمیں زندگی کے پاگل خانہ سے بچاتی ہے۔ یہ ایک رحمدل ڈاکٹر ہے۔ جو زندگی کے مرض سے ہمیں شفا دیتی ہے۔ ہم موت کو جیت نہیں سکتے۔ ہاں موت کا ڈر دل سے ہٹا سکتے ہیں۔ اسی طرح ابیقورس نے یونانی دنیا کے دو بڑے یعنی ایک موت اور دوسرے دیوتاؤں کے ڈر کا خاتمہ کر دیا۔

علم پر عمل کو ترجیح

مادیت کے لحاظ سے ابیقورس کا فلسفہ موجود سائنس کا پیش خیمہ ہے۔ ڈارون کے مسئلہ ارتقا (Evolution) کی بھی اس میں نمایاں جھلک پائی جاتی ہے۔ زندگی ایک جدوجہد ہے۔ جس میں کامیابی مشکلات کے مقابلہ سے ہوتی ہے۔ ترقی کا مرکزی اصول یہی ہے کہ روکاٹوں پر قابو پایا جائے۔

ابیقورس کا فلسفہ علم پر عمل کو ترجیح دیتا ہے۔ جو علم عمل کا راستہ نہیں دکھاتا وہ بے سود ہے۔ خالص علمی تحقیقات کا کچھ فائدہ نہیں یہاں تک کہ ریاضی وغیرہ بیکار اور حقیقت سے بعید ہیں۔ سائنس کا صرف یہ فائدہ ہے کہ قوانین قدرت کے علم سے انسان دیوتاؤں اور موت کے خوف سے آزاد ہو جاتا ہے۔ افلاطون نے کہا تھا کہ انسان یا کسی اور چیز کی انفرادی اور مساوی طور پر کچھ حقیقت نہیں۔ ابیقورس اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس کے مطابق فقط فرد ہی اپنی مادی حیثیت میں حقیقی وجود رکھتا ہے۔ اس کا علم اس کے احساسات پر مبنی ہے عقل پر نہیں۔ جوں ہی انسان عقل سے جانچ کرتا ہے غلطیوں کا شکار ہو جاتا ہے

لذت نیکی اور الم بدی ہے

انسان کی زندگی کا مقصد اعلیٰ یہی ہے کہ وہ اپنی انفرادی زندگی کو مصیبت سے بچائے۔ جس طرح علم عقل پر نہیں بلکہ لذت پر۔ ہر فرد لذت کی طرف راغب ہے۔ اور الم سے بچنا چاہتا ہے پس لذت نیکی اور الم بدی ہے۔ لیکن لذت سے اپی قورس کی مراد صرف جسمانی لذت نہیں بلکہ مکمل زندگی ہے۔ لذت کا مقصد روح کو سکون دنیا ہے۔ چونکہ اس سکون و راحت کے بنیادی اسباب ہمارے نفس کے اندر پائے جاتے ہیں۔ اس لئے نفسی یا روحانی لذت اور الم جسمانی لذت اور الم سے زیادہ اہم ہیں۔ جسم فقط موجودہ رنج و راحت سے متاثر ہوتا ہے لیکن روح گزشتہ اور آئندہ سے بھی متاثر ہوتی ہے۔ ان تاثرات کو صرف روحانی لذت مغلوب کر سکتی ہے۔ فطری خواہشات میں سے بھی فقط ایک حصہ ایسا ہے جن کا پورا کرنا ضروری ہے۔ بیشتر خواہشات غیر فطری اور بیکار ہوتی ہیں۔ عزت اور شان کی خواہش بھی اسی قسم کی لغو خواہش ہے۔ زندگی سے جس قدر لطف حاصل ہو سکے ضرور حاصل کرنا چاہیئے۔ لیکن انسان اپنے آپ کو ان کا محتاج نہ بنائے اصلی ضرورت اس بات کی نہیں کہ انسان چیزوں سے فائدہ اٹھائے۔ بلکہ طبعاً کم چیزوں کا محتاج ہو خود اپی قورس کی زندگی نہایت پاکیزہ اور بلند تھی۔ نہایت اطمینان سے رہتا تھا۔ اور دوسروں کو بھی اطمینان اور قناعت کی تلقین کرتا تھا۔

اپی قورس چونکہ انفرادی زندگی پر زور دیتا تھا۔ اس واسطے سوشل زندگی کی بابت اسے کچھ مشکل کا سامنا ہوا۔ اس کے نزدیک لوگوں کا اکٹھے مل کر رہنا کچھ خاص اخلاقی اہمیت نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کا اصلی مقصد تکالیف سے بچنا ہے۔ سوسائٹی اور اس کے قانون لوگوں کی حفاظت کے لئے ہیں۔ کیونکہ عام لوگ محض سزا کے خوف سے ظلم سے باز رہ سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ہو سکے انسان جمہوری زندگی سے الگ رہے۔ اسی طرح شادی یا خاندان کی زندگی بھی لازمی نہیں۔ لیکن دوستی کی بابت تمام یونانی فلسفی نہایت بلند معیار رکھتے ہیں۔ اپی قورس کے اپنے حلقے کی دوستیاں بہت مشہور ہیں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ یہ جاننا اتنا ضروری نہیں کہ ہم کیا کھا رہے ہیں جتنا یہ کے ہم کس کے ساتھ کھا رہے ہیں۔ مصیبت کے وقت دوست کے لئے جان تک قربان کر دینی چاہیئے دوستی مذہب ہے۔ یہ دنیا میں نہایت شیریں، خوبصورت اور متبرک چیز ہے۔ یہی چیز ہمارے زندہ رہنے کے لئے ایک کشش رکھتی ہے۔

اپی قورس کی اپنی زندگی دنیاوی لحاظ سے مصیبتوں کا مجموعہ تھی۔ وہ غریبی، بیماری اور جسمانی درد کا شکار تھا۔ لیکن موت سے پہلے اس نے ایک دوست کو ایک خط میں لکھا "گو میں ایک ناقابل برداشت درد کا شکار ہوں۔ لیکن ان لمحات کی یاد جو ہم نے اکٹھے گزارے ہیں۔ مجھے خوشی دے رہی ہے"۔

تبصرۂ کتب

● تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں۔ (ادارہ)

نام کتاب : باتیں ادب کی (مضامین اور مصاحبے)
مصنف اور ناشر : ڈاکٹر مظفر حنفی
قیمت : ۲۰۰ روپے
تقسیم کار : موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ ۹۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۔۱۱۰۰۰۲
مبصر : ف۔ س۔ اعجاز

اب سے پانچ سال قبل جب مظفر حنفی پروفیسر آف اقبال چیئر بن کر کلکتہ تشریف لاتے تھے تو کلکتہ کے علمی و ادبی حلقوں میں بڑی مسرت کا اظہار کیا گیا تھا کیونکہ ان کی ادبی شخصیت کافی پہلو دار تھی۔ ایک ہی شخص نمایاں حیثیت کا شاعر بھی تھا، نقاد بھی تھا، نقادوں کا نقاد بھی تھا، محقق و مترجم بھی تھا۔ افسانہ نگار بھی رہ چکا تھا اور ادب میں کسی بھی حوالے سے کسی بھی تحریر یا مکالے کو ایک حتمی یا موثر انجام تک پہنچا سکتا تھا۔ مظفر حنفی نے اردو ادب کو جتنا کچھ دیا ہے کیت و قدر کے اعتبار سے اس کا دسواں حصہ بھی کلکتہ کے عالی مقام مقامی اساتذہ نے مل کر اردو کو نہیں دیا۔ اس کے ثبوت میں ان کی پانچ چھ کتابیں " آزادی کے بعد دہلی میں طنز و مزاح " (۹۰ء) "حسرت موہانی (کئی زبانوں میں) (۹۱ء) ، غزلیات میر حسن : انتخاب و مقدمہ (۹۱ء) ادبی لیکچر اور تقریریں (۹۲ء) شاد عارفی ــــ ایک مطالعہ (۹۲ء) ، 'روح غزل' (۹۳ء) پیش کی جا سکتی ہیں۔ اور اب ایک اور کتاب ۹۴ء میں شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے "باتیں ادب کی"۔ اس عرصے میں کلکتہ میں کئی اسکولی ٹیچروں کو یونیورسٹی کے جز وقتی یا کل وقتی لیکچرر اور پروفیسر بننے کی خوشی حاصل ہو چکی ہے لیکن عمل تصنیف و تالیف سے ان کی قابل ذکر نسبت تو کیا النسبت تک کا پتہ نہیں چلتا۔ ظاہر ہے ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

جو ادبی صورت حال بیان کی گئی اس کی روشنی میں اگر کوئی شخص ایک کتاب میں ادبی باتوں کا جھنڈا رے کر ادبی منظر نامے میں داخل ہو تو ناظرین کو خوشگوار حیرت تو ہوگی ہی!

یہ تمہید خرمن کے خوشہ چینیوں کو یہ بتلانے کے لئے ہے کہ مظفر حنفی نے پھر ایک کتاب پیش کر دی ہے جس کا عنوان "باتیں ادب کی" ہے۔ اگرچہ اس میں جتنی باتیں ادب کی ہیں اتنی ہی ادیبوں کی بھی ہیں۔ یہ کتاب دو حصوں میں تقسیم ہوئی ہے پہلے حصے میں موضوعی اور شخصی مضامین شامل ہیں۔ دوسرا حصہ پانچ مشاہیر ادب کے انٹرویوز اور مصنف کے اپنے تعارف و سوانحی کوائف پر مشتمل ہے مصنف نے ازراہ تکلف اپنے بارے میں لکھے گئے اپنے مضمون کو آخر میں جگہ دی ہے حالانکہ اپنے پسندیدہ قلمکار کے سوانحی کوائف لوگ سب سے پہلے پڑھنا چاہتے ہیں۔ اپنے خاندانی پس منظر اور ذہنی پرورش و پرداخت پر مصنف نے مختصراً روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ کئی اہم باتیں قارئین کو معلوم ہو جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ مظفر حنفی کے کیریر میں ۱۹۵۹ء کا سال ان کی تمام فکری زندگی پر اپنی دھوپ چھاؤں پھیلا تا رہا ہے۔ ۵۹ء میں انہوں نے کھنڈوہ سے "نئے چراغ" رسالے کا اجرا کیا۔ اس کے وسیلے سے شاد عارفی مرحوم سے ان کا تعلق پیدا ہوا جس نے ۱۹۶۲ء میں بڑھ کر استادی شاگردی کے رشتے کی حیثیت اختیار کر لی۔

مضامین میں شخصی نوعیت کے مضامین چار عدد ہیں۔ جن کے عنوان علی الترتیب یہ ہیں : فرمان اور فتحپور، زیب غوری کی یاد میں۔ کچھ ناطق مالوی کے بارے میں اور صالحہ آپا کی موت پر۔

" فرمان اور فتحپور" فرمان فتحپوری کے بارے میں مصنف کے شخصی تاثرات کا مجموعہ ہے۔ مضمون امریکہ میں "جشن فرمان" کے موقعے پر شائع ہونے والے مجلے کے لئے حمیرا رحمان کی فرمائش پر آناً فاناً اس حال میں تحریر کیا گیا کہ فرمان فتحپوری کی تصانیف مضمون نگار کو دستیاب نہیں تھیں۔ ایسی عجلت میں یا ایسے ہنگامی طور پر لکھے گئے مضامین عموماً صاحب موضوع سے مصنف کے نیاز اور نسبت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ مظفر حنفی کا اور فرمان صاحب کا آبائی وطن فتحپور ہے۔ مصنف نے اپنے ہم وطن ممدوح کی عظیم الشان قدر و منزلت جو ترک وطن کے بعد حضرت نیاز فتحپوری کی رہنمائی میں اور ان کے پس مرگ حاصل ہوئی، کو اپنے لئے باعث افتخار محسوس کیا ہے۔ اور فرمان نے جو گلہ ہے بگلہ ہے اپنے ہم وطن کی نگارشات کو رسالہ "نگار" (پاکستان) کے لئے لائق اعتنا سمجھا اور ان کی پذیرائی فرمائی اس کے ذکر سے پہلے فتحپوری پٹھنولی کی دلچسپ تمہید باندھی ہے کہ ہر علاقہ مزاجاً مخصوص انفرادیت کا حامل ہوتا ہے۔ اگرچہ فرمان فتحپوری عمر میں مظفر حنفی سے صرف سات آٹھ سال بڑے ہیں لیکن ان سے موخر الذکر کی نیاز مندی کہیں کہیں عقیدت کے درجے تک جا پہنچی ہے لہٰذا اس مضمون پر مبصروں کی جانب سے انگشت نمائی کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

" زیب غوری کی یاد میں" مظفر حنفی اور زیب غوری کی مشترک یادوں کا مرقع ہے۔ بالانجام یہ مضمون زیب غوری مرحوم کے لئے ایک دوست کا خراج تحسین ہے لیکن درمیان میں کہیں کہیں دوست داری سے تنقید نگاری کی رسم آگے بڑھ نکلی ہے اور مضمون کو مفید اور دلچسپ بحث میں تبدیل کر گئی ہے۔ دو ذی فہم شعراء کی پرلطف رفاقت کشش کا باعث بنتی ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ زیب غوری "عام ڈھرے سے ہٹا ہوا، جذباتی سطح پر زندگی بسر کرنے والا ایک منفرد تخلیق کار تھا"۔ زیب ابتداً جدیدیت کو فیشن پرستی قرار دیتا تھا۔ لیکن بعد میں اس کا فنی نظریہ الٹ گیا یا تضادات کا شکار ہو گیا۔ وہ صراحت پر ابہام کو ترجیح دینے لگا۔ زیب غوری، بانی اور پاکستان کے ظفر اقبال کے مقام و مرتبے کے تعین میں نقادوں اور شاعروں کے ایک مخصوص گروہ نے اکثر بے ایمانی کی ہے۔ یہ دیکھ کر

اچھا لگتا ہے کہ اس معاملے میں حنفی نے کافی انصاف سے کام لیا ہے۔ حنفی نے دو ٹوک لکھا ہے: "زیب غوری جیسا باصلاحیت غزل گو بانی کی تقلید میں مارا گیا۔" اور ایک جگہ لکھا ہے "مزاج شناسی کا مرحلہ، ندرت ادا کا معاملہ ہو یا بلندی خیال کی بات زیب ہر جگہ بانی سے افضل ہیں۔" اس سلسلے میں مظفر حنفی نے معقول دلائل بھی پیش کئے ہیں۔ لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مصنف نے شمس الرحمٰن فاروقی جیسے نقادوں کو مجرم قرار دیا ہے جو زیب جیسے معصوم صفت شاعر اور سیدھے انسان کو اپنی دانشورانہ سفاکی کے ذریعہ پہلے اپنا مطیع بناتے ہیں پھر ان کا ذہنی اغوا کر لیتے ہیں۔ حنفی کو اس بات کا ملال ہے کہ "اردو کے بعض نقادوں اور اکثر مبصروں کو اینٹ پر اینٹ رکھنے کی عادت ہے (کہ اسی میں سہولت بھی بہت ہے)۔" یہاں مظفر حنفی نے ملزم نقادوں کے نام گنوانے کی جرأت نہیں کی۔ شاید وہ اپنی آئندہ کسی تحریر میں ایسا ہدایت نامہ فراہم کریں گے جسے پڑھ کر اردو نقاد اور مبصر اینٹ پر اینٹ رکھنے کی عادت سے چھٹکارا حاصل کرنا سیکھ لیں گے۔ البتہ زیب کے بارے میں ان کی یہ دریافت ایک تخلیقی سچائی کا اعتراف ہے کہ "زیب غوری پر یہ بھید کھل چکا ہے کہ سچی شاعری کے لئے ہدایت نامے کوئی بڑے سے بڑا نقاد بھی نہیں جاری کر سکتا۔ یہ فرمان اپنے لئے شاعر خود جاری کرتا ہے۔"

ناطق مالوی کے بارے میں اپنے مضمون میں مظفر حنفی نے زبردستی کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ تحریر میں جو دعوے کئے گئے ہیں وہ ناطق کے ماخوذ اشعار سے ثابت نہیں ہوتے۔ اور مصنف کا یہ کہنا کہ "سخن معتبر" کے شاعر ناطق کی زندگی جتنی ناخوشگوار گزری اس اعتبار سے انہیں شاعری میں فانی کا مقلد ہونا چاہئے تھا لیکن اندر کی آنچ نے انہیں بھٹنے نہیں دیا۔" کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ چونکہ آنچ ناطق کے کلام میں ہے ہی نہیں۔ خود مصنف نے آخر میں فرمایا ہے " اگر ناطق مالوی کا تمام اچھا کلام منظر عام پر آجائے تو اردو ادب کا کوئی بھی مورخ انہیں آسانی سے فراموش نہ کر سکے گا۔" کاش یہ کار خیر مظفر صاحب خود انجام دیتے۔

"صالحہ آپا کی موت پر" ایک جذباتی نوعیت کا مضمون ہے۔ "نازک ہے بہت کام" میں کلکتہ کے اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والی اخباری اور ادبی تحریروں میں نقائص دریافت کئے گئے ہیں۔ بیشتر صحیح جگہ گرفت کی گئی ہے لیکن کہیں کہیں خود مصنف سے لغزش ہوئی ہے۔ مصنف کو ضرور علم ہوگا کہ اخبار زبان اور قواعد کے اصول برتنے کا پابند نہیں ہوتا۔ زبان کی صحت کی ذمہ داری اگرچہ روزناموں سے زیادہ ادبی رسائل کے مدیران پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے باوجود زبان کے علاقائی لہجے اور بولی ٹھولی کی اصلاح میں اخبارات و رسائل تو در کنار کلکتہ کے اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ بھی کچے واقع ہوتے ہیں۔ اس مضمون کو اسکول کے نصاب میں شامل کر لیا جائے تو بہتر ہے۔

کتاب میں شامل دیگر موضوعی مضامین مصنف کی پختہ کاری کا وافر ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ پہلا ہی مضمون مظفر حنفی نے اپنے استاد محترم کی حیات رومان کے تخلیقی پہلوؤں کو لے کر ترتیب دیا ہے۔ "شاد عارفی معاشقے اور ان کا تخلیقی ردعمل" نہ صرف شاد عارفی کی عشقی کیفیات کو ان کے غزلیہ اشعار میں منعکس کرتا ہوا نظر آتا ہے بلکہ مجموعی طور پر تفہیم شعر کے لئے ایک تازہ کار تنقیدی رویے کو بھی ابھارتا ہے۔ لیکن مظفر حنفی کو اپنی اس رائے میں ترمیم کرنا پڑے گی کہ تغزل پسند طبیعتیں غزل کے مروجہ معیاروں کی روشنی میں شاد عارفی کی غزلوں کی سچی قدر نہیں کر پاتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری تنقید کو اب نئی آنکھیں مل گئی ہیں جس کا ثبوت ماہنامہ [illegible]
بھی شامل کیا گیا تھا۔

مظفر حنفی کے تنقیدی ابعاد مقصدیت و معنویت اور تلاش و تعبیر سے ملو ہیں۔ تخلیق ایک دائرہ ہے جس کے مرکزی نقطے سے خط تنقید کو گزر جانا چاہئے۔ جیسے دائرے کے باہر سے ایک الٹراسونک لہر اپنا سفر شروع کرے اور دائرے کے اندر داخل ہو کر مرکز کو چیرتی ہوئی دائرے سے باہر نکل جائے۔ لیکن کم ناقدین ایسے ہیں جو تخلیق کی ماہیت پر ایک حتمی رائے دینے کے لئے تخلیق کی چیر پھاڑ کر ڈالتے ہوں۔ چنانچہ اکثر نقاد کسی اہم اور رشتہ پہلو فنکار کا یک رخا یا محدود جائزہ پیش کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ قارئین کو بھی انہوں نے مطمئن کر دیا۔ تنقید اگر اس سمت کا سفر کرے جہاں پہلے کسی کے قدم نہ پڑے ہوں تو اس کا مآل خوش آئند ہو سکتا ہے۔ مثلاً آپ مظفر حنفی کے مضمون "میر حسن کی غزلیں" کو لیں۔ ایک شاعر پر اکثر نقادوں نے مثنوی نگار کا لیبل چسپاں کر دیا ہے اور مثنوی "سحرالبیان" کو اس کی سب سے اعلیٰ شناخت کہہ کر اس کے دیگر فنی محاسن اور صنفی تنوع کو کافی حد تک نظر انداز کر دیا، مظفر حنفی نے بطرز دیگر دریافت کیا ہے۔ بے شک مصنف نے اس نکتۂ اعتدال کو قبول کیا ہے کہ میر حسن کی مثنویوں کے بغیر ہم ایک خاص عہد کی جیتی جاگتی زندگی کا صحیح مطالعہ ہی نہیں کر سکتے۔ لیکن اس روش پر اپنی بے اطمینانی کا برملا اظہار بھی کیا ہے کہ "ہماری تنقید وسیع پس منظر میں کسی فنکار کی مکمل شخصیت اور سارے کارناموں پر نگاہ ڈالنے کی کم عادی ہے اور تخصیصی پہلوؤں پر زیادہ زور دیتی ہے۔" چنانچہ میر حسن کی کلیات میں شامل ان کی تقریباً پانچ سو غزلیں انہیں کامیاب غزل گو کا درجہ نہیں دلا سکیں۔ مصنف نے میر حسن کے بے شمار اشعار نقل کئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ مطلع ہی کسی سخن فہم کو انوکھی کیفیت سے دوچار کرنے کے لئے کافی ہے۔

لتنے آنسو تو نہ تھے دیدۂ تر کے آگے
اب تو پانی ہی بھرا رہتا ہے گھر کے آگے

یہ مضمون میر حسن کو زیادہ مکمل شاعر کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ لیکن اس مضمون میں ایک کسر بھی رہ گئی ہے۔ حنفی رقمطراز ہیں: "اگر میر حسن کی کم و بیش پانچ سو غزلیات پر ابتدا سے ہی خاطر خواہ توجہ صرف کی گئی ہوتی تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آج انہیں بھی اردو کے اہم غزل گویوں کی صف میں شمار کیا جاتا۔" مظفر حنفی نے یہ اشارہ کہیں نہیں کیا کہ اگر میر حسن کامیاب غزل گو تسلیم کر لئے جاتے تو کلاسیکی شعراء میں ان کا کیا مقام ہوتا۔ مثلاً چوتھا یا ساتواں؟ اہمیت کے ساتھ ترتیب

کا تعین بھی طالب علم کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

"عنوان چشتی کی غزل" مضمون پندرہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ساڑھے سات صفحات پر نقاد کی نثر ہے اور اتنے ہی صفحات پر عنوان چشتی کے غزلیہ اشعار دیکھے یا پڑھے جا سکتے ہیں۔ جو مصنف نے بطور نمونۂ کلام پیش کئے ہیں۔ پھر بھی مصنف نے لکھا ہے "طوالت کے خوف سے زیادہ مثالیں نہیں پیش کی جا رہی ہیں"۔

مضمون کے دوسرے بند میں ٹی ایس ایلیٹ کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ شاعر ہی شاعری کا بہترین نقاد ہوتا ہے۔ ایلیٹ کی اس عبارت کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ شاعر ہی اپنی شاعری کا بہترین نقاد ہوتا ہے۔ دوسرا مفہوم یہ ممکن ہے کہ ایک شاعر دوسرے شاعر کی شاعری کا بہترین نقاد ہو سکتا ہے۔ تیسرا مفہوم یہ نکلتا ہے اگر شاعر نقاد بھی ہو تو اس سے اچھا نقاد اپنی شاعری کا اسے نہیں ملتا۔ حنفی نے شاید یہ تیسرا مفہوم لیا ہے اور میر تقی میر، محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، نیاز فتحپوری، عندلیب شادانی، آل احمد سرور، سردار جعفری، فراق سے لے کر شمس الرحمٰن فاروقی تک کے نام درج کر دیئے ہیں کہ یہ حضرات اپنے دور کے شاعر بھی ہیں اور نقاد بھی، فاضل مضمون نگار نے اس تناظر میں یہ کہنے کی جسارت کی ہے کہ "بحیثیت ناقد اور ماہر عروض عنوان چشتی کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ تخلیقی سطح پر فن کی نزاکتوں اور لطافتوں کا نجی تجربہ بھی رکھتے ہیں اور اسی وسیلے سے موصوف نے جذبے اور فکر میں تال میل پیدا کیا ہے"۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ عنوان چشتی اپنے عروضی ہتھیار سے کتنے ہی بازاری شاعروں کو اکھاڑ پچھاڑ چکے ہیں اور لوگوں میں یہ بحث چلتی ہے کہ وہ نقاد بڑے ہیں یا شاعر۔ مظفر حنفی نے یہ مقالہ ان کی غزل پر لکھا ہے۔ عنوان چشتی کو ایک جگہ حسرت اور شاد عارفی جیسا کامیاب اور بامراد عاشق قرار دیا ہے اور ایک جگہ عاشق کو "فقیر عشق" کا خطاب عطا کرنے پر عنوان چشتی کو لائق تحسین بھی قرار دیا ہے۔ بعض لوگ اس خیال کے حامی ہیں کہ عاشق کو فقیر عشق کا خطاب دینا غلط ہے۔ کیونکہ وہ دراصل فقیر حسن ہوتا ہے اور حسیناؤں کے جلووں کی بھیک مانگتا پھرتا ہے اور پھر بامراد عاشق کی حیثیت طبیعت بھرے آدمی سے زیادہ کیا رہ جاتی ہے۔ عنوان چشتی کی شاعری میں مظفر حنفی نے علامتی، نیم علامتی، حقیقی، سماجی مقصدیت سے پُر عوامل اور متصوفانہ (اور جیسا کہ لکھا گیا ہے ایک صوفی کی حیثیت سے عنوان چشتی اس معرکے میں حضرت علیؓ کے ساتھ ہیں) اجزاء دریافت کئے ہیں جبکہ یہ بھی رقم ہوا ہے کہ عنوان کی شاعری میں "اوسط قاری ان کی رمزیت اور جنسیت دونوں سے بخوبی محظوظ ہو سکتا ہے"۔ یہ دوسری بات زیادہ ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ اس کے باوجود یہ مضمون ایک مرکزی خیال اور اکائی کا محتاج معلوم ہوتا ہے جس کے سبب مضمون نگار کی ادعائیت منتشر ہو گئی ہے۔

سماجی مقصدیت تنقید نگار کے لئے ایک ذمہ داری ہوتی ہے جس سے سبکدوش ہونے کے لئے اہتنائی سچ بولنا پڑتا ہے۔ ہم عصر ادب میں خود اشتہارات پبلک ریلیشن، توڑ جوڑ کے ذریعہ شاعر، ادیب اور نقاد وہ مقام حاصل کرنے لگے ہیں جس کے درحقیقت وہ مستحق نہیں ہوتے۔ مظفر حنفی نے "معرکۂ تخلیق و تنقید" اور "ہمارے مشاعرے" مضامین میں ایسے کھوکھلے فنکاروں اور بے ایمان ادبی اداروں سے لوگوں کو ہوشیار اور دور رہنے کی تلقین کی ہے۔ بعض گھپلے باز اور عامیانہ شاعروں مثلاً بشیر بدر کے نام بھی ظاہر کر دیئے ہیں۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ "باتیں" کے عنوان سے پانچ انٹرویوز پر مشتمل ہے جو مظفر حنفی نے فکر تونسوی، حسن نعیم، وزیر آغا، ساحر ہوشیار پوری اور جیلانی بانو سے لئے۔ یہ انٹرویو یقیناً رسمی انٹرویوز سے مختلف ہیں اور ان میں ادب کی کلاسیکی اور جدید قدروں، ادیبوں کی معاصرانہ چشمکوں، نقادوں اور ادبی صحافیوں کی بددیانتی اور ادبی تحریکوں کی عظمتوں اور مختلف تاریخی فرو گذاشتوں، جانبداریوں اور غیر جانبداریوں سے متعلق کھل کر سوالات کئے گئے ہیں اور سوالات کے جوابات بھی اسی بے تکلفی اور بے باکی سے دیئے گئے ہیں۔ ان طویل و مختصر مصاحبوں میں سے ہر ایک کی مدت کتنے دنوں یا کتنے گھنٹوں کی تھی یہ کہیں ظاہر نہیں کیا گیا۔ لیکن جیلانی بانو کے انٹرویو کے سوا ہر انٹرویو یا تو انٹرویو کار نے ایک سے زیادہ نشستوں میں حاصل کیا یا ہر انٹرویو کی مدت ۴ تا ۶ گھنٹے ضرور رہی ہوگی۔ بہرحال مظفر حنفی کے اس خیال سے وزیر آغا کی طرح اور بھی لوگ اپنے آپ کو متفق پاتے ہیں کہ اگر باتیں کسی اہم اور معقول آدمی سے ہوں تو گفتگو کی سطح بھی بلند ہوگی۔

مبصر کی مجموعی رائے ہے کہ "باتیں ادب کی" ادب کے ہر سطح کے قاری کے لئے ایک اہم اور مفید کتاب ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ اپنے قاری کو اس کی اہمیت کا احساس دلاتی ہے اور مستقبل کے ادیبوں کی ذہنی تربیت کا فریضہ انجام دیتی ہے۔

نام کتاب : تلاشِ میر
مصنف : ڈاکٹر نثار احمد فاروقی
اشاعت : ۱۹۹۴ء انجمن ترقی اردو دہلی
قیمت : ۶۰ روپیہ
تبصرہ نگار : حکیم محمد حسین خاں شفا، رضا لائبریری، رامپور

اس کتاب میں ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کے میر تقی میر پر لکھے ہوئے ۹ مضامین شامل ہیں۔ جن میں میر کی زندگی اور فن کے مختلف گوشوں کو عالمانہ و محققانہ انداز سے متعارف کرایا ہے۔ میر اردو زبان کی آبرو اور اردو شاعری کے خدائے سخن کہے جاتے ہیں۔ ان کی زبان و لہجہ دل کو چھو لینے والا ہے۔ میر کی "انا" اور "شدت احساس" نے ان کو عظیم فنکار بنا دیا ہے ۔

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے
ہماری گفتگو کا ڈھب الگ ہے

حرفِ آغاز کے عنوان سے ڈاکٹر خلیق انجم اور حرفِ ابتداء کے عنوان سے نثار صاحب نے بڑی فکر انگیز باتیں تحریر کی ہیں۔ اس مجموعہ کا پہلا مضمون "میر کا آرٹ" ہے جس میں میر کی شاعری کا جمالیاتی پہلو اور رس پیش کیا ہے۔ اس کے ہر ہر جملہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ استاذ طلبہ کو علم گھول کر پلا رہا ہے۔ اس مقالہ میں وہ سب داخلی و خارجی عناصر یکجا کر دیئے گئے ہیں جن پر شعر کے اثر و عظمت کا دارومدار ہوتا ہے۔ اس مقالہ میں میر کو علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اصلی مقصد طلبہ میں تفہیم شعر کا شعور پیدا کرنا ہے اور دراصل یہی مقالہ حاصل کتاب ہے۔

دوسرا مقالہ "مطالعہ میر کے امکانات" ہے۔ چونکہ میر کی عظمت کے اعتراف کے باوجود اہل علم نے میر پر بہت کم توجہ دی ہے اس مقالہ میں نثار صاحب نے اکثر وہ پہلو اجاگر کئے ہیں جن پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کا اردو زبان پر کتنا قرض باقی ہے۔ اور اس موضوع پر نثار صاحب کا مطالعہ کتنا وسیع ہے۔

کسی بھی فنکار کی تفہیم میں اس کے عہد اور معاصرین کو کلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ میر کی ۹۰ سالہ زندگی بہت ہی پُر آشوب رہی۔ اس سلسلہ میں بطور نمونہ نثار صاحب نے سید سعادت علی امروہوی اور انعام اللہ خاں یقین پر مقالات تحریر کئے ہیں جو تحقیقی سوانح نگاری کا اچھا نمونہ ہیں۔ ان دونوں حضرات کے سلسلہ میں کوئی ماخذ نثار صاحب کی نظر سے اوجھل معلوم نہیں ہوتا۔

میر تقی میر کو میر مجلس ان کی غزل گوئی نے بنایا ہے جس کے بارے میں میر کا خیال ہے۔

زمین غزل ملک سی ہوگی
یہ قطعہ تصرف میں بالکل کیا
جانا نہیں کچھ جز غزل آکے جہاں میں
کل میرے تصرف میں یہی قطعہ زمین تھا

اس کے ساتھ ہی میر کی مثنویات بھی بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ اس کتاب میں مثنویات میر پر تین مضامین شامل ہیں۔ (۱) میر کی مثنوی شعلہ شوق کا ماخذ (۲) مثنوی دریائے عشق (۳) میر کی مثنویاں۔ میر کی ۳۷ مثنویات کا پتہ چلتا ہے ان مضامین میں میر کی مثنوی نگاری کے فن اور ماخذ سے فاضلانہ بحث کی گئی ہے اور اس فن میں میر کا مقام متعین کیا ہے میر کی نگارشات کا نثری حصہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے اور نثار صاحب کو اس عہد کے میر شناسوں میں نمایاں مقام اسی کی وجہ سے ملا ہے۔ نثار صاحب نے ذکر میر کا اردو ترجمہ "میر کی آپ بیتی" کے عنوان سے کیا اور میر کے تذکرہ نکات الشعرا کا تحقیقی جائزہ لیا۔ اس مجموعہ میں آٹھواں مضمون "نکات الشعراء کی ایک اہم روایت" اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ نثار صاحب نے مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں ایک نادر مخطوطہ دریافت کیا اور اس کا مطبوعہ تذکرہ نکات الشعراء سے مقابلہ کرکے اختلافات کو واضح کیا ہے۔ یہ مضمون مخطوطہ شناسی کا اچھا نمونہ ہے۔

اس کتاب کا آخری مضمون "تذکرہ معشوق چہل سالہ" میر کی مزاج شناسی کا اچھا نمونہ ہے۔ میر تقی میر کے بارے میں قاضی عبدالودود صاحب نے تحریر کیا تھا: "میر صاحب نہ تو مصنف ہیں نہ راست گفتار، ان کا حافظہ بھی قوی نہیں ہے"۔ میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعراء کو اردو شعراء کا پہلا تذکرہ قرار دیا ہے جبکہ ان کے پیش نظر قائم چاندپوری کا تذکرہ مخزن نکات تھا اور اس پر ہی انہوں نے "تذکرہ معشوق چہل سالہ" مرتبہ خاکسار لکھ کر پھبتی کسی ہے۔

نثار صاحب ایک ممتاز میر شناس ہیں اور ان کی یہ کتاب مطالعہ میریات کا شہ کار کہی جا سکتی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۶ء میں مکتبہ جامعہ سے شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک اہم کتاب کو عام کر دیا یہ میر کی غزل کی طرح سہل ممتنع ہے اور ہر سنجیدہ اسکالر کے لئے قابل مطالعہ ہے۔

بقیہ:- قومی اتحاد — آج کے .....

لوگوں کو ٹکرانا چاہتے ہیں اور اپنی دکانیں چمکانا چاہتے ہیں۔ زبان، مذہب، علاقہ اور دیگر علاقائی مسائل کو بنیاد بنا کر ملک کا امن و امان تباہ کرنا حب الوطنی کے جذبے کے منافی ہے۔

ملک کے سبھی عوام کو اس حقیقت پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے اور ملک کے امن و امان کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہئے۔ دیش کا مفاد، ذاتی مفادات سے بالاتر ہے اور اس پہلو کو ہمیشہ ہی یاد رکھنا چاہئے۔ ●●

پندرھویں صدی کی شروعات کے بورڈ اپنے ۳۹ سال مکمل کر رہا ہے۔ اس وقت مغربی بنگال میں بجلی کی اوسط مانگ ۲۲۰۰ میگا واٹ ہے۔

بدلیل اور مستقل ڈیہہ کی لگاتار کامیابی کے باوجود ہمارے پاس خود کو تسلی دینے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ بورڈ کے ملازمین مغربی بنگال کی گہرائی تک میں مصروف ہیں، پہاڑ کی چوٹی سے سمندر کی سطح تک، اور تمام دوسرے حصوں میں تاکہ مختلف ناسازگار حالات میں وہ بجلی کی تقسیم اور اس کے بندوبست کا انتظام سنبھالے رہیں۔

اس صوبے کے عوام کے تعاون کی درخواست کے ساتھ بورڈ زیادہ موثر اور بتدریج خدمات کا مصمم ارادہ رکھتا ہے۔

امید کا نشان

مغربی بنگال اسٹیٹ الکٹرسٹی بورڈ

WEST BENGAL STATE ELECTRICITY BOARD

اطلاعات - اعلانات - ادبی خبریں

جشنِ گوھر میں تقریبات ۹۵ء

کل ہند اردو ڈرامہ سیمینار

مغربی بنگال سے ڈرامہ نگار ظہیر انور نے نمائندگی کی۔

جموں میں ۱۹، ۲۰ / مارچ ۱۹۹۵ء کو جموں یونیورسٹی اور انجمن ترقی اردو (ہند) جموں کی شاخ کے زیرِ اہتمام سہ روزہ کل ہند اردو ڈرامہ سیمی نار منعقد کیا گیا۔

۱۹ / مارچ ۹۵ء کو جموں یونیورسٹی کے شاندار آڈیٹوریم میں دن کے گیارہ بجے افتتاحی جلسہ منعقد ہوا۔ جموں کے گورنر کے مشیر خاص نے افتتاح کیا جس کے بعد استقبالیہ اور کلیدی خطبات پروفیسر جناب شیام لال کالڑا اور صدر شعبہ اردو ڈاکٹر ظہور الدین نے پیش کیے۔ ہال میں موجود معتبر ہستیاں سارے ہندوستان سے آئی ہوئی تھیں، ان میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر شمیم حنفی، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر اخلاق اثر، ڈاکٹر خلیق انجم، جناب کمال احمد صدیقی، ڈاکٹر قمر جہاں، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی، ڈاکٹر منظر اعظمی، ڈاکٹر شہناز بیگم، ڈاکٹر فیروز احمد، ڈاکٹر طیب انصاری، جناب ظہیر انور کے علاوہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر زماں آزردہ، ڈاکٹر حمید معظم، ڈاکٹر نذیر ملک اور اسد اللہ مانی (جموں) وغیرہ شامل تھے۔

دوسرے دن سیمی نار کافی اہم مرحلے میں داخل ہوا۔ صدور ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر اخلاق اثر اور منظر اعظمی وغیرہ تھے۔ ڈاکٹر شارب ردولوی نے "جدید اردو ڈراما - چند مسائل" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ مباحثہ میں ظہیر انور، قمر جہاں، کمال احمد صدیقی اور اسلم پرویز نے حصہ لیا۔ عابد حسین کے ڈراموں پر ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی نے اور محمد حسین اور "مور پنکھی" کے عنوان سے ڈاکٹر ہارون ایوب نے مقالے پیش کئے۔ مغربی بنگال کے ڈرامہ نگار ظہیر انور نے اپنا مقالہ "ڈراما، ناظرین کی نفسیات اور اردو ڈراما" پڑھا جسے لوگوں نے بہت سراہا۔ مباحثہ میں نصرت چودھری اور ڈاکٹر اخلاق اثر نے حصہ لیا۔ محترمہ قمر جہاں (بی ایچ یو) اور اخلاق اثر نے اس مقالے پر بصیرت افروز تقریریں کیں۔ دوسرے دور میں قمر جہاں نے

(بائیں سے) ظہیر انور، شارب ردولوی

(دائیں سے) نصرت ضیاء (جموں یونیورسٹی) مقالہ پڑھ رہی ہیں تشریف فرما ہیں: قمر جہاں (بنارس ہندو یونیورسٹی) ڈاکٹر فیروز احمد (جبل پور) اور طیب انصاری، گلبرگہ (کرناٹک)

آغا حشر کے ہندی ڈرامے پر، ڈاکٹر فیروز احمد (جے پور) نے انارکلی کے ضمنی کرداروں پر، ڈاکٹر توقیر احمد نے انارکلی کے ہیرو سلیم پر مقالات پڑھے۔

تیسرے اور آخری دن بھی ایک انتہائی اہم مقالہ ڈاکٹر اخلاق اثر نے اپٹا کی تاریخی اہمیت اور خدمات کے سلسلے میں پڑھا۔ مباحثہ میں ظہیر انور نے حصہ لیا۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر طیب انصاری (گلبرگہ) ڈاکٹر ہارون ایوب (چنڈی گڑھ) ڈاکٹر ظہور الدین، ڈاکٹر ضیاء الدین اور نصرت ضیاء اور اسد اللہ وانی نے مقالے پڑھے۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے آئے ہوئے ریسرچ اسکالر محمد کاظم نے مغربی بنگال کے حوالے سے ڈراما کی صورت حال پر اپنا مقالہ پڑھا۔ وقفۂ سوال میں ڈاکٹر اسلم پرویز، ظہیر انور، خلیق انجم، نصرت چودھری اور مقامی طلباء نیز ڈرامے کے شیدائیوں نے سوالات کیے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے آخری دن اپنے صدارتی خطبے میں مقالہ نگاروں کی کاوشوں کو سراہا اور ظہیر انور کی اس بات کی تائید کی کہ ڈرامے کی تنقید کا نیا idiom مرتب ہونے لگا ہے لیکن انہوں نے تمام لوگوں کو زبان کی طرف توجہ دینے کی تلقین کی۔ جموں یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر ظہور الدین اور ان کی ٹیم کی کارکردگی کو سراہا اور سمینار کے بہتر انتظام کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا۔

کشور ناہید کا خیر مقدم

پچھلے دنوں اردو کی ممتاز و منفرد شاعرہ کشور ناہید کے اعزاز میں شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت پروفیسر شمیم حنفی (صدر شعبۂ اردو) نے کی اور نظامت کے فرائض پروفیسر صغرا مہدی نے ادا کئے۔

پروفیسر شمیم حنفی نے کشور ناہید کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ کشور ناہید اردو کی ان ممتاز شاعرات میں شمار ہوتی ہیں جنہوں نے اردو شاعری کو ایک نیا رخ عطا کیا۔ ایک نیا لب و لہجہ اور انداز دیا۔ کشور کا پہلا شعری مجموعہ "لب گویا" تھا اور اس طرح انہوں نے میدان شاعری میں لب کھولے تو پھر رکنے کا نام نہیں لیا "بے نام مسافت" سے گزرتی ہوئی وہ ایک بار "گلدستوں کے درمیان" بھی آئیں اور پھر بھی انہوں نے چند "سیاہ حاشیے" لکھے تو ان کی شاعری "گلابی رنگ" ہو گئی۔

کشور ناہید "ماہ نو" کی مدیرہ بھی رہ چکی ہیں اور ماہ نو کا وہ زمانہ اس کا زریں عہد کہا جاتا ہے۔ عورت کے مسائل پر بھی "عورت ایک نفسیاتی مطالعہ" "عورت خواب اور خاک درمیان" کتابیں لکھیں۔ تراجم بھی کئے۔ عالمی ادب کا ترجمہ "باقی ماندہ خواب" کے نام سے شائع ہوا۔ سوانح بھی لکھی جو "بری عورت کی کتھا" کے نام سے شائع ہوئی۔

کشور ناہید نے شعبۂ اردو کے طالب علموں و اساتذہ سے گفتگو کے دوران مختلف سوالات کے جواب دیئے اور اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی بھی ڈالی۔ انہوں نے طالب علموں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ ہمارے معاشرے میں تنگ نظری کا یہ عالم ہے کہ جب کوئی شاعرہ مشاعرے میں پڑھا کرتی تھی تو لوگ اس سے دریافت کرتے تھے کہ تمہیں شعر لکھ کر کون دیتا ہے۔ میں نے شاعری شروع کی اور اس بات کی مخالفت بھی دلیل کے ساتھ کی۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ آپ کو کتابوں کے صفحات سے نکلنا ہوگا کیونکہ کتاب کے صفحات آپ کو لائبریری تک پہنچائیں گے۔ اصل تو آپ کو الفاظ کے معنی پر غور کرنا ہے۔ حرف کی پہچان کرنی ہے۔ جتنا جس لفظ کو برتا جاتا ہے وہ اتنا ہی نہیں کھونتا جاتا ہے، یہی لفظ کی حرمت ہوتی ہے اور یہی لفظ کی خدمت۔ وہ ہر بار ایک نیا مفہوم لے کر سامنے آتا ہے۔

پاکستان میں غزل کے تازہ ترین رجحان کیا ہیں؟ ایک سوال کا جواب کشور ناہید نے بات بنا کر ٹال دیا اور سوال کرنے والے طالب علم کو الجھا دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ یہ بتانا نہیں چاہتی تھیں۔

کشور ناہید نے طالب علموں کے سوال و جواب کے سلسلے کے بعد اپنی سوانح کا ایک اقتباس پڑھ کر سنایا۔ بلند شہر کے قصبے گلاؤٹھی میں پیدائش اور ابتدائی تعلیم اور خاندانی حالات کا ذکر بڑے خوبصورت انداز میں کیا۔ آخر میں انہوں نے اپنی دو غزلیں اور ایک مشہور نظم "جلتے شہروں کی داستان" سنائی۔

• تعلق کو نہ سمجھو جادوانی ۔ یہ آئینہ ہوا سے ٹوٹتا ہے
• ہماری پیاس رخصت چاہتی ہے ۔ پیالہ ہاتھ سے اب چھوٹتا ہے
• دریا بھی تیز خواہش دریا بھی تیز ہے ۔ دامن کی لو خبر کہ دینا بھی تیز ہے

آخر میں مہمان کے اصرار پر پروفیسر حنیف کیفی، ڈاکٹر خالد محمود، ڈاکٹر شہپر رسول، ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی نے بھی اپنا کلام سنایا۔ شکریے کے کلمات پروفیسر صغرا مہدی نے ادا کئے۔

رپورٹ: اسلم جمشید پوری، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ

پروفیسر صغرا مہدی کے افسانوی مجموعہ "پہچان" کا اجراء

ادب پبلی کیشنز، دہلی کے زیر اہتمام اور شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اشتراک سے مشہور ناول نگار، افسانہ نگار پروفیسر صغرا مہدی کے افسانوں کے تازہ مجموعہ "پہچان" کا اجراء ہوا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر شمیم حنفی نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر خالد محمود نے ادا کئے۔

ڈاکٹر شمس الحق عثمانی نے صغرا مہدی کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ کوئی فن کار خاتون اور مرد نہیں ہوتا، وہ بس فن کار ہوتا ہے۔ انہوں نے "پہچان" کے کئی افسانوں کا تجزیہ بھی کیا۔

پروفیسر عظیم الشان صدیقی نے "پہچان" پر ایک بھرپور تبصرہ پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ صغرا مہدی کے یہاں خاص بات یہ ہے کہ وہ بڑے بڑے موضوعات کی تلاش میں نہیں رہتیں۔ بلکہ اپنے اردگرد کے ماحول اور حالات کو موضوع بناتی ہیں۔

اردو دنیا کی مشہور و معروف ناول نگار، افسانہ نگار قرۃ العین حیدر نے اپنے مضمون میں صغرا مہدی کے افسانوں سے خاص بحث کی۔ انہوں نے کہا کہ صغرا مہدی اپنی سوسائٹی اور انسانی رشتوں کے متعلق لکھتی ہیں اور اکثر خود کلامی کی تکنیک اپناتی ہیں۔

صغرا مہدی کے استاد اور مہمان خصوصی جناب عبداللہ ولی بخش قادری کے ہاتھوں کتاب کی رسم اجراء ادا ہوئی۔ بعد ازاں قادری صاحب نے صغرا مہدی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

پروفیسر شمیم حنفی نے منصب صدارت سے فرمایا کہ صغرا مہدی کو شہرت فکشن پر ملی ہے۔ مگر انہوں نے سوانح، سفرنامہ، تحقیق اور تنقید پر بھی اچھا کام کیا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ صغرا مہدی کی کہانیوں میں کوئی پوز نہیں ملتا ہے۔ ان کی کہانیاں بہت سادہ ہوتی ہیں۔ ان کی زبان عام اور روزمرہ کی زبان ہوتی ہے۔

ڈاکٹر شہپر رسول نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر انور جمال قدوائی، پروفیسر حنیف کیفی، شاہد علی خان، پروفیسر عبدالرحمن ہاشمی، ڈاکٹر وہاج الدین علوی، ڈاکٹر صادقہ ذکی، ڈاکٹر شہناز انجم، ڈاکٹر سہیل فاروقی، ڈاکٹر شمع افروز زیدی وغیرہ بھی موجود تھے۔

مرسلہ: اسلم جمشید پوری، (نئی دہلی)

شاعرہ نور جہاں نوری کی نعتوں کا کیسٹ "عقیدتوں کے موسم" جاری

(لندن) نور جہاں نوری دو شعری مجموعوں کی خالق ہیں۔ غزلوں میں ان کا اپنا منفرد انداز ہے۔ حالات حاضرہ پر نظمیں بھی کہتی آئی ہیں۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان دنوں مغربی ممالک میں کوئی بھی بڑا مشاعرہ ہو اس میں انہیں خاص طور پر مدعو کیا جاتا ہے۔ کئی موقر انعامات و اعزازات سے انہیں نوازا گیا ہے خدا نے انہیں بہت خوبصورت ترنم بھی عطا کیا ہے۔ کچھ عرصہ قبل روضۂ رسول ﷺ پر شاعرہ نے حاضری دی۔ بقول نوری ان کے دل میں ایک روشنی اتر گئی۔ اس کے بعد انہوں نے کئی نعتیں کہیں۔ جو نیشنل ہیریٹیج فاؤنڈیشن، اسلام آباد کی جانب سے انہی کی مترنم اور پاکیزہ آواز میں ایک آڈیو کیسٹ میں بعنوان "عقیدتوں کے موسم"، پیش کی گئیں۔ کیسٹ کی صدا بندی جناب راحت نسیم نے کی ہے۔ نور جہاں نوری سوشیالوجی میں ایم اے اور پیشے سے وکیل ہیں۔ اس کے باوجود ان کا اپنی آواز میں نعتوں کا کیسٹ منظر عام پر آیا تو لوگوں کے ایمانی احساسات اور بھی روشن ہو گئے۔ نوری کے کیسٹ "عقیدتوں کے موسم" کی ان دنوں بہت مانگ ہے

صدی شمارے کا سرورق

صدی شمارے کے سرورق پر اردو شاعر، کہانی کار اور فلم نویس وہدایت کار گلزار کی رنگین تصویر شائع ہوئی تھی۔ جو قارئین اور پریس کا مرکز توجہ بن گئی۔ بیشتر اہل الرائے گلزار کو سرورق پر دیکھ کر خوش ہوئے۔ بعض نے نمبر کے مشمولات سے ہٹ کر گلزار اور ان کی تصویر پر رائے زنی شروع کر دی۔ ایک دلچسپ انگلستانی لطیفہ ہفت روزہ 'راوی' کے ایڈیٹر مقصود الٰہی شیخ نے صدی شمارہ پر اپنے بھرپور اور نئی طرز کے تبصرے "آنکھوں دیکھی سنجری"، میں تحریر کیا ہے۔ مبصر نے اپنی رواں "کمنٹری" میں لکھا ہے ایک محترمہ نے جو ادب کی قاری ہیں 'صدی شمارہ' دیکھ کر پوچھا (سرورق پر) یہ کس کی تصویر ہے۔ "گلزار"۔ "کون گلزار؟" لامحالہ فلموں کا حوالہ دیا گیا۔ محترمہ فوراً پہچان گئیں۔ "اچھا وہی! راکھی کے شوہر!!"

مبصر مقصود الٰہی شیخ لکھتے ہیں " ادب اور قلم کا حوالہ بھی کوئی یاد رکھا جاتا ہے؟ شاید صنف نازک کی رنگین عکاسی پرچے کی فروخت کی شماریات میں اضافہ کا باعث ہوتی لیکن فنس۔ اعجاز کو سرورق کے لئے تصویر کے انتخاب کی داد اسی لطیفے میں پنہاں ملے گی۔"

"صدی شمارہ" کے صاحب سرورق گلزار نے پہلے فیکس اور بعد میں فون کے ذریعہ اپنے تاثرات بیان کئے: "آپ نے تو واقعی حیران کر دیا۔ ابھی ابھی پرچہ دیکھا اور چونک گیا اور یہ اعزاز بھی پہلی بار آپ سے ملا کہ کسی رسالے کے سرورق پر میری تصویر چھپی ہو۔ کچھ ڈر گیا...... کچھ ...... سانس بھول گئی۔ شکریہ! بہت بہت شکریہ اس عزت افزائی کا!"

اب قارئین کچھ ہماری بھی سنیں اب تک انشاء کے سرورق پر حسیناؤں، اداکاراؤں کے علاوہ صحافیوں، نقادوں اور شاعروں کی تصاویر بھی چھپی ہیں اور عمارتوں، موسموں اور قلمی خاکوں کو بھی سرورق کی زینت بنایا جا چکا ہے۔ شخصیتوں میں آنجہانی ستیہ جیت رے کا پورٹریٹ بھی چھپ چکا ہے۔ ستیہ جیت رے کہانی کار، مصور، ہدایت کار، سنگیت کار، فوٹوگرافر کیا نہیں تھے۔ لیکن اردو سے ان کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ "شطرنج کے کھلاڑی" ان کا فلمی کارنامہ سہی مگر ان کا اردو کارنامہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے سرورق کے لئے ان کے پورٹریٹ کا انتخاب ان کی عظمت اور خدمت فن کے سبب کیا گیا تھا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو پرچے پر صرف اردو قلمکار کی ہی تصویر شائع ہونا چاہئے وہ شاید تنگ نظر واقع ہوئے ہیں۔ سماج میں صرف ادب، اردو ہی سب کچھ نہیں ہے۔ فن کے مختلف شعبے ہوتے ہیں اور ادبی کلچر اسی وقت سمجھا جائے گا جب اس کا ادب کے علاوہ دیگر فنون سے بھی دور و پاس کا کوئی تعلق ہو۔ جہاں تک گلزار کا تعلق ہے وہ فلم کے میڈیا سے اردو کی اچھی خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔ ان کے مکالمے، اسکرپٹ اور گیت لوگ بھول نہیں سکتے۔ اور یہ بھی فراموش کرنا مشکل ہے کہ ایک فلم "کوشش" گلزار نے ایسی بنائی جس کے خاص کردار کسی بھی زبان کے مرہون منت نہ تھے۔ وہاں گلزار نے فلم کو فلم کی زبان دی آپ اسے اردو کہیں گے یا ہندی؟ اگر کوئی شخص صرف اس لئے گلزار کو اردو فنکار ماننے میں عار محسوس کرتا ہو کہ ان کی فلموں کے سرٹی فکیٹ پر زبان کے خانے میں اردو کے بجائے "ہندی" درج ہوتا ہے تو یہ ایک اعلیٰ درجے کے فنکار کو رد کر دینے کا معقول جواز نہیں ہوا۔ فلم کا سنسر سرٹی فکیٹ حاصل کرنے میں پروڈیوسر اپنی ترجیحات اور مصلحتوں سے کام لیتے ہیں۔ (یہ ایک الگ بحث ہے اور اس پر سیکڑوں مضامین چھپ چکے ہیں)۔ پھر بھی گلزار اپنی چند فلمیں اردو سرٹی فکیٹ کے ساتھ پیش کر پائیں تو ان کے لئے اور ان کے چاہنے والوں کے لئے بڑی بات ہوگی۔

جہاں تک گلزار کی اردو تصنیف کے بارے میں ہمیں علم ہے ان کا ایک مجموعۂ منظومات "چاند پکھراج کا" پاکستان میں منصورہ احمد (دختر احمد ندیم قاسمی) نے دو سال قبل شائع کیا تھا۔ جس پر ایک تبصرہ 'انشاء' میں بھی شائع ہوا تھا۔ مجموعے میں شامل گلزار کی نظمیں جاندار ہیں اور ان کا اپنا انداز ہے۔ ان تمام خدمات کے پیش نظر گلزار کے مقام و مرتبے کا تعین کیا جانا چاہئے۔

مدیر

نوٹ:- ابھی ابھی جب شمارہ پریس جا رہا تھا، گلزار کے مجموعۂ منظومات "چاند پکھراج کا" کا دیسی ایڈیشن موصول ہوا جسے روپا اینڈ کمپنی (دہلی) نے بہت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اس کی قیمت ۱۹۵ روپے ہے۔

آپ کی ڈاک

قارئین کے خطوط

• مراسلہ نگار کی رائے سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

• آپ بے شمار خوبیوں کے مالک ہیں لیکن آپ اس عیب سے مستثنیٰ نہیں ہیں جو عام مدیران کے اندر بدرجہ اتم پایا جاتا ہے یعنی صرف تعریفی و توصیفی خطوط ہی کو اپنے رسالہ کی زینت بنانا۔ عالمی افسانہ نمبر پر میں نے ایک طویل مکتوب آپ کو لکھا تھا جس میں میں نے نمبر کی خامیوں کی نشاندہی کی تھی مگر آپ نے اسے شائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے بھی قاری کی رائے سے مدیر کا اتفاق کرنا ضروری نہیں ہے مگر اس کی رائے کو مسترد کرنے کا حق مدیر کو نہیں، خصوصاً آپ جیسے نڈر اور بے باک مدیر کو تو ہرگز زیب نہیں دیتا۔

بہرحال، اگر آپ تعریف ہی پسند کرتے ہیں تو مجھے بھی تعریف کرنے میں عذر نہیں۔ انشاء کا سواں شمارہ بہت خوب ہے۔ تقریباً دو سو صفحات کے اس شمارے میں چالیس سے زیادہ اشتہارات کا جواب نہیں اور پھر درمیان میں آپ نے مضامین، افسانے، غزلیں، نظمیں وغیرہ ضخامت بڑھانے کے لئے پیش کی ہیں وہ بھی مناسب ہیں اور پھر فضول کے پیغامات نے بھی شمارے کی ضخامت بڑھانے میں کافی تعاون دیا ہے لیکن یہ کیا؟ نعت محبوب خدا صفحہ ۸، پر اور بیگموں وغیرہ کے اشتہارات شروع میں؟ کیا آپ کو خدا اور اس کے محبوب کا خوف یا کم از کم لحاظ نہیں ہے؟ احمد سعید اور ذکیلی نشاط نے اپنے مضامین میں آپ کو خوب مکھن لگایا ہے۔ مسلمانوں کے لئے ریزرویشن ضروری ہے، کلیم الدین نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے۔

رئیس الدین کا مضمون پسند آیا۔ گلزار نے اپنے انشائیہ میں قارئین کو بور کیا ہے۔ تاراچرن رستوگی نے غالب اور یاس یگانہ کا اچھا موازنہ کیا ہے مگر انہوں نے یگانہ کے 'غالب نامہ' کا ذکر تک نہیں کیا۔ دلیپ کمار کی کہانی نے اس عظیم فنکار کے بارے میں کافی معلومات فراہم کی ہیں۔ مصطفیٰ اکریم نے اپنے مضمون میں آپ کے مکھن ہی لگایا ہے۔

افسانوں میں سب افسانے ٹھیک ہیں خصوصاً 'جھوٹ بولتی آنکھیں' کا جواب نہیں ہے۔ سلیم سرفراز کے افسانے 'آگہی' کا کہانی سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ غزلیات میں قتیل شفائی، محمود سعیدی اور مظفر حنفی نے متاثر کیا۔ جوگندر پال طاہر کا یہ شعر بہت خوب ہے؂

یہ لگ رہا ہے کہ نزدیک اب قیامت ہے
دکھائی دیتے ہیں منظر ڈرے ڈرے کتنے

فلک گورکھپوری کے اس شعر نے بھی متاثر کیا؂

رات کا یہ کون سا انداز ہے
سب کے سب سوئے ہیں اور بیدار سب

نظموں میں گلزار کی 'لباس' کا جواب نہیں ہے۔ ایلیٹ کی نظم کا آپ نے ترجمہ بہت خوب کیا ہے، مبارکباد قبول کیجئے۔

پریم چند پر فرقہ پرست ہونے کا الزام صرف 'داراشکوہ کا دربار' ہی سے رد نہیں ہو سکتا۔

آپ 'فقند مکر' کا اشتہار کئی شماروں میں شائع کرتے رہے۔ کیا آپ کو میری مرتب کردہ یہ کتاب کہیں سے مل گئی ہے؟ اگر نہ ملی ہو تو لکھئے میں بھیج دوں گا۔ اس شمارے میں بھی اگر آپ اشتہار دے دیتے تو اچھا ہوتا۔ خیر۔

گزشتہ شمارے میں عزیزی وسیم مینائی کا گوپی چند نارنگ کے بارے میں جو مضمون آپ نے شائع کیا، اسے شائع نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مضمون میں انہوں نے کوئی نئی بات نہیں لکھی ہے۔ جو کچھ لکھنا تھا وہ میں نے اپنی کتاب میں لکھ دیا ہے۔ نارنگ اردو ادب کی نامور ہستی ہیں، ان کی تصنیفات دنیائے اردو کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ محض چند خطوط کی بنا پر اس قدآور شخصیت کو تولنا یقیناً غلط ہے۔ کاش عزیزی وسیم مینائی نے مجھ کو مضمون دکھا دیا ہوتا تو میں سختی سے منع کر دیتا کہ اسے اشاعت کے لئے نہ بھیجیں۔ اس مضمون سے نہ صرف گوپی چند نارنگ ناراض ہیں بلکہ خود رام لعل بھی خفا ہیں۔ میں دونوں حضرات سے عزیزی وسیم مینائی کی طرف سے معذرت چاہتا ہوں۔

خورشید ملک، شاہجہاں پور

• انشاء کا صدی نمبر اور آپ کا عنایت نامہ ملا۔ اس کے حوالے سے جب میں نے "خوابوں کے اسرار" کی تیرہویں اور آخری قسط پڑھی تو اندازہ ہوا کہ آپ کتنے اچھے مترجم ہو گئے ہیں۔ نفسیاتی اور سائنسی مضامین یا کتابوں کا ترجمہ ویسے بھی ادبی مضامین کے ترجموں سے مختلف ہوتا ہے اور مشکل بھی۔

"دماغ" کے مسائل سے بحیثیت معالج کے مجھے دلچسپی رہی ہے اور اب بھی ہے۔ "خوابوں کے اسرار" یقیناً دلچسپ کتاب ہوگی۔ اگر آپ پاکستان کے کسی پبلشر سے تعلق ہو تو اس کتاب کی اشاعت کا مرحلہ آسان ہو جائے گا۔ میں آپ کی ادبی خدمات کا معترف ہوں۔ جو "اس بے بضاعت اردو نگری" میں خصوصاً قابل قدر بھی ہیں اور تحسین کی مستحق بھی۔

عبدالحکیم، چانسلر جامعہ ہمدرد (نئی دہلی)

• انشاء کا صدی شمارہ ملا۔ ہر لحاظ سے خوبصورت اور شاندار ہے۔ ٹائٹل پر گلزار کی چہار رنگی تصویر دے کر آپ نے سچ مچ ایک اہم اور باکمال فنکار کو ایسا اعزاز دیا ہے جس کا وہ مستحق ہے۔

جوگندر پال، حیدر طباطبائی کے مضامین اور منیر الدین احمد کا افسانہ یہ سب اعلیٰ درجہ کی تحریریں ہیں۔

قمر رئیس (دہلی)

● انشاء کا سالنامہ آج ہی ملا ہے۔ آپ یاد رکھتے ہیں یہ میرے لئے باعث خوشی ہے۔ آپ کے طفیل اچھا ادب پڑھنے کو ملتا ہے اور وہ آپ کی ان تھک محنت سے ہم تک پہنچتا ہے۔ انشاء ہفتہ بھر میں پڑھ لیا جاتا ہے لیکن آپ اس کی فراہمی کے لئے چار ہفتے ہر ماہ لگے رہتے ہیں۔

سالنامہ ابھی پورا نہیں پڑھا ہے لیکن یہ پہلا تاثر ہے چونکہ کلکتہ میں آپ کو کام کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور دلی بھی آپ آتے ہیں تو انشاء کے لئے ہی بھاگ دوڑ میں لگے رہتے ہیں۔ سرورق پر گلزار کا فوٹو! چھپا بھی بہت اچھا ہے۔ آپ اردو کے پرستاروں کی شناخت رکھتے ہیں اور انہیں خراج دینا بھی جانتے ہیں!

ایس اے رحمٰن

ایڈیٹر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا (نئی دہلی)

● آپ کا ہر شمارہ یادگار ہوتا ہے اور جب کوئی خاص شمارہ پیش کرتے ہیں تو وہ نہ صرف یادگار بلکہ تاریخی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ آپ کے آج تک کے تمام خصوصی شمارے میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ اس سے قبل آپ کے خصوصی شمارے اردو دنیا میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے گئے اور اب سوواں شمارہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اردو دنیا کے ہر قاری کو پسند بھی آئے گا۔

امنیہ دھلوی، مدیر فلمی ستارے (دہلی)

● فروری ۱۹۹۵ء کے "ایوان اردو" میں جناب ارشد علی خاں صاحب نے انشاء کے صدی شمارہ پر اپنے تبصرہ میں لکھا ہے "سرورق پر گلزار کی چار رنگی تصویر دی گئی ہے۔ ان زبان کا ایک صفحے کا پیغام۔ دو صفحے کا انشائیہ (؟) ہے جاری اردو" اور ایک صفحے کی دو نظمیں شامل ہیں۔ جو سرورق پر تصویر کا جواز نہیں بنتیں۔"

مجھے جناب ارشد علی خاں صاحب کے نظریے سے پوری طرح اتفاق ہے۔ ویسے بھی دیکھا جائے تو جناب گلزار کی اردو زبان و ادب کے لئے کون سی قابل ذکر یا قابل قدر خدمات ہیں۔ ہندی / ہندوستانی سینما میں اُن کا اپنا خاص مقام ضرور ہے لیکن اردو زبان و ادب کے لئے انہوں نے کیا کیا ہے؟ سوائے چند نظموں کے ان کی اردو ادب میں کیا Contribution ہے؟ انہوں نے کیا حصہ ڈالا ہے۔ کون سی عظیم تخلیق کی ہے؟ وہ بھی دوسروں کی طرح اردو میں نظمیں لکھ اور بنا کر ہندی سرٹیفکیٹ حاصل کرتے ہیں اور ہندی نام سے بیچتے ہیں اور اردو میں لکھے اپنے تمام گانوں پر ہندی سرٹیفکیٹ برداشت کرتے ہیں۔

" دو دیوانے شہر میں۔ رات میں دوپہر میں / آب و دانہ مانگتے ہیں اک آشیانہ ڈھونڈتے ہیں"

جیسے ان کے خالص اردو میں لکھے ہوئے گانے ہندی گانے کہلاتے ہیں۔ کیونکہ اُس فلم پر اور اُس کے گانوں پر ہندی سرٹیفکیٹ کی مہر لگی ہوتی ہے۔ ہاں البتہ ادبی جلسوں اور سیمناروں میں گلزار صاحب اردو کے ساتھ اپنی ہمدردی اور وفاداری ضرور جتاتے ہیں۔

آپ سرورق پر منشی پریم چند کی تصویر دے سکتے تھے جن کی "ایک نایاب کہانی" شمارہ میں شامل کی ہے۔ یا پھر اس سال کا اردو ادب کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ پانے والے جناب مظہر امام کی تصویر دے سکتے تھے۔ یا اقبال سمان پانے والے اور فلموں سے ہی جڑے مجروح سلطانپوری کی یا جناب معین احسن جذبی کی تصویر دے سکتے تھے۔ کئی اور نام بھی اس سلسلے میں لئے جا سکتے ہیں۔ اردو ادب کے لئے ملک کا سب سے بڑا گیان پیٹھ ایوارڈ پانے والی محترمہ قرۃ العین حیدر کی تصویر دے سکتے تھے۔ یا پھر فراق گورکھپوری کی۔ ان عظیم ادیبوں میں سے کسی کی بھی تصویر شائع کرنا زیادہ بہتر ہوتا۔

امید ہے کہ آپ اِس مکتوب کو "دخل در معقولات" نہیں سمجھیں گے اور آخر میں اگر میں آپ کو اتنا جامع اور خوبصورت شمارہ نکالنے کے لئے مبارکباد نہ دوں تو یہ فرض میں کوتاہی ہوگی۔ ہماری طرف سے بہت بہت دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ ہو۔

رام پرکاش کپور، درگ ۴۹۱۰۰۱

● انشاء کا صدی شمارہ ملا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ انشاء نے سنچری بنا لی ہے صدی شمارے کی آب و تاب دیکھ کر جی اور بھی خوش ہوا۔

آپ کا اداریہ پڑھ کر البتہ افسوس ہوا۔ خوشی کے موقع پر کوئی ایسی باتیں کرتا ہے بھائی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی جنم دن منا رہا ہو اور اس کو کوئی مبارکباد دے تو وہ کہے کہ یار کیسی مبارک باد تین سو روپے تو کیک خریدنے پر ہی اٹھ گئے۔ باقی کے سامان پر خرچ علیحدہ ہوا۔

آپ تو جانتے ہیں کہ اردو کا رسالہ نکالنا گھاٹے کا سودا ہے۔ اسے کاروبار سمجھ کر کرنا سراسر زیادتی ہے۔ آپ جیسے دیوانے جب اس میدان میں اترتے ہیں تو ایک شوق کو پورا کرنے کے لئے اترتے ہیں اور شوق کبھی منافع بخش نہیں ہوتے۔ ہم نے رسالہ تو نہیں نکالا لیکن اور بہت سے شوق پالے ہیں جن پر گھاٹا ہی گھاٹا ہوا۔

صدی شمارہ تقریباً سارا پڑھ گیا ہوں۔ دو تین کہانیوں کو چھوڑ کر اس میں مطبوعہ مواد پر کوئی رائے نہیں دوں گا کہ یہ میری عادت کے خلاف ہے۔ مدیر کا فرض یہی ہوتا ہے کہ اچھے ادیبوں کی تخلیقات اکٹھی کرے سلیقے سے ترتیب دیدے۔ اور یہ کام آپ نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔ اب قاری جانیں یا متعلقہ ادیب۔ ذاتی طور پر مجھے اس شمارے میں اپنی کمی بری طرح سے کھٹکی۔

دلیپ سنگھ، نئی دہلی۔

● صدی شمارہ ملا تو اس شمارے میں اپنی عدم شرکت کا احساس خود اس بات کی سزا تھی کہ آپ نے اس شمارے کے لئے مجھے یاد نہیں کیا جس کا ذمہ دار میں خود ہوں۔ اس قدر رنگا رنگ نمبر کے لئے دلی مبارکباد قبول کیجئے اور پھر دلی دعائیں بھی کہ آپ انشاء کے کئی صدی شمارے اور نکال سکیں

ستمبر ۱۹۹۴ء کے شمارے میں اردو زبان سے عام بے اعتنائی کے سلسلہ

میں آپ نے جو اہم سوالات اٹھائے تھے ان کی آرا وہ اس سلسلہ میں پیش کی تھیں اس کے سلسلے میں بھی لکھنے کی سوچتا رہا لیکن خرابی صحت کے باعث طبی معائنے کے سلسلے میں حیدرآباد کے سلسلے نے ذہنی سکون کو پراگندہ کر رکھا تھا۔

اردو کے بچنے کے آثار اب دن بہ دن ختم ہو رہے ہیں۔ ہر چھوٹے بڑے تعلقے اور ضلع میں بڑے قصبے اور منڈل میں انگلش میڈیم اسکول جاہل والدین کو گمراہ کرنے کا کاروباری وسیلہ بن گئے ہیں۔ باور کیجیے کہ ایسے اسکولوں میں پڑھانے والوں یہاں تک کہ پرنسپل حضرات کی کم علمی کا یہ عالم ہے کہ وہ صحیح انگریزی کے دو جملے نہ لکھ سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں۔ محکمہ تعلیمات دیانت داری سے اگر سروے کرنے کی زحمت اٹھائے تو اسی تا نوے فیصد انگریزی اسکولس ٹوانکل ٹوانکل لٹل اسٹار اور بابا بلیک شیپ بن کر معصوم بچوں کے زبان زد ہو گئے ہیں۔ ماں باپ اسی میں خوش ہیں۔ صرف اسکول یونیفارم انہیں اردو اسکولوں کی زبوں حالی سے ممیز کرتا ہے۔ آپ اردو کا حشر اس غلامانہ ذہنیت کے پیچھے دیکھ رہے ہیں۔ جب ہمارے گھر کے بچوں کا یہ حال ہے تو مغربی ممالک کا کیا رونا۔ جب تک ہم مادری زبان میں تعلیم کو اپنی ضمیر کی آواز نہیں بنا لیتے عملی طور پر کچھ ہونا مشکل ہے۔ میں تو گزارش کروں گا کہ آپ صرف اور صرف اسی موضوع پر لکھنے کے لیے سارے ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور ادب دوستوں کو کھلے عام دعوت دیں اور ہر ماہ انشاء کے چند صفحات اس کے لیے چند ماہ مختص کریں دیکھیے کیا ہو سکتا ہے۔

اقبال متین، نظام نگر

● انشاء جیسا شاندار رسالہ ہمارے اپنے شہر سے نکلتا ہے۔ یہ سراسر آپ کے ہاتھوں کا اعجاز ہے۔ آپ نے بہت کم مدت میں جتنی کامیابی حاصل کی ہے وہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ سچ رسالہ دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ خواتین میں ریحانہ نواب کی غزلیں اچھی تھیں تمام ادیبوں کی تحریریں پسند آئیں۔

نیلوفر فضل، کلکتہ

● صدی شمارہ میں ثقہ ادیبوں کے مکتوبات۔ آپ کے مضبوط عزم اور اردو سے والہانہ محبت کا اعتراف ہیں۔ آپ واقعی ایسے ناسازگار حالات میں شجر اردو کی کلکتہ جیسی سنگلاخ زمین میں آبیاری کر رہے ہیں۔

سید مطلب اللہ ہری، برطانیہ

● انشاء کا صدی شمارہ دیکھا۔ حرف اول سے گنج رواں تک تمام رشحاتِ قلم انشاء کے روشن ماضی اور تابناک مستقبل کی گواہی اور دلیل ہیں۔ آپ کا اداریہ پھر محترم جناب احمد سعید ملیح آبادی کا مضمون نہایت فکر انگیز اور جاذب نظر ہیں جو زندگی کے مختلف النوع پہلو کی عکاسی کرتے ہیں۔ علاوہ بریں ادبی مسائل میں انشاء کا انداز بلاشبہ ایک منفرد اور معتبر حیثیت کا حامل ہے۔ آپ جس طرح سے انشاء کو پیش کر رہے ہیں اس سے آپ کی مدیرانہ مہارت و ندرت نگاری کی داد دینا پڑتی ہے۔ ان پرچے سے ہر ماہنامہ انشاء کلکتہ

طنز کے قاری کے علمی و ادبی ذوق کی تسکین ہو جاتی ہے۔ جناب رئیس الدین فریدی کی سوانح حیات کا ایک حصہ شائع کر کے آپ نے تڑپا دیا۔ براہ مہربانی اس کو سلسلہ وار شائع کریں۔ اس قدر پُر حقیقت داستان ہے کہ بیان نہیں کر سکتا ہوں۔ ڈاکٹر تارا چند رستوگی کا مضمون "غالب اور یاس یگانہ" بہت پسند آیا۔ افسانوی حصہ بھی بہت بلند تھا۔ لندن کے ادبی حلقوں میں انشاء یوں مانگا جاتا ہے جیسے تبرک ہو اور ہے بھی ادبی تبرک۔ آپ کے لیے کسی نے کہا تھا۔

دیوانگی و جامہ دری کے علاوہ بھی
آتے ہیں مجھ کو کتنے ہنر تم بھی دیکھ لو

صدی نمبر پر BBC اردو میں جلد ہی میں تبصرہ بھی براڈکاسٹ کروں گا۔ جو بعداً

حیدر طباطبائی۔ ایسیکس (برطانیہ)

● انشاء کا صدی شمارہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ گلزار صاحب کی تصویر دیکھی تو میں ان کے سبھی پرانے گیتوں کو یاد کرنے لگا

نیاز ملک، کلٹی (بردوان)

● آپ کا "صدی شمارہ" مجھے مل گیا ہے۔ آپ نے بڑا معرکہ سرانجام دیا ہے۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔

یعقوب مرزا، نوٹنگھم (برطانیہ)

● عہد حاضر میں ۱۶ روپیے کی معمولی قیمت پر اتنی ضخامت کا اردو جریدہ واقعی قابل ستائش بات ہے۔ تقریباً تمام مواد لائق مطالعہ ہے۔ ڈاکٹر محمد ظفر قدوائی کا مضمون "طنز و مزاح اور اکبر الہ آبادی" بھی خوب ہے۔ ظفر گورکھپوری کا یہ شعر بھی پسند آیا۔

کس کو فرصت اینٹ رکھے اینٹ پر
ڈھونڈتے ہیں سایۂ دیوار سب

یوگندر پال ظاہر کا شعر بھی قابل تعریف لگا، شعر

میں چاہتا تو زباں اپنی کھول سکتا تھا
بڑھا دیے مری اس چپ نے فاصلے کتنے

واقعی خاص نمبر نکالنے میں آپ کا بہت اونچا نمبر آتا ہے۔

ایوب اثر، شاہجہاں پور

● سرورق خوب ہے اس پہ غضب آپ نے کیا محترم گلزار صاحب کی تصویر چھاپ کر یہ سونے پہ سہاگہ ہوا۔

بدنام بشر، بہار

● اس شمارے میں آپ کا اداریہ "گفتنی" بازیافت کے تحت پریم چند کی کہانی دو اما شکوہ کا دربار اور فخرالدین عراقی پر حیدر طباطبائی کا مضمون خاصے کی چیزیں ہیں۔

خالد عباس، پٹنہ

● آپ نے اس شمارے میں کمال کر دیا ہے شروع سے ہی یہ شمارہ اپنی بلندی کا ثبوت دے رہا ہے محترم گلزار صاحب کی اتنی بہترین تصویر سے آپ نے شمارے کو شروع کر کے اس کے خالص ادبی پیکر کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ پورا شمارہ کہہ رہا ہے کہ اعجاز صاحب نے کلکتہ کی عظمت کو بڑھا دیا ہے۔ شمارے میں جہاں باقی دنیا کے لوگوں کو شامل کیا گیا ہے وہیں کلکتہ کی نمائندگی میں کوئی کسر نہیں اٹھائی گئی ہے پھر بھی چند لوگوں کی کمی کا احساس ہو گیا۔ شمارے میں منور رانا صاحب کی تینوں غزلیں پسند آئیں، ریحانہ نواب اور شہود عالم آفاقی صاحب کو دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ تنتیل شفائی اور شجاع خاور کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ آپ نے جناب رویندر جبین صاحب کی کتاب "اجالوں کا سلسلہ" پر تبصرہ پیش کیا ہے وہ اردو شاعری پر ایک احسان ہے ان کی چیزیں بہت جاندار ہیں اور ایسے لوگوں کو آپ نے سامنے لا کر بڑا کرم کیا۔ میں نے ان کو بھی ایک خط لکھا ہے آپ کے اس شمارے کا حوالہ دے کر۔ آپ واقعی بہت مہان ہیں۔ جناب تارا چرن رستوگی کے المیہ نے ذہن کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اتنا قیمتی مضمون جو آپ کو بوسیدہ حالت میں ملا اسے پیش کر کے آپ نے بڑا کام کیا ہے اور بھی مضمون قابل تعریف ہیں افسانے پڑھ رہا ہوں۔

"اداریہ" اپنی جگہ پر ایک چیز ہے۔ آپ کے اداریے ویسے بھی سبھی کارآمد ہوتے ہیں۔ اس بار کا اداریہ بہت اہم ہے آپ نے اردو رسائل کی اشاعت کے بارے میں جس بے باکی سے اپنی بات کہی ہے وہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ واقعی اس حالت میں رسالہ یا بنگلہ سے نکالنا ایک ٹیڑھی کھیر ہے۔ آپ نے اردو والوں کی بات کہہ دی ہے۔ سرکار تک اپنی بات لے جانا ہے ہم لوگ بھی اپنے طور سے اس طرف دھیان دیں گے۔

فیاض رشک، مونگیر

● آپ کی ہدایت پر "انشاء" کا صدی شمارہ پڑھا اور خرید کر پڑھا۔ ۱۶/ روپئے بہت کم قیمت ہے۔ صوری و معنوی ہر دو اعتبار شمارہ بے مثال ہے یشری حصہ کچھ زیادہ بہتر ہے۔ اس خاص شمارے کی اشاعت کے لئے یقیناً آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

آپ انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے پر قدرت رکھتے ہیں لہٰذا اس صلاحیت کو عصری ادب پر آزمائیے تو مجھ جیسے ناداروں پر کرم ہو۔ ایلیٹ وغیرہ کو پڑھ کر تو طالب علمی کے زمانے کی نصابی پابندیاں یاد آنے لگتی ہیں۔ ویسے خوابوں والا سلسلہ بھی خوب رہا۔ اسے کتابی صورت میں شائع کریں تو مزید بہتر ہو۔

تسلیم نیازی، برنپور آسنسول

● کیا کہوں کیا کیا حیرانی ہوئی اس شمارے کو دیکھ کر۔ اتنی خاموشی سے آپ نے اتنا اہم شمارہ ترتیب دے لیا اور پھر اس قدر کم قیمت میں اسے پیش کر دیا۔ سرکاری رسالے تو کم قیمت میں نکلنے کے لئے ہیں ہی مگر نجی ادارے سے بھی ایسا ہو جانا باعث حیرت ہے۔

سرورق پر گلزار کی تصویر بہت باوقار اور خوبصورت ہے۔ آپ ادب والوں نے انہیں فلمی کیچڑ سے کھینچ ہی لیا ہے۔ آپ کا اداریہ تلخ مگر مبنی بر حقیقت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انشاء کے اداریوں پر بھی ایک خصوصی شمارہ یا پھر اسے کتابی شکل میں آنا چاہئے۔ شمارے کو چبا چبا کر پڑھ رہا ہوں۔

متین اقبال، مونگیر

● بھائی انشاء سے میری دلی وابستگی ہے میں اسے بڑے شوق سے پڑھتی ہوں جس دن سے میں اس کی خریدار بنی ہوں مجھے انشاء اپنا اپنا سا لگتا ہے میں اسے بند کرنے کے بارے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس کے ذریعہ پردیس میں دیس کیا پوری دنیا کے لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ مضامین، غزلیں اور پورا کا پورا انشاء بہت معیاری ہے اور آپ بہت محنت لگن سے نکال رہے ہیں۔ صدی شمارہ کی شکل دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ لاجواب نکالا ہے "صدی شمارہ" سرورق صدی شمارہ کی منہ بولتی تصویر ہے دم دما اٹھا غزلیں مظفر حنفی، ظفر گورکھپوری ساتھ ساتھ سلری ہی بہت اچھی ہیں اور مضامین سب بہت اچھے اور معیاری ہیں خاص طور پر حیدر طباطبائی کا تحقیقی مضمون "فخرالدین عراقی" بہت پسند آیا بہت بصیرت افروز مضمون ہے۔ "صرف ایک خواب؟" ف س اعجاز کا۔ کافی میں پورا دیکھ سکی۔ "یقین کی نظم میں اشاریت" پروفیسر عبدالقوی ضیاء کا بہت پسند آیا۔ باقی تمام ہی مضامین اور غزلیں شاندار ہیں۔

اتنی خوبصورت اور معیاری اشاعت پر میری جانب سے دلی مبارکباد قبول کریں۔ اللہ میاں سے دعا ہے کہ وہ انشاء کو اس کے نام کی طرح (عبارت۔ طرز۔ تحریر) کی خوبصورتی سے نوازتا رہے۔ انشاء دنیا، ادب میں علم و ادب کا سورج بن کر تاباں رہے۔ آمین

نور جہاں نوری، لندن

● اداریہ بے لاگ ہے۔ کہیں کہیں پر تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا نوک قلم سے الفاظ نہیں نکل رہے ہیں، شرارے پھوٹ رہے ہیں۔ جھنجوڑتے رہتے، جگاتے رہتے شاید کبھی ہم اردو والے خواب غفلت سے بیدار ہو ہی جائیں۔ انشاء کے سلسلے میں احمد سعید ملیح آبادی اور ڈاکٹر یحییٰ نشیط کی تحریریں قابل قدر ہیں اور ان سے خلوص ٹپکتا ہے۔

گلزار کا انشائیہ "بے چاری اردو" بس یوں ہی سا ہے البتہ ان کی نظمیں بڑی جاندار ہیں۔ افسانوں کا انتخاب لاجواب ہے۔ مقصود الٰہی شیخ کا افسانہ "جھوٹ بولتی آنکھیں" بلاشبہ اردو کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ بار بار پڑھنے کو دل کرتا۔ صبح کا افسانہ "کمال اور نجات" اور سلیم سرفراز کا "آگہی" اپنے اپنے رنگ میں کامیاب ہیں۔ میر الدین احمد کے افسانے "چھبیسویں سالگرہ" کے اختتام پر میں کچھ الجھ سا گیا۔ انجام سمجھ میں نہیں آیا۔

[illegible] کا ترتیب دیا ہوا مضمون دلیپ کمار کی کہانی بڑا دلچسپ ہے۔ "خوابوں کے اسرار" کی آخری قسط معلوماتی اور بصیرت افروز ہے۔ خوابوں کا انسانی نفسیات کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ اگر کوئی صاحب نظر اس مضمون کو غور و فکر کے ساتھ پڑھے تو خود آگاہی کی منزلوں سے گزر کر عرفان ذات تک پہنچ سکتا ہے۔

قتیل شفائی، محمود سعیدی، مظفر حنفی، شجاع خاور، عبدالاحد ساز، شہود عالم آفاقی کی غزلیں خاص طور پر پسند آئیں۔ بازیافت کے تحت پریم چند کی تحریر نے شمارے کو مزید وقیع بنا دیا ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ کی نظم کا آپ نے جس خوبصورت انداز میں ترجمہ کیا ہے اس کی تعریف نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔

اقبال حسن آزاد، مونگیر

● خصوصی نمبر نکالنے میں "انشاء" کو جو اہمیت اور مقام حاصل ہے وہ ملک کے کسی اور رسالے کو نہیں۔ اب "انشاء" کا "سوواں شمارہ" یا "صدی نمبر" اس آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آیا کہ آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ جس طرح کلکتہ سے اردو کے پہلے اخبار "جام جہاں نما" کو تاریخی حیثیت حاصل ہے، جس طرح غالب سے کلکتے کا ادبی وقار بلند ہوا اور اب مظفر حنفی، پرویز شاہدی، اقبال چھپرے سے کلکتہ کا اقبال بلند ہو رہا ہے۔ اس میں بھی دو رائے نہیں کہ ف۔ س۔ اعجاز اور "انشاء" سے کلکتہ بین الاقوامی ادبی حیثیت کا حامل ہو گیا ہے۔ آپ کی بے لوث اور مخلصانہ ادبی خدمات قابلِ ستائش ہیں۔ "جام جہاں نما" کے ایک سو تیرہ سال بعد "انشاء" کا صدی نمبر نہ صرف کلکتہ کے لئے بلکہ اردو دنیا کے لئے ایک قابل فخر کارنامہ ہے۔

زیر نظر شمارے کے مضامین میں "انشاء کی صدی"، جناب احمد سعید ملیح آبادی کے بقول "اردو کے کسی ادبی رسالہ اور پھر کلکتہ جیسی جگہ سے کسی ادبی رسالے کے سو شمارے پابندی سے نکالنا واقعی کسی معجزے سے کم نہیں اور پھر وقفہ وقفہ سے خاص نمبروں کا بوجھ ڈھونا اور "انشاء" کو بیرونی ممالک تک پہنچا کر اپنی صلاحیت کا لوہا منوا لینا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ انشاء کو اس بلندی تک پہنچانے میں ف۔ س۔ اعجاز کو کتنی دشوار گذار گھاٹیوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ جناب احمد سعید صاحب نے اردو زبان اور اردو صحافت پر اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے اردو کے رسائل کی شہرت کی دو وجہ بیان کی ہیں۔ ان دونوں اوصاف کے سبب انشاء کو امتیاز حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انشاء نے ادبی دنیا میں اپنا ایک اہم منفرد مقام حاصل کر لیا ہے۔

ماہنامہ انشاء کلکتہ

جناب رئیس الدین فریدی کا مضمون "برصغیر میں تقسیم کی بنیاد کیسے پڑی" سے بھی کئی تاریک گوشے روشن ہوتے ہیں۔ وقت کا تقاضا ہے کہ اس قسم کے مضامین اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی شائع کئے جائیں۔ گلزار صاحب کا انشائیہ "طنز و مزاح کا شاہکار ہے۔ قارئین کرام اس سے خوب محظوظ ہوں گے۔

ہالی وڈ میں مقیم آصفہ نشاط صاحبہ کا اپنی تہذیب اور اپنی شناخت کو قائم رکھنا اور اسے صفحۂ قرطاس پر بکھیرنا قابل تعریف ہے۔ اسی طرح حیدر طباطبائی بھی اپنے تہذیبی ورثے کو برقرار رکھنے اور پروان چڑھانے میں بیرون ملک اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ یادگار زمانہ جناب تارا چرن رستوگی کے یگانہ اور غالب کے موازنے نے بھی متاثر کیا۔ رستوگی صاحب کے ساتھ پیش آئے المیہ سے صدمہ ہوا۔

قاضی حسن رضا، کنواڑہ

● انشاء کی یہ سوویں اشاعت بحدا ناقابل فراموش اور قابل تعریف ہے۔ تخلیقات، نظم و نثر کا انتخاب آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ صدی نمبر گزشتہ سبھی نمبروں کے دوش بدوش رکھا جائے تو اس کی افادیت کم نہیں ہوگی۔ کم قیمت میں ضخیم نمبر نکالنا آپ ہی کے بس کی بات ہے۔

وسیم مینائی، شاہجہاں پور

● آپ پچھلے آٹھ سال کے قلیل عرصہ میں احمد سعید ملیح آبادی نمبر، عالمی اردو افسانہ نمبر، ادیبوں کی حیات معاشقہ نمبر، قمر رئیس نمبر، بابری مسجد نمبر اور اب صدی شمارہ شائع کر کے اردو ادب میں اپنے جھنڈے گاڑ چکے ہیں اور اب آپ آئندہ کچھ بھی نہ کریں تو بھی آپ ان ضخیم ادبی دستاویزات کے حوالوں سے ادب میں یقیناً زندہ رہیں گے اور ہاں آپ کے خوبصورت شعری مجموعے اس پر مستزاد ہیں۔ آپ ان ادبی کارناموں کی بنا پر یقیناً اہل ادب کی ستائش کے مستحق ہیں۔

صدی شمارے میں آپ کے اسٹار پورٹریٹ یعنی حضرت قتیل شفائی کی غزل کے مطلع کا مصرعہ ثانی قابل غور ہے ؎

دیدنی تھا حال کچھ پشیمانیوں کا

بحر کے مزاج کے مطابق ہم اسے "پیشانیوں" پڑھیں[1]

بخت لائلپوری (لندن)

---

[1] غلطی سے "پیشانیوں" کی جگہ "پشیمانیوں" کتابت ہو گیا۔ (مدیر)

● سرورق سے لے کر شمارے کے تقریباً تمام منقولات باوقار ہیں۔ گلزار کا انشائیہ "ہماری اردو" پڑھ کر اگر ظرافت کا لطف ملا تو دوسری جانب اردو کی زبوں حالی اور اس کے لئے اپنے ہی ملک میں اجنبی بن جانے کا صدمہ بھی

پہنچا۔

آصف نشاط کا انشائیہ نما "رنگ" ایک بلند معیاری افسانہ ہے جو کسی بھی حال میں صنفِ انشائیہ میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ جوگندر پال طالب صاحب کی تحریر لاہور کی یادیں عنوان "ساتھ ساتھ" پڑھ کر ماضی کے لاہور کا ادبی و ثقافتی کلچر سامنے آگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ناسٹلجیا کے بیان میں ایسی کشش ہوتی ہے کہ وہ ہر سطح کے قاری کو پسند آجاتی ہے۔

ہاں سلیم سرفراز کا افسانہ "آگہی" بے شک حاصلِ شمارہ لگا۔ برصغیر کے سیاسی مسائل کے ساتھ ساتھ عالمی افق پر چیلسام (امریکی) کی سازشی چالوں کو اس افسانے میں بڑی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ خدا کرے وہ آئندہ بھی عصری آگہی سے متعلق لکھتے رہیں تاکہ اردو ادب میں معیاری تخلیق جگہ پاتی رہے۔

محمد پرویز اقبال (لکھنیادی) مونگیر

● کل صبح آپ کا "شتابدی نمبر" ملا۔ چونکہ وقت بھی ہے اور سکون بھی اس لئے ایک ہی نشست میں اچھی طرح پڑھنے کا موقع مل گیا۔ کام آپ نے اتنا قابل قدر کیا ہے کہ محض مبارکباد سے کام نہیں چلے گا۔ چنانچہ اس بارے میں کچھ "تبلیغ" میں معروف ہوگیا۔ فون پر اور شاید اگلے دو تین دن اور اس باب میں کچھ خدمت کے لمحے مل جائیں۔ کتابت کا طریقہ ختم ہونے سے رسالے کا صوری حسن واضح طور پر بڑھ گیا ہے۔ پڑھنے میں کسی طرح کا زور نگاہوں پر نہیں پڑا۔ میرا خیال ہے دوسرے حضرات نے بھی یہ فرق محسوس کیا ہوگا۔

پریم چند کی کہانی بہت قیمتی ہے۔ اپنی تاریخی اہمیت کے لحاظ سے۔ ہاں مضمون اپنے حیدر طباطبائی کا عراقی کے بارے میں میرے لئے تو خاصا معلومات افزا ثابت ہوا۔ ان سے کچھ اور بھی حاصل کرنے کی کوشش کیجئے۔ انہوں نے ایران کے ادبی و صحافتی حلقوں میں خاصا وقت گزارا ہے۔ کئی برس ایرانی شعبہ نشر و اشاعت اور ٹیلی ویژن سے متعلق رہے۔ مجھ سے جب کبھی ملنے کا اتفاق ہوتا ہے میں درخواست کرتا ہوں کہ وہ اردو کی طرف زیادہ توجہ کریں کیونکہ وہ ہمہ وقت فارسی میں ہی معروف نظر آتے ہیں۔ رئیس الدین فریدی کا موضوع جس تفصیلی توجہ کا طالب ہے اس کے ساتھ شائع شدہ حصہ میں انصاف نہیں ہو سکا ہے۔

قیصر تمکین (برطانیہ)

● جناب احمد سعید ملیح آبادی کے مضمون "انشا کی صدی" میں انشا کی مشکلات (فنی اور مالی) کی سو فیصدی ترجمانی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود انشا نے خصوصی نمبر پر نمبر نکالے اور اس سال کے آخیر تک کئی اور نمبر منصۂ شہود پر آئیں اور انشاء اللہ انشاء دسویں خصوصی نمبر تک پہنچے گا اور یقیناً "ادبی دس نمبری" کہلائے گا۔ یہ ف میں اعجاز کا اعجاز ہے یا انتھک کوششوں اور عرق ریزیوں کا نتیجہ۔ خدا آپ کی اور انشا کی عمر دراز کرے۔ آپنے بادِ مخالف کی تند و تیز ہواؤں میں شمع اردو جلا رکھی ہے۔

ملیک کاشمیری (لندن)

● خوشی بھی ہوئی اور فخر بھی محسوس ہوا کہ آپ کے اتنے اہم نمبر میں ناچیز نے جگہ پائی۔ آپ کے اور آپ کے ادارے کے لئے یہی پیغام ہے کہ خدا آپ کو اور آپ کے حوصلوں کو سلامت رکھے، ادب اور معیاری ادب تخلیق کرنا، نئی نسل پر ایک احسان کے مترادف ہے کیونکہ اگر آپ جیسے لوگ نہ ہوں تو اردو سیکھنا ہی کارے دارد ہو جائے۔

معاشی ترجیحات نے ویسے ہی لفظوں کو ہم سے دور کردیا ہے اور احساس یہ ہوتا ہے کہ جیسے ہمارے ہاتھ خالی ہوگئے ہیں یا ہوتے جارہے ہیں لیکن آپ کا رسالہ پڑھ کر آپ کا جذبہ دیکھ کر لگتا ہے کہ مایوسی کفر ہے اور ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔

آصف نشاط (رالی وولی)

● آپ نے واقعی سنچری شمارہ نکالنے کا حق ادا کیا ہے۔ آپ کی محنت شاقہ اس خوبصورت پرچے کے ہر ورق میں جھلکتی صاف نظر آرہی ہے۔ اس پرچے میں شامل مضامین، افسانے، غزلیں اور نظمیں بھی معیاری اور آپ کے حسن انتخاب کی عکاسی کرتی ہیں اور صرف صفحات بھرنے کی خاطر نہیں ہیں۔ پھر سونے پر سہاگہ کہ آپ نے پرچہ اردو کمپیوٹر پر کمپوز کیا ہے میری طرف سے اس خوبصورت، قابلِ تحسین اور کامیاب کوشش پر دلی مبارک قبول کیجئے۔

"لاہور کی یادیں" میں جوگندر پال چلتے چلتے سیالکوٹ جا پہنچے اور رام تلائی کا ذکر کے گزرے سالوں کی یاد انہوں نے دلادی۔ مقصود الٰہی شیخ کا افسانہ جھوٹ بولتی آنکھیں بھی خوبصورت ہے انہوں نے ایک جنسی موضوع کو بغیر لحریج کے بڑے پیارے انداز سے نبھایا ہے۔ غزلیں اور نظمیں سبھی اچھی ہیں۔ ریحانہ نواب کی غزلیں خوبصورت ہیں۔

احمد سعید انور (براڈ فورڈ، برطانیہ)

● صدی شمارہ یہاں سب ہی لوگوں نے پسند کیا۔ سارے مضامین پڑھنے لائق ہیں۔ کلکتہ سے یہ پہلا شمارہ کمپیوٹر سے آیا ہے۔ بہت صاف ستھرا شمارہ ہے

محسن، (کانکی نارہ)

● "صدی ایڈیشن" کمپیوٹر پر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ ماشاء اللہ بہت دیدہ زیب اور نفیس ہے۔ آپ کی محنت اور لگن کا جواب نہیں۔ خصوصی نمبر نکالنے میں آپ ماہر ہوچکے ہیں۔ انشا اپنے خصوصی نمبروں کے لئے ادبی دنیا میں ایک ریکارڈ قائم کرچکا ہے۔

آپ کے مضامین "خوابوں کے اسرار" کی تمام قسطوں کا مطالعہ میں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ادبی حلقے میں یہ ترجمہ نفس مضمون کے ساتھ ساتھ آپ کی خوبصورت نثر کے لئے خاصا سراہا گیا ہوگا۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں خوبصورت نثر لکھنا خوبصورت شاعری کرنے سے زیادہ دشوار ہے

وہ بھی ترجمہ میں؟ ترجمہ کا فن واقعی کافی صبر آزما ہے۔ آپ کو ترجمے کی تکمیل میں چھ سال لگ گئے تو چیز بھی تو بہت اچھی سامنے آئی ہے۔ "خوابوں کے اسرار" میں آپ نے اپنی دلنشیں نثر کے ذریعہ جو تخلیقیت پیدا کی ہے اس سے یہ مضامین ترجمہ محض سے آگے بڑھ کر تخلیق بن گئے ہیں۔ اسے کتابی صورت میں ضرور لائیے۔ جہاں کہیں اردو ذریعہ تعلیم ہے وہاں اسے نصاب میں آسانی کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔

افسانے میں مقصود الٰہی شیخ کا "جھوٹ بولتی آنکھیں" اور منیر الدین احمد کا "پچیسویں سالگرہ" کافی پسند آئے۔ لیکن شیخ جی کے افسانے پر اس ناچیز کا ایک اعتراض ہے کہ جناب نے ضرورت سے زیادہ ایک مخصوص قسم کی سچوئیشن کو طول دے دیا ہے۔ ایک ہی قسم کے غلیظ نظارے کی بار بار تصویر کشی کی وجہ سے افسانہ میں تلذذ کی جھلک آگئی ہے۔ موضوع بہت اچھا ہے مگر... بات وہی اچھی لگتی ہے جو ذرا ڈھک چھپ کر کہی جائے۔ "برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی است" ہر اچھے آرٹ کا تقاضا ہے۔

"عالمی اردو افسانہ نمبر" ہنوز اپنے قارئین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے اس بات کا ثبوت مصطفیٰ کریم صاحب کے شائع شدہ مضمون سے ظاہر ہے۔ انہوں نے بعض افسانوں پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈال کر اس کی دلچسپی میں اضافہ کیا ہے۔ میں نے ان کے خط کے حوالے سے بعض کہانیوں کا مطالعہ دوبارہ کیا اور حظ اٹھا رہی ہوں۔ کاش! وہ اس ناچیز کی "ایک کہانی ادھوری سی..." کو بھی خصوصی توجہ کے ساتھ پڑھ لیتے۔

قمر جہاں، بھاگلپور

پر آیا ہے، آپ اور آپ کے رفقاء کی جانفشانی قابل تحسین بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔ بالخصوص اس پس منظر میں کہ اردو رسائل و جرائد کی جو حالت سرکاری بے حسی نے کر رکھی ہے، انشاء کا موجودہ شمارہ صرف عزم و سچی لگن بغیر ممکن نہ تھا۔ کبھی یہ سوچ کر بڑا حیران ہوتا ہوں کہ اردو اپنی جائے پیدائش میں اتنی غیر مقبول و معتوب کیوں ٹھہرائی گئی۔ اعجاز بھائی۔ دنیا کا کوئی بھی معاشرہ ہو، کوئی بھی زمانہ ہو، اگر زبان کا رشتہ معاش سے منقطع کر دیا جائے تو وہ زبان صدیوں میں نہیں دہائیوں میں نیست و نابود ہو جایا کرتی ہے۔ یہ کم بخت اردو کچھ ایسی سخت جان واقع ہوئی ہے کہ باوجود ایک سوچی سمجھی سازش کے جو ایوان اقتدار میں تیار کی گئی، یہ زبان آج بھی سانس لے رہی ہے۔ بہت ہی سخت جان ہے یہ صد فیصد ہندوستانی زبان جسے اردو کہا جاتا ہے۔

موجودہ حالات میں آپ اور دیگر ادبی جرائد جس پامردی سے میدان میں ڈٹے ہوتے ہیں اسے دیکھتے ہوئے یہ یقین کر لینے کو جی چاہتا ہے کہ باوجود اہل اقتدار کے معاندانہ رویے کے ابھی اردو کے مستقبل کے حوالے سے امیدیں ہیں اور یہ یقین رکھتا ہوں کہ جلد ہی اردو کو اس کا جائز مقام ملے گا۔ ہندوستان نے دنیا کو دو ہی تو خوبصورت تحفے دیئے ہیں۔ تاج محل اور اردو۔ اپنی اس خوبصورت شناخت یعنی اردو سے اہل ہند کب تک اعماض برتیں گے؟ آپ کی اور آپ کے انشاء کی خدمت میں صدی شمارے جیسی خوبصورت پیشکش پر تہنیت۔ او مرحبا

سلیم جعفری، دبئی

● انشاء کے اداریہ نے بے حد متاثر کیا۔ آپ یقین کریں پڑھنے کے بعد نظروں کے سامنے ایک بجلی سی کوند گئی۔ بہ حیثیت مدیر آپ لکھتے ہیں۔ "ایک طوائف اور ایک فقیر شاید اپنے اپنے پیشے سے خوش ہو سکتے ہیں..." آپ جیسے لوگ کم پیدا ہوتے ہیں جو ناسازگار حالات کے باوجود بھی اپنا نصب العین نہیں بدلتے۔ میں آپ کی اس جرأت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ انشاء کا سالانہ خریداری چندہ ختم ہو گیا ہے۔ مندرجہ بالا انشاء کا سوواں شمارہ خاص کر اداریہ پڑھ کر شدت سے محسوس ہوا کہ میں بھی گناہ گار ہوں۔ اس ماہ ہی سالانہ خریداری چندہ روانہ کر رہا ہوں۔

انشاء میں سائنسی جدید و مفید معلومات بھی شائع کریں تو بہتر ہوگا ہم نے اس سے پہلے بھی مانگ کی تھی کہ انشاء کو انڈیا ٹوڈے جیسا بنایا جائے تاکہ اس کی خوبصورتی میں اور بھی اضافہ ہو۔ رنگین پوسٹر موجودہ دور کی ضرورت ہے جو زندگی کی پہچان ہے۔ رسالہ انڈیا ٹوڈے جیسا بنائیں۔ یہی تبدیلیاں چاہتے ہیں۔

قاسم زبیری، جینوارا، پٹنہ۔

● صدی شمارہ ملا۔ کہہ سکتا ہوں کہ یہ بڑی تیاریوں کے ساتھ منظر شہود (پر آیا ہے)
ماہنامہ انشاء کلکتہ

مشرقی ہندوستان کا بہترین اردو اور بین الاقوامی ادبی رسالہ

ماہنامہ انشاء کلکتہ

جلد: ۱۰	جون جولائی ۱۹۹۵ء	شمارہ: ۶-۷

مدیر: ف۔س۔ اعجاز

فہرست

فی شمارہ	:	۸ روپے
زرِ سالانہ	:	۹۰ روپے
مغربی ممالک سے	:	۱۲ پونڈ یا
		۲۰ امریکی ڈالر

منظومات:-

رقومات بذریعہ منی آرڈر، بینک ڈرافٹ، چیک صرف "انشاء پبلی کیشنز" کے نام میں روانہ فرمائیں ورنہ قابلِ قبول نہ ہوں گی۔ برطانیہ سے BPO کے ذریعہ رقومات بھیجی جائیں۔

خط و کتابت، مضامین بھیجنے اور ترسیل زر کا پتہ:
ماہنامہ انشاء، انشاء پبلی کیشنز
۲۵۔ بی زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳-۰۰۰، فون: ۲۴۹۹-۲۱۵

یہ ہے سپنوں کا ایک
متحرک بھارت

مسافر ریل کے ڈبے میں سوار ہیں۔ اسٹیشنوں پر مسافروں کا چڑھنا اترنا
جاری ہے۔ یہاں پر مختلف زبانوں اور خیالات و عقائد کا ملاپ ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کیلئے
اس متحرک ڈبے میں ہر دھرم اور ہر زبان کے ہم خیال بن جاتے ہیں۔ اور ایک متحد ہندوستان کی
تصویر پیش کرتے ہیں۔ نت نئے اور مختلف الخیال اور مختلف اللسان لوگوں کے
اس میل جول سے ریل کے ہر ڈبے میں ایک نئی زندگی کروٹ لینے لگتی ہے۔

فرض شناس اردو صحافت کے فرائض

ان دنوں سیاسی طور پر ہم لوگ کشمکش سے دوچار ہیں۔ راؤ حکومت نے صدیوں کے مضبوط اور توانا ہندو مسلم اتحاد کو بری طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ مخصوص فرقہ پرست طاقتیں ہمارے سیاسی نظام پر حاوی ہوتی جارہی ہیں۔ اب توجہ بھی ان کی ہے بہت بھی ان کی۔ ہندوستان کی مختلف قومیتوں کے مابین جو ایک کثرت میں وحدت کا فلسفہ ساری دنیا میں طرہ الامتیاز رواداری کی مثال بنا ہوا تھا وہ انوکھے صدمات سے دوچار ہے۔ موجودہ حالات میں جن صوبوں میں انتخابات ہوئے ہیں ان کے نتائج بتاتے ہیں کہ سیاسی عدم استحکام کا بڑا سبب ملک کی سب سے بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں کا ووٹ ہوتا ہے۔ اور اس عدم استحکام سے فائدہ بھی ان ہی طاقتوں کو پہنچتا ہے جو پارلیمنٹ یا اسمبلیوں میں فرقہ پرست پارٹیوں کے ٹکٹوں پر جیت کر آتی ہیں۔ چاہے وہ حکومت میں ہوں یا اپوزیشن میں۔ مہاراشٹر میں اب شیوسینا اور بھارتیہ جنتا پارٹی کی مشترکہ حکومت قائم ہے۔ گجرات میں بھارتیہ جنتا پارٹی حکمراں ہے۔ مدھیہ پردیش میں بی جے پی اپوزیشن میں ہے۔ بہار میں جنتا دل اور اس کی حلیف پارٹیوں کی حکومت ہے جو فرقہ پرست تو نہیں لیکن اس گروہی تعصب کی پرورش ضرور کرتی ہیں جو اپنی جڑیں پھیلا کر ہماری فرقہ پرستی کی تقویت اور افزائش کا سبب بنتا ہے۔ آج کل بعض پارٹیوں کے مسلم نمائندے چند اہم اردو صحافیوں کی مدد سے ایسی تنظیمیں بنانے لگے ہیں جو ایک طرف مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں مخصوص تناسب کا اعتماد دلاکر انہیں رجھاتی ہیں اور دوسری طرف حکومت وقت کو بلیک میل کرتی ہیں۔ مسلمان شور تو کرتے ہیں مگر اپنی قوم کی فکر کم کرتے ہیں۔ کسی کو راجیہ سبھا کی ممبری چاہیے۔ کسی کو کسی عنوان سے کسی وزیر کا التفات چاہیے۔ تمام مسلم قیادت خود غرض اور حکومت کی چاپلوس ہے۔ مسلم پریس کے بیشتر افراد بھی ایسے ہی اوصاف کے حامل ہیں۔ مسلم پریس میں اتنی طاقت ہے ہی نہیں جو حکومت کی بالواسطہ یا بلاواسطہ نوازشات کے بغیر اپنے کسی موقف پر قائم رہے۔ اور اپنی قوم کے مطالبات کے لئے شدت اختیار کرسکے۔ بدلے ہوئے سیاسی تناظر میں عام صحافت پہلے سے زیادہ روشن خیال، بے باک اور معیار ہوچکی ہے لیکن اردو پریس اتنا مجبور محض ہے کہ اس کے قائدین وزیروں کی چمچہ گیری اور حکومت کے گن گائے بغیر زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پیشہ درست کا ہنر اور آداب سیکھے بغیر وہ لوگ پیشہ ور ہونے کا تاثر قائم کرتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ملت کے مفاد کا سودا کرنے کے سوا کچھ جانتے ہی نہیں۔ اس ترقی یافتہ زمانے میں اردو کے ایسے پیپر بھی نکلتے ہیں جن سے کہیں زیادہ صاف ٹوائلٹ پیپر ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں ایسے معصوم صحافی بھی نظر آتے ہیں جو اپنے میڈیا میں ادارتی کالم کی گنجائش ہی نہیں رکھتے اور ایسے جہاں دیدہ اہل اخبار بھی مل جاتے ہیں جو ایک اشاعت میں کانگریسی پالیسی کے گن گاتے ہیں۔ دوسری میں ہر کسی حکومت کی مدح سرائی کرتے ہیں، تیسری میں جنتا دل کی حمایت کرتے ہیں، چوتھی میں بی جے پی کے رہنما اٹل بہاری واجپئی کی تعریف کرتے ہیں، پانچویں میں ملی جلی سیکولر حکومت کے فلسفے کی تائید کرتے ہیں۔ اور اس طرح وہ سب کو خوش کرکے سب کو بے وقوف بناتے ہیں۔ یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ خود کیا چاہتے ہیں اور کس نظریہ کے حامی ہیں۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسی تبدیلیاں ایسے کم ظرفوں پر ہنستی ہیں۔ اور انہیں ہنسنا بھی چاہیے۔ بال ٹھاکرے، لال کرشن اڈوانی اور منوہر جوشی یہ سب مسلمانوں کے بنائے ہوئے لیڈر ہیں:

دیکھ کانٹے ہیں کس قدر شاداب
تو بھی ایسی بہار حاصل کر

ہمارے لیڈروں کا حال یہ ہے کہ جو کسی پارٹی یا حکومت کا رکن ہے وہ شہر کے کسی یتیم خانے کا بھی رکن ہے، کسی مسلم ہسپتال کا عہدہ دار بھی وہی ہے، حج کمیٹی کا بارسوخ ممبر بھی ہے، کھیل کی ٹیم کا سرپرست بھی ہے، ثقافتی تنظیموں، مزدوروں کی یونینوں اور محلوں کی امن کمیٹیوں کا بانی

بلب بھی وہی ہے قبرستان اور اکثر مساجد کی کمیٹی کا ممبر کونسلر بھی وہی ہے۔ کبھی کبھی تو وہی کسی دانش گاہ کا ممبر یا اقلیتی کمیشن کا سربراہ بھی نکل آتا ہے۔ عجب عجب رنگ ماسٹر دکھائی پڑتے ہیں۔ جنہیں ذلت اور عزت میں فرق نظر نہیں آتا۔ اردو اخبار آج کل ایسے ہی بت تراشتے پھر رہے ہیں۔ چنانچہ ہم نے تحریر کیا تھا کہ اردو صحافت مسلم قیادت کی کمی کو پورا کرتی ہے لیکن اب جی چاہتا ہے کہ آس پاس کے اندھیرے کو بھی اپنے چراغ صداقت سے روشن کر دیا جائے۔ چنانچہ عرض ہے کہ جہاں غیر اردو صحافت اپنے مفاد اور پیشے کے مطابق قومی پالیسی کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کی صلاحیت رکھتی ہے وہاں اردو صحافت صرف ایک پیشہ ورانہ مجبوری کا نام ہے۔ بیشتر مسلمان سیاست داں اور اردو صحافی عبرت کا نمونہ ہیں۔ کاش کوئی ان کے چہرے بے نقاب کر دے۔ ایسے تشویشناک اور سنگین ماحول میں یہ لوگ اپنی دکانیں سجائے ہوئے ہیں۔ چند دردمند اور قوم پرور صحافیوں کو چھوڑ کر باقی سب سیاسی خساروں اور گورکنوں کے ایجنٹ بنے ہوئے ہیں۔

اردو صحافت نے ملک کی جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ہر مشکل وقت میں یہ ثابت قدم رہی، اس کے پائے استقامت کو لغزش نہیں ہوئی۔ اب وقت آگیا ہے کہ اسے بدلے ہوئے حالات میں جدید اور انقلابی بنایا جائے۔ تاکہ وہ اپنی شعوری بیداری، باضمیری اور بے باکی کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر فرقہ پرستوں اور حریفوں کے ہر چیلنج کا جواب خوبی کے ساتھ دے سکے۔ اقلیتی فرقوں کے ذہنوں میں نئے دریچے کھولنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ اس گھٹے گھٹے ماحول سے نجات پانا مشکل ہے۔ اگر اردو صحافت کو مسلم قیادت کی کمی کو پورا کرنے کے عزم کا اعادہ کرنا ہے تو اسے نڈر اور زبردست صلاحیت والا صحافتی دستہ پیدا کرنا ہوگا۔ کیا اردو کی روزانہ صحافت اور اردو فوٹو جرنلزم ابھی اخفار پارٹیوں، انکلاح اور دلیوں کی تصویروں اور حاجیوں کے ٹیکہ لگوانے کے اعلانات اور تصاویر اور گھسی پٹی باسی خبروں کی اشاعت سے آگے بھی بڑھے گی یا اپنی انہی اداؤں سے قومی سیاست دانوں کو رجھاتی رہے گی؟ سیاسی، اقتصادی، تعلیمی، تہذیبی اور اخلاقی ہر محاذ سے ہم پر حملہ کیا جا رہا ہے اور صحافتی مورچہ سے ہی ہر حملے کا دنداں شکن جواب دینا ہوگا۔ اس لئے اردو صحافت کو زیادہ نکتہ رس فرض شناس، دردمند اور تخلیقی بنانے کی ضرورت ہے۔ شکر ہے کہ ہمارے بعض اہل اخبار اس معاملے میں حساس اور دیانت دار واقع ہوئے ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔

نظریۂ ارتقاء اور قرآن

نسیم قمر ندوی
مسجد رحمانیہ
مکارم نگر۔ لکھنؤ ۴۰

اس دور میں نظریہ ارتقاء صرف ایک نظریہ ہی نہیں رہا بلکہ ایک عقیدہ بن چکا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں اور مختلف میدانوں میں اس کے جو گہرے اور مضر اثرات مرتب ہو رہے ہیں وہ کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ نظریہ ارتقاء قرآن کے نظریہ تخلیق آدم سے صریح طور پر متصادم ہے۔ انسان کی تخلیق اور اس کے وجود کے متعلق ڈارون اور اس کے ماننے والوں کا جو نظریہ ہے قرآن کا نظریہ اس سے بالکل علیحدہ اور مختلف ہے۔ قرآن سے یہ ثابت ہے کہ انسان کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی ہے۔ سورہ حجر کی آیات ۲۸۔۲۹ میں ارشاد ہے "اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر کھنکھناتی مٹی سے، جو ہوئے گارے کی ہوگی پیدا کرنے والا ہوں پس جب میں اس کو پورے طور پر بنالوں اور اس میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دوں تو تم اس کے لئے سجدے میں گر پڑنا"۔ اس آیت میں تخلیق بشر کا تذکرہ ہے، یہ بشر کون ہے؟ خود دوسری جگہ سورہ بقرہ آیت ۳۴ میں قرآن اس کی تشریح یوں کرتا ہے "اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے"۔

اس کی مزید توضیح دوسری آیتوں سے ہوتی ہے جہاں انسانوں کو آدم کی اولاد اور ذریت بتایا گیا ہے سورہ اعراف آیت ۲۶ میں ارشاد ہے "اے آدم کی اولاد ہم نے تم پر پوشاکیں اتاریں، جو تمہاری شرمگاہوں کو ڈھانپتی ہیں اور تمہاری آرائش بھی کرتی ہیں"۔

مندرجہ بالا آیات اور ان جیسی دوسری آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی جو عالم انسانیت کے مورث اعلیٰ اور فرد اول ہیں۔

بعض علم جدید کے شیدائیوں نے جو مغرب سے آئی ہوئی ہر فکر و نظریہ پر آنکھ بند کر کے آمنا و صدقنا کہنے کے عادی ہیں، ڈارون کے نظریہ سے مرعوب ہو کر یہاں تک کہہ دیا کہ انسان کے ارتقائی دور میں جس پہلے شخص پر آدم کا اطلاق صحیح ہو، ہو سکتا ہے وہی فرد اول آدم ہوں جن کو ابو البشر کہا جاتا ہے معاذ اللہ، چہ بوا لعجبی است۔

پہلی بات یہ کہ انسان کے ارتقائی دور میں (جیسا کہ ڈارون ازم کے معتقدین کا دعویٰ ہے) کسی متعین مقام پر آدمی کا اطلاق مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے، جس کا اعتراف خود خود ڈارون کو بھی ہے، جس نے 1859ء میں اپنے اس نظریہ کی تشہیر کی تھی جو بعد میں جھوٹے پروپیگنڈوں کے ذریعہ ایک عقیدے کی شکل اختیار کر گیا۔ حالانکہ نظریہ ارتقا سائنسی تحقیقات کی طرح کوئی ٹھوس حقیقت (Fact) نہیں بلکہ ایک مفروضہ اور محض گمان (HYPOTHESIS) ہے جس کا کسی تجربہ گاہ (Laboratory) میں تجربہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ڈارون خود اپنی کتاب میں اس طرح اعتراف کرتا ہے "مختلف شکلوں کے سلسلے جو بندر نما مخلوق سے موجودہ انسان تک غیر محسوس طور پر بتدریج رونما ہوئے ہیں، اس بات کا تعین کرنا ناممکن ہے کہ (ان مختلف شکلوں کیلئے) انسان کی اصطلاح کب استعمال کی جانی چاہیے"۔

دوسری بات اگر اس ارتقائی دور میں (جیسا کہ دعویٰ ہے) کسی خاص گروپ کے کسی خاص فرد کو آدم مان لیا جائے تو یہ حضرت آدم علیہ السلام کی تحقیر اور سراسر قرآن کی خلاف ورزی ہوگی۔

اس لئے کہ ان Fossilsmen کے بارے میں علم الحفوریات و آثار ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ نسل گونگی تھی، یہ پست قد کے تھے اور اپنی ساخت کے اعتبار سے موجودہ انسان سے بالکل مختلف تھے۔

کھدائی میں برآمد ہونے والے ڈھانچوں کے نام ان کے دور کے اعتبار سے رکھ لئے گئے ہیں، جیسے Cromanon man یا Neanderthal man وغیرہ، Cromanon man کے بارے میں یہ انکشاف ہوا کہ ان کے سر لمبے، پیشانی چھوٹی، جبڑے بہت چوڑے، آنکھیں گہرائی میں اور قد لمبا تھا۔

ان انکشافات کی روشنی میں حضرت آدم کا اطلاق ان پر کبھی نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو گویائی عطا کی گئی تھی اور وہ روز اول ہی سے گفتگو کرتے تھے "کہا اے آدم! بتادے ان کو ان سب چیزوں کے نام، چنانچہ جب اس نے سب چیزوں کے نام ان کو بتادیئے..... (البقرہ ۳۳)

حضرت آدم علیہ السلام کی نسبت ان ادھورے آدمیوں بلکہ آدمی نما مخلوق کی طرف کرنا کبھی بھی صحیح نہیں ہو سکتا، کیونکہ اب تک ان Fossils men کا جو تصوری خاکہ مرتب کیا گیا ہے وہ نہایت ہی مضحکہ خیز، بھونڈا بدصورت اور ادھورا ہے، جب کہ حضرت آدم علیہ السلام ایک مکمل انسان، حسین و خوبصورت، عقلمند و فہیم شخصیت کے مالک تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں تمام لوگوں میں اپنے باپ حضرت آدم سے زیادہ مشابہ ہوں" گویا حضرت آدم کی جھلک دیکھنی ہو تو حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے آئینہ میں دیکھو۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ پستہ قد تھے اور نہ دراز قد بلکہ درمیان قد کے لوگوں میں تھے (شمائل ترمذی)

حضرت براء فرماتے ہیں کہ میں نے سرخ لباس میں کسی لمبے بالوں والے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ خوبصورت نہیں دیکھا، آپ کے بال کندھوں کو چھوتے تھے اور آپ کا سینہ بہت کشادہ تھا، نہ آپ پست قد تھے نہ دراز قد۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معتدل اور خوبصورت جسم والے تھے، آپؐ کا رنگ گندمی تھا، جب آپؐ چلتے تو جھک کر چلتے تھے۔

حضرت براءؓ سے کسی نے دریافت کیا کہ "کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ تلوار کی طرح لمبا تھا؟ تو آپ نے جواب دیا نہیں، چاند کی طرح تھا"۔

مندرجہ بالا احادیث کی روشنی میں حضرت آدم علیہ السلام کی شبیہ کھل کر سامنے آجاتی ہے اور شمس فی النہار کی طرح روشن اور عیاں ہو جاتی ہے

ان بدنما اور نامکمل ڈھانچوں کی طرف حضرت آدم علیہ السلام کی نسبت کرنا صرف حضرت آدمؑ ہی کی توہین نہیں بلکہ تمام انبیاء کرام کی توہین ہے اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام کو حضرت آدم علیہ السلام کی ذریت قرار دیا ہے، ارشاد باری ہے "یہ وہ انعام یافتہ لوگ ہیں جو پیغمبروں میں سے آدم کی ذریت سے ہیں۔ (مریم - ۵۸)

تیسری بات یہ کہ Fossils Record میں اب تک کوئی ایسا مکمل ڈھانچہ برآمد ہی نہیں ہوا جس سے کسی مکمل فرد کے صحیح صحیح حلیہ کا تصور کیا جا سکے، بلکہ چند ٹوٹی پھوٹی ہڈیاں، نامکمل کھوپڑیاں اور جبڑے وغیرہ برآمد ہوئے ہیں جن سے صرف قیاس کیا جا سکتا ہے، کوئی قطعی علم حاصل نہیں ہو سکتا، اس وجہ سے خود مغربی مصنفین کو اس بات کا اعتراف ہے کہ ان ٹکڑوں کے ذریعہ کوئی حقیقی علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

ایک مشہور محقق D.C. Johnson اپنے مقالہ میں تحریر کرتا ہے کہ کسی قدیم انسانی جبڑے کے محض ایک جزو یا ٹکڑے کی بدولت ہم کو ایسی کوئی بصیرت حاصل نہیں ہو سکتی جو انسان کے مسائل کو حل کرنے میں معاون بن سکے، کیونکہ یہ آثار Remains بالکل جزئی ہیں۔

چوتھی بات نظریہ ارتقاء Evolution Theory کی تشہیر آج سے تقریباً ۱۳۶ سال قبل پہلی بار ۱۸۵۹ء میں لندن سے کی گئی تھی، اس دور میں اس نظریہ کا بودا پن اور کھوکھلا ہونا پوری طرح ثابت ہو چکا ہے۔

ایک مشہور ماہر حیاتیات Biologist اپنے مقالہ "نظریہ ارتقاء کے مغالطے" The Fallacies of Evo Lution Theory میں تحریر کرتا ہے "موجودہ ارتقائی فکر میں سخت پیچیدگی کی وجہ، جو کہ بہت سے مغالطے پیدا کرنے کا باعث ہے یہ ہے کہ حیاتیاتی حقائق کی تشریح و توجیہ از کار رفتہ طبعی نظریہ کی روشنی میں کی جاتی ہے"۔

بقیہ صفحہ پر

کچھ آواز اور موسیقی کے بارے میں

معارف النغمات* (مرتبہ عالیجناب محمد نواب علی خاں صاحب) کے دیباچے سے اقتباسات

آواز کیا ہے :- معروف سی معروف شئے کی حقیقت کا علم بھی ہم کو نہیں ہے پس یہ سوال کہ آواز کیا ہے؟ بغیر جواب کے رہا جاتا ہے خواہ کتنی ہی خاک بیزی کی جائے۔ اس کے متعلق عقلائے زمانہ کے اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ آواز ایک ارتجاج ہے (خاص قسم جنبش جو لرزے سے مشابہ ہے) ہوائے محیط بالا بدان کا جو بسبب تصادم (ٹکرانا) واصطکاک (رگڑ) اجزاء لینیہ یا صلبہ (نرم و سخت) کے پیدا ہو۔ اس تموج یا ارتجاج کو انگریزی میں وائبریشن کہتے ہیں

تصادم واصطکاک آواز کے پیدا ہونے کی علت ہیں خواہ ارادتاً واقع ہو یا اضطراراً ذی روح سے یا غیر ذی روح سے مسلسل ہوں یا منقطع۔ بہرحال ان سے ایک خاص تحریک ہوا میں پیدا ہوگی جسے آواز کہیں گے۔ سبب اور مسبب ایک نہیں ہوتے لہذا یہ نہیں کہہ سکتے کہ اصطکاک یا تصادم کا نام آواز ہے۔ اس کو صرف حس سمع دریافت کر سکتی ہے یعنی اگر حس سمع نہ ہو تو گویا آواز کا وجود ہی نہیں ہے؟ پس اس تین جیسی ساخت والی ترکیب سے اگر ہم یہ کہیں کہ ما یحس بہ السمع (جو کانوں کو سنائی دے) وہی آواز ہے تو کچھ بیجا نہیں۔

حس سمع :- حس سمع بھی ایک قوت ہے اور آوازوں کا احساس اس کی مقررہ خدمت ایک ہی قسم کا ارتجاج ہے جو ہوا اور کان کے پردے میں واقع ہوتا ہے۔ ایک کو آواز دوسرے کو سماعت سے تعبیر کرتے ہیں یعنی جس قسم کے تموجات ہوا میں پیدا ہو کر کان کی غشاء (طبلی) سے ٹکراتے ہیں اسی قسم کا تموج اس غشاء میں پیدا ہو کر چند چھوٹی چھوٹی نازک نازک ہڈیوں اور گھونگھے سے گزرتا ہوا عصب سمع تک پہونچ جاتا ہے اور اس کو حرکت دیتا ہے۔ یہ عصبہ باریک اور چھوٹے ریشوں کا مجموعہ ہے جو اندرونی حصہ گوشت کی تجاویف میں رطوبت مائی کے اندر ڈوب کر دماغ میں اس طرح پھیل گئے ہیں کہ نگاہ سے دیکھے نہیں جا سکتے۔ بسبب اسی قوت کے نفوس کو الحان مطربہ سے مسرت اور ہیبتناک و کریہ آوازوں سے نفرت و کرب حاصل ہوتا ہے۔

موسیقی کو کن آوازوں سے تعلق ہے :- لاانتہا آوازوں میں سے موسیقی کو صرف چند مخصوص آوازوں سے تعلق ہے جنہیں اصطلاحاً سُر کہتے ہیں اور ان سروں سے جو نغمات تالیف ہوئے ہیں قریباً سب مطبوع و دلپسند ہیں اور جس محل کے لئے جو صنف وضع کی گئی ہے اگرچہ اس کی معین تاثیر کی کوئی علت دریافت نہیں ہوئی پھر بھی حسب مواقع اثر پیدا کرتی ہے مگر جس طرح ہر ایک نوع شکل و طبیعت میں تناسب خاص رکھتی ہے اسی طرح اثر و تاثیر میں دیگر انواع سے مغایر ہے۔ پھر یہ مغایرت نوع سے صنف اور صنف سے فرد تک میں موجود ہے اور افراد کا حال بھی یکساں اور مستقل نہیں رہتا۔ پس جس نغمے سے کسی وقت خاطر کو انقباض ہوا تھا دوسرے وقت میں اس کا موجب انبساط ہونا ممکن ہے وبالعکس۔

قوت وصوت و حس سمع کے خواص :- پروفیسر ریڈ لکھتے ہیں کہ جس شخص کا حاسہ سمع قوی ہو وہ قریباً پانچسو آوازوں کے درمیان اختلاف کی تمیز کر سکتا ہے۔

بعض آوازیں بعض آدمیوں کو مطلقاً سنائی نہیں دیتیں مگر وہی آوازیں دوسروں کو سنائی دیتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوت سمع ہر ایک شخص میں مساوی نہیں ہوتی اور آواز بھی ہر ایک کی یکساں نہیں ہوتی۔ ہر ایک قوت میں بذریعہ اجتہاد زیادتی ممکن ہے۔ لہذا حاسہ سمع و درستی آواز میں بھی ممکن ہے۔

سماعت میں اتنی ترقی دیکھی گئی ہے کہ جہت صوت اور مسافت درمیانی تک بعض لوگ معلوم کر لیتے ہیں۔ چنانچہ نپولین اول توپ کی آواز سنتے ہی مسافت اور سمت کو ٹھیک ٹھیک بتا دیتا تھا اور یہ امر اکتسابی ہے بعض لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں کہ ہر ایک بولنے والے کی آواز کا نقش ان کی سماعت پر ایسا گہرا بیٹھ جاتا ہے کہ اس کی نقل ہو بہو کرنے پر قادر ہو جاتے ہیں اور پھر اس آواز کو مدت العمر بھولتے نہیں۔

متکلمین باطن :- اس سے بھی زیادہ عجیب تر وہ فرقہ ہے جسے اہل یورپ وینٹریلوکوسٹس یعنی متکلمین باطن کہتے ہیں مسٹر ڈکنس نے (اپنی کتاب مطبوعہ اکسفورڈ ۱۹۵۵ء میں) بارابینٹ خادم شاہ فرانس کی ایک حکایت لکھی ہے کہ وہ ایک امیر کی لڑکی پر عاشق ہوا۔ لڑکی کے باپ نے درخواست عقد نامنظور کر دی۔ تھوڑے دنوں کے بعد یہ رئیس مر گیا اور لوئس ادائے رسم تعزیت کے لئے لڑکی کی ماں کے پاس گیا۔ کچھ دیر کے بعد مکان کی چھت سے اس بیوہ کو آواز سنائی دی کہ "مجھ پر رحم کرو اور لوئس کے ساتھ لڑکی کا عقد کر دو۔ لوئس کے محروم کر دینے کے باعث مجھ پر سخت عذاب ہے"۔ یہ آواز بہ تکرار اس کے کانوں میں آتی رہی آخر خوف و حیرت سے مجبور ہو کر اس نے لوئس سے درخواست کی کہ گزشتہ باتوں کو بھول جائیے اور اب لڑکی کو قبول کیجئے۔ لوئس ایک مفلس آدمی تھا۔ اس درخواست کو سن کر وہ سید حالیون پہونچا۔ وہاں ایک بڑا مہاجن کورنو نامے رہتا تھا جس کا تمول اور بخل دونوں میں نظیر نہ تھا۔ لوئس سے اور مہاجن سے ملاقات تھی۔ جب وہ مہاجن سے ملا تو اس نے کچھ ذکر روز قیامت و حساب و جزا و سزا کا چھیڑ دیا۔ دفعتاً دیوار سے ایک آواز پیدا ہوئی کہ "بیٹا میں نے لوئس کو اس غرض سے کہ وہ عیسائیوں کو ترکوں کی قید سے چھڑائے اپنے مال میں سے کچھ نہیں دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہایت شدید عذاب میں مبتلا ہوں"۔ مہاجن متحیر ہوا اور ڈرا۔ مگر بخل نے اجازت نہ دی کہ تعمیل کرتا۔ لوئس وہاں سے اس روز خالی ہاتھ واپس آیا۔ دوسرے روز پھر کورنو کے پاس گیا اور اس کے بیٹھتے ہی در و دیوار سقف و مکان سے مختلف قسم کی آوازیں فریاد و استغاثہ و سفارش کی آنے لگیں اور یہ آوازیں کورنو کے مردہ رشتہ داروں اور اس کے باپ کی تھیں۔ ہر ایک کا مطلب یہ تھا کہ کورنو لوئس کو ڈھائی ہزار پونڈ دے کر اس عذاب شدید سے آنجہانی مسٹر کورنو کو نجات دلوائے۔

اب کی مرتبہ کورنو پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ اس نے ڈھائی ہزار پونڈ کی کثیر رقم لوئس کے حوالے کی اور لوئس نے اس رقم سے اپنی محبوبہ کے ساتھ شادی کی۔ تھوڑے دنوں کے بعد جب کورنو کو معلوم ہوا کہ یہ سب لوئس کی شیطنت تھی اور کچھ نہ تھا تو وہ اس غم و غصہ میں بیمار ہو کر مر گیا۔

اس قصے اور دیگر قصص مندرجہ بیبل سے جو اس کے مماثل ہیں اور شہادت سے ان کا صدق متحقق ہو گیا ہے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اکتساب سے انسان آواز پر اتنی قدرت حاصل کر سکتا ہے کہ اگر چاہے تو بغیر ہونٹ ہلائے ہوئے تموجات ہوا کو بخلاف اس سمت کے جس سمت سے اس آواز کو پہونچانا چاہیے سننے والے کے کانوں میں پہونچا دے اور جس کسی کی آواز اس نے کبھی سنی ہو اس کی نقل ہو بہو کر لے۔

جو شخص موسیقی میں مہارت تمام حاصل کرنا چاہے اس کا پہلا فرض آواز کا قابو میں لانا اور ایک آواز کو دوسری آواز سے فرق کرنا ہے۔ آواز ایسی چیز ہے جس سے مرض، غم، غصہ، مہربانی، دشمنی، کسل۔ تعب، مصیبت، خوشی، طرب، مختلف کوائف کی تصویر سامع کے آئینۂ خیال میں کھینچی جا سکتی ہے۔

مسٹر کارک ایک مرتبہ پادری ہو ٹیفیلڈ کی وعظ سننے گئے تھے۔ ان کی فصاحت اور خوش الحانی سے ایسا متاثر ہوئے کہ انہوں نے سو پونڈ اس شخص کا انعام تجویز کیا جو صرف لفظ "آہ" کا ادا کرنا پادری صاحب کی طرح ان کو سکھا دے۔ یہی قوت ہے جس سے زمانہ کے مقرر ایک جماعت کو تابع فرمان کر لیتے ہیں۔ حکیم ڈیمسٹینوس یونان کا ایک بڑا فصیح اللسان شخص تھا۔ جب اس سے کہا گیا کہ فصاحت کی تینوں قسمیں بیان کرے تو اس نے جواب دیا کہ پہلی قسم تلفظ ہے۔ دوسری قسم تلفظ ہے۔ تیسری قسم تلفظ ہے۔ منشا اس کا یہی ہے کہ جس مبحث پر تقریر کر رہا ہے اس مبحث میں جتنے انفعالات مجلس پر طاری کرنا مقصود ہوں چاہیے کہ ویسی ہی آواز اور ویسے ہی الفاظ اپنی تقریر میں لائے ورنہ سننے والے بعض تنگ آکر سو رہیں گے اور بعض ہنسیں گے اور یہ سب کچھ ہر ایک بات کی توجہ سے سننے اور ذہن میں اس کی ترکیب کو دہرانے سے حاصل ہوتا ہے پھر اگر اس کی مشق بار بار کی جائے تو چند روز میں ذہن اس کو کلیتاً قبول کر لیتا ہے۔

وجہ تاثر اصوات مختلفہ :- اور بیان ہوا ہے کہ نسبت تالیفیہ سے نغمات کی تالیف کی جاتی ہے۔ نغمات بذریعہ ہوائے متموج کانوں میں پہونچ کر عصبہ سمع کو حرکت دیتے ہیں اور یہ حرکت باعث انفعال نفس ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہاں صوت کی حقیقت نامعلوم ہے وہاں وجہ تاثر بھی تحقیق نہیں۔ بلکہ اناٹومی کے مطالعہ سے انسانی آلات صوت اور ان کے اجزا کی فزیالوجی زیادہ واضح طور پر دریافت ہو جاتی ہے بخلاف حاسہ سمع کہ اس کے آلات کے خدمات بخوبی معلوم نہیں ہیں۔ مذکورہ بالا وجہ کے علاوہ ایک رائے اور بھی ہے مگر از بسکہ اس کی بنا مقائسہ محض پر ہے۔ لہٰذا اس کی صحت پر اصرار نہیں کیا جاتا اور وہ یہ ہے کہ ہم نے آلات سماعت کی تشریح میں عصب سمع کو باریک باریک ریشوں سے مرکب پایا ہے پس کیا عجب ہے

کہ یہ ریشے یا تار مثل سارنگی کی طربوں کے ہوں۔ یعنی ہر ایک کسی خاص وزن یا قوت کے ساتھ مختص ہو اور جس طرح ایک ہی قوت اور وزن کے تمام تار آپس میں ہمدردی رکھتے ہیں کہ اگر ایک کو جنبش ہوتی ہے تو دوسرے خود بخود بجنے لگتے ہیں اسی طرح یہ ریشے ایک دوسرے سے مختلف قوت کے بنائے گئے ہیں۔ اور غلیظ سے غلیظ اور رقیق سے رقیق ارتعاج سے بحسب کیت رقت و غلظ متاثر ہو کر حسن باطن کو منتقل کرتے ہوں۔ بدیں وجہ کہ علم نفس میں یہ امر طے پاچکا ہے کہ انفعال حاسہ اور انفعال نفس بالحاسہ میں کوئی مشابہت نہیں ہے۔ لامحالہ تار یا ریشہ۔ نفس سے آواز کو متصل کرکے باعث انفعال ہوتے ہیں۔ پس کان گویا خود ایک آلہ موسیقی ہے۔

یہ خیال ہم کو ساز وغیرہ کی (جھنکار بعد ختم نغمہ سرائی) کان میں باقی رہنے سے پیدا ہوا۔ توپ کی صدا سے کانوں میں دیر تک ایک سنسناہٹ کا پیدا ہو کر باقی رہنا یا اکثر گویوں کا بعد بہرے ہونے کے محض دل ہی دل میں نغمہ دہرانے سے لذت و طرب و وجد میں آجانا ہمارے اس خیال کو اور بھی پختہ کرتا ہے کیونکہ بہرا گویا محض متوہمات باطنی سے اپنے کانوں میں وہی تحریک پیدا کرلیتا ہے جس سے اس کی لذت ہیجان میں آجاتی ہے اور صرف حاسہ سمع میں یہ قوت بوجہ اتم دریافت ہوئی ہے بخلاف ذوق و شم و لمس کے۔

یہ بیان کسی قدر تفصیل کا محتاج ہے جسے بخیال طول ترک کرکے مقصود کی طرف پھر متوجہ ہوتے ہیں۔ تاثر خواہ کسی وجہ سے حادث ہوتا ہو مگر اس کے وقوع سے انکار نہیں ہوسکتا۔ البتہ تاثر کو وقت مناسب، موسم مناسب اور سامع کی خواہش سے بہت کچھ علاقہ ہے جس قسم کے انفعالات سے سماع کے وقت دماغ سامع اثر پذیر ہورہا ہے اگر نغمہ ان سے مناسبت نہیں رکھتا تو کامل مزا نہ دے گا۔

ایک عجیب حکایت تاثر کے متعلق وفیات الاعیان ذیل ابن خلکان اور روضۃ الصفا وغیرہ میں نظر سے گزری۔ معلم ثانی ابونصر فارابی ایک جلیل الشان فلسفی اور موجد ساز قانون (باجا) زمانہ خلافت راضی باللہ میں تھا جس کو موسیقی میں منجملہ اور علوم کے کمال دخل تھا۔ ایک روز اس کا گزر سیف الدولہ علی ابن حمدان کی مجلس میں ہوا۔ اس وقت اکثر علوم کے عالم جمع تھے۔ فارابی کی عادت تھی کہ ترکی سپاہیوں کی وضع میں رہتا تھا۔ اس وجہ سے اس کو کسی نے پہچانا نہیں۔ اور یہ کھڑا رہا۔ سیف الدولہ نے اشارہ کیا کہ بیٹھ جاؤ۔ اس نے فوراً سوال کیا کہ اپنی جگہ یا تمہاری جگہ۔ سیف الدولہ نے جواب دیا کہ اپنی جگہ۔ یہ سنتے ہی حضرت لوگوں کو نانگھتے ہوئے مسند پر بیٹھ گئے اور بیٹھے بھی اس طریقے سے کہ سیف الدولہ ناچار اپنی جگہ سے سرک گیا۔ جس قدر وہ سرکتا گیا یہ بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ پائیں مسند جا بیٹھا۔ یہ حرکت سیف الدولہ کو بری معلوم ہوئی اور اس نے اپنے غلاموں کی جانب متوجہ ہو کر ایک خاص زبان میں جو مشہور نہ تھی کہا کہ یہ بڈھا بڑا بدتمیز ہے۔ میں اس سے چند مسائل علمی پوچھتا ہوں۔ اگر اس نے جواب ٹھیک دیا تو خیر ورنہ بار ہستی سے سبکدوش کردینا۔ ابونصر نے اسی زبان میں جواب دیا کہ حضور عالی صبر کیجئے اور نتیجہ کے منتظر رہئے۔ سیف الدولہ نے متعجب ہو کر کہا کیا تم اس زبان سے بھی واقف ہو؟ انہوں نے کہا ہاں! بلکہ ستر زبانوں سے زیادہ جانتا ہوں۔ اب سیف الدولہ کی نگاہ میں ان کی وقعت کس قدر قائم ہوئی۔ پھر فارابی علمائے حاضرین سے گفتگو میں معروف ہوا۔ نوبت باینجا رسید کہ سب مغلوب ہو کر خاموش ہوگئے اور صرف فارابی کلام کرتا رہا۔ آخر لوگوں نے اس کی تحقیقات قلمبند کرنی شروع کی۔ صحبت کا یہ رنگ دیکھ کر سیف الدولہ نے سب علماء کو رخصت کیا اور فارابی سے کھانے پینے کی صلاح کی۔ جواب نفی میں پاکر پوچھا کہ گانا سنوگے۔ کہا ہاں۔ فوراً بڑے بڑے گویے حاضر ہوئے اور جی توڑ توڑ کے گائے مگر اس نے سب کو ناکام رکھا۔ پھر سیف الدولہ نے جھنجھلا کر کہا کہ پھر آپ ہی کچھ کمال دکھایئے۔ اس نے اپنی کمر سے ایک تھیلی نکالی جس میں لکڑیوں کے ٹکڑے تھے ان ٹکڑوں کو جوڑ کے اس نے بجانا شروع کیا۔ حاضرین اس بجانے کی تاثیر سے ہنسنے لگے بعد ازاں دوسری ترکیب سے بجانا شروع کیا اب کی مرتبہ لوگ از خود رفتہ ہوکے رونے لگے۔ آخر کچھ ایسی محویت طاری ہوئی کہ سب کے سب سوگئے اور یہ وہاں سے غائب ہوگیا۔

عرب کی موسیقی :۔ یہ حال عرب کے ملک میں گزرا جہاں کی موسیقی اس درجہ کامل نہیں تھی جیسی کہ ہندوستان میں ہے۔ عرب میں بعض راگ صرف دف پر شادی بیاہ میں گائے جاتے تھے یا حدی خوانی کا رواج تھا مگر وہ اس انتظام و اصول سے نہ تھا جسے کسی فن کی حیثیت سے دیکھا جائے۔ جب فارس فتح ہوا اور وہاں کے امراء یوں کی غلامی میں آئے تو انہوں نے طرح طرح کی ترکیبوں سے غزلیں اور قصیدے پڑھے۔ عبداللہ بن جعفر کے غلام سائب خاثر اور طویس و نشیط فارسی کا عرب میں بہت شہرہ تھا۔ ان لوگوں سے معبد و ابن سریج وغیرہ نے اس فن کو حاصل کیا اور بتدریج اس کو ترقی دیتے رہے۔ یہاں تک کہ بنی عباس کے زمانہ میں یہ فن ایک مستقل فن کی حالت میں آگیا اور ابراہیم بن مہدی و ابراہیم موصلی و اسحاق ابن ابراہیم و

حماد ابن اسحاق وغیرہ بڑے بڑے گویے ان لوگوں میں پیدا ہوئے۔

عرب کا انوکھا ناچ :۔ بعض نے طباخی کو بھی دخل دیا اور ایجادیں بھی کیں۔ چنانچہ ایک قسم کا ناچ جس کا نام کرج ہے ایجاد ہوا۔ یہ وہی ناچ ہے جس کو ہمارے ہندوستان میں لُلی گھوڑی والے ناچا کرتے ہیں یعنی لکڑی کا گھوڑا بنا کے زین لگام سے آراستہ کیا، اس پر عورتوں کو سوار کیا اور ادھر سے ادھر گھمانے لگے۔ سلامتی سے ایجاد نہایت معقول ہوئی اور اس نے ممالک عرب میں خوب رواج پایا۔ اندلس میں گانا ناچنا زریاب موصلی کے ذریعہ جسے عرب کے لوگوں نے ہم پیشگی کے رشک و حسد سے نکال دیا تھا۔ حکم بن ہشام بن عبدالرحمن امیر اندلس کے وقت میں پھیلا (مقدمہ ابن خلدون) [باوجود عربوں کے اس بے تکے پن کے اس فن نے علم کی حیثیت وہاں بھی اختیار کرلی۔ عرب سوائے طلاقت کے کسی چیز میں کمال نہیں رکھتے تھے اور نہ انہیں کسی صناعت کا موجد کہا جاسکتا ہے مگر یہ مقلد بہت اچھے تھے اور جس چیز کو انہوں نے غیروں سے لیا اسے باقی رکھا۔ اگر قدیم کتب خانہ عجم جلایا نہ دیا جاتا تو سلاطین عباسیہ سے پیشتر ہی علوم کا رواج عربوں میں ہو جاتا۔

عجموں کی موسیقی کی اصطلاحیں اب سب قریباً عربی زبان کی ہیں۔ اس لئے کہ ان کی سلطنت جب تباہ ہوئی تو وہ سب کھو بیٹھے۔ کتب خانہ بھی جل چکا تھا۔ ان میں بڑے بڑے استاد ماہر اس فن کے تھے کیونکہ ہندوستان اور عجم سے قدیمی رسم و راہ تھی جس کا پتہ تاریخ سے ملتا ہے۔ الغرض ایک عالم موسیقی کا تابع فرمان رہا ہے۔ خصوصاً حکماء پر تو اس نے خوب ہی قبضہ کیا۔ چنانچہ ہم یہاں بعض حکما کے اقوال متعلق بشرافیت موسیقی ایک عربی رسالہ موسیقی سے جو حضرت بہاء الدین عاملیؒ کی جانب سے منسوب ہے نقل کرتے ہیں۔

اقوال متعلق فضائل موسیقی :۔ بعض حکماء کا قول ہے کہ موسیقی کی فضیلت بیان کرنے سے نطق انسانی عاجز ہے اور اس کا اظہار بذریعہ عبارات و الفاظ ممکن نہیں۔ یہ ایک لحن موزوں ہے کہ اس کے سننے کے ساتھ ہی طبیعت فرحت و سرور و لذت و حبور سے بھر جاتی ہے۔ دوسرا حکیم کہتا ہے کہ موسیقی جب اپنی صناعت میں کامل ہو تو نفس انسانی فضائل کی جانب حرکت کرتا ہے۔ اور رذائل اس سے دور ہو جاتے ہیں۔ ایک کا قول ہے موسیقار (ایک آلہ غنا) اگرچہ حیوان نہیں لیکن اس میں ایسا نطق موجود ہے جو نفوس کے اسرار اور قلوب کے ضمائر سے خبر دیتا ہے مگر اس کی بات سمجھنے کے لئے ایک ترجمان درکار ہے۔

ایک کہتا ہے کہ موسیقار خود موسیقی کا ترجمان ہے۔ اگر اس کی عبارت فصیح و با معنی ہے (یعنی بجانے والا اپنے فن میں کامل و ماہر ہے) تو دلوں کے بھید اور نفوس کے مخفی راز سمجھنے میں کوئی وقت نہیں ہوتی۔ ایک اور حکیم کا مقولہ ہے کہ موسیقار کی صدا اگرچہ بسیط ہے اور اس میں حروف نہیں ہیں مگر پھر بھی نفوس کا میلان اس کی جانب شدید ہے اور نفوس اس کو بہت جلد قبول کرلیتے ہیں اس لئے کہ نفوس اور نغمات میں مشاکلت ہے۔ بایں معنی کہ نفوس نام ہے جوہر بسیطہ روحانیہ کا اور نغمات موسیقار کا بھی یہی حال ہے۔ پس اشیاء کا اپنے مثل کی جانب مائل ہونا ایک نیچرل بات ہے۔

ایک اور حکیم قائل ہے کہ نغمات موسیقار کے معانی اور اس کی لطیف عبارت کے مطالب جو ایک سر غیبی ہے کچھ وہی سمجھ سکتا ہے جس نے نفس شریف پاک از شوائب نفسانیہ و بری از شہوات بہیمیہ پایا ہو۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ خدارسی اور للہیت کے لئے موسیقی سے بہتر کوئی چیز نہیں دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ موسیقی جان ہے اور تمام عالم جسم اگر موسیقی کا تصرف جاتا رہے تو عالم جسد بے روح ہے۔

فن موسیقی اور شرع محمدیؐ :۔ ان میں سے بعض حکمائے متفلسفین کی ستائش میں مبالغہ کو بہت کچھ دخل ہے اور شاید موسیقی کی تعلیم و تعلم کی طرف اگلے لوگوں کا رجحان خاطر ایسی ہی اعلیٰ اغراض کے لئے ہو اور اسی وجہ سے وہ اپنے بچوں کو عدم بلوغ کی حالت میں اس کی تعلیم دلاتے ہوں لیکن ہم بر سبیل استقرا آثار موسیقی کے بارے میں صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ وہ قوائے باطن یا سامع کی طبیعت کو اپنی جانب ایسا متوجہ کرلیتے ہیں کہ محویت سی طاری ہو جاتی ہے۔ اس اثر کو دیکھتے ہوئے شارع علیہ السلام کا اس کے عمل کو باطل قرار دینا کوئی عجیب امر نہیں۔ جب کوئی نغمہ خواہ وہ حمد الہی میں کیوں نہ ہو شروع کیا جاتا ہے تو مغنی کی خداقت کی جانب طبیعت متوجہ ہو جاتی ہے اور اس کی عرق ریزی اور جانکاہی کی داد دینے میں دل مصروف ہو جاتا ہے یا یوں کہو کہ تارہائے موسیقی میں دل الجھ کر رہ جاتا ہے نہ رشتہ تسبیح میں۔ پس خلوص راگ کے ساتھ ہو نہ خدا کے ساتھ۔ خدا کی محبت کسی راگ کی پابند نہ ہونا چاہیے۔ شاعر کہتا ہے

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے

بعینہ ویسی ہی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ معاذ اللہ ہمیں تو صراحی مے کے دور میں نظارہ جمال مقدس الٰہی نظر آتا ہے بمبئی میں تاڑی کے قدح چڑھا کر لوگ ماتم سید الشہدا کرتے ہیں اور طرہ یہ کہ ثواب اخروی کے امیدوار بھی رہتے ہیں۔

اگر ہم اس تاثیر کو تسلیم بھی کر لیں کہ موسیقی کا اتار چڑھاؤ خدا تک پہونچنے کا زینہ ہے تو "سلب شئے عن نفسہ" لازم آئے گا جو عقلا کے نزدیک محال ہے۔ اس لئے کہ نغمات اور حدی خوانی وغیرہ سے غم کا دور ہونا یا بعد مسافت کا نہ محسوس ہونا یا بوجھ کا ہلکا معلوم ہونا یہ سب کچھ دھیان بٹ جانے پر موقوف ہے۔ طبیعت نغمہ کی جانب کلیتاً متوجہ ہو جاتی ہے اور نغمہ ہے در حقیقت ایسی ہی دلکش چیز! ۔ پس خدا کی عبادت میں اپنی طرف متوجہ نہ کرے بلکہ تھوڑی دیر کے لئے کسی عابد کی خاطر سے دوسری جانب متوجہ کر دے اور اپنے ذاتی اثر سے دست بردار ہو جائے اک خلاف عادت بات ہے ایک قسم کی بیخودی اور محویت کا طاری ہو جانا نغمہ کے باعث سے ہوتا ہے اور احسان اس کا خدا پر! کسی قاری کی تلاوت قرآن جو گیے کی دھن میں مثلاً قرآن کی ستائش کی موجب نہیں ہوتی۔ قرآن ایک ضمنی شئے ہو جاتا ہے اور دھن اصلی شئے۔ پس عبادت میں غنا کا اثر جو کہ ایک مجازی شئے تھا حقیقی کہا جانے لگا۔ اس کے علاوہ عبادات کو تصنع سے پاک کرنا عین منشائے شارع ہے نغمہ کے ساتھ تصنع ہے۔ تصنع آیا اور خلوص رخصت ہوا۔

بقیہ: نظریۂ ارتقاء

The Present impasse in evolutionary thinking Productive of so many fallacies, is due chiefly to the interpretation of biological fact in terms of out of date physical theory.

مزید وضاحت کے ساتھ ایک مشہور محقق Dr. Issac Asimoc تحریر کرتا ہے کہ فرنچ سائنس داں (ڈارون کا عقیدت مند) پاسچر (Pasteur) نے تجربات کے باعث از خود حیات کا نظریہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا۔

Pasteur.s demonstration apparently laid the theory of sponteous generation to rest permanently.

بلکہ صاف لفظوں میں یہ کہتا ہے کہ نظریہ ارتقاء بالکل ناقص اور ناکافی نظریہ ہے۔

" Evolution theory is inadequate"

نظریہ ارتقاء کا بودا پن صاف ظاہر ہو چکا ہے پھر اکثر ماہرین علم جدید اس نظریہ کے ساتھ کمبل کی طرح چپٹے ہوئے ہیں اور برابر مرغے کی ایک ٹانگ کی رٹ لگا رہے ہیں، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اسی کا زہر ہلاہل معصوم بچوں کے ذہنوں میں انجکٹ کر رہے ہیں، حالانکہ بچوں کے ذہن پر پہلی بار جو نقوش ثبت کئے جائیں گے وہی آخری اور دائمی نقوش ہوں گے۔

گلزار (بمبئی) ---------- (نظم) ----------------

کباڑ خانہ

دو بجنے میں آٹھ منٹ تھے۔
جب وہ بھاری بوریوں جیسی ٹانگوں سے بلڈنگ کی چھت پہ پہنچا تھا۔
ٹوکر کھا کے، تھوڑی دیر کو، چھت کے فرش پر بیٹھ گیا تھا۔
چھت پر ایک کباڑی گھر تھا -----
سوکھا سکڑا ٹھگنے والا، سود خور اس جاگیردار کا جو تا و میچا تا تھا۔
اس بلڈنگ میں جس کا جو سامان مرا، بیکار ہوا، وہ اوپر لا کے پھینک گیا ہے۔
اس کے پاس تو کتنا کچھ ہے،
کتنا کچھ جو ٹوٹ چکا تھا، ٹوٹ رہا ہے -----
شوہر اور وطن کی چھوڑی، بطشیرہ کل پاکستان سے بچے لیکر لوٹ آئی ہے،
سب کے سب کچھ خالی بوتلوں، ڈبوں جیسے لگتے ہیں۔
پچکے۔ ٹیڑھے، بن لیبل کے،
صبح بھی دیکھا تھا دادی کو سوئی ہوئی تھی -----مری نہیں تھی،
جب دوپہر کو پانی پی کر چھت پر آیا اس دم بھی وہ مری نہیں تھی،
سوئی ہوئی تھی ----
جی چاہا اس کو لا کر چھت پہ پھینک دے، جیسے ٹوٹے ایک
پلنگ کی پشت پڑی ہے ---

دور کسی گھڑیال نے ساڑھے چار بجائے،
دو بجنے میں آٹھ منٹ تھے جب وہ چھت پر آیا تھا ---
سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اس نے سوچ لیا تھا ---
جب اس پار کی ٹریفک لائٹ بدلے گی،
رک جائیں گی ساری کاریں ---
تب وہ پانی کی ٹنکی کے اوپر چڑھ کر پیراپیٹ (Parapet) پر اترے گا

چودھویں منزل سے کودے گا !
اس کے بعد اندھیرے کا اک وقفہ ہوگا۔
کیا وہ گرتے گرتے آنکھیں بند کرے گا؟
یا آنکھیں کچھ اور زیادہ پھٹ جائیں گی؟
یا بس ! -----سب کچھ بجھ جائے گا؟
سانسوں کا اک گچھا اس کے حلق میں آکر اٹک گیا۔
گرتے گرتے بھی لوگوں کا اس نے اک کہرام سنا،
اور لہو کے چھینٹے پوپٹ کی دوکان کے اوپر تک بھی اڑ کر جاتے دیکھے

رات کا ایک بجا تھا جب وہ سیڑھی سے پھر نیچے اترا
اور دیکھا فٹ پاتھ پر آکر،
چاک سے کھینچا، لاش کا نقشہ، وہیں پڑا تھا
جس کو اس نے چھت کے ایک کباڑی گھر سے پھینکا تھا ------- !!

عبدالقوی ضیاء (کناڈا)

غزل

خود کو ہلاک رہگزر ہم نے کیوں کیا
سفاک آندھیوں میں سفر ہم نے کیوں کیا

جب ہاتھ کوئی مال غنیمت نہ آسکا
پھر معرکہ حیات کا سر ہم نے کیوں کیا

وعدے کا اس کے کوئی یقین جب نہ تھا تو پھر
تعمیر سطح آب پہ گھر ہم نے کیوں کیا

ترک وفا کے بعد ہر اک بات ختم تھی
اک بے وفا کا ذکر مگر ہم نے کیوں کیا

جس سمت بے رخی کے سوا اور کچھ نہ تھا
رخ اپنی زندگی کا ادھر ہم نے کیوں کیا

تھے دل کی وسعتوں میں ضیاء لاکھ دائرے
بس ایک دائرے میں سفر ہم نے کیوں کیا

جمال اویسی
محلہ فیض اللہ خان
دربھنگا ۸۴۶۰۰۴ (بہار)

غزل

میں ہمیشہ کسی خیال میں گم
ناتراشیدہ خدوخال میں گم

گھنگھروؤں کی صدا سنائی دے
نیند میں میں سر اور تال میں گم

میں بہت آگے وقت کی حد سے
زندگی اب تک اپنی چال میں گم

کوئی بے ربط سا خیال ہے تو
اور میں اپنے اعتدال میں گم

کاش تم بے حصار ہو جاؤ
ایک شاعر ہو ماہ و سال میں گم

وقت آگے نکلتا جاتا ہے
اور اویسی ہے اپنی چال میں گم

اقبال متین
"کہانی" ۔ کتاب نگر، نظام آباد
(اے ۔ پی) ۵۰۳۰۰۱

غزل

ہم برے ہیں بھی تو ہر دل میں اترجاتے ہیں
دشمنوں کو بھی دعا دے کے گزر جاتے ہیں

سب ہمارے ہیں، ہمیں بھی کوئی اپنا سمجھے
کہہ نہیں سکتے مگر سوچ کے ڈر جاتے ہیں

اپنی چوکھٹ پہ ٹھٹک جاتے ہیں دستک کی طرح
اپنے آنگن میں بھی مانند سحر جاتے ہیں

دیکھنے والے تجھے دیکھ کے جی لیتے ہیں
چاہنے والے تجھے دیکھ کر مرجاتے ہیں

جب کبھی وہ نہیں دیتا ہے ہمیں اذن سخن
لے کے ہم کاسہ اوصاف، ہنرجاتے ہیں

اور کیا دوگے چلو زخم ہی سی لیں مل کر
آج کل اچھے بھلے لوگ بھی مرجاتے ہیں

ہم کو اقبال متین اتنا بتاتے جانا
کبھی آنکھوں سے بھی اشکوں کے شرر جاتے ہیں

"ثبوت حق : نیاگرا!"
[امریکہ کا سفر نامہ]

ڈاکٹر سلیم اختر
"المورث"
C - iii - 569 جہاں زیب بلاک
علامہ اقبال ٹاؤن لاہور ۔۱۸

"اصلی تے وڈا :"

مارلین منرو کو جس فلم نے شہرت دی، اس کی نرم آواز کی حیثیت نمایاں کی اور خرام جنس کو اجاگر کیا۔ وہ تھی "نیاگرا" ۔ فلم کی عکس بندی نیاگرا پر ہوئی تھی۔ گویا ایک ٹکٹ میں دو مزے۔ مارلین منرو کی دید اور نیاگرا کی سیر! اب مارلین منرو نہ رہی اور فلم بھی صرف مجھ جیسوں ہی کو یاد رہ گئی فلم کے کوئی تیس برس بعد میں اصلی تے وڈا نیاگرا دیکھنے جا رہا تھا۔

خالد، طارق اور میں نے ویک اینڈ نیاگرا میں بسر کرنا تھا۔ سفر کوئی اڑھائی سو میل کا تھا۔ بی بی نے بڑے اہتمام سے لنچ کے سامان کے ساتھ کولڈ ڈرنکس بھی آئس بکس میں رکھ دی تھیں۔ سفر خوشگوار تھا، سڑک کے دونوں جانب جہلم کے گرد و نواح جیسی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں مگر زیادہ سرسبز و شاداب۔ دور کہیں کوئی گاؤں دکھائی دے جاتا جس میں تھرمس کی بوتل جیسے اناج گھر، رنگین تکونی چھتوں والے مکانات نیلے آسمان کا پس منظر، ہری چریا اوڑھے دھرتی اور کہیں کہیں کوئی ندی۔ گویا کیلنڈر کی تصویریں زندہ ہو گئی ہوں۔ سڑک کے کنارے ایک ہوائی اڈہ نظر آیا۔ چھوٹے چھوٹے جہاز کھلونوں جیسے۔ ایک لینڈ کرتا جہاز گویا کار کی چھت چھو گیا۔

آبشار کی مناسبت سے متصل شہر کا نام بھی نیاگرا ہے۔ چھوٹا سا قصبہ، صاف ستھرے لان، رنگین چوبی مکانات، مقامی آبادی بھانت بھانت کے بدرنگ سیاحوں کی وجہ سے یقیناً بدمزہ ہوتی ہوگی لیکن نیاگرا شہر کی اقتصادیات اور خوشحالی کا انحصار بھی ان ہی سیاحوں پر ہے۔ فائیو سٹار ہوٹل سے لے کر سستے ہوٹل تک ہر نوع کی رہائشی سہولتیں دستیاب ہیں خالد عیاشی کے موڈ میں تھا کسی بڑھیا سے ہوٹل میں کمرہ لینے کو کہہ رہا تھا مگر ہم نے منع کیا سارا دن گھومنا پھرنا ہو گا صرف رات کو خالص سونا ہے تو پھر کئی سو ڈالر کے کمرہ کا کیا مصرف؟ لہٰذا ایک ہوٹل میں ڈیرا ڈالا (جس کی مالکن الجزائری تھی) سامان رکھا اور چل دیئے نیاگرا کی جانب۔ جو ہم سے ملنے کی خاطر چالیس لاکھ برس سے گرجتا برستا فراز سے نشیب میں گر رہا تھا۔ نیاگرا کا تو علم نہیں لیکن میں یقیناً اس سے مل کر بہت خوش ہوا۔

"کس رزق سے موت اچھی"

طارق سارا راستہ پیزا پیزا کی رٹ لگاتا آیا تھا۔ پیزا مجھے بھی پسند ہے اور حسب استطاعت لاہور میں بھی کھا لیتا ہوں۔

جب دوپہر کا کھانا کھانے گئے تو طارق سیدھا اسی دوکان پر چلا گیا جہاں تازہ پیزا بن رہا تھا یہ اٹالین تھے (پیزا اٹالین ہے) جس طرح ہمارے ماہر پوری ساز ہوا میں پوری اچھالتے ہیں اسی طرح یہ ماہر اٹالین فٹ ڈیڑھ فٹ قطر کا پیزا ہوا میں اچھالتے ہیں جو بذات خود خاصہ اشتہاء افزا منظر ہوتا ہے۔ سیاحوں کا رش تھا اور طارق خاصی جد و جہد اور تاخیر کے بعد سالم پیزا لانے میں کامیاب ہوا تو خوشی سے نہال نظر آ رہا تھا اسے میز پر رکھا تو سوندھی سوندھی مہک سے منہ میں پانی آ گیا۔ طارق اس کے ٹکڑے کرنے کو تھا کہ خالد نے ٹوکا۔ اسی فلمی لہجہ میں جس میں ویلن مولوی صاحب کو عین نکاح کے وقت پر روک کر کہتا ہے۔

ٹھہرو ! یہ شادی نہیں ہو سکتی !
"کیوں ؟"
"دیکھتے نہیں اس میں سور کا گوشت ہے"
"کہاں ؟" طارق نے پوچھا
"یہ دیکھو !"
"یار خالد !" میں نے کہا" یہ تو سرخ ٹماٹر کے گول ٹکڑے ہیں اور بہت اچھے لگ رہے ہیں"
"یہی تو پورک ہے"
"تو اب ؟"
"اسے پنیر والا لینا چاہیے تھا"
میری بھوک اڑ گئی اور طارق کا منہ لٹک گیا۔ پیزا کی اشتہا انگیزی اب اشتہار بائی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ طارق ڈاکٹر ہے مگر ہمارا یہ معصوم بھانجا ہمارے لیے ابھی تک مناہی ہے۔ سو خالد غصے سے بولا۔
"بے وقوف منے ! مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا"
"اب کیا کریں ؟" اس نے بے چارگی سے پوچھا
"اسے پھینکتے ہیں اور کیا کرنا ہے"
اتنا مہنگا، گرما گرم اور ڈیڑھ فٹ قطر کا پیزا یوں ضائع کرنے کو جی نہ مانا میں نے مشورہ دیا اسے کسی فقیر کو دے دیتے ہیں۔
خالد نے کہا" اول تو یہاں فقیر نہیں دوسرے یوں کھانا کوئی بھی نہ لے گا اور تیسرے........"
طارق نے مردہ دلی سے پیزا، اس کا ڈبہ، پلاسٹک کی چمچیاں وغیرہ سب کچھ کوڑادان میں پھینک دیا۔ اب خالد نے ہماری رہنمائی کی ایک چھوٹی سی دوکان میں، پسینہ میں بھیگی لڑکی۔ بے حد مصروف لڑکی بھوکوں کو نمٹا رہی تھی۔ شاید یہ سپینش تھی، خالد نے اسی سے نہایت بدمزہ سبزیوں کا سوپ خریدا، جسے ہم نے دوا سمجھ کر پیا۔ اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی۔ بعض اوقات بدذائقہ کھانے علامہ اقبال کے اس شعر کا عملاً مطلب واضح کرتے ہیں۔

"قمقموں کا ڈسکو ڈانس :"

ایک چکر بازار کا لگایا۔ ونڈو شاپنگ کی۔ شاپنگ اس لیے ممکن نہ تھی کہ سیاحوں کی وجہ سے قیمتیں نیویارک سے بھی زیادہ تھیں۔ سوونیئر اور تحائف فروش کے علاوہ نیاگرا کے بارے میں ایک میوزیم اور ایک چھوٹا سا ویکس میوزیم بھی ہے۔
رات کو ایک بلڈنگ پر ڈسکو میوزک پر رنگین قمقموں کا ڈسکو ڈانس دیکھا۔ موسیقی کے زیر و بم کے ساتھ مختلف رنگوں کے جلتے بجھتے قمقمے اچھے لگے، یوں محسوس ہوتا گویا موسیقی کی لہروں نے برقی لہروں کا روپ دھار لیا ہو۔

"فطرت کی دریا دلی :"

فطرت نے بڑی دریا دلی سے کام لیتے ہوئے امریکہ اور کینیڈا میں آبشار تقسیم کر رکھا ہے۔ امریکی حصہ میں گیارہ سو فٹ چوڑا نیاگرا (۱۸۰) فٹ کی بلندی سے نیچے گرتا ہے جب کہ کینیڈا میں اڑھائی ہزار فٹ چوڑا نیاگرا (۱۷۰) فٹ کی اونچائی سے گرتا ہے اسی حصہ کو "گھوڑے کا نعل آبشار" (Horse Shoe Fall) کہتے ہیں۔ آبشار کا نعل والا حصہ کینیڈا میں ہے امریکہ میں اس کا صرف ۱۰ فیصد پانی گرتا ہے۔ تفریح کے علاوہ اس کے پرشور پانیوں سے بجلی پیدا کی جاتی ہے کینیڈا ضرورت سے زیادہ توانائی حاصل کر رہا ہے۔
دنیا میں نیاگرا کی ۱۸۰ فٹ بلندی کی مقابلہ سے زیادہ بلند اور خوبصورت آبشار بھی موجود ہیں افریقہ میں وکٹوریہ فال بہت مشہور ہے جنوبی

امریکہ کے بعض نسبتاً چھوٹے آبشار بھی خاصے دیدہ زیب ہیں لیکن نیاگرا کا جلال دیدنی ہے۔
آبشار کی مناسبت سے میں پہاڑی علاقہ کی توقع کر رہا تھا مگر یہ تو میدانی علاقہ نکلا۔ اس کا پانی کسی پہاڑ کی برفانی چوٹی یا گلیشیر کا مرہون منت نہیں بلکہ چار جھیلوں کا عطیہ ہے جن کا پانی نیاگرا ریور میں شامل ہو کر آبشار بناتا جھیل اونٹوریو میں مل جاتا ہے پھر یہ سب سینٹ لارنس ریور میں شامل ہو جاتے ہیں اور یوں یہ وسیع آبی خزانہ بحر اوقیانوس میں شامل ہو جاتا ہے۔
نیاگرا کی عمر چار سو ملین سال بتائی جاتی ہے۔
امریکہ اور کینیڈا کے لوگ ایک دوسرے کے علاقہ میں کام کاج کے لیے آزادانہ آتے جاتے ہیں، کینیڈین عورتیں نیاگرا کو "بازار" سمجھ کر شاپنگ کے لیے آتی ہیں۔ اب دوکانوں پر اشیاء کی زیادہ قیمتوں کی وجہ سمجھ میں آئی۔ جگہ جگہ کینیڈین اور امریکن کرنسی کے تبادلہ کے مراکز نظر آئے۔
نیاگرا میں جگہ جگہ سرخ میپل پتے (Maple Leaf) والا کینیڈین پرچم لہراتا دیکھا۔
کینیڈین سائڈ پر بڑے بڑے ہوٹل رات کو روشنیوں میں نہا رہے تھے۔ ایک مینار دیکھا جس کے باہر لگی دو لفٹیں سنیل کی رفتار سے چلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ رات کو ایک سرخ شمع روشن نظر آئی۔
دریا پر ایک پل مشترک سرحد پر چیک پوسٹ کا کام کرتا ہے لوگ آجا رہے تھے، ہم نے حسرت سے کینیڈا کی جانب دیکھا اور پھر درمیان میں ۱۸۰ فٹ گہرے سبز رنگ کے موجزن دریا کو دیکھا۔ نہ مجھے تیرنا آتا ہے اور نہ گھڑے (کچے یا پکے کی تخصیص نہیں) پر تیرنے کے فن سے واقفیت۔ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔
ہیلی کاپٹر سے بھی نیاگرا کی سیر کا بندوبست کیا گیا ہے دریا کے ارد گرد کے علاقہ اور آبشار کی پرواز یقیناً مسحور کن ہوگی۔

"ثبوت حق کے لیے:"

ٹکٹ لے کر اندر داخل ہونے پر ایک آہنی آبزرویشن ٹاور دکھائی دیتا ہے جس پر چڑھ کر ارد گرد کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں تیز ہوا گویا اڑائے لیے جا رہی ہو۔ نیچے جھانکیں تو گہرے سبز پانی کا ٹھاٹھ ادھر دیکھیں تو امریکن لینڈ سکیپ، ادھر دیکھیں تو کینیڈین محافظ !
دریا میں فیری آبشار کی جانب رینگتی جا رہی تھی۔ نیلے رین کوٹ میں ملبوس مسافر بلندی سے پنگوین جیسے لگ رہے تھے ایک فیری آرہی تھی دوسری جا رہی تھی چھوٹے چھوٹے دو کھلونے، کھلونے مسافر لیے۔ صرف سبز دریا اور ضخیم آبشار کی عظیم گرج حقیقی محسوس ہو رہی تھی۔
میں آبشار کے ارد گرد کی باتیں کر رہا ہوں مگر آبشار کا ذکر نہیں کر رہا تو اصل بات یہ ہے کہ الفاظ سے نیاگرا کی حقیقی منظر نگاری ناممکن ہے یہی نہیں بلکہ اسے دیکھ کر قلب و نظر کی کیفیات کا بھی ابلاغ ممکن نہیں۔ "دہریہ" جوش نے کہا تھا :

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

میں سمجھتا ہوں جوش نے اگر نیاگرا دیکھا ہوتا تو آبشار کے خروش جیسی نظم سے اسے بھی "ثبوت حق" قرار دیتا...... میں تو ڈل نثر لکھنے والا نقاد ہوں، ہم تو سنہری بالوں کی آبشار کے بارے میں لکھنے کا حق ادا کرنے کے اہل نہیں، نیاگرا کی منظر کشی بھلا کیا کر سکتے ہیں تاہم زندگی میں بعض مواقع، خوشیاں، لمحات ایسے بھی ہوتے ہیں جب انسان خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے یہ دن دیکھنے کے لیے مجھے زندہ رکھا۔ چنانچہ نیاگرا دیکھ کر بھی کچھ ایسی ہی خوشی اور سرشاری کا احساس ہوا۔
نیاگرا طویل عرصہ سے مصوروں، فوٹوگرافروں اور شاعروں کے لیے جو ایک زندہ چیلنج بنا ہے تو اسے دیکھ کر وجہ سمجھ میں آجاتی ہے۔
کسی زمانہ میں مہم جو حضرات نے اسے رسہ کے ذریعہ سے عبور کرنے کی متعدد کامیاب اور ناکام کوششیں بھی کیں۔ بعض جو زیادہ ہی نڈر تھے انہوں نے ڈرم یا گیند نما گولے میں بند ہو کر خود کو آبشار سے نیچے بھی گرایا اور اس سعی میں بیشتر جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ حتیٰ کہ حکومت نے ان نمائشوں پر پابندی لگا دی۔ مگر اس کے باوجود یہ آبشار مہمیز کرتا اور خون گرماتا رہتا ہے۔
رات کو جب اس پر طرح طرح کے رنگوں کی روشنیاں پھینکی جاتی ہیں تو اس منظر کا بعد اگنہ حسن ہوتا ہے۔ دن کو اس کی دھند قوس قزح کو جنم

دیتی ہے شاید اسی رعایت سے ایک پل کا نام "رین بو برج" رکھا گیا ہے۔ رات کو رنگ بدلتی روشنیوں میں نیاگرا دیکھا تو نگاہوں کی قوس قزح سولہ سنگھار کرکے نیاگرا کی دلہن بن کر آگئی ہے دریا کے پانی میں آبشار جھاگ پیدا کرتی ہے۔ جس سے بننے والی دھند دھوپ میں دھنک کے دائرے بناتی ہے ہم نے آسمان پر ہمیشہ دھنک کی قوس دیکھی ہے مگر یہاں دھنک دائرہ میں تھی جب تیز ہوا دھند کی دبیز چادر کو بکھرا دیتی تو دھنک کے دائروں میں رنگین ارتعاش پیدا ہو جاتا، یوں کہ دھنک لرزتی اور کپکپاتی محسوس ہوتی۔

"دھند کی نار" :

فیری میں بیٹھنے سے پہلے ہم سب کو بلیو رین کوٹ دئے گئے جنہیں ہم نے غیر ضروری سمجھ کر بے دلی سے پہن لیا بلکہ بٹن تک بند نہ کیے۔ جس فیری میں ہم سوار ہوئے اس کا نام "MAID OF THE MIST" تھا جو ماحول کی مناسبت سے موزوں بھی تھا اور شاعرانہ بھی بلکہ "LAKE POETS" میں کسی کی رومانی نظم کا عنوان محسوس ہوتا تھا۔ فیری نے سیاحوں کو حتی الامکان آبشار کے قریب ترین لے جانا ہوتا ہے اور وہ بتدریج آبشار کے قریب ہوتی جارہی تھی۔ پہلے دھند سی تھی۔ پھر پھوار سی اور پھر تو یوں محسوس ہوا گویا فیری کے اندر طوفان آگیا ہو ہم شرابور ہو رہے تھے بالوں سے پانی کی لہریں اپنے زور میں عینک کے شیشوں کو بہائے لیے جارہی تھیں۔ تیز ہوا کے جھکڑ اور سامنے چند گز کے فاصلہ پر ٹنوں پانی کے گرنے کا شور۔ شور تو میں نے لکھا ہے وضاحت کے لیے موزوں لفظ نہیں ملتا۔ میں نے کیمرہ بھیگی پینٹ کی جیب میں ٹھونس لیا مبادا لینس برباد ہو جائے۔ خالد نے بڑی مہارت اور محنت سے منظر کی عکس بندی کی لیکن جب آبشار کے مزید قریب ہوگئے تو اس نے بھی کیمرہ رین کوٹ کے اندر محفوظ کر لیا۔

اب ہم نیاگرا کے قریب تھے !

لاکھوں ٹن پانی کا خروش اعصاب پر عجب طریقہ سے اثر انداز ہو رہا تھا۔ دریا اور آبشار کے پانی کے ٹکراؤ سے بننے والی جھاگ اور پھوار بلند ہو کر دھند میں تبدیل ہو جاتی تھی قریب سے قریب تر ہوتی جارہی تھی اور پھر ہم نیاگرا کے قریب ترین ہوگئے۔ آبشار کا شور براہ راست دل پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا گویا پانی کا مخالف ریلا فیری کو عین آبشار کے نیچے کر دے گا اور ہم سب آبی چادر میں لپٹ کر رہ جائیں گے لیکن اگلے ہی لمحہ فیری مڑتی ہے۔ ہم آبشار سے دور ہوتے جارہے ہیں۔

ہم مکمل طور پر بھیگ چکے تھے چنانچہ فیری سے اترتے ہی دریا کے کنارے بیٹھ گئے اور جو کچھ جسم سے الگ کیا جاسکتا تھا سوکھنے کو ڈال دیا۔ ادھر گرد نگاہ دوڑائی تو سیاحوں کی کثیر تعداد کا اندازہ ہوا۔ یورپین کے علاوہ جاپانی، کورین، فلپینی، ہندوستانی، سکھ اور ہم پاکستانی۔ الغرض ہر نسل، رنگ اور زبان بولنے والوں کا اژدحام تھا۔ سب خوش، فکر فردا سے بے نیاز، تعطیلات کے لطف میں مگن، نیاگرا کی تصویریں، مناظر کی تصویریں، اپنے ساتھیوں، دوستوں اور حسینوں کی تصویریں بنانے میں مگن !

ایک نیاگرا ادھر اور خوشیوں کے ان گنت نیاگرا ادھر !

کچھ گیلے ہماری مانند خود کو سکھا رہے تھے۔ ایک جل پری سنہری بالوں کے تکیہ پر دھوپ میں خود کو خشک کر رہی تھی یہ بھی MAID OF THE MIST ہی تھی مگر نوعیت جداگانہ تھی کہ اسے دیکھ کر خدائے خشک و تر یاد آجائے۔ اسی کے قریب بیٹھا مردہ مچھلی سا لڑکا، عینک کے شیشے خشک کرتا قطعاً نہ بھایا۔ میں نے جل پری کی تصویر بنانے کا سوچا لیکن ایک مہینہ میں ہی اتنا کچھ دیکھ چکا تھا کہ اب ایسے مناظر میرے بلڈ پریشر کا کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے۔

"نادان حسینہ" :

ہم اوپر دریا کے کنارے پر اور آبشار کے بالائی حصہ پر آجاتے ہیں یعنی وہ جگہ جہاں سے دریا نیچے دھڑام سے چھلانگ لگا دیتا ہے بالائی منظر بھی خوبصورت تھا۔ دریا کے کنارے، پل پر، طبقہ سبزہ زاروں پر۔ الغرض ہر طرف بے فکروں کا ہجوم تھا اور کیمرے ہی کیمرے۔ میرا اندازہ ہے کہ نیاگرا پر ہر روز بلا مبالغہ میلوں کے حساب سے فلمیں اترتی ہوں گی مگر یار لوگ بیوٹی ہو تھی سامنے لا کر منظر کا حسن داغدار کر دیتے ہیں جب کہ میں منظر

کی صرف بطور منظر تصویر کشی کا قائل ہوں۔ یعنی وہ منظر اپنے منظر میں نہ تبدیل ہو جائے۔ بعض لوگوں کی خود پرستی طرح طرح سے تصویریں اتروا کر تسلی پاتی ہے اس کی ایک مثال میں واشنگٹن کے آرلنگٹن قبرستان کے سلسلہ میں لکھ آیا ہوں ایک اور کا مظاہرہ یہاں بھی دیکھا۔
پارک میں ایک بڑا سا مجمع دیکھا ایک گڑیا سی جاپانی لڑکی قہقہے لگاتی مجسمہ کی گود میں جا بیٹھی۔ اس کے ساتھیوں نے ہنستے ہنستے اس کی تصویریں بنائیں۔ معلوم نہیں اس مادام کو انسانوں بھری گرم آغوش اور سرد اور بے حس ننگی گود کا فرق محسوس بھی ہوا یا نہیں؟

"دھوکہ باز نیاگرا":

عام لوگوں کو اندازہ نہیں لیکن امریکہ میں نیاگرا دو حصوں میں منقسم ہو کر گرتا ہے اور ان دونوں حصوں کے درمیان خشکی کا چھوٹا سا حصہ LUNA ISLAND (جس کا ترجمہ جزیرہ مہتاب کیا جا سکتا ہے یا پھر اسے "چاند نگر" کا نام بھی دیا جا سکتا ہے) کہلاتی ہے۔ آبشار کا بڑا حصہ "امریکن فال" اور چھوٹا حصہ BRIDAL VEIL FALL (عروسی نقاب) کہلاتا ہے لیکن فاصلہ، بلندی اور پانی کے زور کی وجہ سے ایک ہی آبشار دکھائی دیتا ہے۔

آبشار کے ساتھ ایک خشک جگہ پر نئے نکور سکے چمک رہے تھے میرے استفسار پر خالد نے بتایا کہ سکہ پھینک کر وش کرتے ہیں اس پر مجھے روم کا وہ مشہور فوارہ یاد آگیا جس میں سکہ پھینک کر منت مانی جاتی ہے اور اس مقام پر ایک دلچسپ فلم بنائی گئی تھی "THREE COINS IN A FOUNTAIN" انسان امریکہ کا ہو یا اٹلی کا یا پاکستان کا وہ ہمیشہ ہی خواہشات کے بھنور ہی میں رہتا ہے۔

ہم نے بھی سکے پھینکے!

میں نے وش کیا کہ اگلی مرتبہ میں اہل خانہ کے ساتھ یہاں آؤں۔ مگر تین سال میں بات نہ بنی۔ سکہ ضائع گیا۔ نیاگرا نے دھوکہ دیا۔

"دھنک کے پھول":

نیچے دریا کو جھانک کر دیکھا تو نیلے رین کوٹ میں لوگوں کو آبشار کے نیچے جاتے پایا شاید یہ تشبیہہ اچھی نہیں مگر میلے کفن پہنے آدمی جہنم میں سزا بھگتنے والے مردے یاد آگئے۔

آبشار کے اس حصہ کا "VALLEY OF WIND AND MIST" (ہوا اور دھند کی وادی) نام رکھا گیا ہے اور سیاحوں کو بڑے آبشار کے نیچے اور قریب ترین مقام تک سیر کے لیے لے جانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ہم بھلا کیوں پیچھے رہتے۔

اس مرتبہ رخت سفر کے طور پر پیلا رین کوٹ اور ربڑ کے لمبے لمبے جوتے دئے گئے لیری کے سلسلہ میں ہاتھ لگ چکے تھے۔ سو اس مرتبہ کمال احتیاط سے رین کوٹ کے بٹن بند کر کے ٹھیک طرح سے ربڑ کے جوتے پہنے۔ ہم آبشاری سفر کے لیے تیار تھے۔

لکڑی کی ریلنگ والا تنگ سا چوبی راستہ ہمیں قدم قدم نیاگرا سے قریب کر تا جا رہا تھا۔ ایک چوبی پلیٹ فارم آیا جہاں دم لینے اور گرد و پیش کا جائزہ لینے کو رکے۔ تیز ہوا اور آنکھوں کے سامنے گویا دریا الٹ آیا ہو۔ دھند گویا اور گرد پیلے، سفید، سیاہ، سلیٹی اور کائی زدہ پتھروں سے پھوٹ رہی ہو اور پھر میں نے وہ منظر دیکھا جو شاید نیاگرا ہی دکھا سکتا تھا میرے ارد گرد دھنک کا دائرہ اور میں اس کا مرکز! یوں کہ ہاتھ بڑھا کر دھنک کو رین کی طرح پکڑ لوں دھنک کے رنگوں سے اپنی پوریں رنگین کر ڈالوں رنگوں کے پھول چرا لوں۔

ہم آگے بڑھتے ہیں تھوڑا سا چلنے کے بعد زیر آبشار آبی سفر کا آخری پڑاؤ یعنی ایک اور چوبی پلیٹ فارم ہے "ہری کین" کا بہت مناسب نام دیا گیا ہے جس کے قریب ہی آبشار کی دھواں دار بارش میں بھیگتے لکڑی کے ایک تختہ پر "نو سموکنگ" لکھا گیا تھا۔ میں ہنسا یہ وہ جگہ تھی جہاں سگریٹ پینا تو کہاں سلگانا بھی ممکن نہ تھا۔

نیاگرا کے اس سے زیادہ قریب یا مزید نیچے جانا ممکن نہ تھا۔ ہم اب بھی بہت ہی قریب تھے اتنے کہ وہ ذرا سا اچک کر لاکھوں ٹن والے آبشار سے اپنے حصے کی ایک چلو بھر لو۔ نیاگرا کی گرج نے پہلی مرتبہ دل کی دھڑکن کو تیز کیا۔ تیز ہوا اور جسم میں خنکی کا احساس پیدا کر رہی تھی۔ ارد گرد انگڑائیاں لیتی دھند میں دھنک کے چھوٹے چھوٹے پھول۔ عجب دیدنی منظر تھا۔ خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا!

ٹی۔اے۔باقری
Lane Opp. Zamarud Talkies.
Abids. Hyderabad (A.P)

الیکشن ۱۹۹۵ء اور مسٹر سیشن

نیتاؤں کے اذہان پہ چھایا ہوا سیشن
ہے سر سے کفن باندھے مٹانے کو کرپشن
اب دیکھئے کس رنگ سے ہوتا ہے الیکشن
قربان ترے عزم و ہدایات کے سیشن
کیا خوب منظم ہوئے اس بار الیکشن

دن میں بھی نظر آگئے نیتاؤں کو تارے
کچھ کر نہ سکے دولت و طاقت کے سہارے
سیشن کے فرامین سے بے بس تھے بچارے
قربان ترے عزم و ہدایات کے سیشن
کیا خوب منظم ہوئے اس بار الیکشن

ویسے تو یہ ووٹنگ میں چلا کرتا تھا چکر
اس دیش کو درکار تھا اک آہنی پیکر
تو بن گیا ووٹر کے مقدر کا سکندر
قربان ترے عزم و ہدایات کے سیشن
کیا خوب منظم ہوئے اس بار الیکشن

افزار جداگانہ ہیں میٹنگ ہو کہ فنکشن
محفلوں ہوا کرتے ہیں نیتاؤں کے بھاشن
پرچار کر کرکے دیا کرتے ہیں درشن
قربان ترے عزم و ہدایات کے سیشن
کیا خوب منظم ہوئے اس بار الیکشن

افراد کے کردار کی پہچان ہے نیشن
جنتا کا مقدر بھی ہے نیتا کا سنگھاسن
ویسے بھی تو ممکن نہیں اک دم ریولیوشن
قربان ترے عزم و ہدایات کے سیشن
کیا خوب منظم ہوئے اس بار الیکشن

دیمک کی طرح دیش کو چاٹے ہے کرپشن
بیدار ہو گر قوم تو ممکن ہے کریکشن
بہتر ہے کہ اس دیش کا ہر فرد ہو سیشن
قربان ترے عزم و ہدایات کے سیشن
کیا خوب منظم ہوئے اس بار الیکشن

اس بار تو جو کچھ بھی ہوا کرگئے سیشن
آگے بھی مراحل سے ہے دوچار الیکشن
نیتاؤں کے، لگتا ہے، سدھر جائیں گے لچھن
قربان ترے عزم و ہدایات کے سیشن
کیا خوب منظم ہوئے اس بار الیکشن

اقبال حسین آزاد
شاہ کالونی
شاہ زبیر روڈ
مونگیر ۸۱۱۲۰۱

حرام۔ حلال

السائی السائی سی دھوپ ابھی ابھی نکلی تھی۔ چاروں طرف ہلکا ہلکا کہاسا چھایا ہوا تھا۔ رات اس قدر اوس گری تھی گویا بارش ہوئی ہو کرمتے نے گرم چادر کو چاروں طرف کس کر لپیٹ لیا اور بیڑی کا آخری کش کھینچتے ہوئے لوٹا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پھر ہلکے ہلکے قدموں سے اپنی کوٹھری کی جانب چل پڑا۔ پہلی گلی ختم ہونے کے بعد وہ جیسے ہی دوسری گلی میں مڑا ٹھٹھک کر رک گیا۔ سامنے چھیدن ناجو کا راستہ روکے کھڑا تھا اور ناجو اس سے بچ نکلنے کا راستہ تلاش کر رہی تھی۔

"سالا حرامی!" غصے کی ایک تیز لہر کرمتے کے رگ پے میں دوڑ گئی اور اس نے لوٹا زور سے زمین پر پٹک دیا۔ گلی کا سناٹا بکھر گیا۔ چھیدن چونک کر مڑا اور لال پیلے ہوتے ہوئے کرمتے کو دیکھ کر ہنستا ہوا گلی کے موڑ سے غائب ہو گیا۔ اس کی طنزیہ ہنسی کرمتے کو اندر ہی اندر سلگا گئی۔ اس کا سارا جسم بھٹی کی طرح سلگنے لگا۔ سخت سردی کے موسم میں بھی اسے گرمی محسوس ہونے لگی اور اسے ایسا لگا گویا گرم چادر نے جلتے ہوئے شعلوں کی طرح اسے چاروں طرف سے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو۔ وہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ بے حس و حرکت، پتہ نہیں کتنی دیر تک۔ اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ ناجو کب اس کے قریب سے ہو کر اگلی گلی میں گم ہو گئی۔ کسی کے قدموں کی چاپ سے گویا وہ جاگ پڑا۔ سامنے سے رحمو آرہا تھا۔ اس نے اپنے حواس مجتمع کئے اور گویا شعلوں پر چلتا ہوا اپنی کوٹھری کے پاس پہنچا۔ کوٹھری کے اندر داخل ہونے کے بعد اس نے اپنے جسم سے چادر اتار پھینکی اور پھر دھم سے کھاٹ پر گر پڑا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور سینہ تیزی کے ساتھ پھول پچک رہا تھا۔ اس نے اپنی مٹھیوں کو زور سے بھینچا، بازوؤں کی مچھلیوں پر ہاتھ پھیرا، سینے کی چوڑائی کا اندازہ کیا۔ اسے لگا جیسے وہ بہت طاقتور ہے۔ اس کے تصور نے اڑان بھری اور وہ پھر اسی گلی میں پہنچ گیا۔ چھیدن ناجو کا راستہ روکے کھڑا تھا اس نے زور سے چھیدن کو للکارا۔ اپنے سامنے کرمتے کو دیکھ کر چھیدن کا رنگ سفید ہو گیا۔ اس نے بھاگنا چاہا مگر کرمتے کے لمبے بازوؤں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور پھر اس نے چھیدن پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر دی۔ اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے، اس کے بال نوچ ڈالے اور اسے اتنا مارا، اتنا مارا کہ اس کی ناک سے خون بہنے لگا مگر کرمتے کے ہاتھ چلتے ہی جا رہے تھے، چلتے ہی جا رہے تھے۔

"پگلا گیا ہے کا رے؟ ایسے ایسے کا کر رہا ہے؟" ماں کی آواز سن کر جیسے وہ اپنی دنیا میں واپس آگیا۔ یہاں نہ ناجو تھی اور نہ چھیدن۔ وہ تو بس ہوا سے لڑ تا رہا تھا اتنی دیر تک۔ اس نے ماں کو خونخوار نظروں سے دیکھا اور پھر اٹھ کر باہر نکل پڑا۔

باہر نکل کر اس نے اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی سر پر گرد جمی تھی کپڑے گندے ہو چلے تھے۔ چھ ماہ۔ صرف چھ ماہ قبل تک وہ ایسا نہ تھا۔ روز نہاتا، سر میں تیل ڈالتا، صاف ستھرے کپڑے پہنتا اور پھر اپنا رکشہ لے کر سڑکوں پر نکل پڑتا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ اس نے مڈل تک تعلیم حاصل کی تھی۔ ماں کی خواہش تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے مگر اس کی قسمت میں تو اپنے مرے ہوئے باپ کی طرح رکشہ چلانا لکھا تھا۔ رکشہ تو وہ گھر کا خرچ چلانے کے لئے چلاتا تھا مگر اس کا یہ بننا سنورنا وکیل صاحب کی چھوٹی بیٹی ثریا کے لئے تھا جسے اسکول پہنچانا اور پھر اسکول سے واپس لانا اس کی ڈیوٹی میں شامل

تھا۔ ثریا ایک سیدھی سادی شرمیلی سی لڑکی تھی۔ اسے دیکھ کر کرمتے کے دل میں نہ جانے کیسے کیسے خیالات آتے تھے۔ جب وہ اسے اپنے رکشہ پر لے کر نکلتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ اس کا رکشہ نہیں بلکہ اڑن کھٹولہ ہے اور وہ ثریا کے ساتھ آسمان کی بلندیوں کی سیر کر رہا ہے۔ ثریا کے سامنے وہ حد سے زیادہ مہذب اور شائستہ بننے کی کوشش کرتا رہتا۔ جب ثریا اس کے رکشے پر بیٹھی ہوتی تو وہ دھیرے دھیرے پیڈل گھماتا تاکہ ٹوٹی پھوٹی سڑک کے ہچکولوں سے وہ محفوظ رہے۔ جب اسکول میں چھٹی رہتی تو وہ بجھ سا جاتا۔ اس کے ساتھی اسے چھیڑتے۔

"کیوں رے، منھ لٹکائے کاہے بیٹھا ہے؟"

کوئی دوسرا بول اٹھتا

"سالا اسکول بند ہے آج"

وہ بگڑ اٹھتا

"چپ سالے، کھبردار جو آگے کچھ کہا تو ....." اور وہ سب کھی کھی کر کے ہنسنے لگتے۔

ایک دن جب وہ ثریا کو گھر پہنچا کر مڑنے ہی والا تھا کہ اندر سے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ یہ ناجو تھی۔ چودہ پندرہ سال کی قیامت۔ کرمتے آنکھیں لال پیلی کرتے ہوئے بول پڑا۔

"دیکھ کر نہیں چلتی ہے کا؟" مگر بجائے کوئی جواب دینے کے وہ ایک بیباک سی ہنسی ہنستے ہوئی آگے بڑھ گئی۔

"سالی چلتی کیسے ہے؟" اس نے جیسے خود سے کہا اور پھر رکشہ پر سوار ہو کر گھنٹی بجاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ناجو کا باپ ایک غریب چڑی مار تھا۔ پہلے وہ کسی گاؤں میں رہتا تھا۔ پھر روزی روٹی کی تلاش میں اسے شہر آنا پڑا۔ اس کے گھر میں کل سات افراد تھے۔ اس کی بیوی، ایک بیٹا، بہو۔ ان کے دو بچے اور ناجو۔ چڑی مار اور اس کا بیٹا تو پرندوں کو پکڑنے اور بیچنے کے کام میں لگ گئے جب کہ اس کی بیوی، بہو اور بیٹی ناجو الگ الگ گھروں میں کام کرنے لگیں۔ ناجو ان دنوں ثریا کے گھر پر کام کرتی تھی۔ صبح جب وہ ثریا کو لینے پہنچتا تو ناجو گھنٹی کی آواز سن کر باہر نکل پڑتی۔ وہ جب اسے واپس پہنچانے جاتا اس وقت بھی ناجو کسی نہ کسی بہانے باہر نکل آتی اور اسے دیکھ کر بڑی بیباک سی ہنسی ہنستی۔ بڑی گول آنکھیں، پھولے پھولے سانولے گال، موٹے موٹے بھیگے ہوئے ہونٹ اور ان سب سے بڑھ کر دو سرکش چٹانیں جن سے کرمتے کی آنکھیں الجھ الجھ جاتیں۔ اس کے سارے جسم میں تناؤ پیدا ہونے لگتا اور وہ بے خیالی میں ہونٹ چبانے لگتا۔ جب وہ اپنے جسم میں بجلی بھاتی اس کے سامنے سے گزرتی تو وہ گویا اپنے آپ سے بول پڑتا۔

"سالی چلتی کیسے ہے"۔

ایک دن وہ چڑی مار کے گھر کے قریب سے گزرا تو دیکھا کہ اس کی بہو گھر کی دہلیز پر بیٹھی بال سنوار رہی تھی۔ ناجو ابھی ابھی کسی طوفانی ہوا کی طرح ادھر سے گزری تھی۔ کرمتے چڑی مار کی بہو سے بول پڑا۔

"ای لڑکی ادھر ادھر اتنا بوڑاتی کاہے ہے؟"

"اور کا کرے؟ اوہاں گاؤں میں مولی صاحب سے پڑھتی تھی ایہاں کام کرنا پڑے ہے"۔

"اس کا سادی کاہے نہیں کر دیتی ہو؟"

"کون کرے گا اس سے سادی؟" چڑی مار کی بہو نے گویا اسے للکارتے ہوئے کہا۔

"ہم کریں گے۔" اس نے سینہ پھلا کر کہا اور بس شادی طے ہو گئی۔ ایک نیا رکشہ، گھڑی، ٹرانزسٹر اور ایک ہزار نقد پر معاملہ طے ہوا۔ چڑی مار گاؤں میں اپنا پشتینی مکان بیچ کر آیا تھا۔ کچھ محلے والوں نے مدد کی۔ شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔ ایک دن کرمتے کے ساتھی جمرو دے نے اس سے پوچھا۔

"کیوں رے، تے تو وکیل صاحب کی بیٹی سے عشک کرتا تھا اس سے کاہے سادی کر رہا ہے؟"

کرمتے نے فلسفیانہ انداز میں آنکھیں سکوڑ کر جواب دیا۔

"دیکھ بیٹا، کوئی جروری نہیں کہ جس سے عشک کیا جائے، سادی بھی اسی کے ساتھ ہو اور پھر اوہیں بڑے لوگ اور ہم ٹھہرے گریب رکسا چالک، کا سمجھے؟"

تو اور کوئی دوسری لڑکی نہیں ملی تھی کا، ای بوڑاہی سے کاہے سادی کر رہا ہے؟"

"بیٹا، سادی ہو جانے دو، پھر دیکھو اس کو کیسے ٹپ ٹاپ بنا کر رکھتے ہیں۔ سری دیوی کی طرح"۔

شادی ہو گئی اور کرمتے نے ناجو کو ٹپ ٹاپ بنانے کا کام شروع کر دیا۔ اب وہ فیشن کے کپڑے پہن کر چھوٹے چھوٹے قدموں سے ٹھمک ٹھمک کر چلنے لگی تھی۔ کرمتے نے شام کو رکشہ چلانا چھوڑ دیا اور روز

ماجو کو لے کر گھومنے نکل جاتا۔ کرمتے حسب معمول ثریا کو اسکول پہنچاتا
رہا اور ماجو ثریا کے گھر پر کام کرتی رہی۔ چند ماہ بڑے آرام سے گزرے
مگر ایک دن اس کے گھر کا سارا سکون درہم برہم ہوگیا۔ اس دن ماجو
جب اپنے گھر کا سامان ٹھیک کر رہی تھی تو اسے ایک خط ملا۔ یہ خط کرمتے
نے غالباً اپنی شادی سے قبل ثریا کے نام لکھا تھا مگر یا تو ثریا تک پہنچانے
کی اس کی ہمت نہ ہوئی تھی یا پھر شاید اس نے یہ خط صرف اپنے دل کا
بوجھ ہلکا کرنے کے لئے لکھا تھا۔ خط پڑھ کر ماجو کے اندر جیسے کوئی ناگن
انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے خط اپنے بلاؤز میں ٹھونسا اور ثریا کے
گھر کام کرنے پہنچ گئی اور پھر جھاڑو دیتے دیتے اس نے چپکے سے وہ خط
زمین پر گرادیا۔ ثریا کی امی سامنے چوکی پر بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھیں۔
ماجو نے گویا انجان بنتے ہوئے وہ خط زمین پر سے اٹھایا اور ان کی طرف
بڑھاتے ہوئے بولی۔

"دیکھئے تو امی کاگز کام کا ہے کا؟" ثریا کی امی نے کاغذ کھول کر
دیکھا تو ان کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وکیل صاحب کورٹ جانے کے لئے گھر
سے نکلنے والے تھے۔ انہوں نے فوراً وہ خط وکیل صاحب کو دکھایا۔
وکیل صاحب تیا کی آدمی تھے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سیدھے تھانے
پہنچ گئے۔ حوالدار ان کا شناسا تھا۔ انہوں نے حوالدار سے کہا۔

اس حرام زادے کرمتے کو پکڑ کر اتنا مارے کہ دماغ درست
ہوجائے سالے کا"۔ چنانچہ پولیس آئی اور کرمتے کو پکڑ کر لے گئی۔ تین
دنوں تک اس کی خوب دھنائی ہوئی اور چوتھے دن جب وہ چھوٹ کر آیا
تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ گھر پہنچتے ہی ماجو کی چوٹی پکڑ کر گھر
سے باہر گھسیٹا اور تین بار زور سے بولا۔

"طلاک!"

"طلاک!!"

"طلاک!!!"

ماجو پہلے تو ہکا بکا سی کھڑی رہی اور پھر روتی ہوئی اپنے باپ کے
گھر کی جانب چل پڑی۔ اس دن پورے محلے میں یہی چرچا تھا کہ کرمتے
نے ماجو کو طلاق دے دی۔ چڑی مار پہلے تو بہت پریشان ہوا اور پھر اسی
پریشانی کے عالم میں محلے کے چند لوگوں کے ساتھ سیدھے خانقاہ جا پہنچا۔
بڑے پیر صاحب کے سامنے پورا واقعہ بیان کیا گیا۔ انہوں نے کافی دیر
تک بڑی ہی فصیح و بلیغ زبان میں نہ جانے کیا کیا فرمایا مگر چڑی مار کی سمجھ
میں صرف اتنا آیا کہ

"طلاق ہوگئی۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے حرام ہیں"۔

چڑی مار خانقاہ سے نکلا تو سیدھے تاڑی خانے میں داخل ہوگیا۔
پے در پے کئی گلاس اپنے اندر انڈیلنے کے بعد جب وہ ڈگمگاتا ہوا گھر
واپس آیا تو ماجو کا جھونٹا پکڑ کر بولا۔

"ہے دونوں اب ایک دوسرے کے لئے حرام ہے حرام کا بھی
حرام؟"

کرمتے اور ماجو کے راستے الگ الگ ہوچکے تھے مگر ایک ہی محلے
میں رہنے کے باعث کبھی کبھی ایک دوسرے پر نظر پڑجاتی۔ ماجو پھر
پہلے جیسی چال چلنے لگی تھی۔ محلے کے لونڈے اسے دیکھتے تو آنکھ مار کر
کہتے۔

"گھبراؤ مت جانی، ہم لوگ ہیں۔" کرمتے کے کانوں تک یہ آواز
پہنچتی تو وہ اندر ہی اندر کھول کر رہ جاتا۔ پھر اسے چھیدن کی وہ طنزیہ
ہنسی یاد آجاتی۔ اسے ایسا لگتا جیسے اس کی عزت کوئی کھلونا ہے جس سے یہ
لونڈے کھلواڑ کر رہے ہیں۔ ایک دن وہ ماجو کا رستہ روک کر کھڑا
ہوگیا۔

"تے ادھر ادھر اتنا بوڑاتی کاہے ہے؟ گھبردار ......"

ماجو پلٹ کر بول پڑی

"اب کاہے کا رے؟ اب تو طلاک ہوگئی"۔ اور اتنا کہہ کر وہ
اپنے راستے آگے بڑھ گئی۔ کرمتے جیسے کمزور ہوگیا اس ایک جملے سے جاتی
ہوئی ماجو کو گویا اس نے پکار کر کہا۔

"گسے میں کہہ دیا تو طلاک ہوگیا کا؟" مگر شاید ماجو نے اس کی
بات سنی ہی نہیں۔ کرمتے نے اس دن رکشہ نہیں نکالا۔ دو تین بار
ادھر ادھر کا چکر لگانے کے بعد وہ سیدھا قبرستان پہنچ گیا اور ایک قبر کے
کتبے سے ٹیک لگا کر سوچتا رہا۔

گسے میں کہہ دیا تو طلاک ہوگیا کا؟" اس کا ذہن جیسے اس جملے کی
گردان کرنے لگا اور اسے ایسا لگا جیسے یہ سب کچھ ڈھکوسلہ ہے، ڈھونگ
ہے، جھوٹ ہے، فریب ہے۔ ماجو اس کی ہے۔ اس کی بیوی ہے۔ اس
کی عزت ہے اور اس کی عزت سے یہ لونڈے کھلواڑ کر رہے ہیں۔ لوگ
کہتے ہیں کہ اب وہ اس کی بیوی نہیں رہی۔ کیا میاں بیوی کا رشتہ ایک
کچا دھاگا ہے جو تین لفظ کہنے سے ٹوٹ جاتا ہے، کیا غصہ اتنی بری چیز ہے
؟ اسے یاد آیا کسی نے ایک بار اس سے کہا تھا کہ غصہ حرام ہے۔ ہاں غصہ
حرام ہے۔ تبھی تو اب اس کی بیوی اس کے لئے حرام ہوگئی ہے۔

غصہ حرام ہے!
غصہ حرام ہے!!
اس نے واقعات کے سرے ملانے شروع کئے تو اسے ایسا لگا جیسے سارا قصور اسی کا تھا۔ اپنی غلطی پر نادم ہونے کے بجائے اس نے ماجو پر سارا غصہ اتارا اور اب اسے اپنے عمل کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ اکیلے ہی۔ اور پھر اس کے دماغ کی رگوں میں اچھلتا ہوا خون نارمل انداز میں دوڑنے لگا۔ اس کے اندر کا ابال دھیرے دھیرے بیٹھنے لگا۔ کھولتا ہوا پانی جیسے چولہے پر سے اترنے کے بعد دھیرے دھیرے پرسکون ہوجاتا ہے وہ بھی پرسکون ہوتا گیا اور پھر یہ پانی اس کی آنکھوں کے راستے بہہ بہہ کر اس کے گالوں کو بھگونے لگا۔

شام ہو چلی تھی۔ قبرستان میں ہر طرف سناٹا تھا، سکون تھا۔ آسمان پر چڑیوں کا جھنڈ اپنے آشیانوں کی طرف اڑا جارہا تھا۔ اسے ان پرندوں پر رشک آنے لگا جو اپنا ایک آشیانہ رکھتے ہیں اور وہ تو اب ایک ایسے پرندے کی مانند تھا جو شام کو اپنے گھر کا راستہ بھول کر کسی ڈال پر بیٹھ جاتا ہے اور صبح ہونے کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ پتہ نہیں اس کی زندگی میں وہ صبح پھر کبھی آئے گی یا نہیں۔ وہ روتا رہا اور سوچتا رہا یہاں تک کہ رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا مگر وہ اسی قبر سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ رات کے اندھیرے میں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بھی اس قبر کا ایک حصہ ہے۔

بقیہ :- وابستگی

جانے کتنے چھن، لمحے، ساعتیں گزری ہوں گی کہ وہ دھیرے سے اٹھا۔
"کہاں چلے"
"میں تھکا، سو گئیں۔۔۔" وہ جہاں تھا وہیں ساکت ہوگیا۔
"عمر ڈھل گئی۔۔۔ منانا بھی نہیں آیا !!!"

بقیہ : ادبی سرگرمیاں

کے بعد وسیم بھنائی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ تقریب میں محمد شبیر علی محمدوی عرفان احمد انصاری، زبیر عالم، عمر ماز، فیروز نعمان آزر نے بھی اپنے تاثرات پیش کئے۔

قتیل شفائی کے مجموعے
"رنگ۔ خوشبو۔ روشنی" کی رسم اجرا

انڈین کلچرل سوسائٹی نئی دہلی کے زیر اہتمام مورخہ ۱۱/ مارچ 1995ء کو ایوان غالب ماتا سندری لین نئی دہلی میں قتیل شفائی کے نئے مجموعے "رنگ، خوشبو، روشنی" کی رسم اجرا شری ایچ کے ایل بھگت سابق مرکزی وزیر نشر و اشاعت اور جناب فاروق عبداللہ سابق وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر نے مشترکہ طور پر کیا۔ اس کتاب کو مکتبہ جامعہ نے قتیل صاحب کے غزلوں کے دس مجموعوں سے انتخاب کرکے نہایت اہتمام سے چھاپا ہے۔ اجرا کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے بھگت صاحب نے فرمایا کہ مجھے اس کتاب کا اجرا کرتے ہوئے دلی مسرت ہو رہی ہے کہ قتیل صاحب پاکستان سے تشریف لائے ہیں اور ان کا یہ مجموعہ ہندوستان میں شائع ہوا ہے جو قتیل صاحب کی ہندوستان میں مقبولیت اور دونوں ملکوں کی آپسی محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ فاروق عبداللہ صاحب نے فرمایا کہ ادب اور ادیب و شاعر کسی ایک ملک کی میراث نہیں ہوتے یہ لوگ دونوں ملکوں کے تعلقات میں بہتری لانے کے لئے اچھے سفیر ثابت ہوتے ہیں۔ قتیل صاحب کے مجموعے کا ہندوستان میں شائع ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ اردو کسی خاص خطے کی زبان نہیں ہے۔ یہ ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ بھگت صاحب اور فاروق عبداللہ صاحب کی فرمائش پر قتیل صاحب اور پاکستان سے تشریف لائے شاعر اطہر جاوید صاحب نے اپنی غزلوں اور نظموں سے سامعین کو مستفید کیا اور مارننگ سالی نے بھگت صاحب، فاروق عبداللہ صاحب، منتظمین اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اس کے بعد سٹیج میکائل امروہی صاحب نے سنبھال لیا اور انڈین کلچرل سوسائٹی کے زیر اہتمام باقاعدہ مشاعرہ کا آغاز جناب بھگت رام جین ایم پی اور شمیم صدیقی صاحب وائس پریذیڈنٹ دہلی پردیش کانگریس نے شمع روشن کرکے کیا جس میں ہندوستان سے تشریف لائے جانے پہچانے شاعروں نے اپنے کلام سے مستفید فرمایا۔

مبارک شمیم (ایمن زئی، شاہجہاں پور)

غزل

اتنا تو آپ خود کو ہنر ور بنائیے
حرفوں سے کرب روح کا پیکر بنائیے

یوں کیجئے نہ منت صحرا قدم قدم
صحرا حصار ذات کے اندر بنائیے

ہے شرط مصلحت کے مغیلان دشت کو
اپنا لہو پلا کے تناور بنائیے

آثار کہہ رہے ہیں قیامت ہے آس پاس
برتے گا کون کس کے لئے گھر بنائیے

موتی ملیں گے دجلہ جاں میں صدف صدف
دریائے جاں کا خود کو شناور بنائیے

دشوار مرحلے سفر غم میں آئیں گے
اپنے سوا کسی کو نہ رہبر بنائیے

ہو دسترس شمیم تو قرطاس ذہن پر
حالات ناگزیز کے منظر بنائیے

○○○

یوں گزاری ہم نے اپنی عمر کی راہ طویل
بے بصیرت ہم سفر تھا راستہ بے سنگ میل

ٹوٹے خوابوں کی نہ ہم کو اب کوئی سوغات دے
دوستو اس راہ میں ہم ہوچکے ہیں خود کفیل

اہل گلشن کے لئے دشوار ہے کار نفس
ہے وہی باہر گلشن جو حبس ہے اندر فصیل

ابن آدم کا لہو ہے ابن آدم پر حلال
دیکھئے تازہ لہو کی موجزن ہر سمت جھیل

آج بھی دل میں دبی ہیں شوق کی چنگاریاں
جگمگا جاتا ہے اکثر دل کو اک عکس جمیل

مصلحت دیکھی اسی میں لوگ پتھر بن گئے
کچھ نہ تھی اس کے سوا خود کو بچانے کی سبیل

چھا لے خود ہراول ہیں اندھیروں کے شمیم
کچھ زخموں کی قندیلیں جلانے کی سبیل

محترمہ راحت زاہد (گلاسکو، اسکاٹ لینڈ)

غزل

اشک اے کاش کبھی دیدۂ تر سے نہ گرے
خاص کر اپنی ندامت کے اثر سے نہ گرے

کم نگاہی کا اثر ہوتا ہے دل پر منفی
کم سے کم قدر وفا اپنی نظر سے نہ گرے

آبرو دولت دنیا میں ہے سب سے افضل
موت آجائے مگر تاج یہ سر سے نہ گرے

دیکھ غصے میں تڑپنا تجھے لے ڈوبے گا
برق بیتاب نشیمن پہ نہ برسے نہ گرے!

جن کو تعمیر کیا کرتی ہے انساں کی ہوس
وہ صنم خانے نہ گرنے تھے بشر سے، نہ گرے!

برگ سر سبز نے اک بات پتے کی کہدی
جس کی قسمت ہو بھلی، اپنے شجر سے نہ گرے

یہ رہے یاد کہ اب لطف سخن میں راحت
شعر ہر اک ترا معیار ہنر سے نہ گرے

نسیم سحر (جدہ، سعودی عربیہ)

غزل

جسے ادراک ہوتا جارہا ہے
گریباں چاک ہوتا جارہا ہے
لہو شامل ہوا تو قطرہء اشک
ریا سے پاک ہوتا جارہا ہے
عجب سیلاب آیا ہے کہ سب کچھ
خس و خاشاک ہوتا جارہا ہے
کہاں اب روح کا کوئی ٹھکانہ
بدن ہی چاک ہوتا جارہا ہے
تری رعنائیاں شامل نہیں ہیں
یہ موسم خاک ہوتا جارہا ہے
وہی سادہ ہیں ہم اور یہ زمانہ
بہت چالاک ہوتا جارہا ہے
خرد تو ہے تکلف کی گھٹن میں
جنوں بے باک ہوتا جارہا ہے
برہنہ ہو نہ پائیں گے کبھی ہم
لہو پوشاک ہوتا جارہا ہے
نسیم اہل زمیں کیا جانیں کیا کچھ
تہ افلاک ہوتا جارہا ہے

ھائیکو

قید غزالوں میں
موسم کی سب رنگینی
کالے ہاتھوں میں

○

پیڑ ہے کیکر کا
فیض کوئی کیا پائے گا
وہ ہے پتھر کا

○

اک نازی لڑکی
خود تو نہیں ٹوٹی لیکن
مجھ کو توڑ گئی

○

آنگن خالی ہے
ماضی کی پرچھائیں بھی
جانے والی ہے

○

بارش اتنی تیز
شہر کے سب گلیاں کوچے
جلے ہی لبریز

○

رات کی آنکھوں میں
روشنیوں کی سازش سے
کتنے اندھیرے ہیں !

○

دھوپ کی زیبائی
کانٹوں پر آویزاں ہے
بے رونق ہیں پھول

○

ایک اشارا ہے
شب لٹ جانے کا شاہد
صبح کا تارا ہے

انتظار اور ابھی.......

قیصر تمکین

NP 44 6 UN

(GREAT BRITAIN)

قیصر تمکین (برطانیہ)

اس نے دستک دی اور اعلان کیا! "میں اتنے گناہ کر چکا ہوں کہ اب بالکل معصوم ہو گیا ہوں"

اگر اس کا کہنا سچ ہوتا تو پھاٹک کے دوسری طرف کی خوشبوؤں میں گھنٹیاں بجنے لگتیں۔ مگر ہوا یہ کہ کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ زندگی کی ستر بہتر منزلیں طے کرنے کے بعد اس پھاٹک پر وارد ہوا تھا۔ تب تک اس کے بال جو شانوں تک لمبے تھے سن کی طرح سفید ہو چکے تھے اس کی داڑھی بہت گھنی، بہت سفید اور دراز تھی۔ وہ بہت قیمتی اور نفیس سوٹ پہنے ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کے موٹھ کی ایک پرانی وضع کی چھڑی تھی۔ اس سے اس نے اس آہنی پھاٹک پر دستک دی تھی اور کسی بازگشت یا حرکت و عمل کا منتظر تھا اور سوچ رہا تھا۔

پھاٹک۔ گیٹ اور دروازے مختلف جسامت اور ہیئت کے ہوتے ہیں ان کے نام مختلف ہوتے ہیں اور ان کی نوعیت کے بارے میں معقول اصول نہیں ہوتا۔ ویسے عام طور پر پھاٹک اور دروازے میں بڑا فرق ہوتا ہے پھر بھی لوگ ان الفاظ کو مختلف معنوں میں استعمال کرتے ہیں مثلاً دلی گیٹ پھاٹک حبش خاں یا گول دروازہ جیسے ناموں میں کسی خاص معنویت پر زور نہیں دیا جاتا حالانکہ آس پاس کی دنیائیں مختلف ہوتی ہیں۔

یہ بالکل علاحدہ بات ہے کہ نادر علی کی زندگی میں پھاٹک یا دروازے اور گیٹ کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان ناموں سے اس کی کوئی خاص کمزوری وابستہ رہی تھی چنانچہ اس پر اسرار دروازے پر دستک دیتے ہوئے وہ اس قدیم اور غیر معروف شہر میں طرح طرح کی باتیں سوچ رہا تھا۔

بڑے پھاٹک والے اپنی بد دماغی اور غرور کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے۔ ملکہ گیتی کے پھاٹک کے پاس سود خور پشاوری اور پختون رہتے تھے یہ لوگ ہینگ اور خشک میوہ بیچتے اور اپنی وضع قطع سے ٹیگور کے کابل والا کی یاد دلاتے۔

پھاٹک حبش خاں پر اس رسالے کا دفتر تھا جس کے اڈیٹر نے چودہ سالہ نادر علی کو باقاعدہ ادیب تسلیم کرتے ہوئے ایک پیالی چائے پلائی تھی اور ایک کہانی کا نقد معاوضہ بھی دیا تھا اور اس دن وہ جیسیوں دروازے اور پھاٹک طے کرتا ہوا وہاں اعلان کر رہا تھا "میں نے اتنے گناہ کئے ہیں کہ اب معصوم ہو گیا ہوں"۔

نادر علی کے لڑکپن میں صرف ایک ہی سڑک اس کی جولاں گاہ تھی۔ اس الگ تھلگ دو میل لمبی سڑک کے دونوں سروں پر بہت اونچی محرابوں کی شکل میں در بنے ہوئے تھے۔ شمالی در کو گول دروازہ کہا جاتا اور جنوبی در اکبری گیٹ کہلاتا، فرق دونوں میں کوئی خاص نہیں تھا۔ دونوں تقریباً ایک ہی وضع کے گارے اور چونے سے بنے ہوئے تھے۔ مگر گول دروازے سے اکبری گیٹ تک ایک دنیا آباد تھی۔ ایک سرے پر سونے چاندی کا کاروبار ہوتا۔ اس کو صرافہ کہا جاتا اور دوسرے سرے پر عورتوں کے جسموں کے سونے چاندی کی سجاوٹ ہوتی اور اس کو بازار حسن کہا جاتا جس کے کوٹھوں پر چھم چھم کرتی طوائفیں داغ دہلوی اور ثاقب لکھنوی کی غزلیں گاتیں۔ آس پاس کی دوکانوں پر عورتوں کی داخلی و خارجی تزئین و آرائش کا سامان فراہم

اناالور مردوں کی مرمت اور نو تعمیر کے لئے جڑی بوٹیوں کی فراوانی رہتی۔

اکبری گیٹ کے قریب نادر علی کے بچپن کے زمانے کی سب سے خوبصورت عمارت حنا بلڈنگ تھی۔ وہ لوگ اس کو دیکھ کر خوش ہوتے اور روزانہ اس کے سامنے گزرتے ہوئے اس سے نکلنے والی فرحت انگیز خوشبوؤں سے مفت میں فیضیاب ہوتے۔ انہوں نے سنا تھا کہ ایسی خوبصورت عمارت بمبئی اور لندن تو کیا پیرس میں بھی نہیں تھی۔ کسی نے تو یہ بھی کہا تھا کہ اس عمارت میں بننے والے عطر حنا کا دنیا میں کوئی جواب نہیں تھا۔ اور اس نے یہ بھی سنا تھا کہ لندن اور پیرس میں بڑے بڑے لاٹ لوگوں کی میم صاحب لوگ یہ عطر منگاتی اور فخر سے استعمال کرتی تھیں۔

گول دروازے اور اکبری گیٹ کے بالکل بیچ میں چاندی سونے کے ورق بنانے والے کتابی شکل کی دبیز جلدیں کوٹا کرتے اور آس پاس کے علاقوں میں یہ آواز ایک قابل قبول (ناگزیر) آہنگ کی طرح باعث زندگی رہتی۔ ان دبیز جلدوں سے بال سے بھی باریک چاندی اور سونے کے نازک ورق نکلتے۔ جن میں لپیٹ کر حلوہ جات اور کشتہ جات کھائے جاتے۔ غلام نبی کی کھیر اور عبداللہ شیرینی فروش کی امرتیوں اور لڈوؤں پر بھی یہ سنہرے روپہلے ورق جھلملاتے رہتے۔

اسی طرف وہ محلہ بھی تھا جس کو بڑا پھاٹک کہا جاتا اور جو نادر علی کا ننھیال تھا۔ اس میں شرح طرح کے پابند پلاؤ خور مولانا لوگ رہتے جو قورمہ آلود لہجوں میں بہت مرغن عربی فارسی بولتے اور مذہبی تفرقات اور فسادات کے لئے فضا ہموار کرتے اور بڑی نفاست و تہذیب سے مخالف فرقوں کو غلیظ ترین گالیاں دیتے۔ اس بڑے پھاٹک سے الگ کوئی سات میل دور پر مغرب میں ایک محلہ تھا جس کو صرف پھاٹک کہا جاتا۔ یہ لوگ نادر علی کے دادھیالی اعزا تھے جو خوب پابندی سے نمازیں پڑھتے۔ روزے رکھتے۔ سعید و فرماں بردار میاں لوگ ایک ایک ببول اور کیکر کے درخت کی خاطر لمبے لمبے مقدمے لڑتے۔ سود پر لین دین بھی کرتے اور وہیں ان سب کی مشترک چچی جان بھی رہتیں جو روپے دو روپے کے لئے اپنے سگے بھتیجوں سے "رسید پختہ" لکھوا لیتیں۔ اللہ اللہ کیا اچھے زمانے تھے، کیا محبتوں کے لوگ تھے اب کہاں وہ محبتیں اور وہ محبت کرنے والے لوگ!!

نادر علی نے بڑے پھاٹک میں زبردستی لڑجھگڑ کر داخلہ حاصل کیا تھا۔ اس نے ان تمام کوٹھیوں، محلوں اور حویلیوں میں جہاں دیواریں ہی نہیں بلکہ باضابطہ فصیلیں کھڑی تھیں بے حیائی، بد تہذیبی اور بے ہودگی سے کالم کھوج کرکے جگہیں حاصل کی تھیں۔ اگر کبھی کوئی فصیل سدراہ ہوئی، کوئی پھاٹک نہ کھل سکا تو وہ دیواریں پھلانگ کر یا توڑ کر بڑے لوگوں کی عظمتوں میں سیندھ لگا کر ان کی محفلوں کو درہم برہم کرکے آگیا۔ اس دن تک اس کی زندگی میں کوئی دروازہ ایسا نہیں آیا تھا جس کو اس نے برے یا بھلے یا جائز و ناجائز طریقے پر نہ کھلوایا ہو جس کو توڑ پھوڑ کر اونچی حویلیوں میں نہ گھسا ہو۔ لیکن اس دن اس پھاٹک پر کھڑا ہوا وہ ایک ناقابل فہم کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس نے اپنا موقف دہرایا، دستک دی اور بازگشت کا انتظار کرنے لگا۔

کہتے ہیں کہ پہلے شہر میں داخلے کا دروازہ یہی تھا بعد میں جب ایک قدیم شاہراہ پر بنی ہوئی قیام گاہیں مسمار ہوگئیں۔ کلیسا منہدم ہوگیا تو اس کے ساتھ ہی دروازے کی کلیدی اہمیت بھی ختم ہوگئی۔ اب یہ شہر کے باہر ہے۔ نیا شہر برابر ترقی کر رہا ہے۔ دو تین سمتوں میں برابر پھیل رہا ہے۔ اس نے قریب کے کئی گاؤں اور مواضعات بھی اپنے میں سمیٹ لئے ہیں۔ لیکن اس دروازے کی طرف کوئی تعمیر و ترقی نہیں ہو رہی ہے۔ اب اس کو محکمہ آثار قدیمہ نے تاریخی آثار کا تحفظ عطا کر دیا ہے۔ لہذا اس طرف تعمیر کا امکان بھی ختم ہو چکا ہے یہ دروازہ تو محض رسمی طور پر کہلاتا ہے اصل معنوں میں اس کو پھاٹک ہی کہا جائے گا جیسے شاہ عالمی گیٹ یا اجمیری گیٹ۔ اس کی ساخت حیدر آباد کے چار مینار کی طرح ہے۔ چلیپائی شکل میں چار اونچی اونچی محرابیں ہیں۔ ایک سڑک مغرب سے مشرق کی طرف جاتی ہے جس سے ہو کر پرانے زمانے میں صلیبی جانباز بیت المقدس کی طرف جاتے تھے اور دوسری سڑک شمال سے آتی ہے جو اس دروازے سے ہوتی ہوئی جنوب کے چمکیلے ساحلوں تک جاتی ہے۔ آخری صلیبی لڑائی کے بعد مغرب سے مشرق کی طرف جانے والا دروازہ بند کر دیا گیا اس پر چار خانے کی وضع کا ایک دیو ہیکل فولادی چوکھٹا لگا دیا گیا۔ اب یہ عام طور پر بند ہی رہتا ہے۔ یہ پھاٹک اتنا مضبوط ہے کہ بکتر بند گاڑیوں اور دبابوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

شمال سے جنوب کی طرف جانے والی سڑک ہمیشہ کھلی رہتی تھی کیونکہ یہ شہر کے وسط سے گزرتی ہے بعد میں جب نئی نئی سڑکوں اور قومی شاہراہوں کا جال بچھ گیا تو اس قدیم شہر کی اہمیت بالکل ہی ماند پڑ گئی۔ اب تو یہ سڑک اس طرح ٹوٹی پھوٹی رہتی ہے کہ مواضعات کی کچی پکی سڑکوں کی یاد آتی ہے۔

نادر علی پہلی بار وہاں اس وجہ سے گیا کہ شہر کے کنارے پر ایک تاریخی اہمیت کا اسکول تھا جس میں داخلے کے لئے دور دور کے علاقوں کے ذہین بچوں کا مقابلہ ہوتا تھا اور ہزار بارہ سو میں سے صرف سو بچے چنے جاتے۔ ان میں اول چار جو اعلیٰ ترین نمبر حاصل کرتے ان کے تمام اخراجات رہنے سہنے کا انتظام اور فیس معاف ہوتی۔ اس کے علاوہ ان چار خوش نصیبوں کو نقد وظیفہ بھی ملتا۔ ان چار بچوں کا مرتبہ پرانے زمانے کے آئی سی ایس افسروں کا سا ہوتا۔ وہ جب بھی اسکول جاتا تو یہ ارادہ کرتا کہ کسی دن یہاں کے جد عتیق کے قلعے کی باقیات بھی دیکھنے جائے گا اور وہ شکستہ روسی مندر بھی دیکھے گا جس کی بنیادوں میں ایک ہزار کنواریوں کا جیتا جاگتا خون بھی شامل تھا اور اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اس گیٹ کو ضرور کھلوائے گا جس کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں اس گیٹ کے دوسری طرف ایک سوئی سوئی سی دنیا تھی۔ کہتے ہیں اس طرف کے لوگ بہت عجیب تھے۔ وہ سب مذہبی پناہ گزیں تھے وہاں بوڑھے بچے اور مرد اور عورتیں سبھی اس مرتی مارتی دنیا سے الگ معصوم گوشہ، عزلت میں مگن تھے۔ وہ سب خاموشی ور سکون سے مسیحا کی آمد کے منتظر تھے۔

اس دروازے کے کھلوانے کے لئے اس نے بہت سے اہم واقف کاروں کی مدد چاہی تھی۔ لیکن اس سے گزرنے کا خیال ہی مقامی لوگوں کی نظر میں محض پاگل پن کی دلیل تھا اور اب تو یہ مشہور ہو گیا تھا کہ کوئی خاکی گناہ گار اس دروازے سے گزر ہی نہیں سکتا تھا۔ دنیا کا معصوم ترین فرد جب اس کے نیچے سے گزرے گا تو یہ پھاٹک گر پڑے گا اور کہتے ہیں کہ تب ہی قیامت بھی آجائے گی۔

نادر علی نے دنیا تیاگ دی تھی اس نے چین، لنکا اور برما کے قدیم مندروں میں گھنٹے بجائے تھے۔ عظیم ترین عبادت گاہوں میں باجماعت سجدہ ریز ہوا تھا دنیا کی تقریباً ہر قابل ذکر زیارت گاہ اور تیرتھ استھان پر حاضری دی تھی۔ اس نے ان تمام مقدس چشموں میں غسل کیا تھا جو راہ نجات کے ضامن کہلاتے تھے۔ اس کو دروازے کے پار جانے کی دھن تھی۔

شروع میں اس نے ہوائی جہاز یا ہیلی کاپٹر کے ذریعے پھاٹک کے پار والی آبادی دیکھنا چاہی۔ پھر اس نے ایک گلائڈر کلب کی رکنیت اختیار کی ہوائی جھولوں اور غباروں کے ذریعے وہاں اڑا بھی۔ لیکن اس آسیب زدہ خرابے کی طرح کے علاقے میں بجز چند ٹیلوں کے کچھ نظر نہ آیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے بید سے بنے ہوئے تکونے جھولے الٹے کر کے ڈال دیئے گئے ہوں۔ بیچ میں سیاہی مائل بھوری رنگت کا ایک ٹوٹا پھوٹا کلیسا تھا۔ اس کے آس پاس سیاہ فرغل میں ملبوس ایک راہب بھی دکھائی دے جاتا۔ وہ سال کے آخر میں نئے سال کی آمد کا اعلان کرنے کے لئے نصف شب کو گھنٹہ بجاتا تھا۔

کافکا کے ایک ہیرو کی طرح جو حصول انصاف کی دھن میں آخری حد تک پہنچ گیا تھا نادر علی نے اس پھاٹک کو کھلوانے اور اس کے پار جانے کی تمام کوششیں کر ڈالی تھیں اور آخر کار درسگاہ کی قریب المرگ منتظمہ نے بتایا تھا کہ پرانی لائبریری کے پرانے مخطوطات کے پرانے حصے میں جا کر سب سے قدیم کتاب ڈھونڈو اس کے پہلے ہی صفحہ پر کسی عمل، وظیفے یا طریق کار کا ہدایت نامہ مل جائے گا۔

نادر علی کو اپنی اس تلاش اور چھان بین میں تین برس لگ گئے اور درمیانی مدت میں وہ منتظمہ جس کی عمر مقامی کہاوتوں کے مطابق سوا سو برس سے بھی اوپر تھی چل بسی۔ تب تک مسیح ناصری کے مصلوب ہونے کی داستان پورے دو ہزار برس پرانی ہو گئی۔ اور اب نادر علی ایک نئے اشتیاق، جذبے و امنگ کے ساتھ دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اس نے پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ بتایا تھا کہ اس نے اتنے گناہ کئے ہیں کہ اب وہ بالکل معصوم ہو گیا ہے۔

ٹھیک بارہ بجے چاروں طرف روشنیاں جگمگا اٹھیں، گھنٹے بجنے لگے، آتش بازی کی رنگ برنگی گل کاریوں سے آسمان چمک اٹھا۔ ایک نئی صدی طلوع ہو رہی تھی ایک نیا ہزارہ شروع ہو رہا تھا۔ وہ نیا زمانہ بھی آ ہی رہا تھا جس کے تصور میں ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں اور موسیقاروں نے گیت لکھے تھے۔ کہانیاں گڑھی تھیں، داستانیں بنی تھیں اور رنگ و نور کے مرقعے بنائے تھے۔

نادر علی نے پھر دستک دی۔ جواب میں پھاٹک کے دوسری طرف کی سوئی ہوئی بستی میں ایک پتہ بھی نہ کھڑکا۔

برفباری شروع ہو چکی تھی۔ تمام جتن کرنے کے بعد نادر علی ناکام ہی تھا۔ اس کے لئے واپسی کا تصور ہی محال تھا۔ چنانچہ وہ وہیں تیز برفباری میں بیٹھا مسیح موعود کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

گوہر رشک
مٹا کنواں۔ سام پور (یوپی)

غزل

بھیگے ، رومانی موسم کے بادل بے لمان نہ تھے
پھر بھی چاہت کے کھیتوں پر بارش کے امکان نہ تھے

تاریکی کے گہرے جھرمٹ ، دریا ، ریت ، چٹانیں چپ
ہم جن رستوں کے راہی تھے وہ رستے آسان نہ تھے

جا پہنچیں تکمیل کی منزل تک کمزور اڑانیں بھی
فخر متاعِ شہ پر کے خمیازے بے احسان نہ تھے

حرف و نوا کی یلغاروں میں گھٹتے لفظوں کا منظر
دیکھنے والے چپ تھے لیکن کس کے گم اوسان نہ تھے

دور ندی پر تان نے مرلی کی آخر من موہ لیا
لانے والے پاس کے پنگھٹ سے پانی نادان نہ تھے

ہم نے جنگل کاٹ کے بھیگے موسم کو ناراض کیا
زرد رتوں کے بڑھتے سائے فطرت کا بحران نہ تھے

میں نے جس انداز سخن سے زخموں کو دی خندہ لبی
اس میں دل کا درد چھپا تھا وہ لہجے بے جان نہ تھے

میں شائق بیٹھی آوازوں ، نرم لچیلے جسموں کا
سخت نکیلے پیکر میری غزلوں کے ارکان نہ تھے

تیری اڑتی مٹی سے کل دنیا یہ نہ کہے اے رشک
تیرا لب و لہجہ میرے اشعار تری پہچان نہ تھے

مختار احسن انصاری
324/6, S.V.P Road, Police Officer,s Qrs.
Bhendi Bazar, Dongri, Bom - 9

غزلیں

ہنستے ہوئے مرجاتے ہیں پر اف نہیں کرتے
ہم قتل بھی ہونے میں توقف نہیں کرتے
کہنے لگے بس روز یونہی ملتے رہیں گے
اب حادثے بھی ہم سے تکلف نہیں کرتے
لو ! خون کے رشتے بھی عدالت میں کھڑے ہیں
حیرت ہے معاف آج کے یوسف نہیں کرتے
آئینہ یہی پوچھتا ہے روز علی الصبح
کیا بات ہے دنیا پہ جو تم تف نہیں کرتے
تیور لئے ہر فکر معطر ہے غزل میں
الفاظ کا ہم یونہی تصرف نہیں کرتے
دنیا کی حقیقت کو سمجھتے ہیں ہم احسن
لیکن کبھی اظہار تصوف نہیں کرتے

OOO

جس کے لئے کہی ہے غزل جانتا ہے وہ
اپنے بدن کے نور کو پہچانتا ہے وہ
اس کی نظر میں ہیچ ہے کل کائنات بھی
آئینہ ہو تو پھر کسے گردانتا ہے وہ
تتلی سے پوچھ کیف و نشہ اس کے لمس کا
نظروں کی تتلیوں کو بھی پہچانتا ہے وہ
کیا آفتاب کو بھی سکون کی تلاش ہے
در در کی خاک کس کے لئے چھانتا ہے
ہر شعر اک گلاب ، غزل ماہتاب ہے
اپنے ہر اک لباس کو پہچانتا ہے وہ
احسن وہ چاند دور ہی یہ بھی کم نہیں
ہر فکر اس کا عکس ہے یہ مانتا ہے وہ

بلبل کاشمیری (لندن)

علی گڑھی غزل

جو چھلکے تھے شرابِ علم کے پیالے علی گڑھ کے
وہی لاکر پلاؤ ہم ہیں متوالے علی گڑھ کے

ابھی تک دل میں تازہ ہیں حسیں یادیں علی گڑھ کی
سیہ اچکن اگرچہ ہم نے دھو ڈالے علی گڑھ کے

وہ اردو بولنے والے لبوں پر اور اردو پر
لگائے جارہے ہیں آجکل تالے علی گڑھ کے

ہوا بدلی ۔ مزاج باغباں بدلا ۔ چمن اجڑا
خزاں دیدہ چمن میں ہیں چمن والے علی گڑھ کے

جو چھپنے لگ گئیں اردو کتابیں ناگری خط میں
کتب خانے نہ بن جائیں دھرم سالے علی گڑھ کے

الٰہی بھیج پھر ابر بہاراں پھر ہرے کردے
وہ بوٹے جو کہ سر سید نے تھے پالے علی گڑھ کے

دو شعر قافیہ بدل کر

علیگی نام کا حصہ ہے یوں جیسے تخلص ہو
ضمیر و ذہن میں کتنے حوالے ہیں علی گڑھ کے

معطر کیوں نہ ہو خوشبوئے فن سے چار دیواری
مرے گھر میں پرانے کچھ رسالے ہیں علی گڑھ کے

غزل

مریضِ عشق کو آیا میسر چارہ گر آدھا
کبھی دھڑکے ہے دل آدھا کبھی گھومے ہے سر آدھا

خدا اے نرس ۔ تجھ کو اور بھی توفیق خدمت دے
تری مالش سے میرا رہ گیا دردِ کمر آدھا

فلسطیں کیا عرب سارے پہ وہ قبضہ جمالیتا
مگر " موشے دیاں " کانا تھا یعنی دیدہ ور آدھا

وہ ہم سے دن کو ہی ملتا ہے راتوں کو نہیں ملتا
وہ ہم سے پیار کا پیمان کرتا ہے مگر آدھا

بڑی دشواریاں تھیں راستے میں ہم سفر لیکن
کٹا ہے گفتگو میں زندگانی کا سفر آدھا

کیا تہذیب کے کلچر نے نر مردوں کو زن صورت
کیا فیشن کے استادوں نے زن مادوں کو نر پیدا

وہ تڑپے گا کبھی لوٹن کبوتر کی طرح بلبل
خدا دے اس ستمگر کو مرا دردِ جگر آدھا

وابستگی۔ وابستگی

مقصود الہٰی شیخ
مدیر "راوی"
براڈفورڈ (یو۔کے)

"پاپا آپ ڈائیٹ کر رہے ہیں؟"
اس نے منہ پھیر کر بیٹی کی طرف دیکھا۔ بیٹی اپنے شوہر کی طرف ناامیدی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
اس نے بنا کچھ کہے اپنی نگاہیں بیٹی داماد سے ہٹا کر زمین پر گاڑ دیں۔ دل میں سوچا۔
"کیوں؟ یا نہ کیوں !!
بیٹی ماں کے پہلو سے لگ کر بیٹھ گئی۔ دیر تک ماں کی خیریت معلوم کرتی رہی۔
دوا وقت پر کھانا۔
جلدی سو جانا۔
زیادہ کام نہ کرنا۔
بیٹی نے صحت برقرار رکھنے کے لئے، کتنے ہی نسخے ماں کو بتائے پھر بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت قریب دیکھ کر میاں کے ساتھ رخصت ہو گئی !
وہ بھی اپنی بھول بھلیوں سے نکلا "لو! یہ لوگ چلے گئے۔ سودا منگوا لیتے تو اچھا تھا۔ اب خود جانا ہوگا۔
بیوی چڑ گئی۔
"دامادوں کو تکلیف نہیں دیا کرتے۔"
"میں تو انہیں بیٹوں کی طرح بلکہ بیٹا ہی سمجھتا ہوں"۔
"دامادوں کو داماد سمجھو۔ عزت کرو۔ عزت کراؤ۔" وہ بات ختم کرتے کرتے ہانپنے لگی۔ ہانپتے ہانپتے اس نے اپنے والد کی مثال دی۔ جن کی چھ بیٹیاں تھیں، بیٹا کوئی نہ تھا۔ تمام عمر دامادوں کے ساتھ بیزار کھڑ رکھاؤ رہا۔
اس نے اپنی بیوی کو ترس بھری نگاہوں سے تکتے ہوئے کہا "تمہیں اکیلا چھوڑ کر جانے کو جی نہیں کرتا!"
"مجھے اکیلے میں ڈر لگتا ہے اور نہ کوئی اٹھا کر لے جائے گا۔ ہاں نہیں تو !!" بیگم نے آواز میں کرارا پن پیدا کرتے ہوئے شوہر کی خبر لی۔۔۔۔۔۔
جو کچھ لانا ہے۔ جاؤ لے آؤ اور نہ بھی لائے تو گزارا ہو جائے گا۔"
گھر والی پر نقاہت طاری ہو گئی۔
"میں چلا تو جاؤں مگر میری غیر حاضری میں تمہیں دورہ پڑ گیا تو۔؟" اس نے بات مکمل نہ کی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ "لو تمہارے بہو بیٹا آگئے" میاں کے چہرے پر مسرت کی لہر چھا گئی۔ اطمینان ابھر آیا۔ مریضہ بھی کھل اٹھی۔ اس پر رونق آگئی !!
اس کی بیماری کے طول پکڑنے پر بیٹا بہو لندن چھوڑ کر پاس آبسے تھے۔
"ایک شہر میں رہنے کا یہی تو فائدہ ہے۔ بیٹی گئی، بیٹا آگیا۔" میاں نے بیمار بیوی کو طمانیت سے یوں دیکھا جیسے اسے نئی تسلی، ڈھارس دے

سدہاہو۔

بہو آتے ہی کچن میں چلی گئی۔ پہلے چائے بنالائی پھر اس نے روٹی ترکاری تیار کر کے پوچھا "کھانا لگاؤں؟" جب اماں ابا دونوں نے کہا کہ ٹھہر کر خود ہی کھالیں گے تو بہو نے اپنے گھر والے سے اشاروں ہی اشاروں میں اٹھنے کے لئے کہا۔

بیٹا ماں کا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔ یہ معمول بن گیا تھا۔ بہو آتے ہی گھریلو کام کاج میں لگ جاتی۔ کھانا بنانا، ساس سسر کو کھلانا، بہو اپنا فرض جانتی تھی۔ گھر کی صفائی نند کر جاتی تھی اگر وہ کوتاہی کرتی تو منہ کھولے بنا یہ کام بھی بہو کرنے میں عار نہ سمجھتی۔ بیٹا ماں کو سنگت دیتا۔ دوا دارو کا پوچھتا۔ اٹھتے ہوئے بیٹے نے ماں کو تسلی دی "اماں اکل کتنے بجے ہسپتال جاؤگی؟ بالکل بھی نہ گھبرانا۔ میں گھنٹے دو گھنٹے کی چھٹی لے کر سیدھا وہیں پہنچ جاؤں گا !!"

یارکشائر کے اس "منی پاکستان" میں رہتے 25 برس سے زیادہ ہو چکے تھے مگر اس چھوٹے سے پاکستانی کنبے پر یہاں جم جانے کے بعد یہ پہلی افتاد ماں کی بیماری کی صورت میں پڑی تھی۔ ان کی دوسروں سے جدا کہانی نہیں تھی۔ سب ایشیائی گھروں میں تقریباً تقریباً یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ سبھی کو ایک سے حالات کا سامنا رہا ہے۔ پلٹ کر دیکھنے سے سخت جد و جہد سامنے آجاتی ہے۔

کتنے جوکھم سے، برسوں کی دربدری کے بعد یہ گھر بنا تھا پھر اس ایک گھر کے کئی گھر بنے۔ یہ اطمینان بہر حال میاں بیوی دونوں کو تھا کہ بچے اپنے گھروں میں خوش و خرم ہیں پھر بھی ایک احساس تنہائی خصوصاً بیماری کے آغاز سے ان کے حواس پر چھایا رہتا تھا۔ کاش یہ ممکن ہوتا دیس کی طرح یہاں بھی۔ دکھ، سکھ میں۔ سب ایک چھت تلے رہتے۔ پر کس کے پاس اتنا وقت تھا کہ گھر داری چھوڑ کر اماں ابا کے پاس آکر رہے۔ اس کڑھن کا علاج افراد کے ہاتھوں سے اب نکل گیا تھا اور وقت بالتا کب ہے؟ اپنی اپنی چھت ہے۔ اپنے اپنے غم ہیں یہ تو پھر بھی خوش قسمت تھے !!

جانے کیا مرض تھا۔ بی بی جی کو آئے دن ہسپتال جانا پڑتا۔ کبھی یہ ٹسٹ ہو رہا ہے کبھی وہ۔ اب سرجن کے حوالے کر دیا گیا کہ وہی چیر پھاڑ کرے گا!

چیرے کے سہم سے دونوں میاں بیوی سہمے، گھبرائے ہوئے تھے۔ باقی لوگ بھی فکر مند ہوں گے مگر انہیں اپنے اوپر قابو تھا۔ خیر سلا معلوم کی۔ ممکنہ خدمت، سیوا کی اور گھروں کو چلے گئے۔ زمانے کا چلن ہی بدل گیا۔ مزاج اور قدریں بدل گئیں۔

یہ دونوں بھی تو اپنے والدین کو وطن میں چھوڑ کر نئے دیس میں آبسے تھے !!

یہ مسئلہ ہی دوسرا تھا۔ وطن چھوڑا تو پیٹ بھرنے کا سوال تھا۔ یہ کس کو خبر تھی کہ یوں وقت پھر پھر کر تانکل جائے گا۔ خاندان ٹوٹیں گے، بکھریں گے اور سب بے بس ہو جائیں گے۔ پہلے بڑوں کی اہمیت ہوتی تھی۔ اب معاملہ الٹ گیا۔ بچوں کی آڑ میں بڑوں سے دامن کشی روا رکھی جاتی ہے۔

وہ سودا لانے تو نہ گیا۔ ہاں اداس سا ہو کر بیٹھ گیا۔ بیٹا بہو کے جانے کے بعد اس نے اپنی نحیف و نزار بیوی کو سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا۔ خود باتھ روم میں چلا گیا۔ گلا صاف کرنے کو کلی کی۔ وحشت مٹانے کو منہ پر چھپکا مارا اور تولیے سے منہ خشک کرتے ہوئے آئینہ دیکھا۔ بڑی بے دھیانی میں نظر پڑی تھی مگر اسے اپنی بیٹی کی بات یاد آگئی۔ اس بیماری نے تو آنکھوں دیکھی بات کی ہے۔ وہ ڈائیٹ تو نہیں کر رہا مگر چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ شیشے میں اپنی حالت دیکھ کر وہ حیران ہو گیا۔ جیسے کسی غیر کا چہرہ ہو۔ یہ کیا ہو گیا؟ کیا وہ واقعی اتنا بھیانک ہو گیا ہے؟

وہ دم بھر کر ٹھٹک کر، ٹھٹھر کر آئینہ دیکھتا رہا !!!

وہاں کوئی اور نہیں کھڑا تھا۔ اس کا اپنا نقشہ بگڑ گیا تھا۔ اے ڈی۔ ایچ لارنس کی "ڈورین گرے کی تصویر" والی کہانی یاد آگئی۔ ہاں وقت اسی طرح نقش و نگار اور حلیہ بدل دیتا ہے۔

وہ کئی راتوں سے جاگ رہا تھا۔ پریشان اور فکر مند تھا۔ ڈاکٹر لاکھ اطمینان دلاتے رہیں تشویش تو رہتی ہے اور جب اپنے کسی کو بڑا چیرا دیا جانے والا ہو تو یہ ڈر، دھڑکا اور خدشہ ہوتا ہے "خدا نہ کرے ایسی ویسی بات ہو جائے"۔ آدمی انگلی سے ناخن بڑھ جانے پر جدا کرتے بھی احتیاط کرتا ہے۔ یہاں تو انسانی جسم سے ایک حصہ ہی کاٹ کر الگ کر دیا جائے گا۔ پہلے ہی کم جا کم جی میں دو تین مہینے یوں گزر گئے۔ اب اللہ کرے سب کام ٹھیک ٹھاک ہو جائے۔ صحت کی بحالی اور علاج مکمل ہونے کی مدت پانچ ماہ بتائی گئی ہے۔ گویا مقدر میں سال بھر کی پریشانی لکھی تھی۔ کسی کو دھیان آیا بھی بس اتنا کہ ماں بیمار ہے کسی نے یہ جاننے کی کوشش تک نہ کی باپ پر کتنا ہول ہے؟

مجھتے ہیں، ڈائیٹ کر رہا ہے !!

اس نے زندگی میں پہلی بار گڑگڑا کر دعا مانگی تھی۔ پہلی بار اس کے اندر یہ احساس جاگا تھا کہ خاتون خانہ کو، اس عورت کو اس نے کیا دیا؟ بس وہی کچھ دیا جو اوپر والے نے اس کے مقسوم میں لکھا تھا اور وہ تو پھر بندہ ہے کیا دے سکتا ہے؟

مالک الملک تیرے خزانوں میں کمی نہیں اسے صحت دے دے !۔

وہ کوئی بابر نہیں پھر بھی خلوص سے دعا کی کہ "نہیں تو میری زندگی اسے دے دے" !!

پچھلے تیس پینتیس برس میں سب کچھ اپنے آپ ہی ہو گیا تھا۔ بچے ہوئے، پلے بڑھے۔ ان کی شادیاں ہوئیں۔ سب اپنے گھروں کے ہوئے۔ یہ پھیلا پنے پھرتے رہے۔ بیوی نے سارے کام نمٹائے۔ اب وہ زمانہ آگیا تھا بچوں کے بچے آگئے تو گھر میں ننھے منوں کا میلہ سالگ جاتا۔ یہ میاں بیوی کبھی بچوں کے آنے پر خوش ہوتے، کبھی غل غپاڑے پر گھبرا جاتے۔ تنگ ہوتے اور کبھی ان کے نہ آنے پر گھر کے در و دیوار تک اداس دکھائی دیتے۔

اور اب جو یہ عورت بیمار پڑی تو مرض بڑھتا گیا۔ یہ کمزور ہوتی چلی گئی۔ تب جاکر اس کو احساس ہوا گھر میں ایک مضبوط نظام قائم کرکے اس کو آزاد رکھنے میں اس کمزور سی غیر اہم عورت کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ تو شام سویرے بسیرا کرنے، بیند کرنے اور چوگ چگنے کے لئے ہی دہلیز پر قدم دھرتا تھا۔

یہ جذبہ اپنی جگہ نیا بھی تھا اور انوکھا بھی، جب دعا کرکے اس نے زندگی کے مالک سے گڑگڑا کر یہاں تک کہہ دیا کہ "میری زندگی بھی اس کو دے دے" تو کیا کو اس سے پہلے بیوی کے وجود تک کا احساس نہ تھا؟

ایمانداری کی بات یہ ہے کہ نہیں تھا۔

اس کا روگ تو یہ تھا۔ ماں باپ نے خواہ مخواہ پلے باندھ دی تھی !

آج شیشے میں دکھائی دینے والی عورت کے اڑے اڑے رنگ اور بگڑے نقش جہاں عمر رفتہ کی پرچھائیاں نظروں میں گھما پھرا رہے تھے وہیں یہ کرب بھی چٹکیاں لے رہا تھا کہ کتنی تلخیاں اور ناانصافیاں کس بے خبری سے اس کے ہاتھوں انجام پاتی رہی ہیں !

یہ حقیقت ہے، مرد یہاں کا، وہاں کا بیوی کو روبوٹ ہی سمجھتا ہے عورت تو وہ ہوتی ہے جو محبوبہ بن کر اشاروں پر نچاتی ہے نخرہ دکھاتی ہے، ناز اٹھواتی ہے، پھر کے لگاتی ہے۔ خوشامد کراتی ہے !!

کیا وہ بھی اپنی بیوی کو گھریلو کام کرنے والی مشین ہی سمجھتا رہا ہے؟

وہ شرمندہ ہو گیا۔

نہیں۔ وہ اس کے وجود سے بے خبر رہا ہو۔ بے اعتنائی برتی ہو مگر اسے مشین یا خادمہ نہیں سمجھا۔ وہ روایتی بھلاووں میں ضرور گرفتار رہا کہ اس کی دیکھ بھال ایک اچھی بیوی کا فرض ہے مگر برابر اس کا احترام کرتا رہا۔ ان لمحوں کے سوا جب غصے میں دیوانہ ہو گیا ہو گا ہمیشہ عزت دی۔ گھر کی زینت سمجھا۔ کل اختیار، گھریلو سلطنت پوری کی پوری اسے سونپ رکھی تھی۔

شاید اس لئے۔ اس کے دل میں چھپے چور نے سر اٹھایا۔

وہ پہلے اس کی بیوی بن کر آئی تھی مگر تھی تو وہ اماں کی اور ابا کی رشتہ دار۔ یہ سوچ بڑی گہری تھی۔ دل میں پہلے دن سے کھب گئی تھی، پیوست ہو چکی تھی۔ ماند ہی نہ پڑتی تھی کہ یہ ایک روایتی بندھن تھا۔ محض خاندانی وقار اور مصلحتوں کی بنا پر اس کے پلے ایک ایسی لڑکی کو باندھ دیا گیا تھا جس کا اس حیثیت میں اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے کب کسی سے کہا کہ اسے ایک کٹھ پتلی درکار ہے۔ کوئی سی خاندان کی لڑکی اس کے ساتھ نتھی کردو۔

باخبر اور بے خبری کے اطراف میں ڈولتے ہوئے وہ شرمندگی، رنجیدگی سے نکل نہیں پا رہا تھا۔

پھر بھی۔۔۔۔ پھر بھی
جیسے بجھ گئی، بجھ گئی
اب زندگی کے اس موڑ پر

خدا نہ کرے،
اس ناتواں سی، کمزور سی عورت کو کچھ ہو ----
ورنہ اس کی زندگی میں رہ کیا جائے گا ؟؟؟
آخر اسے اپنا ہی غم ہے نا ؟؟ اس کے دل کے چور نے پھر سر اٹھایا۔
نہیں۔ نہیں اس نے خلوص سے سوچا اب اسے محض یہ غم ہے، صرف یہ فکر ہے اس کے گھر کی رانی کو کچھ نہ ہو۔
ہر وقت مصروف رہنے والی، دوڑ دوڑ کر سب کے کام کرنے والی کتنی عاجز آ چکی تھی۔ چلنے پھرنے سے گئی۔ بات کرتے ہوئے ہانپنے لگتی ہے پھر بھی اس کی ضرورتوں کا خیال رکھتی ہے۔ بیٹی بہو سے یاد کر کر کے اس کے ذاتی کام نمٹوا دیتی ہے۔
بستر بنا دو
استری کر دو
پالش کر دو
سوٹ ڈرائی کلین کرا لاؤ۔
وہ غسل خانے سے آکر ذرا کی ذرا بیوی کے ساتھ ہی لیٹ گیا۔
پچھتاوؤں میں لتھڑی نظروں نے جانے کس طرح چغلی کھائی، بیوی نے بند آنکھیں کھول کر شوہر کو ہمدردانہ نظروں سے دیکھا۔
"یہ کیا سوچ رہے ہو ؟"
"کچھ نہیں ----- !"
"پھر بھی ----"
"تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا"
"کیا؟"
وہ کچھ نہ بتا سکا۔ کوشش کی تو آواز نہ نکلی۔ گلا، آنکھیں سب جیسے بھر بھرا کر روک ڈال رہی ہوں۔ مانع اور حائل ہوں۔
وہ گھبرا گئی --- "کیا ہوا ---- بتاؤ نا ---- تمہیں میری قسم !!"
"میں نے تمہارے ساتھ سختیاں کیں۔ ناانصافیاں کیں۔ کچھ خیال نہ کیا۔ لاپرواہ اور بے نیاز بنا رہا۔ اب بھی موقعہ نہیں دیتی ہو کہ ازالہ کروں --- "تلافی کروں --- پھر وہ بے قابو ہو گیا۔
"مجھے اکیلے نہ چھوڑ جانا ----"
اس کی بیمار آنکھوں میں چمک آ گئی، روشنی آ گئی۔
"نہیں ابھی نہیں مرتی ---"
وہ اس سے لپٹ گئی۔
زندگی میں پہلی بار ان جذبوں کا احساس ہوا جو کم از کم اس کے جانے پہچانے نہ تھے۔ جیسے یہ کمزور سی عورت ہی اس کا بڑا سہارا تھی۔ جیسے وہ ڈوب رہا تھا اور بچنے کا ایک سہارا ہی تو تھی۔
کتنی دیر وہ دونوں چپ چاپ لیٹے رہے۔
اس نے سوچا یہ ڈبل بیڈ جس پر وہ لیٹے ہوئے ہیں دلہن نے کتنے بہانوں سے منگوایا تھا۔ وہ کہتا رہا کہ بھاڑ میں جائے بہاں کا رواج، اسے بالکل اچھا نہیں لگتا کہ بچے بڑے ہو رہے آئیں تو میاں بیوی ساتھ لیٹے ہوں، نئی نسلوں میں بے حیائی اسی طرح تو بڑھی ہے۔ پھر جتنا الگ، علٰیحدہ ٹھہرا ٹھہرا اور پرسکون وہ دن میں ہوتا تھا۔ بعد میں انتہائی بے تماشہ متحرک اور شور شرابا اٹھانے والا تھا لیکن وہ اعتبار ہی نہ کرتی تھی کہ اس کے آرام کی غرض سے وہ علیحدہ بیڈ پر

سونا چاہتا ہے سو نیک بخت نے ڈبل بیڈ منگوا کر ہی دم لیا تھا۔
تو اسی نے پھر آ دبوچا۔ ان کے سونے، اٹھنے کے اوقات بدل گئے۔ آرام میں خلل کا پہلو مزاحمت بن گیا۔ بیڈ علیحدہ ہو گئے۔
شاید وہ بھی ڈبل بیڈ کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔
دو چاند اور ایک بے جان چیز کے حوالے سے ماضی میں جھانک رہے تھے۔
"ایک بات بتاؤ گے؟"
"پوچھو!"
"نہیں تم کبھی سچ نہیں بتاؤ گے!"
"کبھی جھوٹ بولا؟"
"ہمیشہ۔ بہت سے جھوٹ بولے۔ میں چپ کی چپ رہی"۔
وہ حیران ہو کر، خاموش، ہونٹ سی کر لیٹا رہا۔ پلٹ کر بیوی کی طرف دیکھا بھی نہیں کہ کس موڈ میں ہے اسوالات کی یہ نئی بوچھاڑ کیا معنی؟
اچانک ارتعاش پیدا ہوا۔
"تم اس پر مرتے تھے؟"
"کس پر"
"نام بتاؤں؟ جیسے جانتے نہیں؟"
"کیا کہہ رہی ہو----"
"کسی نادان سے بات کر رہی ہوں؟-----چلو نہ بتاؤ۔ مجھے معلوم ہے!؟"
"نئی نئی پہیلیاں کہہ رہی ہو---"
"بن گئے وہی انجان کے انجان----"
وہ ہار کر چپ ہو گیا۔
"چپ کیوں ہوا"
"تو کیا کہوں----؟"
میں اچھی ہو جاؤں گی؟"
اس کا دل چاہا بتا دے کہ "تمہارے لئے دعا مانگی تھی میری عمر بھی تمہیں لگ جائے"۔
وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کن لفظوں میں کہے کہ بیوی نے سرہانے پڑا دوپٹہ اٹھایا۔ سینہ ڈھکا۔ سر پر ایک رخ سے ڈالا اور اس کی کنی کو دونوں ہاتھوں کی پہلی انگلیوں اور انگوٹھوں کے بیچ لے کر بل نکالنے لگی۔
"میں پوچھ رہی تھی-----"
"کیا-----؟" اس نے نئے سرے سے حیران ہو کر پوچھا
"مجھے آگ لگ جاتی ہے بناوٹی معصومیت سے----وہ خفا سی ہو گئی۔
پھر خود ہی سلسلہ کلام نئے سرے سے جوڑا۔
"کہہ رہی تھی-----اس کو مار کر ہی مروں گی!"
اس کے منہ سے بے دھیانی میں نکلا "کس کو؟" وہ سمجھا ہی نہیں کس لہجے میں کیا کہا گیا ہے۔ بس چپ چاپ دبکا پڑا رہا۔ بیوی نے کروٹ بدل کر پیٹھ کر لی۔

بقیہ ص ۲۳۱ پر

ڈاکٹر سجاد سید
C-2- گل مہر ایونیو
جامعہ نگر، اوکھلا
نئی دہلی- ۱۱۰۰۲۵

غزل

شب و روز و شام و سحر رائگاں
زمین و زماں کا سفر رائگاں

حقیقت یہ منزل پہ جاکر کھلی
ہوا عرصۂ بال و پر رائگاں

نہ ظلمت دلوں کی یہ کم ہو سکی
تجلی، علم و ہنر رائگاں

سماعت سے محروم تھا ہر صنم
دعاء التجا ، بے اثر ، رائگاں

کیا بندگی پر بھروسہ فضول
جھکے آستانوں پہ سر رائگاں

وہ نقار خانہ ہے سید جہاں
زبان و بیاں کے گہر رائگاں

ادبی سرگرمیاں - خبریں - اعلانات

خاک طیبہ ٹرسٹ جدہ کا عید ملن مشاعرہ

گزشتہ دنوں خاک طیبہ ٹرسٹ جدہ کے زیر اہتمام عید ملن مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ خاک طیبہ ٹرسٹ کا یہ چوتھا سالانہ عید ملن مشاعرہ تھا اور ہر سال کی طرح اس برس بھی مشاعرے کی ترتیب اور انتظام میں سلیقہ اور منصوبہ بندی نمایاں تھے۔ مشاعرے کی صدارت جناب مصلح الدین سعدی نے کی جب کہ نسیم سحر مہمان خصوصی تھے اور حاظر قدوائی ناظم مشاعرہ تھے۔ خاک طیبہ ٹرسٹ کے جنرل سکریٹری جناب سیادت علی خاں نے ابتدائی خیر مقدمی کلمات کہے۔ حافظ امیر حمزہ نے تلاوت کلام پاک فرمائی جس کے بعد نسیم سحر نے نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پیش کی اور خاک طیبہ ٹرسٹ کے صدر جناب حبیب اللہ نے ٹرسٹ کی بہبودی، سرگرمیوں اور حیدرآباد دکن اور جدہ میں جاری مختلف منصوبوں کے بارے میں خطاب کیا۔ جنرل سکریٹری سیادت علی خاں نے بھی وقفے وقفے سے ٹرسٹ کی بہبودی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ جدہ کے اکثر و بیشتر معروف شعرائے کرام کے علاوہ اس مشاعرے میں سامعین کی بھی ایک کثیر تعداد شریک تھی اور مشاعرہ ہر لحاظ سے بھرپور اور کامیاب رہا

جن شعرائے کرام نے اس مشاعرے میں کلام پیش کیا ان میں محمد حسین عرفان، عرفان بارہ بنکوی، نوید افروز، عبدالقیوم عادل، حاکم الدین مقبول، محسن علوی، علیم خاں فلکی، کلیم اللہ فاروقی، حسین عود، نعمان منظور عبدالستار بلوچ، عبدالمقتدر وقار، اطہر عباسی، راشد صدیقی، رؤف خلش، حاظر قدوائی والد، ڈاکٹر اوصاف احمد، نعیم بازید پوری، طارق غازی، سید عثمان حامد، نسیم سحر اور مصلح الدین سعدی صاحبان شامل تھے۔ یہ یادگار اور خوب صورت مشاعرہ رات کے اڑھائی بجے تک جاری رہا۔

اس یادگار عید ملن مشاعرہ میں پیش کئے جانے والے کلام کا انتخاب ملاحظہ فرمائیے۔

اجڑے چمن کو دیکھ کر آنسو نکل پڑے
اپنے وطن کو دیکھ کر آنسو نکل پڑے

محمد حسین عرفان

یہ مانا اس نے میری زندگی برباد کر ڈالی
مگر پھر بھی کوئی اس سے کہ اچھا نہیں لگتا

عرفان بارہ بنکوی

وطن سے دور خیال وطن مرا حق ہے
بلا کا درد ہے دل میں دبائے بیٹھے ہیں

نوید افروز

بھر لوں آنکھوں میں منظر حسیں
جانے کب آؤں گا لوٹ کر
جن کی خاطر ہوا در بدر
ہنس رہے ہیں مرے حال پر

عبدالقیوم عادل

سردار کی نگاہ جہاں متفق نہیں
ہم تو کسی قبیلہ بے خاناں میں ہیں

حاکم الدین مقبول

جیسے ادراک ہوتا جارہا ہے
گریباں چاک ہوتا جارہا ہے
برہنہ ہو نہ پائیں گے کبھی ہم
لہو پوشاک ہوتا جارہا ہے

نسیم سحر

خوشیوں کا تبرک تو دیا کرتے ہیں کم لوگ
ہر موڑ پہ دنیا میں دیئے جاتے ہیں غم لوگ
ہو کچھ تو عطا رحمت عالم ترے در سے
اک عمر سے گھٹ گھٹ کے چلے جاتے ہیں ہم تک

محسن علوی

دکھائی دیں گے سیہ دل حسیں اجالوں کے
ہماری طرح گزارو تو روز و شب لوگو

علیم خاں فلکی

میں تو شائستگی میں ہوں چپ چاپ
جی تو کرتا ہے خوب رو لینا
کربلا کافلہ کی داستاں سن کر
تم بھی پلکیں ذرا بھگو لینا

رؤف خلش

سوالوں کے انبار اٹھائے پھرتا ہوں
آنکھوں میں گھر بار اٹھائے پھرتا ہوں

نعمان منظور

بھولے سے آجائے اگر ہونٹوں پہ سچی بات
کوئی نہ کوئی رکھ دیتا ہے میرے منہ پہ ہات
کلیم اللہ فاروقی

تیرگی کے ہر بدن پہ نور کا ملبوس ہے
یہ اثر ہے صبح کا شفاف منظر ہر طرف
عبدالغفور وقار

تعمیر کر رہا تھا میں دیوار شان کی
رسوائیاں ہوئیں مرے اپنے مکان کی
روحوں کا کرب روتے زمیں پہ بکھر گیا
قاتل کو جب پناہ ملی سائبان کی
اطہر عباسی

جس کے رنگوں میں ہو شامل مرے زخموں کا لہو
اے مصور کوئی ایسی بھی تو تصویر بنے
راشد صدیقی

زندگی کے پیکر میں حسن ہے نہ رعنائی
سب گزر گیا موسم ہجر میں بہاروں کا
سید عثمان حامد

اس پاک وطن کی رگ رگ میں اپنے ہی لہو کی گردش ہے
اس خاک سے ہم بھی اٹھے ہیں جس خاک سے پاکستان اٹھا
نسیم بایزید پوری

جمالیات نگہ کی تفسیر کیجئے اس کے گھر سے پہلے
مگر یہ سب کچھ ہو چکے چکے کتاب دل میں نظر سے پہلے
طارق قازی

جناب ناظر قدوائی والد نے مزاحیہ کلام سنایا جب کہ ڈاکٹر اوصاف احمد نے آیات کریمہ پر مبنی خوب صورت منظوم نظمیں پیش کیں - آخر میں صاحب صدر جناب مصلح الدین سعدی نے کلام سنایا جس میں سے دو اشعار پیش خدمت ہیں -

تہذیب کے ہیں بھوت مکانوں کے آس پاس
جنگل بھی بس گئے ہیں مکانوں کے آس پاس

کیا بات ہے کہ اہل نظر بولتے نہیں
سنتے ہیں ساری بات مگر بولتے نہیں

شاہجہاں پور میں ایک شام الحاج انیس دہلوی کے نام اور "دست نگاریں" کا اجرا

نامور صحافی الحاج انیس دہلوی صاحب ایڈیٹر " فلمی ستارے " سرپرست ماہنامہ " باجی " دہلی کی شاہجہاں پور آمد پر مشہور و معروف ادیب و شاعر وسیم بجنائی کی جانب سے ماڈرن جونیر ہائی اسکول میں ۱۱/ مارچ 95. (ایک شام الحاج انیس دہلوی کے نام) کے عنوان سے ایک عظیم الشان مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت عالیجناب انوار الحق صاحب اے - ڈی - ایم شاہجہاں پور نے کی اور نظامت کے فرائض بانی، مشاعرہ وسیم بجنائی نے انجام دیئے - مشاعرہ کے آغاز سے قبل اعلانسر وسیم بجنائی نے مہمان خصوصی الحاج انیس دہلوی کی شخصیت، ادبی و صحافتی خدمات سے شرکائے مشاعرہ کو متعارف کرایا - شہر کے متعدد شعرا اور معتبر ہستیوں نے مہمان خصوصی کو ہار پہنائے - بعدہ، استاد الشعراء سید ارشاد حسین رشید شاہجہاں پوری کے بہترین مجموعہ کلام "دست نگاریں" کی رسم اجرا الحاج انیس دہلوی کے مبارک ہاتھوں سے انجام پائی جسے مصنف کے فرزند ارجمند جناب ڈاکٹر سید ارشد حسین لکچرر شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ نے نہایت عمدگی کے ساتھ مرتب کرکے شائع فرمایا ہے - مشہور شاعر حضرت نسیم شاہجہاں پوری نے ایک جامع سپاس نامہ پڑھا اور انیس دہلوی صاحب کو پیش کیا - مشاعرہ کا آغاز قاضی، شہر سید مسعود حسن نے شمع روشن فرماکر کیا - سب سے پہلے جام نسیمی نے "دست نگاریں" کے مصنف رشید شاہجہاں پوری مرحوم کی ایک شاہکار غزل ترنم سے سناکر خوب داد حاصل کی - بعدہ، مشاعرہ کا باقاعدہ آغاز ہوا - اور نسیم شاہجہاں پوری، ریاست علی خاں ریاست، ننھے میاں صنعت، مکاش عابدی، جام نسیمی، وسیم بجنائی، ظفر جلیل سلفی، سخاوت ظہیر پوری، افسر تلہری، خضر شاہجہاں پوری، ذاکر علی عرش، شاداب تلہری، سید رشید حسین اثر، مس شبنم تلہری وغیرہ نے اپنا کلام سنایا - اختتام پر مہمان خصوصی انیس دہلوی نے ایک جامع تقریر فرمائی اور اپنی زندگی کے سفر میں کامیابی کی منزل تک پہنچنے کی روداد بیان کرتے ہوئے اس راہ میں آنے والی دشواریوں، سختیوں اور صعوبتوں کے مرحلے بھی بیان کئے اور کہا کہ وہ خدا کی مہربانی سے زندگی کی جدوجہد میں کامیابی کے موجودہ مرحلوں تک پہونچے ہیں - اس کے بعد صدر مشاعرہ جناب انوار الحق نے شرکائے محفل سے نہایت خلوص کے ساتھ اپیل کی کہ آپ اردو کی ترویج و ترقی میں نمایاں حصہ لیں اپنے بچوں کو مادری زبان اردو ضرور پڑھوائیں - انہوں نے پرزور الفاظ میں کہا کہ ہم مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے بچوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلواکر غیر قوموں کے دوش بدوش کھڑا کریں تاکہ مستقبل میں وہ بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو سکیں - خطبہ صدارت

بقیہ صہ ۲۲۳

Metro Railway — Calcuttan's Dream Come True

ہر نیا دستخط کنندہ
قوم پر فخر کرتا ہے

ہر گاؤں جو بائیں محاذ حکومت کے ناخواندگی کے خاتمے کے منظم منصوبے میں شریک ہے یا تو تعلیم یافتہ رہا ہے یا ہونے والا ہے۔

علم ابجد ہر فرد کے روشن مستقبل کی فوری ضرورت ہے۔ آیئے ہم سب ہر گھر میں علم کی شمع فروزاں کر دیں۔
تاکہ تعلیم کو فروغ ہو۔

حکومت مغربی بنگال

Government of West Bengal

مشرقی ہندوستان کا بہترین اور واحد بین الاقوامی اُردو رسالہ

ماہنامہ اِنشاء کلکتہ

شمارہ ۸	اگست ۱۹۹۵ء	جلد ۱۰

مُدیر: ف۔س۔ اعجاز

فہرست

منظومات:

فی شمارہ : ۸ روپے
زر سالانہ : ۹۰ روپے
مغربی ممالک سے: ۱۲ پونڈ یا
۲۰ ، امریکی ڈالر

رقومات بذریعہ منی آرڈر/ بینک ڈرافٹ/ چیک صرف "انشاء پبلی کیشنز" کے نام میں روانہ فرمائیں ورنہ قابلِ قبول نہ ہوں گی۔ برطانیہ سے BPO کے ذریعہ رقومات بھیجی جائیں۔

خط و کتابت/ مضامین بھیجنے اور ترسیل زر کا پتہ:
ماہنامہ اِنشاء انشاء پبلی کیشنز
۲۵۔بی زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳، فون: ۲۶۹۱۴-۲۵

کوڑے کا ٹب

وہانہ کھول دو کوڑے کے ٹب کا
مجھے اجلے شرافت کے کفن میں
گھنونے شہر کی ساری نفاست
جس کا یہ اظہار کرتا ہے
اسی مکروہ ویرانے میں
اگلی صبح سے پہلے
اسی کوڑے کے ٹب میں پھینک جانا ہے
کوئی کتا نہیں بھونکے
اگر بھونکا تو میرے ہاتھ میں پستول ہے
خاموش کر دوں گا!

تندور مرڈر کیس

حادثے کی آنکھوں میں کیمرہ نہیں ہوتا
حادثے کی آنکھوں میں کیمرہ لگا دیجئے
تاکہ جو بھی قاتل ہو اس کا نقش رہ جائے
حادثے کی آنکھوں میں ایک کیمرہ ہونا
اب بہت ضروری ہے!

۱۹۹۵ — ریل استعمال کرنیوالوں کا سال

پہلا یوم آزادی اور اس کے بعد

تحریر : رئیس الدین فریدی۔

مدیر "روزانہ ھند" - ساگر دت لین - کلکتہ - ۷۳

رئیس الدین فریدی صاحب تقریباً ۴۵۰ صفحات پر مشتمل اپنی سوانح حیات ترتیب دے چکے ہیں - عنقریب ان کی سرگزشت حیات کتابی صورت میں منظر عام پر آجائے گی - زیر نظر مضمون اس کتاب کا ایک باب ہے اور قارئین انشاء کی فرمائش پر خاص طور پر مصنف سے حاصل کیا گیا ہے -

مضمون معلومات بلکہ انکشافات کا خزانہ ہے - اس میں فریدی صاحب کے کئی سیاسی اور تاریخی مشاہدے ضبط تحریر میں آگئے ہیں - اس تحریر کے مطالعہ سے دل پر عجیب سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے - ہمارا اندازہ ہے کہ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد لوگوں میں فریدی صاحب کی مکمل سوانح حیات پڑھنے کا زبردست اشتیاق پیدا ہوجائے گا ....

(مدیر)

آزادی سے پہلے ملک جن دردناک کرب ناک اور ہولناک حالات سے دوچار تھا اس کا ذکر پچھلے صفحوں میں تفصیل سے آچکا ہے لہذا پہلی ۱۵/ اگست ۴۷ء میں ایسی آئی خدا کسی دشمن کو بھی اس طرح آزادی کی صورت دیکھنے سے بچائے - ملک میں چاروں طرف آگ لگی ہوئی تھی خصوصاً شمالی، مشرقی اور وسطی ہندوستان میں یہی حال اس ملک کا بھی تھا جو ایک دن پہلے پاکستان کے نام سے عالم وجود میں آچکا تھا - ادھر سے مسلمان گھر بار کی تباہی اور جان کے خوف سے بے سر و سامان پاکستان کو بھاگ رہے تھے اور وہاں ہندوؤں اور سکھوں کی املاک پر قبضہ کررہے تھے تو ادھر سے ہندو اور سکھ لاکھوں کی تعداد میں وحشت و سراسیمگی اور تاریک مستقبل کے سائے میں چلے آرہے تھے - کس طرح آرہے تھے اور اثنائے راہ میں کیسی مار کاٹ اور رہزنی کا شکار ہورہے تھے - اس کا حال کئی کتابوں میں بھرا ہوا ہے -

جو مسلمان ہندوستان میں رہنے کی ٹھانے ہوئے تھے ان کی یہ حالت تھی کہ مہینوں سے گھروں اور محلوں میں پہرہ دینے، جان کے خوف میں مبتلا رہنے اور کسی وقت بھی پولیس کے آنے اور پکڑ کر لے جانے کے ڈر سے اور موٹا جھوٹا کھانے کی وجہ سے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور بدن میں کاٹو تو خون نہ تھا - روشنی کی صرف ایک کرن گاندھی جی کی صورت میں نظر آرہی تھی جو آزادی کے وقت بنگال، بہار وغیرہ میں بھڑکی ہوئی فرقہ پرستی اور برادر کشی کی آگ کو میٹھی باتوں آنسوؤں اور پسینے سے بجھاتے جان ہتھیلی پر لئے پھر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ایسی آزادی دیکھنے سے پہلے میں مر کیوں نہ گیا - ان کے لئے آزادی ذہنی کوفت دلی دکھ اور زندگی سے بیزاری کا پیغام لے کر آئی تھی اور عملی طور پر کروڑوں آدمی اسی حالت سے دوچار تھے - **پہلے یوم آزادی کو دہلی اور شمالی و وسطی ہند میں جو کچھ ہورہا تھا اس کا تو میں چشم دید گواہ نہیں مگر مختلف ذرائع سے جو کچھ معلوم ہورہا تھا اور بعد میں بھی ہوا اس کا خلاصہ یہی ہے کہ حکومت اور کانگریس کے کارندوں نے نجومیوں کے مشورہ سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے آزادی کا پروانہ حاصل کرنے کے لئے ۱۴ اور ۱۵ اگست کی عین آدھی رات کا وقت طے کیا تھا اور پارلیمنٹ ہاؤس کے بڑے ہال میں اس کی تیاری ہورہی تھی تو ہال کے باہر بہت سے کانگریسی پوجا پاٹ کرنے، تلک لگانے اور گیندے کے ہار بانٹنے میں لگے ہوئے تھے اور باہر وہی پرانا کھیل ہورہا تھا - بمبئی شہر میں جو کچھ ہورہا تھا وہ میں ضرور دیکھ رہا تھا۔**

۱۵/ اگست ۴۷ء کو تقسیم کے ساتھ آزادی کا اعلان ہوتے ہی فرقہ وارانہ فسادات رک گئے

تھے - ہندو خوشی میں اور مسلمان مجنب مٹانے اور مستقبل کی تاریکی کا ڈر بھگانے کے لئے آزادی کا استقبال کرنے میں لگ گئے تھے - بمبئی شہر خصوصاً گیٹ وے آف انڈیا فورٹ اور کلابہ کے سرکاری اور کاروباری علاقوں میں بڑی سجاوٹ اور روشنی ہورہی تھی اور بے حساب لوگ پیدل اور ہر قسم کی سواریوں میں بھرے جن میں ٹرک بھی شامل تھے نعرے لگاتے اور باجے بجاتے ہوئے سجے ہوئے علاقوں کی سیر کو جارہے تھے - دن عید اور رات شب برات معلوم ہورہے تھے - ۱۴/ اگست کی شام کو کلکتے کے میر شہر نے کارپوریشن کے ممبروں اور معززین شہر کو جن میں اہم اخبار نویس بھی تھے عصرانے پر بلا رکھا تھا جس کے لئے کارپوریشن کی بلند و بالا عمارت کی کھلی ہوئی چھت پسند کی گئی تھی - تمام حاضرین جن میں میں اور اسوسی ایشن کے کئی دوسرے رکن شامل تھے نیچے کی سڑکوں کے اس پرجوش مگر پرامن جشن مسرت پر پھولے نہیں سمارہے تھے اور یہی حالت برقرار رہنے کی دعاء کررہے تھے - آزادی کے دوسرے دن آخری انگریز وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن بمبئی آکر گورنمنٹ ہاؤس میں مقیم ہوئے تو ان کی خوب خوب پذیرائی ہوئی اور جب شام کو وہ تاج محل میں دو ہزار کے قریب آدمیوں کے عصرانے میں شرکت کو آئے تو میں نے بھی اس میں شرکت کے لئے پیدل ہی جاتے ہوئے یہ منظر دیکھا کہ وہ اور ان کی لیڈی موٹر میں کھڑے ہوئے ہیں اور ہندوستانیوں کا ایک ہجوم نعرے لگاتے ، تالیاں بجاتے ، ہاتھ ہلاتے ہوئے مصافحے کے لئے موٹر کے قریب جانے کی کوشش کررہا ہے اور میاں بیوی دونوں مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلارہے ہیں -

اس جشن مسرت میں ہماری بمبئی اردو جرنلسٹ اسوسی ایشن نے بھی شرکت کا فیصلہ کیا - وزیراعظم بالاجی کھیر اور وزیر داخلہ مرارجی دیسائی سے عصرانے کا مہمان خاص بننے کی درخواست کی جسے دونوں نے ۱۸/ اگست کے لئے خوشی سے منظور کرلیا - جگہ تاج محل ہوٹل کے قریب کا شاندار گرینس ہوٹل تجویز ہوئی - کھیر صاحب نے چھوٹی سی شرط یہ رکھی تھی کہ جب مدعوین جمع ہوجائیں تو میں دفتر سے ان کو لے جاؤں - میں مناسب وقت پر وہاں پہونچا تو سکریٹری ایٹ کے تمام دفتر بند ہوچکے تھے - صرف کھیر صاحب کا دفتر کھلا ہوا تھا اور دروازے پر ان کا تنہا چپراسی ایک اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا - اب ایسا واقعہ پیش آیا کہ میں کھیر صاحب کی شرافت کے سامنے سرنگوں ہوگیا - وہ اپنی میز پر بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے تھے - آہٹ پاتے ہی نظر اٹھاکر دیکھا تو پہلا کام یہ کیا کہ گاندھی ٹوپی جو میز پر رکھی ہوئی تھی اٹھاکر سر پر رکھ لی - میں اگرچہ شیروانی پہنے ہوئے تھا مگر اس سے قطعی غافل تھا کہ کسی سے ملتے وقت ٹوپی اوڑھنا ہندوستانی تہذیب کا لازمہ ہے - خیر وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوگئے - نیچے آئے اور میرے ساتھ اپنی چھوٹی سی موٹر میں بیٹھ گئے - چپراسی آگے بیٹھ گیا - ایک زمانہ وہ تھا کہ وزیراعظم کے دفتر میں جانے کے لئے کوئی روک ٹوک نہ تھی - نہ پولیس والے گھیرتے تھے نہ تلاشی ہوتی تھی - نہ نسب نامہ سنا جاتا تھا اور ایک زمانہ آج کا ہے کہ کسی وزیر تو کیا معمولی کلرک سے ملنے کے لئے بھی کوہ بے ستون کو پار کرنا پڑتا ہے - وجہ یہ کہ سیاسی رہنماؤں کی عزت تھی ، ان کا کوئی دشمن نہ تھا - لوگ ان کو اپنا ہی خواہ اور ہمدرد مانتے تھے اور وہ تھے بھی ایسے ہی -

مرارجی دیسائی کھیر صاحب سے پہلے ہی آگئے تھے - جلسے کی کارروائی میری تقریر سے شروع ہوئی جس میں میں نے ۱۸۵۷ء سے لے کر اس وقت کی اس جدوجہد اور قربانی کا ذکر کیا جو اردو کے اخباروں اور اخبار نویسوں ، ادیبوں اور شاعروں نے عوام میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے کی تھی اور آزادی کے بعد پرانے جذبات اور احساسات کو زندہ رکھنے اور ترقی دینے کی ضرورت ظاہر کی - اس کے بعد کھیر صاحب نے جو میری گزارشات کے درمیان آنکھیں بند کئے بیٹھے رہے تھے بڑے درد کے ساتھ پچھلے برسوں کے واقعات اور تقسیم کی وجہ سے ہونے والی خونریزی ، تباہی اور انسانی مصیبتوں کا ذکر کرتے ہوئے ماضی کو بھول جانے اور پچھلی غلطیوں سے بچنے کی ضرورت ظاہر کی - کھیر صاحب کے بعد مرارجی بھائی نے جو میری اور کھیر صاحب کی تقریروں کے درمیان زہرخند میں مبتلا رہے تھے تقسیم ملک پر غم و غصے کا اظہار کرنے کے بعد یہ بھی کہا کہ پرانی باتیں اب نہیں چلیں گی - مسلمانوں کو کافی بدلنا پڑے گا - ہندو زمانہ قدیم ہی سے فراخ دل ہے - اس لئے اس نے مسلمانوں کو بھی برداشت کیا اور آخر میں ملک کا ایک ٹکڑا بھی کاٹ کر ان کو دے دیا - اب جو مسلمان یہاں رہ گئے ہیں ان کو بھی فراخ دل بننا چاہیے - وہ چاہیں تو ہم ان کو ہندو سوسائٹی کا ایک انگ بنا سکتے ہیں - ہم نے دوسرے مذہبوں کے دیوی دیوتاؤں کو اپنے دھرم میں بھی رتبہ دے کر اپنے اندر شامل کرلیا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کرسکتے ہیں اور مسلمان ہندوؤں کی ایک ذات بن کر یہاں رہ سکتے ہیں -

آخر میں اسوسی ایشن کے صدر ڈاکٹر عبدالحمید قاضی نے شکریہ ادا کرتے ہوئے مرارجی بھائی کی بعض نصیحتوں سے نرم لفظوں میں اختلاف کیا اور چائے نوشی کے بعد جلسہ ختم ہوا - یاد پڑتا ہے کہ ہوٹل والوں نے چائے ، بسکٹ اور پیسٹری کا

معاوضہ سات روپے فی کس لیا تھا جو آج کل ۱۰۰ روپے سے کم نہ ہوگا۔

کھیر صاحب کی خوبیاں

بالاجی کھیر مرہٹوں کے ایک اونچے خاندان سے تعلق رکھتے تھے - شرافت ان کی صورت سے ٹپکتی تھی - ہمیشہ دھوتی، شیروانی اور گاندھی ٹوپی میں ملبوس رہتے تھے - سگریٹ یا کوئی اور مکروہ چیز تو کیا پان سے بھی شوق نہیں کرتے تھے - کہا کرتے تھے کہ میری تعلیم خاندانی رواج کے مطابق فارسی سے شروع ہوئی تھی اور گلستاں بھی پڑھی تھی - جب بھی مسلمانوں کے کسی جلسے میں شریک ہوتے تھے تو تقریر میں گلستاں کے کچھ شعر بھی حافظے پر زور ڈال کر سنا دیتے تھے - مثلاً غریبوں کی مدد پر زور دیتے ہوئے

منعم کسے رابود روزہ داشت
کہ وا ماندگاں رادہد نان چاشت

(روزہ رکھنا اسی کو زیب دیتا ہے جو دوپہر کی روٹی غریبوں کو دیدے)

بنی آدم اعضائے یک دیگرند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضو ہارا نہ ماند قرار

(انسان ایک دوسرے کے بدن کے حصوں کی طرح ہیں کیونکہ سب کی تخلیق ایک ہی جوہر سے ہوتی ہے اگر زمانہ کسی ایک عضو میں درد پیدا کرے تو دوسرے اعضاء بھی بے چین ہو جاتے ہیں)

فسادات کے طویل سلسلے میں وہ بہت افسردہ اور پریشان رہتے تھے - وزیر داخلہ اگرچہ مرارجی بھائی تھے مگر کھیر صاحب کی ہدایت تھی کہ فساد کی ہر خبر ان کو دی جائے اور فساد کے مقامات پر وہ خود پہنچ جاتے تھے - وہ کہا کرتے تھے کہ جب بھی ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے مجھے ہول دل ہو جاتا ہے کہ نہ جانے کہاں کیا ہو رہا ہے -

آزادی کے بعد ایک دن پائیدھونی کے علاقے میں رات کو دس بجے فساد شروع ہوا تو اخبار نویس وہاں کو دوڑ پڑے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کھیر صاحب وہاں موجود ہیں اور پولیس والوں سے رنگاری محلے کی گلیوں میں جا کر فساد پر قابو پانے کو کہہ رہے ہیں جہاں آمنے سامنے کی عمارتوں سے پتھروں اور آگ کے گولوں کی بارش ہو رہی تھی - ان کی بیوی بھی سادگی اور شرافت میں ان کا جواب تھیں - صورت شکل میں بڑی دلکش مگر ہمیشہ مرہٹی وضع کی سادی سی ساڑھی میں ملبوس - ایک دن کھیر صاحب کے ساتھ ایک جلسے میں آئیں تو جلسے کے بعد میں نے بڑے ادب سے پوچھا کہ مائی جی آپ کو کھیر صاحب کی وزارت کیسی لگتی ہے تو آنکھیں جھکا کر بولیں کہ دیش کی سیوا کی بات تو ٹھیک ہے مگر دکھ یہ ہے کہ وہ جب سے منتری بنے ہیں ان کو چین نہیں ملتا - دنگے سے بڑے دکھی رہتے ہیں - رات کو چین سے سو بھی نہیں سکتے -

مرارجی دیسائی

مرارجی بھائی کا ذکر تو لگاتار آہی رہا ہے اور آئندہ بھی آتا رہے گا - ان کے متعلق یہاں اتنا بتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ وہ بہت غریب خاندان کے چشم و چراغ تھے - بچپن میں میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے - تعلیم میں اچھے تھے اس لئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے آئی سی ایس میں آگئے اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے تک پہنچے لیکن [illegible] ملازمت سے مستعفی ہو کر [illegible] گاندھی جی [illegible] آزادی کی جدوجہد میں شامل ہو گئے - وہ گاندھی جی سے [illegible] سردار پٹیل کے حلقے تھے - کھیر صاحب کے بعد بمبئی کے وزیر اعظم بھی رہے - پھر مرکز میں چلے گئے - جب سنڈیکیٹ اور اندرا گاندھی میں جھگڑا ہوا تو یہ سوشلزم کے مخالف سنڈیکیٹ میں شامل رہے اور نائب وزیر اعظم کے عہدے سے مستعفی ہو گئے کیونکہ وہ بینکوں کو قومی ملکیت میں لینے کے خلاف تھے - جنتا پارٹی بنی تو اس میں شامل ہو کر ۷۷ء میں وزیر اعظم ہو گئے مگر ساتھیوں خصوصاً چرن سنگھ سے ان کی نہ بنی اس لئے وزیر اعظم کا عہدہ چھوڑنا پڑا۔

آدمی سخت مزاج تھے - موافقت پر خوشی کا اظہار نہیں کرتے تھے - مخالفت پر برہم ہو جاتے تھے - پھر بھی اتنی بات ضرور تھی کہ ہر معقول مطالبے کو خاموشی سے پورا کر دیتے تھے - قواعد و ضوابط کی حد سے زیادہ پابندی کرتے اور دوسروں سے کرانے کی کوشش میں رہتے تھے - فسادات اور مسلم لیگ کے زور کے زمانے میں بہت برہم رہتے تھے اور تمام اخبار نویسوں خصوصاً اردو اخباروں کے ایڈیٹروں کو اپنے دفتر میں یا کوٹھی پر بلا کر سخت سست کہتے رہتے تھے - اسی قسم کے ایک جلسے میں میں نے کہا کہ آپ پاکستان بنانا قبول کرلیں تو سارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے - یہ سن کر مجھے گھور کر دیکھا اور سخت لہجے میں کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا - مگر جب مرکز میں وزیر اعظم ہوئے تو پاکستان سے اچھے تعلقات رکھے اسی لئے جنرل ضیاء الحق نے ان کو "ہلال پاکستان" کا تمغہ دیا جسے لینے کو پاکستان نہ جا سکے اور پاکستانی سفیر نے بمبئی آکر ان کو دیا - زمانہ وزارت میں ان کے وزیر خارجہ اٹل بہاری واجپئی نے اسرائیل کے فوجی جلاد موشے دیان کو جو وزیر خارجہ ہو گیا تھا چوری سے ہندوستان بلایا اور ان سے [illegible] ملاقات کرائی اگرچہ وہ اس سے خوش نہیں تھے - اور واجپئی جی کی ترقی کے [illegible] انہوں نے

ہر قدم کا رہنما.........
آرام کی سچّی پہچان
۶ ماہ کی گارنٹی
ہماری دوسری پیش کش:
• جنتا فوم
• جنتا ہوائی
JRI
تیار کردہ:
جنتا ربر انڈسٹریز
کلکتہ - ۷۰۰۰۴۶
نیلے رنگ میں بھی دستیاب ہے

موصوف دیان سے صرف اتنی بات کی کہ آپ جب تک عربوں کی زمین پر غاصبانہ قبضہ رکھیں گے ہمارے اور آپ کے ملک میں دوستی نہیں ہوسکے گی افسوس کہ ۱۵ سال کے اندر ہی امریکہ کے زیر اثر جو سوویت یونین کے خاتمے کے بعد دنیا کی واحد قوت عالیہ ہوگیا ہے ہندوستان کی القلیتی کانگریسی حکومت نے اسرائیل سے پوری دوستی کرلی اور مختلف میدانوں میں اس سے تعاون پر مجبور ہوگیا اور گاندھی جی اور جواہر لال کی تعلیمات کو بالائے طاق رکھ دیا - وجہ کیا ہے امریکہ اور اس کے دوستوں سے ملنے والا قرض اور اس کی دشمنی سے محفوظ رہنے کا خبط

قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند

اخبار خلافت کی پالیسی کی وجہ سے وہ مجھ سے بھی خوش نہ تھے - پھر بھی مجھے اور ڈاکٹر عبدالحمید قاضی کو مشورے کے لئے بلاتے رہتے تھے - ان کا خیال یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ فرقہ پرست تو نہیں مگر کھل کر سامنے آنے سے مجبور ہیں اور حقیقت بھی اس کے قریب ہی تھی - کبھی کبھی مذاق میں کہہ دیا کرتے تھے کہ میں تجھے پکڑنے کی کوشش تو کرتا ہوں مگر تو بڑا چالاک ہے - افسوس کہ ۹۵ء میں ۹۹ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا ہوش و حواس آخر تک درست رہے - اس وقت بابری مسجد کا جو قضیہ چل رہا ہے اس سے ان کو اتفاق نہیں تھا - کھل کر تو کچھ نہیں کہتے تھے مگر عمل سے ہندو فرقہ پرستوں کو اپنی رائے سے واقف کرتے رہتے تھے - چنانچہ ۹۰ء میں جب لال کشن اڈوانی نے بابری مسجد کے معاملے پر سارے شمالی ہند میں آگ لگانے کے لئے جیپ گاڑی کو رام رتھ بناکر گجرات کے سومناتھ کے مندر سے بابری مسجد تک کی یاترا شروع کرنی چاہی تو مرارجی بھائی نے جو سومناتھ کے مندر کے ٹرسٹی تھے ان کو مندر کے احاطے میں گھسنے کی اجازت نہ دی اور یاترا باہر ہی سے شروع ہوئی اس وقت انہوں نے بتایا کہ اس مندر کے احاطے میں ایک مسجد بھی ہے اور اس میں اذان اور نماز بھی ہوتی ہے - مقصد شاید یہ بتانا تھا کہ مندر اور مسجد ساتھ ساتھ بھی رہ سکتے ہیں -

ایک لطیفہ بھی ان سے وابستہ ہے جب وہ ۹۰ سال کے ہوئے اور لوگ مبارک دینے گئے تو کہا کہ کیسے نوے سال میں تو ابھی ۲۵ سال ہی کا ہوں نکتہ یہ ہے کہ وہ ۲۹ فروری کو پیدا ہوئے تھے اور ۲۹ فروری چار سال میں ایک بار ہی آتی ہے -

خانہ تلاشی

مرارجی بھائی سے میرا اور اردو جرنلسٹ اسوسی ایشن کا ایک ایک بار ہی سخت جھگڑا ہوا - ۴۸ء میں جب ریاست حیدرآباد کی ہندیونین میں شرکت کا جھگڑا چل رہا تھا اور مجلس اتحاد المسلمین کے رضاکاروں کی سرگرمی بڑھ رہی تھی تو اس کا اثر ملک کے دوسرے حصوں پر بھی پڑ رہا تھا خصوصاً اس وجہ سے کہ ریاست کے قریبی ہندوستانی علاقوں کے مسلمانوں کو حیدرآباد میں جمع کرنے کی تحریک بھی چلادی گئی اور اس طرح ہزاروں آدمی حیدرآباد میں بھرگئے تھے - خیال یہ بھی تھا کہ دوسرے علاقوں میں بھی رضاکاروں کے حامی موجود ہیں - لہذا کسی مخبری کی بناء پر یا بطور احتیاط خلافت ہاؤس کی بھی تلاشی لی گئی کیونکہ مولانا شوکت علی کے حیدرآباد کے حاکموں سے اچھے تعلقات رہ چکے تھے اور حیدرآباد کے دونوں شہزادوں اعظم جاہ اور معظم جاہ کی شادی ترکی کی دو شہزادیوں در شہوار اور نیلوفر سے کرانے کی کوشش میں حصہ لینے کی وجہ سے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہوگیا تھا اس لئے خلافت ہاؤس کی پوزیشن بھی مشکوک ہورہی تھی - خیر ایک سندھی پولیس آفیسر جو نیا نیا کراچی سے آیا تھا اور اردو جانتا تھا تلاشی لینے کو آیا تو اسے کچھ نہ ملا - جس فلیٹ میں میں بیوی کے ساتھ رہتا تھا اس کو بھی کھولا نہیں گیا - حالانکہ حالت یہ تھی کہ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں - میرے کاغذات میں سے اسے صرف ایک چھپا ہوا اشتہار ملا جو پاکستان سے آیا تھا اور اس میں ہندوستانی مسلمانوں کو کچھ مفسدانہ مشورے دیئے گئے تھے - اس نے وہ کاغذ ہی مرارجی بھائی کو دکھایا ہوگا - تلاشی کے بعد میں نے پریس ایڈوائزری کمیٹی کے ممبروں کو سخت احتجاجی خط لکھا جو مرارجی بھائی کی طرف بڑھا دیا گیا - ایک دن انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ اس میں احتجاج کرنے کی کیا بات ہے - تلاشی شک دور کرنے کے لئے لی گئی تھی اور جب تم بھی وہاں رہتے ہو تو تم کیسے بچ سکتے تھے - بہرحال اب کوئی شک نہیں رہا - تاہم انہوں نے پاکستانی اشتہار کی بات کو بڑھانا چاہا اور کہا کہ اسے اپنے پاس رکھنے کی کیا ضرورت تھی - میرے پاس بھیج دیا ہوتا - اس پر میں نے کہا کہ اخباروں کے دفتروں میں نہ جانے کیا کیا الا بلا آتی رہتی ہے میں اسے آپ کے پاس کہاں تک بھیجوں گا - ایسی چیزوں کو ہم خود ہی پھینک دیتے ہیں - اس لئے زیر بحث اشتہار بھی ضائع نہیں کیا مگر کسی طرح وہ تلف ہونے سے بچ گیا اس کے بعد وہ یہ کہہ کر خاموش ہوگئے کہ آئندہ احتیاط کرنا -

کلاپے کا فساد

۴۸ء میں میں بمبئی پریسڈنسی کے مہاراشٹر کے ضلع کلاپہ میں فساد ہوا - یہ وہ زمانہ تھا کہ مرارجی بھائی نے فسادات کی خبریں شائع کرنے پر بے لکھی پابندی لگا رکھی تھی کیونکہ فسادات یک طرفہ ہوگئے تھے اور ہر فساد کی خبر پاکستان میں بڑھا چڑھا کر شائع کی جاتی تھی - یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور پاکستان کے احمق حاکم اس کو

ہندوستانی مسلمانوں کی بدحالی خود مت سکھنے کے خبط میں مبتلا چلے آرہے ہیں حالانکہ یہ مکاری کے سوا کچھ نہیں - ان کی اس نمائشی ہمدردی سے ہندوستانی مسلمانوں کا کام بھی بگڑتا ہے اور دونوں ملکوں کے تعلقات بد سے بدتر الگ ہوتے ہیں - آج کل یہی صورت بابری مسجد اور کشمیر کے معاملوں میں بھی ہورہی ہے اور وہ ہیں کہ اپنے اعمال پر نظر ڈالنے کی ضرورت سے بے نیاز ہیں - مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کو لوٹ کر، ستاکر، بے عزت کرکے اور ان کی زبان اور طرز زندگی کو تبدیل کرنے کے خبط میں انہوں نے بنگلہ دیش بنوایا - وہاں کے جن مسلمانوں نے خود کو پاکستانی لکھوا کر بنگلہ دیش سے روحانی وطن کو واپس جانا چاہا وہ ابھی تک لاکھوں کی تعداد میں وہیں سڑ رہے ہیں - اور جو ہندوستانی مسلمان لاکھوں کی تعداد میں پاکستان جانے پر مجبور ہوئے تھے یا ہندوؤں کی جگہ پاکستان کی سیاسی، تجارتی اور انتظامی کشتی کو ڈوبنے سے بچانے کی خاطر ہزاروں سبز باغ دکھاکر لے جائے گئے تھے کراچی کی سڑکوں گلیوں اور کوٹھریوں میں پولیس، فوج اور غنڈوں کی گولیوں سے مچھروں اور مکھیوں کی طرح مارے جارہے ہیں - رہا کشمیر تو وہاں جو کچھ ہورہا ہے اس کی ذمہ داری سے پاکستان کہاں مبرا ہے -

بہرحال کلاسہ کے فساد کے بعد ہماری اسوسی ایشن کی طرف سے قاضی صاحب، میں خود، احمد علی علوی، خواجہ غلام جیلانی اور انعام نبی پردیسی مانگی ہوئی موٹر میں روانہ ہوتے تو کلیان سے کلاسہ کی سب سے بڑی بستی اورن کو جانے والی سڑک پر یہ منظر دیکھا کہ سڑک کے دونوں طرف کے تناور درخت راستہ بند کرنے کے لئے کاٹ کر سڑک پر ڈال دیئے گئے ہیں تاکہ پولیس وہاں نہ پہونچ سکے - غور کیا تو نظر آیا کہ شاید پولیس کی کسی جیپ کے گزرنے کے لئے راستہ بنایا گیا تھا - اس پر ہماری چھوٹی سی موٹر بھی لڑھکنے لگی - راستے میں جگہ جگہ مسجدوں، مقبروں اور چھوٹی چھوٹی دکانوں میں توڑ پھوڑ اور آتش زنی کے نشانات نظر آئے - ضلع کی ایک بستی بھونڈیل پہونچے تو وہاں بہت سے پناہ گزین دیکھے جن کی مقامی مہمان دیکھ بھال کررہے تھے - یہاں مسلمانوں نے ہماری بھی بڑی آؤ بھگت کی اور مچھلی اور خشکے کی دعوت بھی کی - ایک دو کانگریسی لیڈروں سے بھی بات چیت کی جنہوں نے فسادیوں کا مقابلہ کرنے سے بے بسی ظاہر کی مگر قیام امن کے کام میں تعاون کا وعدہ کیا - ان کا سب سے بڑا عذر یہ تھا کہ فسادی اتنے منظم اور مسلح ہیں کہ عام آدمی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے - یہ کام پولیس کرسکتی ہے مگر اس کی تعداد بہت کم ہے بھونڈیل سے ہم لوگ اورن گئے جو فسادیوں کا خاص نشانہ تھا کیونکہ یہاں مسلمان بڑی تعداد میں ہیں اور سمندر سے نمک بناکر فروخت کرنے اور ناریل کے باغوں کی وجہ سے بہت سے خوش حال بھی ہیں - وہاں جاکر معلوم ہوا کہ اورن پر حملہ کرنے کے لئے ہزاروں مسلح مرہٹے چڑھ آئے تھے - ان کے مقابلے کے لئے مسلمان بھی بڑی سڑک پر جمع ہوگئے تھے - پولیس کے صرف چند بندوق بند سپاہی دونوں کے بیچ میں حائل تھے - دونوں طرف سے پتھراؤ ہورہا تھا - اتنے میں کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ہندوؤں کی طرف سے آنے والی ایک اینٹ ایک پولیس والے کو لگی جو بہار مالی نیچی مگر جنگ جو ذات کا آدمی تھا - اسی میں ڈاکٹر امبیڈکر بھی پیدا ہوئے تھے - پتھر لگتے ہی اس کی بندوق خود بخود چل گئی یا اس نے خود چلائی مگر حملہ آور ہجوم میں بھگدڑ مچ گئی اور اورن کے مسلمان بچ گئے - مسلمانوں نے ہم لوگوں سے کہا کہ خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے - پھر حملہ ہوسکتا ہے اس لئے بمبئی جاکر مرارجی بھائی سے مزید پولیس بھیجنے کو کہیے - شام کو واپس آکر تھکا ماندہ ہونے کے باوجود میں نے رپورٹ لکھنی شروع کی - مکمل کرکے قاضی صاحب کو دکھائی اور منظوری کے بعد عام اردو اخباروں کو اشاعت کے لئے دیدی - اور دوسرے دن وہ شائع ہوگئی - اب ہم دونوں کا بلاوا آیا اور مرارجی بھائی اس دن واقعی بہت غصے میں تھے - کہا کہ میں مسلمانوں کو بچانے کی پوری کوشش کررہا ہوں مگر آپ لوگ شرارت سے باز نہیں آتے - ہم سمجھے کہ معاملہ رفع دفع ہوگیا ہے مگر انہوں نے اسے پریس ایڈوائزری کمیٹی میں لانا ضروری سمجھا اور اس دن ہوم سکریٹری کی جگہ خود ہی صدارت کرنے کو آدھمکے - رپورٹ کا ترجمہ سرکاری طور پر آگیا تھا - اس کو پڑھ کر کچھ ممبر تو خاموش ہوگئے - بعض نے دبے لفظوں میں معاملہ رفع دفع کرنے کو کہا - ڈاکٹر قاضی نے اور میں نے جو دلیلیں دیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ کلاسہ میں جو کچھ ہوا وہ فرقہ وارانہ فساد نہیں بلکہ ایک فرقے پر دوسرے کا بے سبب حملہ تھا - نیز اس کا مقصد حکومت کو وہاں کے حالات سے باخبر کرنا بھی تھا - مرارجی بھائی مطمئن تو نہ تھے مگر یہ دیکھ کر کہ کمیٹی ان کا پورا ساتھ نہیں دے رہی ہے اور یہ رپورٹ چونکہ تمام اردو اخباروں میں شائع ہوئی تھی اس لئے تمام اخباروں کے خلاف کارروائی کرنا بھی قرین مصلحت نہ تھا اس لئے خاموش ہوگئے اور ہم یہ کہتے ہوئے واپس ہوئے کہ جان بچی تو لاکھوں پائے -

بعد میں معلوم ہوا کہ مرارجی بھائی نے کلاسہ میں پولیس کی تعداد بڑھا دی ہے اور افسروں کو مزید فساد نہ ہونے دینے کی ہدایت بھی کی ہے - یہ بمبئی اردو جرنلسٹ اسوسی ایشن کا آخری کارنامہ تھا - اس کے بعد قاضی صاحب

کراچی کو اور میں حیدرآباد کو سدھار گئے اور کوئی دوسرا ایسا مطالبہ حریف سے مردانگی حق ہوتا

مسلمان اور قومی وفاداری

اب اپنی اسوسی ایشن کی ایک ایسی خدمت کا ذکر کرکے جو میرے نزدیک اس کا سب سے دلیرانہ کارنامہ بھی ہو سکتا ہے اس بیان کو جو کافی طویل ہو چکا ہے ختم کر دینا چاہتا ہوں ورنہ لکھنے کو تو ابھی بہت کچھ باقی ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی حالت اور بھی قابل رحم ہو رہی تھی۔ تقسیم کے نتیجے میں پاکستانی علاقوں سے ہندوؤں اور سکھوں کو جان بوجھ کر اکھاڑا اور بھگایا جا رہا تھا۔ راستے میں ان کے قافلوں پر حملے بھی ہو رہے تھے۔ یہ لوگ ہندوستان آکر مسلمانوں کو مار کاٹ کر کے بھگا رہے تھے اور ان کے بھرے پرے گھروں، دکانوں، کارخانوں، مسجدوں، مدرسوں اور مقبروں پر قبضہ کر رہے تھے۔ کتب خانوں کو جلا رہے تھے۔ دلی میں انجمن ترقی اردو کا دفتر اور کتب خانہ بھی جو مشہور قومی لیڈر ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کی تاریخی کوٹھی میں تھا لوٹا اور جلا دیا گیا تھا۔ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دلی اور کئی دوسرے مقامات پر نادر اور بیش قیمت قلمی کتابیں آگ تاپنے کے لئے جلائی جا رہی ہیں۔ مسلمان بھاگنے سے پہلے کثرت سے اثاث البیت کوڑیوں کے مول فروخت کر رہے تھے اور دلی اور مغربی یوپی میں ہر گھر کے باہر کباڑی کی دکان لگی ہوئی تھی کیونکہ ہر شخص جان اور عزت کو بچانے کے لئے پاکستان بھاگنے کی فکر میں تھا۔ دلی میں شہر کے اطراف کے مسلمان بے گھر بے در ہو کر ہزاروں کی تعداد میں جامع مسجد، ہمایوں کے مقبرے اور پرانے قلعے میں بھیڑوں بکریوں کی طرح جمع تھے۔ یہاں سے جو لوگ بھاگ رہے تھے ان کی اسپیشل ٹرینوں، بسوں اور پیدل قافلوں پر بھی حملے ہو رہے تھے اور ان کو لوٹا اور جوان لڑکیوں کا اغوا کیا جا رہا تھا۔ الغرض سارے ملک میں مسلمانوں کے لئے قیامت برپا ہو رہی تھی۔ گاندھی جی مسلمانوں اور پاکستان کی حمایت کے الزام کی بناء پر ۳۰ جنوری ۴۸ کو قتل کئے جا چکے تھے اور ان کے قاتل ناتھورام گوڈسے کی شان میں قصیدے پڑھے جا رہے تھے۔ جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کی کوشش سے یہ طوفان ۲۰ مہینوں بعد بڑی مشکل سے رکا تھا۔ اور مغربی یوپی کو اتر پردیش کے وزیر داخلہ رفیع احمد قدوائی بڑی مشکل سے پناہ گزینوں کے سیلاب سے بچا رہے تھے اگرچہ اس کی پاداش میں ان کو یوپی کے وزیر اعظم پنڈت گووند ولبھ پنت وزارت سے نکالنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اور جواہر لال نہرو ان کو مرکزی حکومت میں لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ایک طرف یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو دوسری طرف سارے ملک میں مسلم کش فسادات کی لہر پھر چلنے لگی تھی۔ جہاں کسی مسلم آبادی میں کسی مزار پر ہرا کپڑا نظر آتا یا خود ہی لگا دیا جاتا تو یہ کہہ کر حملہ کر دیا جاتا کہ یہ پاکستان کا جھنڈا بلند کیا گیا ہے۔ مسلمانوں پر حملے کرنے کے لئے اور بھی طرح طرح کے بہانے بنائے جاتے جن میں چوری سے گائے کاٹنے کو خاص اہمیت دی جا رہی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ مرکزی اور صوبائی حکومتیں جانتی تھیں کہ یہ سب مکاری ہے مگر وہ بھی اس کی تردید اور فسادیوں پر سختی کرنے سے کتراتی تھیں۔ اس طرح مسلمان پٹ بھی رہے تھے اور بدنام بھی کئے جا رہے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ خود وزیر اعظم جواہر لال نہرو سے مرکزی اور صوبائی وزارتوں کے نام یہ خفیہ حکم نامہ جاری کر دیا گیا تھا کہ کسی مسلمان کو کسی اہم انتظامی عہدے پر نہ رکھا جائے۔ سرکاری اور نجی کارخانوں اور کاروباری اداروں کے دروازے بھی مسلمانوں پر بند کر دیئے گئے تھے اس وقت سب یہی سوچتے تھے کہ مسلمان اس ملک میں کیسے رہیں گے مگر رفتہ رفتہ حالت کچھ بہتر بھی ہو رہی تھی اور دستور ساز اسمبلی میں دستور کے جن مسودوں پر بحث ہو رہی تھی ان سے یہ امید ہونے لگی تھی کہ آئندہ مسلمانوں کو چین مل جائے گا مگر اس کے ساتھ میں اجودھیا میں بابری مسجد پر قبضہ کرلئے جانے کی وجہ سے مسلمانوں کے جذبات پر کاری ضرب لگائی گئی تھی۔ وزیر اعظم جواہر لال نہرو کہہ رہے تھے کہ بہت برا ہوا ہے اور اس کا فوراً تدارک کرنا چاہئے مگر پنڈت پنت اور سردار پٹیل کے سامنے ان کی کچھ نہیں چلی تھی۔ انہوں نے جو کچھ کہا تھا وہ صحیح ثابت ہو رہا ہے اور اس مسجد کو ڈھا کے ملک کے سیکولرزم اور انسانی مساوات پر مبنی دستور کی جڑیں ہی اکھاڑی جا رہی ہیں۔ یہ مصیبتیں ہی کیا کم تھیں کہ ہردیش بھگت بیانوں، تجویزوں اور اخباروں کے ذریعہ مسلمانوں سے یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ وہ وفاداری کا ثبوت دیں۔ مسلمان یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ وہ ایسا کونسا کام کر رہے ہیں جو ملک سے غداری کے مترادف ہے اور جسے چھوڑ دیں تو ان کو ملک کا وفادار تسلیم کر لیا جائے گا۔ سوائے اس کے کہ وہ اپنا مذہب اور رہن سہن چھوڑ دیں۔

ظاہر ہے کہ مسلمانوں پر یہ ساری مصیبت ان کے ایک بڑے عنصر کے مسلم لیگ کے دو قومی نظریے کی رو میں بہہ جانے کی وجہ سے نازل ہو رہی تھی۔ اسی عالم میں جب مسلم لیگ کے چوٹی کے لیڈر چودھری خلیق الزماں نے دستور ساز اسمبلی میں جس کے وہ بھی ممبر تھے دستور کی تکمیل کے وقت اپنی اور مسلمانوں کی طرف سے

دستور اور قومی جھنڈے سے وفاداری کا زور دار وعدہ کیا تو وفاداری ثابت کرنے کے مطالبے کی آگ کی لپٹ کچھ کم ہوئی مگر کچھ دنوں بعد ان ہی چودھری صاحب نے اس آگ پر تیل بھی انڈیل دیا۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے جناح صاحب کی صدارت میں کراچی میں ہونے والے اجلاس میں یہ کہہ کر شرکت کے لئے گئے کہ وہ جلد واپس آجائیں گے۔ وہ گئے واپس آئے اور چند روز رہ کر چوری سے پاکستان بھاگ گئے اور مسلمانوں کے لئے نئی مصیبت کھڑی کر گئے۔

میں ذرہ بے مقدار بمبئی میں بیٹھا ہوا یہ سارا دردناک تماشہ دیکھ رہا تھا اور دانت پیس رہا تھا۔ ایک دن جی میں آئی کہ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے اس لئے کچھ کرنا چاہیے۔ لہٰذا ایک بیان یا تجویز کا مسودہ لکھنا شروع کر دیا۔ اس کے مکمل ہو جانے پر اسوسی ایشن کا مکمل جلسہ طلب کرکے وہ مسودہ اس میں رکھ دیا۔ غور و خوض کے بعد اس میں کچھ رد و بدل ہوا کیونکہ میں غصے میں چند سخت باتیں بھی لکھ گیا تھا۔ ڈاکٹر قاضی اور ڈاکٹر اشرف نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اس بیان کو اردو کے اخباروں کے علاوہ تمام دوسری زبانوں کے اخباروں نے بھی نمایاں جگہ دی اور اس پر کوئی مخالفانہ تبصرہ نہ ہوا۔ جس سے محسوس ہوا کہ تیر ٹھکانے پر بیٹھا ہے۔ اعتراض کیا تو ٹھاکر چرن سنگھ نے جو ان دنوں اترپردیش کے وزیر اعظم پنڈت پنت کے پرائیوٹ سکریٹری تھے۔ ان کے بیان کو اخباروں نے کوئی اہمیت نہیں دی اور صرف سنگل کالم میں چھاپا۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ اتنا ہی مختصر تھا یا اخباروں نے غیر اہم اور مضر سمجھ کر اس میں کتر بیونت کر دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا فرقہ وارانہ مزاج ابھی تک بدلا نہیں ہے اور وہ اپنے کئے پر نادم بھی نہیں ہیں۔ افسوس کہ اس بیان کی کوئی نقل میرے پاس محفوظ نہیں ہے۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ اس کے ابتدائی حصے میں تاریخی حوالے دے کر یہ کہا گیا تھا کہ مسلمانوں نے اپنے وطن سے بے وفائی کا سبق سیکھا ہی نہیں ہے۔ وہ ملک کی عزت اور وقار کے لئے ہر دور میں بے مثال قربانی کرتے چلے آرہے ہیں۔ ملک کی ترقی کی جدو جہد میں وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے اور ملک کو متحد کرنے میں بھی ان کی کوشش کو بڑا دخل ہے۔ برطانوی سامراج کی مخالفت میں بھی جس نے ملک کے باشندوں میں پھوٹ ڈال کر اپنے راج کی جڑیں مضبوط کرنی چاہیں۔ مسلمان پیش پیش رہے۔ لہٰذا ان کو ملک سے وفاداری کا سبق دینے یا وفاداری کا ثبوت طلب کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں۔

اس کے بعد کہا گیا تھا کہ ملک کا تقسیم کے ساتھ آزاد ہونا افسوسناک ضرور ہے مگر اس کی ذمہ داری تنہا مسلمانوں پر ڈالنا بڑی زیادتی ہے۔ یہ تقسیم ایک سیاسی سمجھوتے کی بناء پر ہوئی ہے جس میں دونوں فرقے شریک تھے۔ اب جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے ہیں۔ وہ اسی کے باشندے ہیں اور اپنی ساری وطنی اور قومی ذمے داریاں پوری کرنے کو تیار ہیں اس لئے ان کو بدنام، ہراساں اور پریشان کرنا قرین انصاف و دانش مندی نہیں جو لوگ اب پھر ایسا کر رہے ہیں وہ قومی امن و اتحاد کے دوست نہیں ہو سکتے۔ مرارجی بھائی کو یہ سب کچھ ضرور معلوم ہوا ہوگا مگر انہوں نے اس پر ہم سے کوئی جواب طلب نہیں کیا اور ہم بھی الخاموشی نیم رضا سمجھ کر خاموش ہی رہے۔

امن کا جلوس

جب ۱۹۴۸ء کے آخر تک بھی باقی ملک کی طرح بمبئی کے ایک طرف فسادات کا سلسلہ بند نہ ہوا جن کا واحد مقصد زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اجاڑ کر مزید شدت اور کثرت سے پاکستان بھیجنا رہ گیا تھا تو ایک دن خواجہ احمد عباس نے اپنے چھوٹے سے بنگلے پر جو دادر میں سمندر کے کنارے واقع تھا تمام زبانوں کے صحافیوں، ادیبوں، شاعروں اور فلمی شخصیتوں کا ایک مشورتی جلسہ طلب کیا جس میں دادر میں شیواجی پارک سے جو سب سے مخدوش علاقہ تھا آزاد میدان تک سڑکوں پر ایک جلوس لے جانے کا فیصلہ ہوا۔ یہ جلوس نکلا اور بڑی شان سے نکلا۔ سڑکوں میں لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے تھے جن سے تقریریں ہو رہی تھیں اور امن اور بھائی چارے کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ شروع سے آخر تک سڑکوں کے کنارے کھڑے ہوئے اور اظہار مسرت کرتے ہوئے لاکھوں آدمیوں نے اس کا استقبال کیا اور ایسا معلوم ہوا جیسے فسادات کو کسی نے تالا لگا دیا ہو۔ اس کے بعد ۹۲ء تک بمبئی میں کوئی بڑا فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا مگر بابری مسجد کے انہدام کے بعد مسلمانوں کو ہلاک اور زخمی کرنے اور ان کے گھروں، دکانوں اور کارخانوں کو لوٹ کر اور جلا کر بمبئی کو ان سے صاف کرنے کی ہولناک کوشش ہوئی جس میں سنگھ پریوار کے علاوہ پولیس نے بھی حصہ لیا۔ اس کے کچھ دنوں بعد ہی ۱۲ اہم مقامات پر ایک گھنٹے کے اندر ہی ہولناک دھماکے ہوئے جن میں سیکڑوں آدمی مارے گئے اور ہزاروں گرفتار کئے گئے۔ ان کی ذمے داری مسلمان اسمگلروں پر ڈالی گئی مگر سیکڑوں کی تعداد میں غریب اور بے قصور مسلمانوں کو ٹاڈا کے وحشیانہ قانون کے پھندے میں پھانس لیا گیا۔

ریاض عمر
۵۳۰ چاندنی چوک، دہلی - ۶

جشن آزادی ۱۹۹۵ء کے ایام میں
بابری مسجد کی شہادت پر ایک دعا

اے خدائے بزرگ و برتر - اے خدائے ذوالجلال
ہم نہ صرف تیری عبادت گاہ کو یاد کرتے ہیں بلکہ اس کے شہید کرنے والوں کو بھی اس لئے نہیں کہ انہوں نے اس معبد کو شہید کر دیا
ہمارے دلوں کو لہولہان کر دیا اور
ہماری آنکھوں کو آنسوؤں سے تر بتر کر دیا
اس لئے بھی نہیں کہ ان ظالموں نے اپنے اس سفاکانہ عمل سے مہذب قوموں میں ہمارے ملک کا نام سرنگوں کر دیا
بلکہ اس لئے کہ اس مجرمانہ فعل سے ہم کو قربانی کی راہ میں قدم آگے بڑھانے کا موقع ملا
اس سانحہ نے ہمارے اندر کی خود غرضی اور مغلوبیت کے جذبے کو جلادیا ہے
اس کے شعلوں نے کمینگی کو دلوں کی گہرائیوں سے نکال باہر کیا ہے
اور
انسانی خاصے میں موجود گناہوں اور نفرتوں کو اکھاڑ پھینکا ہے
ہم انہیں اس لیے بھی یاد کرتے ہیں کہ ان کے عمل نے
خدا کی محبت کے ہمارے عقیدے کو پختہ کر دیا
وہ محبت جو ہمیں قاتلوں کی نفرت سے دور لے جاتی ہے
وہ محبت جو ہمیں صبر، برداشت، ہمت، فرمابرداری، انکساری، سخاوت اور فراخ دلی کا سبق دیتی ہے
وہ محبت جو ہمیں دنیا میں خدا پر بھروسے کے عقیدے کو آخری حدود تک لے جاتی ہے
اور
وہ محبت جو ہمیں اپنے روزِ وصال پر موت کا سامنا کرنے کے لئے تیار کرتی ہے
اے مالک روز حساب اے خدائے لازوال
تیرے معبد کی شہادت نے میری روح میں دبے تیری ملاقات کے جذبے میں گوناگوں اضافہ کر دیا ہے
پس
جب اس کے قاتل روزِ انصاف تیرے سامنے کھڑے ہوں
میری روح کے ان خوش رنگ جذبوں کو یاد رکھو
جن کی وجہ سے ہماری زندگیاں مالا مال ہو گئیں
اور
اے خداوند کریم
انہیں معاف کر دیجیو

نو

جوگندر پال
۲۰۴ سندر اگنی الکیو، نئی دہلی - ۱۱۰۰۱۹

کیا واقعی

"یا حضرت، مرحومین جب ہمارے خوابوں میں آتے ہیں تو کیا واقعی آئے ہوتے ہیں؟"

"تو کیا واقعی نہیں آئے ہوتے عزیزی؟"

"مگر یہ کیونکر ممکن ہے حضرت؟ وہ تو اپنا وجود کھو چکے ہوتے ہیں۔"

"اسی لئے تو خوابوں میں آتے ہیں، وگرنہ دو پہروں سے چل کر اس وقت بھی کھٹاک سے آوارد ہوں جب ہم جاگ رہے ہوتے ہیں"

درس و ہدایت

"نہیں، بیٹا، ہمیشہ کسی بزرگ کے نقشِ قدم پر چلو۔"

"بزرگ تو واپسی کی راہ اختیار کئے ہوتے ہیں بابا۔ میں تو ابھی ابھی آیا ہوں۔ آتے ہی واپس ہو لوں؟"

عروج

ماحولیاتی آلودگی پر اپنی تقریر کے اواخر میں سائنس دان نے اپنا پیرایہ بیان غیر پیشہ ورانہ بنا لینا چاہا۔ "دوستو، خدا نے تو آسمانوں میں اپنی رحمت کی اوزون تعمیر کر رکھی تھی، کہ جہنمی روحیں ہماری دنیا میں اترنے کی راہ نہ پا سکیں، مگر ہمارے گناہوں اور گندگی کی زہریلی گیسوں نے اوپر اٹھ اٹھ کر اوزون میں چار سو سوراخ کر دیئے۔"

"اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟" سامعین میں سے کسی نے پوچھا۔

"جو ہم کرنے کے عادی ہیں، یعنی کچھ نہیں۔" سائنس دان مسکرانے لگا۔ "خدا نے اپنا حکمنامہ جاری کر دیا ہے کہ اب جہنم کو ہماری دنیا میں ہی منتقل کر دیا جائے۔"

نہیں، رحمن بابو

نہیں، رحمن بابو، بروں کو برا مت کہو برے لوگ بڑے بھولے بھالے ہوتے ہیں۔ اچھائی پر پھنیر سانپوں کا پہرہ ہو تو معصوم بھلا کیا کریں؟ انہیں کیا پتہ، بے چارے کتنی بڑی نعمت سے محروم ہیں؟ اتنے اچھے ہیں رحمن بابو، کہ برے برے بھی ہنسی خوشی جیے چلے جاتے ہیں۔ خدا جیسے بھی رکھے!

کہانی

میں نے ندی کا تھاہ کرنا چاہا،
مگر کیسے کرتا؟
وہ تو بہ یک وقت اپنے آگے بھی تھی اور پیچھے بھی!
سو میں لاچار سا اسے چپ چاپ دیکھتا رہ گیا۔

ملاقات

میں سالہا سال اپنی اس خواہش پر حاوی نہ ہو پایا کہ مرنے سے پہلے ایک بار اپنا پاکستان کا وہ پرانا گھر دیکھ آؤں۔ بالآخر میری یہ خواہش پوری ہونے کا موقع آگیا اور میں ویزا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اڑ کر وہاں جا پہنچا اور میں آہستگی سے اپنے پرانے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں، اور وہ طلسمی دروازہ ایک دم کھلا ہے۔

"کون ہو، بابا؟"

دروازہ کھولنے والے چھوکرے کو دیکھ کر میں چونک پڑا ہوں اور اس کے چہرے پر اپنی آنکھیں گاڑی ہیں۔ وہی ؟

جوں کا توں وہی، جسے آج سے پچاس پچپن برس پہلے چھوڑ کر میں چپ چاپ گھر سے باہر ہولیا تھا۔

"کس سے ملنا ہے بابا؟ گھر والے باہر گئے ہوئے ہیں۔"

ہاں، وہ بچارہ کیا جانے، گھر والے ہی لوٹ آئے ہیں؟

"بولو بابا، کون ہو؟"

نہیں، اس معصوم نے مجھے کبھی دیکھا ہی نہیں تو اس کا کیا دوش؟ کسی بچے کو کیا معلوم کہ بڈھا کھڈا ہو کر اس کی یہ صورت نکل آئے گی؟

میرے آنسو بہہ نکلے ہیں اور میں نے بے اختیار آگے بڑھ کر اسے باہوں میں لے لیا ہے

جنت

"اچھا!" خدا مسکرانے لگا ہے تو اَنگنت ستارے درخشندہ ہو اٹھے ہیں۔ "انسان جیتے جی یہاں ساتویں آسمان میں آبسا ہے؟"

وہ لحظہ بھر رکا ہے۔ "کوئی بات نہیں۔ اسے یہاں بس جانے دو۔ اس کی آل اولاد اب اس لئے ساری ساری عمر عبادت میں صرف کیا کرے گی کہ موت کے بعد اسے ---"

اس نے کرۂ ارض کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"اسے وہاں بسنا نصیب ہو۔"

غرقاب

میں ایک عرصہ سے ایک سمندری جہاز میں نوکری کرتا ہوں۔

پہلے پہل جب میرا سمندر سے رابطہ ہوا تو مجھے لگتا تھا میں اس میں ڈوب جاؤں گا۔

مگر اب مجھے لگتا ہے کہ سمندر ہی میرے اندر ڈوب گیا ہے۔

خواب و خیال

"جوگن؟"

کہو بھائی!"

"تمہارے پپوٹے منڈے منڈے کیوں رہتے ہیں، جوگن؟"

"جب تم اندر ہو بھائی، تو استری گھر کے کواڑ بند ہی رکھتی ہے۔"

ڈاکٹر اظہار مسرت
B.M.H.Dispensary
Behind Tehsil
ناگور ۳۴۱۰۰۱

غزلیں

مجھ تلک اس کا گزر بادلِ ناخواستہ ہے
ربط قائم ہے مگر بادلِ ناخواستہ ہے

سرخروئی کی رمق یعنی دعا کی توفیق
عزم لا یعنی ، اگر بادلِ ناخواستہ ہے

خودکشی جرم ہے اور ذوق طلب ہے بے سود
زندگی سینہ سپر بادلِ ناخواستہ ہے

گھر میں بچوں کی خوشی ، ہاتھ میں تفسیر معاش
ورنہ تحریکِ سفر بادلِ ناخواستہ ہے

سر کی معراج ہوا کرتی ہے سجدوں کی زمیں
نوکری پر تو بسر بادلِ ناخواستہ ہے

ترکِ اظہار وفا خواب وفا کی تعبیر
اور تجدید ہنر بادلِ ناخواستہ ہے

فنِ اظہار پہ تنقید مسرت کا حصول
عیب پر اپنے نظر بادلِ ناخواستہ ہے

کر عطا سب کو خدائے کارساز و سازکار
ایک بیٹا خوش طبیعت ایک بیٹی بردبار

بارشوں کے فیصلے تھے یا دعاؤں کے سفیر
نصرتوں کی فصل آنگن میں ہوئی ہے آبیار

زندہ رہنے کا حوالہ ڈوب مرنے کی سبیل
پھول ہونٹوں کا تبسم جھیل آنکھوں کا خمار

اجنبی احساس ایسا بھی کوئی اک شعر دے
ڈائری میں لکھ سکوں جو میں بطور شاہکار

کوئی عذرا ، کوئی سلمیٰ ، کوئی ریحانہ نہیں
پھر بھی اختر کا تخاطب ہے پسندیدہ شعار

یا وہ شق ہو جائے گی ، یا یہ ہوا ہو جائے گا
سانس کی دیوار پر ہے زندگی کا اشتہار

رات دن میں جس قدر ہے ربط باہم معتبر
ہے مسرت کا بھی اتنا ہی غموں پر انحصار

ڈاکٹر سخاوت شمیم
سرجن ۔ بی ۔ ڈی ۔ ایم اسپتال
کوٹ پتلی ۳۰۳۱۰۸
(راجستھان)

غزل

دن کو دھکیل آیا صعوبت کے غار میں
بیٹھی ہوئی تھی رات مرے انتظار میں

پہچان بن کے مجھ میں سمائے تھے جو اصول
نکلا ہوں ڈھونڈنے انہیں اپنے شعار میں

اک اجنبی سی بھیڑ میں احساس یوں ہوا
میرا وجود ہے بھی تو ہے کس شمار میں

خود کو بھی بھول جاؤں تمہیں یاد جب کروں
کتنی سپردگی ہے مرے اختیار میں

دشتِ طلب میں پھول نہ جب کوئی کھل سکا
تتلی نے پر سمیٹ لئے انتظار میں

دیوار و در پہ ہیں وہی وحشت کی یورشیں
گھر بھی بسا کے دیکھ لیا لالہ زار میں

جوشِ طلب کے ساتھ رہا دل کا قافلہ
گزری شمیم عمر میری ریگزار میں

نوشاد علی انصاری
۸۵ / سے چھوتو لیسپا روڈ کلکتہ ۳۹

غزل

روشن تو ہوئی آخر اک شمع زمانے میں
گو جان گئی اپنی دشمن کو بچانے میں
ہے مہر و محبت کا متروک چلن اب تو
سکہ نہیں چلتا یہ موجودہ زمانے میں
وہ پونچھ رہا ہے جو آنسو میری آنکھوں کے
آگے تھا وہی سب سے گھر میرا جلانے میں
لگتا ہے مجھے اب بھی لگ جائیں گی صدیاں کچھ
اولاد کو آدم کی انسان بنانے میں
نوشاد یہ دنیا بھی کتنی ہے عجب دنیا
بھائی ہی لگا ہے اب بھائی کو گرانے میں

وسیم مینائی
تارین جلال نگر ۔ شاہجہاں پور

غزل

سب کا بوجھ اپنے ہی کاندھوں پہ اٹھانے والے
دیکھیں کیا نام تجھے دیں گے زمانے والے
پہلے اسلاف تو غم بانٹ لیا کرتے تھے
اب نہیں ملتے جنازوں کو اٹھانے والے
ان کی بیٹی بھی تو ہو سکتی ہے نذرِ آتش
سوچتے کاش بہو اپنی جلانے والے
ہم کہ پروردۂ آلام و حوادث ٹھہرے
ہم کو کیا خاک ستائیں گے ستانے والے
ٹوٹ کر شاخ سے پتے نہیں آتے واپس
کل نہ لوٹیں گے وسیم آج کے جانے والے

وہ اک چہرہ نظم

نسیم عزیزی
۳۴ / بیلیلیس روڈ
ہوڑہ ۷۱۱۱۰۱

ہماری جھونپڑی کے سامنے بالکل
ابھی کوئی اٹھارہ بیس گز کے فاصلے پر
دیکھتے ہیں اک عمارت ہم
کہ جس کی پہلی منزل پر
دریچہ ایک کھلتا ہے
جو ہر موسم کے تیور کا شناسا ہے
اسی کھڑکی پہ اک چہرہ
منگار ہتا ہے بن کے نقشِ بلورا
عجب فطری کشش رکھتا ہے یہ چہرہ
نہ دیکھیں گر تو یہ محسوس ہوتا ہے
کہ دم سینے میں گھٹتا ہے
ہزاروں اس سے افسانے ہیں وابستہ
کئی کردار بھی جلوہ کناں اس میں
اگر ان کے نقابوں کو الٹ ڈالیں
تو پائی کتنے چہروں کا اتر جائے
مرقعے کیسے کیسے سامنے آئیں
ہمارے لب سلے ہوں گے !
کلیجے پھٹ پڑے ہوں گے !!
کئی برسوں سے اس چہرے کا یہ معمول دیکھا ہے
کہ خاموشی سے سب کچھ دیکھتے رہنے کا عادی ہے
زلیخا، آمنہ، حوا، یشودھا، فاطمہ، رادھا
کی پاکیزہ خیالی کا یہ مظہر ہے
اسے کمزور کہہ کر لاکھ ٹھکرائیں
مگر وہ قوت ایثار و الفت سے
سدا سرشار رہتا ہے
وہ اک چہرہ جو اس کھڑکی پہ اکثر دیکھتے ہیں ہم
ذرا جو غور فرمائیں تو ہے اس میں
ہماری شخصیت کی جلوہ فرمائی

سوہنی مہینوال

احمد سعید انور

وہ کلاس روم سے نکل رہی تھی کہ ایک پیاری سی بچی بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی - سرخ یونیفارم میں ملبوس اور اوپر سے معصوم سی شکل، وہ بہت بھلی لگ رہی تھی - اس نے آتے ہی کہا:

مس آج آپ جمنازیم میں میری مدد کریں گی نا ؟-----آپ نے کل مجھ سے وعدہ کیا تھا - اور اب تو میرے لئے پریکٹس کے صرف تھوڑے ہی دن رہ گئے ہیں اگلے ہفتے مجھے علاقائی مقابلوں میں حصہ لینا ہے - اگر میں نے پریکٹس جاری نہ رکھی تو میرا کوئی چانس نہیں -

ننھی سی پیاری سی بچی یہ سب کچھ کہے جا رہی تھی لیکن وہ بت بنی وہاں کھڑی تھی اس کے چہرے سے لگتا تھا اس کے ذہن میں کشمکش ہے - وہ کچھ بھی نہیں بول رہی تھی - اسے چپ کھڑے دیکھ کر وہ بچی پھر بولی -

مس سونیا لیا آپ کو یاد تو ہے نا آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا -

ہاں لینا !، مجھے یاد ہے میں نے تم سے وعدہ کیا تھا - مگر-----

مگر کیا مس ؟-

میں کسی اور سے بھی وعدہ کر چکی ہوں - وہ آہستہ سے بولی لیکن لینا نے اس کی بات سن لی - اس کے چہرے پر مایوسی کے آثار نمایاں ہو گئے - یوں لگتا تھا، ابھی آنسو اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے نکل کر اس کے گالوں پر تیرنے لگیں گے - وہ یکدم افسردہ نظر آنے لگی - نو سال کی بھولی بھالی بچی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا ماجرا ہے - وہ پھر بولی -

لیکن مس آپ نے مجھ سے پہلے وعدہ کیا تھا -

ہاں لینا میں نے ضرور کیا تھا لیکن آج صبح میں نے اس سے بھی وعدہ کر لیا - مجھے یاد ہی نہ رہا کہ میں تم سے وعدہ کر چکی ہوں - اس کے دل میں نہ جانے کیا کیا خیالات آئیں گے -

میرا بھی تو دل ٹوٹے گا مس سونیا لیکن شاید میرے دل کی آپ کو پرواہ نہیں -

اور یہ کہکر وہ جانے کے لئے مڑی - سونیا نے دیکھا اب آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے تھے - وہ جلدی سے آگے بڑھی اور لینا کو اس نے سینے سے لگا لیا -

نہیں لینا مجھ سے روٹھو نہیں میں تمہاری ضرور مدد کروں گی -

سونیا نے لینا کے آنسو پونچھ ڈالے - وہ سونیا کی آنکھوں میں جھانکنے لگی - پھر بولی -

مس سونیا ! اس کے دل میں نہ جانے کیا کیا خیالات آئیں گے - آپ چلی جائیں، مجھے کل پریکٹس کرا دیں -

لینا تم دل سے کہہ رہی ہو ؟

ہاں مس سونیا ! - سونیا نے اس کے ماتھے کو چوم لیا اور بھاگ کھڑی ہوئی - تھوڑی دور جا کر مڑی اور بولی -

کل تمہیں ضرور پریکٹس کراؤں گی -

سونیا اپنے باپ کے ساتھ لینن گراڈ کے جنوب میں ایک بارونق شہر نووگراڈ کے خوشحال علاقے میں رہتی تھی - اس کے والد ایگور ریشکوف شہر کے ایک بہت بڑے سٹور کے مالک تھے - وہ اپنی اکلوتی بیٹی سے بے پناہ محبت کرتے تھے - وہ چاہتے تھے کہ سونیا ان کے سٹور کا سارا انتظام سنبھال لے لیکن سونیا بچوں کو پڑھانے میں زیادہ دلچسپی رکھتی تھی - اس نے گریجوایشن کے بعد ایک مقامی سکول میں نوکری کر لی -

اس دن سونیا نے کلینن ریستوران میں میہنوالف سے سکول کے بعد ملنے کا وعدہ کیا تھا - جب وہ بس سے اتر کر کلینن ریستوران پہنچی تو میہنوالف ریستوران کے باہر اس کی انتظار کر رہا تھا -

بڑی دیر کر دی تم نے سونیا - وہ اس کی طرف لپکتے ہوئے بولا -

ارے واہ ! میرے پاس کوئی بجلی کا پر تو ہے نہیں جو اڑ کر یہاں پہنچ جاتی -

وہ دونوں بانہوں میں بانہیں ڈالے ریستوران کے اندر آ کر ایک ٹیبل کے پاس بیٹھ گئے -

جانتی ہو میرا دل دھک دھک کرنے لگا تھا -

اور تم جانتے ہو کہ میں کس کا دل توڑ کر آئی ہوں -

میہنوالف کے دل و دماغ پر جیسے بجلی گری ہو - ایک ہی لمحے میں اس نے نہ جانے کیا کیا سوچ لیا - وہ کرسی پر اکڑ کر بیٹھ گیا - اس کے چہرے سے اس کے دل کی حالت صاف ظاہر تھی -

کون، کس کا دل، کیا بات کہہ رہی ہو سونیا ؟

ارے بس بس کہیں تمہارا ہارٹ فیل نہ ہو جائے - وہ تو نو سالہ لینا تھی جس سے میں نے پریکٹس کرانے کا وعدہ کیا تھا -

اوہ - اور اس نے اطمینان کا سانس لیا -

ویسے مرد ہوتے بڑے شکی مزاج ہیں - اب دیکھو کوئی بات بھی نہیں اور تمہارے دل میں پتہ نہیں کیسے کیسے شکوک ایک لمحہ میں پیدا ہو گئے -

سونیا تمہیں پتہ نہیں تم کتنی خوبصورت ہو - کبھی کبھی میں یہ سوچ کر ڈر

جانتا ہوں کہ کہیں تمہیں کھو نہ دوں۔
میں نے تمہیں پیار کیا ہے میںنو الف، میرا دل کوئی فٹ بال نہیں کہ کبھی ادھر لڑھک جائے اور کبھی ادھر۔
میں جانتا ہوں میری سونیا ! اور میں نے بھی تو تمہیں دل و جان سے چاہا ہے۔

سونیا واقعی بہت خوبصورت تھی۔ درمیانے قد کی پتلی دبلی لڑکی، گہری نیلی آنکھیں، پتلے پتلے پھول کی پتیوں جیسے نازک ہونٹ اور ان ہونٹوں پر اکثر ایک ہلکی سی مسکراہٹ بکھری رہتی۔ سنہری بال اس کے شانوں کو چھوتے ہوئے ------- اس کی شخصیت میں ایک ایسی جاذبیت تھی کہ دیکھنے والا ایک بار ضرور قدرت کی تراشی اس حسین عورت کو مڑ کر دیکھتا۔
میںنو الف بھی خاصا سمارٹ آدمی تھا۔ عمر بھی کوئی پچیس کے قریب ہوگی، چھ فٹ قد اور مضبوط جسم، میںنو الف روسی فوج میں میجر کے عہدے پر تھا۔ دو سال پہلے دونوں ایک سرکاری تقریب میں ملے تھے اور ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے تھے۔
وہ دونوں ریستوران سے نکل کر کچھ دیر سڑک کے کنارے چلتے رہے۔ فضا میں خنکی تھی اور چودھویں کا چاند دور کہیں سے اس حسین جوڑے کو سلامی دینے کے لئے ابھر رہا تھا۔
چاندنی کتنی خوبصورت لگ رہی ہے سونیا ! لیکن صرف تمہارے ساتھ کی وجہ سے، جی چاہتا ہے ہم دونوں اس حسین چاندنی میں چلتے چلے جائیں یہاں تک کہ ہماری منزل آجائے۔
منزل ! میں تو سمجھی تھی، ہمارا پیار ہی ہماری منزل ہے۔
ہے تو۔
پھر تمہیں کس منزل کی تلاش ہے میںنو الف
اور میںنو الف نے اس کا ہاتھ دبا کر پیار سے اس کے بالوں کو کچھ اس انداز سے بوسہ دیا کہ وہ شرما سی گئی۔ میںنو الف نے ذرا دیر کے لئے رک کر سونیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور سوال کر دیا۔
مجھ سے شادی کرو گی سونیا ؟ اب تم سے جدا نہیں رہا جاتا۔
میری روح اور میرا جسم تمہارے ہیں میںنو الف
اور میںنو الف نے جیب سے انگوٹھی نکال کر اس کی خوبصورت انگلی میں پہنادی۔ انگوٹھی میں جڑا ہوا چھوٹا سا ہیرا چاند کی روشنی میں چمک رہا تھا۔
میںنو الف ! تم نے ریستوران میں یہ سب کچھ کیوں نہیں کیا۔
میں آسمانی چاند کو گواہ ٹھہرا کر زمینی چاند سے عہد محبت باندھنا چاہتا تھا۔
ایک دوسرے کے ہونٹوں نے آنکھیں پیوست ہو کر اس عہد محبت پر مہر لگا دی۔
سونیا ! میں کسی دن تمہارے گھر آؤں گا اور پھر تمہارے ڈیڈی سے بات کر کے شادی کی تاریخ مقرر کر لیں گے۔
اتنے میں سونیا کی بس آگئی۔ وہ بس پر سوار ہو گئی اور میںنو الف سڑک پر کھڑا دیر تک بس کی پچھلی بتیوں کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ موڑ مڑ گئی۔

اگلی صبح سونیا سوچ رہی تھی کہ ناشتے کی میز پر اپنے ڈیڈی کو خوشخبری سنائے گی۔ لیکن ابھی وہ ناشتے کے لئے اپنے ڈیڈی کا انتظار کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ سونیا نے فون اٹھایا اور فوراً ہی اس کے چہرے سے پریشانی کے آثار نظر آنے لگے۔ مختصر سی بات کے بعد اس نے فون رکھدیا اس کے ڈیڈی بھی ناشتے کی میز پر پہنچ گئے اور اسے پریشان دیکھ کر بولے۔
سونیا بیٹی خیریت تو ہے ؟ تم پریشان لگ رہی ہو۔ کس کا فون تھا

ڈیڈی میںنو الف کا فون تھا۔ ماسکو میں اچانک حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی ہے اور اسے دبانے کے لئے حکومت نے ہنگامی طور پر فوج طلب کر لی ہے۔ میںنو الف آدھے گھنٹے میں ماسکو کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔
اوہو ! یہ تو بری خبر ہوئی لیکن خیر کوئی بات نہیں تم پریشان مت ہو چند ہی دنوں میں بغاوت پر قابو پالیا جائے گا تو حالات معمول پر آجائیں گے اور پھر میںنو الف واپس آجائیگا۔
مجھے ڈر لگ رہا ہے ڈیڈی۔
ارے اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ کچھ سر پھروں نے حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی ہے لیکن ہماری حکومت اور ہماری فوج اس بغاوت کو کچل کر رکھدیگی۔ تم دیکھ لینا۔ اب تم جلدی سے ناشتہ کر لو۔ اور فکر مت کرو میںنو الف کو کچھ نہیں ہوگا۔
ان کی نظر سونیا کی انگلی میں چمکتے ہوئے ہیرے کی انگوٹھی پر پڑی۔ وہ بولے
سونیا یہ انگوٹھی -------
معاف کرنا ڈیڈی ! میں اس پریشانی میں بھول ہی گئی۔ میں تو آج ناشتے پر آپکو یہ خوشخبری دینے والی تھی۔
مبارک ہو۔
انہوں نے آگے بڑھکر سونیا کی پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر بولے

خوشی کا دن کب ہے بھئی .... ہمیں بتاؤگی یا یہ تمہارا اور
میینوالف کا معاملہ ہے۔
نہیں نہیں ڈیڈی۔ میینوالف رات کہہ رہا تھا کہ وہ آپ سے ملکر شادی کی
تاریخ طے کریگا۔ لیکن اب تو وہ ماسکو.......... اس کی آواز بھرا گئی
گھبراؤ نہیں بیٹی سب ٹھیک ہو جائیگا۔

ماسکو میں جو آگ لگی تھی وہ قابو میں آنے کی بجائے پھیلتی ہی جا رہی تھی۔ اور اب آس پاس کے علاقے بھی اس کی لپیٹ میں آ رہے تھے۔ اگرچہ حالات پورے ملک میں نہیں بگڑے تھے لیکن خطرہ تھا کہ اگر سختی سے اس بغاوت کو نہ کچل دیا گیا تو حالات حکومت کے لئے بہت زیادہ خطرناک صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ شروع شروع میں فوج کو یہ حکم تھا کہ باغیوں سے نپٹنے کے لئے اندھا دھند فائرنگ نہ کرے تاکہ کہیں بے گناہ عوام بھی اس کی زد میں نہ آجائیں لیکن جب حالات نے سنگین رخ اختیار کرنا شروع کیا تو فوج فائرنگ کے علاوہ ٹینکوں کا استعمال بھی کرنے لگی۔ ادھر باغیوں نے بھی جوابی حملے کرنے کی ٹھان لی اور اس چپقلش کے دوران نہ صرف باغیوں کو جانی نقصان اٹھانا پڑا بلکہ فوج کے کئی سپاہی اور چند افسر بھی مارے گئے اور کچھ زخمی ہوئے۔ اور زخمی ہونے والوں میں میینوالف بھی تھا۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے بعد اسے لینن گراڈ ہسپتال میں بھجوا دیا گیا جو نوو گراڈ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ سونیا اکثر اس سے ملنے کے لئے ہسپتال چلی جاتی۔ میینوالف خوش تھا کہ سونیا اس کے قریب تھی۔ اس کے جسم کے زخم آہستہ آہستہ مندمل ہو رہے تھے اور ملک کے حالات بھی معمول پر آ رہے تھے بغاوت کو کچل دیا گیا تھا۔ ویسے بھی موسم بدل چکا تھا۔ اب غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ برف باری اسقدر ہوئی کہ گذشتہ کئی سالوں میں اتنی نہ ہوئی تھی۔ لوگ سردی کے مارے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے اور کسی میں اتنی شدید سردی میں سڑکوں پر آکر بغاوت کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ باغی لیڈر یا تو مارے جا چکے تھے یا جیلوں میں ڈال دیئے گئے تھے۔

سونیا کے ڈیڈی بھی کبھی کبھار میینوالف کی عیادت کے لئے ہسپتال آتے اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جاتے۔ سونیا چاہتی تھی کہ شادی کی بات چلے لیکن ایسا کوئی موقع ہی نہیں آتا تھا۔ آخر ایکدن اس کا دل کھل اٹھا جب اس کے ڈیڈی نے بتایا کہ وہ میینوالف سے ملنے جا رہے ہیں اور شادی کی بات بھی کریں گے۔ سونیا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لئے اس نے اپنے ڈیڈی کے ساتھ جانے سے معذوری ظاہر کی۔ وہ اکیلے ہی چلے گئے اور میینوالف کی رسمی عیادت کے بعد اسے کہنے لگے۔
میینوالف ! تمہاری بیماری کی پریشانی میں تو میں تمہیں اور سونیا کو مبارک دینا ہی بھول گیا۔
میینوالف ان کا اشارہ سمجھ گیا۔
جی بہت شکریہ۔ اب آپ کوئی مناسب تاریخ بتا دیں کیونکہ آپ مصروف آدمی ہیں۔ ہمیں آپ کی مصروفیت کو مد نظر رکھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔
بس تم ذرا ہسپتال سے فارغ ہو جاؤ پھر دیکھ لیں گے۔
ہسپتال والے تو مجھے جلد ہی فارغ کر دیں گے۔ اب میں خود اپنے آپ کو صحتمند محسوس کرتا ہوں۔ اگر یہ بیچ میں حالات خراب نہ ہوتے تو ہم دونوں شاید اب تک.......
ہاں یہ چند کتوں نے لالچ میں آکر پورے ملک کو تباہ کرنا چاہا۔
ایسا مت کہیے۔ وہ بھی آخر انسان ہیں اور پھر روسی ہیں۔
انسان ! روسی !! ---میں نے تو کتوں کا لفظ استعمال کیا ہے حالانکہ وہ بھی مالک کے وفادار ہوتے ہیں۔ اور یہ لوگ تو ان سے بھی بدتر ہیں۔ آخر حکومت نے ان کا بگاڑا ہی کیا تھا۔ ملک کی ترقی کے لئے حکومت جو اقدام کر رہی ہے انہیں سراہنا چاہئے نہ کہ پیچھے کی طرف مڑ جائیں۔
گستاخی معاف ینکوف صاحب ! ہمارا ماضی کوئی برا تو نہیں تھا۔ سوویت یونین کا ساری دنیا پر رعب تھا ہم ایک بڑی طاقت تھے، ساری دنیا ہماری طاقت سے مرعوب تھی۔ اب ہم کیا ہیں اور ہمارے پاس کیا ہے۔ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے، ہماری حکومت کاسہ گدائی لیکر کبھی امریکہ کے سامنے جھولی پھیلاتی ہے اور کبھی یورپ کے سامنے.......
کیا ماضی اس سے بہتر نہیں تھا ؟
ایگور ینکوف حیرانگی اور غصے میں میینوالف کی باتیں سن رہے تھے شاید ہسپتال میں نہ ہوتے تو میینوالف کی ایسی خبر لیتے کہ ساری عمر یاد رکھتا پھر بھی ان سے نہ رہا گیا۔ وہ بولے۔
تم کس ماضی کی باتیں کرتے ہو میینوالف ؟ اس ماضی کی جب کمیونزم نظام کے تحت ہم نے انسانوں کو......ہاں اپنے ہی ہم وطنوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنائے رکھا، انہیں بیگار کیمپوں میں ڈالا، خاوند کو بیوی اور بچوں سے کئی کئی سال اور شاید ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔ آج ہمارے ملک کو نئی آزادی ملی ہے، نیا نظام ملا ہے، ہماری دنیا کی نظروں میں عزت ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ ہمارا ماضی برا نہیں تھا۔ اور تم

------ تم کس منہ سے یہ بات کہہ رہے ہو۔ تم اس وردی کی توہین کر رہے ہو جس کے واسطے سے تمہیں روزی مل رہی ہے -------- کہیں تم بھی تو باغیوں میں شامل نہیں ہو ؟ یاد رکھو اگر ایسا ہوا تو تم باغی ہی نہیں، غدار ہو گے ---- ملک اور قوم کے غدار !

آپ خواہ مخواہ غصے میں آرہے ہیں۔ میں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اگر اس جمہوری دور میں مجھے اس کی بھی اجازت نہیں تو میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔

اس نے جمہوری دور کے الفاظ کچھ اس انداز سے کہے کہ ینکوف اس کی طنز سے جل اٹھے۔

اس سے پہلے کہ ایگور ینکوف کچھ کہتے، ڈاکٹر نے آکر میینو الف کو بتایا کہ اسے کل ڈسچارج کر دیا جائے گا کیونکہ اب وہ پوری طرح صحتیاب ہو چکا ہے۔

ایگور ینکوف گھر آئے تو غصے سے ان کے نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ سونیا جو ان کی ہسپتال سے واپسی کا بڑی شدت سے انتظار کر رہی تھی کہ کوئی خوشی کی خبر لے کر آئیں گے، انہیں اس حالت میں دیکھ کر ڈر گئی۔

تم اس غدار سے شادی کرنا چاہتی ہو تو خوشی سے کرو لیکن میرا پیار تمہیں نہیں مل سکے گا۔ وہ سونیا سے مخاطب ہو کر بولے۔ سونیا نے سہمی سہمی آواز میں پوچھا

کیا ہوا ڈیڈی ؟ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ

میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔ آج میینو الف کے خیالات سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی ہے۔ وہ کمیونزم کا حامی ہے۔

آپ فکر نہ کریں ڈیڈی۔ سب ٹھیک ہو جائیگا۔

خاک ٹھیک ہو جائیگا نادان لڑکی۔ تم جانتے بوجھتے ہوئے اپنے آپ کو کنویں میں نہ گراؤ۔ وہ جس پلیٹ میں کھاتا ہے اسی میں گند پھینکتا ہے۔

وہ برابر غصے میں بولے جا رہے تھے۔

میں اسے سمجھاؤں گی ڈیڈی۔ آپ اپنی طبیعت خراب نہ کریں۔

اس نے اپنے باپ کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر انہوں نے انتقام لینا چاہا تو میینو الف کے لئے کوئی راہ فرار نہ ہوگی۔ وہ میینو الف کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔

اس واقعہ کو چند روز گزر گئے۔ گھر کے ماحول میں کھنچاؤ سا تھا۔ سونیا پریشان تھی وہ اس دوران میینو الف سے بھی مل چکی تھی لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے اور کیسے حالات کو سلجھائے۔ ایک طرف باپ کا پیار تھا دوسری طرف میینو الف ------- دو قسم کے نظریوں اور دو شخصیتوں کے درمیان سونیا پستی نظر آرہی تھی۔ ادھر سکول والوں نے پروگرام بنایا کہ سردیوں کی کھیلوں کی تیاری کرنی ہے بچیوں کو آئس سکیٹنگ کی پریکٹس کے لئے تجویز ہوا کہ سونیا انہیں جھیل لا۔مین پر لے جائے جہاں پر رہائش کے لئے سکول نے ایک کاٹیج کا انتظام کر دیا تھا۔ سونیا لینا اور سکول کی دوسری بچیوں کو ساتھ لیکر وہاں چلی گئی۔ سب کو امید تھی کہ سونیا کی نگرانی میں آئس سکیٹنگ کی پریکٹس کرنے سے بچیاں ضرور مقابلے جیتیں گی اور لینا کے متعلق تو سب کو یقین تھا کہ چیمپین شپ جیت لے گی۔

لا۔مین جھیل جو نووگراڈ سے قریب تھی، برف کا ایک پلیٹ فارم بن چکی تھی۔ جھیل کا پانی جم چکا تھا اور لوگ یہاں سکیٹنگ کے لئے آتے تھے سونیا اور بچیوں نے خوب لطف اٹھایا اور جی بھر کر پریکٹس کی۔

ایک دن حسب معمول سونیا سکیٹنگ کی پریکٹس کرا رہی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے میینو الف اس کی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ اسی طرح سکیٹنگ کرتی ہوئی اور خوشی سے جھومتی ہوئی میینو الف کی طرف بڑھی۔ اچانک برف میں شگاف پڑا اور سونیا کی چیخ بلند ہوئی

میینو ال.....

میینو الف اس جگہ پہنچا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر جھیل کی سطح پر پڑے اور جم گئے۔ اس نے جیب سے ایک خط نکال کر اس جگہ پھینک دیا خط میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ خرابی صحت کی بناء پر اسے فوج کی ملازمت سے فارغ کر دیا گیا ہے۔

ناظم سلطانپوری (کلکتہ)

غزل

کہاں تک ایسی اذیت سے ہم گزرتے رہیں
کہ اصل باقی باحق رہے اور سود بھرتے رہیں
اجالا کون کرے گا اندھیری راہوں میں
تمہاری طرح ہوا سے جو ہم بھی ڈرتے رہیں
ہوا چلے کوئی ایسی کہ رخ بدل جائے
ہم اپنے آپ سے کب تک یہ جنگ کرتے رہیں
دلوں میں کھوٹ نہیں کوئی بھید بھاؤ نہیں
تو کس بنا پہ ہم اک دوسرے سے ڈرتے رہیں
میاں یہ جینے کی خواہش عجیب ہوتی ہے
ادا مثال کوئی ہو تو ہم بھی مرتے رہیں
خلاف طبع سہی عاقبت اسی میں ہے
وہ جس کو چاہے اسے ہم گوارا کرتے رہیں
نواح جاں میں ہو ایسی کوئی جگہ ناظم
جہاں پہ درد کے پنچھی سدا اترتے رہیں

شفق امام
علی گڑھ

غزل

شجر پہ پھر پرندوں کی قطاریں لوٹ آئی ہیں
ترے آنے سے گلشن میں بہاریں لوٹ آئی ہیں
تری یادوں کا موسم اس نئے انداز سے آیا
فصیل دل پہ زخموں کی کگاریں لوٹ آئی ہیں
یقیناً سرحد دل پر معرکہ ہونے والا ہے
کہ معنی خیز شمشیروں پہ دھاریں لوٹ آئی ہیں
خمار آلودہ جھونکے نے کچھ ایسی تازگی بخشی
تمام افسردہ چہروں پر بہاریں لوٹ آئی ہیں
مرے عزم سفر کا معترف ہونا پڑا آخر
شفق منزل بکف کچھ رہگزاریں لوٹ آئی ہیں

کنور بہادر سنگھ سوز

غزل

راستی نایاب ہے دنیا کے کاروبار میں
جو صداقت کی نہیں باقی کہیں اطوار میں
مسکراہٹ تھی ریا کی الوداع کہنے کے بعد
ہو نہ ہو ابلیس ہی تھا صورت غمخوار میں
دن بہ دن اقدار کا ہوتا رہا، گر یوں زوال
لحم انسان کیا عجب بکنے لگے بازار میں
راستہ ملتا نہیں تھا نفرتوں کی کشت میں
چل پڑا تھا اک مسیحا وادیٔ پرخار میں
کھنڈروں کا شہر ہے معدوم ہیں جس کے مکیں
ڈھونڈتے ہو تم عبث کس کو در و دیوار میں
سوز تو نادان ہے کہہ کر غزل کیا پائے گا
ذکر تیرے دوست حاجی کا چھپا اخبار میں

کنور بہادر سنگھ سوز

غزل

کرادوں سیر جنت مجھ کو لے آیا ہے یوں کہہ کر
گلی ہے بیکسوں کی کیا یہی جنت ہے اے رہبر
عقیدے رہ گئے چھٹ سے گئے اطوار انسانی
لہو آلودہ پھر کیونکر نہ ہوتا شہر کا منظر
جو شیوہ اپنا یوں ہو، دوستی کیا ہمدمی کیسی
زباں میں انگبیں ہوتا ہے زیر آستیں خنجر
گھٹتے جاتے ہیں انساں روز بلا تر تمدن ہے
کہیں ہے آبرو کی لوٹ جلتے ہیں کہیں کے گھر
چھپانا بھی کہاں ممکن ہے چہرہ داغدار اپنا
اٹھاؤں کس طرح سر اب حضور داور محشر

ڈاکٹر پی۔ کے۔ سری واستو نجاز
ڈی ۲۷۔ دیو نگر، ٹونک روڈ۔ جے پور

غزل

ہم ہیں پژمردہ کہ وارفتہ حروف
کیوں نظر آتے ہیں برگشتہ حروف
بے اثر، بے معنی، و بے ربط و راہ
ہوگئے ہیں کس قدر خستہ حروف
دل سے کیا مطلب، نظر سے کیا مراد
ہیں فقط کاغذ سے وابستہ حروف
سنگ کیا کہسار کردیتے تھے چاک
ہمنوا ایسے بھی تھے پختہ حروف
شرط ہے ترتیب کی کچھ احتیاط
کچھ بھی کہہ سکتے ہیں برجستہ حروف
ہاں سلیقہ چاہئے ہے ہر زباں
ظرف کے طالب ہیں شائستہ حروف
چاہئے کتابت میں کچھ تلاش
یوں نہیں ملنے کے گم گشتہ حروف
پھر وہی ہے سرخیٔ اخبار صبح
پھر وہی شب رنگ سے پستہ حروف
کوئی لفظوں کو سمجھائے مجاز
شاعری منزل ہے اور رستہ حروف

اسحاق ملک
حیدرآباد-۲۲

سایہ!

کچھ مکانوں والا وہ چھوٹا سا محلہ
نحیف دیواروں کا مکان
ہر لمحہ خاموشی
کوئی چراغ جلتا ہے نہ بجھتا
ہاں ---!!
قدموں کی مدھم چاپ سنی
ایک پراسرار سایہ ہر قدم منڈلائے
درد بھرا اک گیت سنائے
وہ سایہ ---!!

ڈاکٹر مختار الدین احمد
بریڈ فورڈ (برطانیہ)

غزلیں

جئیں کیا خاک جب نور نظر زندہ نہیں رہتے
مکیں اٹھ جائیں تو دیوار و در زندہ نہیں رہتے

اگر کٹ جائیں شاخیں تو شجر زندہ نہیں رہتے
پرندے جس طرح بے بال و پر زندہ نہیں رہتے

کبھی آبادیاں تھیں اب فقط سیاح آتے ہیں
اجڑ جائیں تو دل کیا ہیں نگر زندہ نہیں رہتے

بالآخر ریگ دوراں دفن کر دیتی ہے اخلاقاً
مٹیں جب شہر تو ان کے کھنڈر زندہ نہیں رہتے

تعلق شاخ گل سے چھوڑ کر گھر اڑ گئی تتلی
جو خالی ہوں مکینوں سے وہ گھر زندہ نہیں رہتے

عجائب گھر میں اپنی کاوشیں رکھی گئیں تو کیا
جو طاقوں میں سجے ہوں وہ ہنر زندہ نہیں رہتے

ولادت اور مرنے کے سفر اپنی جگہ لیکن
نہ گزریں کربلا سے تو سفر زندہ نہیں رہتے

زمیں کے پیٹ سے تو [illegible] لے کر آئے تھے بہتر
اندھیرا اتنا گہرا ہے شرر زندہ نہیں رہتے

شمار اپنا بھی اب مختار ہے پس ماندہ لوگوں میں
جو جیتے ہیں بہر صورت مگر زندہ نہیں رہتے

بھائیوں سے دوستوں سے غم گساروں سے کہی
قلم کی روداد ہم نے سب اداروں سے کہی

جو محافظ تھے وہ دشمن قریہ دل کے ہوئے
جانے کیسی بات اس نے شہرداروں سے کہی

داد سوز غم ملی تو دلفگاروں سے ملی
زندگی کی داستاں تھی تو شراروں سے کہی

اس کے کانوں تک نہ پہنچی داستان ظلم بھی
دوستوں یا دشمنوں سے کیا ہزاروں سے کہی

لوگ چلتے تھے تکبر سے زمیں کی کوکھ پر
کل ہوا نے یہ کہانی رہگزاروں سے کہی

شہر کے بازار میں اس کے بہت چرچے رہے
بات جو بھی میں نے اپنے رازداروں سے کہی

رات میں نے بھی دکھایا اس کے سورج کو چراغ
دل کے زخموں کی حکایت ماہ پاروں سے کہی

دیکھنا تم بھی نہ ہو پامال دنیا کی طرح
چاند نے یہ بات کل سارے ستاروں سے کہی

زندگی بھر میرے منہ سے بات جو نکلی نہیں
وقت رخصت میں نے آزردہ اشاروں سے کہی

آج پھر مختار کہئے وہ حدیث دلبری
جو مرے محبوب نے سب جاں نثاروں سے کہی

اشعار

منڈیروں سے نہیں جاتا سروں کی فصل کا موسم
ہر اک موسم کو ٹھہرایا ہے اس نے قتل کا موسم

پرندے ہو رہے ہیں منتشر باد مخالف سے
نہ یارا ہے بسیرے کا نہ ہے یہ نقل کا موسم

فصیلوں سے اتارے جا رہے ہیں سر گئی رت کے
مبارک ہو کہ آتا ہے ہماری نسل کا موسم

گھروں کو کر لیا روشن مگر دل میں ہے تاریکی
مسلط ہے ابھی تک اپنے سر پر جہل کا موسم

حریر و اطلس و بانات کے بستر پہ کاٹے
گزارا ہجرتوں میں جس نے سارا وصل کا موسم

لہو کے رنگ سے اپنی خزاں رشک بہاراں ہے
پلٹ کر آئے گا کس دن خدا کے فضل کا موسم

گزر جائے گی جب مختار یہ رت سر کٹانے کی
پھر اس کے بعد آئے گا انا کے قتل کا موسم

تعارف :

نام	:	ساجدہ رحمن
قلمی نام	:	ساجدہ عندلیب رحمن
والد کا نام	:	حبیب الرحمن
دادا کا نام	:	جناب عبد الرحمن
مقام پیدائش	:	پورٹ بلیئر۔ انڈمان
تعلیم	:	ایم۔اے، بی۔ایڈ (کلکتہ یونیورسٹی) ادیب کامل (علیگڑھ)
موجودہ ملازمت	:	ہسٹری ٹیچر تھومس ڈے ہائی اسکول خضرپور۔ کلکتہ ۷۰۰۰۲۳
زبانیں	:	اردو، انگریزی، ہندی، بنگالی
پسندیدہ افسانہ نگار	:	راجندر سنگھ بیدی۔ انیس رفیع جیلانی بانو۔ ذکیہ مشہدی
افسانوی زندگی کا آغاز	:	۱۹۹۰ء سے
افسانوں کی پیش کش	:	انڈیا اور پاکستان کے علاوہ کئی اور رسالوں میں شائع ہوئی آکاش وانی کلکتہ سے افسانوں کی نشریات
تفریحات	:	اردو اناؤنسر۔ انجمن اردو پروگرام آکاش وانی کلکتہ۔ اردو نیوز ریڈر دوردرشن کلکتہ رہ چکی۔ بی ہائی گریڈ اردو، ہندی ریڈیو ڈرامہ آرٹسٹ سامعین کے خطوط کے جوابات آکاش وانی کلکتہ ریڈیو ڈرامے و فیچرز کی پیش کش، تحریر و ہدایت کاری ہوا محل (وِوِدھ بھارتی) و آکاش وانی کلکتہ
مستقل قیام	:	E/1 ابراہیم روڈ۔ خضرپور کلکتہ۔ ۷۰۰۰۲۳

رہائی

ساجدہ عندلیب رحمان

زندگی کے بیس سال ان سلاخوں کے پیچھے گزارنے کے بعد آج جانکی بائی کو رہائی مل رہی تھی۔ ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی پوٹلی اور ماتھے پر شکن لئے وہ اپنے ہی خیالوں میں محو تھی !

"واہ ری قدرت کیا کیا کرشمے دکھاتی ہے تو بھی!" اسے لگ رہا تھا کہ اس کی دل کی دھڑکنیں یک لخت بند ہو جائیں گی۔ اس کی آنکھوں میں نمی پھیلنے لگی اور نظریں چھت سے ٹکرانے لگیں!

"ہم تو انسان ہیں! تمہارے بندے! تمہارے اشاروں پر چلنے والی کٹھ پتلیاں! تم تو بھگوان ہو! سبھوں کی مجبوری و بےکسی کو سمجھنے والے۔ تمہیں آخر کیا پڑی تھی جو مجھے پھر اسی دنیا کی جانب دھکیل دیا۔ وہ دنیا جس نے مجھ سے میری اپنی ہی شناخت چھین کر مجھے قیدی نمبر ۳۱۳ کے جسم میں مقید کر دیا۔" الوہ! یکایک اس نے آنکھیں بند کر لیں پھر کئی سوالات اس کے دل و دماغ میں ابھرنے لگے۔ "آخر۔ آخر۔ ایسا کیوں ؟ ہمارے سامنے نئی کی چاہ میں پرانی کی اہمیت کیوں ماند پڑ جاتی ہے ؟ کیوں ؟ کیوں ؟" اس کے ہونٹوں کو خفیف جنبش ہوئی۔ "شاید۔ شاید۔ قدرت کے اس اصول کی خلاف ورزی! انسانی اختیار میں نہیں۔!" اس کے زخم رسنے لگے اور درد بتدریج بڑھنے لگا!

"میں زندگی کے اس موڑ پر کھڑی ہوں جہاں مجھ سے میرے اپنے پرانے سبھی الگ ہو چکے ہیں۔ جہاں میں آج ہوں کیولی اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اس اندھیرے اور موت میں کچھ زیادہ فرق تو نہیں۔!" اس کے لہجے میں اب بھی درد تھا۔ وہ دیوار کا سہارا لئے اپنی جگہ سے اٹھی اور جھروکے کے قریب آگئی۔ اس کے سامنے وسیع سمندر تھا۔ شانت۔ اور وہ مبہوت نظروں سے سمندر کی گہرائی جانچنے کی کوشش کرنے لگی! "آہا۔ کتنا سکون۔ کتنا ٹھہراؤ ہے سمندر کے دل میں۔ شاید طوفان نے اپنا رخ بدل لیا ہے۔ ہے رام۔ طوفانی ہواؤں کا راستہ بدل چکا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ پھر میری زندگی ......" وہ سہم گئی!

"زندگی کے بیس سال ......! مضبوط آہنی سلاخیں۔ اور کئی تجربے۔ جیل سے لگا جاریل کا سرسبز باغیچہ اور اس کی آغوش میں پروان چڑھتی جانکی اور لصیبن کی دوستی۔ حسینی کی شرارتیں اور۔ اور۔ یشاف صاحب سے بڑھتی ہوئی ہمدردی!"

بنگالی صاحب کا نام لیتے ہی اس کے چہرے پر شگفتگی کے آثار نظر آنے لگے!

"اچھے اور برے لوگ تو کہیں بھی مل سکتے ہیں - ان پر کسی مذہب، کسی برادری اور کسی بھی ملک کی قید نہیں - پوترا گنی کے گرد سات پھیرے لے کر اس ویرانے میں مجھے گم کر دینے والا کون ہے؟ میرا ہم وطن - میرا پتی! اور - اس اجنبی دنیا میں میری بے رنگ زندگی میں رنگ بھرنے والے، مجھے ہمت اور حوصلہ عطا کرنے والے کون ہیں؟ ایک انگریز ... وہ تو میرے محسن ہیں میں ان سے کیوں نفرت کروں؟"
اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلکتے چھلکتے رہ گیا۔

اب تک ماہی گیروں کی کشتیاں نمکین پانی کی سطح پر تیر رہی تھیں - یہ منظر جانکی کو لبھانے لگا - کہ اچانک ہی دور کہیں دور اس کی نظریں کچھ دیر کے لئے ٹک گئیں - ابرا ڈین کی جانب بڑھتا آرہا اسٹیمر اسے دکھائی پڑا - اس کی بے چینی بڑھنے لگی اور ہاتھ سر سے ڈھلکتے آنچل کو درست کرنے لگے!

"آہ اسٹیمر - ساحل - پھر اس کے بعد میری انجان منزل - مگر - مگر - نہیں - میری منزل انجان نہیں بلکہ میری اپنی ہی بستی ہے -!"

"میری بستی - ہے رام!" وہ لرز گئی - وہ بستی جسے حافظے کے کھنڈر سے نکال کر دیکھنا جانکی بائی کے لئے ایک تکلیف دہ مرحلہ تھا!

"میری بستی تو وہی ہوگی - وہاں کے کچے اونچے نیچے - اور پتھریلے راستے بھی وہی ہو سکتے ہیں مگر - کیا ان پر اٹھنے والے قدم اور ان قدموں کے نشانات وہی ہوں گے؟ نہیں نہیں - بستی والوں کے طنز و نشتر بھرے جملے! یہ سب میں کیونکر برداشت کروں گی -!" سمندر کے اس پار جزیرۂ روس کے سینے سے اٹھتے ہوئے کالے دھوئیں کے بادل اسے نظر آنے لگے - وہ چونک اٹھی - پھر سنبھلتے ہوئے بولی "یہ سیاہ بادل - یہ تو محض عارضی ہیں - مگر - مگر - وہ چنگاری جو مجھے اپنے گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہی ہے - جس کی زد میں میں آکر راکھ بن کر بکھر جاؤں گی - اس کا کیا ہوگا؟" وہ دونوں ہتھیلیوں سے چہرے کو رگڑنے لگی!

"میں بھی کتنی پاگل ہوں جو اس سے گھبرا گئی - یہ اس آدمی سے زیادہ سنگ دل تو نہیں جو عجیب سا تھا - جو طوفان، خوف، دھرتی اور آکاش کا بھی رنگ بدل دینے میں آگے آگے تھا پرس رام - ہاں شاید یہی نام تھا اس کا - ہے رام -
اس نے حقارت سے گردن جھکالی اور انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی - "نام کے ہی سہی مگر میرے پتی .... محض نئی چیزوں کے دلدادہ یہاں تک کہ نئی بیوی کے بھی -" اس کے لہجے میں لرزش اور تلخی کے ملے جلے آثار نظر آنے لگے - مگر - مگر - یہ سب میں کیوں سہہ رہی تھی؟ ہاں - شاید اس لئے کہ وہ میری کمزوری تھے - یا - میں اسے اپنی زندگی کا واحد سرمایہ مان چکی تھی - یہ بھی ممکن ہے کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے ہی پھینکے ہوئے پتھروں سے میرے ہی گھر کا شیشہ چور چور ہو جائے گھر - میرا گھر - وہ گھر جس کی خاطر میں نے اپنا وجود چار دیواری میں سمیٹ لیا تھا - مگر - مگر - گھر ایسا ہوتا ہے کیا؟ دو تنگ کمرے دو بیویاں - اور ان کی روز روز کی تو، تو، میں میں! وہ ہنسنے لگی - "ہا - ہا ہا - گھر اسے کہتے ہیں -؟ اگر وہ گھر تھا تو میں سمجھتی ہوں کہ گھر سے کال کوٹھری ہی بھلی - ہا - ہا - ہا"
اس کے قہقہے نفرت کی آمیزش لئے اب بھی فضا میں بلند ہو رہے تھے! یکایک وہ خاموش ہو گئی اس کی آنکھیں خون رنگ ہونے لگیں - اور وہ دوبارہ ماضی کی یادوں کو بٹورنے کی کوشش کرنے لگی -!

"میرے بیتے ہوئے دن -! جہاں ظلم، عداوت - نفرتیں، صبر .... مگر آخر کب تک؟ ہر چیز کی ایک سیما ہوتی ہے -!" میرے ذہن میں اتھل پتھل ہونے لگی - میرا گھر مجھے قبرستان سا ویران لگنے لگا - مگر - قبرستان اور شمشان میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا - یہ مشابہت میرے دل و دماغ میں حاوی ہونے لگی - میں تلملا اٹھی - اور ہندوستانی بیوی کے خول سے نکل کر شکتی کا روپ دھارن کرنے لگی - رفتہ رفتہ غیر مہذب آہنی شکنجے میں ایک دیوی دب گئی اور وہ اپنے خواب کو حقیقت کا عملی جامہ پہنانے کے لئے مستعد ہو گئی -
اس نے کچھ طے بھی کر لیا - ایک رات ایک زبردست دھماکہ ہوا - اور - پل بھر میں سبھی کچھ تہس نہس ہو گیا - وہ گھر! میرا گھر! ان کا گھر - حقیقتاً ایک شمشان بن چکا تھا - میرے ہی ہاتھوں دو لاشیں چتا کی نذر ہو گئیں - مگر - اس تپش سے میرا دامن بھی محفوظ نہ رہ سکا - اور - میں یہاں آگئی - پر یہاں مجھے تسکین میسر ہوئی کیونکہ اب میرے روبرو نہ ہی پرس رام تھا اور نہ ہی اس کے افسانے -! اس طرح کئی سال گزر گئے - وقت نادر کسی کے ساتھ نہیں چلتا کہ بشر اس کی رفتار کو چھونے سے قاصر ہے - اور - تعاقب کرنے والے یاد ماضی کا حصہ بن کر کسی کھنڈر میں دبک جاتے ہیں - میں بھی تقریباً بھولا ہوا قصہ بن چکی تھی - مگر - آج کے بعد پھر وہی کیفیت - وہی الجھنیں! اس کے دل و دماغ میں ایک ہیجان برپا ہونے لگا - گرد و نواح کی تمام چیزیں اسے زمیں بوس ہوتی نظر آنے لگیں - اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نے ایک نوکیلی کیل اس کے سینے میں اتار دی ہے - وہ اپنی تمام قوتوں کو سمیٹ کر لڑکھڑاتے قدموں کو جمانے کی کوشش کرنے لگی - کالے پل پر سے اکا دکا مسافر گزر رہے تھے - وہ مسکراتی ہوئی اچٹتی سی نظر پل

سے لگی سڑک پر ڈال کر سرگوشی میں بولی "واہ رہی زندگی - تو بالکل اسی راہ کی طرح ہے جس پر سے بکھرے کانٹے اگر چن لئے جائیں تو چبھن کا خوف جاتا رہتا ہے!" یشاف صاحب نے بھی تمام کانٹے چن کر ایک ایسی ہی نرم و ٹھنڈی راہ پر جانکی بائی کو روانہ کر دیا تھا - زندگی کو اس راہ سے گزار کر ایک تازہ و شفاف زندگی کا خواب جانکی کی منزل بن گئی - منزل در منزل آگے بڑھنے کا تصور اب اسے کھینچ رہا تھا - اس کے روبرو یشاف صاحب کی کئی تصویریں ابھرنے لگیں -!

"گھبراؤ نہیں - تم وہی جانکی بائی ہو - بیس سال قبل والی - وہی مشرقی معاشرے کی رانی - ہندوستانی تہذیب کی علمبردار جسے رسمی لبادہ اوڑھا کر تمہارے اپنے مہذب لوگوں نے ننگا کر دیا تھا - اس لبادے کو اتار کر تم پھر سے وہی ہو گئی ہو - میں تمہارا رکھوالا ہوں - میں تمہارا محافظ ہوں - آجاؤ - آجاؤ -!" وہ مضبوط ارادوں کے سہارے لمبے لمبے ڈگ بھرتی دروازے سے باہر نکل آئی - اس میں درد کی لے دھیمی پڑ چکی تھی اس نے واپس جانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا -

"آجاؤ - آجاؤ -!" یشاف صاحب اب بھی اسے پکار رہے تھے - وہ بڑھ رہی تھی - آگے - آگے - آگے - اور آگے - وہ اوجھل ہو گئی سیاہ بادلوں کی دیوار پھلانگ کر اپنی پرچھائیوں کے جنگل میں - شاید اسی کاٹیج کی جانب جہاں یشاف صاحب پنشن کے بعد رہ رہے تھے - پھر - دور کہیں دور بگل کی آواز سے سارا جزیرہ گونج رہا تھا -!

غواصی کی مثنویوں میں اخلاقی اقدار

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ
صدر شعبہ اردو
پوسٹ گراجویٹ کالج - سکندرآباد - ۵۰۰۰۰۳

غواصی قدیم اردو یا دکنی کا عظیم ترین شاعر ہے - مثنوی اور غزل دونوں اصناف میں، دبستان گولکنڈہ اور دبستان بیجاپور کا کوئی شاعر اس کے مرتبہ کو نہیں پہنچتا - وہ قدیم اردو کا شاعر ہے لیکن شاعرانہ فنکاری و حسن کاری کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اگر ساری اردو شاعری سے نصف درجن بلند پایہ شاعروں کے نام گنائے جائیں تو غواصی کو ان میں نمایاں مقام حاصل رہے گا - غواصی کا "طوطی نامہ" اردو شاعری میں اپنی طرز کا منفرد شاہکار ہے جو عظیم لاطینی فنکار "بوکے شیو" کی "دی کیمے راں (DECAMERON) کی یاد دلاتا ہے - میر حسن کی "سحرالبیان" اس کے مقابلے میں بے جان چیز معلوم ہوتی ہے - دوسری طرف غواصی کی غزلیں، شوخی و دارفتگی، والہانہ شیفتگی اور خود سپردگی کی ایسی شدید کیفیات کی حامل ہیں جن کے آگے مومن، حسرت اور جگر کے تجربات محبت بھی بے رنگ معلوم ہوتے ہیں - اس کی بعض غزلیں جو فکر و احساس کی بلندیوں کی ترجمانی کرتی ہیں - غالب کی اسی رنگ کی غزلوں کے ہم پلہ ہیں -

دکنی مثنوی قدیم اردو کے اصناف سخن میں مثنوی کو ایسی ہی مقبولیت حاصل تھی جو بعد کے ادوار میں غزل کو میسر ہوئی - دکنی کے کم و بیش تمام تر شعرا مثنوی کی صنف میں اپنے جوہر دکھانے کی کوشش کرتے ہیں - دکنی مثنوی قدیم اردو کی مقبول ترین صنف سخن ہے -

اخلاقی اقدار جنہیں ہم اخلاقی اقدار کہتے ہیں، وہ انسانی معاشرہ کے قیام، اس کی بقا اور کامیابی کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں - انسان معاشرتی حیوان ہے - خیر و شر، حق و باطل، انصاف اور ناانصافی کی قدروں کو یکسر نظرانداز کر دیا جائے تو ایک روٹی پر متعدد آدمی جھپٹنے لگیں گے اور انسان پھر جنگل کی دنیا میں لوٹ جائے گا سارے مذاہب، اور تمام عظیم مفکروں نے ان ہی بنیادی قدروں کی تلقین کی ہے، جنھیں ہم انسانی اقدار کہہ لیں یا اخلاقی اقدار - عالمی شعر و ادب کے سارے اعلیٰ نمونے، راست یا بالواسطہ طور پر اعلیٰ انسانی اقدار کی ترجمانی کرتے ہیں -

جس طرح انسانی جسم کے لیے ہوا، پانی اور غذا ضروری ہے اسی طرح معاشرتی زندگی کی بقاء اور کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ افراد نیکی اور بدی انصاف اور ناانصافی، صداقت اور باطل کی قدروں سے آگاہ ہوں اور ان پر عمل پیرا بھی ہوں اخلاقی اقدار کے بغیر انسان، انسان نہیں رہ جاتا بلکہ ایک جانور بن جاتا ہے - انسانی اقدار نہ ہوں تو جسم باقی رہتا ہے روح غائب ہو جاتی ہے - انسان اپنے ہر فعل و عمل پر نظر رکھے اور انسانی یا اخلاقی اصولوں کی پابندی اور زندگی کے ہر مرحلے پر انسانی تعداد کو ملحوظ رکھے تو وہ صحیح معنوں میں انسان کہلائے گا - غالب نے اسی لیے کہا ہے -

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

سارے مذاہب اعلیٰ انسانی اقدار کی تلقین کرتے ہیں اور انسان کو دیانت داری و سچائی کی روشنی میں اپنا راستہ تلاش کرنے پر مائل کرتے ہیں یہ دیانت و صداقت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کے بغیر قوت اور اقتدار کے مظاہرہ نے تاریخ انسانی کو بہت داغدار کیا ہے - دنیا میں بہت سی خونریزیاں اسی وجہ سے ہوئیں کہ افراد اور قوموں نے صرف قوت اور اقتدار کا مظاہرہ کیا اور اعلیٰ انسانی اقدار کو یکسر نظرانداز کر دیا - آج چنگیز خاں، ہلاکو اور ہٹلر کے

واقعات سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں لیکن انسانی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ صرف قوت و اقتدار کے سہارے فتوحات حاصل کرنے والوں نے جو نقش چھوڑا ہے انہیں بہت جلد ہمیشہ کے لیے مٹا دیا گیا۔ انسان کا عمدہ چال چلن اور اعلیٰ اخلاق زندگی میں اس کے کام کو سہل اور آسان بنا دیتے ہیں۔ معاشرے کے دوسرے افراد کسی انسان کے اخلاقی کرداری سے اس کی اندرونی حالت اور دلی نیکی اور قلبی صفائی کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ اعلیٰ اقدار کا حامل انسان اپنے پاکیزہ کردار کی وجہ سے کامیاب ہوتا ہے۔ دکنی مثنویوں میں اخلاقی کردار کا مظاہرہ اکثر جگہوں پر واضح طور پر ملتا ہے۔

اعلیٰ شعر و ادب میں اعلیٰ انسانی اقدار کی تلقین و تصویر ہر جگہ ملتی ہے۔ ذیل میں غواصی کی دو مثنویوں کے حوالے سے اپنے موضوع پر روشنی ڈالوں گا یہ دو مثنویاں ہیں "طوطی نامہ" اور "سیناست ونتی"

مثنوی "طوطی نامہ" سنسکرت کے مشہور قصے "شکاسب تتی" سے ماخوذ ہے لیکن غواصی کا ماخذ فارسی ترجمہ ہی ہے۔ "طوطی نامہ" کا ترجمہ سب سے پہلے مولانا ضیاء الدین نخشی نے ۷۳۰ھ میں کیا تھا۔ انھوں نے ستر کہانیوں میں سے صرف باون کہانیوں کا انتخاب کیا۔ یہ ترجمہ کافی مشہور و مقبول ہوا۔ شہنشاہ اکبر اعظم کی فرمائش پر ابوالفضل نے سلیس فارسی میں اس کا خلاصہ کیا تھا بعد میں ملا سید محمد قادری نے نخشی کی باون کہانیوں میں سے صرف پینتیس کا انتخاب روزمرہ فارسی میں کیا۔ غواصی کا ماخذ نخشی ہی کا طوطی نامہ ہے غواصی کے ایک شعر سے اس کا ثبوت مل جاتا ہے۔

ہوئے حضرت نخشی مج مدد

دیا میں اسے تو رواج اس سند

غواصی نے صرف ۳۵ کہانیوں کا انتخاب کیا اور ان کہانیوں میں اپنی طرف سے ترمیم و اضافے کئے۔ غواصی کا یہ پہلا ترجمہ ہے جو فارسی سے دکنی میں کیا گیا۔ بعد میں فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کے منشی سید حیدر بخش حیدری نے ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۲ء میں اردو میں اس کا ترجمہ کیا۔ میر سعادت علی رضوی نے ۱۳۵۷ھ مطابق ------ء میں اس کو ترتیب اور تصحیح کے ساتھ مرتب کیا اور سلسلہ یوسفیہ کی جانب سے اس کو شائع کیا گیا۔ اردو کے علاوہ ترکی، انگریزی، جرمنی اور ہندی زبانوں میں بھی "طوطی نامے" کے ترجمے ہوئے ہیں۔ یہ چار ہزار اشعار کی نہایت طویل مثنوی ہے جس کی ------ ۱۰۵۹ھ مطابق ------ء ہے۔ مثنوی کی عام روایت کے برخلاف غواصی نے مافوق الفطرت عناصر سے بہت کم کام لیا ہے۔ مثنوی میں صرف ایک طوطا ہے جو بولتا ہے۔ اس طویل مثنوی میں اخلاقی اقدار کی جھلکیاں جگہ جگہ نظر آتی ہیں یہ قصہ در قصہ کا انداز ہے۔ ایک نوجوان سوداگر کی شادی کسی حسین لڑکی سے ہوتی ہے۔ سوداگر بازار سے ایک طوطا خریدتا ہے۔ طوطا بہت ہی دانشمند ہے سوداگر کو تجارت میں بھی مشورے دیا کرتا ہے۔ طوطے کی صحبت کے لیے سوداگر نے ایک مینا بھی خرید لی۔ تجارت کے سلسلہ میں وہ دوسرے شہر گیا اور طوطے اور مینا کی پرورش کی ذمہ داری اس نے اپنی بی بی کے سپرد کی۔ سوداگر کی بیوی ایک بدکار عورت تھی وہ صدمہ فراق سہہ نہ سکی۔ سوداگر کے غیاب میں اس کی آنکھ ایک نوجوان سے لڑ گئی۔ ملاقات کا وقت مقرر ہوا۔ سوداگر کی بیوی نے مینا سے اجازت طلب کی کہ وہ اس نوجوان سے وصال کی آرزو مند ہے۔ مینا نے انکار کیا اور نصیحت کی کہ وہ بدکاری سے باز رہے۔ فرقت کی ماری، اتاؤلی سوداگر کی بیوی کو یہ سچی بات کھلی۔ اس نے مینا کے بال و پر نوچ کر اس کو ہلاک کر دیا۔ اگلا گرا پچھلا ہوشیار کے مصداق طوطا ہوشیار ہو گیا۔ سوداگر کی بیوی نے جب طوطے سے مشورہ لیا تو اس نے خلاف مصلحت سمجھ کر اجازت دے دی۔ لیکن اس شرط پر کہ وہ اپنے دل کا راز کسی سے نہ کہے ورنہ اس کا وہی حال ہوگا جو ایک رانی کا ہوا تھا۔ سوداگر کی بیوی نے رانی کے قصے کو سننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ طوطے نے بیان کیا یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ ہر روز یہی ہوتا رہا۔ طوطا اجازت دیتے ہوئے ایک نہ ایک قصے کا ذکر کر دیتا جب سوداگر کی بیوی سننے کی خواہش کرتی تو وہ بیان کرتا جاتا۔ وہ اس طرح بیان کرتا کہ اس کے عاشق سے ملاقات کا وقت گزر جاتا اور وہ اپنے عاشق سے ملنے نہ جا پاتی۔ طوطے نے ۲۵ کہانیاں، ۲۹ راتوں میں بیان کیں۔ یہاں تک کہ سوداگر سفر سے واپس آیا اور گھر کا حال طوطے سے دریافت کیا۔ طوطے نے اس شرط پر حقیقت حال پر آمادگی ظاہر کی کہ وہ حالات سننے کے بعد اسے رہا کر دے گا۔ سوداگر تمام حالات سننے کے بعد بہت رنجیدہ اور ملول ہوا۔ اپنی بی بی کو قتل کر ڈالا۔ مال و دولت خیرات کر کے درویشی اختیار کی۔

سوداگر ایک شریف انسان ہے ۔ اس کی بیوی بد چلن اور آوارہ ہے ۔ سوداگر اخلاقی قدروں کی پاسبانی کرتا ہے جب کہ اس کی بیوی اخلاقی قدروں کو پامال کرنے پر آمادہ ہے ۔ کسی بھی انسان کی شخصیت اس کے کردار کی آئینہ دار ہوتی ہے ۔ شخصیت میں انسان کی خوبیاں اور خامیاں دونوں صفات موجود ہوتی ہیں ۔ اس مثنوی کے دو کردار یعنی طوطے اور مینا میں بڑا تضاد ہے ۔ طوطا فریس اور موقع شناس ہے جب کہ مینا بھولی بھالی اور نادان ہے ۔ اپنی نادانی کی وجہ سے اس کی جان گئی ۔ طوطے کی ہوشیاری اور مصلحت نے اس کی جان بچائی ۔ غواصی کی اس طویل مثنوی میں نیک مرد اور بدکار مردوں کے کردار ملتے ہیں اور نیک عورتوں اور بدکردار عورتوں کے کردار بھی ۔

"طوطی نامہ" غواصی کی شاہکار مثنوی ہے اس کے مطالعہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ یہ مثنوی غواصی کے آخری زمانے کی تصنیف ہے جب کہ اس کو شہرت، عزت اور دوسری تمام آسائش مہیا ہو چکی تھیں ۔ شاید اسی لیے وہ دنیا کے عیش و عشرت اور دولت سے بیزار سا نظر آتا ہے ۔ سوداگر کی بیوی میں اعلیٰ انسانی اقدار کا فقدان ہے ۔ وہ بڑی ہی بے باکی سے فراق کے عالم میں بار بار طوطے سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

لگیا دل مرا اک نوے یار سوں | بھلے ہیں نین اوس کے دیدار سوں
کہاں تے مہاڑی پو میں جا پڑی | جو آنچ اوپر ایسی بازی کھڑی
نہ جانوں کہ کیوں ہے مرے بھاگ آج | لگی ہے چھنے کوں برہ آگ آج
جو عقل آج تک تھی میرے بات میں | کدھر گئی کہ دستی نئیں ذات میں
سینا کونڈتا ہے مسلم مرا | قیامت لیایا ہے نو غم مرا
تو سینا مرا تڑخنے بار نئیں | کہ سکھ سوں رہنے جیو کوں ٹھار نئیں

غواصی نے ہر باب کے آخر میں دو اشعار ایسے لکھے ہیں جس میں بدکردار عورت کے مکر و فریب پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ بد باطن عورت زہر کی پڑیا ہے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

شکر تے اگرچہ ہے عورت مٹھی | ولے سر بسر زہر کی ہے گھٹی
غواصی اگر نار کھا تک پہ آئے | تو سچ بات کوں جھوٹ کر لوں بسائے

ایسی عورت حور بھی ہو تو وہ سفاکی کا نمونہ ہوتی ہے ۔

جو پھٹ جاگیاں کا سینا چور ہوئے | بری ذات ہے یو اگر حور ہوئے
غواصی جتی خوب عورت اچھے | رہے نا بغیر کوچ حیلے رچے

فریبی عورت سے ڈرنا چاہیے ۔ وہ ایک بلا کی طرح ہے ، اس کی سسکیاں بھی فریب ہوتی ہیں اس کے رونے پر کان مت دھرو یہ غواصی کی نصیحت ہے ۔ ہندی کا مشہور مقولہ ہے "روتی عورت اور ہنستے مرد کو نہیں پتیانا چاہیے" ۔

زباں دار عورت تے ڈرنا بھلا | کہ ہے تو بلا ، بد سے بدتر بلا
غواصی سسکیاں پر نہ دھر اعتبار | کہ ہیں اندر ان کے یو چھل کے ہار

عورت کی ظاہری خوبی پر نہ جاؤ اس کے باطن میں کانٹے چھپے ہوئے ہیں ۔

نہ جا ان کی ظاہر کی خوبی یہ پھول | کہ کانٹے تلے ہے تیز یو گرچہ پھول
غواصی جتا نار عورت اگر | گھڑی ہوتے آکر مکر تس پر

بدکار عورت کا ظاہر اور باطن ایک نہیں ہوتا اس قسم کی عورتوں کے مکر و فریب پر کتابیں لکھی جائیں تو کافی نہ ہوں گی ۔

مکھیاں گرچہ دستیاں ہیں جیوں شکر آج   ولے دل میں کچ نیں کڑوائی باج

غواصی جو ماریاں کراہکر ، کوے   لکھے سو کتاباں تو پورا نہ ہوئے

"مینا ستونتی" غواصی کی ایک دلچسپ مثنوی ہے جس کو ماہر دکنیات و اقبالیات پروفیسر غلام عمر خاں صاحب (سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی) نے اکتوبر ۱۹۸۱ء میں بڑے سلیقہ سے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ "مینا ستونتی" کا پہلا ایڈیشن شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی کے سلسلہ مطبوعات قدیم اردو میں ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔ عرصہ سے یہ کتاب نایاب اور کمیاب ہو گئی تھی اس کی اشاعت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ایک ناشر محمد علی زیرک نے اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۱ء میں شائع کیا۔ ہندوستان کی متعدد جامعات کے نصاب میں یہ مثنوی شامل ہے۔ اس مثنوی میں پروفیسر غلام عمر خان صاحب کا ۹۶ صفحات پر مشتمل عالمانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔

"مینا ستونتی" کا قصہ ہندوستان کی ایک قدیم پریم کتھا پر مبنی ہے۔ ۷۸۹ھ میں یوپی کے مولانا داؤد نے ایک طویل منظوم کہانی "چندائن" لکھی تھی۔ "چندائن" کا شمار اب ہندی کے قدیم ترین ادب پاروں میں ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ ایک پریم کتھا تھی لیکن اخلاقی قدر و قیمت کے اعتبار سے ایسی کہانی تھی جسے بعض واعظ مسجد کے منبر پر بھی پڑھا کرتے تھے اور گویئے اس کے اشعار گایا کرتے تھے۔ جہانگیر کے عہد میں ایک شاعر حمیدی نے فارسی میں اس کا ترجمہ "عصمت نامہ" کے نام سے کیا۔ "مینا ستونتی" کے قصے کے ماخذ پر خود غواصی نے اس شعر میں روشنی ڈالی ہے۔

رسالہ اتھا فارسی یو اول

کیا نظم دکنی ستے لے بدل

فارسی میں اس وقت تک صرف ایک ہی قصہ حمیدی کا "عصمت نامہ" منظر عام پر آیا تھا اس لیے یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ "عصمت نامہ" ہی "مینا ستونتی" کے قصے کا ماخذ ہے۔

چندا ایک راجہ کی خوبصورت لڑکی تھی۔ ایک دن وہ محل کے بالاخانے پر کھڑی تھی اس نے ایک چرواہے کو دیکھا جس کا نام لورک تھا۔ وہ اس کے مردانہ حسن سے بے حد متاثر ہوئی اور اپنے محل میں اسے طلب کیا۔ لورک شادی شدہ اور اپنی حسین بیوی "مینا" کے ساتھ مفلسی کی زندگی گزار رہا تھا۔ چندا کی ترغیب اور تحریص میں آکر لورک اس کے ساتھ راہ فرار اختیار کرتا ہے۔ راجکماری کے فرار ہونے پر راجہ نے صبر سے کام لیا۔ راجہ کے مصاحبین نے لورک کی حسین و جمیل بیوی کا سراپا راجہ سے بیان کیا، راجہ بغیر دیکھے اس پر فریفتہ ہو گیا اور اسے اپنے محل میں لانے کے لیے ایک دلالہ (دوتی) کی خدمات حاصل کیں۔ دوتی نے مینا کو ورغلایا، عیش و آرام کی زندگی کے سبز باغ دکھائے لیکن مینا ایک ست ونتی یعنی باعصمت عورت تھی۔ [illegible]تی کی زبانی ایسی ورغلانے والی باتیں سن کر مینا بے حد برہم ہوئی۔ اس نے کہا لورک ہی میرے لیے ایک راجہ سے کم نہیں۔ دونوں کی اس گفتگو کے دوران شاعر غواصی کے چند حکایتیں بھی سنائی ہیں۔ غرض بوڑھی دلالہ مینا کو اپنے دام میں پھانسنے میں ناکام ہو گئی۔ راجہ خود مینا کے گھر آتا ہے۔ وہ مینا کی شخصیت سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ فوراً لورک اور چندا کو پکڑ لانے کا حکم دیتا ہے جب وہ دونوں راجہ کے سامنے پیش ہوتے ہیں تو راجہ لورک کو مینا کے پاس بھیج دیتا ہے اور چندا کو سنگسار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ دوتی کا سر منڈوا کر سارے شہر میں پھروایا جاتا ہے۔

راجکماری چندا جب پہلی بار لورک کو دیکھتی ہے تو اس پر پہلی نظر میں عاشق ہو جاتی ہے۔ راجکماری کا اخلاقی کردار ایک عیاش عورت کی غمازی کرتا ہے۔ یہ دو شعر ملاحظہ کیجئے۔

چھبیلا توں ہے جان ، جانی مجے   لگیا جیوں میرا گتی ہوں تجے

کتی ہوں سدا سکھ سوں مل کر رہنا   میں عاروس پیاری ، توں نوشہ بنا

لورک ایک سیدھا سادا انسان ہے۔ وہ راجکماری چندا کے حربا چترا اور میٹھی میٹھی باتوں میں آجاتا ہے لورک کے اخلاقی کردار میں ٹھہراؤ [illegible]تا ہے وہ دولت کے لالچ میں آجاتا ہے۔ پھر بھی وہ اپنی بیوی مینا کے حسن و جمال کا ذکر کرتے ہوئے اس کے باعصمت ہونے کا بھی اعلان کرتا ہے مگر

چندا اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

یو سن کر کہا ، میرے گھر تار ہے — او ستونت ناریاں میں اوتار ہے

خدا نے اسے نور ایسا دیا — چتر سار خاصیاں میں اس کوں کیا

نہ حاجت کچ چاند ہور سور کا — مرے گھر میں شعلہ ہے کہہ طور کا

اسم ، پاک اوس کا کہوں میں ملک ایک — پتی ورتا مینا سو ہے ناؤں نیک

بوڑھی دوتی مینا کو بہکاتی ہے ، اس کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی کوشش کرتی ہے اور کہتی ہے جوانی تیزی سے گزر جانے والی ہے ۔ جوانی کو ضائع نہ کر ، راجہ نے بلایا ہے ۔ یہ دن پھر نہ آئیں گے ۔ دوتی کے ورغلانے والے صرف دو شعر پیش خدمت ہیں ۔

مرا آس بھرلا چنچل گن بھری — جوانی چلی باؤ ہو صرصری

کتے ہیں جوانی گئے پراونار — کہ جیوں دیس ڈھل جا پڑے اندر کار

مینا دلالہ کی باتوں میں نہیں آتی اس کے جذبات کا اظہار غواصی کی زبانی سنیئے ۔

اگر کوئی ملک ہوئے صاحب جمال — اگر کوئی مقبول ہوئے جگ اہال

تو لورک سے ایلاڑ ہیں سب تمام — او سرتاج میرا ، مجے اوس سے کام

پرائی سیج میں جا اپس کوں سلاؤں — تو وہ سیج ماٹی میں کیوں نہ ملاؤں

مرے ست کے دریا کا لورک غواص — نہ لے سے کوی اس باج موتیاں کی راس

پرت کا مرے دھن یو بیٹھیا ہے ناگ — سکے کون لینے کوں تن میں ہے آگ

مینا ترغیب و تحریص کی مسلسل کوششوں سے تنگ آکر دوتی سے کہتی ہے ۔

کہی سن کے مینا ، تو کرتی ہے جھات — توں کچ کھول کر بول تیری تو بات

کری تھی کتے مرد ، توں آج لگ — جو مج کوں کرد کر پڑی ہے بلگ

اس کے جواب میں دوتی کا یہ راست اور مختصر جواب ملاحظہ ہو ۔

سنی بات دوتی ، کہتی کچ نہ لاج — کہ بارے جیتی یو قبولی سو آج

کہ تھن پن میں دو چار ، جوانی میں دس — بڈی ہوئی ، اتا پھر کوں آتا ہوس

دوتی گویا شر کی نقیب ہے جب کہ مینا ایک مثالی باعصمت ، باکردار ہندوستانی عورت ہے غواصی نے ان دونوں متضاد کرداروں کے ذریعہ خیر و شر ، نیکی اور بدی کی ازلی کشمکش کی عکاسی کی ہے مکالموں میں بے ساختہ پن موجود ہے دکنی کی قدیم نسوانی زبان کے بیسیوں محاورے اور فقرے اس مثنوی میں محفوظ ہوگئے ہیں ۔

بلند پایہ شاعر اور ادیب جب اعلیٰ انسانی اقدار کو اپنا موضوع بناتا ہے وہ رسمی وعظ و نصیحت کا انداز نہیں اختیار کرتا ۔ وہ اپنے فن پاروں میں ، نفس انسانی میں خیر و شر کی کشمکش کا ایسا دلچسپ اور متاثر کن نقشہ پیش کرتا ہے کہ قاری خود اس میں گم ہو جاتا ہے اور نتائج وہ خود اخذ کرتا ہے ۔ یہی اعلیٰ شاعری GREAT POETRY کی پہچان ہے ۔

تبصرۂ کتب

○ تبصرے کے لیے ہر کتاب کی ۲ جلدیں آنا ضروری ہیں

کتاب : معیار اردو
مؤلفہ : نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل
صفحات : ۱۷۶- قیمت -/21 روپیے
تبصرہ : ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

معیار اردو نواب فصاحت جنگ جلیل کی اجتہادی کاوش فکر کا نتیجہ ہے ۔ اس کتاب میں مؤلف نے عام طور پر مستعمل اردو محاوروں کو بہ اعتبار حروف تہجی جمع کیا ۔ اور ان کے معنی و مطالب لکھنے میں ایسی مشاقی کا ثبوت فراہم کیا ہے جس سے اس کی افادیت اور بڑھ گئی ہے ۔ کتاب کا دیباچہ قاضی تلمذ حسین ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے نہایت پر مغزی سے معہ مختصر حالات مؤلف پانچ تا بیس صفحات پر تحریر کیے ہیں ۔

اس میں شک نہیں کہ معیار اردو خاص طور سے ان لوگوں کے لیے لکھی گئی ہے جو اہل زبان نہیں ہیں ۔ چونکہ کسی زبان کا صحیح لطف و ادراک اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب اس زبان میں رائج محاوروں پر بھی دسترس ہو ۔ اس اعتبار سے اہل زبان حضرات کے لیے بھی اس کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہے ۔

محاوروں کا لفظی معنوں سے عموماً کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ بلکہ ان میں الفاظ علامت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں مثلاً باسی کڑھی میں ابال آنا کو ہی لے لیجئے یا مرے پر سو درے جہاں نہ باسی کڑھی نہ ابال مراد ہے نہ لاش اور اس پر دروں کی مار ہی مراد ہے ۔ بلکہ محاوروں کا مفہوم لفظوں کے پس چلمن کچھ اور ہی ہے ۔ لفظوں کی یہی وہ پردہ داری ہے جو کسی زبان کو حسن عطا کرتی ہے ۔

جلیل سے قبل بھی اکثر اردو لغات میں آخری صفحات پر محاورے لکھنے کا بھی سلسلہ نظر آتا ہے مگر میرے نزدیک ان کی حیثیت ان رباعیوں کی طرح ہے جو ضمناً ترتیب دیوان کے لیے یا مرثیہ کے ایک جزو کی حیثیت سے لکھی جاتی ہیں ۔ باقاعدہ توجہ اس طرف بہت بعد میں کی گئی ۔ اس طرح محاوروں کا بھی معاملہ رہا ہے ۔

جلیل صاحب لائق ستائش ہیں کہ انھوں نے سب سے پہلے ادھر نگاہ کی اور محاوروں کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے اردو کی اس بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے ۔ یہ مختصر سی کتاب اردو ادب کو معیار رفعت تک پہونچانے والی شاہراہ کا ایسا اہم سنگ میل ہے جس پر غیر اہل زبان اور اہل زبان دونوں کو نگاہ رکھنا چاہیے ۔

نام کتاب : پیش رفت
شاعر : ڈاکٹر محبوب راہی
صفحات : ۱۶۰- قیمت -/50 روپیے
سنہ اشاعت : ۱۹۹۴ء
ملنے کا پتہ : اسباق پبلیکیشنز، نیتا پارک - پونہ
مبصر : عاصم شہنواز شبلی

ڈاکٹر محبوب راہی کا شمار عہد حاضر کے باشعور شعرا میں ہوتا ہے ۔ ان کی شاعری کو نہ صرف قارئین بلکہ بلند پایہ ناقدین بھی بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں ۔ اس سے قبل ڈاکٹر محبوب راہی کے تین شعری مجموعے شہات ، تردید اور بازیافت منظر عام پر آچکے ہیں ۔ "پیش رفت" ان کا چوتھا شعری مجموعہ ہے ۔ ان کی شاعری کا سب سے اہم وصف لہجے کی کاٹ ، نیا انداز گفتگو اور ایک خاص قسم کا فنی رکھ رکھاؤ ہے وہ اپنی بات اپنے طور سے کہنے کے ہنر سے واقف ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ راہی صاحب مسلسل ریاضت فن میں مصروف رہے ہیں اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں نئی وادیوں میں پہنچ کر خوشنما پھول چن لائے ہیں ۔ مجموعے کے ظاہری حسن میں نفاست اور سلیقہ تو ہے ہی معنوی حسن میں بھی فکر و احساس کی تازگی اور شعور و آگہی کی روشنی ملتی ہے ۔ میرے ان خیالات کو ڈاکٹر وزیر آغا کے یہ الفاظ اعتبار سند بخشتے ہیں ۔

" ان کے ہاں فکر کو پر عطا ہوئے ہیں اور جذبے کو وارفتگی

نصیب ہوئی ہے اور فکر اور جذبہ ایک دوسرے میں جذب ہونے کے لیے بیتاب نظر آتے ہیں"۔

"پیش رفت" شاعر کے تجربات، واردات اور جذبات کی دلاویز اور دلکش آمیزش ہے۔ ایسے اشعار قدم قدم پر نظر آتے ہیں جو ہماری توجہ کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

اس کا لہجہ ہی بتاتا ہے کہ سچا ہے وہ
جو کھرا ہوتا ہے وہ سکہ کھنکتا ہی ہے

مجھے نصیب ہے ہوا بھی دھوپ اور چھاؤں بھی
خدا کے فضل سے یہ خاکسار خود کفیل ہے

شکاری تاکتا ہے اوٹ لے کر
پرندہ دور بیٹھا تاڑتا ہے

باز اظہار صداقت سے آ اے راہی
اپنا لہجہ مگر اس درجہ بھی تیکھا مت کر

کمائی تو بہت ہے شاعری میں
مگر راہی تو بس جھک مارتا ہے

محبوب راہی کی غزل گوئی اس تیکھے اور سچے ذائقے سے روشناس کراتی ہے جو یگانہ اور شاد عارفی سے ہوتے ہوئے مظفر حنفی، عرفان صدیقی، نصر غزالی اور شجاع خاور تک پہنچی ہے۔ لہجے کی وہی کاٹ اور منفرد انداز محبوب راہی کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔

"پیش رفت" میں ۸۸ غزلوں کے علاوہ ۵ نظمیں، ۸ قطعات اور ۲۵ رباعیات بھی شامل ہیں جن سے شاعر کی زود گوئی اور قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک بات میں اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ "پیش رفت" محبوب راہی کا چوتھا شعری مجموعہ ہے اس لیے اس کی چنداں ضرورت نہیں تھی کہ قارئین کے توصیف نامے مجموعے میں شامل کیے جاتے۔ شکیل اعجاز کا بنایا ہوا سرورق جاذب نظر اور معنوی تاثر لیے ہوئے ہے

نام کتاب : سب سے چھوٹا غم
صفحات : ۱۴۴ - قیمت ۵۰ روپیے
پبلشر : نصرت پبلیشرز امین آباد، لکھنو
مبصر : ڈاکٹر ظفر قدوائی

سب سے چھوٹا غم مختلف عنوانات کے تحت لکھے گئے عابد سہیل کے سولہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کو انھوں نے اپنی چھوٹی بہن نجمہ مرحومہ کے نام معنون کیا ہے۔ جب کہ اس کا انتساب اسی کتاب کے نام ان چار مصرعوں کے ساتھ درج ہے۔

تری رہگزر میں چراغ میرے نیاز کا
جو بھڑک اٹھا بھی تو چھپ کے اوٹ میں کنج کی
تجھے کیا خبر کہ ہوائے دشت کے سیل نے
اسے کتنے زخم عطا کیے اسے کیا دیا

دراصل یہی مصرعے پیش نظر افسانوں کی روح ہیں۔ جن کے بیان کے لیے عابد سہیل نے کسی خاص اسٹائل یا طرز کو اپنانے یا فن کاری دکھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ روزمرہ کی زندگی اور بالخصوص لکھنوی ماحول میں ہی انھوں نے اپنے موضوع تلاش کیے اور ان پر بے ساختہ بلکہ قلم برداشتہ شگفتہ طور پر صاف ستھری زبان میں روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطالعہ سے بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کوئی ہمارے دل کی بات ہم سے کہہ رہا ہو۔ عابد سہیل سماج میں پھیلی ہوئی ان ناہمواریوں اور تلخ سچائیوں کے مصور ہیں جو متوسط طبقہ خاص کر مسلمانوں کے سامنے قدم قدم پر بکھری ہوئی ہیں۔ ان کوتاہیوں یا خامیوں کا ذکر وہ محض تشہیر و شہرت کے لیے نہیں کرتے بلکہ وہ اپنی تحریر کے وسیلے سے ایک آئینہ دکھاتے ہیں جس میں ہم اپنا اور اپنے سماج کا چہرہ بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔

منیر کی اماں ایک خادمہ ہے جو ملازمت سے برطرف کر دیے جانے کے باوجود اپنے مالک کے بچے کو جس سے وہ بے حد پیار کرتی تھی برابر دیکھنے آتی ہے۔ اس طرح وہ وفاداری بشرط استواری کو عین ایمان سمجھ کر اس پر قائم ہے۔ لیکن آج کی مادی دنیا خلوص ایثار اور سچائیوں

کے رشتوں سے یکسر بے نیاز ہو چکی ہے۔ عابد سہیل ان پر قلم اٹھا کر ان کی بازیافت کے لیے تحریک عطا کرتے ہیں۔

آج نہ وہ چچا ہیں جو اپنی بھتیجی کے ذہن و افکار پر سماج میں پھیلے ہوئے زہر کے اثرات دیکھ کر اس درجہ متفکر ہوں۔ اور نہ اب وہ شوکت بیگم ہیں جو ازدواجی زندگی کی تلخیوں کو نہایت صبر و تحمل سے برداشت کرتی ہوئی نباہتی ہیں۔ رشتوں کا یہ نازک پن عابد سہیل کے افسانوں کی جان ہے۔ جو ان کی حد درجہ بیدار اور باریک بینی پر دلالت کرتا ہے۔ ان کا ہر مکالمہ نہایت ہی برجستہ اور بے ساختگی سے پوری طرح معمور ہوتا ہے۔ ان کے افسانے لکھنو کی پرانی تہذیب کے مٹنے کا احساس ہیں جس نے آج کے دور میں محبتوں کا گھلا گھونٹ دیا ہے اب وہ سارے رشتے ناطے مفقود الخبر ہوگئے ہیں جو لکھنوی تہذیب کا خاصہ تھے۔ ان افسانوں میں "اندھیرے کا کرب" ۔ "نوحہ گر" ۔ "بی بخاتن بچے جھوٹے موتی" خاص طور سے لائق توجہ ہیں۔ نوحہ گر اور سب سے چھوٹا غم میں حالانکہ عابد سہیل نے مزاروں پر منتوں کے بندھے ہوئے گنڈے یا روحی دروازے دیواروں پر ہزاروں آنے والوں کے نام اور آرزوؤں کا ذکر کر کے ایسے اشارے دیئے ہیں جس سے محسوس ہوتا ہے کہ اس بھیڑ بھری دنیا میں اب انسان کو خود اپنی شکل اور مقام پہچاننا مشکل ہوگیا ہے۔ غرض کہ آج کا انسان ایک راہ گم کردہ کی مانند سرگرم سفر حیات ہے۔

عابد سہیل قصہ گوئی کے فن کے ماہر ہیں۔ ان کی تحریر صاف سادہ، انداز بیان انفرادیت لیے ہوئے اور تقلید و تتبع سے یکسر پاک ہے بلکہ وہ اپنے طرز کے خود ہی موجد ہیں۔ عابد سہیل اپنے قاری کے لیے ایسی فکر و احساس کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ جو از آغاز تا انجام دلچسپیوں کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ نئے اقدار کے بڑھتے ہوئے قدموں سے بچ کر رہنے کی تلقین بھی کرتے ہیں لیکن اشاروں اور کنایوں کی زبان میں۔

کسی فن پارے کی محض یہ اچھائی نہیں کہ قاری کی نگاہ اس شاہکار سے کسی طرح الگ نہ ہو۔ بلکہ اہم بات یہ ہے کہ اس کے مطالعہ کے دوران غیر ارادی طور سے قاری اپنی نگاہ بند کر کے خیالات کی اس فضائے بسیط میں خود بھی محو پرواز ہوجائے جس میں خود فنکار رہا ہے۔ اور یہ غور و فکر برابر جاری ہے۔ عابد سہیل کے افسانوں کا یہی سب سے بڑا وصف ہے جو انھیں دوسرے فنکاروں کے انبوہ کثیر میں نمایاں انفرادیت عطا کرتا ہے۔

ادبی سرگرمیاں_اطلاعات_اعلانات

ناروے کے شاعر جمشید مسرور کو اعزاز

NORWEGIAN AUTHORS UNION کی موقر اور ناروے کے مظاہیر پر مشتمل بارہ رکنی ادبی کونسل کی سفارشات پر ادبی خدمات کے صلے میں جمشید مسرور کو

(IBSEN / BJORNSEN FOUNDATION)

سے ایک لاکھ روپے کے انعامی وظیفہ سے نوازا گیا ہے۔

جمشید مسرور ناروے کی ادبی تاریخ میں پہلے غیر ملکی شاعر و ادیب ہیں جن کو اس انعام سے نوازا گیا ہے۔

0000

حلقۂ راوی کا ایک نیک اور عظیم کام

ممتاز ہندوستانی شاعر جناب ساحل احمد کے بارے میں لوگ جانتے ہیں کہ شدید حادثے سے دوچار ہونے کے بعد طرح طرح کے مصائب و آلام میں مبتلا ہیں وہ پرخطر آپریشن کے مصارف کے متحمل نہیں ہوتے اگر بریڈ فورڈ (برطانیہ) کے ہفت روزہ "راوی" کی اپیل پر اس اخبار کے اہل خیر قارئین اور احباب ان کی مدد نہ کرتے۔ساحل احمد کے علاج پر ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے خرچ ہو چکے تھے اور مزید ساڑھے بیالیس ہزار روپے کی انھیں ضرورت تھی۔یہ مطلوبہ رقم "راوی" دوستوں نے دو قسطوں میں بذریعہ بنک ڈرافٹ انھیں روانہ کر دی۔"راوی" نے اپنی ۶/ مئی ۹۵ء کی اشاعت میں اپنے تمام کرمفرماؤں کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے ایک نیک کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنے اسمائے گرامی پوشیدہ رکھے۔اس نیک کام کے لئے خود مدیر "راوی" جناب مقصود الٰہی شیخ بھی قابل ستائش ہیں جنھوں نے انسانیت کی ایک روشن مثال قائم کی۔جناب ساحل احمد کا پتہ یہ ہے :

LIG _ 10 Neem Sarai

ADA Coloy, Mundera Chak

Allahabad _ 211011

00000

کشور ناہید کے اعزاز میں استقبالیہ

حلقہ ارباب ذوق کے زیر اہتمام سارک کانفرنس میں پاکستان سے بطور ڈیلیگیٹ شمولیت کے لئے نئی دہلی تشریف لائی ہوئی کشور ناہید صاحبہ کے اعزاز میں ۱۴/ مئی کو نارنگ ساقی کے گھر پر منفرد ادبی تقریب و استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا۔کشور ناہید نے اپنی سوانحعمری "**بری عورت کی کتھا**" (جو حال ہی میں ہندوستان میں شائع ہوئی ہے) سے کچھ حصے پڑھ کر سناتے ہوئے بتایا "جو قاری اس کتاب کو یہ سمجھ کر پڑھنا چاہتا ہے کہ اس میں شاید میرے معاشقوں کا ذکر ہوگا اسے یقیناً مایوسی ہوگی میں نے تو اس میں پاکستانی عورت کے حالات کی عکاسی کی ہے کہ اسے پنپنے کے لئے کن حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔اس کے بعد انہوں نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔محفل قریباً تین گھنٹے تک جاری رہی اور حاضرین ہمہ تن گوش داد دیتے رہے۔تقریب میں جوگندر پال، کرشنا پال، علی باقر، نجمہ ظہیر باقر، شمیم حنفی، صدیق الرحمان قدوائی، دیپ سنگھ، اوتار سنگھ جج، مجتبیٰ حسین، رئیس مرزا، شمشیر سنگھ شیر، ممتاز مرزا، منورما دیوان، گیتا ٹھاکر روشنی کے علاوہ پاکستان ایمبیسی کے پریس منسٹر جمیل الدین مفتی نے خصوصی طور پر شرکت کی۔تقریب کے خاتمے پر نارنگ ساقی نے سب حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔اس کے بعد سب حاضرین نے کھانے میں شرکت کی جس کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔

نارنگ ساقی (دہلی)

00000

عرعر میں یوم اردو _ عالمی مشاعرہ

۲۸/ مئی ۹۵ء کو بزم احباب سخن، عرعر نے یوم اردو کے سلسلے میں ایک شاندار مشاعرہ جناب شمشاد احمد (آرگنائزر) کے گھر (گلستان لکھنو، عرعر) میں منعقد کیا جس میں سعودی عربیہ کے دور دراز سے آئے ہوئے شعراء و عاشقان اردو نے حصہ لیا۔صدارت کے فرائض جناب ظل الرحمن قاسمی نے اور نظامت کے فرائض راقم الحروف نے انجام دیئے۔راقم الحروف نے اور ظل الرحمن قاسمی نے یوم اردو منانے کے مقاصد اور اس کی ترویج و ترقی سے متعلق اپنا اپنا مقالہ پیش کیا۔جس میں تاریخ زبان اردو اور شعر و ادب پر مختصر روشنی ڈالی گئی۔جلسے کی کارروائی السید / بہاء حسن مصری کی تلاوت کلام پاک سے شروع ہوئی پھر حنیف ترین نے حمد اور مہدی حسن مجور نے نعت پیش کی۔بزم کے نائب صدر ظل الرحمن قاسمی، سکریٹری رازق مہوی کے علاوہ عبد القیوم، اسلم، عبد المنان، سلیم، محمد ہارون رشید صاحبان نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔مشاعرہ کی ویڈیو فلم بندی اکرم لطیف مہوی نے اور فوٹوگرافی جناب سلیم لکھنوی نے کی۔جن شعرا نے سامعین کو اپنے کلام سے نوازا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ڈاکٹر حنیف ترین، مہدی حسن مجور، ظل الرحمن قاسمی، عبد الرزاق مہوی، محمد صادق (گجرات، پاکستان)، رئیس لکھنوی، اقبال اعظمی، سرفراز واثی، محمد نسیم اعظمی، محمد اصغر بیگ، وصی اللہ بستوی، اشفاق یمنی (لاہور) اور محمد ذاکر ذاکر۔

حنیف ترین صدر بزم احباب سخن، عرعر (سعودی عربیہ)

آپ کی ڈاک

(قارئین کے خطوط)

مراسلہ نگار کی رائے سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

رام لعل کی جانب سے
"قند مکرر" کے مرتب خورشید ملک کی سرزنش

○ **انشاء** کے نومبر دسمبر ۹۴ء کے شمارے میں ایک صاحب کا مضمون میرے نام کے خطوط "قند مکرر" (مرتب خورشید ملک) کے بارے میں شائع ہوا ہے جو یونیورسٹیوں کے اساتذوں کی باہمی چشمک کا غماز ہے اور انتہائی غیر ذمہ دارانہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں عرصہ تین برس سے کینسر کے مرض میں مبتلا ہوں۔ میں نے خطوط کا پلندہ خورشید ملک صاحب کے حوالے ضرور کیا تھا لیکن انہیں یہ بھی ہدایت کردی تھی کہ ان خطوط میں جہاں جہاں ذاتی باتیں ہوں انہیں حذف کردیا جائے۔ زندہ ادیبوں کے خطوط چھاپنے میں فساد خلق کا اندیشہ ہمیشہ رہتا ہے لیکن چونکہ زیادہ تر خطوط ادبی نوعیت کے تھے اور بعض لوگوں کا بھی اصرار تھا کہ ایسے خطوط بھی ضرور شائع کئے جانے چاہئیں لیکن انہیں ایڈیٹ (Edit) کرلینے کے بعد مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ خورشید ملک صاحب نے نہ صرف یہ کہ خطوط میں سے ذاتی باتیں حذف نہیں کیں بلکہ مجھ سے حواشی بھی نہ لکھوائے۔ شاید وہ مجھے علالت کی وجہ سے پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے از خود حواشی لکھے لیکن ان حواشی کی حیثیت اظہار رائے جیسی ہوگئی جس کی وجہ سے کئی مکتوب نگاروں کے دل میں بدمزگی پیدا ہوگئی۔ ظاہر ہے اس کی ساری ذمہ داری، بہرحال مجھ ہی پر عائد ہوتی ہے جس کی وجہ سے مجھے بے حد ذہنی کوفت محسوس ہوئی ہے۔ یوں بھی انہوں نے بعض خطوط کے بارے میں اظہار رائے نہ کرکے جانبداری کا ثبوت دیا ہے۔ یہ سب بھی میرے لیے باعث پریشانی بنا ہے۔

مذکورہ مضمون میں انجمن ترقی اردو کی مرکزی کونسل کی مجلس عام میں میرے انتخاب کا بھی ذکر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے مجھے ووٹ دینے کا وعدہ کیا تھا وہ اگر سب کے سب ووٹ دے دیتے تو میں الیکشن نہیں ہارتا (دوسری مرتبہ راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، عابدہ بیگم وغیرہ کئی اہم شخصیات نے مجھے ووٹ دے کر پانچ سال کے لیے مرکزی کونسل کا ممبر بنوادیا تھا) اس سلسلے میں ڈاکٹر نارنگ نے جو کچھ پیشن گوئی کے طور پر اپنے خط میں لکھا ہے وہ غلط نہیں تھا۔ لیکن مضمون نگار صاحب کی خدمت میں یہ عرض کردوں کہ اس وقت انجمن میں نائب صدر یا صدر کے الیکشن کا کوئی موقعہ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے مضمون کے ڈانڈے صریحاً غلط طور پر انجمن کے عہدوں سے ملادیئے ہیں۔ ایک بات اور عرض کردوں کہ ڈاکٹر نارنگ کی ادبی حیثیت اتنی مستحکم اور فعال ہوچکی ہے کہ وہ کسی بھی بڑی سے بڑی قومی یا بین الاقوامی ادبی انجمن کے سربراہ بنائے جاسکتے ہیں۔ مضمون نگار صاحب کو بھی ان کی ادبی حیثیت کا احساس کرنا چاہیے۔ ایسا نہ کرنا بددیانتی ہوگی۔ میری کسی سے ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ ڈاکٹر نارنگ ہوں یا ڈاکٹر قمر رئیس۔ ان سب سے میرے دیرینہ دوستانہ تعلقات ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد بھی ہم اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے ملے ہیں۔ میں تو اس مسلک کا ہمیشہ سے قائل ہوں

کبیرا کھڑا بازار میں مانگے سب کی خیر
نہ کوئی سے دوستی نہ کوئی سے بیر

رام لعل

ooooo

○ **ایک صاحب** افسانہ نگار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ افسانہ نگاری انہیں اعلیٰ مرتبے پر نہیں پہنچا سکی۔ انھوں نے ایک سرکردہ اور ممتاز افسانہ نگار کے نام لکھے گئے مشاہیر کے خطوط اس افسانہ نگار سے لے کر چھاپ دیئے اور خود کو ان خطوط کا مرتب قرار دے کر سستی پبلسٹی حاصل کرنے کے درپے ہیں انہوں نے ایک ادبی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ میں نام نہ بھی لوں تو لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ قصہ افسانہ نگار رام لعل اور افسانہ نگار خورشید ملک کا ہے۔ خورشید ملک نے پروفیسر نارنگ کے ساتھ بدتمیزی کی ہے اور وسیم بنائی نے اپنے مضمون میں نارنگ صاحب کے سلسلے میں جو معروضات پیش کئے ہیں وہ خورشید ملک صاحب کی مرتب کردہ کتاب "قند مکرر" سے ہی حاصل کئے ہیں۔ اس لیے پروفیسر قمر رئیس اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کے درمیان جھگڑے کا اصل سبب رام لعل اور ان کے خطوط کے مرتب خورشید ملک صاحب ہی ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ اور رام لعل کو اپنی صفائی پیش کرنی چاہیے۔ نارنگ صاحب کی چپ کا مطلب کیا ہے؟ یا تو وہ رام لعل کے سپرد اشاعت کئے گئے خطوط کو کوئی اہمیت نہیں دیتے یا پھر وہ ان خطوط کو جھٹلا نہیں سکتے۔ ویسے امید یہی ہے کہ موصوف کسی نئے پراجکٹ میں منہمک ہوں گے۔ ان کے پاس اتنا وقت کہاں کہ ایسی ہلکی باتوں میں پڑیں۔ ان کا مقام بہت اونچا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میر تقی میر سے لے کر ساختیات تک تخلیق

تحقیق اور ادب کے ہر موضوع پر ان کے رشحات قلم آئندہ کئی نسلوں کے لیے مینارہ نور کا فریضہ انجام دیتے رہیں گے - البتہ رام لعل اور خورشید ملک صاحبان کی تسکین "قند مکرر" جیسی خفیف حرکتوں سے ہوسکتی ہے اور ایسی ہی خفیف الحرکتی کے مرتکب وسیم بینائی ہوئے ہیں - یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر قمر رئیس خود کچھ لکھیں اور اس معاملے میں اپنی پوزیشن صاف کریں - ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ خورشید ملک جیسے بے بضاعت ادیب اور وسیم بینائی جیسے حاشیہ بردار کو ان ہی کی شہ حاصل ہے -

احسان علی تابش (علی گڑھ)

ooooo

○ آپ کے رسالے کی اتنی تعریف سنی - ساقی فاروقی جو میرے دوست بھی ہیں اور یہاں کے غالباً سب سے اچھے شاعر ہیں ان کی زبانی بھی تعریف سنی تھی - ساقی اگر کسی کی تعریف کرے تو وہ ضرور اچھی چیز ہوگی (جہاں تک ادب کا معاملہ ہے ادب کا نہیں -) آخر "صدی شمارہ" مجھے مل گیا - انشاء کے سو ویں شمارے پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے - میں صرف نثری حصہ کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کرتا ہوں -

افسانے : اس نمبر میں تمام افسانے بڑی خوبیوں کے حامل ہیں لیکن مجھے جو افسانہ سب سے زیادہ پسند آیا وہ ہے "کالا بال اور نجات" (ترجمہ حیدر جعفری سید -) یہ بڑا دردناک افسانہ ہے اور سماج پر نشتر سے جراحی کی گئی ہے اور اتنی خوبصورت انداز سے کی گئی ہے کہ افسانہ ترجمہ نہیں طبع زاد معلوم ہوتا ہے - اس افسانے پر اس کے ہندی مصنف دیجئے کو سلام کرتا ہوں - اس کہانی پر بہت کچھ کہا جاسکتا ہے جس کا اس تبصرہ میں موقع نہیں ہے - یہ مظلوم عورت کی تاریخ ہے جو پاک ہند میں ہمیشہ دہرائی گئی ہے - لیکن اس کی خوبی یہ ہے جیسے آپ کی آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح دل میں پوری تصویر اتر گئی ہو - ہماری بے حس سوسائٹی نے کبھی توجہ ہی نہیں دی - ہمارے شعراء نے خاص طور پر ترقی پسند شعراء نے بھی بہت لکھا ہے - مگر ہمارے سیاسی راہ نمایا سرمایہ دار اپنے محلوں میں مست ہیں - باہر کی آواز ان کو نہیں سنائی دیتی - اس قسم کا ادب انگریزی اور فرانسیسی زبان میں ترجمہ کے ساتھ شائع ہونا چاہیے -

جھوٹ بولتی آنکھیں : مقصود الہی شیخ افسانہ نگار اور صحافی ہیں انگلستان میں بیٹھ کر اردو کی خدمت کر رہے ہیں - وہ بہت خوبصورت لہجے میں اچھی کہانیاں لکھتے رہے ہیں اور اب تک ان کے ۳ مجموعے بریڈ فورڈ برطانیہ سے شائع ہو چکے ہیں - باقی افسانے بھی خوب ہیں - افسانوی انداز میں

منیرالدین احمد کا جرمنی سفرنامہ بھی خوبصورت ہے اور وہاں کی تہذیب اور ماحول کی اچھی عکاسی کرتا ہے (میں جرمنی میں سال بھر کام کرتا رہا ہوں) - دلیپ کمار کی کہانی بڑی دلچسپ ہے اور اس کی زندگی میں جو موڑ آئے ہیں ان پر دکھ بھی ہوتا ہے - وہ بڑا فنکار ہے - اس کے تاثرات بڑی سادگی سے قلم بند کئے گئے ہیں - پاک و ہند کے عوام دراصل اس سے بڑی محبت کرتے ہیں اس کا ایک جرم ہے کہ وہ مسلمان ہے اور ہندو دہشت گر اس کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے - یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ہندو مسلمان سنی اور شیعہ بن کر رہ گئے ہیں - وطن سے محبت اس طرح نہیں کی جاتی ظلم جہاں بھی ہو اس پر قلم بھی اٹھتا ہے آواز بھی - فنکار اس کو کبھی برداشت نہیں کرسکتا -

مضامین : "فخرالدین عراقی" میں حیدر طباطبائی نے بہت فکر سے کام کیا ہے - طباطبائی صاحب کئی برس تک ایران میں رہے ہیں - اس دوران میں ان کی رسائی ایرانی ادب تک ہوئی - ان کے مضامین عام طور پر ایرانی دانشوروں کے متعلق ہوتے ہیں اور یہ اچھی بات ہے کہ وہ اپنے مشاہدات تجربات کی بناء پر ہم کو ایرانی ادیبوں، دانشوروں سے متعارف کراتے ہیں - کافی محنت سے کام کر رہے ہیں - ان کی کوشش قابل ستائش ہے حالانکہ اب وہ لندن کے باسی ہیں - پھر بھی وہ اس پر اپنا قلم اٹھائے ہوئے ہیں -

پروفیسر عبدالقوی ضیا - کناڈا میں بیٹھ کر اردو کی خدمت کر رہے ہیں وہ شاعر بھی ہیں، نقاد بھی ہیں، محقق بھی ہیں - انہوں نے اردو، انگریزی دونوں زبانوں میں کتابیں تحریر کی ہیں "Vision Envision" جو انگریزی میں چند سال قبل لکھی گئی تھی جس میں انہوں نے اردو کے ادباء، شعراء کو جو کناڈا میں مقیم ہیں انگریزی داں طبقہ سے متعارف کرایا ہے - "برف زار" ان کی شاعری کا مجموعہ ہے اس کے علاوہ بھی کئی کتابیں اردو اور انگریزی میں ہیں کناڈا کی ایک یونیورسٹی میں کافی دن پروفیسر رہنے کے بعد سڈبری میں مستقل قیام ہے اور اردو کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں - ان کا مضمون صدی شمارے میں "فیض کی نظم میں اشاریت" ایک قابل قدر اضافہ ہے - ضیا کا یہ مضمون ایک طرف تو فیض کے استعارات اور تیور پر نظر ڈالتا ہے - دوسری طرف اسالیب اور طرز ادائیگی پر توجہ دلاتا ہے - نئی نسل کے شعراء نے فیض سے کتنا اکتساب کیا ہے وہ سب ہی جانتے ہیں انہوں نے Poe اور ممتاز حسن کے مضمون کے حوالے سے اس کی پہچان پر روشنی ڈالی ہے -

ڈاکٹر رستوگی کا مضمون "قالب اور یگانہ" خاصا بحث طلب ہے - گزشتہ کئی برسوں سے یہ بحث جاری ہے - یگانہ کو قالب شکن کہنا غالباً صحیح نہیں - یگانہ

بذات خود شاعر کی حیثیت سے یگانہ تھے - مصنف نے خود ہی اپنے آخری پیراگراف میں یگانہ کے ساتھ انصاف کیا ہے - غالب کا زمانہ اور تھا یگانہ کا زمانہ دوسرا ہے - ہر دور کی شاعری اپنے ماحول کی محتاج ہوتی ہے - یگانہ کو بڑھانا یا گرانا ان لوگوں کا کام ہے جو یا تو خوشامد پرست تھے یا یگانہ سے کچھ بیر رکھتے تھے - یہ سلسلہ اب ختم ہو جانا چاہیے شعراء پر میں اس لئے نہیں لکھتا کہ شاعری میرا میراث میدان نہیں ہے -

عمران الارشد (لندن)

ooooo

○ انشاء کا صدی شمارہ ہوا کے لطیف جھونکے کی طرح سرشار کر گیا - کمپیوٹر کمپوزنگ ، عمدہ سرورق اور تخلیقات کا بہترین انتخاب آپ کی محنت اور لگن کا ثبوت ہیں - پروف ریڈنگ کی چند لغزشیں شمارے میں موجود ہیں مگر انھیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے - گلزار کی نظموں نے بہت متاثر کیا - خصوصاً ان کی نظم "گرمیوں کی چھٹی میں" دل کو چھو گئی -

"گفتنی" کے علاوہ "انشاء کی صدی" اور ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کے مضمون میں جن مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ واقعی بحث اور حل طلب مسائل ہیں - انشاء ایسے صحت مند ادبی رسائل کو اپنی سانسیں قائم رکھنے کے لیے صعوبتوں کے صحراؤں سے گزر جانا پڑے تو یہ بدقسمتی کی بات ہے - احمد سعید صاحب کے مضمون میں اردو پریس کے بارے میں پڑھتے وقت ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جموں و کشمیر کے اردو اخبارات کے بارے میں کہہ رہے ہیں - (ملحوظ رہے کہ اردو ریاست جموں و کشمیر کی سرکاری زبان ہے) میرے خیال میں اگر صرف اردو کے شاعر ، ادیب اور نقاد ہی یہ حلف لے لیں کہ وہ اپنی پسند کے اردو اخبارات ، رسائل اور کتب ہمیشہ خرید کر پڑھیں گے ، تب بھی اخبارات و رسائل کو کافی سہارا مل سکتا ہے - جناب یوگیندر پال طائر جموں کا نام خوب روشن کر رہے ہیں - جناب پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور جناب یوگیندر پال طائر کا کلام شائع کر کے آپ نے جموں بلکہ جموں و کشمیر کو انشاء میں نمائندگی دی ہے جو ہمارے لیے فخر کی بات ہے -

تسلیم منظر (جموں)

ooooo

○ "انشاء" کا صدی نمبر ایسے وقت وارد ہوا جب راقم دو ہفتوں کے لیے ہسپتال میں مہمان بنایا گیا تھا - یہ ڈاکٹروں اور نرسوں کی تیمارداری کے ساتھ ساتھ اس ہمدرد جریدہ کی مسیحائی کا کرشمہ سمجھتا ہوں کہ میں آپ کی دعا سے صحت یاب ہو کر گھر میں پرہیزی کھانے اور دوائیں کھا کر قلم و قرطاس کے رشتوں کو بحال کرنے کی سعی کر رہا ہوں - انشاء کے خاص نمبروں کی ترتیب و تدوین میں آپ کی پیشہ ورانہ مہارت اور کامیاب ادارت کے بارے میں جن جن احباب نے جس جس انداز سے آپ کے حق میں لکھا ، خیر کہا ہے میں ان تمام ہدیہ ، تحسین کی تائید مزید کرتا ہوں تاہم میری ذاتی رائے کامیاب اور موثر جرائد کے بارے میں یہ ہے کہ وہ طے شدہ وقفوں اور وقت معینہ پر باقاعدگی سے اپنے قارئین کے ہاتھوں میں ہونے چاہئیں کیونکہ یہی باہمی اعتماد اور رشتوں کی مضبوط استواری کی بنیاد ہو سکتی ہے -

میری دعائیں مستجاب ہوں تو آپ کا ماہوار شمارہ اس خاص شمارے کی ضخامت کا نکلنا چاہیے یا کم از کم نصف صفحات (یعنی ۱۰۰) پر مشتمل - بدقسمتی سے بھارت میں اردو کے اضمحلال یا زوال کی باتوں کا ایک سلسلہ چل نکلا ہے اور اس کی نوحہ خوانی میں شریک ہونا شاید سعادت سمجھ لیا گیا ہے جو بجائے خود کوئی مثبت نتائج دینے والا عمل نہیں - ہاں اردو کے روزی روٹی کے ذرائع سے الگ تھلگ ہو جانے اور سرکاری درس گاہوں میں منضبط اور کسی منصوبہ بندی کے بغیر تدریس کی نمائش کے مقابلے میں نئی نسل میں اس ترویج کا متبادل انتظام نہ ہونا تشویش ناک ضرور ہے جس کے لیے محض علاقائی اور غیر مربوط کارروائیاں شاید زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوں بلکہ پورے ملک میں قومی سطح پر اردو سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں کا رابطہ اور تہذیبی دائرہ سے نکل کر سیاسی میدان میں متفقہ قراردادوں کی شکل میں ارباب اختیار کو جھنجھوڑنے اور بھارت کے معلوم کلچر کے اس زندہ جاوید حصے کو نہ صرف باقی رکھنے بلکہ زیادہ توانا اور موثر بنانے کی ضرورت کو اجاگر کرنے کی جد و جہد ضروری ہے - میں سمجھتا ہوں کہ "انشاء" پہلے ہی اس راہ پر چل نکلا ہے

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ !

مجھ سے زیادہ آپ اور انشاء کے قارئین جانتے ہیں کہ اردو اپنے جنم دن سے لے کر آج تک دیہات اور گاؤں میں بسنے والے عام لوگوں کی بولی ٹھولی سے پنپ کر تہذیب کے معروف مراکز میں آکر بازار دربار اور بڑے تھوڑے عرصے کے لیے سرکار کی چھترچھاؤں میں رہی ہے - آج بھی یہ کروڑوں عوام کی زبان ہے اسے جو نام بھی دیا جائے ہمالے سے لے کر اوو بئی تک پورے یورپ ، امریکہ ، کینیڈا ، برطانیہ اور روس تک جہاں جہاں بھی برصغیر میں آباد لوگوں کے آباء کی جڑیں رہی ہیں اردو کو بولنے اور سمجھنے والے موجود رہیں گے اردو ایک زندہ زبان ہے کسی بھی صنف ادب میں اس کے تخلیق کار کسی دوسری ترقی یافتہ زبان سے فروتر اور غیر معیاری تصانیف پیش نہیں کرتے

ہیں - ضرورت صرف اپنے وسائل پر قابو پانے اپنی صلاحتیں اور وسائل اکٹھے کرنے اور ذرا محنت اور فنکاری سے اپنے اپنے دائرہ عمل میں تخلیقی کام جاری رکھنے کی ہے - جرائد اپنی جگہ تربیتی ادارے ہوتے ہیں ان کے معیار میں پختگی اور اشاعت میں باقاعدگی ہو تو نہ صرف مستقل خریداروں اور قلمی معاونین میں ایک طرح کی وفاداری اور وابستگی کا احساس رہتا ہے بلکہ تجارتی حلقوں میں بھی ان کے دائرہ اثر اور تشہیر کے نتائج ثبت ہونے کا یقین ہوجاتا ہے کیونکہ پرچے کی Circulation مسلسہ سمجھی جاسکتی ہے نہ جانے میں کیوں آپ کی سمع خراشی کئے جارہا ہوں معاف فرمائیے گا !

حالیہ صدی نمبر کے مندرجات نہایت متوازن ہیں اور نہایت سلیقے سے ترتیب دیے گئے ہیں مولانا احمد سعید ملیح آبادی کا مضمون اردو صحافت کے مسائل کی بہترین تصویر پیش کرتا ہے ۔ انشائیے ، افسانے ، منظومات اور غزلیات اپنے اپنے رنگ میں خوب ہیں - سید منیر نیازی کا کلیم الدین شمس سے انٹرویو اور رئیس الدین فریدی کا مضمون حقائق شناسی کے لیے اور پروفیسر عبدالقوی ضیا کا فیض کی نظم میں اشاریت پر مضمون پسند آئے - ڈاکٹر تاراچرن رستوگی کا غالب اور یاس یگانہ پر مضمون بھی دلچسپ ہے لیکن اسے محض لکھنو شہر میں چھیڑ خوباں کا سامان سمجھنا بھی محل نظر ہے کیونکہ یگانہ کے ہاں محض معاصرانہ چپقلش سے زیادہ کچھ انا پروری اور غالب شکنی کا عنصر نمایاں رہا ہے -

خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا !

ادبی جرائد میں اس طرح کی باز خوانی عصری رویوں میں سمت نما ثابت ہو سکتی ہے اور چشم بینا کے لیے سیکھنے کا بہت سامان مہیا ہو سکتا ہے - خطوط ، اخبار اور تبصروں کے حصے کو یا تو تھوڑا سا مزید وسیع بنانے کی کوشش ہونی چاہیے یا اس کی جگہ ایک یا دو تنقیدی مضامین کی گنجائش نکالنی چاہیے -

انشاء کا "اسکنڈے نیوائی ادب" کا خاص نمبر بھی اردو میں دوسری زبانوں کے تراجم کے ذخیرے میں اضافے کا موجب ہو گا بلکہ یورپ میں اردو کی پذیرائی اور فروغ کا سبب بنے گا - راوی کے ذریعے آپ کے ارادوں کی خبر ملتی رہتی ہے مقصود الہیٰ شیخ صاحب تن تنہا برطانیہ ، یورپ اور مجموعی طور پر بیرون ملک اردو کی بقا اور اس کے نئی نسل میں نفوذ کے لیے بہ ہمہ وجوہ مصروف جہاد ہیں کیونکہ ہمارے یہاں اردو باہمی رابطوں اور تہذیبی و دینی تصانیف کے خزینوں تک رسائی کا واحد ذریعہ ہے بلکہ بذات خود ایک کلچر اور سماج ہے جو برصغیر سے آکر یہاں آباد ہونے والے تارکین وطن کو ایک مضبوط رشتے اور احساس یگانگت دے سکتا ہے بشرطیکہ ماضی بعید کے تعصبات سے نجات اور درگزر کی راہیں تلاش کرلی جائیں ورنہ مستقبل کے سبق آموز ہونے میں مجھے کوئی شبہ نہیں -

"انشاء" کے قلمی معاونین کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے ہی ایک تابناک مستقبل میں کوئی شبہ نہیں رہتا - رفیقان ادارہ اور سرپرستوں میں بھی ماشاء اللہ یگانہ ، روزگار مشاہیر نظر آتے ہیں اور سب سے بڑھ کر آپ جس لگن اور محنت سے یکسو ہو کر اس جریدہ کو بنانے سنوارنے اور ترقی دینے میں مصروف ہیں کامیابی کی بہترین بنیاد فراہم کرتے ہیں - ہم غریب الدیار لوگ آپ کی کامیابیوں اور کامرانیوں کے لیے دعاگو رہتے ہیں کیونکہ ہمارے لیے اردو کے جرائد برصغیر میں جاری ادبی سرگرمیوں اور ہمارے معاصرین کے تخلیقی سفر کی منزلوں کے نشان لاتے ہیں -

اختر ضیائی (لندن)

آہ ! اظہر عباس گزر گئے

پاکستان مزدور محاذ کے بانی اور ماہنامہ "منشور" کراچی کے منیجنگ ایڈیٹر جناب اظہر عباس ۳ مئی ۱۹۹۵ء کو اس جہان فانی سے گزر گئے - ان للہ وان الیہ راجعون۔

ماہنامہ انشاء کی جانب سے مرحوم کے پسماندگان اور اراکین "منشور" سے ہم اپنے غم کا اظہار کرتے ہیں -

مرحوم کا نام ترقی پسند مزدور تحریک ، سیاست ، صحافت اور ثقافت میں زندہ رہے گا -

ف - س - اعجاز

گھڑی تجارت کے سلسلے کی اولین کڑی :

کلکتہ کے رادھا بازار کی معروف ترین دکان

ایس-ایچ-ممتاز الدین

بیسویں صدی کا دوسرا شاندار دہا
--- محلوں کا شہر اس سے اچھا کبھی نہیں تھا
برطانیہ عظمیٰ نے دنیا کی پہلی جنگ عظیم
جیتی اور ایسا لگتا تھا کہ اب اس کا سورج کبھی
نہیں ڈوبے گا۔ اگرچہ راجدھانی بھی تبدیل
کر دی گئی تھی لیکن تجارتیں کلکتہ میں بہت
کامیابی سے چلنے لگی تھیں۔

۱۹۲۲ء میں ایک دن شمس الحق
نے رادھا بازار میں چشمہ سازی کا کارخانہ
لگایا۔ وہ مشہور کمپنیوں کی ہاتھ گھڑیوں،
دیوار گھڑیوں، گھڑی کے پرزوں اور اوزار
کے براہ راست درآمد کنندہ تھے۔ اس عظیم
کام کو کرنے کے لیے ان کے تین بیٹوں نے
ان کی ہمت افزائی کی۔ پہلا شمس
العارفین (جس نے کچھ عرصہ بعد کلکتہ چھوڑ
دیا تھا) دوسرا ممتاز الدین اور تیسرا
محمد سعید۔ انہوں نے اپنا
کاروبار بھی شمس الحق اور
ممتاز الدین کے نام پر ایس۔ ایچ۔
ممتاز الدین رکھا۔ انہوں نے دہلی میں
بھی ایک دکان کھولی جو ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۵ء
کے درمیان بہت اچھی چلی۔ پورے
مشرقی ہندوستان میں ایس۔ ایچ۔
ممتاز الدین ہی ایک ایسی دکان
ہے جو اپنے ۷۳ ویں سال میں
گھڑیوں کی سب سے بڑی تاجر
ثابت ہوئی۔ ۱۹۵۰ء میں اس کمپنی نے
چشمہ سازی کا کام بند کر دیا۔ اس کے شوروم
میں ہندوستان کی تمام بڑی اور مشہور
کمپنیوں کی گھڑیاں فروخت ہوئیں۔

ہر ایک گھڑی کو بیچنے میں احتیاط اور
بعد فروخت سروس دکان کی نیک نامی کے لیے
بڑی فائدہ مند ثابت ہوئی۔ یہ بہت حد تک
اس کی قائم کردہ روایت کی وجہ سے ہے۔
شمس الحق اور ممتاز الدین نے اس کاروبار کی
دیکھ بھال کی۔ ۱۹۶۶ء سے معراج الدین کے
بیٹے فیروز الدین جو دکان کے پارٹنر بھی ہیں
نے دکان کی باگ ڈور سنبھالی۔ فیروز
الدین صاحب کی رہنمائی میں
روزگار کو کافی تقویت حاصل
ہوئی۔ اب ان کے چھوٹے بھائی ان
کے سرگرم معاون ہیں۔

۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء کے درمیان جب
کوارٹز گھڑیاں پہلی بار ہندوستان کے بازار
میں لائی گئیں تو شدید تغیر رونما ہوا۔ منظر عام
پر سب سے پہلے ایچ۔ ایم۔ ٹی گھڑیاں پھر آلون
(Allwyn) گھڑیاں اور پھر ٹائٹن گھڑیاں
آئیں۔ ایس۔ ایچ۔ ممتاز الدین نے شروع

ایس۔ایچ۔ممتاز الدین کی ایک تاریخی تصویر
(دائیں سے) کھڑے ہوئے: محمد جمیل۔ محمد سعید
کرسیوں پر بیٹھے ہوئے: ممتاز الدین شمس الحق
(ممتاز الدین صاحب کے والد) محمد یوسف۔
سامنے بیٹھے ہوئے: سوئز گھڑی کمپنی کا
نمائندہ
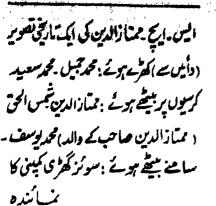
سے ہی کوارٹز گھڑیاں کو فروغ دیا اور مختلف کمپنیوں کی مصنوعات کو دکان میں جگہ دی۔ لگ بھگ پچھلے دس سالوں سے یہ دکان (Sakura) کی کوارٹز گھڑیوں کی تجارت کررہی ہے۔ فیروز الدین صاحب نے ہندوستان اور دنیا کے گھڑی کے منظر نامے کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔

آج بھی ہندوستان میں میکانیکی گھڑیوں کی ایک بڑی مانگ پائی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ گھڑیاں میٹرو شہروں سے باہر فروخت کی جاتی ہیں۔ زیادہ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ میکانیکی گھڑیاں جو کہ مہنگے بازار کا سامان ہیں یورپ میں دوبارہ ان کی آمد ہورہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میکانیکی گھڑیاں بہت پائیدار ہوتی ہیں۔ اور اچھی چلتی ہیں چنانچہ گھڑی جتنی قیمتی ہوگی اتنا ہی امکان ہوگا کہ وہ میکانیکی ہوگی کوارٹز نہیں۔

کیا عملی سرگرمیاں بڑھانے کے لیے اس سے اچھا کوئی وقت ہوگا یقیناً نہیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ ایس۔ایچ۔ممتاز الدین کے ۳۰ سالہ وجود کے بعد ایس۔ ایچ ممتاز الدین نے ۲۹ جنوری ۱۹۹۵ کو نئی دکان " ٹائم آرٹ ایچ۔ ایم۔ ٹی " کھول دی ہے۔ یہ دوکان ڈائمنڈ ہاربر روڈ، نابینا اسکول کے قریب بیہالہ میں ہے۔ کلکتہ میں یہ "ٹائم آرٹ ایچ۔ایم۔ٹی" کی تیسری دکان ہے پہلی گلک اسٹریٹ اور دوسری مہاتما گاندھی روڈ پر ہے۔ باصلاحیت اور قابل تعریف نابینا طالب علموں کو بریلے (Braille) گھڑیاں بانٹنے سے اس دوکان کی شروعات ہوئی۔ فیروز الدین صاحب نے کہا ہے کہ یہ ایک بڑے سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ موجودہ منصوبہ ۱۹۹۵ میں تین شوروم کھولنے کا ہے۔

فیروز الدین صاحب کی رائے یہ ہے کہ گھڑی بازار زبردست تجارتی افزائش کے لیے آمادہ و تیار ہے۔ یہ نظریہ اس لئے معقول سمجھا جاتا ہے کہ پچھلے ایک دو سال میں کھپت کافی بڑھ گئی ہے۔ بہت سی نئی کمپنیوں کی گھڑیاں بازار میں آرہی ہیں۔ اور خریدنے والے اپنی پسند کی چیز کا بہتر انتخاب کرسکیں گے۔ البتہ اس وقت فیروز الدین صاحب کی پیشنگوئی ہے کہ آنے والا سال گھڑی کی صنعتوں کے لیے بحرانی سال ثابت ہوگا۔ اب بھی یہاں درآمد شدہ سستی گھڑیوں کی خرید و فروخت چور بازاروں میں دن بدن بڑھتی ہی جارہی ہے۔ ان بازاروں کو بند کرنا چاہیے۔ کیونکہ مشہور کمپنیوں کی بیش قیمت اچھی گھڑیوں کے بجائے لوگ درآمد شدہ سستی گھڑیاں خرید لیتے ہیں۔

فیروز الدین صاحب نے یہ پوچھنے پر کہ اس کام کو پہلے کیوں نہیں پھیلایا گیا؟ جواب دیا کہ اب سے پہلے حالات موافق نہیں تھے۔ اب ہر کمپنی کے پاس پیش کرنے کے لیے مختلف گھڑیوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ اس لیے اب یہ منصوبہ قابل عمل ہے۔

وقت بدلتا ہے، پسند بدلتی ہے لیکن بھروسہ مند انتظام کبھی نہیں بدلتا۔ جو ایس۔ ایچ ممتاز الدین کی کامیابی کا راز ہے۔ یہ فیروز الدین صاحب کے عزم و حوصلے کی وجہ ہے کہ آج " ایس۔ ایچ۔ ممتاز الدین " کے جتنی فروخت پورے ہندوستان کی کسی بھی واحد دکان سے نہیں ہوتی۔ اب کلکتہ شہر میں ایک سے زیادہ دکانیں کھول لینے کے ایک سال بعد کیا نظارہ ہوگا یہ صرف وقت ہی بتاسکتا ہے۔ لیکن یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ رد عمل مثبت ہوگا۔ چونکہ ۷۰ سالہ کاروباری زندگی کا نچوڑا ہوا اعتماد اس قیاس کے پیچھے موجود ہے۔

(اثر: الطاف)

کولمبس شمارہ

اسکنڈے نیویائی ادب

افسانے مضامین شاعری

اسکنڈے نیویا

سب سے زیادہ فروخت ہونے والا
اے. آر. چاند تارا مارکہ گل

مشرقی ہندوستان کا بہترین اور واحد بین الاقوامی اردو رسالہ

ماہنامہ انشاء کلکتہ

جلد: ۱۰ | ستمبر/اکتوبر ۱۹۹۵ء | شمارہ: ۹-۱۰

مدیر: ف۔س۔ اعجاز

فہرست

فی شمارہ : ۸ روپے
زرسالانہ : ۹۰ روپے
مغربی ممالک : ۱۲ پونڈ یا ۲۰ امریکی ڈالر

رقومات بذریعہ منی آرڈر، بینک ڈرافٹ، چیک صرف "انشاء پبلی کیشنز" کے نام میں روانہ فرمائیں ورنہ قابل قبول نہ ہوں گی۔ برطانیہ سے BPO کے ذریعہ رقومات بھیجی جائیں۔

ماہنامہ انشاء انشاء پبلی کیشنز
خط وکتابت، مضامین بھیجنے اور ترسیل زر کا پتہ :
۲۵-بی زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳، فون: ۲۴۱۶-۲۳۵

تنوّع
کچھ اور نہیں بلکہ
ہماری یکجہتی کا خوش گوار اظہار ہے۔

ہندوستانی تہذیب و ثقافت میں ایرانی اشتراک و تعاون

حیدر طباطبائی
(لندن)

سرزمین ہند پر مسلمانوں کی آمد سے پہلے کوئی کلچر، آرٹ یا زندگی کا کوئی روپ نہیں تھا۔ مسلمانوں نے اس دھرتی کو اپنا لیا اور یہاں آبیاری کی اس ملک کو ایک حسین لالہ زار میں مبدل کر دیا اور اس محنت و لگن سے دنیا بھر میں ہندوستان کو سونے کی چڑیا کہا جانے لگا۔ قدیم ہند کے باسیوں کو کبھی واقعہ نگاری سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ یہاں کی قدیم تاریخ دیو مالائی قصوں کہانیوں اور اسی قسم کی ناقابل قیاس خرافاتوں سے بھری ہوئی ہے۔ پانچویں صدی قبل از مسیح کے اوائل میں حق منشی خاندان کے شاہ دار یوش اول نے شیراز سے چل کر گندھارا، کشمیر اور بلوچستان کے بعض حصوں پر قبضہ کر لیا۔ کم و بیش دو صدیوں تک اس علاقہ پر اس خاندان کا تسلط رہا۔ تا آنکہ سکندر مقدونوی نے دار یوش سوم کو شکست دے کر اس سلطنت کا خاتمہ کیا۔ ایرانی جہاں گردوں کی کتابوں، یونانی مورخین اور چینی سیاحوں کی تحریروں سے اس عہد کے ہندوستان کی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔ سب سے پہلے ایرانیوں نے ہندوستان کی باقاعدہ تاریخ نگاری کا آغاز کیا۔ ایرانی فاتحین و ایرانی افواج اور پھر ایران کے ہنرمندوں نے ہندوستان سے اپنی سرزمین جیسا پیار کیا۔ آتے ہی یہاں کے باسیوں کی روزمرہ کی زندگی، عادات و خصائل، رسوم و شعار، آداب محفل، لباس کی تراش خراش، فن تعمیر، مصوری، ادبیات و موسیقی پر بھی گہرے اثرات ثبت کئے اور انہیں اس لطافت اور نزاکت و قرینے اور سلیقے، رعنائی، احساس اور فراخی، مشرب سے روشناس کرایا جو ایرانی تمدن سے خاص رہی ہے۔ اس بات کی ایک چھوٹی سی مثال دے دوں کہ ابوالفضل "آئین اکبری" میں لکھتا ہے کہ "اس سے قبل ہند کے لوگ بغیر کسی ترتیب و تناسب کے باغات لگاتے تھے۔ بابر کی آمد کے بعد باغات کو باسلیقہ اور خوبصورت انداز میں لگانے کا رواج ہوا"۔ قدیم پہلوی زبان کا ایک لفظ ہے، "پیرادوز" جس کو انگریزی والوں نے " PARADISE " تلفظ کر کے اختیار کر لیا۔ فارسی میں فردوس اور عربی میں جنت کہتے ہیں لیکن ایران میں پیرادوز اس آراستہ باغ کو کہا جاتا تھا، جس میں درخت ہائے میوہ کے علاوہ پھولوں کے درخت بھی ہوں اور نہریں و فوارے بھی رواں ہوں۔ شاہان تیموریہ اور صفویہ نے ہند سہ کے اصولوں پر باغات لگوائے۔ دلکشا (سمرقند) رشک بہشت (شیراز) باغ بہشت (شیراز) باغ ہزار جریب۔ چہار باغ۔ باغ چہل ستون (اصفہان) باغ صبا۔ باغ شاہ اور باغ فدک (تہران)۔ یہ قدیم باغات اپنی خوبصورتی اور قطعہ بندی کے لئے مشہور ہیں۔ شہنشاہ بابر کو باغ لگوانے کا شوق تھا۔ اس نے کابل میں باغ وفا۔ آگرہ میں باغ صفا۔ چہار باغ اور زہرہ باغ، دھولپور میں باغ نیلوفر جمنا کے کنارے اور روبرو باغ زر فشاں لگوائے۔ شمشاد، چنار اور دوسرے اعلیٰ درخت جیسے سرو۔ شاہ بلوط وغیرہ کی قلمیں خاص طور سے کابل و ایران سے منگوا کر یہاں لگوائیں۔ دیار ہند کو مزین کیا۔ دیگر سلاطین مغلیہ نے بھی جا بجا خوبصورت باغات لگوائے۔ کشمیری نشاط باغ۔ نسیم باغ۔ شالامار باغ جو لاہور میں بھی بڑی آب و تاب سے اب تک مغل سلاطین کے حسن سلیقہ کی داستان سنا رہا ہے۔ آگرہ میں تاج محل کے احاطے میں جس قدر نفیس باغ موجود ہے اس کی مثال دنیا کی کسی ساختمان میں نہیں ملتی۔ تاج کے رنگ کے مقابلے میں قرمز۔ صورتی۔ دھانی۔ ارغوانی اور زعفرانی پھولوں کی کیاریاں اور پھر عجیب حیرت انگیز انداز سے فواروں سے بلند امواج کا بلند ہونا۔ شفاف پانی کی نکاسی بغیر بجلی کے موٹر کے، دیکھنے والا مبہوت ہو اٹھتا ہے۔ یہ ایرانی آرٹ کے ناقابل فراموش نمونے ہیں۔ ایرانی سلاطین و اہل ذوق ہندوستان میں زرد آلو۔ آلو بخارہ۔ آڑو۔ خربوزہ۔ خوبانی۔ بادام۔ پستہ

چلغوزہ ۔ انگور اور انار ایسے نایاب پھل لائے جو اس سے قبل یہاں نہیں تھے ۔ فندق اب بھی یہاں نہیں ملتا ۔ انجیر اور خربوزہ بھی مسلمان اپنے ساتھ ہندوستان لائے ۔ پھر پھولوں میں ارغوان ۔ یاسمن ۔ نرگس ۔ لالہ ۔ نسترن ۔ نسترن ۔ یاسمین ۔ یاس ۔ کیوڑہ ۔ تاج خروس ۔ ریحان ۔ روزی ۔ [illegible] ۔ [illegible] ۔ نافرمان ۔ خطمی ۔ بنفشہ ۔ شب بو ۔ مریم ۔ مہندی ۔ آرکیدہ ۔ لادن ۔ یخ ۔ سپیدہ ۔ شبنم ۔ اطلس ۔ گل روحی ۔ گل یخ ۔ گل حنا ۔ گل عباس وغیرہ اور گلابوں کی نئی نئی قسمیں لاکر باغات کے حسن میں اضافہ کیا ۔ جیسا کہ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ "یہاں کے باغات جنگل کے مماثل خود رو درختوں کی مانند جھنڈ کے جھنڈ لگے رہتے تھے ۔ کسی طرح کی ترتیب و تناسب کا خیال نہیں ہوتا تھا" ۔ قدیم ہند کے باسیوں کے معبد اور محلات بھی تنگ و تاریک تھے ۔ جن میں بمشکل ہوا کا گزر ہوتا تھا ۔ ترک و مغل بادشاہوں نے سنگ مرمر و سنگ سرخ کی عالی شان دیو قامت اور کشادہ عمارتیں تعمیر کروائیں ۔ مینا کاری اور دلکش مرمریں جالیوں سے ان کے حسن میں چار چاند لگا دیئے ۔ قصر ہزار ستون ۔ بلند دروازہ ۔ علائی دروازہ ۔ تاج محل ۔ لال قلعہ (دہلی و آگرہ) ۔ گول گنبد ۔ قطب مینار ۔ بھول بھلیاں ۔ آصف الدولہ کا امام باڑہ لکھنو ۔ رومی گیٹ لکھنو ۔ چھتر منزل اور لکھنو کی جامع مسجد ۔ مقبرہ شیخ سلیم چشتی ۔ مقبرہ ہمایوں ۔ اعتماد الدولہ و سکندرہ ۔ مقبرہ جہانگیر ۔ شیش محل ۔ چار مینار ۔ دہلی و لاہور کی جامع مسجد (جو لاہور میں شاہی مسجد کے نام سے مشہور ہوئی) یہ وہ نایاب نمونے ہیں جو دنیا کے دوسرے ممالک میں عنقا ہیں ۔ یہ سب مسلمان فاتحین کی عظمت کی داستان بیان کر رہے ہیں ۔ ایک اطالوی مورخ کے بقول "ہندوستان میں عمارتوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ان کو دیووں کی طرح تعمیر کیا گیا ہو اور سناروں نے دولہنوں کے زیوارات کی طرح تزئین کی ہو" ۔ ان تمام عمارتوں میں ایرانی طرز تعمیر کے بے مثال نمونے موجود ہیں ۔ فقط تاج محل کا سفید سنگ مرمر ایران سے درآمد کیا گیا تھا ۔ تاج محل کے چیف انجنئر اور تمام نقشہ نویس و بنیاد گر وغیرہ سب ایرانی تھے ۔ اس زمانہ میں جب بجلی کا وجود نہیں تھا ، پھر بھی تاج محل کے فواروں کا نظام ، پانی کی ترسیل اور ان کے پانی کی بلند و بالا دھاریں جو آج تک اسی انداز سے جاری ہیں ، ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے ۔

یہی بات ہم مصوری کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں ۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت ہندی تمدن زوال پذیر تھا بلکہ آرٹس کی دنیا کو دی تھی ۔ البیرونی نے اپنی کتاب الہند میں اس تنزل کا تفصیل سے ذکر کیا ہے ۔ دوسرے علوم و فنون کی طرح مصوری بھی رسمی و رواجی اسالیب کی گرفت میں تھی ، جب کہ تبریز ۔ کاشان ۔ گیلان اور ہرات میں فن ا مصوری بام کمال کو پہنچ چکا تھا ۔ استاد کمال الدین بہزاد شہنشاہ بابر کا ہم عصر تھا ، بابر نے اپنے عم زاد سلطان حسین ۔ بالقیرا کے دربار میں اس کے شاہکار دیکھے تھے ۔ بابر اس کی بنائی ہوئی چند تصاویر بھی ہندوستان لایا تھا ۔ جس سے مغل مصوری کی بنیاد پڑی ۔ جب سیاسی ہرج مرج ختم ہوا ، اور دہلی میں مغل دربار آراستہ ہوا تو ایران سے جو مصور یہاں آئے ان میں بہزاد کا شاگرد عبدالصمد شیرازی ۔ میر سید علی تبریزی ۔ مشکین ۔ فرخ ۔ نادرالعصر ۔ استاد منصور ابوالحسن ۔ میر ہاشم ۔ محمد نادر سمرقندی اور فقیر اللہ ۔ بڑے پائے کے استاد تھے ۔ یہ لوگ دہلی و آگرہ میں مقیم ہوئے ۔ چنانچہ یہاں آباد ہندو مصوروں وسونت اور بساون نے ان ایرانی مصوروں سے کسب فیض کیا اور ان کی خط کشی و رنگ آمیزی کے اسالیب اختیار کئے اپنے زرد ، بسنتی اور کالے رنگوں کو ترک کر دیا اب ان کی جگہ ہلکے رنگوں کی بنیاد پڑی ۔ فیروزی ۔ اکرئی ۔ طوسی ۔ بنفشی ۔ قرمیز ۔ عنابی ۔ کاسنی اور سرمئی وغیرہ اس سے پہلے یہ رنگ یہاں کسی نے دیکھے تک نہیں تھے ۔

اس مختصر ذکر سے وہ تناظر قائم کرنے کی کوشش کی ہے جس کے بغیر کلاسکی موسیقی میں مسلمانان ہند کی دین یا خدمات کو کما حقہ سمجھا نہیں جا سکتا ہے ۔ تفصیل میں جانے سے قبل یہ کتنا مناسب ہو گا کہ مسلمانوں کے لائے ہوئے ایرانی تمدن نے جس تناسب و توافق ، تزئین اور زیبائی ، کشادگی اور فراخی کو رواج دیا اس سے سب سے پہلا تاثر تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس پیاری دھرتی کو اپنا وطن بنا لیا تھا ۔ زمین خدا کی ہوتی ہے جس پر خلق خدا کو

رہنے کا پورا حق ہے۔ مسلمانوں نے یہاں آکر ہندوؤں کے درختوں کے جھنڈ خوبصورت اور خوش قطع باغات میں مبدل کر دئے۔ ان کے تنگ و تاریک بھونوں کو روشن و کشادہ محلوں میں تبدیل کر دیا۔ موسیقی کی سحر آفرینی اور اثر انگیزی عبادت گاہوں سے لے کر حکومت کے ایوانوں تک برابر کار فرما رہی ہے۔ جہاں اہل تصوف نے اسے تزکیہ، نفس اور نشاط روح کا ذریعہ بنایا وہاں امراء و سلاطین نے اس سے تفریح طبع و لذت گوش کا کام لیا۔ عرب ہو یا عجم، مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ موسیقاروں اور ان کے سرپرستوں نے اس سے گہرا شغف رکھا اور قرن ہا قرن سے اس کو حیات تازہ بخشتے چلے آئے۔ مسلمانوں نے ہر زمانے میں جہاں دنیا کے ذخیرہ، علوم میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ وہاں فنون مفیدہ و فنون لطیفہ کے ساتھ ہمیشہ انصاف کیا ہے۔ ہند کی تو تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان سلاطین، امراء اور صوفیائے کرام فنون کی تخلیق اور ترقی کے علاوہ اہل فن کی سرپرستی اور قدردانی بھی کرتے رہے۔ اس پیش رفت کا نقطہ، عروج آخری تاجدار اودھ نواب واجد علی شاہ کے عہد میں قابل ملاحظہ ہے۔ ان کی حکومت کے زوال کے بعد سے آج تک اس پائے کے فنکار و فنون تخلیق نہ ہو پائے، یہ وہ نکات ہیں جن کی طرف سے تجاہل عارفانہ برتا جاتا ہے۔ سرزمین ہند پر خاص کر ایرانی تمدن نے اپنا فن معماری۔ سنگ تراشی۔ خوش نویسی و کارہائے دستی۔ علوم نظامی۔ تفنگ و توپ سازی۔ شمشیر کی تراش و خراش کے پہلو بہ پہلو مصوری، شاعری اور موسیقی کی ترویج میں نمایاں حصہ لیا ہے جس کی گواہی صفحات تاریخ پر آج بھی ثبت ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ قدیم ہند کے باسی کپڑے پہننا اور کھانا کھانے کے سلیقے سے بھی محتاج تھے۔ گرمیوں میں بدن بھر پر صرف ایک لنگوٹی برہنہ پا یا ایک کھڑاؤں۔ جاڑوں میں ایک دو شالہ۔ کھانا پتوں پر رکھ کر تناول کرتے تھے۔ ایرانیوں نے جب آداب زندگی سکھائے تو آرٹس کی دولت سے بھی مالا مال کیا۔ سنگیت میں بھی خوش آئند اور دوررس تبدیلیاں کیں۔ چنانچہ تاج محل۔ نشاط باغ اور شالامار باغ کی طرح "خیال" کی گائیکی بھی مسلمانوں کی تہذیبی دین کا گراں بہا حصہ ہے۔ جس سے انکار کرنا اتنا ہی خندہ آور ہے جتنا کہ تاج محل اور قطب مینار کو کسی گمنام ہندو راجہ سے منسوب کرنا۔ سب سے پہلے عرب مسلمانوں نے اس فن لطیف کی طرف گوشہ، چشم التفات مبذول کیا۔ ابو الفرج پہلا تذکرہ نویس ہے جس نے موسیقی کا ذکر کیا اور اس کے لطائف جمع کئے۔ اس کی کتاب "اغانی" فن موسیقی میں مشہور دستاویز ہے۔ اس نے بہت سے عرب موسیقاروں کا حال لکھا ہے۔ جن میں ابراہیم موصلی۔ اسحاق موصلی۔ اسمٰعیل بن جامع۔ مالک مغنیہ۔ مخارق۔ محمد الرف۔ حسنین بلوخ۔ عمر امیرانی۔ حماد بن اسحاق۔ عیسیٰ بن رشید اور مطربہ عریب شامل تھے۔ بنی امیہ اور بنی عباس کے دور اقتدار میں موسیقی کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ فنکاروں کو بڑے بڑے انعامات اور جاگیروں سے نوازا جاتا تھا۔ چونکہ شاعری عرب ثقافت کی شناخت ہے اور شاعری میں موسیقی کے اوزان سے گہرا تعلق ہے، اس لئے معروف عروضی خلیل بن احمد بصری نے فن عروض کی ترتیب و تدوین کے بعد آواز اور تال کی شرح میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی جس میں الایقاعات اور الحاد یعنی تالیوں اور ماتروں سے مفصل بحث کی ہے۔

سرزمین ایران میں موسیقی نے عرب سے بھی زیادہ ترقی کی، کیونکہ وہاں سیاسی رسہ کشی کم تھی اس لئے فنون لطیفہ بزودی پروان چڑھے۔ فردوسی نے جابجا موسیقی کے آلات و اصطلاحات کا ذکر کیا ہے۔ اصل میں قدیم زبان میں موسیقی کو رامشگری کہا جاتا تھا۔ کیونکہ موسیقی یونانی لفظ ہے۔ جس میں انگریزی میں MUSIKE یا MUSES منسوب ہوا۔ فردوسی فرماتے ہیں ؎

سرائندہ این غزل ساز کرد
دف و چنگ و نے را ہم آواز کرد

اور شعر میں فردوسی نے آلات موسیقی کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

جہاں پالست برساخت زود
برآورد ماز ندرانی سرود

شاہان ایران میں بہرام گور اور خسرو پرویز گانے بجانے کے بڑے شیدائی تھے۔ انہوں نے اس فن کی سرپرستی کی، ان کے عہد میں نوائے باربد ضرب المثل بن چکی تھی۔ باربد کا نظام موسیقی سات خسروانیات یعنی شاہی طرزیں مانا جاتا ہے۔ مسعودی نے مروج الذہب میں انہیں "الطرق
[illegible]

الملوکیہ" کہا ہے۔ (یعنی شاہ کے حکم کے بموجب بنائی گئی طرزیں) ۔ یہ تیس لحن اور تین سو ساٹھ راگنیوں پر مشتمل تھا۔ لغات برہان قاطع کی جلدوں میں وہ تیس لحن مذکور ہیں۔ جو بار بد نے خسرو پرویز کی دل جوئی کے لئے اختراع کئے تھے۔ نظامی گنجوی نے اپنی مشہور مثنوی "خسرو و شیریں" میں ان کا ذکر کیا ہے۔ قدیم ایرانی موسیقی کا احیا بھی دور بنی عباس میں ہوا۔ اسی لئے اس عہد کی موسیقی کی اصطلاحات میں عربی نام بھی رواج پا گئے۔ ایرانیوں کے سرود (راگ عربی میں مقامات کو بھی کہتے ہیں) بارہ تھے جو خورشید کے بارہ برجوں کی رعایت سے مرتب کئے گئے تھے۔ جو راگ بڑے ہوتے ہیں وہ آہنگ کہلاتے ہیں۔ جن کی تعداد چھ تک ہے۔ جن کو گوشہ کہتے ہیں۔ ان کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے۔ ایرانی موسیقی میں سترہ تالیں تھیں جو مرور زمان سے اپنا روپ بدلتی رہیں۔ لیکن آج بھی ہندوستانی و اسپینی موسیقی میں چند تالیں مستعمل ہیں۔ اہل ایران کا سب سے مشکل ساز بربط ہوتا ہے۔ بربط کے چار تار ہوتے ہیں۔ (۱) اخلاط۔ (۲) اربعہ۔ (۳) صفرادم۔ (۴) بلغم سودا۔ صفرا کا تار زرد رنگ کا ہوتا ہے۔ باقی سفید و سیاہ۔ دوسرے سازوں میں کمنچہ۔ شاہرود۔ دف۔ چنگ۔ نے۔ کوس۔ قرنا۔ خرنائی یعنی بڑی نے۔ عام طور پر بھی ساز بجائے جاتے ہیں۔ مغربی موسیقی نے ان ہی ذخائر سے اپنے آرکیسٹرا اور دوسرے ساز ترتیب دیئے ہیں۔ قرنا اور خرنائی میں عام طور سے جو ساز بجایا جاتا ہے اس میں بکری کے بچے کے روایتی روتے وقت کی آواز کے نشیب و فراز نہایت دلکش انداز میں پیش کئے جاتے ہیں۔

بنو امیہ کے عروج سلطنت پر زنان بازاری اور رقص کا رواج عام ہوا۔ یہاں تک کچھ عرصہ کے لئے مکہ، مدینہ اور طائف رقص و موسیقی کے مراکز بن گئے تھے۔ جہاں کنیزیں ناچ گانے کی تربیت حاصل کرتی تھیں۔ ابتداء میں حبشی غلام گاتے بجاتے تھے۔ پھر عرب سوداگر طولانی مسافرتوں میں جب دم لینے کو قیام کرتے تو ساز اور نغمہ سے مشغلہ کرتے۔ اسی عہد میں ایرانی طرزوں کو بھی عربی اشعار میں ڈھالا گیا۔ بنو عباس کے برسراقتدار آنے پر مشہور ایرانی خاندان ابرامکہ کو وزارت سونپ دی گئی۔ یحییٰ برمکی اور اس کے ہونہار بیٹوں فضل برمکی و جعفر برمکی نے ایرانی تہذیب و تمدن کو حیات تازہ عطا کی اور عرب اہل فن کی نہایت دریادلی سے سرپرستی کی۔ ابراھیم بن ماہان موصلی اور اس کا فرزند جس کا نام تھا اسحٰق موصلی اور زریاب اس دور کے عظیم ترین موسیقار تھے۔ جن کا قیام بغداد اور دمشق میں رہا۔ ابراھیم موصلی سیاط کا شاگرد تھا اور سیاط نے یونس کاتب سے تعلیم حاصل کی تھی۔ جو قدیم ایرانی موسیقی کا بہت بڑا عالم تھا۔ ابو الفرج اصفہانی نے اپنی کتاب "الاغانی" میں اس زمانے میں سو راگ راگنیوں کا ذکر کیا ہے۔

مسلمان جب فاتح بن کر وارد ہند ہوئے تو وہ موسیقی جو عرب اور ایران میں ترتیب پا چکی تھی اپنے ساتھ لائے اور جب یہاں مقامی موسیقی سے میل جول اور ربط و ضبط بڑھا تو دونوں کی آمیزش سے ہند و ایران کلچر کی بنیاد پڑی۔ ایرانی موسیقار جو ساز اپنے ساتھ ہندوستان لائے ان میں طبل۔ عود۔ نے۔ بنان۔ ارغنون۔ مزمار۔ بربط۔ چنگ۔ قانون۔ کاسہ۔ دائرہ۔ نقارہ۔ نفیری۔ بوق۔ شہنائی۔ غیچک۔ سارنگی۔ سار ندے۔ دف۔ دنبک اور رود وغیرہ تھے۔ یہ تمام ساز آج ساری دنیا میں نام اور شکلیں بدل کر رائج ہیں۔ حضرت امیر خسروؒ کی بلند و بالا شخصیت بھی ایرانی کلچر کے فروغ میں ایک ستون محکم کی طرح سے ہے۔ آپ نے راگ راگنیوں کے جدید طرز تلاش کئے جیسے نقش۔ ترانہ۔ قول۔ قلبانہ وغیرہ ایجاد کئے۔ جن میں ترانہ اور قول یعنی قوالی آج تک مقبول و مروج ہیں۔ قوالی گانے والے اور قوالی کے شائقین بھی اہل ہند بہت زیادہ ہیں۔ قوالی نے ہند و مسلم اتحاد کے لئے نہایت کارآمد راہ بنائی جو آج تک رائج ہے۔ قوالی عارفانہ کلام کی حسین تکرار ہوتی ہے۔ جسے عموماً تین تال اور دادرا میں گایا جاتا ہے یہ طرز صوفیائے کرام کی مجالس سماع میں زیادہ مروج ہے جو ارباب الٰہی کو وجد میں لاتی ہے۔ صوفیوں کے بارہ میں دس مکتبہ ہائے فکر سماع کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں موسیقی جو ساز و آواز کی ہم آہنگی اور سر تال کا تعاون ہے، تزکیہ، باطن اور روح کی پاکیزگی کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ جو انسان کو عشق حقیقی کو جانب متوجہ کرتا ہے۔

امام غزالیؒ احیاء العلوم میں فرماتے ہیں "جیسے لوہے اور پتھر میں آگ مخفی ہوتی ہے اسی طرح دلوں میں باطن کے اسرار

پوشیدہ ہیں، جن کے اظہار کی تدبیر راگ سے بہتر کوئی نہیں۔ دلوں کی جانب ایک راہ ہے وہ ہے گوش، جس سے سن کر نغمات موزوں اور ان کا پیغام و راز ہائے سربستہ ظاہر ہوتے ہیں۔ دل کا حال ایک بھرے ہوئے برتن جیسا ہے۔ وہ جب چھلکے گا تو وہی نکلے گا جو اس میں بھرا ہوا ہے۔ اس طرح راگ بھی دل کی صداقت کی آواز ہوتا ہے۔ جب راگ گایا جائے تو ہر دل پر وہی باتیں ظاہر ہوں گی جو اس پر غالب آئیں گی۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ دل طبعلراگ و موسیقی کے مطیع ہوتے ہیں"۔ صوفیاء کے لئے موسیقی ایک وسیلہ روحانی تھا جو انسانی قدروں کو نیکی کا راستہ دکھاتا ہے۔ لیکن عیاش طبع سلاطین و امراء نے اسے ایک تفریح جان کر ناز برداری کی اور لہو و لعب شامل ہو گیا۔ دکن میں ابراہیم عادل شاہ نہ صرف موسیقی کا قدر دان تھا بلکہ اس نے اس فن پر کتابیں بھی لکھیں۔ اس کی ایک کتاب "نورس" پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے جو اب تک مقبول ہے۔ بنگال تو موسیقی کا آستانہ بن گیا جہاں کے راجہ و امراء نے ہمیشہ اس فن کی اور فنکاروں کی جو قدر دانی و ہمت افزائی کی ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ ہندوستانی موسیقی کی ترویج و ترقی میں سرزمین بنگال کا تعاون ہمیشہ سنہرے حروف میں تحریر ہوگا۔ جب ایرانی وارد ہند ہوئے تو اہل ہند۔ دھورو۔ پد۔ چھند۔ کبت اور دوہا گاتے تھے۔ یہ اصناف گانے میں کلام موزوں داخل کرنے کی صورت میں وجود میں آئیں۔ محض آوازوں کی دلکشی سے ہی موسیقی کا منشا پورا نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے ہر مغنی شاعر کا محتاج ہے موسیقی اشکال کے اظہار پر قادر نہیں۔ اس کے مقابلے میں فن شعر گوئی آواز اور اشکال دونوں کے اظہار پر قادر ہے۔ ساز کو بجانے والے ہاتھ درکار ہیں گانے والے کو سریلا گلا چاہیے۔ لیکن ان دونوں کو ہمیشہ کلام موزوں کی ضرورت رہتی ہے جو صرف شاعری فراہم کرتا ہے چنانچہ موسیقی کی دنیا ہر کلام پر شعرا کو سلام کرتی نظر آئے گی۔ راجہ مان سنگھ گوالیاری کے درباری گویوں بخشو اور مچھو نے دھورو اور پد کو ملا کر صوفیائے کرام کا کلام گانا شروع کیا جس سے "دھرو پد" کی گائیکی کا آغاز ہوا۔ دھرو کے معنی ہیں ٹھہرا ہوا اور پد کے معنی مرتبہ ہے۔ دھرو پد کے مزاج میں ٹھہراؤ اور دبدبہ ہے۔ اس کے چار حصے ہیں استائی۔ انترا۔ سنچاری اور ابھوگ۔ ایرانی گانے والوں نے خیال کو جن چار حصوں میں تقسیم کیا ہے وہ ہیں۔ الاپ۔ استائی۔ انترا اور ترانہ الاپ کو ایرانی موسیقی میں سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اسے ادا یا پیش رو بھی کہتے ہیں۔ ایرانی خوانندے الاپ کو خوب کھلا کھلا کر ٹھہرے دے دے کر نشیب و فراز کے ساتھ گاتے ہیں۔ اسی راگ میں راگنی کے روپ کو پوری طرح سے متشکل کر دیا جاتا ہے۔ الاپ جو خیال کا سب سے اہم حصہ ہے، اس کی یہ اہمیت ایرانی موسیقی کے اثر کا نتیجہ ہے۔

مغل شہنشاہ اکبر کے معروف گویئے میاں تان سین (اصل نام ترلوچن داس تھا) نے متھرا میں سوامی ہری داس سے سنگیت سیکھا تھا۔ پھر ہری داس کے ایک اور شاگرد رام داس و تان سین نے مل کر دھرو پد کو رواج و قبول بخشا۔ تان سین کے ترتیب دیئے راگوں میں "میاں کی ٹوڈی"۔ میاں کے ملہار۔ راگ درباری۔ درباری کلیان اور شہانہ کا نام لیا جاتا ہے۔ عجب بات یہ ہے کہ ملا مبارک جو موسیقی کا بھی عالم تھا تان سین کے کمال فن کا قائل نہیں تھا۔ ایک بار اکبر نے ملا مبارک کو اپنی خاص محفل موسیقی میں بلایا اور تان سین کے مختلف راگ سنوائے تو ملا مبارک نے کہا کہ "ہاں کچھ گا لیتا ہے"۔ ابوالفضل کا بھائی فیضی ایک ماہر بین کار تھا۔ اور تو اور ملا عبدالقادر بدایونی جیسے زاہد خشک بھی بین کاری میں استادی کا درجہ رکھتے تھے۔ ان تصریحات سے اس بات کا واضح کرنا مقصود ہے کہ کلاسیکی موسیقی چودھویں صدی کے اواخر سے انیسویں صدی تک استادی موسیقی بن چکی تھی۔ ان صدیوں کے اکابر موسیقار و تمام رہنمایان سنگیت۔ تنت کار۔ گلکی اور پکھاوجی مکتب ایران کے ہی پروردہ تھے۔ یا ان کے تقلید کار یا شاگرد تھے۔ ان ہی مکتب ایران کے مقلدین نے ہندوستانی موسیقی کو وہ اسالیب اور ہیئت عطا کی ہے جو فی زمانہ برصغیر میں رائج ہے۔ ایرانیوں نے فنون لطیفہ کی ہر پہلو سے خدمت کی ہے۔ فقط موسیقی کو ہی فروغ نہیں دیا، بلکہ الکندی۔ فارابی اور ابن سینا وغیرہ نے اس فن پر تحقیق کا کام بھی کیا اور مستند کتابیں بھی لکھیں۔ یہ اجتہاد اب بھی جاری ہے۔ محمد رضا کی نغمات آصفی۔ مرزا محمد کی تحفۃ الہند۔ نواب واجد علی شاہ آخری فرمانروائے اودھ نے بھی ایک کتاب موسیقی پر لکھی ہے جو تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ہر آواز کے لئے ایک باب وقف ہے۔ اس کے علاوہ نواب واجد علی شاہ نے ٹھمریوں اور گیتوں پر بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ صادق خان نے [illegible] میں مرتب۔

حضرت معروف بہ قانون موسیقی تصنیف کی اس میں ۵۰۲ عنوانات ہیں۔ یہ کتاب شمالی موسیقی اور دکنی موسیقی کو دو حصوں میں منقسم کرتی ہے۔ ٹھاکر نوب علی خاں کی "معارف النغمات"۔ مردان علی خاں کی غنچہ راگ۔ حسین خاں کی نغمہ جانفزا۔ کرم امام خاں کی معدن الموسیقی۔ عطیہ فیضی کی سنگیت آف انڈیا خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ علاوہ برایں لکھنؤ کے ایک مشہور عالم دین جو شاعر گر اور ادیب گر بھی مشہور تھے مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ نے ایک کتاب موسیقی پر لکھی تھی جو ان کے بیٹے جناب سالک لکھنوی کے پاس تھی۔ اس کتاب کی زیارت کا شرف راقم الحروف کو بھی ہے۔ جس میں موسیقی کے لئے لکھا ہے کہ جب آفتاب کسی برج میں تحویل ہوتا ہے تو اس برج سے آواز آتی ہے اس طرح سے خورشید عالمتاب کے بارہ برجوں میں سے بارہ آوازیں آتی ہیں۔ یہ ایرانی خیال ہے اور عربی خیال ہے اور یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی سے جاری ہونے والے بارہ چشموں کی آوازیں بھی بارہ تھیں۔ ان بارہ آوازوں سے موسیقی کے بارہ مقام متعین ہوئے۔ عربی حکایت سے ایک دلچسپ قصہ درج ہے کہ موسیقار نامی ایک پرندہ بیت المقدس کے سلسلہ جبال پر رہتا تھا جس کی عمر ہزار سال کی ہوتی ہے۔ یہ جانور مرتے وقت لکڑیاں جمع کر لیتا ہے اور اس ہیزم میں اس کی دلربا آواز سے آگ لگ جاتی ہے جس سے وہ پرندہ تو جل کر مر جاتا ہے، لیکن اس کی راکھ سے اس کا جانشین وجود میں آتا ہے۔ اس کی دراز چونچ میں بارہ سوراخ ہوتے ہیں، ان میں سے مختلف آوازیں نکلتی ہیں اور ان ہی آوازوں سے علم موسیقی کا استخراج کیا گیا ہے (۱)۔

اس فن کے سخت جان ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ یہ فن مذہب اور اخلاق کی تنظیم نمائی کا صدیوں مقابلہ کرتا رہا۔ ہندوؤں سے قطع نظر جو اسے عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے یہاں صوفیائے کرام کی محفل سماع کے پردے میں کبھی نعت خوانی کے لباس میں کبھی مرثیہ، سوز خوانی اور نوحہ ماتم کے بھیس میں موسیقی اہل دین کے دلوں میں گھر کر لیتی ہے۔ اس کی حرمت کا مسئلہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ رہا ہے۔ یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ایرانی اشتراک اور تعاون کو فراموش کرنے کے لئے آج کے مصنفین کافی کچھ لکھ رہے ہیں۔ یعنی تیرھویں صدی میں سارنگ دیو نے ایک کتاب "سنگیت رتناکر" کے نام سے لکھی تھی۔ لیکن اس اصل کتاب کا وجود نہیں ہے یہ بھی ان ہی دیومالائی مفروضوں کی مانند ہے کہ سنگیت ودیا کے خالق برہما تھے۔ اور شوجی مہاراج نے دنیا کو اس سے روشناس کرایا پھر بھرت رشی نے یہ فن اپسراؤں کو سکھایا اور نارد رشی نے اس فن کی تعلیم دنیا والوں کو دی۔ اس طرح سے جو بھی تاریخ ہے وہ FICTIONALISE ضرور ہے لیکن حقیقت سے دور ہے۔

ہندوستانی موسیقی کو یورپ میں سب سے پہلے متعارف کرانے والی خاتون عطیہ فیضی تھیں۔ جنہوں نے پیرس۔ لندن۔ برلن۔ وی آنا وغیرہ جاکر بڑی بڑی کانفرنسوں میں شریک کی اور اس فن میں ہندوستانیوں کی پیش رفت پر روشنی ڈالی۔ جب تک عطیہ فیضی امریکہ اور جاپان نہیں گئی تھیں، تب تک ان ممالک میں کوئی یہ تک نہیں جانتا تھا کہ بھارت میں بھی موسیقی کا چلن ہے۔ عطیہ فیضی ہی کی تحریک پر بڑودہ میں مہاراجہ گائیکواڑ نے ۱۹۱۶ء میں پہلی بار میوزک کانفرنس منعقد کرائی جو اب ایک مستقل سالانہ تقریب بن چکی ہے۔ اس کے علاوہ بڑودہ شہر میں میوزیک کالج قائم کیا۔ وہ موسیقی میں بہت بصیرت رکھتی تھیں۔ ان کے بجائے نغمات سوربون یونیورسٹی پیرس میں ریکارڈ کئے گئے۔ لیکن اپنی میراث سے غفلت برتنے کی یہ چھوٹی سی مثال ہے آج عطیہ فیضی کی ان خدمات سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ چہ جائیکہ ایرانی خدمات جو سرزمین ہند کے لئے کی گئیں جن سے چشم پوشی امکان پذیر نہیں۔

اہل ایران نے ہندوستانی شعر و ادب کی جو رہنمائی کی ہے وہ موضوع اس قدر وسعت رکھتا ہے کہ اس کے لئے ایک کتاب بھی کم ہے۔ ان جامع الکمالات ادیبوں اور شاعروں کی فہرست اتنی طولانی ہے کہ ان کا بیان مشکل ہے۔ یہ سلسلہ مسعود سعد بن سلمان سے شروع ہوتا ہے جو عہد غزنوی میں ہندوستان آیا تھا اور آج تک جاری ہے۔ علامہ اقبال اس صدی میں برجستہ ترین شاعر تھے۔ ہند کی سرزمین میں فارسی شاعری کا جو ذخیرہ جمع ہے اس کی قدر و قیمت پر ہم ناز کر سکتے ہیں۔ جب ایران میں صفوی حکومت کے قیام کے ساتھ بلند شاعری کی صلاحیت سلب ہو گئی تو دہلی میں مغل دربار نے اس نئے دبستان کی سرپرستی کی جسے "سبک ہندی" کا عنوان دیا گیا۔ اس کی بنا رکھنے والوں میں نظیری اور صائب تبریزی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

نہوں نے ہندوستانی تہذیب اور ثقافت سے متاثر ہو کر یہاں کے ماحول تک ہندو رسوں اور باسیوں سے لاہوتی عشق کیا اور یہ بات بھی قابل فکر ہے
د فیضی کی مثنوی "نل دمن" سے پہلے یہاں کسی فارسی گو شاعر نے اپنے ماحول کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ اکبر نے جب ہندو مسلم اتحاد کی داغ بیل ڈالی
ور علمی و تہذیبی رواداری کی ہمت افزائی کی تو اس تحریک کا اثر فارسی شاعری پر پڑا۔ "سبک ہندی" کے بانیوں نے اس کا دوسرا فارسی نام "تازہ گوئی"
رکھا جو محاورۂ رائج الوقت میں جدیدیت کہا جاسکتا ہے۔ جدیدیت کی اس لہر کے خیر مقدم کے لئے بے شمار شعرا آگئے۔ اب جدت طرازی پر زیادہ توجہ
دی گئی۔ ابھی تک سبک ہندی کا کوئی خاطر خواہ تجزیہ نہیں ملتا۔ تاہم قیاس یہ کہتا ہے کہ شاید ہندی دوہوں یا سنسکرت نظم نے اس طرزِ جدید کی
راہنمائی کی ہو۔ شبلی نعمانی نے ہر تحریر میں سقفہ سازی سے کام لیا چنانچہ شعرالعجم میں اس دور کو شاہ جہاں تک لاکر ختم کر دیا اور لکھا کہ فارسی شاعروں کا
بڑا دور ختم ہوا۔ اب کوئی بھی منصف مزاج اسکالر کیا مرزا بیدل کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ اسی طرح غالب اور اقبال کو بھی شبلی فراموش کر گئے جب کہ آج
بھی ایرانی دانشگاہوں میں ہر دو کو فارسی کا بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اقبال تو اہل ایران کے قہرمان ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو، فارسی اور
ہندی والے طبقوں میں لسانی عدم واقفیت کی بنا پر کسی نے آج تک سبک ہندی سے سنسکرت نیز ہندی فارسی شاعری کا تقابلی مطالعہ نہیں کیا ورنہ
ہندوستانی کلچر اور شاعری کو فروغ حاصل ہو سکتا تھا۔ افسوس کہ اس جانب کسی یونیورسٹی میں کام نہیں ہوا۔ اسی طرح ہندی ادب میں مسلمان
شاعروں کے اشتراک سے اردو والے زیادہ واقف نہیں ہیں جو ایرانی اثرات کو ترک کر کے فارسی زبان کو فراموش کر کے ہندی ادب کی خدمت میں
لگ گئے۔ ان میں کبیر۔ ملک محمد جائسی اور عبدالرحیم خان خاناں کا شمار ہندی ادب کے صف اول کے شعرا میں ہوتا ہے۔ میاں کبیر نے ہندی شاعری
میں معرفت کے جو رنگ بھر دیئے ہیں وہ عالمی ادب کی راہنمائی کر رہے ہیں۔ تصوف کا شاعر ان کا ایسا یکتائے روزگار ملنا مشکل ہے۔ جائسی کی "پدماوت"
کو لسانی و فنی اعتبار سے تلسی داس کی رامائن کا پیش رو قرار دیا جاسکتا ہے۔ خان خاناں کے سات سو دوہوں کے مجموعے بنام "رحیم ست سئی" میں فکر و
حکمت کے موتی بکھرے پڑے ہیں۔ اسی طرح بنگالی زبان میں ٹیگور کے بعد قاضی نذر الاسلام جیسا عظیم شاعر پیدا نہیں ہوا۔ یہ سب بھی ایرانی ثقافت کا
ثمر ہے۔ تہذیبوں کی ترقی اور زوال کا براہ راست تعلق فکری زندگی کے نشیب و فراز سے ہے۔ جب کوئی قوم اندھی تقلید کو ضابطۂ حیات بنا لیتی ہے تو وہ
آگے کے بجائے پیچھے چلنے لگتی ہے اور تاریخ کی شاہراہ سے بھٹک جاتی ہے۔ اپنے آپ سے گمراہ ہو جاتی ہے۔

آج ہمارا سکوت اور باطل سے اشتراک ہمارے غفلت کے اندوختوں میں اضافہ کر رہا ہے۔ آخر ہم کب تک ریگ دریا کی مانند بے لبی پڑے
ان تمام بے ہنگم نقوش کو قبول کرتے رہیں گے۔ ہم کو چاہیے کہ آب رواں پر تیر چلانے کی اس کوشش کو سراسر بے نقش اور بے اثر ثابت کر دیں۔
ہمارے ادیب و دانشور اس سازش کی ماہیت سے بخوبی آگاہ و آشنا ہیں۔ پھر کیوں نہیں قیام کرتے اپنی شاعری ادب اور ثقافت کی از سر نو درست تاریخ
مرتب کیوں نہیں کرتے ہم کو چاہیے کہ سرکاری انعامات اور کاذب روابط عمومی کی مئے ہوش ربا کے فریب میں نہ آئیں بلکہ یہ سارے جام و سبو توڑ ڈالیں
پہلے ادیب سماج کے نیک و بد کے جائزے پر اکتفا کرتا تھا۔ اب وہ اس ہم سے وابستہ ہونے لگا جو ظلم اور بے انصافی کی قوتوں سے نبرد آزما ہو رہی ہے۔
ہم پر واجب ہے کہ اس آخر الذکر رجحان کو ادبی، سماجی و فنی عظمت عطا کریں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

---

(۱) مصنف نے "ققنس" پرندے کی طرف اشارہ کیا ہے کہا جاتا ہے کہ اس کی چونچ میں ۳۶۰ سوراخ ہوتے ہیں۔ یہ جوڑا نہیں ہوتا۔ اس کی عمر طبعی ختم ہونے پر آتی ہے تو اس کی چونچ سے دیپک راگ نکلتا ہے۔ جس سے اس کی جمع کردہ لکڑیاں بھی جل جاتی ہیں اور یہ خود بھی جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ اس کی راکھ پر بارش ہوتی ہے اور اس میں سے از خود ایک انڈا پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر اس انڈے سے ققنس جنم لیتا ہے۔
دیپک راگ انتہائی مشکل راگ مانا جاتا ہے۔ (مدیر)

تحریک کے
قدم
ٹالی گنج
رابندر سروور
کالی گھاٹ
جتن داس پارک
بھوانی پور
رابندر سدن
میدان
پارک اسٹریٹ
ایسپلینیڈ
چاندنی چوک
سنٹرل
مہاتما گاندھی روڈ
گریش پارک
سووا بازار
شیام بازار
بیلگچھیا
دم دم
میٹرو کی تحریک۔ زمین کے
اندرونی ہیجان نے کلکتہ کو متحرک
کر دیا ہے۔ ۱۹۸۴ء میں اس تحریک
نے ایسپلینیڈ اور بھوانی پور کے درمیان
ایک چھوٹے قدم سے تحریک چلائی۔
کئی سال گزر گئے۔ اب ۱۹۹۵ء سے
وہ چھوٹا قدم لمبا ہو کر ٹالی گنج سے
سنٹرل اور گریش پارک سے دم دم
تک پہنچ گیا ہے۔ اور بہت جلد میٹرو
گرم جوشی سے آگے بڑھنے والی ہے۔
ایک بہت بڑے قدم کے ذریعہ براہ راست
ٹالی گنج سے دم دم تک جانے والی
ہے۔ اس کے راستے میں صرف ایک
مہاتما گاندھی روڈ اسٹیشن کچھ
عرصہ تک حرکت میں نہیں آئے گا۔
لیکن یہ میٹرو کی تحریک میں کوئی
رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔ میٹرو کا
دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہوگا کہ وہ
اسے مضبوط اور تربیت یافتہ
کاریگروں کے ذریعہ پورا ہو جانے سے
پہلے پہل پیدا کروائے گی۔
چلئے ہم سب ایک ہو کر
آج یہ عہد کریں کہ ہم میٹرو کی
تحریک کو برقرار رکھیں گے۔
آج اور ہمیشہ۔
میٹرو ریلوے
کلکتہ
I care for you. you care for Metro

ظفر گورکھپوری

۳۰۲-A فلوریڈا، شاستری نگر
اندھیری (ویسٹ)
بمبئی - ۴۰۰۰۵۸

جو بدگماں ہے، وہ غمخوار بھی ہماری تھی
کبھی یہ عمرِ طلب گار بھی ہماری تھی

ہمیں زمین، ہمیں خشت اور ہمیں بنیاد
گری جو ہم پہ وہ دیوار بھی ہماری تھی

طلب بھی کرتے جو ہم خوں بہا تو دیتا کون
گلا بھی اپنا تھا، تلوار بھی ہماری تھی

برہنہ پا تھے مگر بچ کے کس طرح چلتے
جنوں کی وادیِ پُرخار بھی ہماری تھی

لہو کسی کو، کسی کو چراغ سر دے گئے
سحر بھی اپنی، شبِ تار بھی ہماری تھی

مزید ہم سے توقع کے کچھ خلاف ہوا
کبھی یہ دنیا طرف دار بھی ہماری تھی

سالم تھے، توڑ توڑ کے رسوا کیے گئے
ہم تجربوں کے واسطے پیدا کیے گئے

پتوں کی تیغ کاٹ نہ ڈالے ہوا کے ہاتھ
کچھ سوچ کر درخت برہنہ کیے گئے

ہم مسئلوں کی طرح رہے زندگی کے ساتھ
دفنا دیے گئے، کبھی زندہ کیے گئے

اس میں کہیں تھا اُس کی بھی تکمیل کا سوال
یوں ہی نہیں اسیرِ تمنّا کیے گئے

سمتیں دکھا دکھا کے زمیں کھینچ لی گئی!
ہم جانے کس سفر پہ روانہ کیے گئے

اُترے گا کوئی پار، کوئی ڈوب جائے گا
بھر ندیوں کے پاٹ کشادہ کیے گئے

اوم کرشن راحت
5L-152 فرید آباد

غزل

حواس کھو کے بھی راحت میں ہوش مند رہا
غموں کے بوجھ سے دب کے بھی سربلند رہا

نہ میں نے چھوڑا کبھی رحمتوں کا دروازہ
مجھے پتہ نہیں در وہ کھلا کہ بند رہا

مذاق یوں بھی اڑایا ہے میں نے ہستی کا
کہ دل میں کرب رہا لب پہ زہرخند رہا

یہ اور بات کہ جرأت نہیں تھی کہنے کی
تمام عمر میں خود کو بھی ناپسند رہا

سنا ہے لفظِ خوشامد سے کھل بھی سکتا تھا
وہ ایک در جو ہمیشہ ہی مجھ پہ بند رہا

میری گرفت بھی ڈھیلی نہیں پڑی اس پر
جکڑ میں زیست کی میرا بھی بند بند رہا

حیات کچھ بھی نہ یارو مرا بگاڑ سکی
میں داؤ ہارا مگر حوصلہ بلند رہا

نوٹ: شاعر نے یہ غزل انتہائی المناک حادثے کے بعد کہی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کی جان بچ گئی۔ لیکن وہ Walker کے بغیر اب بھی نہیں چل سکتے۔ قارئین ان کی صحتیابی کے لئے دعا فرمائیں۔ (انجانا)

اقبال متین
نظام آباد (اے۔پی)

غزل

آدمی ہوتا ہوا بھی کوئی اوتار لگے
وہ گزر جائے جہاں سے وہیں بازار لگے

شب کے سناٹوں میں پرتول رہی تھی دنیا
پو پھٹے ایک کرن دوشِ زمیں بار لگے

اس کے کوچے میں مری شان۔ انا بھی دیکھو
کتنے ارمانوں کے جمگھٹ میں، سردار لگے

کوئی دیوار سر راہ رکاوٹ بن جائے
کوئی رستہ سر منزل مجھے دیوار لگے

اس کے اقرار میں انکار کا پہلو نکلے
اس کا انکار بھی اک طرح سے اقرار لگے

ہائے اس شخص کا انداز کرم بھی دیکھو
میرے پاس آئے تو خود اپنے سے بیزار لگے

وہ جو اک شخص نے چاہا مجھے اقبال متین
اس کے گھر جاؤں تو وہ درپئے آزار لگے

واجد سحری
نئی دہلی

غزل

دریائے محبت میں ابھرے ہیں نہ ڈوبے ہیں
ساحل پہ کھڑے ہوکر طوفان میں رہتے ہیں

اس شہر ستمگر کا کچھ بھی تو نہیں بدلا
آنکھیں وہی آنکھیں ہیں چہرے وہی چہرے ہیں

بیدار نگاہی تو ، تحفہ ہے غریبوں کا
ہم ان کی بدولت ہی آنکھیں کھلی رکھتے ہیں

مجرم کی طرح رنگت کیوں قید ہے گلشن میں
کاندھوں پہ ہواؤں کے خوشبوؤں کے پہرے ہیں

بہتر جنھیں سمجھے تھے ہم اپنے ہی رستے کا
اب ایسے بزرگوں کو ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں

دولت کی طرح برسوں تہذیب جہاں بانٹی
بہتر کے وہاں انساں اب بھی نظر آتے ہیں

تو جان بہاراں ہے سرگنج گلستاں ہے
لیکن تری خوشبو کے جھونکے ہمیں ڈستے ہیں

احساس ، وفا ، غیرت کیا کیا نہ ملا واجد
ہم جیسے غریبوں کے کیا قیمتی ورثے ہیں

مرد

کدارناتھ شرما
پنچکولہ (ہریانہ)

"کہاں جانا ہے ؟"
"بہادر گڑھ۔"
"بہادر گڑھ ؟"
"ہاں۔"
"اکیلی ہو ؟"
"ہاں۔"
"کہاں سے آئی ہو ؟"
"کیتھل سے۔"
"بہادر گڑھ جانے والی گاڑی تو صبح چار بجے ملے گی۔"
"ہاں۔ پتہ ہے۔"
"تو پھر چار بجے تک یہاں انتظار کرنا پڑے گا۔"
"سو تو ہے ہی۔"
"پتہ ہوتے ہوئے بھی آپ نے رات کا سفر کیوں کیا ؟ وہ بھی اکیلے۔"
"مجبوری تھی۔ ہمارے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔"
"میں نے بھی اسی گاڑی سے روہتک جانا ہے۔"
"تو اچھا ہوا۔"
"اگر کہو تو سامان اٹھوا دوں۔"

پھر میں اس کا سامان اٹھوا کر سیکنڈ کلاس کے ویٹنگ روم کے سامنے برآمدے تک لے آیا۔ اس کے پاس کئی گٹھریاں اور پوٹلیاں تھیں۔

کیتھل سے آنے والی اس گاڑی سے کئی سواریاں اتری تھیں جو چلی گئی تھیں۔ وہ لڑکی پلیٹ فارم پر اکیلی رہ گئی تھی۔ گاڑی خالی ہو کر یارڈ کی طرف چلی گئی تھی۔ اس لڑکی کو اکیلا دیکھ کر نہ جانے کہاں سے دو تین آدمی اس لڑکی کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ گاڑی کی آواز سن کر میں ویٹنگ روم سے باہر نکل کر ٹہلنے لگا تھا۔ ان آدمیوں کو اکیلی لڑکی کی طرف بڑھتے دیکھ کر میں بھی تیز قدموں سے وہاں پہنچ گیا تھا۔ مجھے گفتگو میں محو دیکھ انہوں نے اپنا راستہ ناپ لیا تھا۔

اسٹیشن سونا ہو گیا تھا۔ قلی اور نیلی وردی والے ریلوے کے ملازمین بھی جا چکے تھے۔ پلیٹ فارم پر اکیلے رہ گئے چائے والے وینڈر نے بھی اپنی دوکان بڑھا دی تھی۔ اپنی سلگتی انگیٹھی کو میرے روم میں پہنچا کر وہ بھی چلا گیا تھا۔

ہم نے برآمدے میں رکھے سامان کو اندر ویٹنگ روم میں کر لیا تھا اور ہم انگیٹھی کے گرد بیٹھ کر تاپنے لگے تھے۔ میں نے جو گھبراہٹ اس لڑکی کے چہرے پر کچھ دیر پہلے پلیٹ فارم پر اکیلے کھڑے اور کچھ آدمیوں کو ادھر بڑھنے پر دیکھی تھی، غائب ہو گئی تھی۔ وہ یہاں اپنے آپ کو محفوظ محسوس کر رہی تھی۔

میں کل روہتک سے پٹیالہ آیا تھا۔ جب چپراسی کے ذریعے بلائے جانے پر میں صاحب کے کمرے میں گیا تھا تو صاحب نے مجھے دیکھ کر ہیڈ کلرک کو حکم دیا تھا۔ "اس لڑکے کو آج ہی پٹیالہ ٹور پر بھیج دو"۔ اور میں نے حکم کی تعمیل کی تھی۔

بس اڈے پر مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ بعد دوپہر دو بجے ایک بس نروانہ جاتی ہے اور وہ پانچ بجے نروانہ پہنچتی ہے۔ بس اڈہ نروانہ اسٹیشن کے پاس ہے۔ جوں ہی بس نروانہ پہنچتی ہے وہاں سے گاڑی مل جاتی ہے

جو لگ بھگ سات بجے روہتک پہنچا دیتی ہے۔

اس لیے میں پٹیالہ میں صاحب کے روبرو پیش ہوا تھا۔ میری بات سننے کے بعد انہوں نے اکونٹنٹ کو بلا کر حکم دیا دیا تھا۔ "لڑکے کو جلد فارغ کر دو تاکہ وہ وقت پر بس پکڑ سکے۔"

میں نے وقت پر بس پکڑی تھی۔ جب میری بس نروانہ پہنچی تو میں نے ریل گاڑی کو اسٹیشن پر کھڑے دیکھا تھا۔ لیکن جب میں بس سے پلیٹ فارم پر پہنچا تھا تو گاڑی چل پڑی تھی۔ میں چلتی گاڑی پر چڑھنے کی ہمت نہ جٹا پایا تھا۔ میں مایوس ہو گیا تھا اور پلیٹ فارم سے باہر نکل آیا تھا۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ اب تو گاڑی صبح چار بجے ہی مل سکے گی۔

جنوری کا مہینہ تھا۔ سورج غروب ہو گیا تھا۔ دھوپ کے چلے جانے کے بعد سردی کی شدت اور بڑھ گئی تھی۔ میرے پاس اوڑھنے کے لیے کوئی کپڑا ہی نہ تھا۔ تن پر ایک سویٹر تھا جو سردی کو روکنے کے لیے ناکافی تھا۔ میری نظریں سامنے ایک مکان کی طرف چلی گئی تھیں جس کی اوٹ میں ایک بڑھیا چنے بھون رہی تھی۔ کچھ بچے کڑاہی کے گرد کھڑے تھے اور اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ بھنے ہوئے چنوں کی خوشبو میرے نتھنوں میں چڑھ رہی تھی جس نے میری بھوک جگا دی تھی۔ میں نے دونی کا ایک سکہ بڑھاتے ہوئے اس بڑھیا سے چنے کی فرمائش کی۔ کڑاہی کے نیچے آگ کی لپٹوں سے پورا ماحول گرم ہو اٹھا تھا۔ مکان کی اوٹ میں جہاں ہوا کی زد سے بھی بچاؤ تھا۔ میں تب تک وہاں کھڑا رہا جب تک کہ بڑھیا اپنا کام بڑھا کر چلی نہیں گئی۔

اندھیرا ہو گیا تھا۔ سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ میں نے سامنے ایک ڈھابے میں جا کر پناہ لی۔ انگیٹھی کے پاس کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد میں نے وہاں چائے پی اور تب تک وہاں سے نہیں ہلا جب تک کہ ڈھابہ بند نہیں ہو گیا۔ اس ڈھابے میں کھانا کھانے والا میں آخری گاہک تھا۔

اب میرے پاس ریلوے اسٹیشن پر لوٹ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ سونے پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں اس کے زیر اثر ایک کمرے میں داخل ہوا جہاں ریلوے کے ایک بزرگ بابو کرسی پر بیٹھے کوئی کام کر رہے تھے۔

"سر۔ میں ایک سرکاری ملازم ہوں۔ میں نے صبح چار بجے والی گاڑی سے جانا ہے۔"

"تو؟"۔

"میں آج پٹیالہ سے آیا تھا۔ جب میری بس یہاں پانچ بجے پہنچی تو گاڑی جا چکی تھی"۔

"پھر"

"اگر آپ سیکنڈ کلاس کا ویٹنگ روم کھلوا دیں اور مجھے وہاں ٹھہرنے کی اجازت دیں تو مہربانی ہوگی۔ دراصل میرے پاس لاکھوں روپے کے سرکاری چیک ہیں۔"

"کوئی بات نہیں"۔

بڑے بابو نے میری طرف پر مسرت نگاہوں سے دیکھا اور نیلی وردی والے ایک شخص سے کہا۔ "اس لڑکے کے لیے کمرہ کھول دو"۔

میں خوشی خوشی اس اہلکار کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ کمرے میں ایک آرام کرسی پر بیٹھ کر میں نے کئی لحاظ سے اپنے آپ کو محفوظ محسوس کیا۔

ریلوے پلیٹ فارم پر میرے کمرے کے عین سامنے چائے کا وینڈر کھڑا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں نے اس کے پاس جا کر کئی بار چائے پی ڈالی تھی جس سے میری اس سے واقفیت گہری ہو گئی تھی۔

"آپ کا یہ سٹال کتنے بجے تک رہے گا؟"

"بارہ بجے تک۔ کیتھل سے جب شٹل آتا ہے۔ اس کے بعد میں گھر چلا جاتا ہوں اور چار بجے بمبئی میل کے آنے کے وقت پھر واپس آجاتا ہوں"۔

"اگر آپ اسی انگیٹھی کو بنا بجھائے میرے پاس چھوڑ جائیں ...."۔

"آپ نے تو بمبئی میل سے جانا ہے؟"

"ہاں۔"

"تو پھر کوئی بات نہیں۔"

میں نے دو روپے اس کی ہتھیلی پر ٹکا دیئے تھے اور وہ انگیٹھی میرے پاس چھوڑ گیا تھا۔

انگیٹھی کے گرد بیٹھے میں سوچنے لگا تھا کہ نہ جانے کب تک مجھے لوگ لڑکا ہی سمجھتے رہیں گے اور مجھے اسی نام سے پکارتے رہیں گے۔

بروقت اکیلی پلیٹ فارم پر بارہ بجے کے پاس پہنچ کر اور وہاں کھڑے دو
تین آدمیوں کے دل میں خوف پیدا کرکے میں نے اسے حفاظت کا
احساس دلایا تھا۔ اس سے میں خود بھی اپنے آپ کو لڑکا ہونے سے بہت
کچھ اونچا سمجھنے لگا تھا۔

ایک جواں سال لڑکی کا قرب۔ سرد رات اور تنہائی میرے لیے
ایک نئی بات تھی۔ میں خود ان حالات میں اپنے رویے کا تجزیہ کر رہا تھا۔
وہ لڑکی عروسی پوشاک میں ملبوس تھی۔ اس کی ادائیں شوخ اور شرارت
بھری تھیں۔ اس کا انداز تکلم بے جھجک اور بے باکانہ تھا۔ وہ بات بات
پر کھلکھلا اٹھتی تھی۔ میں نے اس میں نو عمر دوشیزاؤں کی طرح شرم و حیا
بھی دیکھی۔

وہ دیر تک میرے ساتھ باتیں کرتی رہی۔ اپنے بارے میں اس
نے بچپن سے لے کر اب تک کی اپنی زندگی کے بارے میں اپنی داستان
اختصار سے کہہ ڈالی۔ ایک جواں عمر لڑکی کے ساتھ تنہائی میں لمبے عرصے
تک رہنے کا یہ میرا پہلا موقعہ تھا۔ مجھے ایک شوخ اور حسین دوشیزہ کا
قرب حاصل تھا۔ مجھے پہلی بار اس کے دہکتے ہوئے رخساروں کا نظارہ
کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ اس کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نرم و نازک گلابی
ہونٹ اور انار کے دانوں کی طرح چمکتے دانت اور پھر ان پر پھیلی قیامت
خیز مسکراہٹ کا احساس بھی مجھے پہلی بار ہوا تھا۔ اس کا مرمریں مجسمہ،
اس کے تراشیدہ اعضاء اس کے حسن و جمال کا نغمہ میرے لیے صبر آزما تھا
میری تجسس بھری نگاہیں نہ جانے اس میں کیا کیا تلاش کر رہی تھی۔ مجھے
اپنے قریب اس کی گرم گرم سانسوں کا احساس ہوا۔ مجھے لگا جیسے ساکن
سمندر کے پانی میں جوار آگیا ہو۔ اس کی بڑی بڑی کجراری آنکھوں سے
نکلتی ہوئی شعاعیں مجھے پگھلائے جا رہی تھیں۔ مگر میں ضبط کی ڈور تھامے
ثابت قدم تھا۔ اس کے ابھرتے سکڑتے سینے کی حرکت غضب ڈھا رہی
تھی مگر میں بہت نزدیک ہو کر بھی اس کے ساتھ مناسب دوری قائم
رکھے ہوا تھا۔ میں نے اس بیچ کئی بار ایک ذمہ دار شخص کی طرح
پر خلوص ماحول کو اپنے بارعب تکلم سے متلاطم کر دیا جو کہ شاید حالات
کی نزاکت کے پیش نظر ضروری ہو گیا تھا۔

حسن اور عشق کی اس کشاکش۔ جذبات اور خرد کی اس بازی
کو بنا ہارے جیتے۔ قرب اور دوریوں کو بنائے رکھ کر ہم آخر اس شبستان
سے باہر آئے۔ جب چائے سٹال کے وینڈر نے دروازے پر آکر یہ اطلاع
دی کہ گاڑی آنے والی ہے۔

گاڑی کے پلیٹ فارم پر لگتے ہی ہم نے اپنا سامان اوپر چڑھایا
اور بیٹھ گئے۔ گاڑی میں زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ زیادہ تر سواریاں اونگھ
رہی تھیں اور سردی کی وجہ سے سب نے اپنا سر منہ ڈھانپ رکھا تھا۔

ریل کی پٹڑیوں پر ہچکولے کھا رہے ڈبوں میں اور باد سحری کے
مست جھونکوں کے مابین آنکھوں میں مستی اتر آئی تھی۔ اس کے گداز
جسم اور اس کے مشکیں بالوں کی خوشبو سے سرشار ہمارا سفر کٹنے لگا۔ ہم
ایک دوسرے کے نزدیک ہو کر بھی اتنے دور تھے جتنا کہ ہمیں رہنا
چاہیے تھا لیکن میرے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ عورت کیا آدمی کے
خوابوں کی تعبیر ہے؟ عورت کیا آدمی کی تکمیل کے لیے اہم ہے۔ کیا
عورت آدمی کی پریشانیوں میں فرحت بخش ہو سکتی ہے۔ ایسے کئی
سوالوں کا مجھے جواب مل گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اس کسوٹی پر کس
کے دیکھ لیا تھا کہ کیا اب عورت کو سمجھنے کا شعور مجھ میں پیدا ہو گیا ہے؟

میرا وقت زیادہ عورت کے مشاہدے میں ہی گزر رہا تھا۔ اس کے
احساسات۔ اس کے جذبات۔ اس کی اداؤں کی نیرنگیوں۔ آدمی کے
بارے میں عورت کے عقیدوں۔ قدروں اور چاہتوں کا میں نے تجزیہ
کیا تھا۔ میں دراصل گھر میں کئی بار اپنی شادی کے بارے میں کی جا رہی
باتوں کو سنتا آ رہا تھا مگر اپنے فیصلے سے انہیں آگاہ نہ کر سکا تھا۔

یہ موقعہ اس بات کو سمجھنے سمجھانے کے لیے کافی کارآمد ثابت
ہوا تھا۔ میں نے بڑی سنجیدگی سے اس معاملے پر غور و خوض کیا تھا۔ ماں
کی ممتا اور ایثار کو میں نے بڑی گہرائی سے دیکھا تھا۔ بہن کا پیار اور حیا
بھی میں نے پایا تھا۔ عورت کے اس روپ کو میں نے پہلی بار محسوس
کیا تھا۔ اس سے پہلے مجھے اس کا تجربہ نہ تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ
عورت محبت کے نام پر اپنا سب کچھ نثار کر سکتی ہے۔ میری سمجھ میں یہ
بات بھی آگئی تھی کہ شادی کی رسم میں بندھے بیوی اور خاوند محبت کے
پاک رشتے میں عمر بھر کے لیے ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک
دوسرے کی تکمیل کرتے رہتے ہیں اور یہ سلسلہ پوری عمر تک چلتا ہے۔
زندگی خوشگوار ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ اپنی بڑی چھوٹی سبھی خواہشات کو
ملکر پورا کرتے ہیں۔ ان کی کامیابی۔ فتحیابی اور کامرانی میں دونوں کا

برابر کا حصہ ہوتا ہے۔ سچی محبت میں مرد کا عورت کے ساتھ اور عورت کا مرد کے ساتھ ہر پل ہر لمحہ کتنا روح پرور ہوتا ہے۔ میں نے دل کی گہرائیوں میں اس کا اندازہ کر لیا تھا۔

گلاب دار ریوڑی۔ روہتک کی مشہور ریوڑی کی آوازوں سے میں نے یہ جان لیا تھا کہ روہتک کا ریلوے اسٹیشن آگیا ہے۔ گاڑی رکتے ہی میں نے اس ہم سفر کو الوداع کہا اور گاڑی سے نیچے اتر گیا۔

"ریوڑی نہ لوگے ؟" ہاکر نے کہا

"ہاں۔"

"صاحب۔ اپنے لیے۔ اپنے اپنوں کے لیے۔"

میں نے جھٹ سے ریوڑی کے دو پیکٹ خرید لیے اور ڈبے کی کھڑکی میں سے اپنے ہمسفر کو پکڑاتے ہوئے ہاکر کو پیسے دینے کے لیے لوٹا۔

گاڑی چل دی۔ گاڑی کے ڈبے سے ایک ساتھ کئی لوگ چلا اٹھے

"اس کا مرد نیچے رہ گیا۔"

میں نے یہ محسوس کیا کہ واقعی میں ایسا لڑکا نہیں رہا، مرد بن گیا ہوں !!۔

بقیہ : ادبی سرگرمیاں

ترجمہ سنایا جس کے بعد جگنی ماتھر/آزاد نے اپنی اصل اردو نظم پیش کی۔ تقریب میں مندرجہ بالا حضرات کے علاوہ سروشری آنند لہر، راجکمار چندن، ڈاکٹر نورشید حرا، ڈاکٹر شہاب عنایت ملک، مسز آزاد اور مسز بے تاب نے شرکت کی۔

جلسے کی ابتدا میں اردو کی ان بلند پایہ شخصیتوں کی یاد میں ماتمی معلوشن پاس کیا گیا جن کا انتقال حال ہی میں ہوا۔ ان حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

پروین شاکر، ضمیر کاشمیری، محمد عبداللہ قریشی، حسن طاہر، جلیل ہاشمی، اختر حسین جعفری، مظفر بدایونی، احمد داؤد، ممتاز حسین (پاکستان) گیانی ذیل سنگھ، حسن واصف، شہاب سرمدی، وحید انور، محمد محبوب علی نصرت اور پروفیسر سید ظہیر الدین مدنی (ہندوستان)

مرسلہ : راج کمار چندن
اسسٹنٹ سکریٹری (اعزازی)

بقیہ: تبصرہ کتب . . .

معصومہ اور اشوک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دوسرے وہ بوڑھے کردار جنہوں نے مغربی تہذیب سے مفاہمت کرلی ہے کیوں کہ وہ جان چکے ہیں کہ اب ان کی تہذیبی رسوم و روایات میں دم خم باقی نہیں رہا اور زندہ رہنے اور زندگی گزارنے کے لیے مغربی طرز زندگی سے مفاہمت ہی بھلی ہے۔ تیسرے وہ کردار ہیں جو اب تک اپنی تہذیبی روایات کے جال میں پھنسے ہیں لیکن انہیں بھی اس بات کا احساس ہو چلا ہے کہ ہماری تہذیبی روایات اور انداز فکر نئی زندگی کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔

اس مجموعے کے افسانوں کا بیانیہ انداز قاری کو افسانے کے اختتام تک پہنچنے پر مجبور کرتا ہے۔ جگہ جگہ نفسیاتی اصطلاحوں کی بھرمار نظر آتی ہے جو مصنف کی مجبوری بھی ہو سکتی ہے۔ اس مجموعے کے افسانوں میں افسانہ نگار نے شاعری کا بھی استعمال خوب صورت تخلیقی انداز میں کیا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ افسانوں کے بیچ بیچ میں آنے والی یہ نظمیں اور غزلیں خود مصنف ہی کی تخلیق ہیں۔

ہاں! ہجری ادب سے یہ افسانوی مجموعہ اس اعتبار سے بھی مختلف ہے کہ اس میں ناسٹیلجیائی کیفیت نہیں کیونکہ افسانہ نگار کو ذاتی اور اجتماعی طور پر مختلف روایات اور طرز زندگی کے خوش گوار امتزاج کے امکانات روشن نظر آتے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے اس افسانوی مجموعے میں مصنف عورتوں کی آزادی، نئے ماحول سے ہم آہنگی، نئی زندگی کے تقاضوں جیسے اہم مسائل پر اپنے واضح نقطہ نظر کے ساتھ اظہار خیال کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

ملکیت ماہنامہ "انشاء" سے
متعلق ضروری تفصیلات بمطابق فارم نمبر ۴

۱۔ مقام اشاعت ـــــ کلکتہ
۲۔ وقفہ ـــــ ماہنامہ
۳۔ پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر ـــــ ف۔ س۔ اعجاز
۴۔ قومیت ـــــ ہندوستانی
۵۔ پتہ ـــــ ۲۵، کاکی سیل اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳

میں ف۔ س۔ اعجاز اعلان کرتا ہوں کہ درج بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط ف۔ س۔ اعجاز

شہناز مزمل
125 F.Model Town. Lahore

موم کے سائبان

سکوتِ شام میں بجتی ہوئی گھنٹی کی آوازیں
افق میں ڈوبتے سورج کی سرخی
فضا میں تیرتے بادل کے ٹکڑے
اور بدلتی رت کی خوشبو
وہی منظر
کسی سپنے کی صورت آنکھ کی پتلی میں رہنے دو
ہجوم بیکراں ہے
کوئی سمجھا ہے نہ سمجھے گا
کسی برگد کا دکھ
اور ڈار سے بچھڑی ہوئی ایک کونج کی لمبی اڑانوں کو
کہ سب کے سب تو خود کھوئے ہوئے ہیں
اور اپنی ان چمکتی تیز آنکھوں کو چھانوں پر سجایا ہے
تو یوں تاریکیاں اندر ہی اندر بڑھتی جاتی ہیں
سلاسل یاس کے پھیلے ہوئے ہیں
سمندر دور، دریا دور، بادل دور ہیں جاناں
کڑی ہے دھوپ منزل بے نشاں ہے
کسی دیوار کا سایہ
کوئی بارانِ رحمت کی ردا سر پر نہیں ہے
کہ جتنے سائباں ہیں سب کے سب ہیں موم کے جاناں
ہجوم بیکراں ہے
اور اب ان سائبانوں میں
جو جلتی آگ سے قطروں کی صورت بہہ رہے ہیں
اماں کس کو ملے گی
کون ٹھہرے گا یہاں
ہجوم دہر کو کیا ہو گیا ہے
کہ ہر اک آرزو کو جستجو کو ختم کر کے
اپنی آنکھوں کو چھانوں پر سجایا ہے

ساجدہ زیدی (علی گڑھ)

غزل

اک نشترِ نظر کے طلبگار ہم بھی ہیں
دانا ہو تم غموں کے تو غمخوار ہم بھی ہیں
حیراں کھڑے ہوئے انھیں راہوں میں ہیں ہنوز
اے رہروانِ کوچہ دلدار ہم بھی ہیں
دریا سمجھ لیا جیسے نکلا وہی سراب
اک حرفِ تشنگی کے گنہگار ہم بھی ہیں
منہ راہ نہد شوق سے موڑا نہیں ابھی
یاں جرمِ خستگی کے خطاوار ہم بھی ہیں
اس باغ میں کہ زاغ و زغن ہیں امین گل
خاموش دیکھنے کے سزاوار ہم بھی ہیں

کرامت بخاری
۲۷۰-اے۔ فیصل ٹاؤن۔ لاہور

غزل

خواب ذرا سا رہ جاتا ہے
ہاتھ میں کاسہ رہ جاتا ہے
جب رسوائی ہو جاتی ہے
کون شناسا رہ جاتا ہے
ہجر کا درد دلوں میں اکثر
اچھا خاصا رہ جاتا ہے
آگے موج گزر جاتی ہے
ساحل پیاسا رہ جاتا ہے
بربادی کے بعد **بخاری**
ایک دلاسہ رہ جاتا ہے

ڈاکٹر طلعت زریں (دہلی)

غزل

ذہن مدفون ہے لمحات کی تنہائی میں
کون جاتا ہے خیالات کی تنہائی میں

دیدہ و دل کے فسانے تھے بکھرتے ہی رہے
وہ بھی فرسودہ روایات کی تنہائی میں

کتنے غم تھے جنہیں الفاظ کا پیکر نہ ملا
ٹوٹ کر رہ گئے حالات کی تنہائی میں

دھوپ خوشیوں کی تھی جو دل میں سمٹتی ہی رہی
سائے جھکتے گئے دن رات کی تنہائی میں

آپ کی سادہ نگاہی کا نہیں کوئی جواب
اک نہ اک بات ہے ہر بات کی تنہائی میں

صبح سے پہلے ہی مٹ جائیں گے خوابوں کے نقوش
چاندنی ڈوب گئی رات کی تنہائی میں

ٹوٹ کر جیسے ستارہ کوئی گم ہو زریں
دل ہے یوں ارض و سماوات کی تنہائی میں

علی اصغر
16-8-51 Chanchalguda
Hyderabad 500024

مجھے اپنے غم کا شعور ہے

مجھے اپنے غم کا شعور ہے
جو مری نگاہ سے دور ہے

کبھی ایک جذبہء رائیگاں
کبھی ایک وسعت لامکاں

کبھی جستجو میں رچا بسا
کبھی آرزو میں گھلا ہوا

کہیں ایک وحشتِ قفس نما
کہیں اک دریچہ کھلا ہوا

مجھے اپنے غم کا شعور ہے
مرا غم ہے شاید اک آئینہ

جو بتا رہا ہے غبار سا
مری زندگی کا اتا پتا

مجھے روز و شب کی خبر تو ہے
مرے آنسوؤں میں اثر تو ہے

اختر ضیائی
(لندن)

غزل

غم میں ڈوبے خوشی کو بھول گئے
ایسے روئے ہنسی کو بھول گئے

زندہ رہنا ہی بس غنیمت تھا
لوگ زندہ دلی کو بھول گئے

چشم شبنم نے اشک برسائے
پھول خندہ لبی کو بھول گئے

مرگ سامانیوں میں گم ہوکر
بے بصر زندگی کو بھول گئے

رونق کائنات تھی جس سے
حیف ہم آدمی کو بھول گئے

داغ بے مائگی تو مٹ نہ سکا
اہل دل سرکشی کو بھول گئے

کتنی دلچسپ بھول تھی اختر
ہم یہ سمجھے کسی کو بھول گئے

ماضی کی موت

مہتاب عالم اعظمی (قیام محل)
اسٹیشن روڈ۔ پوسٹ آفس براکر
ضلع بردوان (ویسٹ بنگال) ۷۱۳۳۲۴

موت کا سناٹا بہت خوفناک ہوتا ہے نا۔ بس کچھ ایسا ہی سناٹا چھا گیا تھا تمہارے جانے کے بعد۔ تم نہیں تھے تو بے بسی کے احساس نے میرا انگ انگ دبوچ لیا تھا۔

کسی کے الفاظ کانوں میں گونجتے رہے اور اس نے سائیکل دائیں جانب گھمالی۔ سڑک مڑتے ہی اس نے میل کا پتھر دیکھا۔ اودھم پور ابھی پانچ میل تھا۔ دور دور تک پھیلے ہرے بھرے کھیتوں کو دیکھا تو اسے محسوس ہوا جیسے بھٹوں کے پودوں میں سرسراہٹ ہو رہی ہے۔ اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا نام ہوا میں اچھالا ہے اس کے پاؤں تیز تیز چل رہے تھے۔ سائیکل کے پہیے گھوم گھوم کر فاصلہ طے کر رہے تھے۔ اس کا جی چاہا جواب میں "ہاں ...." کہدے۔ اسی طرح جیسے برسوں پہلے کیرتی کی آواز سن کر کہا تھا۔

لیکن اب وہ کیرتی کہاں؟ وہ کیرتی تو نہ معلوم کہاں گم ہو گئی جو اس کی آواز سن کر گھر سے بھاگ آیا کرتی تھی۔ وہ اپنے گھٹنوں پر سر رکھ کر، بڑ کے قدیم درخت کے نیچے، دیر تک الٹی سیدھی باتیں کرتی رہی تھی۔ وہ بکریاں لے کر کھیتوں کی طرف جاتا تو وہ بالٹی اٹھا کر چکنی مٹی لینے کے بہانے سے چلی آتی تھی۔ اس کے الغوزے کی دھن پر مست ہو کر ناچتی تھی پھدکتی تھی، ننھی ننھی چوڑیوں سے ہوڑ لے کر۔ ایک لمحے کے لئے اسے محسوس ہوا جیسے بہت کچھ بدل گیا ہے۔ وقت کا چکر چلتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حالات تغیر پذیر ہوتے رہتے ہیں، زندگی کے طور بدلتے رہتے ہیں۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ بچہ جوان ہو جاتا ہے، جوان بوڑھا ہو جاتا ہے اور بوڑھے اپنی باتیں چھوڑ کر مٹی کی آغوش میں سو جاتے ہیں۔ وہ خود بھی تو کتنا بدل گیا ہے۔ پہلی بار پینٹ پہننے سے اس کی کمر درد کرنے لگی تھی۔ لیکن آج اگر وہ لنگی پہن لے تو شاید اس میں الجھ کر دو قدم بھی نہ چل سکے۔ چماری کا بنایا دیسی چپل پہن کر شاید اسے پاؤں کا آپریشن کرانا پڑے۔

پھر اسے محسوس ہوا کہ جو کچھ وہ سوچ رہا ہے وہ سب بکواس ہے۔ وہ قطعاً نہیں بدلا ہے۔ اس کی آتما وہی ہے۔ وہ اب بھی دیسی جوتا پہن سکتا ہے۔ لنگی پہن کر، کمر میں الغوزہ ٹھونس کر، اب بھی بکریوں کا ریوڑ چرانے لے جا سکتا ہے۔ ایم۔ اے پاس کر لینے پر بھی اس کی آتما میں ذرا سی تبدیلی بھی نہیں آئی ہے۔ آتما میں تبدیلی آ گئی تو کیا وہ برسوں پرانی ان یادوں کو یونہی سینے سے لگائے پھرتا؟ کیا وہ آج رنگتی چھکڑا اتی بس میں سوار ہو کر راج گڑھ پہنچتا اور وہاں سے کرایہ کی سائیکل لے کر اودھم پور کے اس دھول بھرے راستے پر گامزن ہوتا؟

کیرتی سے اس کا کون سا رومانس تھا۔ کیرتی۔ جو دستخط کرنے کے بجائے انگوٹھے کی چھاپ لگاتی ہے۔ جو اپنے نام کا مطلب "کیرتی" یعنی محنت کش سمجھتی ہے۔ جو مہاپاس کو شطرنج کا مہرا، شیکسپیئر کو شخص بیمار اور کالیداس کو کام کرنے والا بتاتی تھی۔ جو پنت کو کسی ڈیرے کا سنت سمجھتی تھی۔ ایسی لڑکی اس کی محبوبہ کیسے ہو سکتی تھی؟ بدل ہی گیا ہوتا تو اپنی ہم جماعت لڑکیوں سے لٹریچر پر گفتگو کرتے ہوئے یہ نہ بتاتا کہ میری ایک دوست ہے جس سے میں نے پوچھا کہ مہاپاس، شیکسپیئر، کالیداس، پنت کسی کو پڑھا ہوگی؟ تو کہنے لگی۔ "ان کا کیا مطلب ہوا جی؟" میں نے کہا تم بتاؤ تو؟" اور اس نے

بتایا .... اور پھر کانتا اور شیلا کے یہ پوچھنے پر کہ تمہارا ذہنی معیار اتنا پست کیوں ہے، وہ ہنس کر یہ نہ کہتا کہ تم سب پڑھی لکھی لڑکیاں مل کر بھی ایک کیرتی نہیں بن سکتیں۔

اودھم پور سے راج گڑھ کی طرف جاتے ہوئے دو ایک لوگوں نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ لیکن وہ انھیں نہیں جانتا تھا۔ اس نے سوچا ان ناواقف لوگوں نے اس کو نہیں اس کے لباس کو غور سے دیکھا ہے۔ لیکن کیا لباس کے بدل جانے سے ہی انسان بدل جاتا ہے؟ کیا تغیر کے لئے آتما کا بدلنا ضروری نہیں ہے؟ کیا گاندھی کی آتما تب زوردار ہو سکتی تھی جب انھوں نے پینٹ کوٹ پہننا ترک کر دیا تھا؟ کیا جواہر لعل پینٹ کوٹ پہن کر روحانی قوت سے محروم ہو جاتے تھے؟ کیا پریم چند کوٹ پینٹ پہن کر "گئو دان" کی تخلیق نہیں کر سکتے تھے؟ لباس سے آتما کا کیا رشتہ ہے؟ لباس تو انسان کی مجبوری ہے۔ جس سماج میں وہ آج کل رہتا ہے، وہاں گنجی اور لنگی سے کام نہیں چل سکتا۔ وہاں یہی سب پہننا پڑتا ہے، جو اس نے اس وقت پہن رکھا ہے۔

لیکن اودھم پور امیر نگر نہیں ہے نا۔ امیر نگر کے تو ذرے ذرے سے اس کی آشنائی تھی۔ وہاں کی مٹی میں کھیل کر تو وہ پروان چڑھا ہے۔ وہیں کیرتی پیدا ہوئی تھی۔ اس گاؤں کی دھول میں کھیلتے ہوئے ان دونوں کے اندر ہونے والے "کچھ" نے جنم لیا تھا۔ وہاں کی بات اور تھی۔

لیکن کیرتی کا سسرال کیرتی کا مائیکا نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنے سسرال میں نہ جانے وہ کیسے رہتی ہوگی۔ اگر لباس کا بدل جانا ہی تبدیلی کی علامت ہے تو شادی کے بعد تو کیرتی کا لباس یکسر بدل گیا ہو گیا۔ کالے رنگ کی شلوار اور بڑے بڑے پھولوں والی قمیض وہ اب نہیں پہنتی ہوگی۔ اب تو وہ تڑک بھڑک والے کپڑوں کے علاوہ زیوروں سے بھی لدی رہتی ہوگی۔ کانوں میں کلیاں لٹکانے والی کیرتی اب لمبے لمبے کانٹوں کا بوجھ اٹھانے لگی ہوگی اور سب سے بڑی بات .... وہ اب ماں بن گئی ہوگی۔

گاؤں میں داخل ہوتے ہی اس نے ایک آدمی سے سوہن لال کا مکان معلوم کیا۔ یہ بمبئی نہیں تھا کہ بتانے والا "دائیں بازو" کہہ کر بھیڑ میں گم ہو جاتا۔ یہ تو اودھم پور تھا۔ ہندوستان کا ایک گاؤں۔ بتانے والے نے اشتیاق سے اتنا ضرور پوچھا۔ "کیا آپ شہر سے آئے ہیں"۔ اور پھر وہ خود اسے سوہن لال کے گھر تک پہنچا آیا۔

کیرتی ڈیوڑھی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ننھا بچہ اس کی گود میں کلکاریاں بھر رہا تھا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"ہیلو کیرتی"۔ کیرتی نے تیزی سے سر سے ڈھلکا دوپٹہ درست کیا اور اٹھ کھڑی ہو گئی۔

"حیران ہو گئی ہو نا، مجھے یہاں دیکھ کر؟"۔ "اور تو کیا"۔ "کیرتی بہت جی چاہتا تھا تم سے ملنے کو، بس چلا آیا"۔

"بہت اچھا کیا"۔ کہہ کر کیرتی نے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ "آؤ اوپر چلیں"۔ اور وہ اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ بغل کی کوٹھری میں ایک کھانستی ہوئی ضعیف آواز آئی۔ "کون آیا ہے بہو؟"۔ مشین کی طرح کیرتی نے اس آواز پر گھونگھٹ نکال لیا۔ اور گھونگھٹ ہی میں سے جواب دیا۔ "میرے گاؤں سے آیا ہے"۔ اس کے بعد کوئی آواز نہیں لوٹی۔ کیرتی نے اطمینان کی سانس لی۔ سیڑھیاں ختم کرکے اس نے گھونگھٹ کے لئے ماتھے پر کھنچا پلو پیچھے کر دیا۔ کھاٹ پر بیٹھتے ہی اس نے کہا "بیٹھو نا کیرتی"۔ "بیٹھتی ہوں"۔ کہہ کر بھی وہ کھڑی رہی۔

امیر نگر میں جگن ماما کی چوپال پر جب وہ کھٹیا پر لیٹا ہوتا تو کیرتی اسے ایک طرف کو دھکیل کر دھم سے بیٹھ جایا کرتی تھی اور کہا کرتی تھی۔

"باپ والی کھٹیا ہے رے۔ ساری روک بیٹھے ہو"۔ اور آج کیرتی اس تذبذب میں ہے کہ جس چارپائی پر سدھیر بیٹھا ہے، اس پر بیٹھے یا نہیں۔

سدھیر نے کہا۔ "کیرتی کچھ بات کرو نا۔ میں تمہاری باتیں سننے آیا ہوں۔ چاہتا ہوں آج تم جی بھر کر باتیں کرو اور میں سنتا رہوں۔ تھوڑی دیر ان لمحوں میں جینا چاہتا ہوں جو پر لگا کر اڑ گئے ہیں۔ وہ لمحے، جن میں تم تھیں، میں تھا، ہماری بے سر پیر کی باتیں تھیں۔ کیرتی زندگی کیا سے کیا ہو گئی ہے۔ تمہیں کبھی میری یاد بھی آتی ہے؟"۔

کیرتی اسے دیکھ رہی تھی۔ دیکھتی رہی۔ کاندھے سے لگا بچہ اس کے دوپٹے میں ٹنکے ستاروں سے کھیلتا رہا۔ سدھیر کہہ رہا تھا "کیرتی تمہیں دیکھنے کو

آنکھیں ترس گئی تھیں، تمہاری آواز سننے کو کان ترس گئے تھے، تم ....؟"

سیڑھیوں میں کسی کے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ کیرتی دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ سدھیر کے منہ کا جملہ منہ میں ہی رہ گیا۔

چڑھنے والے نے سیڑھیوں میں ہی سے پکارا۔ "کون آیا ہے بہو؟" کیرتی کی ساس پوچھ رہی تھی۔ کیا جواب دے کیرتی کیا بتائے کسی کو کہ آنے والا اس کا کون ہوتا ہے۔ کس رشتے کا نام دے وہ۔ اس سے اپنے تعلقات کو۔ ہوتا تو کچھ نہیں ہے وہ لیکن ہے اپنا۔ سر سے پاؤں تک [illegible] مگر یہ کسی سے کہا تو نہیں جاسکتا۔

ساس کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کیرتی ایک دم سنبھل گئی۔ بچے کو اوپر کی طرف اچھالتے ہوئے اس نے کہا۔ "دادی سے کہو ہمارے ماما آئے ہیں"۔ دادی نے اور کچھ دریافت نہ کیا۔ سدھیر کے سر پر ہاتھ پھیر کر وہ اس کے قریب اس چارپائی پر بیٹھ گئی۔ خیر خیریت ضرور پوچھی۔

سدھیر نے محسوس کیا کہ اس بڑھیا کی موجودگی میں وہ کیرتی سے کوئی بات نہیں کر پائے گا۔ کیرتی کوئی بات نہیں کرے گی۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کی ناکام کوشش ضرور کرتی رہی۔ کیرتی کی نند چائے دے گئی۔ سدھیر کو پینا پڑی۔ ساس کو وہاں سے اٹھنا تھا نہ اٹھی۔

بہت دیر تک سدھیر منتظر رہا کہ بڑھیا اٹھ جائے۔ پھر وہ خود اٹھ کھڑا ہوا۔ ان لوگوں کے اصرار کے باوجود اٹھ کھڑا ہوا۔ جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اس نے بچے کی طرف بڑھایا تو کیرتی کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ بھرے گلے سے سدھیر نے کہا۔ "تمہیں تو نہیں دے رہا کیرتی۔ اپنے بیٹے کو دے رہا ہوں"۔ اور ساس نے بیچ بچاؤ کرتے معصوم بچے سے کہا۔ "لے لو بیٹا، ماما جی دے رہے ہیں"۔

کیرتی کے مکان سے نکل کر اس نے سائیکل اٹھائی اور تیز تیز چلانے لگا۔ گاؤں کی حدود سے باہر نکل کر اس نے سائیکل کی رفتار دھیمی کی اور مڑ کر ایک نظر گاؤں کو دیکھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے یہ بھرا پورا گاؤں ایک مقبرہ ہے جس میں کیرتی دفنا دی گئی ہے اور مری ہوئی کیرتی کے آس پاس بھوت رہتے ہیں۔

غزلیں

یوگیندر پال [illegible]

293-New Plots Jammu

مرا قلم بھی ہے ساکت، زباں بھی پتھر ہے
جو روبرو ہے، بڑا ہولناک منظر ہے

مرا وجود ہے چھلنی مرے ہی تیروں سے
مرا بدن مرے اپنے ہی خون سے تر ہے

نہ کوئی شاخ ہری ہے، نہ پیڑ ہے سرسبز
بدل نہ جائے خرابے میں گلستاں، ڈر ہے

کسے ہے [illegible] عالمِ وحشت میں آگہی اتنی
رقیب کون ہے اور کون حملہ آور ہے

جو بے قصور ہدف بن گئے تشدد کا
ذرا یہ سوچیے، خون ان کا کس کے سر پر ہے

جو گلستاں کا نہیں، اس کا خیر خواہ نہیں
اسی کی بات یہاں آج کیوں موثر ہے

یہ سر زمیں مرا کشمیر ہو نہیں سکتی
نہ کھیت میں کوئی نغمہ سرا نہ کیسر ہے

سوا قفس کے تیرا ہے ہی کون اے طائر
یہ آسرا بھی نہ چھن جائے۔ مجھ کو یہ ڈر ہے

تنویر شاہد محمدزئی

دائرہ دین پناہ

ضلع مظفر گڑھ۔ صوبہ پنجاب (پاکستان)

سینے میں دفن کر دیئے ہیں وحشتوں کے راز
کھلتے کسی پہ کیسے گھنے جنگلوں کے راز

شاید کہیں پہ قتل کوئی بے گنہ ہوا
کچھ لوگ جانتے ہیں ابھی آندھیوں کے راز

جس نے مرے وجود کو سورج کی آگ دی
اب مجھ سے پوچھتا ہے وہی پانیوں کے راز

کچھ لوگ میرے شہر تک آ کر پلٹ گئے
کچے گھروں میں رہ گئے کچے گھروں کے راز

نیلے سمندروں میں پڑے پتھروں کے پاس
کچھ کشتیوں کے راز تھے، کچھ ساحلوں کے راز

ہر شخص اپنی ذات کے ملبے میں دب گیا
تنویر کون جانتا ان زلزلوں کے راز

انجام کی خبر

ریکھا جین
معرفت گھاشی لال جین
پانچی پاڑہ (مغربی بنگال) ۷۴۳۲۰۸

انسانی سماج میں صدیوں سے کچھ ایسی غیر فطری باتیں ہوتی چلی آرہی ہیں جنہیں ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ ایسا ہی کچھ پاروتی کے ساتھ بھی ہوا ہے جس کا ان کے ذہن میں آنا بھی برا لگتا ہے۔ یہ تو طے ہے کہ پاروتی جی نے زندگی سے بہت کچھ سیکھا اور انہیں انوکھے تجربے بھی ہوئے۔

"پاروتی" ان کے شوہر نندلال جی نے آواز لگائی۔

"کیا ہوا؟"

"مجھے تیار ہوئے کتنی دیر ہو گئی پر ابھی تک ناشتے کا کوئی پتہ نہیں"

"میں نشا کو تیار کر رہی ہوں۔ آخر اسے بھی تو اسکول جانا ہے۔ اپنی پیاری نشا پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بنے گی۔ کیوں نشا ہے نا؟"

"جی ممی! ڈاکٹر انکل کتنے اچھے ہیں میں بھی ان کی طرح ڈاکٹر بنوں گی"۔ نندلال جی بیچ میں ٹپک پڑے۔ "ہاں بھئی! میں بھی ڈاکٹر بننے چلا تھا لیکن ہو گیا ایک کلرک"

نندلال جی ویسے تو ایک کلرک ہیں پر ان کی زندگی میں ایک ہی خواہش تھی کہ وہ ایک ڈاکٹر بنتے۔ نندلال جی جب میڈیکل کے لئے تیاری کر رہے تھے اسی وقت ان کے والد گزر گئے اور انہیں کلرک کی نوکری کر لینی پڑی۔ آج بھی اگر کوئی دلچسپی سے ان سے پرانی باتوں کی پوچھے تو وہ فخریہ انداز میں اپنا سارا قصہ کہہ ڈالتے ہیں۔ اور اس شخص کو اپنا خیر خواہ سمجھنے لگتے ہیں۔ کچھ اسی طرح سے چوبے جی سے ان کی دوستی ہوتی ہے۔ چوبے جی ایک ادھیڑ عمر شخص ہیں، بچوں سے انہیں خاصہ لگاؤ ہے۔ ان کا بچوں سے اس طرح گھلنا ملنا عجیب سا لگتا ہے۔ گرچہ چوبے جی کسی پارٹی کے کارندے ہیں لیکن نندلال جی سے ان کی خوب بنتی ہے۔ چوبے جی طبیعت شناس انسان ہیں جو زیادہ تر باتوں میں نندلال جی سے گزشتہ دنوں کی باتیں ہی کرتے۔ "یار نند یہ زندگی بھی عجیب ہے دیکھو نا آج تم اور میں دوست ہیں۔ یہ تو تمہارے پتاجی وقت سے پہلے چل بسے ورنہ تم تو کسی ہسپتال کے سرجن ہوتے"۔ نندلال اندر ہی اندر خوش ہوتا ہے اور غم زدہ لہجہ میں اپنی بد نصیبی کو کوستا ہے۔ "یار چوبے! انسان تو سوچتا بہت ہے پر ہوتا وہی ہے جو بھاگیہ میں لکھا ہوتا ہے خیر چھوڑو یہ سب چلو چائے پیتے ہیں"۔ اور دوسرے ہی پل نندلال جی کو لے کر گھر آتے ہیں۔ چوبے جی چونکہ بچوں کے چاہنے والے ہیں ان کی دوستی گیارہ، بارہ سال کی نشا سے ہو جاتی ہے۔ اب وہ اکثر بن بلائے نندلال جی کے گھر آجاتے ہیں اور نشا کو گود میں لے کر اس کی پڑھائی پر باتیں کرتے ہیں اور نشا کی تعریف کرتے ہیں۔ کسی بات پر وہ کہتے ہیں "ارے ہماری نشا تو بہت ہی ذہین اور سمجھدار ہے"۔ باتوں باتوں میں وہ نشا کو چومتے ہیں اور ایسے سہلاتے ہیں گویا نشا ایک بچی نہ ہو۔ یہ سب دیکھ کر پاروتی کو بہت غصہ آتا ہے پر وہ اپنے غصے کو قابو میں رکھتی ہے اور پھر بعد میں نندلال جی سے اس کی شکایت کرتی ہے۔

"اجی مجھے چوبے جی کا یہاں بار بار آنا کچھ ٹھیک نہیں لگتا"۔

"کیوں بھئی اس میں برائی کیا ہے"۔ نندلال جی بولے۔

"دیکھو جی مجھے ان کا یہاں اس طرح آنا اچھا نہیں لگتا، آپ کو پتہ نہیں دنیا میں کیسے کیسے لوگ بستے ہیں، کتنے معزز دکھنے والے بھی کتنی گندی فطرت کے ہو سکتے ہیں آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے"۔

"چوبے جی کی فطرت میں تمہیں کیا نقص نظر آیا۔ یہی نا کہ وہ نشا کو دلار کرتا ہے۔ یہ تو انکا پیار ہے وہ نشا کے کیریر سے متعلق کتنا سوچتے ہیں معلوم ہے"۔

"دیکھئے آپ برا نہ مانیں۔ آپ بہت بھولے ہیں، چوبے جی کا اس طرح آنا نشا کے کیریر کی تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ اور میں نہیں چاہتی کہ نشا بھی میری طرح کلرک کی بیوی بن کر زندگی گزارے، وہ اپنی زندگی جئے گی، ایک ڈاکٹر بن کر، یہی میری زندگی کا مقصد ہے۔"

"دیکھو بھئی اب تم جیسا ٹھیک سمجھو میں نے تو زندگی کو ٹھیک سے نہیں سمجھا، مجھے تو بس اپنی لڑکی کا روشن مستقبل چاہیے"۔

پاروتی جی نے بھی اپنے لئے کچھ خواب دیکھے تھے۔ وہ سب کچھ کیسے بھلا سکتی ہیں۔ پیار سے سبھی انہیں "پارو" ہی تو کہتے تھے۔ ان کے ہاں ماسٹر انکل رہتے تھے جو گھر بار چھوڑ کر یہاں ماسٹری کرتے تھے۔ ہمیشہ پارو کے لئے چاکلیٹ، بسکٹ اور مٹھائیاں لاتے تھے اور گود میں بٹھا کر کھلاتے تھے۔ پاروتی کافی ذہین تھیں۔ انہیں بچپن سے ہی ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ بات بات پر ماسٹر انکل اس کی ذہانت کی تعریف کرتے اور چوما کرتے تھے۔ پارو کو یہ اچھا نہیں لگتا تھا پر کمسنی تو کمسنی ہوتی ہے چونکہ ماسٹر صاحب عمر دراز تھے وہ کچھ کہہ بھی نہ پاتی تھی اور پھر اپنی تعریف اچھی لگتی تھی۔ انسانی فطرت تو عادات کی غلام ہوا کرتی ہے۔ پارو کو بھی ان سب کی عادت پڑ گئی۔

اب پارو ماسٹر انکل کے نہ بلانے پر بھی ان کی گود میں جا بیٹھتی تھی۔ اس طرح وہ بڑی ہوتی چلی گئی اور پڑھنے لکھنے میں اس کا دھیان گھٹتا گیا۔ اب تو وہ لڑکوں سے بھی دوستی کرنے لگی تھی۔ گھر، پڑھائی یہ سب اسے بوجھ سا محسوس ہونے لگا تھا اب میڈیکل کی تیاری سے اسے خوف سا ہو گیا تھا۔ پارو کے پتاجی ایک عزت دار اور دھنی شخص تھے۔ انہیں زندگی کا تجربہ تھا۔ اپنی بیٹی کے لچھن انہیں کچھ اچھے نہیں لگے۔ اس نے پاروتی کی پڑھائی ڈراپ کروادی اور اپنی مان مریادہ کی خاطر کم عمر میں اس کی شادی کردی۔

"پاروتی"

"جی" وہ چونکی

"کیا سوچ رہی تھی۔؟"

کچھ نہیں، بس نشا کی سوچ رہی تھی کہ اسے کس طرح سے آئیڈیل بنایا جائے۔

"بیٹے نشا سنو" پاروتی جی نے کہا

شام کا وقت تھا ماں اپنی بیٹی کو دنیا کی کچھ باتیں سمجھا رہی تھی۔

"دیکھو بیٹی دنیا میں کوئی کسی کو بے غرض کچھ نہیں دیتا، ہم تمہیں اس لئے پیار کرتے ہیں کیونکہ تم ہماری اچھی بیٹی نشا ہو اور پڑھا اس لئے رہے ہیں کہ تم ڈاکٹر بنو اور ہمارا بہت نام ہو، اب اگر کوئی آدمی تمہیں، ہم لوگوں سے زیادہ پیار دے تو ضرور اس کا کوئی مطلب ہوگا۔ ہے کہ نہیں؟

"جی ممی"

"اب دیکھو تمہارے چوبے انکل تمہیں روز چاکلیٹ وغیرہ لادیتے ہیں جب کہ وہ ہمارے صرف پہچان کے ہیں۔ اب تم پڑھائی لکھائی چھوڑ کر ان کی گفتگو سنتی رہتی ہو۔ لیکن بیٹے ڈاکٹر بننا اتنا آسان نہیں ہے اس میں بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ اپنا سارا وقت لگا دینا پڑتا ہے۔ اب تمہیں کیا کرنا ہے۔ کیسے کتنا وقت دینا ہے، ہم تم پر چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ زندگی کے ہر قدم پر فیصلہ تمہیں ہی تو کرنا ہے"۔

دوسرے ہی پل چوبے جی حاضر ہوتے ہیں اور نشا کو پکارتے ہیں۔

"انکل جی میں تو پڑھ رہی ہوں آپ ممی سے باتیں کیجئے نا پلیز" ۔ نشا اپنے ریڈنگ روم سے جواب دیتی ہے۔

انشاء
کا
اسکنڈے نیویائی ادب نمبر

ایک تاریخ ساز ضخیم شمارہ

جس میں براعظم اسکنڈے نیویا کے اصل اردو ادب اور اصل علاقائی ادب کے اردو تراجم بہت نئے اور منفرد انداز سے پیش کیے گئے ہیں۔

قیمت : اندرون ملک .. ۳ روپے

بیرون ملک .۳ امریکی ڈالر

یا ۲۰ برطانوی پونڈ

ماہنامہ انشاء کلکتہ

غزلیں ـــــ شہود عالم آفاقی کلکتہ

○

بے ربط سے الفاظ لئے سر پہ کھڑے ہیں
غالب سے بھی اس دور کے فنکار بڑے ہیں
ساحل پہ یہ ٹوٹے ہوئے تختے جو پڑے ہیں
ٹکرائے ہیں طوفاں سے تلاطم سے لڑے ہیں
دل اپنا جلاؤ شب ظلمت کے حریفو
کیا غم جو چراغوں کے اگر قحط پڑے ہیں
چڑھنے دو ابھی اور ذرا وقت کا سورج
ہو جائیں گے چھوٹے ہی سائے جو بڑے ہیں
جن لوگوں نے کاٹے ہیں گلے لوٹے ہیں گھربار
انصاف بھی کرنے کو وہی لوگ کھڑے ہیں
یوں تکتے ہیں نفرت کی نظر سے ہمیں کچھ لوگ
اس شہر میں جیسے کہ یہی سب سے بڑے ہیں
منزل سے پلٹ آئے ہیں ہم اہل محبت
جو سنگ ہدایت تھے وہ رستے میں کھڑے ہیں
ہیں مسخ شدہ چہرے شہود آپ سے برہم
آئینہ صفت آپ مقابل جو کھڑے ہیں

○

سب کے دل میں سمانا نہیں چاہیے
خود کو قصہ بنانا نہیں چاہیے
آپ ہی کے لئے کوئی برباد ہے
آپ کو مسکرانا نہیں چاہیے
ہم پہ ظاہر ہوا ڈوب جانے کے بعد
ڈوبتے کو بچانا نہیں چاہیے
ریڑھ کی ہڈیاں تک چٹخنے لگیں
خود کو اتنا جھکانا نہیں چاہیے
ہم نے جانا پتنگوں کے انجام سے
روشنی میں نہانا نہیں چاہیے
زلزلے سانس لیتے ہیں زیرِ زمیں
گھر زمیں پر بنانا نہیں چاہیے
جس جگہ جا کے انسان چھوٹا لگے
اس بلندی پہ جانا نہیں چاہیے

مستشرقین۔تعارف وکارنامے

نسیم قمر ندوی
آسنسول

مستشرقین (Orientalists) کا اطلاق عام طور پر ان غیر مسلم اہل علم پر ہوتا ہے، جن کو علوم مشرقیہ (Oriental Studies) پر دسترس حاصل ہو۔ مفکر اسلام سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے الفاظ میں: "مستشرقین عمومی طور پر اہل علم کا وہ بدقسمت اور بے توفیق گروہ ہے، جس نے قرآن وحدیث، سیرت نبوی، فقہ اسلامی اور اخلاق وتصوف کے سمندر میں بار بار غوطے لگائے اور بالکل خشک دامن اور تہی دست واپس آیا۔ بلکہ اس سے اس کا اعتقاد، اسلام سے دوری اور حق کے انکار کا جذبہ اور بڑھ گیا"۔

مستشرقین نے اسلامی علوم کے تقریباً ہر پہلو سے بحث کی ہے، مثلاً تفسیر قرآن، فقہ وکلام، سیرت نبوی، صحابہ کرام، تابعین، ائمہ مجتہدین، محدثین وفقہاء، مشائخ وصوفیہ، اخلاق وتصوف، رواۃ حدیث، تدوین حدیث، فقہ اسلامی کے ماخذ، فقہ اسلامی کا ارتقاء، عربی لغت کی تحقیق وترتیب وغیرہ موضوعات پر مستشرقین کی تحقیقات کا کافی ذخیرہ موجود ہے، اگرچہ ان کی تحقیقات اور تحریروں میں اتنا تشکیکی مواد پایا جاتا ہے کہ ایک ذہین اور حساس آدمی کو جو ان موضوعات پر وسیع اور گہری نظر نہ رکھتا ہو، پورے اسلام سے منحرف اور برگشتہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا اعتراف بھی کرنا پڑتا ہے کہ بہت سے نادر ونایاب نسخے اور مخطوطے مغربی مستشرقین کی ہمت اور ان کی کاوشوں کے نتیجہ میں پردہ خفاء سے نکل کر منظر عام پر آئے، جو کم ہمتی اور بے توجہی کی وجہ سے اب تک شائع نہ ہوسکے تھے۔

استشراق کی ابتداء کب ہوئی، یہ پتہ لگانا دشوار ہے، ویسے مغرب میں سب سے پہلے اس کی طرف توجہ پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی کے اوائل میں کی گئی جب کہ اسپین (اندلس) علم وفن کا گہوارہ تھا اور اسلامی وعصری علوم کی کرنیں یہاں سے پوری دنیائے مغرب میں پھیل رہی تھیں، اندلس میں اسلامی حکومت کی بالادستی کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب کو بھی آزادی حاصل تھی، جس کی وجہ سے وہاں موجود عیسائی کلیساؤں میں راہبوں کی ایک اچھی تعداد موجود تھی، انہوں نے اسلامی علوم کی طرف توجہ کی اور مختلف علوم وفنون پر عبور حاصل کیا۔

علوم مشرقیہ (Oriental Studies) کی طرف توجہ کرنے والے مغربی علماء کی فہرست میں ہمیں سب سے پہلا نام مشہور فرانسیسی راہب جیربرٹ (Jerbert) کا ملتا ہے، موصوف ۹۹۹ء میں اندلس سے واپسی کے بعد روم کے کلیسا کے پادری مقرر ہوئے۔ بعد میں استشراق ایک فن کی حیثیت سے ابھاگر ہوا، اور بہت سے مغربی اہل علم نے علوم مشرقیہ کی طرف توجہ کی، معقولات ومنقولات ہر طرح کے علم کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا، چونکہ اس وقت مختلف علوم وفنون کے ماخذ اور مصدر کی حیثیت سے معلوم کتابیں عربی زبان ہی میں تھیں، لہذا مستشرقین نے عربوں کے قدیم نسخوں اور مخطوطوں کو خرید کر یا سرقہ کی راہ سے حاصل کر کے اپنے کتب خانوں اور لائبریریوں کو معمور کرنا شروع کیا۔ ڈاکٹر مصطفی سباعی مرحوم کی معلومات کے مطابق جو انہوں نے اپنی کتاب "المستشرقون والاسلام" میں فراہم کی ہیں، انیسویں صدی کے وسط تک پچاس ہزار دو سو [illegible] کا ذخیرہ یورپ کے میوزیم میں جمع ہوگیا۔ جس میں مزید اضافہ جاری ہے۔

مستشرقین کی پہلی کانفرنس [illegible]ء میں منعقد ہوئی اور پھر اس کے بعد مختلف اوقات میں آج تک اس طرح کی مجلسیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔

مستشرقین کی کثیر تعداد یہودی اور عیسائی ہے۔ اس لئے صلیبی جنگوں کے اختتام اور اس میں شکست فاش کے بعد مستشرقین کی سرگرمیوں میں

مزید اضافہ ہوا، جس قوم کو میدان جنگ میں شکست نہ دے سکے اسے اسلام کے اندر خامیاں اور کوتاہیاں دکھاکر اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوشش شروع ہوئی، مگر کچھ ہی دنوں کے بعد مستشرقین کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوا، اسلام کے اندر کیڑے نکالنے کے بجائے (جس کی وجہ سے بعض اوقات ان کے مقصد کے برعکس نتیجہ برآمد ہوتا تھا اور مسلمان اپنے مذہب کے دفاع میں اور بھی مستعد ہوجاتے تھے) انہوں نے اسلام کی نئی تشریح پیش کرنی شروع کی۔ اسلامی اصطلاحات اور عربی اصطلاحات میں فرق کرنا شروع کیا، زمانہ جاہلیت کے ادباء اور شعراء کی قدر دانی کے جذبہ کو ابھاگر کرنا شروع کیا، اور "مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا" کے سچے اصول کو نہایت ہی شاطرانہ انداز سے ٹھکرا کر عرب قومیت کی چنگاری بھڑکانا شروع کی جس کے نتیجہ میں مصر میں "فرعونی"، عراق میں "آشوری"، شمالی افریقہ میں "بربری" اور فلسطین و لبنان کے ساحل پر "فینیقی" تہذیب و تمدن کے احیاء کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ آج بھی شریعت اسلامیہ میں تبدیلی و اضافہ کی آواز جن حلقوں کی طرف سے اٹھائی جارہی ہے یا ماضی قریب میں اٹھائی گئی۔ وہ بیشتر ان ہی مستشرقین کے لگائے ہوئے تشکیک کے باغ کے خوشہ چینوں میں سے ہیں۔

مستشرقین کی اکثریت عربی زبان سے واقفیت رکھتی ہے، اور وہ براہ راست اسلامی علوم کے ماخذ اور بنیادی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں، ڈاکٹر مصطفی سباعی مرحوم مستشرقین سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک یہودی مستشرق کے بارے میں جو آکسفورڈ میں عربی اور اسلامیات کے صدر مقرر تھے، اپنے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "میں نے انہیں دیکھا کہ وہ استشراق کے طلباء کو قرآن مجید کی تفسیر زمخشری کی تفسیر (کشاف) سے نکھار رہے تھے، کیمبرج یونیورسٹی میں علوم مشرقیہ کے صدر مشہور مستشرق آربرے (Arberry) نے عربی ادب میں اختصاص حاصل کیا تھا۔ مانچسٹر میں جس وقت ڈاکٹر سباعی کی ملاقات پروفیسر روبوسن (Roboson) سے ہوئی، اس وقت وہ سنن ابو داؤد کے نسخہ کو ایک قلمی نسخہ مخطوطہ سے ملانے میں مصروف تھے، جامعۃ السلام میں جب ان کی ملاقات بزرگ مستشرق ہنبرج سے ہوئی تو اس وقت وہ "الانتصار لابن الخیاط" کی تصحیح فرمارہے تھے۔

استشراق کے عوامل و محرکات

مغربی اہل علم کو اسلامی علوم کی طرف متوجہ کرنے اور اس تحقیق و مطالعہ پر ابھارنے والے اسباب و عوامل مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) شوق مطالعہ و تحقیق (۲) اقتصادی اغراض (۳) دعوتی مصالح (۴) سیاسی مصالح (۵) جذبہ انتقام۔

شوق مطالعہ و تحقیق :۔ ذاتی طور پر اسلامی علوم و فنون سے دلچسپی اور اس کی تحقیق و مطالعہ کا شوق رکھنے والے بھی بعض مستشرقین گزرے ہیں، جنہوں نے علوم مشرقیہ کی قابل قدر خدمت انجام دی، جس کا اعتراف نہ کرنا اخلاقی بددیانتی ہوگی۔ ذاتی دلچسپی اور شوق کے نتیجہ میں اس راہ میں قدم اٹھانے والے مستشرقین نے دوسروں کی بہ نسبت کچھ کم ٹھوکریں کھائی ہیں، بعض نے تو اپنے غیر متعصبانہ نظریات و خیالات کی وجہ سے اسلام کی حقانیت و معقولیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا اور اسلام کی سرحد میں داخل ہوکر قبول حق کی دولت سے سرفراز ہوئے، مثال کے طور پر مشہور فرانسیسی مستشرق دینیہ کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ موصوف ایک زمانے تک الجزائر میں مسلمانوں کے ساتھ رہے، وہیں اسلام قبول کیا، ان کی مشہور کتاب "أشعة خاصة على نبحوة الاسلام" ہے۔ اسلام پر ہی فرانس میں ان کا انتقال ہوا۔

اقتصادی اغراض :۔ بہت سے مستشرقین اسلامی علوم کو اپنا موضوع محض مالی منفعت اور اقتصادی غرض کی بنا پر بناتے ہیں، اور اس ضمن میں اپنی محنت صرف کرتے ہیں، کیونکہ مشرقی علوم پر اچھوتے انداز میں لکھی گئی کتابیں یورپ میں بہت مقبول ہیں، اس کا اندازہ بمبئی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اے۔ ایم۔ بھٹاچاریہ (A.M.Bhata charya) کے معاملہ سے بھی ہوتا ہے۔ جن کی لکھی ہوئی کتاب "اسلامی قانون اور دستور" پر لندن کی ایک پبلشر فرم نے ۸۰ ہزار امریکی ڈالر ادا کئے۔

دعوتی مصالح :۔ مستشرقین کی کثیر تعداد کلیسا کے پوپ اور پادریوں کی ہوتی ہے، جو عرب ملکوں میں اپنے مذہب کی نشر و اشاعت ک

خاطر عربی سیکھ کر عرب نوجوانوں کو اپنی محنت کا سیدان بناتے ہیں، شروع میں مستشرقین نے اسلام میں نقص اور خامی تلاش کرنے کی کوشش کی، مگر جب خاطر خواہ نتیجہ نہیں برآمد ہوا بلکہ اس کا الٹا اثر پڑتا دکھائی دیا تو انہوں نے اپنی روش تبدیل کی اور اسلام کی نئی تشریح و توضیح شروع کر دی، یہاں میں ہیری گیلارڈ ڈارمن (Harry Gaylord Darmon) کی کتاب سے ایک اقتباس پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ نے اپنے ایک مضمون میں نقل کیا ہے۔ "اصلاحی تحریکیں، دینی تعلیمات کے موجودہ تجربوں کی روشنی میں از سر نو تشریح کرنے کی مخلصانہ کوشش ہوتی ہیں، یا ان کے ذریعہ نئے تجربوں کو دینی تعلیمات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس لئے وہ (مسیحیت کے) ایک مبلغ کے لئے اولین اہمیت رکھتی ہیں، اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہر نئی تحریک جس کو چند خبطی شروع کر دیں وہ اس کا استحقاق رکھتی ہے کہ اس کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے، ہماری مراد ان تحریکوں سے ہے جن کی حیثیت موجودہ زندگی کے سچے دینی اظہار کی ہے، اور جو روزمرہ کے تجربہ کی روحانی تشریح کرنے کی کوشش کرتی ہیں، اور پھیلتی جا رہی ہیں، اور جس میں روحانی قوتیں حقیقت سے نبرد آزما ہیں۔ بہت ممکن ہے اس میں سے کوئی اصلاحی تحریک مسلمانوں کے لئے حضرت عیسیٰ کو سمجھنے کے سلسلے میں بالآخر بڑی اہم ثابت ہو، حتیٰ کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آئندہ چند سالوں میں اسلامی ممالک میں (مسیحی) مبلغ کا اصل کارنامہ مسلمان افراد کی اصلاح و احیاء سے زیادہ خود اسلام کی تجدید و احیاء کا ہے، بہرحال یہ کام کا ایک میدان ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور جس سے غفلت نہیں برتی جا سکتی ہے"۔

سیاسی مصالح :۔ گزشتہ چند صدیوں میں جب یورپ کو سیاسی غلبہ حاصل ہوا تو بہت سے مستشرقین بطور ہراول دستہ (Pioneer) مغربی ممالک کے دست و بازو بن گئے۔ اور اسلامی ملکوں میں رہ کر وہاں کی تہذیب و تمدن، رسم و رواج سے واقفیت حاصل کر کے اپنے حکمراں طبقہ کو اطلاع بہم پہنچاتے تاکہ اس کی روشنی میں اپنے تسلط (Command) کو برقرار رکھنے کی تدبیریں سوچی جائیں اور اس کو بروئے کار لانے کی ترکیبیں اختیار کی جائیں، اسی کے ساتھ ان حالات اور واقعات کا توڑ بھی پیش کیا جائے جس سے ان کی حکومتوں کو ان ممالک میں سامنا کرنا پڑتا ہے۔

جذبۂ انتقام :۔ استشراق کا ایک اہم محرک اسلام کے خلاف عناد و جذبۂ انتقام بھی ہے، خاص کر صلیبی جنگوں کے بعد مستشرقین کے سینوں میں عداوت کی چنگاری شعلہ بن کر بھڑکنے لگی، اور انہوں نے اپنی تحریروں میں زہر اگلنا شروع کیا، آج تک ان کے پیرو اپنے اس مشن میں بڑی تندہی کے ساتھ مشغول ہیں، جن میں مصری مسیحی مستشرق عوریر عطیہ سوریال، جان مائی نارڈ اور اے۔ جے۔ آربرے کے نام سرفہرست ہیں۔

اسلوب و وسائل :۔ مستشرقین جدید اور اچھوتے اسلوب میں اپنی تحقیقات و آراء پیش کرتے ہیں، تاکہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ ان کے سحر میں گرفتار ہو سکے۔ بعض مستشرقین نے گویا اس کام کا بیڑا اٹھا رکھا ہے کہ وہ اسلام کو موجودہ دور میں ان فٹ ثابت کریں، پہلے وہ اسلام کی اور اس کے اصولوں کی اس انداز میں تعریف کریں گے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے پھر اس چالاکی اور ہوشیاری سے اسے ناقص اور لاممکن التنفیذ (Non applicable) ثابت کریں گے کہ اگر مطالعہ وسیع نہ ہو تو قاری حیرانی و بے یقینی کی دلدل میں پھنس جائے، مستشرقین اپنی تحریروں میں اصول استقراء کو بہت کم بروئے کار لاتے ہیں بلکہ وہ پہلے سے اپنے ذہن میں ایک بات طے کر لیتے ہیں پھر اس کی تائید اور دلیل کے طور پر ہر طرح کا رطب و یابس مواد جہاں سے ملے حاصل کر کے پیش کرتے ہیں۔ اکثر وہ فن تشریع اور قانون سازی کے اٹل اصول کے خلاف ایک فرعی اور جزئی واقعہ سے بنیادی اور کلی اصول پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مستشرقین نے اپنی تحقیقات کو پھیلانے اور عام کرنے کی خاطر تنظیمیں بنائیں، اور بہت سے رسائل و مجلات کا اجراء کیا، ۱۸۲۰ء میں پیرس میں مستشرقین کی ایک انجمن قائم ہوئی جس کی نگرانی میں "آسیویہ" نام کا ایک رسالہ جاری ہوا۔ ۱۸۲۳ء میں لندن میں علوم مشرقیہ کی ہمت افزائی کی غرض سے ایک انجمن قائم کی گئی اور اس کے زیر نگرانی ایک رسالہ "الجمعۃ اللسیویہ الملکیہ" شائع کیا۔ امریکی مستشرقین کی نگرانی میں نکلنے والے رسائل "دراسات الشرقیہ" "شئون الشرق الاوسط" اور "العالم الاسلامی" (The Muslim World) جو پہلی بار ۱۹۱۱ء میں منظر عام پر

آیا تھا، خاص [illegible] شامل ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ مستشرقین نے مختلف اسلامی موضوعات پر کتابیں بھی لکھی ہیں، مثلاً تاریخ اور ادبیات عربی پر آر اے۔ نکلسن (R.A.Nicolson) کی کتاب "ہسٹری آف عرب" (History of Arab) ۔ تاریخ ادبیات اسلامیہ پر بروکلمان (Brocholmon) کی کتاب " The History of Arab Literature " ۔ اسلامی قانون پر شاخت کی کتاب The Origins of Mohammadans Jusisprudence اپنے اپنے موضوع پر منفرد سمجھی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ آرنلڈ کی "حیاۃ محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ اے۔ جے۔ آربرے (A.J.Arberry) کی "تاریخ مذاہب التفسیر الاسلامی" اور "تاریخ العرب"۔ گولڈ زیہر (Gold Zieher) کی "الیھودیۃ فی الاسلام" فلپ ہٹی (Philip Hitti) کی "عقیدۃ الاسلام" بشپ ترپن (Bishop Turpin) کی "الاسلام نحد لعقیدۃ" ہنری لانس کی "دعوۃ المنذفہ" ونسنک (Wensink) کی "الحوب والسلام فی الاسلام"۔ اے آر۔ گب (A.R.Gibb) کی "التصوف فی الاسلام" اور "مصادر تاریخ القرآن" آرتھر جیفری (Arthur Jeffry) کی "مقدمۃ القرآن" وغیرہ کو یورپ کے بیشتر مشرقی جامعات میں ایک علمی مرجع (Reference Book) اور سند کا درجہ حاصل ہے۔ مندرجہ بالا تصنیفات اکثر انگریزی یا جرمن زبان میں لکھی گئیں، عربی میں جن کا ترجمہ ہوا ہے۔ مستشرقین کی ایک بڑی جماعت نے "دائرۃ المعارف الاسلامیۃ" (Encyclopaedia of Islam) ترتیب دی ہے، جس میں برائے نام مسلمان مضمون نگاروں کی بھی شمولیت ہے۔ مولانا سلمان الحسینی ندوی نے اپنی کتاب "مستشرقین اور اسلام" (جو ڈاکٹر سباعی کی "المستشرقون والاسلام" کا ترجمہ ہے مزید اضافے کے ساتھ اور جو اس مقالہ کا دراصل ماخذ ہے) اس میں مصنف موصوف نے بطور مثال چھیاسی افراد کے نام جن کے مضامین اس کتاب میں شامل ہیں پیش کئے ہیں۔

بیسویں صدی کے چند مشہور مستشرقین

اے۔ جے۔ آربرے (A.J.Arberry) :۔ مشہور انگریز مستشرق ہیں، عربی زبان میں اختصاص کیا، بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، مثلاً "الاسلام الیوم" طبع ۱۹۴۳ء۔ "مقدمۃ التاریخ التصوف" طبع ۱۹۴۲ء۔ "ترجمۃ القرآن" طبع ۱۹۵۰ء۔

الفرڈ جیوم (Alford Geom) :۔ انگریز مستشرق ہیں۔ ان کی کتاب "الاسلام" بہت مشہور ہے۔

ایچ۔ اے۔ آر۔ گب (H.A.R.Gibb) :۔ مصر کے لغویج اکاڈمی کے ممبر تھے۔ امریکہ میں اسلامیات کے پروفیسر بھی رہ چکے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مرتبین میں سے ہیں۔

گولڈزیہر (Gold Zieher) :۔ انہوں نے قرآن مجید اور حدیث کے موضوع پر خاص طور سے قلم اٹھایا ہے۔ اسلام دشمنی اور علمی بددیانتی کے لئے مشہور ہیں۔

ہندوستان میں بھی ایسے غیر مسلم اہل علم موجود ہیں جن کو علوم مشرقیہ اردو، فارسی اور عربی سے کافی واقفیت حاصل ہے، بشمبر ناتھ پانڈے مشہور ہندو مورخ ہیں۔ موصوف کو اسلامی تاریخ سے اچھی واقفیت حاصل ہے، دلاوجی گپتا ایک سیاسی آدمی ہیں مگر عربی، اردو اور اسلامی موضوعات پر کافی جانکاری رکھتے ہیں، موصوف کو جمعیت شباب الاسلام کے دفتر میں ہندی اکاڈمی کے افتتاح کے موقع پر سنا، انہوں نے بہت سی قدیم عربی اور فارسی کتابوں کا حوالہ پیش کیا اور علم سے متعلق ایک حدیث "أنا مدينة العلم وعلى بابها" عربی زبان میں پیش کی۔

ضرورت ہے کہ ایسے افراد اور ان کے کارناموں کو منظر عام پر لایا جائے۔

تبصرۂ کتب

تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

نام کتاب : رت جگے (غزلوں کا مجموعہ)
نام شاعر : رحمت امروہوی
قیمت : ۴۰ روپے
ملنے کا پتہ : ایلوو الیہ بک ڈپو - ۴۹ - ۹۹۸۸ - ہنو رہتک روڈ
نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۵ اور ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ - دریا گنج - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
مبصر : رئیس الدین فریدی

حضرت رحمت امروہوی اردو ادب میں تعارف کے محتاج نہیں - ان کی نظم و نثر سے اردو داں اور اردو خواں برسوں سے واقف اور ان کی خوبیوں کے قدرداں اور مداح چلے آتے ہیں - مگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو وہ اردو ادب کی ایک تاریخ ساز ہستی بھی تسلیم کئے جاسکتے ہیں - ولی نے گجرات سے دلی جاکر دلی والوں کو اردو میں غزل کہنے کی طرف مائل کیا اور امروہے کے شاعر سید سعادت علی نے میر صاحب کو فارسی سے پیچھا چھڑا کر اردو میں شعر کہنا سکھایا اور اس کے دو سو سال بعد رحمت امروہوی رحمت نے امروہے سے احمد آباد جاکر اردو کی ٹمٹماتی شمع کی لو کو بڑھا کر گجرات کو منور کیا اور شاعری کی بدولت ساری دنیا میں نام بھی کمایا اور شاعروں کو صحیح راستہ دکھانے میں بھی حصہ لیا - انہوں نے ساری جوانی احمد آباد کے ایک پارچہ بافی کے مل میں گزارنے کے باوجود شعر بافی سے ہی اپنا تعلق قائم نہ رکھا بلکہ محض غم غلط کرنے کے لیے شعر کہنے کے بجائے غم دوراں کے منظوم گل بوٹے بھی کھلائے اور اس طرح اپنی شاعری کو کام کی شاعری بنادیا - یہ مجموعہ تمامتر اسی قسم کے کلام سے پر ہے اور اس سے ہر کہ و مہ کو استفادہ کرنا چاہیے - اس کی خوبیوں کے مقابلے میں قیمت کچھ بھی نہیں - بس یہی حال ہے -

سرمہ مفت نظر ہوں میری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احسان مرا

بطور نمونہ انتخاب کلام شائع کرنا مصنف کی شان کے خلاف مان کر اس سے گریز کر رہا ہوں صرف اس حقیقت کی داد دے سکتا ہوں کہ ۵۰ سال سے زیادہ کی مدت احمد آباد میں گزارنے کے بعد بھی زبان پر ان کی گرفت کمزور نہیں ہوئی ہے - اور عمر "زبان غیر سے اپنی زبان بگڑتی ہے" جیسے امکانات کو قریب پھٹکنے نہیں دیا ہے -

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

ooooo

نام کتاب : شعلۂ گل
شاعر : سردار الہام
قیمت : ۴۰ روپے مع محصول ڈاک ۵۵ روپے
ملنے کا پتہ : موثر مقامات کے علاوہ مصنف کی قیام گاہ
مکان نمبر 22-3-370 منڈی میر عالم، حیدر آباد
آندھرا پردیش

اس صدی کے شروع میں حیدر آباد میں سارے ملک کے علماء، فضلاء، شاعر اور مترجم جامعہ عثمانیہ کے قیام کے انتظامات کے سلسلہ میں جمع ہوئے تو وہ علوم و فنون کا سب سے بڑا مرکز بن گیا - اس کے بعد جامعہ عثمانیہ سے استفادہ کرکے حیدر آبادی نوجوان بھی بڑی تعداد میں جامع کمالات ہوئے - ان ہی میں سے ایک سردار الہام بھی ہیں جنہوں نے تعلیم سے فارغ ہوکر حیدر آباد کے علاوہ بمبئی میں بھی ادب و صحافت کے جوہر دکھائے اب ہفتہ عمر کو پہونچ جانے کے بعد انہوں نے اپنا مجموعہ کلام شعلۂ گل ریاستی اردو اکیڈیمی کے مالی تعاون سے شائع کیا ہے جو ان کی فکر صحیح، جولانی طبع اور قادر الکلامی و قابل قدر اور لائق استفادہ ہے -

سردار الہام چونکہ زیادہ تر نظموں کے شاعر ہیں اس لیے ۱۲۵ میں سے ۹۲ صفحات نظموں کے لیے وقف ہوگئے ہیں اور آخر میں عقیدت اور یاد رفتگاں کے عنوانوں کے تحت جو کلام ہے وہ بھی زیادہ تر نظموں پر مشتمل ہے جن میں سے اکثر فکر انگیز اور ادبی شان کی مالک ہیں - درمیان میں ۲۰ صفحات پر غزلیں بھی پھیلی ہوئی ہیں - مجموعی طور پر یہ مجموعہ قابل قدر، لائق ستائش اور واجب الاستفادہ ہے - امید ہے کہ ارباب اردو مصنف کی حوصلہ افزائی میں کوتاہی نہ کریں گے - شعلۂ گل سے اشعار کا انتخاب بطور نمونہ پیش کرنا تو مشکل ہے اس لئے صرف ایک قطعاتی نظم کے ایک بند پر اکتفا کیا جاتا ہے جو بمبئی کے متعلق ہے اور مشتے نمونہ از خروارے کا کام دے سکتی ہے -

کہیں خلوت کی خاموشی ہے کہیں شور و شر بازاروں کا
کہیں جشن طرب زرداروں کا کہیں نوحہ غم ناداروں کا

کبھی پیار کبھی اقرار وفا کہ رقص اپنی طواروں کا —
پامال کلی دہراتی ہے افسانہ مست بہاروں کا

00000

نام کتاب : ابھی موسم نہیں بدلا
نوعیت : مجموعہ کلام
شاعر : بخش لائل پوری
قیمت : ۱۰۰ روپے
ناشر : تخلیقات، لاہور

بخش لائل پوری انگلینڈ میں مقیم اردو کے شاعر ہیں - اس سے پہلے ان کے تین مجموعے ۸۹-۸۶ ء کے درمیان بعنوان "لہو کا خراج" - زعفران شہر اور باد شمال" شائع ہو چکے ہیں - چونکہ وہ نظر سے نہیں گزرے اس لئے ان کے بارے میں کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں - مگر یہ چوتھا مجموعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ بخش صاحب حالات زمانہ و ابنائے زمانہ کے چلن سے سخت مایوس ، بیزار اور برہم ہیں جس کا مظاہرہ ان کے کلام میں بدرجہ اتم بلکہ ناقابل برداشت حد تک موجود ہے جو شاعرانہ اخلاق و آداب اور شاعرانہ مزاج سے کوسوں دور کا رویہ ہے - مثلاً مختصر آزاد نظموں میں جمہوریت کے لیے کہتے ہیں -

سیاسی زناکاروں میں
گھری ہوئی ہے بس
اور مجبور دوشیزہ

اور صحافت ان کی نظر میں کیا ہے —
تماش بینوں کے
گروہ میں طبلے کی تھاپ پر
ناچتی ہوئی
عمر رسیدہ طوائف

ایک مسدس بعنوان - "ملا ، عورت اور گواہی" ہے جس میں عورت کی عظمت بیان کی ہے مگر اس کا بند جو کرر آتا ہے اس طرح ہے

اس عورت کو اس ملا نے یہ کہکر سزا دی ہے
یہ بستر میں برابر ہے گواہی اس کی آدھی ہے

ایک اور طویل آزاد نظم "دربار رسالت میں" کے عنوان سے کہی ہے جس میں حسب ذیل مصرعے بھی در آتے ہیں -

میں اس انسان کامل کی
بھلا اپنے قلم سے
کیا نعت لکھوں
میں شاطروں میں کاذب ہوں
میں سیم و زر کے ٹکڑوں پر
ہلا کر دم مثال سگ جھپٹتا ہوں
قلم میرا ہے ملکیت سیاسی قحبہ خانوں کی

اگرچہ نظموں کا بڑا حصہ اسی قسم کی جلی بھنی نظموں سے بھرا پڑا ہے پھر بھی کافی قابل قدر نظمیں اور غزلیں بھی شامل مجموعہ ہیں جن میں امید اور خوش آیند مستقبل کی جھلک نظر آتی ہے اور یہ انداز شاعرانہ مزاج سے زیادہ لگا کھاتا ہے - بیاد فیض - زوال روس اور کشمیر - صحت مند خیالات پر مبنی ہیں اور وہ طویل آزاد نظم جو کتاب کا عنوان بنی ہے پاکستان کی موجودہ قابل رحم حالت کا صحیح نقشہ بھی ہے اور اس کا مکمل مرثیہ بھی -

00000

حیدرآباد کے محلے

روزنامہ سیاست حیدرآباد نے اپنے شہر کی تاریخ ، معاشرت ، تہذیب اور تمدن کے بارے میں کتابیں چھاپنے کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے اس کی ایک اہم تصنیف "حیدرآباد کے محلے" نامی کتاب بھی ہے جس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوجانے کے بعد دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے جو بڑے سائز کے ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے اور حیدرآباد کی پوری تاریخ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تاریخ اور ہندوستانی اسلامی تہذیب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بڑے کام کی چیز ہے -

قیمت : ۳۰ روپے
ملنے کا پتہ : سیل کاؤنٹر، روزنامہ سیاست، حیدرآباد-500001

00000

نام کتاب : وحشت تنہائی (مجموعہ کلام)
مصنفہ : سیدہ نسرین نقاش
قیمت : سو روپے
ملنے کا پتہ : بزم فکر و فن - اردو ہاؤس - ۴، ۳۳ ایس وی پی روڈ

مصنفہ کشمیری نژاد ، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اردو زبان کی ادیبہ اور شاعرہ کے علاوہ صحافیہ بھی ہیں - ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے جس کا آغاز ۲۵ صفحات پر حاوی توصیفی ، تعریفی اور مداحی نگارشات سے ہوتا ہے - جن میں قتیل راجستھانی ، خلیق انجم ، رفعت سروش ، ڈاکٹر حامدی کشمیری ، قتیل شفائی جیسے اکابر علم و ادب نے نقاش کی شاعری پر ایسے سیر حاصل اور نیاضانہ تبصرے کئے ہیں کہ ان کی چاپلوسانہ شاعرہ کے کلام پر شروع شروع میں نظر ڈالنا بھی مشکل کر دیتی ہے - مگر جب اصل کلام کو دیکھا جائے تو یہ جاننے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے کہ نقاش کو صانع حقیقی نے شعر گوئی کی صلاحیت بدرجہ اتم دے رکھی ہے اور اگر وہ اس پر چلا کریں تو ہندوستان کی پروین شاکر بھلے ہی نہ ہوں مگر چوٹی کی اردو شاعرہ ضرور ہو سکتی ہیں بلکہ ہو رہی ہیں اس مجموعے میں صفحہ ۳۲ سے ۱۲۵ تک غزلیات ہیں تو ۱۲۶ سے ۱۹۰ تک مختلف قسم کی نظمیں مگر ان کی قدرت کلام غزلوں میں زیادہ نمایاں ہے نظمیں مزید غور و فکر کی آرزومند نظر آتی ہیں - اور جب یہ دیکھا جائے کہ اپنی مادری زبان کشمیری ہونے کے باوجود اردو میں اتنی دستگاہ حاصل کر لی ہے تو شاعرہ کی قدرتی ذہانت کی داد دینی ہی پڑتی ہے - کاش ان کو اپنی خداداد صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا بھرپور موقع نصیب ہو -

تعارف نگاروں نے اگرچہ یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ گویا نقاش صاحبہ کی شاعری ایک خاص زاویہ و نظر کی مظہر ہے اور اسی لیے انہوں نے اپنی کتاب کا نام "دشت تنہائی" رکھا ہے مگر کلام کے مطالعے سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی - ان کی شاعری میں مناظر قدرت کی عکاسی حسن و عشق کی چاشنی ، ہجر و وصل کی کیفیات ابنائے زمانہ کی شکوہ سنجی اور وفا اور بے وفائی کے احساسات اور تخیلات سب موجود ہیں - کہیں کہیں عروضی خامیاں ضرور نظر آتی ہیں مگر عروض کی مکمل پابندی کس نے کی ہے اور کون کر سکتا ہے - ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے نسوانی جذبات کا نسوانی طرز تکلم میں اظہار کر کے اردو کی ایک بنیادی کمزوری کا علاج کیا ہے - سیدہ نسرین نقاش کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے اور تخیل کی بلند پروازی کی کوشش اور زبان و بیان کے حسن و شائستگی کا لطف اٹھائیے -

آپ کو ہم سے جدا کرتے ہیں
یہ بھلے لوگ برا کرتے ہیں

زندگی اپنی کہاں ہے نسرین
ہم تو بس سانس لیا کرتے ہیں

بے کار کے دلاسوں سے اکتا گیا ہے دل
اچھا جو کر نہ پاؤ تو بیمار ہی کرو

آئینہ دیکھوں تو ہے سامنے صورت اس کی
اس طرح سے نہ کسی ذہن پہ چھائے کوئی

لمحہ لمحہ بدل رہا ہے جہاں
وہ بھی ظالم بدل نہ جائے کہیں

وہ مجھے پیار سے بس ایک نظر دیکھ لے
ہجوم کے ملاحوں کی اداؤں کی شرماؤں کی

اس خطا پر ہم کو دنیا نے مٹا کر رکھ دیا
ہم نہیں بدلے ہوا کا رخ بدلتا دیکھ کر

حصول زر کی ہوس لے گئی اسے پردیس
سکون دل کی وہ دولت مگر لٹا بھی گیا

بعض اصلاح طلب شعروں کے نمونے شاعرہ :

ڈوب جائے نہ کہیں دل کا جزیرہ ایک دن
جوش پر ہے تیری یادوں کا سمندر اب کے

(یہاں دل کا جزیرہ کی جگہ دل کا سفینہ موزوں ہوگا)

انا ہے اس کی مری انکساری کیا ٹوٹی
کہ اس کے ساتھ ہی آپس کی نسبتیں بھی گئیں

(مطلب واضح نہیں ہے اور "انکساری" مناسب نہیں ہے - اس کی جگہ "انکسار" موزوں ہوگا)

ساتھ چھوڑا نہ کسی طرح انا نے میرا
بارہا ہم نے یہ احساس مٹا کر دیکھا

(دوسرے مصرع میں ہم کی جگہ میں ہونا چاہیے تھا)

نقاش کا کلام نہ صرف شوق سے پڑھنے بلکہ غور کرنے کے قابل بھی ہے اور وہ شاعری میں نئے مضامین تلاش کرنے والوں کے بھی بڑے کام کی چیز ہے - اس کی سب کو قدر کرنی چاہیے -

OOOOO

نام کتاب : دو کشتیوں میں سوار
مصنف : خالد سہیل (کناڈا)

دو کشتیوں میں سوار خالد سہیل کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں شامل پندرہ افسانوں سے مصنف کے فکری اور تخلیقی رویے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ خالد سہیل ماہر نفسیات ہیں اور کینیڈا میں مقیم ہیں۔ چنانچہ ان کے افسانوں کے موضوعات بھی اسی زمین سے اگے ہیں اور ان مسائل کے تجزیے میں ایک ماہر نفسیات کا ذہن کار فرما نظر آتا ہے۔ اس مجموعے کے تمام افسانے مہاجرین مرد، عورت اور بچوں کی زندگی سے متعلق ہیں اور بقول سہیل :

"جب انسان ایک ماحول میں پلا بڑھا ہو اور دوسرے معاشرے میں جا بسے تو اکثر اوقات اپنی ذات کو دو کشتیوں میں سوار محسوس کرتا ہے۔ جب بچپن کی سوچ، انداز، فکر اور روایات میزبان تہذیب کی طرز زندگی اور اس کی اقدار سے ٹکراتے ہیں تو کتنے لوگ اپنے آپ کو دوراہوں پر کھڑے پاتے ہیں"۔

خالد سہیل نے اسی دوراہے پر کھڑے انسان کو قریب سے دیکھا ہے اور کتنوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر سڑک پار کرائی ہے۔ کیوں کہ "......اگر ہم خود ان کی مدد نہ کریں گے تو کون کرے گا۔"

آج انسان زیادہ سے زیادہ مادی آسائشوں کی تلاش میں اپنے ٹھکانوں کو چھوڑ کر بہ رضا و ترجیح غیر ممالک کی خاک چھانتا پھر رہا ہے۔ مگر کیا وہ ان ممالک کے لیے کار آمد بھی ہے؟ کیا وہ ان ممالک کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا اہل بھی ہے؟

"دو کشتیوں میں سوار" کے دو افسانے "برابر لیکن مختلف" اور "کٹی ہوئی پتنگیں" (جس کا نام فہرست میں "نئے شہر میں" ہے) ان ہی بنیادی سوالوں پر مبنی ہیں۔ یہ افسانے ان مہاجرین کی زندگی کا المیہ بیان کرتے ہیں جو اپنے وطن عزیز کو خیرباد کہہ کر ہجرت کرتے ہیں مگر ان کے نصیب میں در بہ در کی ٹھوکروں اور پریشانیوں کے سوا کچھ نہیں۔ کیوں کہ وہ جدید اور مغربی علوم سے بہرہ ور نہیں جن کے بغیر مغربی ممالک میں بہتر ملازمت اور عزت حاصل کرنا دشوار ہے۔

اس مجموعے کے بیشتر افسانوں پر جنسی آزادی کی فضا قائم ہے۔ اس قبیل کے افسانوں میں خصوصی طور پر دو خبریں، شہوت بھری آنکھیں اور دو کشتیوں میں سوار افسانے شامل ہیں۔ افسانہ دو کشتیوں میں سوار کے متعلق خود افسانہ نگار کا خیال ہے :

"وہ میری نگاہ میں میری ادبی اور نظریاتی سوچ کو سمجھنے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے اس لیے میں نے کتاب کا نام بھی اسی افسانے کے حوالے سے رکھا ہے"۔

اس افسانے کا مرکزی کردار ایک جنسی طور پر ناآسودہ عورت ہے جو امریکہ میں مقیم ہے۔ اپنے شوہر سے ناآسودگی کے سبب وہ اس کا ساتھ چھوڑ کر الگ رہنے لگتی ہے اور دوسروں کے ساتھ زندگی کا لطف حاصل کرتی ہے۔ یہ کردار مغرب میں عورتوں کی آزادی سے متاثر ہے وہ کہتی ہے :

"پاکستان میں ہوتی تو شاید یہ جبر سہہ جاتی لیکن امریکہ میں آکر تو اس کا کوئی جواز نہ تھا یہاں تو عورتیں مردوں کے برابر تھیں اور انہیں ہر قسم کے حقوق حاصل تھے۔ میں جوان ہوں، نہ صرف زندہ رہنا چاہتی ہوں بلکہ خوش خوش زندہ رہنا چاہتی ہوں خوش رہنا ہر مرد اور عورت کا بنیادی حق ہے"۔

اس افسانے میں افسانہ نگار نے عورتوں کے بنیادی حقوق کے لیے صدا بلند کی ہے اور ان پر صدیوں سے لگے جنسی قدغن کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ جو مصنف کے نقطہ نظر کا علامیہ ہے۔ بقول افسانہ نگار :

"یہ میرا پہلا افسانہ ہے جس میں میں نے عورت کو توانا، آزاد اور خود مختار پیش کیا ہے۔ اس لیے اس افسانے کا مقصد قارئین کے جنسی جذبات کو بھڑکانا نہیں بلکہ عورتوں کے Liberation کے Process کو Highlight کرنا ہے۔

اسی قبیل کا دوسرا افسانہ "شہوت بھری آنکھیں" ہے۔ جس میں مصنف نے یہ دکھایا ہے کہ مغربی معاشرہ کس طرح عورتوں کی ہم جنسی کو قبول کر رہا ہے۔

اس کے علاوہ اس مجموعے کے افسانوں میں تہذیبی اور سماجی کشمکش کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں کیونکہ ہند و پاک سے مغربی ممالک کا سفر کرنے والوں کے لیے وہاں کی نئی تہذیب میں جذب ہو جانا ممکن نہ سہی ایک مشکل امر ضرور ہے یہی نہیں ہند و پاک سے کوچ کرنے والے لوگ اپنے تمام تہذیبی ورثے کے ساتھ تعصب بھی اپنے کاندھوں پر ڈھو رہے ہیں۔ افسانہ "روایتوں کے شہر میں" اس کی عمدہ مثال ہے۔

جہاں تک کرداروں کا سوال ہے انہیں تین خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول آزاد خیال اور انفرادی آزادی کے دل دادہ مرد اور عورتیں جنہوں نے مغرب سے اثر قبول کیا ہے اور اب وہ ہر طرح کی آزادی کے خواہش مند ہیں۔ ان میں "شہوت بھری آنکھوں" کی کرن، "دو کشتیوں میں سوار" کی فوزیہ، "دو خبریں" کی ڈیبی اور طارق، "روایتوں کے شہر میں" کی

بقیہ ص ۱۸ پر

ادبی سرگرمیاں_اطلاعات_اعلانات

خلیج میں "جشن کیفی" کے مشاعرے

دبئی - گزشتہ دنوں عرب امارات کی فعال انجمن "یونی کیریئرز امارات" کی جانب سے خلیج میں برصغیر کے ممتاز شاعر کیفی اعظمی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں "جشن کیفی" کی تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔

مرکزی پروگرام دبئی کے ہوٹل ایمبار میں پاکستان کے معروف شاعر پیرزادہ قاسم کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں پاک و ہند کے علاوہ دیگر ممالک کے شعرا نے بھی اپنا مرصع کلام سنا کر سامعین کو محظوظ کیا۔

مشاعرے کی نظامت یونی کیریئرز کے روح رواں سلیم جعفری نے کی اور اپنی شگفتہ بیانی سے حاضرین کو رات میں بجے تک محسور رکھا۔ عالمی پیمانے پر سخن نوازوں تک پہنچانے کے لئے مشاعرے کی ویڈیو ریکارڈنگ مشہور کمپنی "المنصور ویڈیو" نے کی۔

ہندوستانی شعراء میں کیفی اعظمی، کرشن بہاری نور، والی آسی، ساغر خیامی، ساغر اعظمی، شاعر جمالی، رویندر جاکھو ساحل اور محترمہ انجم رہبر شامل تھیں جب کہ پاکستانی شعراء میں پیرزادہ قاسم، جون ایلیا، عطاء الحق قاسمی، ظفر امروہوی، اعجاز رحمانی، راشد نور، اسلم کولسری اور محترمہ نجمہ خان تھیں۔

بحرین سے سعید قیس اور مقامی طور پر ہلال جعفری، یعقوب تصور نے شرکت فرمائی۔ تقریب میں کیفی اعظمی کی شخصیت اور فن پر برصغیر کے نامور قلم کاروں کے مضامین سے آراستہ ضخیم اور شاندار "مجلہ کیفی" بھی جاری کیا گیا۔ تمام شعراء کے علاوہ رابطہ آفیسران حنیف باحلیم اور حاجی انیس دہلوی کو اسٹیج پر مدعو کر کے پذیرائی اور تعارف پیش کیا گیا۔

دبئی کے علاوہ العین، ابو ظہبی میں بھی جشن کیفی کے مشاعرے منعقد ہوئے جس کی نظامت ابو ظہبی کی سرگرم شخصیت اور منفرد لب و لہجے کے شاعر ظہور الاسلام جاوید نے کی۔

صدارت کے فرائض عزت مآب جناب عبدالرزاق سو مرو سفیر پاکستان نے فرمائے۔ عرب امارات کے علاوہ دوحہ قطر میں بھی "جشن کیفی" کی تقریبات مجلس فروغ اردو ادب کے زیر اہتمام منعقد ہوئیں جس کا افتتاح ۱۷/ مئی کو دوحہ کلب کے شاندار عشائیے سے ہوا۔ جس کا انعقاد مجلس کے چیرمین محمد عتیق اور ان کی بیگم نے کیا تھا۔

دوحہ قطر میں مجلہ کیفی کا اجراء مہمان اعزازی ڈاکٹر محمد عبدالحمید الکواری وزیر اطلاعات و ثقافت حکومت قطر نے فرمایا۔

دوحہ قطر میں مہمان خصوصی کے طور پر ادریس دہلوی (شمع) محمود

ماہنامہ شاعر بمبئی

ظاہر جگ(...) نے شرکت فرمائی۔

۱۸- مئی کو دوحہ کے ہوٹل شیریٹن میں عظیم الشان مشاعرہ ہوا جس میں احمد فراز، جاوید اختر نے بھی کلام سنایا۔

دوحہ قطر کی تقریبات میں شبانہ اعظمی بھی رونق محفل بنی ہوئی تھیں مجلس کی سرپرست اور سرگرم محترمہ ڈاکٹر شوکت رضوی کی جانب سے بھی مقامی ہوٹل میں عشائیہ اور شعری نشست کا خاص اہتمام کیا گیا جس کی نظامت والی آسی نے فرمائی۔

علاوہ ازیں دوحہ کے محبان اردو خالد بشیر الخلافی محمود بن محفوظ اور سید اشفاق حسین کی جانب سے ضیافتوں کا اہتمام کیا گیا۔

جشن کیفی کی تمام تقریبات ۱۷/ سے ۲۸/ مئی تک خلیج میں شاندار طریقے پر جاری رہیں جس کے لئے یونی کیریئرز کے روح رواں سلیم جعفری ان کے رفقاء دوحہ قطر میں مجلس فروغ اردو ادب کے چیرمین محمد عتیق بانی مجلس ابن الجیب اختر حبیب الرحمن العین کی فعال انجمن بزم شعر و ادب، الامارات کے مستان شریف اور ان کے رفقاء ابو ظہبی کے ادب نواز حضرات کا تعاون شامل رہا۔

تمام تقریبات نہایت کامیابی اور حسن انتظام اور خوش سلیقگی کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔

(رپورٹ : نظامت دہلوی، وسیم کاتبی، دبئی)

ooooo

محمد شبیر علی مخدومی کے افسانوی مجموعہ "دختر ابلیس" کا جشن اجراء

مخدومی (قیصم پور) افسانہ نگار شبیر علی مخدومی کے افسانوی مجموعہ "دختر ابلیس" کی تقریب اجراء ڈاک بنگلہ مخدومی میں منعقد ہوئی جس کی صدارت بمبئی سے تشریف لائے فلم پروڈیوسر و ڈائریکٹر مظفر علی نے کی۔ نظامت کے فرائض شاعر حضرت نسیم فاعجہانپوری نے انجام دیئے۔ تقریب میں مشہور شاعر و ادیب وسیم بجانی بطور مہمان شاعر شریک ہوئے۔ تقریب کا آغاز کرتے ہوئے جناب نسیم فاعجہانپوری نے "دختر ابلیس" کے مصنف کی افسانوی خدمات اور شخصیت پر گرانقدر الفاظ میں روشنی ڈالی۔ اس موقع پر ایک شاندار مشاعرہ کا اہتمام بھی کیا گیا جس میں ساقی مخدومی، ایاز حضرت، مایب شفق، سراج علی سراج، سہاس تقوی، مظفر صدیقی، ظہیر الحق ساحر، نسیم فاعجہانپوری اور وسیم بجانی نے اپنا کلام پیش کیا۔

شعری دور کے بعد صدر محفل جناب مظفر علی نے اپنے دست

مبارک سے کتاب کی رونمائی کی رسم ادا کی۔ مظفر علی نے تقریر میں کہا کہ شبیر علی کی یہ اولین تصنیف ملک و بیرون ملک میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ مصنف نے اپنے افسانوں میں زیادہ تر سماج میں رستے ہوئے ناسوروں پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ ان کے افسانوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سماج کی دکھتی رگوں کو پہچانتے ہیں ساتھ ہی وہ سماج کی اصلاح بھی کرنا چاہتے ہیں۔

آخر میں افسانہ نگار محمد شبیر علی محمدوی نے اپنی کتاب "دختر ابلیس" کے حوالے سے کہا کہ قوم کو نازک حالات سے واقف کرانا ضروری ہے۔ خاص طور پر نوجوانوں کو اپنی تاریخ سے واقف ہونا چاہیے کہ ہمارے بزرگوں نے کون سی ایسی غلطیاں کی ہیں جس کی وجہ سے ہم سبھی ہندوستانیوں کا سر شرم سے جھک جاتا ہے ان سے ہمیں بچنا چاہیے۔ اس کتاب کا مطالعہ کرکے نوجوان سبق حاصل کرکے اپنی اصلاح بھی کرسکتے ہیں۔

ooooo

جدہ میں ڈاکٹر کلیم عاجز کے اعزاز میں خصوصی مشاعرہ

جناب سعید محسن باعزال کی رہائش گاہ پر معروف بزرگ شاعر ڈاکٹر کلیم عاجز کے اعزاز میں ایک خصوصی مشاعرہ منعقد ہوا جس میں جدہ کے چنیدہ اردو شعراء اور سامعین نے شرکت کی۔ مشاعرہ کا صدر اور مہمان خصوصی ڈاکٹر کلیم عاجز کو ہی ٹھہرایا گیا۔ معروف ادب نواز شخصیت احمد مسعود قاسمی نے مشاعرے کی نظامت کی۔ ابتدائی خیر مقدمی کلمات میزبان جناب سعید باعزال نے ادا کئے اور پیر خالد قدوائی نے تلاوت کلام پاک کی۔ سعید اختر نے وقفے وقفے سے ڈاکٹر کلیم عاجز کی غزلیں پیش کیں۔ چونکہ یہ محفل خصوصی طور پر ڈاکٹر کلیم عاجز کو ہی سماعت کرنے کی غرض سے منعقد ہوئی تھی اس لئے الترتیبا زیادہ سے زیادہ وقت ڈاکٹر کلیم عاجز کو سننے کے لئے وقف کیا گیا۔ جن شعراء نے اس محفل میں کلام پیش کیا ان میں ڈاکٹر عثمان، طارق حسن عسکری، عبدالہادی انجم، نسیم سحر، ظفر مہدی اور مولانا وحید الفریدی شامل تھے۔ ڈاکٹر کلیم عاجز نے اپنا منظوم کلام سنانے سے پہلے نثر میں بھی خطاب کیا اور اپنی ذات اور شاعری کے حوالے سے بڑی پر اثر باتیں کیں بلکہ اپنے قریبی اور دیرینہ احباب سے اس بات کا شکوہ بھی کیا کہ انہوں نے آج تک ڈاکٹر کلیم عاجز کو سمجھنے اور انکی اندرونی کیفیات سے آگاہ ہونے کی کوشش نہیں کی اور وہ آج بھی سب میں ہوتے ہوئے بھی خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔

ooooo ماہنامہ انتشار کلکتہ

برصغیر کے نامور شاعر تلوک چند محروم کی ۲۹ویں برسی جموں کے شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کی طرف سے خراج عقیدت

جموں برصغیر کے مشہور شاعر تلوک چند محروم کے انتیسویں یوم وفات پر جموں میں محروم میموریل سوسائٹی نے ایک تقریب منعقد کی جس کی صدارت جموں کے سینئر شاعر جناب عابد مناوری نے فرمائی۔ جناب محروم کی زندگی اور شاعری پر تین مقالے پیش کیے گئے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے "حیات محروم" کا ایک باب پڑھا جس میں مرحوم شاعر کی طالب علمی کے زمانے سے لے کر ان کی شاعری کے عروج تک کے کئی واقعات پر روشنی ڈالی گئی۔ آزاد صاحب جتنے اچھے شاعر ہیں اتنے ہی اچھے نثرنگار بھی ہیں۔ ان کی نثر نگی اور شاعرانہ اوصاف کی بدولت سامعین پر سحر طاری کردیتی ہے۔ ان کے مقالے کے دوران بار بار اس بات کا احساس ہوا۔ خاص طور پر آپ جب نظم "نور جہاں کا مزار" کے معرض تخلیق میں آنے، اس کے روزنامہ "زمیندار" لاہور کے پہلے صفحے پر شائع ہونے، اور مولانا ظفر علی خاں کے لاہور کے ایک بڑے پبلک جلسے میں اپنی تقریر کے دوران میں اس نظم کے اشعار پڑھنے اور اس کے بعد کے واقعات کا ذکر کر رہے تھے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی فلم دکھائی جارہی ہے۔

اب خدا جانے محروم صاحب کی اس نظم کا اعجاز تھا یا مولانا ظفر علی خاں کی خطابت کا کرشمہ یا دونوں کا مشترکہ نتیجہ کہ نور جہاں کا مزار جو ویرانے کی ایک تصویر تھا شاندار اور پر شکوہ زیارت گاہ کی شکل اختیار کرگیا اور حکومت وقت نے مولانا ظفر علی خان اور محروم صاحب کی آواز پر مزار کی تعمیر نو کے احکام جاری کردیے۔

دوسرے مقالے کے لیے اسد اللہ وانی صاحب کو ان کے مقالے "تلوک چند محروم گنج معانی کے آئینے میں" کے لیے دعوت دی۔ ان کا مضمون "گنج معانی" پر بھرپور اور سیر حاصل تبصرہ تھا۔ وانی صاحب نے محروم کی نظموں کے جو حوالے دیے، خاص طور پر محروم کی بیوی اور بیٹیوں شکنتلا اور ودیا کی وفات پر کہی ہوئی نظموں کے، ان سے حاضرین بہت متاثر ہوئے۔

ڈاکٹر ظہور الدین صدر شعبہ اردو جموں یونیورسٹی نے اپنا مقالہ "تلوک چند محروم فن اور شخصیت" پڑھا۔ آخر میں ایک شعری نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں یسین بیگ، پرتپال سنگھ بیتاب، یوگندر پال شاکر، ڈاکٹر ظاہر ہارون مرزا، سریندر سرد اور تسلیم منتظر نے اپنا کلام پیش کیا۔ ڈاکٹر آر۔ کے۔ بھارتی نے جگن ناتھ آزاد کی نظم "دو ہنگ کی سرحد پر" کا منظوم انگریزی

(بقیہ ص ۱۹)

آپ کی ڈاک (قارئین کے خطوط)

○ مراسلہ نگار کی رائے سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

ف-س-اعجاز صاحب مکرم مدیر انشاء

○ انشاء اس بار دور حاضر کی جدید ترین طریق طباعت سے آراستہ و پیراستہ طاہر ہوا۔ اردو کی قتل گاہ پر ایسی گلکاریاں آمد بہار کی بشارت سے کم نہیں۔ اللھم زد فزد ٥

اس بار ایک تبصراتی گوشہ سا جناب نثار احمد فاروقی کی کتاب "تلاش میر" سے متعلق بھی ہے جس کا پہلا اڈیشن ۷۴ء میں نکلا تھا اور اس پر انھیں ساہتیہ اکیڈمی کا انعام بھی مل چکا ہے مگر میر کے چھ دیوانوں کے بحرِ ذخار کی شناوری میں اچھے اچھے غوطہ کھا جاتے ہیں اسی طرح بعض چھوٹی موٹی مگر اہم ڈبکیوں سے ہمارے فاروقی صاحب بھی نہیں بچے۔ اگر وہی ایڈیشن بجنسہ پھر آیا ہے تو یہ چند باتیں قابل ذکر ہیں مثلاً امیر رام پوری جو نواب وقت کے بچا ہوتے ہیں، جن کا شعر ہے صفحہ ۲۳۴

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے امیر
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا ہے

فاروقی صاحب اسے میر تقی میر سے منسوب فرماگئے ہیں۔ اسی طرح میر ہی کا شعر جس کا صحیح متن ہے

راہ دور عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

کو "ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا" صفحہ ۳۶، پر تحریر فرماگئے ہیں جو ظاہر ہے کہ درست نہیں ہے ایک شعر تو غالب کا بھی میر کے نام لکھ گئے ہیں صفحہ ۳۴۶ پر دیکھئے

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

مزید صفحہ ۳۴۹ پر میر کے اشعار میں (بقول ان کے) "خیر و برکت کی فضا، حسن و عشق کا گہرا وجدان، بے پناہ ایمائی اثر" کے تحت ان اشعار کا ہونا بڑی رواروی کا احساس دلاتا ہے۔ مثلاً بقول مجنوں گورکھپوری کہ میر نے یہی ایک شعر کہا ہوتا تو ان کی شعری زندگی کے لئے کافی تھا۔

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

یا بقول میرے ان اشعار کا اس خیر و برکت کی فضا میں نہ ہونا پھر ان کی جلد بازی کی غمازی کرتا ہے مثلاً

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

یا یہ شعر کہ جیسے پورے کرۂ ارض کو بغل میں داب لیا ہو۔

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

یا

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کردیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے اگر دل بے مدعا ہوتے

وصل و ہجراں یہ جو دو منزل ہیں راہ عشق کی
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

اور یہ شعر جس کے ہوتے غالب اپنے "سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں" اپنے سمیت میر کے گھٹنے تک رہ جاتے ہیں۔ میر کہتے ہیں۔

آنکھوں میں آشنا تھا مگر دیکھا تھا کہیں
تو گل کل ایک دیکھا ہے میں نے صبا کے ہاتھ

غرض کہ جن چند اشعار کو فاروقی صاحب مثالاً پیش کرتے ہیں وہ میر کے ان اشعار کے سامنے کیسے ہیں یہ فیصلہ میں آپ ہی لوگوں پر چھوڑتا ہوں۔ یہ لیجئے تین شعر پھر سامنے کھڑے ہوگئے۔

خاک آدم ہی ہے زمین تمام
پاؤں کو ہم سنبھال رکھتے ہیں

اب ایسے ہیں کہ صانع کے مزاج اوپر ہم پہونچے
جو خاطر خواہ اپنے ہم ہوئے ہوتے تو کیا ہوتے

محبت نے کاڑھا ہے ظلمت سے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

غرض کہ یہ سلسلہ کافی طویل ہوسکتا ہے، نجانے کس بدمذاق نے میر کے صرف بہتر۷۲، نشتر اندھوں کی طرح ڈھونڈ نکالے تھے۔ فاروقی صاحب کی دو چار بڑی غلطیاں اگر اب بھی سدھار لی جائیں تو کیا حرج ہے۔

مجروح سلطانپوری، بمبئی

ooooo

○ کل ٹی-وی پر جب یہ خبر سنی کہ پاکستان گورنمنٹ نے مہاجر قومی محاذ کو دہشت گرد اور کالعدم قرار دے دیا ہے تو مجھے ایک بار پھر جناب

خورشید ملک صاحب کے نومبر - دسمبر کے انشاء میں چھپے [illegible] یاد آئے -
"دراصل جہاں [illegible] کھڑا کرنے والے سیاسی مفاد کے لئے کوشاں ہیں - اور پھر کچھ ادھر سے بھی ہوا دی جارہی ہے" - مجھے امید ہے کہ جناب خورشید ملک صاحب کی "خوش فہمی" انشاء کے جلد ۱۰ شمارہ ۲-۳ میں چھپے میرے مکتوب کو پڑھنے کے بعد کافی حد تک [illegible] ہوگئی ہوگی - رہی سہی کسر اب پوری ہوجانی چاہیے - بے نظیر بھٹو صاحبہ نے تو پہلے ہی تمام مہاجرین کو پاکستان کا غدار قرار دے دیا تھا - جب انہوں نے پاکستان گورنمنٹ کے کشمیر کے بارے میں ملک گیر "ہڑتال" میں حصہ نہیں لیا تھا - کراچی اور سندھ کے دوسرے شہروں میں جو آگ لگی ہوئی ہے - اس سے ہر حساس ہندوستانی کو کوفت ہوتی ہے - کاش ہمارے اس وقت کے لیڈر انگریز کے بچھائے ہوئے جال میں نہ پھنستے - اور یہ غیر قدرتی تقسیم قبول نہ کرتے - برصغیر کے سارے جھگڑے اسی تقسیم کا ہی نتیجہ ہیں - شاطر انگریز نے تقسیم کی ایسی لکیر کھینچی کہ سکھ ہندوستان میں ہیں اور ان کے نہایت متبرک مقامات ننکانہ صاحب اور پنجہ صاحب پاکستان میں - قادیانی پاکستان میں ہیں اور ان کا مقدس مقام قادیان ہندوستان میں ہے - اور عقیدت مندوں کو ان مقامات کی زیارت کرنے کے ویزا اور پاسپورٹ کی ضرورت پڑتی ہے - اسی طرح خواجہ معین الدین چشتی، نظام الدین اولیاء اور دوسرے صوفی فقیروں کی خانقاہوں کی زیارت کرنے کے لئے آنے والوں کو بھی ہندوستان سے پاکستان جانے والے عقیدت مندوں کو بھی ویزا اور پاسپورٹ لینا پڑتا ہے - اردو پاکستان کی قومی زبان ہے لیکن اردو بولنے والے قلب اردو ہندوستان میں ہیں - اور پاکستان میں چند مہاجر بستیوں کو چھوڑ کر کسی بھی علاقہ کے لوگوں کی زبان اردو نہیں ہے - جب کہ ہندوستان میں کروڑوں لوگوں کی مادری زبان اردو ہے -

اب ایک اچھی خبر :

بھوپال میں کونسل فرشپی مشن مرکزی وزارت انسانی وسائل و بہبود کے تعاون سے مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام ایک سہ روزہ "اردو مستقبل کا قومی تعاون کی کا سمینار" (17 تا 19 جون) منعقد کیا گیا - مجھے بھی اس میں شرکت کرنے کا شرف حاصل ہوا - یہ سمینار ملک میں اپنی قسم کا پہلا سمینار تھا - جس میں مدھیہ پردیش اور ہندوستان کے مختلف مقامات سے اردو کے جانے مانے مستقبل و شعراء تشریف لائے - ان میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر جناب پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور سکریٹری جناب خلیق انجم بھی شامل تھے - مدھیہ پردیش اردو اکادمی اور اس کے سکریٹری جناب پروفیسر آفاق احمد مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس سلسلے میں دلچسپی کی اور اردو والوں کی رہنمائی کی اور ہر لحاظ سے کامیاب یہ سمینار منعقد کیا -

مختلف کمیٹیوں میں تین دن کی تمام پہلوؤں پر بحث مباحثہ کے بعد جو قراردادیں و سفارشات سامنے آئیں - سبجیکٹس کمیٹی نے انہیں فائنل ترتیب دے کر پورے ہاؤس کے سامنے پیش کیا اور اتفاق رائے سے یہ منظور کرلی گئیں -

اس کے علاوہ ایک شام کو مشاعرہ ہوا جس میں بھوپال کے اور باہر سے آئے شعراء نے اپنا کلام سنایا - پروفیسر جگن ناتھ آزاد جب ایک غزل سنا چکے تو سامعین نے اصرار کیا کہ ایک اور غزل سنائیں - اس وقت میں نے انہیں 1948ء میں لاہور کے ایک مشاعرے میں سنائی گئی غزل سنانے کی فرمائش کی - اس غزل کے کچھ اشعار مجھے یاد تھے - فرمائش کرتے وقت میں نے اس غزل کا یہ شعر پڑھ بھی دیا

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانند مہماں لے کے آیا ہوں

پروفیسر آزاد نے بتایا کہ 1948ء میں لاہور میں منعقد ہونے والے مشاعرہ کے لئے ہندوستان سے بزرگ شاعروں میں سے جناب نوح ناروی، درمیانی عمر والوں میں سے جگر مرادآبادی اور نوجوانوں میں سے جگن ناتھ آزاد کو مدعو کیا گیا تھا - نوح ناروی اور جگر مرادآبادی نہیں جاسکتے تھے کیونکہ اس وقت کے حالات میں اگر کوئی مسلمان عارضی طور پر بھی پاکستان جاتا تو اس کی جائیداد پر کسٹوڈین والے (اسے مہاجر قرار دے کر) قبضہ کرلیتے تھے - اس لئے پروفیسر جگن ناتھ آزاد اکیلے ہی اس مشاعرے میں شامل ہوئے - جناب جگن ناتھ آزاد صاحب نے اس مشاعرے میں یہ غزل سنائی - اور سامعین نے پرزور تالیوں اور واہ واہ مرحبا سے داد دی -

دوسری شام کو ایک اردو ڈرامہ کھیلا گیا "اردو ہے جس کا نام" - محدود وقت میں نہایت موثر اور اردو زبان کی پوری تواریخ کو محیط کرتا ہوا یہ ڈرامہ جناب فضل تابش کا لکھا ہوا تھا - ڈرامے کا سکرپٹ، ڈائیلاگ، اداکاری، سنگیت، روشنی اور شاعری کا انتخاب نہایت پرفیکٹ اور اونچے معیار کا تھا - ڈرامہ بہت زیادہ پسند کیا گیا - پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ "اس سے اچھا ڈرامہ میں نے زندگی میں نہیں دیکھا"

پروفیسر آفاق احمد کی قیادت میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے [illegible] کر کے سارے ملک کی اردو اکادمیوں کی رہنمائی کی ہے اور وزارت انسانی وسائل بہبود کو نہایت معقول اور قابل قبول تجاویز و سفارشات پیش کی [illegible] یہ اردو زبان کی بیش بہا خدمت ہے -

مدھیہ پردیش بہار کے بعد دوسری ریاست ہے جہاں اردو زبان کو اس کا صحیح مقام دلانے کی سمت میں ٹھوس اور سنجیدہ قدم اٹھائے جارہے ہیں

رام پرکاش کپور
درگ (ایم پی)

ooooo

○ سوال شمارہ دیکھ کر طبیعت پھڑک اٹھی تھی اور اب کے تازہ شمارہ (عید نمبر) بھی خوب ہے - پروین شاکر کو جو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے - آپ نے ان کا خوبصورت شعری انتخاب پیش کیا ہے - نہ جانے اللہ میاں ایسی شخصیتوں کو اپنے پاس جلد کیوں بلا لیتے ہیں جن کی خوشبو پوری طرح باہر بھی نہ نکلی ہو - یہ بھی کوئی مرنے کی عمر تھی - پروین نہیں مری - مر تو گئی وہ شعری روایت جو پروین کی شاعری کا مزاج بن گئی تھی - اب بھلا کون اس روایت کو آگے بڑھا پائے گا - ؟

آپ کا منظوم اداریہ "چراغوں کو ڈر ہے یہ تم جانتے ہو" اور نظم میبرڈ عید بھی خوب ہے - کلکتہ میں آپ نے جو تحریک چلا رکھی ہے وہ پوری اردو دنیا کے لئے باعث عبرت ہے - انشاء کا اس طرح پابندی کے ساتھ نکلتے رہنا باعث حیرت ہی نہیں باعث عبرت بھی ہے ان لوگوں کے لئے جو اردو کو مردہ سمجھ رہے ہیں -

مشتاق احمد نوری
سکریٹری بہار اردو اکاڈمی (پٹنہ)

ooooo

○ "انشاء" کا عید نمبر موصول ہوا - جو حسب سابق اپنے مشمولات کی وجہ سے پسند آیا - آپ کا منظوم اداریہ "چراغوں کو ڈر ہے یہ تم جانتے ہو" خوب ہے - تارا چرن رستوگی صاحب پتہ نہیں کس ذہنیت کے مالک ہیں - آپ جیسے Intellectuals کو مذہب کی طرف راغب دیکھتا ہوں تو ایک عجیب سی جذباتیت کا احساس ہوتا ہے -

پروین شاکر پر گوشہ شائع کرنا ایک مستحسن قدم ہے - پچھلے دنوں "مایا" (ہندی) کے تازہ شمارے میں پروین شاکر اور تسلیمہ نسرین کی شاعری پر ایک تقابلی مضمون نظر سے گزرا - دیکھئے کیسی شرپسندی ہے ؟ کہاں پروین شاکر سی عظیم شاعرہ اور کہاں وہ دو ٹکے کی فحش گو !

تسلیم نیازی
مدن پور (مغربی بنگال)

ooooo

○ میں عموماً اپنی کسی تحریر پر کئے گئے اعتراض پر خاموشی اختیار کرلیتا ہوں - لیکن جناب رام پرکاش کپور کے اعتراضات نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کردیا کیونکہ انہوں نے میرے مکتوب کے جواب میں جو استدلال پیش کئے ہیں ، وہ حلق سے اترنے والے نہیں ہیں -

پاکستان سے آئے ہوئے حضرات کو سرکاری طور پر یہاں قبول کیا گیا تھا نہ کہ عوام کی طرف سے - یہ دونوں ملکوں کے لئے سیاسی مجبوری تھی ، خوشی خوشی نہ وہاں کے لوگوں کو قبول کیا گیا اور نہ ہی یہاں - بہرحال اگر وہاں سے آئے ہوئے لوگ اگر یہ محسوس نہ کریں جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے تو پھر کیا محسوس کریں یہاں کے عوام کی بھی مجبوری ہے اور ان کی بھی ، کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں - مزید یہ کہ وہاں سے آئے لوگوں کو عموماً پنجابی ہی کہا جاتا ہے کیونکہ ہجرت کرنے والوں کی اکثریت اسی علاقے سے تعلق رکھتی تھی ، وہاں کے دیگر علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں پر بھی پنجاب کی پوری چھاپ تھی - اس ضمن میں ایک بات اور واضح کردوں کہ اگر ان لوگوں کو پورے ہندوستان میں پھیلایا گیا تھا تو آنجہانی پنڈت نہرو نے کسی کو بھی اپنے شہر الہ آباد میں نہیں بھیجا تھا - کیوں ؟

آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی کے بہیمانہ قتل کے بعد جو کچھ ہوا ، اس سے جناب رام پرکاش کپور بخوبی واقف ہوں گے - ان کا قتل شری پولیس نے کیا تھا تو عوام نے ان سب کے خلاف تشدد کیوں نہیں کیا ، صرف ایک ہی فرقے کے لوگوں کو نشانہ کیوں بنایا گیا ؟

اس وقت مجبوری میں ان کی الگ کالونیاں بنائی گئی تھیں کیونکہ وہ مالی طور سے کمزور بھی تھے مگر اب تو ایسی بات نہیں ہے - اب بھی وہ جو نئے مکانات بناتے ہیں ، انہیں کالونیوں کے قرب وجوار میں بناتے ہیں -

ذات برادری کی پابندی کرنے کی کوشش ضرور کی جاتی ہے مگر اس پر سختی سے عمل نہیں کیا جاتا ، خصوصاً مسلمانوں میں اس کی پابندی پر زور نہیں دیا جاتا ہے - اس کا اعتراف انہوں نے خود بھی کیا ہے کہ ذات برادری اور حلقۂ زبان سے باہر بھی شادیاں ہوتی ہیں ، کیونکہ بدلتے وقت کا تقاضہ یہی ہے - لیکن ان کا ثبوت میں یہ کہنا کہ ان کی بہن کے لڑکے نے بہار شریف میں شادی کی اور ایک لڑکی نے بہار شریف کے لڑکے سے عجیب محسوس ہوا - یوں تو سنیل دت نے نرگس سے ، نواب پٹوڈی نے شرمیلا ٹیگور سے ، چیف جسٹس ہدایت اللہ نے ہندو لڑکی سے اور خود جناب ایڈوانی کی بھتیجی نے ایک مسلمان لڑکے سے شادی کی - لیکن یہ مثالیں عمومیت کی قبا نہیں پہن سکتیں - ان مٹھی بھر مثالوں سے یہ نتیجہ کیسے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شادی بیاہ کے معاملے میں ذات

برادری یا مذہب کی پابندی نہیں ہے۔

ہمیں پاکستان سے کیا لینا دینا ہمیں تو اپنے مسائل کو حل کرنا چاہیئے۔ ہم ہندوستانی ہیں اور اسی کے دائرے میں ہمیں متحد ہو کر رہنا چاہیئے۔ لیکن جناب رام پرکاش کپور کا یہ کہنا پاکستان سے آئے لوگ کسی شہر میں چلے جائیں تو ان میں اور مقامی لوگوں میں تمیز کرنا مشکل ہو جائے گا، کوئی نئی بات نہیں پیش کرتا۔ یہی بات مشرقی اور مغربی بنگال والوں پر بھی صحیح ہے، صرف ہریانہ اور پنجاب ہی کے لئے کیوں؟ یوں تو ہمارا ملک اتنا وسیع ہے کہ سو کلومیٹر کے فاصلے پر بھی زبان اور رہن سہن کا فرق محسوس ہونے لگتا ہے۔ یو۔پی کا باشندہ تامل ناڈو، کیرالا وغیرہ میں خود کو اجنبی محسوس کرے گا مگر پھر بھی اسے احساس ہوگا کہ وہ اپنے ہی ملک میں ہے۔ یہ ایک ادنیٰ مثال ہے کہ یہاں Diversity کے باوجود Unity ہے۔

انہوں نے دو حوالے بھی دیئے ہیں جن میں ایک مولانا آزاد کی بات کا اقتباس ہے۔ کاش جناب جناح کو وہ بات بھی یاد ہوتی جو انہوں نے وہاں سے ہجرت کرنے والوں سے التجا کر کے کہی تھی۔

بہرحال مجھے کوئی خوش فہمی نہ تھی اور نہ ہے۔ لیکن اگر میں نے ان کی غلط فہمی دور کرنے میں اگر ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے تو میں مؤدبانہ طور پر ان سے معذرت چاہتا ہوں کیونکہ میرا مقصد کسی کو دکھ پہنچانا نہیں تھا بلکہ حقائق سے روشناس کرانا تھا۔ لیکن اگر کوئی نہ مانے تو معذرت کرنے کے علاوہ چارہ بھی کیا ہے؟

خورشید ملک

شاہجہاں پور

ooooo

○ عید نمبر کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ افسانوی حصہ بڑا جاذب النظر ہے۔ چار کہانیوں اور ایک انشائیہ پر مشتمل یہ گوشہ تقریباً کئی ماہ بعد دیکھنے کو ملا۔ ساتھ ہی اچھی کہانیوں اور بامقصد مواد کی فراہمی سے ان کہانیوں میں زندگی کے اتار چڑھاؤ اور حالات سے پیدا ہونے والے تاثرات و احساسات کا حقیقی نقشہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اقبال حسن آزاد کی کہانی بہت اچھی لگی لیکن کہانی کا انجام کچھ پھیکا پھیکا سا نظر آیا۔ آج کل کہانیوں میں ایک رسمی بھرسی چل پڑی ہے۔ کہانی کا آغاز خواہ کہیں سے بھی ہو لیکن کہانی کا انجام کہانی کے عنوان کی معنویت شامل کئے بغیر انجام پذیر نہیں ہوتا۔ چنانچہ اکثر کہانیاں یا تو قبل از وقت اپنا آخری تاثر بالجبر اگل دیتی ہیں یا پھر بعض کہانیاں اپنے آخری اور اصلی تاثرات سے محروم رہ جاتی ہیں۔ جب کہ کہانی کا آخری تاثر ہی کہانی کی کامیابی کا اصل محرک ہوتا ہے۔ بالخصوص تاثراتی یا تجریدی کہانیوں میں ان تاثرات کا ہونا لازمی ہے۔

پروین شاکر کی اچانک موت اردو شاعری کے لئے ایک عظیم سانحہ ہے۔ ترقی کی راہ پر گامزن اس مقبول و معروف شاعرہ نے اردو شاعری کو جو نیا زخم دیا ہے وہ شاید بدلتے ہوئے وقت کے موسم میں مندمل ہو جائے لیکن اس خلا کو پر کرنے میں اردو شاعری کی زرخیز زمین کو بہت وقت لگے گا۔ "خوشبو" سے متعلق کچھ اور تحریریں پیش کریں۔

مسرور تمیر (مونگیر)

ooooo

○ عید نمبر کے سلسلے میں سب سے پہلے تو سرورق کی سادگی اور پرکاری کی داد دیتا ہوں۔ پھر عید پر نظمیں خوب ہیں لیکن آپ کی نظم "میٹرو عید" بہت خوبصورت تہنیت ہے۔ آپ نے ریلوے اور سارے ملک کو بہت عمدہ اور انوکھا تحفہ پیش کیا ہے۔ مبارک ہو۔

رسالہ مذہب، تاریخ، فن تعمیر شعر و ادب سائنس، فلم، اخبار، تنقید و تبصرہ غرض ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ بہتر اپنے دامن میں سمیٹے ہے اور خاصہ متنوع ہے۔

سید احمد سحر (شاہجہاں پور)

ooooo

○ انشاء کا عید نمبر موصول ہوا "آپ کی ڈاک" میں شکیل گوالیاری کا مکتوب پڑھا۔ جواباً عرض ہے۔ بعض خوبیوں کے پیش نظر بعض خامیاں لائق اعتنا نہیں ہوتی بلکہ بعض خوبیوں کے پیش نظر بعض خامیوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن زیر بحث اشعار

ہزار رنج سہی آؤ ہم گلے مل لیں
کہ عید کا رہے کچھ تو وقار عید کے دن
شراب عیش و مسرت کی آج جی بھر کر
پیو! ہر اک کو پلاؤ کہ عید کا دن ہے

ارکان ثلاثہ سے مبرا و مستثنیٰ ہیں اس لئے رعایت کا جواز پیدا نہیں ہوتا آپ کے خیال شریف میں اگر کوئی رکن کار فرما ہے تو اس کی نشاندہی کیجئے۔ عمل جراحی کا المیہ ہے کہ نونہال اسے ظالمانہ سلوک سے تعبیر کرتے ہیں جب کہ بالغ نظر باعث رحمت سمجھتے ہیں۔ واللہ اعلم ف۔ س۔ اعجاز صاحب پر کیا افنا

آرزو تھی کہ انھوں نے لتنے ناسپاسہ اشعار نمایاں طور پر اہتمام کے ساتھ شائع کئے۔ انشاء کے آخری حصے میں کہیں پر بھی خانک دیتے تو یہ افسانہ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہوجاتا۔ میرے عزیز میرے بھائی شکیل صاحب میں آپ کے خلوص کی قدر کرتا ہوں اللہ کرے حسن ظن اور زیادہ۔ آپ نے تعمیمی اشعار کی جس طرح وکالت کی ہے وہ دائرہ اعتدال سے باہر کی بات ہے۔ جو تنقید اعتدال پر مبنی نہ ہو تعریف یا تنقیص ہو سکتی ہے تنقید نہیں اردو پر عربی کی تمام ترحکمرانی نہیں ہے۔

(۱) عربی میں رقیب کے معنی نگہبان اور اردو میں بقول غالب

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

(۲) تسلیم شدہ انیس (۱۹) بحریں عربی میں مستعمل ہیں جب کہ اردو میں صرف بارہ (۱۲) ہیں۔

(۳) سناد یعنی اختلاف ردف فارسی اور اردو میں محض ناجائز ہے جب کہ اہل عرب ردف یا اور ردف واؤ کا قافیہ درست رکھتے ہیں جیسے جمیل و نزول، منیرو بدور وغیرہ نیز اختلاف ردف زائد بھی عربی میں جائز ہے جیسے گوشت و پوست الغرض ایسے بے شمار مقامات ہیں جہاں اردو اور عربی شتر گربہ کا رول ادا کرتی ہیں یوں بھی ہر زبان کا اپنا آہنگ اپنا مزاج ہوتا ہے۔ آپ نے ناحق عربی کے ہوے کو زحمت دی۔

"مراسلہ نگار کو بے جا حوالے کی ضرورت نہ تھی" کے سلسلے میں عرض ہے ڈاکٹر اوم پرکاش اگروال زار علامی کا مضمون "عروض دانی فاروقی" کتاب نما جنوری ۹۴ صفحہ ۲۷-۳۷ شائع ہوا ہے اس کو ملاحظہ فرمائیں یا اپنا پورا پتہ تحریر کریں تاکہ فوٹو اسٹیٹ کاپی آپ کو روانہ کی جاسکے۔ زار علامی کے مضمون کی روشنی میں وہ چہرہ مسخ ہو کر رہ جاتا ہے جسے ہم شمس الرحمٰن فاروقی کے نام سے جانتے ہیں۔ از روئے انصاف فاروقی صاحب کی عروضی لغزشوں سے انکار کیا جاسکتا ہے نہ ادبی خدمات سے انحراف۔

مشتاق شاہجہاں پوری
محلہ ستار گنج۔ تلہر (یوپی)

OOOOO

O آپ کا انشاء اپنی معجزانہ شان کے ساتھ خصوصی پیشکش کی شکل میں جلوہ گر ہوا اور پھر عید نمبر نئی سج دھج کے ساتھ نمودار ہوا، لیکن میں اپنی طویل علالت کے باعث وصول یابی کی اطلاع نہ دے سکا۔ معاف فرمائیں گے۔ اردو کے تعلق سے آج کے حوصلہ شکن حالات میں سوداگرانہ ذہنیت کو بالائے طاق رکھ کر خلوص دل کے ساتھ صحت مند ادب کے چراغ روشن کرنا ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے جو آپ انجام دے رہے ہیں۔ نظم و نثر کا انتخاب خوب سے خوب تر ہے۔ مقصود الہٰی شیخ کا افسانہ "جھوٹ بولتی آنکھیں" عظیم ادب کا حصہ ہے۔ عراقی پر حیدر طباطبائی کا مضمون بہت ہی اہم اور معلوماتی ہے۔ یاس یگانہ پر بہت کم لکھا جاتا ہے۔ عموماً انہیں ایک خطا کی پاداش میں ہمارے نقاد نظر انداز کرتے رہے ہیں۔ آپ نے یہ مضمون شامل کرکے پھر ایک بار اس کی اہمیت کا احساس دلایا ہے۔ آپ کی یہ خصوصی پیشکش ایک تاریخ ساز کارنامہ ہے۔

کلیم الدین شمس سے سید منیر نیازی کے لئے گئے انٹرویو کے سلسلے میں عرض ہے کہ مسلمانوں کے لئے ریزرویشن کی بات کسی طرح مناسب نظر نہیں آتی۔ مذہب کی بنیاد پر اگر مسلمانوں کو ریزرویشن دیا گیا تو دوسرے مذاہب کے لوگ جو اقلیت میں ہیں ان کی جانب سے بھی اس قسم کا مطالبہ سر اٹھا سکتا ہے جو بے جا نہ ہوگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ مسلمانوں کے لئے ریزرویشن اس لئے بھی حق بہ جانب ہے کہ وہ سب سے زیادہ ذلت و پستی کی زندگی گزار رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ رحم و کرم کی بھیک پر ہی ہمارا گزارا ہو سکتا ہے۔ اس بھیک کو ہم اپنا حق کہہ کر طلب کر رہے ہیں۔ رہا سوال یہ کہ مقابلوں کے امتحانات میں مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کی جاتی ہے تو اس کے لئے صدائے احتجاج بلند کی جاسکتی ہے یہاں ایک دلچسپ واقعہ سن لیجئے۔

میرے ایک دوست ملازمت کے لئے زبانی امتحان میں صرف اس لئے فیل کردیئے جاتے تھے کہ نوجوانی میں ان کے چہرے پر بڑی سی ڈاڑھی تھی ہر ممتحن پہلا سوال یہی داغ دیتا تھا کہ اس عمر میں ڈاڑھی کیوں، اس کے بعد تمام گفت و شنید کے دوران بدمزگی رہتی۔ بالآخر فیل کردیئے جاتے۔ ایک مرتبہ میرے دوست جیسے ہی ممتحن کے کمرے میں داخل ہوئے سامنے سردارجی رونق افروز تھے۔ دوست نے خوشی کا اظہار کیا۔ سردارجی نے دریافت کیا کہ خوشی کس بات کی؟۔ کہا آپ کم از کم مجھ سے میری ڈاڑھی پر سوال نہیں کریں گے۔ پھر کیا تھا ایک خوش گوار ماحول آخر تک رہا اور نتیجے میں بھی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس طرح کی دقتیں پیش آتی ہیں لیکن یہاں بھی امیدوار کی ذہانت کا امتحان ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ خواہ مخواہ احساس کمتری کا مرض لگا ہوا ہے جسے یہ سیاسی لیڈر بجائے کم کرنے کے بڑھاتے رہتے ہیں۔

شکیل گوالیاری (گوالیار)

OOOOO

O "انشاء" کا تازہ شمارہ مئی ۹۵ء نظر نواز ہوا۔ "آپ کی ڈاک" کے کالم میں خورشید ملک کے مراسلہ کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا

ہوں - یہ مراسلہ نہ صرف یہ کہ ذہنی کم مائیگی کا نمونہ ہے بلکہ احساس کمتری کا شکار ایک کج فہم عام نہاد ادیب کی دریدہ دہنی کا بھی شکار ہے - مجھے شکوہ یہ ہے کہ آپ نے اسے "انشاء" جیسے مہذب، معیاری اور ادبی جریدہ میں شائع ہی کیوں کیا - صرف اس لئے کہ مراسلہ نگار نے شروع میں جانی بوجھی مصلحت کے تحت آپ پر یہ گھناؤنا الزام لگایا ہے کہ آپ خوشامد پسند ہیں اور صرف تعریفی خطوط ہی شائع فرماتے ہیں - حالانکہ "انشاء" کے ہزاروں قارئین میں ہر شخص جانتا ہے کہ کم سواد، خوشامد پسند ادیبوں کا آپ سے دور دور کا کوئی رشتہ نہیں اور یہ کہ آپ صرف تعریفی خط نہیں بلکہ متوازن ادبی اور علمی انداز کے خطوط ہی شائع کرتے ہیں - موصوف کو اس پر اعتراض ہے کہ "انشاء" کا سوواں شمارہ (صدی نمبر) جو دو سو صفحات پر مبنی ہے میں چالیس سے زیادہ اشتہارات آپ نے کیوں شائع کئے - افسوس! کہ ملک صاحب کو عصر حاضر کی صحافت کی ابجد کی بھی آگہی نہیں ہے وہ ذرا انگریزی اور ہندی کے معیاری ہفتہ وار اور ماہنامے اٹھا کر دیکھیں تو انھیں پتہ چلے گا کہ ان کے صفحات میں اشتہارات اور مضامین کے درمیان کیا نسبت ہوتی ہے - انھیں یہ بھی خبر نہیں کہ کسی ادبی جریدے کو زندہ رکھنے کے لئے آج خریدار نہیں بلکہ اشتہارات شہ رگ کا کام دیتے ہیں -

موصوف اپنے مکتوب کے آخری پیراگراف میں میرے مضمون "گوپی چند نارنگ - کردار اور گفتار اپنے خطوط کے آئینے میں" کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ "اس مضمون سے نہ صرف گوپی چند نارنگ ناراض ہیں بلکہ خود رام لعل بھی خفا ہیں - میں دونوں حضرات سے عزیزی وسیم بینائی کی طرف سے معذرت چاہتا ہوں" -

پہلی بات تو یہ ہے کہ خورشید ملک صاحب کو میں نے اپنے مضمون کے لئے کسی سے معذرت چاہنے کا حق کبھی نہیں دیا اور نہ میں خود اس مضمون کے لئے کسی سے معذرت خواہ ہوا اور نہ آئندہ معذرت خواہ ہونے کا ارادہ ہے - میں اپنی تحریر بہت سوچ سمجھ کر اور مکمل احساس ذمہ داری کے ساتھ لکھتا ہوں - موصوف نے اسی پیراگراف میں اوپر لکھا ہے "مضمون میں انھوں نے (یعنی میں نے) کوئی نئی بات نہیں لکھی - جو کچھ لکھنا تھا وہ میں نے اپنی کتاب میں لکھ دیا ہے" -

اگر بقول خورشید ملک میرے مضمون میں گوپی چند نارنگ کے بارے میں صرف وہی باتیں درج ہیں جو وہ رام لعل کے مجموعہ خطوط (قندِ مکرر) کے حاشیوں میں لکھ چکے ہیں تو پھر میرے مضمون سے نارنگ جی یا رام لعل کو خفا ہونے کی کیا ضرورت تھی - ان کی خفگی اور برہمی کا نشانہ تو خورشید ملک کو ہونا چاہیے - اس لئے کہ بقول ان کے میں نے اپنے مضمون میں ان کی لکھی ہوئی باتوں کو دہرایا ہے - اس صورت میں ملک صاحب کو میرے مضمون کے لئے نارنگ جی یا رام لعل سے معذرت چاہنے کے بجائے "قندِ مکرر" میں انھوں نے نارنگ کے خلاف جس دریدہ دہنی سے لکھا ہے اس کے لئے انھیں اپنی ندامت کا اظہار کرنا چاہیے اور معذرت خواہ ہونا چاہیے -

میں نے اپنے مضمون میں ابتدا ہی میں گوپی چند نارنگ کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کیا تھا - ساتھ ہی ان کے کردار کی ان کمزوریوں کی طرف بھی اشارہ کیا تھا جو ان کے خطوط میں مجھے نظر آئیں - نارنگ سے بھی زیادہ بلند اور محترم شخصیتیں بے ساختہ انداز میں خط لکھتے ہوئے کبھی کبھی اپنی سیرت کے نہایت کمزور اور معیوب پہلوؤں کو بے نقاب کرتی رہی ہیں - صرف ایک مثال لے لیجئے، مرزا غالب جیسے عظیم شاعر اور ادیب نے ایک موقع پر جب نواب رام پور کی مالی امداد کے لئے لکھا تو اس میں ایک عزیز دوست مفتی صدر الدین آزردہ کی بیوی کی اس درخواست کی درپردہ مخالفت کی جس میں انھوں نے نواب رام پور سے اپنے گزارے کے لئے مالی امداد چاہی تھی - مرزا غالب نے لکھا کہ اس سے زیادہ میں امداد کا مستحق ہوں - ظاہر ہے کہ یہ غالب کی سیرت کا بہت پست پہلو تھا لیکن اس سے ان کا ادبی اور فنی قامت کم نہیں ہوتا صرف ان کا کردار داغدار ہو جاتا ہے - خورشید ملک صاحب لکھتے ہیں کہ "محض چند خطوط کی بناء پر اس قدآور شخصیت کو تولنا یقیناً غلط ہے"، میری گزارش یہ ہے کہ خطوط ہی کے آئینہ میں کسی شخصیت کے حقیقی اور باطنی خد و خال کو پڑھا جاسکتا ہے - اگر ضرورت ہوئی تو اس سلسلہ میں مزید ان گنت مثالیں پیش کروں گا - نارنگ صاحب پر میرا جو مضمون شائع ہوا اصل میں اس کے لکھنے کی ترغیب مجھے خورشید ملک صاحب ہی سے ملی - اس طرح کہ وہ اپنی یہ کتاب لے کر میرے غریب خانہ پر تشریف لائے اور اصرار کیا کہ میں مذکورہ کتاب (قندِ مکرر) پر کچھ لکھوں - میں نے جب اس کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تو اس میں شامل نارنگ جی کے خطوط اور ملک صاحب کے ان پر لکھے حاشیوں نے مجھے خصوصیت سے متاثر کیا اور اس طرح ایک ہی نشست میں وہ مضمون مکمل ہوگیا - اس میں ہر بات میں نے استدلال اور مثالوں کے ساتھ لکھی - البتہ خورشید ملک صاحب کا یہ مراسلہ جو شائع ہوا ہے بے حد جذباتی، غیر ذمہ دارانہ اور اشتعال انگیز ہے -

وسیم بینائی
تارین جلال نگر - شاہجہاں پور

ooooo

مشرقی ہندوستان کا بہترین اور واحد بین الاقوامی اُردو رسالہ

ماہنامہ انشاء کلکتہ

جلد ۱۰	نومبر ۱۹۹۵ء	شمارہ ۱۱

فہرست

مدیر: ف۔س۔ اعجاز

فی شمارہ : ۸ روپے

زر سالانہ : ۹۰ روپے

مغربی ممالک سے : ۱۲ پونڈ یا

۲۰ ، امریکی ڈالر

رقومات بذریعہ منی آرڈر / بینک ڈرافٹ، چیک صرف "انشاء پبلی کیشنز" کے نام میں روانہ فرمائیں ورنہ قابل قبول نہ ہوں گی۔ برطانیہ سے BPO کے ذریعہ رقومات بھیجی جائیں۔

خط و کتابت، مضامین بھیجنے اور ترسیل زر کا پتہ :

ماہنامہ انشاء انشاء پبلی کیشنز ۲۵-بی زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳، فون: ۲۵-۴۱۶

انشاء

کا

اسکنڈے نیویائی ادب نمبر

ایک تاریخ ساز ضخیم شمارہ

جس میں براعظم اسکنڈے نیویا
کے اصل اردو ادب اور اصل علاقائی
ادب کے اردو تراجم بہت نئے
اور منفرد انداز سے پیش کیے گئے
ہیں۔

قیمت : اندرون ملک ۔۔ ۳۰ روپے
بیرون ملک ۳۰ امریکی ڈالر
یا ۲۰ برطانوی پونڈ

مجلہ انشاء کلکتہ

دستخط کنندہ کا دستخط

آدمی سیکھنا چاہتا ہے۔ پڑھنا چاہتا ہے۔
جاننا اور سمجھنا چاہتا ہے۔

آدمی کو بیدار کرنے کے لیے اس راہ عمل
میں آپ بھی آگے بڑھیں۔

حکومت مغربی بنگال

4634 ICA / Advt

احترام کس کا اشوک سنگھل ؟

تقریباً ۴۰۰ سال بعد مکمل سورج گرہن کے نتیجے میں زمین پر ایک انوکھا اندھیرا چھا گیا لیکن اس کالے وقت میں بھی ہندو بنیاد پرستی کا سورج بڑی آب و تاب کے ساتھ نصف النہار پر چمکتا رہا۔ مہاراشٹر میں شیو سینا چیف بال ٹھاکرے، وشو ہندو پریشد کے سکریٹری اشوک سنگھل، بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈر لال کرشن اڈوانی، مرلی منوہر جوشی، کلیان سنگھ، اوما بھارتی، سادھوی رتمبرا کی زہریلی تقریروں سے جو وہ ہندی مسلمانوں کے خلاف کرتے ہیں سارا آسمان اور فصیلِ کشور ہندوستان گونج رہے ہیں۔

مسلمان غدار ہیں۔
مسلمان ملک کے دشمن ہیں۔
مسلمان کی شرح غلط ہے۔
مسلمان عورتوں سے برا اور ظالمانہ سلوک کرتے ہیں۔
مسلمان نیچی ذات کے ہندوؤں کو قبول اسلام پر اکساتے ہیں۔ مسلمان مرد اوروں کی لڑکیاں بھگا کر لے جاتے ہیں اور ان سے شادی کر لیتے ہیں۔
مسلمان بچے زیادہ پیدا کرتے ہیں جس سے ہندو آبادی کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ وہ چار چار شادیاں کرتے ہیں۔
مسلمانوں کا یہاں ہندوستان میں کچھ نہیں ہے۔ انہیں سرحد پار کر کے اپنے اصل وطن پاکستان چلے جانا چاہیے۔

یہ لوگ کہیں تقریر کریں، کسی اخبار کے ذریعہ اپنا پرچار کریں ان کا لب لباب یہی ہوتا ہے۔ مسلمان کو وہ ریوڑ سمجھتے ہیں۔ لیکن کیا مسلمان ان کا لقمۂ تر بن پائے گا؟ ابھی وشو ہندو پریشد نے پورے ملک میں ایکتا تا یاترا کا آغاز کیا ہے۔ اس سلسلے میں کلکتہ کے شہید مینار میدان میں اس زہریلی تنظیم کے سکریٹری اشوک سنگھل اور شعلہ بیان مقررہ سادھوی رتمبرا نے اپنی تقریروں کے ذریعہ دہشت پھیلائی۔ سادھوی نے اپنے گلے کی نسیں پھلا کر پوری طاقت کے ساتھ کہا "مسلمانوں نے میری ماں کو کبھی اپنی ماں نہیں سمجھا پھر بھی میری ماں کا بٹوارہ ہوا۔ کوئی اگر اپنی ماں کو قتل کرتا ہے تو اس کے ساتھ دوستی اور رشتہ کیسا ہے؟ .... پورے ملک میں ۳۶ ہزار مذبح ہیں جہاں روزانہ گائیں ذبح کی جاتی ہیں۔ ہمارے نام نہاد سیکولر لیڈروں کا کہنا ہے کہ بوڑھی گائے ذبح کی جاتی ہے۔ اگر بوڑھی چیزوں سے اتنی ہی نفرت ہے تو مسلمان اپنے بوڑھے ماں باپ کو قتل کیوں نہیں کرتے؟"۔

سنگھل نے کہا کہ اگر مسلمانوں کو ملک میں رہنا ہے تو انہیں بھارت ماتا کہنا ہوگا اور رام کو اپنا باپ دادا تسلیم کرنا ہوگا۔ ملک میں مسلمان اسلامستان اور عیسائی بائبل ہوم لینڈ بنانے کی سازش میں مصروف ہیں۔ ایک کروڑ پچھتر لاکھ مسلمان سرحدی اضلاع میں باہر سے آکر بس گئے ہیں۔

نرسمہا راؤ کی حکومت ہیجڑوں کی حکومت ہے جو عیسائیوں اور مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہی ہے

اشوک سنگھل نے یہ بھی کہا کہ قرآن میں کہیں بھی نہیں لکھا ہے کہ گائے کی قربانی ضروری ہے یا مسلمان گوشت کے لئے گائے کو قتل کریں۔ اس کے باوجود وہ صرف اس لئے گائے کو قتل کرتے ہیں کہ اسے ہندو پوجتا ہے۔ لہٰذا اس سال کو وشو ہندو پریشد گائے تحفظ کا سال قرار دیتی ہے اور ۲۰ ہزار رضاکار گئو رکھشا کی ڈیوٹی پر مامور کئے جائیں گے۔

مسلمانوں کو سنگھل نے دھمکی دی کہ اگر آئندہ بقرعید میں ایک گائے بھی قتل کی گئی تو کالی دیوی کی مورتی کے چرنوں میں ان کے سر کاٹ کر رکھ دیئے جائیں گے۔ ان لوگوں نے یہ بھی کہا کہ اگر نرسمہا راؤ نے سازش کے تحت بابری مسجد دوبارہ بنادی تو ہر مسجد میں ہر ہر مہادیو بسا دیئے جائیں گے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہمارا احترام کرنا سیکھیں۔

ہندو بنیاد پرستی کو ہوا دے کر ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے نفرت کا ماحول بنایا جا رہا ہے۔ جائز ناجائز کسی بھی طریقے سے کٹر پنتھیوں کو دلی کے راج سنگھاسن پر قبضہ جمانا مقصود ہے۔ اس کے لئے ملک میں ووٹروں کی عددی ترکیب کو اس حد تک بگاڑ دینا ضروری ہے کہ ہندوستان کی جمہوریت بے توازنی کا شکار ہو کر ان کے قدموں میں گر پڑے اور پھر وہ ان کے لئے قابل استحصال بن جائے۔ ان لوگوں نے اقتدار کی ہوس میں ظلم و استبداد کی وہ طرحیں ایجاد کی ہیں کہ چنگیز، ہلاکو اور ہٹلر کی مثالوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ کیسے کیسے زہریلے سانپ مہذب شہری سماج میں آزادانہ گھوم پھر رہے ہیں۔ ملک میں اکثریت کی بنا پر کوئی بھی پارٹی حکومت کر سکتی ہے۔ ہندو فرقے کو ہی اکثریت میں رہنا ہے اور وہی اکثریت میں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ اکثریت متحد نہیں ہے۔ ہندوؤں میں دھارمک دھاروں میں بڑی رنگا رنگی اور اختلاف پایا جاتا ہے۔ نظریاتی اتفاق کی غیر موجودگی اور گروہی مفاد پرستی نے ہندو سماج کو بری طرح منتشر کر رکھا ہے۔ ایک عقیدے اور ایک وحدت کے بندھن میں نہ بندھے ہونے کے سبب کسی دیرپا اور صحتمند سیاسی انقلاب کا جنم نہیں ہو رہا ہے۔ پرپنچ ---- جمہوری نہیں بلکہ فرقہ وارانہ اور طبقہ جاتی پرپنچ ---- جن کے ذہنوں میں گھسا ہوا ہو وہ نیتا الفت کا ترانہ کیسے گا سکتے ہیں۔

اس کالے وقت میں ملک میں کہیں بھی کوئی حکومت دستور کی حرمت کو محفوظ رکھنے میں کامیاب نہیں ہے۔ ایک مغربی بنگال کی حکومت استثنیٰ کی حیثیت رکھتی تھی لیکن اب کے کلکتہ میں بایاں محاذ حکومت کے زیر سایہ ہی اشوک سنگھل اور سادھوی رتمبرا ڈنکے کی چوٹ پر یہ باتیں کہہ گئے اور مسلمانوں کو گالیاں اور قتل کی دھمکیاں سنا کر چلتے بنے۔ کیا بگاڑ لیا کسی نے ان کا ؟۔ اگر دستور اور قانون کا لحاظ ہوتا تو ان فسادیوں کو اسی وقت گرفتار کر کے جیل کی کوٹھری میں ڈال دیا جاتا۔ لیکن ایسی باتوں کا وزیر اعلیٰ مغربی بنگال شری جیوتی باسو نے نوٹس نہیں لیا۔ اگر انہوں نے اپنے "مون برت" کے ذریعہ کسی مصلحت کا ثبوت دینا چاہا ہے تو اس میں کیا شک رہ جاتا ہے کہ مصلحت بزدلی کا دوسرا نام ہے۔ اگلے پارلیمانی چناؤ میں غیر کانگریسی اور غیر بی جے پی طاقتوں کا جو سیکولر محاذ ٹکر لینے والا ہے اس کے بیشتر شرکاء شری جیوتی باسو کو وزیر اعظم بننے کی دعوت دیتے آ رہے ہیں جو انہیں منظور نہیں ہے۔ نہیں ہے تو نہ سہی لیکن جس مقبول اور بااثر ہستی سے ایسی نیک توقع قائم کی جاتی ہے اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ قانون کی حاکمیت قائم کرنے میں کبھی چوکے نہیں اور لوگوں کی جائز توقعات پر پورا اترنے کی سعی کرتا ہے۔ یہ ذمہ داری اسے عوامی زندگی کا قرض اتارنے کے لئے ملتی ہے۔ زبان خلق کو نقارۂ خدا آخر کیوں کہا جاتا ہے ؟۔

مسلمان غدار ہیں، دیش دروہی ہیں۔ یہ کوئی کیسے کہہ سکتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ جن عہدوں پر بیٹھ کر وطن سے بے وفائی اور غداری کی جا سکتی ہے مسلمانوں کو ان کا اہل نہیں سمجھا جاتا۔ اور وہ ان عہدوں پر فائز نہیں کئے جاتے۔ ڈیفنس، اہم پولیس انتظامیہ اور خارجی امور مسلمانوں کے بس میں نہیں ہیں۔

مسلمانوں کی شریعت پر معترض ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کی شریعت ان کے لئے ٹھیک ہے اور کسی دیگر قوم کو اس سے کچھ نقصان نہیں ہے۔ مسلمان اپنی عورتوں سے برا سلوک کرتے ہیں۔ یہ

ایک تہمت ہے ۔ ہر آدمی مسلمان ہو یا کوئی اور اپنی عورت سے برا سلوک کر سکتا ہے ۔ اس کے لئے مسلمان مرد کو ہی کیوں بدنام کیا جاتا ہے ۔ اسلام نے عورت کو اچھا اور محفوظ مقام دیا ہے ۔ تنقید کے لئے برے ہی نمونوں کو کیوں پیش کیا جاتا ہے اور اگر تصویر کا ایک ہی رخ دکھانا مقصود ہو تو ہندو سماج میں عورت کی ستی کی رسم کا ذکر بھی کرنا چاہیے ۔ جو اب تک ملک میں زندہ ہے بلکہ اسے زعفرانی نیتا ایک نئی طاقت کے ساتھ عام کرنا چاہتے ہیں ۔ ایک شنکر آچاریہ تو ہندو عورت کو وید پڑھنے کا حق ہی نہیں دیتے اور جو ناری وید کو ہاتھ لگائے یا پڑھ سے الجھے اسے وہ مہاشے بر سر عام تھپڑ مارتے ہیں ۔ بیواؤں کو ، خصوصاً جوان بیواؤں کو روایتی ہندو سماج اچھی نظر سے نہیں دیکھتا ۔ مسلمان تبدیلیء مذہب کے لئے دوسروں کو اکساتے ہیں ۔ یہ بھی جھوٹا الزام ہے ۔ بلکہ یہ حقیقت سے کوسوں دور کی بات ہے ۔ کٹر پنتھیوں کو اس کا صدمہ لگا ہوا ہے ۔ اور سچ بات کہنے کی ان میں جرأت نہیں ہے ۔ ان کے سماج میں مساوات کا چلن نہیں ہے ۔ بالاتر طبقے کے ستم ، چھوا چھوت اور بد سلوکی کے ہاتھوں مجبور ہو کر پست درجے کے لوگ از خود اجتماعی طور پر اپنے من کی آزادی سے کوئی دوسرا مذہب قبول کر لیتے ہیں ۔ جہاں انہیں نفرت سے دیکھنے والی آنکھوں سے نجات مل جاتی ہے ۔ انسان اپنے لئے آبرومندانہ پناہ اور آسودگی ڈھونڈنے پر مجبور ہے ۔ لیکن مسلمانوں کو اس بات کی کون سی ایسی خوشی ہوگی کہ ان کی برادری میں کوئی بناوٹی طور پر کلمہ پڑھ کر گھس آئے ۔ مسلمان کو تو خود ہی روزی روٹی کے لالے پڑے ہوئے ہیں ۔ اسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ اپنی روٹی کو آدھا کرے ۔ دراصل یہ نچلے طبقے کے ہندوؤں کی اعلیٰ طبقے سے ایک انتقامی کارروائی ہوتی ہے جس سے متعلقہ لوگوں کا تشویش میں مبتلا ہونا اور شورش پھیلانا ایک فطری رد عمل ہے ۔ مگر کاش وہ دوسروں کو مورد الزام ٹھہرانے کے بجائے اپنی برائیوں کا تدارک کرتے ۔

آج کل ہندوؤں اور مسلمانوں میں جھگڑے اور فساد کے اندیشے کے باوجود بین المذہبی شادیاں عام ہونے لگی ہیں ۔ کسی کو فکر ہے کہ مسلمان لڑکا ہندو لڑکی کو بھگا کر لے گیا تو کسی کو شکایت ہے کہ مسلمان لڑکی کو ہندو لڑکا لے اڑا ۔ اگرچہ یہ چلن پہلے سے زیادہ عام ہو گیا ہے لیکن مجموعی طور پر ہندو مسلم دونوں معاشروں میں پہلے سے زیادہ آزادی پانے کے سبب لڑکوں لڑکیوں کا باہمی میل جول آسان ہو گیا ہے دل لگی کی شادیوں پر اب پہلے جیسی بندش لگانا مشکل ہو چکا ہے ۔ کروڑوں کی آبادی میں دو ایک فلمی انداز کے رنگیلے بندھن روز قائم ہوتے رہتے ہیں ۔ جس پر حیرت کا اظہار کرنا بجائے خود تعجب کی بات ہے ۔ لیکن ایسی باتیں سنگھل اور دوسروں کو پریشان کئے دے رہی ہیں

ایسے ایسے فتنے کھڑے کرنے کی کسی کو کیا ضرورت ہے ۔ آپ مسلمانوں سے کیوں کہتے ہیں کہ تم پاکستان چلے جاؤ ۔ پاکستان جن کی طلب اور منزل تھا وہ وہاں جا چکے ہیں ، وہاں سما چکے ہیں ۔ اب وہ جانیں ان کا خدا جانے ۔ آپ اپنے من کے انتشار پر قابو پالیجے ۔ ہمارے اپنے بن جائیے ۔ ہمارے مفادات کا تحفظ کیجئے ۔ ہندوستانی بن کر سوچئے ۔ ہم آپ کو اپنے ووٹ دے دیں گے ۔ آپ کو اپنا لیڈر چن لیں گے ۔ آپ کی صاف گوئی قابل داد ہے کہ آپ لگی لپٹی نہیں کہتے ۔ آپ ہمارے کھلے دشمن ہیں چھپے دشمن نہیں ہیں ۔ ہمیں بھی اچھا نہیں لگتا کہ ووٹ ہم دوسری پارٹیوں کو دیں اور دہائی آپ کے نام کی دیں ۔ پناہ کے طلبگار آپ سے بنیں ۔

بال ٹھاکرے اور اشوک سنگھل وغیرہ نے مسلمانوں کی نظر میں اپنی الگ شناخت بنا رکھی ہے ۔ لیکن یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم انہیں وطن شریک بھائی سمجھتے ہوئے اپنا مافی الضمیر سمجھانے کی کوشش کریں ۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان ان کے دیوتاؤں اور اوتاروں کا ویسا ہی احترام کریں جیسا وہ خود کرتے ہیں تو صاف عرض ہے کہ یہ ہمارے لئے ممکن نہیں ۔ اور اس بنا پر کوئی صاحب فہم ہمیں وطن دشمن ثابت نہیں کر سکتا ۔ ان کا ایسا امید رکھنا ان کی نادانی پر مبنی ہے ۔ کیا وہ ہمارے پیشواؤں کا احترام اسی طرح کریں گے جس طرح ہم شری رام اور شری کرشن کا کرتے ہیں ۔ کیا وہ ہمارے صوفیاء اور بزرگان دین کو اتنا ہی محترم جانتے ہیں جتنا ہم سوامی وویک آنند یا شری راما کرشنا کو ان کی اخلاقی و روحانی تعلیمات اور بھگتی کی بنا پر مانتے ہیں ۔ یقیناً ایسا نہیں ہے اور بال ٹھاکرے ، رجو بھیا ، سنگھل ، اڈوانی تو سیکولرزم میں بھی یقین نہیں رکھتے تو پھر وہ ہم سے ایسی امید کیوں رکھتے ہیں ؟ ۔ انڈیا کے مسلمان اگر گائے کھاتے ہیں تو گائے خوری ان پر قرآن نے فرض نہیں

کی ۔ سیدھی سی بات ہے ، ہر قوم کی خورد و نوش اور پہناوے کی عادت اس کے مذہب کی دی گئی آزادی اور جغرافیائی حالات کے سہارے پروان چڑھتی ہے ۔ صدیوں سے ہندوؤں میں گائے کھانے کا رواج نہیں ہے ۔ ماضی میں ہندوؤں میں گائے کھانے یا نہ کھانے کے بارے میں اچھا خاصا اختلاف پایا جاتا ہے ۔ بعض روشن خیال یا لبرل مائنڈ کے ہندو ہمارے صوبے میں گائے کا گوشت کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے ۔ لیکن یہ بات مسلمانوں کی دلچسپی کی نہیں ہے ۔ ہندومت کو اجتماع اضداد نے ایک ایسی لچک دے دی ہے کہ گوشت خور بھی ہندو کہلاتا ہے ، پیاز لہسن نہ کھانے والا بھی ہندو کہلاتا ہے ، رام اور کرشن کا ماننے والا بھی ہندو ہے ، انہیں نہ ماننے والا بھی ہندو ہے ۔ اسلامی قوانین الگ ہیں ۔ سور کھانے والا از روئے شرع مسلمان نہیں رہ جاتا ۔ اور اعلیٰ صفات کا حامل ہونے کے باوجود اسے مسلمان مسلمان نہیں مانتے ۔ لہذا " احترام " کے آگے کئی سوالیہ نشان لگتے ہیں ۔ یہ ایک ایسی قدر ہے جسے کسی معاشرے میں یکطرفہ نہیں مانا جاتا ۔ ہمارے ملے جلے معاشرے میں " احترام " کو طرفین کے بیچ تحمل ، رواداری اور صلح پسندی کی بارٹر قدر (Barter Value) ماننا چاہیے ۔ ایسا کچھ نہیں ہے کہ کوئی ہمیں گالیوں سے نوازے تو ہم اس کا شکریہ ادا کریں اور اس کے گن گائیں ۔

مسلمانوں کو خدا یا ڈاکٹر نے نہیں کہا کہ تم صرف گائے کا گوشت کھایا کرو اور نہ گائے کا گوشت کوئی اس لئے کھاتا ہے کہ اسے ہندو پوجتا ہے ۔ مسلمانوں کے لئے حلال چیزوں میں سے گائے کا گوشت کھانا صرف ایک اقتصادی سہولت کی بات ہے ۔ حکومت گائے کے گوشت کی قیمت پر بکرے کا گوشت دلوا دے تو مسلمان کورٹ پیپر پر لکھ کر دے سکتا ہے کہ وہ نہ گائے کا گوشت کھائے گا اور نہ گائے کی قربانی دے گا ۔ گائے خوری ترک کرنے کے نتیجے میں ملک کی چمڑے کی صنعت کو کروڑوں اربوں روپیے کا جو نقصان ہوا کرے گا مسلمان اس کی بھی فکر نہیں کرے گا ۔

گائے خوری اور احترام کا ذکر آیا ہے تو سنگھل کو ایک بات اور معلوم ہونی چاہیے ۔ مسلمان جس جانور کو کھاتا ہے اسے کھانے سے پہلے احترام اور طہارت کے ساتھ ذبح کرنا اس پر فرض ہے ۔ ورنہ وہ چیز اس کے لئے حلال خوراک نہیں بنتی ۔ حلال طریقے سے جانور کا خون بہانا ضروری ہے ۔ یہ طریقہ " جھٹکے " جیسا ظالمانہ نہیں ہوتا جو جانور کے اعصاب میں تشنج اور صدمہ پیدا کر دیتا ہے ۔ قانون قدرت کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے جو مہذب طریقہ جانور کے ساتھ ذبح کے لئے اختیار کرنا چاہیے وہ اختیار کیا جاتا ہے ۔ اس عمل کو قتل نہیں کہتے ۔ جیسا کہ سنگھل نے کہا کہ مسلمان گائے کا قتل کرکے اسے کھاتے ہیں ۔ مقتول جانور کا گوشت کوئی نہیں کھاتا ۔ سادھوی کا جوش میں آکر اپنی تقریروں میں یہ کہنا کہ مسلمان بوڑھی گائے کا گوشت کھاتے ہیں اور اگر انہیں بوڑھی چیزوں سے اتنی نفرت ہے تو وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کو قتل کیوں نہیں کرتے ، سخت نادانی کی بات ہے ۔ جس طرح ایک صحیح الحواس ہندو اپنے ماں باپ کا قتل نہیں کرتا اسی طرح مسلمان کیا کوئی بھی اپنے ماں باپ کا قتل نہیں کرسکتا ۔ بکواس کرنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایسی باتوں سے مادرانہ اور پدرانہ حیثیت کی تنسیخ ہوجاتی ہے ۔ وہ خلاف فطرت اور خلاف عقل باتیں کیوں کرتے ہیں ۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ انسان کو اشرف المخلوقات بنایا گیا ہے اور کل کائنات اس کے فائدے کے لئے اور اس کی تابع ہے ۔ ینگا گاندھی کا فلسفہ صرف ابھار بنا کر ٹرانسپیرنٹ مرتبان میں رکھنے کے لئے ہے ۔ وہ کبھی یونی ورسل نہیں ہوسکتا ۔

سنگھل اور دیگر لوگ یہ بتادیں کہ وہ انسان ہیں یا نہیں ۔ اگر انسان ہیں تو ہندو ہیں یا نہیں ۔ مسلمان لوگ شریف ہندوؤں کو معزز اور محترم اکثریت کے طور پر دیکھتے ہیں ۔ اور ان کی جانب سے بالکل مطمئن ہیں ۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جمہوریت کی کامیابی کا ثبوت اکثریت کا گھمنڈ نہیں ہے بلکہ اقلیت کا محفوظ اور بے خوف ہونا اور محفوظ اور بے خوف جینا ہے ۔ بال ٹھاکرے ، سنگھل اور ان کے حلیفوں کو اپنی زبان کھولنے سے پہلے کم از کم لفظوں کا احترام سیکھ لینا چاہیے ۔ آپ احترام احترام چلا رہے ہیں جب کہ بھارت ماتا کے سپوتوں کو جنوں کی راہ پر لگانا چاہتے ہیں ۔ ہوش میں آیئے ۔

ترپ کا اکا

خالد سہیل (کناڈا)

میرے محبوب ساحل !

میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں کہوں آؤ میرے قریب آؤ - میرے پہلو میں لیٹ جاؤ، میرے بازو پر اپنا سر رکھو، میرے رخساروں اور ہونٹوں کو بوسے دو، مجھ سے بغلگیر ہو جاؤ، میرے سراپا کو اپنے بازوؤں میں لے لو کیونکہ میں زندگی میں پہلی مرتبہ خود سپردگی کے اس موڑ پر پہنچی ہوں جہاں میں اپنی ذات کاملتہ تمہیں پیش کر سکتی ہوں - مجھے اس بات کا اعتراف کرنا ہو گا کہ آج سے پہلے میں جب بھی تمہارے ساتھ سوئی تھی تو میرا جسم تو تمہارے ساتھ ہوتا تھا لیکن میرا ذہن کسی اور کے خوابوں میں الجھا رہتا تھا اور میری روح کسی اور کے تصورات سے سرگوشیاں کر رہی ہوتی تھی - شاید اسی لیے میں تمہیں اس شدت سے نہ چاہ سکی تھی جس کے تم حقدار تھے اور تمہارا دل ٹوٹ گیا تھا جس کا تمہیں حق تھا کیونکہ تم نے مجھ سے ٹوٹ کر محبت کی تھی - میں نے تمہاری چاہت کی قدر نہ کی کیونکہ میں خود فریبیوں کے ایسے گرداب میں کھوئی ہوئی تھی جس سے تم واقف نہ تھے اگر تم میرے ماضی سے واقف ہوتے تو عین ممکن تھا کہ تم مجھے بہتر سمجھ سکتے -

کیا تم ایک مشرقی عورت کا کرب سمجھتے ہو ؟ کیا تم ایک ایشیائی عورت کا دکھ جانتے ہو ؟ کیا تم ایسی عورت کی جنگ سے واقف ہو جو روایات کی اتنی اونچی دیواروں میں پلی بڑھی ہو کہ نسلوں سے کسی نے باہر نہ دیکھا ہو - بچپن سے جوانی تک میرے والدین اور رشتہ دار ہر موڑ پر میری آزادی کو خاندان کی جھوٹی عزت پر قربان کرتے رہے اور میرے پر کاٹتے رہے میرے خاندان میں میری نانی وہ واحد ہستی تھیں جو میرا ساتھ دیتیں اور میری جنگ لڑتیں - وہ مجھے اپنے والدین سے ہمسایوں کے بچوں کے ساتھ پکنک پر جانے یا سکول میں تقریری مقابلوں میں حصہ لینے کی اجازت دلواتیں اور جب میرے والدین نے مجھے یونیورسٹی میں ایم - اے اردو کے داخلے سے اس لئے منع کر دیا کہ وہاں کو ایجوکیشن CO-EDUCATION ہے اور ان کی مشرقی حیا کو گوارا نہیں کہ میں مردوں کے ساتھ تعلیم حاصل کروں تو میری نانی اماں نے انہیں قائل کیا تھا کہ آج کے دور میں لڑکیوں کے لئے تعلیم بہت ضروری ہے - اس سے نہ صرف ان کا شعور بڑھتا ہے بلکہ وہ اپنے بچوں کی بھی تعلیم کا بہتر انتظام کر سکتی ہیں تو میرے والدین بادل ناخواستہ تیار ہو گئے تھے -

میں نے ایم - اے تو کر لیا لیکن مجھ پر اتنی پابندیاں عائد کر دی گئیں کہ میرا دم گھٹنے لگا - آخر مجھے اس مشرقی ماحول سے فرار ہونے کا واحد طریقہ یہ نظر آیا کہ میں کسی ایسے صاحب ثروت سے شادی کا پیغام قبول کر لوں جو مغرب میں بسا ہو چنانچہ میں پاکستان سے ہجرت کر کے کینیڈا چلی آئی تھی -

لیکن ٹورانٹو میں پہلی رات ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ جو شخص مجھے اپنی بیوی بنا کر لایا تھا وہ انسانی جذبوں کے گداز سے ناواقف تھا - وہ پھولوں کی خوشبو، جھرنوں کی موسیقی اور انسانی خوابوں کی آہٹ سے نابلد تھا -

اس نے پہلی رات ہی جب میرے سراپا کو ایسے ٹٹولا اور جھنجھوڑا جیسے میں اس کی ملکیت ہوں تو میری روح کو اتنے کچوکے لگے کہ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے لیکن وہ میرے آنسوؤں سے بے خبر میرے جسم پر اپنے بوسوں سے نیل ڈالتا رہا اور میں اپنے جسم کو ایسے دیکھتی رہی جیسے وہ کسی اور کا جسم ہو -

جب اس کے سرد سینے پر میرا ایک گرم آنسو گرا تو وہ حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگا -

"خیریت؟"

" میں نہ تو کوئی ربر ڈول (RUBBER DOLL) ہوں اور نہ ہی ایک رات کی خریدی ہوئی عورت۔"

"لیکن تم میری بیوی تو ہو؟"

"بیوی ہوں لیکن ابھی نہ تو تمہاری دوست بنی ہوں اور نہ ہی محبوبہ!"

اس کو جیسے ایک ذہنی دھچکا لگا۔ پھر وہ مجھ سے ایسی گفتگو کی توقع نہ رکھتا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا کہے۔

کاش تم چند دن انتظار کر لیتے۔ ابھی تو میرا جیٹ لیگ (JET LAG) بھی ختم نہیں ہوا۔

اور وہ عالم بے بسی میں میرے پہلو میں لیٹ گیا تھا۔ اس کے سارے اعضا مضمحل ہو گئے تھے اور اعصاب شل۔ اس پر شاید زندگی میں پہلی مرتبہ نامردی کا حملہ ہوا تھا۔

جبار! مجھے تمہارے لمس سے اندازہ ہو گیا ہے کہ میں تمہاری زندگی کی پہلی عورت نہیں ہوں لیکن میں تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ تم میری زندگی کے پہلے مرد ہو اور شاید اسی لیے تم نے مجھ سے شادی کی ہے

وہ تو اس رات پہلو بدل کر سو گیا تھا اور میں رات بھر اپنے تکیے کے غلاف سے آنسو خشک کرتی رہی تھی۔

جبار کے ساتھ میری شادی کے چند سال مجبور رفاقت کے چند سال تھے۔

جب ہم دونوں اکیلے ہوتے تو اکثر خاموشی سے ٹی۔وی دیکھتے رہتے جیسے ہماری روحوں پر کوئی بھاری بوجھ ہو لیکن جب مہمان آتے تو ایسے شیر و شکر ہوتے کہ دوسروں کو ہم پر رشک آتا۔

آپ جیسا محبت کرنے والا جوڑا ہم نے بہت کم دیکھا ہے آپ ایک آئیڈیل کپل (IDEAL COUPLE) ہیں۔ مجھے کسی کو اپنے پیٹ پر سے کپڑا اٹھا کر دکھانے کی عادت نہ تھی اس لئے میرے چہرے پر دکھ بھری مسکراہٹ پھیل جاتی اور جبار بھی مصلحتاً خاموش رہتا۔

شروع شروع میں تو مجھے امید تھی کہ شاید جبار کا رویہ بدل جائے گا اور وہ مجھے سمجھنے کی کوشش کرے گا لیکن آہستہ آہستہ وہ امید راکھ میں ملتی گئی اور میں اپنے ازدواجی رشتے سے ناامید ہوتی گئی۔

اگر بات صرف رومانوی رشتے کی ناکامی کی ہوتی تو شاید اتنی بڑی ٹریجڈی (TRAGEDY) نہ ہوتی مجھے دھیرے دھیرے احساس ہوا کہ جبار نے کبھی عورت کا احترام کرنا سیکھا ہی نہ تھا۔ اس کی نگاہ میں عورت ذات جنسی تسکین کے ذریعے سے زیادہ کچھ وقعت نہ رکھتی تھی۔ وہ شاید بازار سے دودھ خریدتے تنگ آچکا تھا اس لئے گائے خرید لایا تھا۔ وہ کبھی کبھار شیخی بگھارنے آتا تو اپنے ماضی کے رومانوی قصے ایسے سناتا جیسے کوئی فوجی اپنے جنگی کارناموں کی کہانیاں سناتا ہے۔ اس نے کبھی کسی عورت سے دوستی نہ کی تھی۔

مجھے یہ جاننے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ اس کے لئے میری آرزوئیں، خواہشیں، امنگیں اور خواب کچھ زیادہ اہمیت نہ رکھتے تھے۔ اس کے ذہن میں بیوی کا ایک خاکہ تھا اور وہ چاہتا تھا کہ میں اس سانچے میں ڈھل جاؤں۔ میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ اس سے غیر ضروری طور پر نہ الجھوں لیکن میں اس سانچے میں ڈھلتے ڈھلتے خود بھی چیخ کر رہ گئی۔

جبار نے مجھے سر کے بال لمبے رکھنے کو کہا تو میں نے سر کے بال کٹوانے چھوڑ دیئے۔ جب اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں سر کے بال کیوں کٹواتی ہوں تو میں نے اسے بتایا تھا کہ جب میں یونیورسٹی میں تھی تو پڑھائی میں اتنی مصروف رہتی تھی کہ بالوں کی نگہداشت کا وقت نہ ملتا تھا۔ میں نے جب اس سے پوچھا کہ وہ مجھ سے بال بڑھانے کی فرمائش کیوں کر رہا تھا تو کہنے لگا کہ جب سے وہ کنیڈا آیا تھا اس کی فینٹسی لائف (FANTASY LIFE) برباد ہو گئی تھی پاکستان میں وہ لمبے بالوں اور بھوری آنکھوں والی عورتوں کے تصورات میں کھویا رہتا تھا لیکن کنیڈا میں اس نے جتنی عورتوں کو بھی ڈیٹ کیا تھا وہ سب چھوٹے بالوں والی بلونڈ (BLONDE) اور برونٹ (BRUNETTE) تھیں۔ میں ایسی باتیں سن کر ہنس دی تھی میں ایشیائی مردوں کے اس المیے سے پہلے واقف نہ تھی۔

بالوں کے بعد اس کی فرمائش کپڑوں میں تبدیلی کی تھی۔ اس کی خواہش تھی جو درخواست کم اور حکم زیادہ محسوس ہوتی تھی کہ میں شلوار قمیص کے ساتھ ساتھ پتلونیں،

ٹی شرٹیں اور جینز بھی پہنا کروں ۔ اسے خوش کرنے کے لیے میں نے وہ بھی پہننے شروع کر دیئے ۔

کپڑوں کے بعد کھانوں کی باری آئی ۔ خود تو اس نے نہ تو کبھی انڈا بنایا تھا نہ کبھی چائے ۔ ایک جنوبی افریقہ کی عورت فاطمہ ہر ہفتے عشرے کے بعد پانچ سات کھانے بنا کر دے جاتی تھی جسے وہ فریز (FREEZE) کر لیتا اور گرم کر کر کے کھاتا رہتا لیکن مجھ سے یہ فرمائش تھی کہ میں چائنیز (CHINESE) ، گریک (GREEK) اٹیلین (ITALIAN) اور میکسیکن (MEXICAN) کھانے پکانے سیکھوں تاکہ جب وہ اپنے دوستوں کو بلائے تو فخر سے کہہ سکے کہ میری بیوی طرح طرح کے کھانے پکانا جانتی ہے ۔ میں نے وہ سب کچھ بھی کیا ۔ کھانے میں بناتی اور کریڈٹ (CREDIT) وہ لیتا ۔

کچھ عرصے کے بعد جب کچھ بے تکلفی بڑھی اور مجھ میں دل کی باتیں کہنے کی ہمت ہوئی تو میں نے ایک شام کہا ۔

" جبار ذرا ٹی وی بند کرو اور میری بات سنو " ۔

" کیا بات ہے ؟ " اس نے لاتعلقی سے پوچھا ۔

" پہلے ٹی وی بند کرو تب بتاؤں گی ۔ بات اہم ہے ۔ " جب اس نے ٹی وی بند کر دیا تو میں نے کہا ۔

" دیکھو جبار ! تم ڈاکٹر ہو ۔ صبح ہسپتال چلے جاتے ہو اور شام کو تھکے ہارے لوٹتے ہو ۔ پھر خبریں سن کر اور کھیلوں کا پروگرام دیکھ کر سو جاتے ہو ۔ میں ساری رات چار دیواروں کو گھورتی رہتی ہوں اور دن بھر احساس تنہائی کے زخم چاٹتی رہتی ہوں ۔

" تو آخر چاہتی کیا ہو ؟ " اس کے لہجے میں ہمدردی کی بجائے بیزاری کا رنگ غالب تھا ۔

" میں نے بھی پاکستان میں اردو ادب میں ایم ۔ اے کیا تھا ۔ کیوں نہ میں یہاں یونیورسٹی میں داخلہ لے لوں اور ایسی تعلیم حاصل کروں جس سے یہاں ملازمت کرنے کے قابل ہو سکوں " ۔

" پاگل ہوئی ہو ، اس نے طنزیہ قہقہہ لگایا " ادب میں ایم ۔ اے کی بات کرتی ہو ۔ یہاں تیسری دنیا کے سینکڑوں ڈاکٹر ایسے ہیں جو ہسپتالوں میں اردلیوں کا کام کرتے ہیں ۔ کتنے انجینرس جو ٹیکسیاں چلاتے ہیں اور کتنے وکیل ہیں جو پارکنگ لاٹز (PARKING LOTS) میں چھ ڈالر فی گھنٹہ کی ملازمت کرتے ہیں ۔ تم تو رانیوں کی طرح رہتی ہو ۔ تمہیں تو مفت میں امگریشن مل گیا ہے یہاں نجانے کتنے لوگ ہیں جو سالہا سال سے امگریشن کے لئے گل سڑ رہے ہیں ۔ ویسے تمہیں ملازمت کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے خدا کا دیا سب کچھ ہے " ۔

" مجھے معلوم ہے کہ تمہاری ذہنیں بھی ہیں چاہیے ہوں ۔ بھی اگر ایسی ہی بات ہے تو تم اتنی دیر سے گھر کیوں آتے ہو ۔ پریکٹس کم کرو اور شامیں میرے ساتھ گزارا کرو ۔ میں نے تمہارے ساتھ شادی کی ہے ان چار دیواروں کے ساتھ نہیں "

میری کتنی خواہش ہے کہ ہم اکٹھے پارک میں سیر کرنے جائیں ۔ شاپنگ مالز میں خریداری کریں ۔ فلمیں اور ڈرامے دیکھیں کتب خانوں میں نئی اور پرانی کتابوں کا جائزہ لیں اور کبھی مل جل کر کھانا پکائیں اور کینڈل لائٹ ڈنر (Candle Light Dinner) سے محظوظ ہوں ۔

لیکن تم کسی اور ہی نگر کے باسی لگتے ہو اور ہم دو دوستوں یا محبوبوں کی طرح نہیں دو روم میٹز (ROOM MATES) کی طرح زندگی گزارتے ہیں "

اس گفتگو کے بعد اس نے گھر تو جلد آنا نہ شروع کیا لیکن ان دوستوں اور ان کی بیویوں کو جن کو وہ کبھی کبھار بلایا کرتا تھا اکثر بلانے لگا ۔ اس کے دوستوں میں نہ تو کوئی ادیب تھا ، نہ فنکار ، نہ فلاسفر ، وہ یا تو ڈاکٹر تھے یا وکیل ، یا بزنس مین تھے یا اکاؤنٹنٹ اور ان سب کے اعصاب پر ڈالر سوار تھے وہ سب غریب خاندانوں کے مہاجر نو دولتیے تھے جو انسانوں کو ان کے بینک بیلنس کی ترازو میں تولتے تھے ۔

میں ان مہمانوں اور ان کی بیویوں کو اپنا نام سلمیٰ بتاتی لیکن وہ مجھے مسز ملک ہی کہہ کر بلاتے ۔ وہ تمام عورتیں جو اپنے خاوندوں کے ساتھ آتیں ہمیشہ مسز فاروقی ، مسز صدیقی ، مسز چوہدری اور مسز ملک ہی کہلاتیں ۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے نام سے تعارف نہ کراتی ۔ مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ

وہ سب ایسی چڑیاں ہیں جو خوبصورت پنجروں
میں بند ہیں اور ایک دن وہیں سونے کی
چوری کھاتے کھاتے مرجائیں گی وہ سب مجھے
اپنے خاوندوں کی ایکسٹنشن
(EXTENSION) لگتیں۔ میری حالت
ان سے مختلف نہ تھی لیکن میں جانتی تھی کہ
میں قید میں ہوں وہ تو اپنی غلامی پر فخر کرتیں۔
پہلے تو مجھے ان کی منافقت پر غصہ آتا لیکن
آہستہ آہستہ مجھے ان پر رحم آنے لگا۔ مجھے لگا کہ
انہیں نفرت کی نہیں ہمدردی کی ضرورت
ہے۔

دلچسپی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ
سب مرد شراب پیتے تھے لیکن عورتیں کوکاکولا
اور اورنج جوس کی فرمائش کرتیں۔ جبار نے
مجھے اپنے دوستوں کے لیے ڈرنکس
(DRINKS) تیار کرنے سکھا دیئے تھے۔
جن اینڈ ٹانک، رم اینڈ کوک، بلڈی میری
اور نجانے کیا کیا۔ میں بھی یہ سب کچھ سیکھ
رہی تھی کیونکہ میں ایک اچھی طالب علم تھی
اور جانتی تھی کہ ایک ادیبہ اور فنکارہ کے لیے
زندگی کی درسگاہ میں سیکھا ہوا کوئی درس ضائع
نہیں جاتا، کہیں نہ کہیں کام آہی جاتا ہے۔

جبار کے تمام دوستوں اور ان کی
بیویوں میں مجھے صرف ایک عورت ایسی ملی
تھی جسے جان کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔ اس کا نام
امید تھا اور اس نے ایک فرنچ کنیڈین سے
شادی کی ہوئی تھی۔ وہ خود ایک سوشل ورکر
تھی اور اس کا خاوند کمپیوٹرز کا ماہر تھا اور
جبار کے کمپیوٹرز کا خیال رکھتا تھا۔ امید جب
ایک پارٹی میں شریک ہوئی اور ہمارے
مہمانوں کی بیویوں سے ملی تو مجھ سے بے تکلفی
سے کہنے لگی کہ یہ تم کن روبوٹس
(ROBOTS) میں پھنس گئی ہو ان کی
قربت تو تمہاری روح کو دیمک کی طرح کھا
جائے گی۔ ایک دفعہ جب جبار کسی کانفرنس
کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا تھا تو وہ مجھے
ایک ویکنڈ (WEEKEND) کے لیے
اپنے گھر لے گئی۔ میں نے اسے اپنے حالات
سے مختصراً متعارف کروایا تو کہنے لگی کہ اگر تم
نے اس ملک میں رہنا ہے تو دو کام کرو۔
ڈرائیونگ سیکھو اور بینک میں اپنا علیحدہ
اکاؤنٹ کھلواؤ تاکہ اگر تمہاری شادی کا بھرم
کسی دن چکنا چور ہو تو تم اپنے پاؤں پر کچھ دن
کھڑی رہنے کے قابل ہو سکو۔ میں نے امید کے
مشوروں پر عمل کیا۔ اور جبار کی ناراضگی
مول لے کر ڈرائیونگ سیکھی اور اسے فیور
کیا کہ اپنی جیسی جیگوار (JAGUAR)
تو نہیں ایک چھوٹی اور سستی سی ہونڈا
(HONDA) گاڑی خرید وا دے۔ میں
نے اس سے چھپ کر بینک اکاؤنٹ بھی
کھول لیا اور میں اس میں ہر ہفتے کچھ ڈالر جمع
کروا دیتی۔

جب میری جرأت رندانہ میں
قدرے اضافہ ہوا تو ایک دن میں نے جبار کو
بتایا کہ مجھے شاعری سے بہت شغف ہے۔ میں
خود بھی شعر کہتی ہوں اور پاکستان اور
ہندوستان کے کئی موقر رسالوں میں چھپ
بھی چکی ہوں۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ
اس کا شاعری کے بارے میں کیا خیال ہے تو
وہ کہنے لگا۔
" شاعری بالکل فضول چیز ہے۔
وقت کا ضیاع ہے۔ مغرب نے شاعری کو
بالکل رد کر دیا ہے اب یہاں کے ادیب شعر
کہنے کے بجائے ناول اور ڈرامے لکھتے ہیں۔ یہ
فلموں، ٹی وی اور ویڈیوز کا دور ہے
مشاعروں کا نہیں" میں اس کی باتیں سن کر
خاموش ہو گئی۔ میں ادب کی ایسی بے ادبی
سننا نہیں چاہتی تھی۔

یہ شادی کا ڈھونگ نجانے کب تک
چلتا رہتا کہ جبار کے ایک دوست نے حالات
کو مزید بگاڑ دیا۔ ایک دن جبار اپنے ایک
رفیق کار فیصل کو گھر لے کر آیا۔ جبار فیصل
کے ساتھ مل کر ایک نئی اپارٹمنٹ بلڈنگ
خریدنا چاہتا تھا۔ مجھے فیصل بالکل اچھا نہ لگا۔
مجھے اس کی آنکھوں میں عیاری کی چمک صاف
نظر آرہی تھی۔ وہ شادی شدہ تھا لیکن اپنے
معاشقوں کا ذکر بڑے فخر سے کرتا تھا۔ میں
نے اسے بالکل نظر انداز کر دیا۔ اس کے
جانے کے بعد میں نے فیصل سے دبے الفاظ
میں کہا کہ مجھے اس کی حرکتیں بالکل پسند نہیں
آئیں اور وہ قابل اعتبار انسان نہیں لگتا لیکن
جبار نے میری باتوں کو کوئی اہمیت نہ دی اور
پھر وہ واقعہ پیش آیا جس نے میری زندگی کا
رخ بدل دیا۔

اس شام جبار نے اپنے ایک دوست
کی برتھ ڈے پارٹی کا انتظار کیا تھا اور بہت
سے دوستوں کو بلایا تھا۔ سب مہمان لونگ
روم (LIVING ROOM) میں بیٹھے
تھے کہ میں کسی کام سے باورچی خانے گئی۔
میں وہاں اپنے گلاس میں اورنج جوس ڈال رہی

تھی کہ مجھے اپنے پیچھے فیصل کھڑا نظر آیا۔
"سفینہ کیا حال ہے؟" اس کی سانس کی بو اور آواز کی لڑکھڑاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔
"کیا تم مجھ سے خفا ہو؟" میں نے اسے مڑ کر دیکھا اس کی آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح عیاری کے سائے لہرا رہے تھے۔
"نہیں" میں نے مختصر سا جواب دیا
"تو پھر اتنی بے رخی کیوں؟"
میں پھر بھی خاموش رہی
"سفینہ! تم بہت سندر ہو۔ جی چاہتا ہے کہ تمہیں بوسہ دوں"
"نہیں، شکریہ"
"گالوں پر نہیں۔ ہونٹوں پر نہیں بائیں پستان کے نیچے جہاں تمہارا خوبصورت تل ہے"
میرے سراپا میں بجلی دوڑ گئی اور میں نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ جاکر فرج سے ٹکرایا، لڑکھڑایا اور پھر سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔
"خبیث کہیں کا" میں بڑبڑائی اور باورچی خانے سے باہر نکل آئی۔
جب مہمان چلے گئے تو میں نے جبار سے کہا
"تم بہت بے غیرت ہو"
"کیوں کیا ہوا"
"تم غیروں کو ہماری ذاتی باتیں بتاتے ہو"
"کیسی ذاتی باتیں"
"کہ میرے بائیں پستان کے نیچے تل ہے۔ اگر میں بھی بتانے لگوں کہ تم نامرد ہو تو تمہیں کیسا لگے گا"۔
"میں نے نہیں بتایا" وہ غرایا۔
"تو پھر اسے کیسے پتہ چلا"۔ میں آج کے بعد اپنے گھر میں فیصل کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر تمہارے ضمیر میں رتی بھر غیرت بھی ہے تو اس سے تمام رشتے منقطع کر دو اگر وہ دوبارہ اس گھر میں آیا تو میں اس گھر میں نہیں رہوں گی"۔
"تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو۔ ہو سکتا ہے وہ مذاق کر رہا ہو"
"میں ایسے مذاق برداشت نہیں کر سکتی"۔
میرے منہ میں کڑواہٹ پھیلنے لگی۔ مجھے سب سے زیادہ دکھ اس بات کا ہوا کہ جبار نے اس واقعہ کو کوئی اہمیت نہ دی۔
اس رات میں پہلی دفعہ صوفے پر جاکر سوئی۔ جبار نے مجھے خوابگاہ میں بلایا لیکن میں نہ گئی۔
چند دن فضا میں تشنج رہا۔ نہ میں نے صلح کی اور نہ ہی جبار نے معافی مانگی۔ جب جبار نے فیصل سے تعلقات منقطع نہ کیے اور کاروبار میں کوئی فرق نہ آیا تو مجھے احساس ہو گیا کہ جبار کی زندگی میں میری کتنی اہمیت ہے۔
ایک رات جب جبار کا فون آیا کہ وہ ایک دفعہ پھر فیصل کو لے کر گھر آ رہا ہے تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا میں نے دو بیگ تیار کیے ایک میں کپڑے اور دوسرے میں اپنی کتابیں، تصویریں، کیسٹ اور زیور رکھے۔ میں نے ایک کاغذ کی پرچی پر جبار کے لیے پیغام چھوڑا۔

جبار جس گھر میں میری عزت محفوظ نہ ہو اس گھر میں رہنا میری غیرت کو گوارا نہیں۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہارے گھر اور تمہاری زندگی سے جا رہی ہوں مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کرنا۔

سفینہ

اس رات گھر سے نکلتے وقت جب میرا ایک پاؤں گھر کے اندر تھا اور ایک باہر تو مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ میں ایک جنم کو پیچھے چھوڑے جا رہی تھی اور دوسرے جنم کو شروع کر رہی تھی۔
میں ساری رات برفباری میں شہر ٹورانٹو کی گلیوں اور سڑکوں پر بے قصد ڈرائیو (DRIVE) کرتی رہی۔ آخر صبح کے چار بجے مجھے امید کا خیال آیا اور میں ایک گھنٹے کے سفر کے بعد اس کے گھر پہنچی۔ میں نے امید کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے دروازہ کھولا اور میری آنکھوں کے آنسوؤں اور سرخی سے سمجھ گئی کہ میں کس بحران کا شکار تھی۔ اس نے مجھے گلے سے لگایا اور اپنے گیسٹ روم (GUEST ROOM) کا دروازہ کھولا میں نے وہاں اپنے بیگ رکھے اور بستر پر دھڑام سے گر گئی۔ میں اگلے دن سہ پہر تک سوتی رہی۔ میں نے امید کو اپنی بپتا سنائی تو اس نے ایک ہمدرد دوست کی طرح اپنا دامن پھیلا دیا اور اپنے ہاں کچھ عرصہ رہنے کی دعوت دی۔ میں بھی مجبور تھی ٹھہر گئی۔

اس رات کے بعد میرا دوسرا جنم شروع ہوا۔ میں نے چھوٹے موٹے کام کرنے شروع کئے۔ کچھ عرصے ایک ڈرگ سٹور میں اور کچھ عرصہ ایک ڈیپارٹمنٹ سٹور میں کام کیا اور پھر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ میں ادب اور جرنلزم پڑھنے لگی اور ہوسٹل میں رہنے لگی۔

یونیورسٹی کی آزاد فضا نے مجھے پر لگا دیئے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میرے سانولے مشرقی رنگ کو دیکھ کر مغرب کے مردوں کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ میں ایک آزاد پنچھی کی طرح ایک بستر سے دوسرے بستر پر لینڈ (LAND) کرتی رہی اور مختلف رنگ اور نسل کے ہونٹوں سے اپنی نسلوں کی پیاس بجھاتی رہی۔

میں لذتوں کے سمندر میں کود گئی تھی اور ایسے گرداب تک آپہنچی تھی جہاں

عشق اور ہوس

خواہش اور ضرورت

اور خواب اور حقیقت کی تمیز مٹ گئی تھی۔ میں کبھی سٹریٹ (STRAIGHT) مردوں کے ساتھ سوتی کبھی گے (GAY) مردوں کو چھیڑتی اور کبھی لیسبینز کے جسموں کو ٹٹولتی۔ کبھی میں اخباروں اور رسالوں میں اشتہار دیتی اور کبھی بلائنڈ ڈیٹس (BLIND DATES) سے رومانوی بصیرتیں حاصل کرتی۔

میں اس مغربی دنیا کی روح کی گہرائیوں میں اتر جانا چاہتی تھی۔ مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ شمالی افریقہ میں بھی جہاں مردوں اور عورتوں کو برابری کا مان تھا دوہرے معیار (DOUBLE STANDARD) بدستور قائم تھے۔ وہ مرد جو ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ جنسی طور پر ملوث تھے عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے اور سٹڈ (STUD) کہلاتے اور جو عورتیں ایک سے زیادہ مردوں کے ساتھ جنسی طور پر ملوث ہوتیں بے عزتی کی نگاہ سے دیکھی جاتیں اور سلٹ (SLUT) کہلاتیں۔ میں ان فروعی مسائل سے بے نیاز تھی۔ میرے اندر تو ایک آتش فشاں چھپا ہوا تھا جو پھٹ پڑا تھا۔ یونیورسٹی میں میری جو مشرقی سہیلیاں تھیں وہ مجھے شتر بے مہار کہتیں اور جو مغربی سہیلیاں تھی وہ کہتیں

YOU ARE BURNING CANDLE FROM BOTH ENDS

(تم موم بتی دونوں طرف سے جلا رہی ہو)

ان دنوں میں نے جی بھر کر ڈونا سمر (DONNA SUMMER) اور میڈونا (MADONNA) کے گانے سنے ، اریکا یونگ (ERICA JONG) کے ناول ، اینئس نن (ANAIS NIN) کی ڈائری ، ورجینیا وولف (VIRGINIA WOLFF) کے افسانے اور کشور ناہید ، فہمیدہ ریاض اور عشرت آفرین کی نظمیں پڑھیں۔

ان تجربوں کا ایک فائدہ تو ہوا کہ میری شاعری جو شادی شدہ زندگی میں گھٹن کا شکار ہو رہی تھی تازہ دم ہو گئی اور میں اپنے ہر تجربے اور بحران کے بعد نئی نظم لکھنے لگی۔ فن کا وہ دیوتا جس کی میں مہینوں منتظر رہتی اب ہر رات ملنے آتا اور میری بیاض اس کے تحفوں سے بھرنے لگی۔

اس سفر کے دوران کئی دفعہ جبار کا خیال آیا بھی اور جی بھی چاہا کہ اس کی زندگی کے بارے میں کچھ جانوں لیکن پھر یہ خود ہی اندازہ ہو گیا کہ میں جس دشت میں سفر کر رہی تھی اس دشت میں پیچھے مڑ کر دیکھنے والے پتھر کے ہو جاتے ہیں اس لئے میں آگے ہی بڑھتی گئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

اس خود آگہی یا خود فریبی کے سفر میں پہلی دفعہ مجھے اسی شام یہ احساس ہوا کہ میں اس راستے پر بہت دور نکل گئی ہوں جب ایک محفل میں ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوئی جس کے ساتھ میں نے کئی راتیں گزاری تھیں جس کا نام بہت سے ناموں میں خلط ملط ہو گیا تھا۔ میں نے اس واقعہ کو بھی نظر انداز کر دیا اور اپنا بے منزل سفر جاری رکھا۔

اور پھر ساحل ! جب میری تم سے ملاقات ہوئی تو میں ایسی دنیا میں پہنچ چکی تھی جہاں میرے لیے اپنوں اور غیروں کی پہچان مشکل ہو گئی تھی۔ میرے لیے سب مرد بھیڑیے تھے اور میں ان کی اناؤں میں خنجر گھونپ کر فرحت محسوس کرتی تھی۔ مجھے خود بھی اندازہ نہ تھا کہ میرے اندر برسوں کی تنہائیوں اور محرومیوں نے اتنا غصہ ، نفرت اور تلخیاں بھر دی ہیں۔

اب میں پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو

مجھے احساس ہوتا ہے کہ سب مرد ایک طرح
کے نہ تھے۔ تم بخوبی واقف تھے کہ

خلوص کیا ہے
محبت کیا ہے
اعتماد کیا ہے
اعتبار کیا ہے

لیکن میں اپنی ذاتی آزادی کے نشے
میں اتنی مخمور تھی کہ عشق اور ہوس اور
دوستی اور وقت گزاری میں تمیز نہ کر سکی تھی
اور ایک شام جب تم میرے گھر آئے تھے اور
مجھے کسی اور مرد کے پہلو میں سوتے پایا تھا اور
تم سیخ پا ہوگئے تھے تو میں نے اپنے نئے عاشق کو
رخصت کرنے کی بجائے تمہیں بغیر اطلاع
دیئے آنے پر برا بھلا کہا تھا اور گھر سے نکل
جانے کو کہا تھا۔

اور اگلے دن جب تم نے ایک
محبوب کی طرح مجھ سے صفائی چاہی تھی تو میں
ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح بولی تھی
"ہماری جنسی زندگی کوئی جوئنٹ بینک
اکاؤنٹ (JOINT BANK ACCOUNT) تو ہے نہیں کہ ہر دفعہ
کچھ خرچ کرنے سے پہلے میں تم سے دستخط
کرواؤں"۔

"میرا خیال تھا کہ ہم دو وفادار انسان
ہیں"

"کس سے وفادار؟"
"ایک دوسرے سے"
"یا اپنے آپ سے"
"کیا مطلب؟"

"ہم دوسروں سے اس وقت تک
وفادار نہیں ہوسکتے جب تک ہم اپنی ذات
سے وفادار نہ ہوں"

"یہ منطق میری سمجھ سے بالاتر ہے"
"تم جس وفاداری کو محبت کی معراج
سمجھتے ہو میں اسے دورِ جہالت کی فرسودہ
روایت سمجھتی ہوں"

اور تم غصے میں رخصت ہوگئے تھے۔
اس واقعہ کو کئی مہینے بیت گئے۔ ہم
دونوں اپنی اپنی انا کے زخم چاٹتے رہے۔

اسی دوران میری نانی اماں بہت
بیمار ہوئیں اور مجھے پاکستان جانا پڑا۔ میری
نانی اماں ایک جہاندیدہ عورت ہیں ان کی
دانائی نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی ہے۔
ایک سہ پہر جب میں ان کا سر دبا رہی تھی اور
وہ آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھیں تو میں نے
انہیں ساری کہانی سنادی۔ انہوں نے اپنے
سفید بالوں پر ہاتھ پھیرا اور آنکھیں کھولیں۔
پھر میرا ہاتھ اپنے جھریوں بھرے ہاتھ میں لیا
اور کہنے لگیں۔

"بیٹا! میں نے ساری عمر تمہاری
طرفداری کی ہے اور تمہاری آزادی اور خود
مختاری کو سراہا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ تم
نے ابھی تک رشتوں کا احترام نہیں سیکھا۔ وہ
انسان سب سے زیادہ خوش قسمت ہوتا ہے
جس کا محبوب اس کا دوست بھی ہو۔ تم جبار
کا بدلہ ساحل سے کیوں لے رہی ہو۔ انسان کو
اپنی زندگی میں ترپ کا ایک ہی اکہ ملتا ہے جو
اسے وقت پر استعمال نہیں کرتے تو وہ اسے
ہاتھوں میں پکڑے رہ جاتے ہیں اور کھیل ختم
ہو جاتا ہے۔

ساحل! میں نے تمہیں سمجھنے میں
دیر کردی۔ آؤ مجھے گلے لگالو۔ آؤ ہم ایک نئی
زندگی کا آغاز کریں۔

تمہاری

سلمیٰ

سلمیٰ!

مجھے تمہاری نانی اماں سے پورا اتفاق
ہے کہ ہمیں ترپ کا اکہ کھیل ختم ہونے سے
پہلے استعمال کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے تمہاری
زندگی میں محبت کا کھیل ابھی ختم نہ ہوا ہو
لیکن میری نگاہ میں ہمارے رشتے کا کھیل اس
شام ختم ہوگیا تھا جس شام میں نے تمہیں کسی
اور مرد کی آغوش میں دیکھا تھا اور تم نے مجھے
اپنے گھر سے نکل جانے کو کہا تھا۔

میں تمہارے لیے اپنی ہر چیز قربان
کرنے کے لیے تیار تھا لیکن اپنی غیرت نہیں
کیونکہ اس کے بعد اگر میں تمہیں چاہتا بھی تو
وہ ایک بے غیرت کا پیار ہوتا۔

مجھے آہستہ آہستہ یہ بھی احساس ہوگیا
ہے کہ تم بنیادی طور پر ایک شاعرہ اور فنکارہ
ہو۔

تمہارا ہر نیا رشتہ تمہاری شاعری اور
ہر نیا بحران فن کے لیے خام مال مہیا کرتا ہے۔
میں تمہاری شاعری کا قدردان ہوں لیکن
تمہارے فن کے لیے خام مال بننے کے لیے تیار
نہیں۔

کیوں نہ ہم اسی موڑ پر جدا ہوجائیں
اور اپنے اپنے راستوں پر چلتے رہیں۔
ہم نے جتنا بھی وقت اکٹھے گزارا ہے
وہ میری یادوں کا سرمایہ رہے گا۔

مخلص

ساحل

عمیق احساس کا سفر

محمد سلیم خان ہمراز
6 _ J (فرسٹ فلور) رامنگر لین
گارڈن ریچ، کلکتہ 700024

جب اس نے ہوش سنبھالا تو حاجتیں اور ضرورتیں اس کے قدموں سے لپٹی ہوئی تھیں اور حقوق و فرائض دامن پکڑے ہوئے تھے، جن کی تکمیل ہی سفر حیات تھا۔ اس کے پیش رو یہ سفر طے کر چکے تھے۔ بحر و بر کا سفر، ہموار میدانوں، پہاڑوں اور ریگستانوں کا سفر جہاں سکھ کی کلیاں اور دکھ کے کانٹے بکھرے ہوئے تھے، جن پر چل کر کبھی اس کے قدموں سے جھرنے پھوٹ پڑے تھے، دہکتی آگ گلزار بن گئی تھی اور مصائب کے اونچے اونچے پہاڑ ایمان کی گرمی سے موم کی طرح پگھل گئے تھے۔ گویا یہ سفر، سفر نہ ہو بلکہ ایک آزمائش ہو ایک امتحان ہو۔

یہ سفر اس کے لئے بظاہر مشکل ضرور تھا، ناممکن نہیں۔ کیونکہ اس کی جھولی میں اپنے اجداد کا ذہنی سرمایہ اور تجربہ تھا۔ جو زندگی کی تاریک راہوں میں بھی چاند کی طرح چمک کر اس کی راہنمائی کر سکتا تھا۔ مگر چند قدم چلنے کے بعد ہی اسے راستہ کافی دشوار، پرخار اور پیچیدہ لگا۔ اندیشوں کے گہرے سایوں نے اسے آگھیرا اور اس کے کمزور قدم ڈگمگانے لگے کچھ راستوں پر لوگ بڑی ہی پر لطف شاندار عیش و نشاط کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس کے قدم غیر ارادی طور پر ان لوگوں کی طرف اٹھ گئے اور جب وہ ان کے قریب پہنچا تو ان کے زرق برق، معطر لباس اور تمدن نے اسے مسحور کر دیا۔ اس کے دل میں خواہشوں کے کئی دیپ جل اٹھے، آنکھوں سے رشک و حسد کی شعاعیں پھوٹ پڑیں اور اس نے بغیر سوچے سمجھے ان لوگوں کی تقلید کو اپنا شعار بنالیا۔

اب اس کے سامنے ایک سر سبز مخملی راہ گزر تھی، جس پر خواہشوں کی رنگارنگ تتلیاں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ وہ آنکھوں میں خواب سجائے دوڑنے لگا۔ اور شب و روز ماہ و سال گرد و نواح سے بے خبر دوڑتا رہا۔ ہر خواب کی تکمیل ایک نئے خواب کو جنم دیتی رہی اور وہ رنگینیوں کے تعاقب میں آگے بڑھتا رہا۔ اس کے احساس کے دریچوں پر ہوس کے تالے پڑ چکے تھے اور وہ ایک مشینی انسان بن کر رہ گیا تھا۔ وقت گزرتا رہا اور وہ دھرتی سے آکاش تک فضاؤں اور خلاؤں میں اڑتا چاند تاروں پر کمندیں ڈالتا رہا اور اپنی جھولی بھرتا رہا۔

ایک طویل مدت بعد جب اس کے بالوں میں چاندی پھیل گئی۔ کمر اپنے لدے بوجھ سے وفادار غلام کی طرح جھکنے لگی، کتابوں کے الفاظ رینگتے دکھائی دینے لگے۔ تھکے ہوئے پیروں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا، اس نے آرام و استراحت کے لئے اپنا بوجھ اور آنکھوں پر چڑھی رنگین عینک اتار دی تب اس کے وجود میں احساس کی لہریں دوڑ گئیں اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ کسی طویل طلسمی خواب سے بیدار ہوا ہو۔ اور جب احساس کے بھی دریچے کھل گئے اس نے اپنے آپ کو جنگل میں ببول کے ایک درخت کی شاخوں پر بنے ہوئے مچان پر پایا، جس کی دوسری شاخوں اور تنوں پر چیل کووں، گرگٹ اور سانپوں کی شکلوں کے انسانوں کا بسیرا تھا۔ جن کے چہروں سے عیاری، درندگی اور حیوانیت ٹپک رہی تھیں۔ وہ حیران و پریشان ہو اٹھا۔ اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔ نیچے تاحدِ نظر سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ دور ایک نیلی جھیل کے قریب پھلوں سے لدے درخت کے نیچے بچے پھل کھاتے کھیلتے دکھائی دیئے۔

ان انسان نما جانوروں کے درمیان اس کا دم گھٹنے لگا، اور اس نے گھبرا کر جیسے ہی نیچے چھلانگ لگائی ننھی ننھی سبز گھاس میں چھپے ہوئے بھالے کی انی کی طرح تیز انگشت کانٹے اس کے ہاتھ پاؤں میں پیوست ہو گئے۔ خاردار ٹہنیوں سے الجھ کر اس کا پیراہن تار تار ہو چکا تھا اور جسم پر جا بجا خراشیں آچکی تھیں۔ رستے زخموں کی جلن اور چبھن سے وہ کراہ اٹھا اور مارے درد کے دہرا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد دوپہر کا آگ اگلتا سورج اس کے وجود پر نیزے برسانے لگا اور جسم نمکین پسینے سے بھیگنے لگا، ہونٹ گلے سے ملنے لگی اور زبان تالو چاٹنے لگی۔ اس نے اپنی بکھری ہوئی ہمت بٹور کر کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر اس کے بوڑھے زخمی تھرتھراتے پیر اس کا ساتھ نہ دے سکے اور وہ بے بس ہو کر حیرت بھری نگاہوں سے ببول کی ننگی ٹہنیوں کی طرف دیکھنے لگا جو نہ سایہ دے سکتی تھیں نہ پھل !!

دوسرا نام

جمیل آفتاب
چاندور بازار ۴۴۴۷۰۴
ضلع امراوتی (مہاراشٹرا)

وہ جب بھی اپنے دوست کے گھر جاتا بھابھی ہمیشہ اس کے سامنے اپنے شوہر کی بے وفائی کا ذکر کرنے لگتیں۔ "آپ انھیں سمجھاتے کیوں نہیں؟

"آخر کیا سمجھاؤں کچھ پتہ بھی تو چلے!" وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن کر پوچھتا۔ "یہی کہ وہ اپنے بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری پرائی عورتوں کی طرف نظر نہ ڈالے۔"

"یہ کیا بات ہوئی بھابھی؟ ۔ آخر دنیا میں ایسا کونسا اچھا مرد ہے بھابھی جو پرائی عورتوں کی طرف نہیں دیکھتا؟ ۔ اور پھر وہ پرائی عورتوں کی طرف صرف دیکھتا ہی تو ہے بھابھی" اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

"کیا دیکھنے والا صرف دیکھنے کی ہی نیت سے دیکھتا ہے؟ .... اس کے دل میں اور کوئی حسرت اور کوئی تمنا نہیں ہوتی؟" وہ چابی والے کھلونے کی طرح تھوڑا تھوڑا کھلنے لگتیں۔

"ہوتی ہے، ہوتی ہے، ضرور ہوتی ہے۔ لیکن جس کی طرف وہ چاہت کی نظروں سے دیکھتا ہے، اس نے ابھی تک اسے اپنے دل کے باغیچے میں جھانکنے کی اجازت نہیں دی ہے۔"

"تو کیا آپ انھیں اس چڑیل کے دل کی سیر کرنے کے بعد سمجھاؤگے؟"

"وہ سنئے تب نا۔"

"کیا وہ مجھ سے بھی زیادہ خوبصورت ہے؟" ۔ آواز میں نرمی، جستجو اور درد کا ملا جلا احساس ہے۔

"بالکل نہیں۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ خوبصورتی میں وہ آپ کے پیروں کی بھی برابری نہیں کر سکتی۔"

"کیا اس کا نام مجھ سے اچھا ہے؟"

"ہاں بھابھی! نام تو واقعی آپ سے زیادہ خوبصورت ہے اس کا۔ "لیقتہ شاداب" ۔ اس نے اس کے نام پر زور دیتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی "اور اب اس میں اس بیچاری کا کیا قصور ہے بھابھی کہ وہ بھی میرے دوست یعنی آپ کے شریک سفر کو پسند کرنے لگی ہے۔"

"اچھا تو آگ دونوں طرف لگی ہوئی ہے؟" تھکے ہوئے مسافر کا سا انداز ہے۔

"جی سولہ آنے۔ مگر میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہوں گا بھابھی۔"

"کیا مشورہ۔؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"یہی کہ جب آپ جیسی خوبصورت ساتھی کی اسے قدر نہیں ہے تو پھر آپ کو بھی اس کی طرف سے لاپرواہی برتنی چاہیے۔"

"نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا .... آخر وہ سرتاج ہیں۔ وہ چاہے لاکھ مجھ سے منہ موڑیں، مگر میں ان کے ساتھ بے اعتنائی نہیں کر سکتی۔"

"تو پھر یوں ہی زندگی بھر جلتی کڑھتی رہو۔" اس نے جھنجھلاتے ہوئے جواب دیا "میں تمہارا خیر خواہ ہوں، میرے دل میں تمہارے لیے ایک نرم گوشہ ہے۔ اور میں .... اسی نرم گوشے کو دوسرا رشتہ، دوسرا نام دینا چاہتا تھا اس لیے یہ مشورہ تمہارے گوش گزار کیا۔"

"دوسرا نام؟ ۔ میں سمجھی نہیں۔ اس نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں پیار کا نام۔" اس نے موقعہ کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے فوراً جال پھینکا۔

"پھر ان میں اور تم میں کونسا فرق رہا؟ ۔ کیا اس طرح کا رشتہ مجھ سے جوڑ کر تم اپنی بیوی کے ساتھ غداری نہیں کروگے؟؟" بھابھی کے اس جواب سے وہ اس طرح گھبرا گیا جیسے کسی نے زہریلے ناگ کے سر پر پتھر سے وار کر دیا ہو۔

موسیٰ علی موسیٰ
پیپل پورہ، چاندور بازار
امراوتی - ۴۴۴۷۰۴

نیا زمانہ

والد صاحب کے لاکھ منع کرنے پر بھی وہ، پڑوس میں ٹی۔وی دیکھنے کے لیے چلی گئی۔اور ہاں ! باپ کے علاوہ اسے روکنے والا اور کون باقی رہا تھا۔ماں کا سایہ تو اس کے سر سے بچپن میں ہی اٹھ چکا تھا۔لیکن آج شام ڈھلے جب باپ محنت مزدوری کر کے گھر لوٹا اس نے دیکھا لڑکی گھر میں نہیں تھی۔اس کا غصہ ساتویں آسمان پر چڑھ گیا۔باپ نے کسی کے ذریعہ لڑکی کو بلوایا۔جیسے ہی لڑکی گھر میں داخل ہوئی باپ نے لال پیلی نظروں سے اسے دیکھا اور بھاری بھرکم ہاتھ سے زوردار طمانچہ اس کے نرم و نازک گال پر رسید کر دیا۔لڑکی گال سہلا کر ہچکیاں لیتی ہوئی جھنجھلاہٹ سے کہہ اٹھی "کیا میں آپ کو غلط لائن کی نظر آتی ہوں۔ !!" اتنا سنتے ہی باپ کے پیروں تلے کی زمین کھسکنے لگی۔جیسے ایک ساتھ ہزاروں بچھوؤں نے ڈنک مار دیئے ہوں۔!کیونکہ اس وقت لڑکی کی عمر صرف گیارہ برس کی تھی۔!!!"

غریب کا دل

جب ندیم پیدا ہوا تو باپ کا سایا سر سے اٹھ گیا۔ماں نے بڑی جانفشانی کے ساتھ ہوس کے بھیڑیوں سے بچ کر لوگوں کے گھر جھوٹے برتن صاف کر کے اپنے لخت جگر کو پڑھایا لکھایا۔اور آج وہ خدا کے فضل و کرم سے ایک کامیاب انجینئر بن چکا تھا۔ماں خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔اور دوسری خوشی یہ کہ آج اس کا لال ڈیوٹی جوائن کرنے کے لیے پونہ شہر جا رہا تھا۔ماں نے ڈھیر ساری دعائیں اپنے بیٹے کو دیں اور اسے بخوشی رخصت کر دیا۔آج ندیم کو گئے پورے ۳۰ تیس دن گزر چکے تھے۔وہ اپنے بیٹے کی یادوں میں ہر پل کھوئی رہتی۔اسے اپنی غریبی کا احساس تھا۔ساٹھ روپے ہفتے میں ہی وہ اپنا اور اپنے لخت جگر کا گزر بسر کرتی تھی۔شاید ہی اس نے اپنی زندگی میں کبھی سو کا نوٹ دیکھا ہو۔وہ دور تک ماضی کی یادوں میں کھوئی رہی اچانک دروازے پر کھٹ کھٹ کی آواز سے چونک پڑی۔سامنے دیکھا تو پوسٹ مین کھڑا تھا۔آپ کا منی آرڈر ہے مائی جی۔وہ بولا۔آپ یہاں انگوٹھا لگا دیجئے۔بڑھیا نے اپنا انگوٹھا لگایا۔اور پوسٹ مین ۱۰۰ کے ۳۰ نوٹ بڑھیا کے ہاتھوں میں تھما کر چلا گیا۔بڑھیا کبھی نوٹ دیکھتی تو کبھی اپنے ٹوٹے ہوئے گھر کو دیکھتی۔گویا وہ پیسے رکھنے کے لئے جگہ تلاش کر رہی ہو۔اچانک زور سے قہقہہ مار کر گر پڑی۔اور لگاتار قہقہے لگاتی رہی۔وہ اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھی۔!!!!"

الجھنوں کو یوں بھی سلجھاتے ہیں ہم

دلیپ سنگھ
۴/۵۹ راجندر نگر - نئی دہلی - ۱۱۰۰۶۰

[پچھلے دنوں ہمارے مزاح نگار دوست دلیپ سنگھ اپنی کچھ الجھنیں سلجھانے امریکہ تشریف لے گئے تھے ، یہ مضمون خاص طور پر انشاء کے قارئین کے لیے انہوں نے وہاں سے روانہ کیا۔

مدیر]

۱۹۴۷ میں جب ملک تقسیم ہوا تو ہمارا خاندان مغربی پنجاب کے ایک گاؤں سے منتقل ہو کر دلی آ گیا۔ میں اس وقت نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ۱۹۴۸ میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد میرے لئے ملازمت ڈھونڈنا ضروری ہو گیا کہ خاندان کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ ایک دن کسی اخبار میں اشتہار پڑھا کہ اردو کے ایک ہفتہ وار اخبار کو ایک ایسے نوجوان کی ضرورت تھی جو خوش خط ہو۔ میں نے درخواست دی تو فوراً منتخب کر لیا گیا میرا نہ صرف خط اچھا تھا بلکہ اردو زبان و ادب کے ساتھ تعلقات بھی اچھے تھے۔ ایڈیٹر نے شاید مجھے لفافوں پر پتے لکھنے کے لئے ملازم رکھا تھا لیکن میری "قابلیت" کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ اخبار کی بہت ساری ذمے داریاں میرے سپرد کر دیں لیکن تنخواہ وہی رہنے دی جو پتے لکھنے والے کو دی جاتی ہے

اگر آپ اخبار اور رسائل کا بغور مطالعہ کرنے کے عادی ہیں تو یقیناً آپ نے دیکھا ہو گا کہ بہت سے اخباروں اور رسالوں میں ایک کالم شائع ہوتا ہے جن میں قارئین کی نفسیاتی الجھنوں کو ایک ماہر نفسیات سلجھاتا ہے۔ نمونے کے طور پر میں اردو کے ایک مشہور اخبار میں شائع شدہ اس کالم کا ایک مختصر سا نمونہ پیش کر رہا ہوں۔

سوال : میرے گھر کے سامنے والے مکان میں ایک لڑکی رہتی ہے جس کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد میں اس سے بے پناہ محبت کرنے لگا ہوں میرا اندازہ ہے کہ اس کے دل میں بھی میرے لئے محبت جاگ چکی ہے کہ وہ دن میں کئی بار اس کھڑکی میں آ کھڑی ہوتی ہے جو ہمارے گھر کی طرف کھلتی ہے شروع شروع میں ان کی یہ کھڑکی ہمیشہ بند رہتی تھی لیکن اب اکثر کھلی رہتی ہے۔ کئی دفعہ میرا جی چاہا ہے کہ اس لڑکی کو خط لکھ کر اپنی محبت کا اظہار کر دوں لیکن ڈر لگتا ہے کہ اگر کہیں میرا اندازہ غلط نکلا تو کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ آپ بتلایئے کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے ؟

جواب : آپ نے خط میں جو تفصیلات لکھی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ لڑکی کے دل میں اگر آپ کے لئے ابھی تک پوری طرح محبت بیدار نہیں ہوئی تاہم اتنا صاف ظاہر ہے کہ وہ یعنی محبت انگڑائیاں ضرور لینے لگی ہے۔ دیکھئے نا اتنی سردی میں کھڑکی کھلی رکھے کا جسے کسی کو دیکھنے کی تمنا ہو گی اس لئے ہمارا مشورہ ہے کہ ایک دن اپنے دل کی بات زبان پر لے آیئے۔ انشاء اللہ کامیابی ہو گی۔

سوال : میرے ساتھ کالج میں ایک لڑکا پڑھتا تھا جس سے میری دوستی ہو گئی۔ آہستہ آہستہ ہماری دوستی عشق میں بدل گئی اور ہم نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ لڑکے کی باتوں میں آ کر ہم دونوں ایک دن وہ حد بھی پار کر گئے جس کی مذہب اور سوسائٹی اجازت نہیں دیتی۔ مجھے افسوس تو بہت ہوا

لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ لڑکا مجھ سے شادی کرلے گا۔ لیکن اس نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تمہارے تعلقات میرے ساتھ ایسے ہو سکتے ہیں تو یقینا کسی اور کے ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔ اب میرے والدین نے میرے لئے ایک اچھا لڑکا تلاش کر لیا ہے جو نہ صرف دیکھنے میں پہلے لڑکے سے بہتر ہے بلکہ تنخواہ بھی زیادہ پاتا ہے۔ چنانچہ میں اس سے شادی کر رہی ہوں۔ کیا مجھے لڑکے کو بتادینا چاہیے کہ مجھ پر کیا بیت چکی ہے؟

جواب : آپ نے جو حرکت کی وہ ٹھیک تو نہیں تھی لیکن جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اس کے بارے میں سوچ سوچ کر اپنے آپ کو پریشان مت کیجئے کہ جوانی میں غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ خدارا اپنے خاوند کو ہرگز کچھ نہ بتایئے گا۔ اگر اسے کسی اور ذریعے سے پتہ چل بھی جائے اور وہ اس سلسلے میں آپ سے پوچھ تاچھ کرے تو صاف مکر جایئے گا کہ ایسے جرم کو ثابت کرنا بہت مشکل ہوتا۔ ہماری طرف سے شادی کی مبارک باد قبول فرمایئے۔

ایسے خط اور ان کے جواب پڑھنے کے بعد اکثر مجھے خیال آتا ہے کہ انہیں اخبار میں کیوں شائع کیا جاتا ہے۔ ماہر نفسیات کو تو ایسے خطوں کا جواب خفیہ طور پر دینا چاہیے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ کسی کے ذاتی مسئلے کو آپ اشتہار بنا کر رکھ دیں۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ لوگ جن کا ان مسائل سے ذاتی طور پر کوئی تعلق نہیں ہوتا وہ بھی یہ خط چٹخارے لیکر پڑھتے ہیں۔ کئی لوگ تو میں نے سنا ہے اخبار کے دفتر میں جاکر منتیں کرتے ہیں کہ صاحب ہمیں اس لڑکی کا پتہ بتادیجئے جس نے وہ خط لکھا تھا تاکہ ہم بہ نفس نفیس اسے تسلی دے سکیں کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ کچھ لوگ اس کالج کا نام جاننا چاہتے ہیں جہاں وہ لڑکی پڑھتی تھی کہ اس کالج میں انہیں عشق کے امکان بہتر نظر آتے ہیں۔ کئی لوگ اس لڑکے کا پتہ جاننا چاہتے ہیں جو وعدہ کرکے مکر گیا تھا تاکہ اسے سبق سکھا سکیں کہ بھولی بھالی لڑکیوں کو دھوکہ دینا بری بات ہے۔

میرے کئی دوستوں کو ماہر نفسیات کے جوابات پر بھی اعتراض ہے۔ اوپر درج کئے گئے پہلے خط کے بارے میں ایک دوست کا کہنا ہے کہ ماہر نفسیات نے جو مشورہ دیا ہے وہ سراسر غلط ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ سامنے والے گھر کی کھڑکی چونکہ کھلی رہتی ہے اس لئے صاف ظاہر ہے کہ وہ لڑکی مکتوب الیہ سے محبت کرنے لگی ہے۔ کیا گھروں میں کھڑکیاں اس لئے لگائی جاتی ہیں کہ ان میں رہنے والی جوان لڑکیاں سامنے والے گھر کے نوجوان لڑکوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل سکیں۔ کھڑکیاں تو گھروں میں اس لئے لگائی جاتی ہیں کہ تازہ ہوا اندر آسکے۔ میرے دوست کا خیال ہے کہ اس ماہر نفسیات کو خود کسی ماہر نفسیات کی ضرورت ہے۔

دوسرے خط کے بارے میں میرے ایک دوست کا خیال ہے کہ اس لڑکی کو کسی ماہر نفسیات کے مشورے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ خود دنیا کی اونچ نیچ کو سمجھتی ہے۔ دیکھو نا وہ پہلی نظر میں ہی بھانپ گئی ہے کہ اس کے گھر والوں نے اس کے لئے جو لڑکا چنا ہے وہ نہ صرف دیکھنے میں پہلے لڑکے سے اچھا ہے بلکہ اس سے تنخواہ بھی زیادہ پاتا ہے۔ ماہر نفسیات کا اسے مشورہ دینا کہ وہ اپنے خاوند کو اپنے پہلے عشق کے بارے میں کچھ نہ بتائے اس لئے فضول ہے کہ وہ لڑکی کبھی بتائے گی بھی نہیں۔ میرے دوست کا خیال ہے کہ پہلے لڑکے نے شادی سے انکار نہیں کیا ہوگا بلکہ یہ لڑکی خود ہی اس سے پینڈ چھڑا کر نکل آئی ہوگی کہ چالاک لڑکیاں ایسے ہی کرتی ہیں۔

میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ میرے دوستوں کے اعتراضات درست ہیں یا نہیں کیونکہ میں اس ماہر نفسیات کی قابلیت سے واقف نہیں ہوں۔ ہاں البتہ کچھ عرصے تک میں نے خود ماہر نفسیات کا رول ادا کیا تھا اور یقین مانیے میں نے جو مشورے دیئے تھے وہ سب کے سب صحیح نکلے۔

میں نے جس اخبار میں ملازمت کی تھی اس میں بھی وہ کالم شائع ہوتا تھا جس میں قارئین کے خطوں کے جواب کوئی ماہر نفسیات دیتا تھا۔ لیکن میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں تھا کہ سارے دفتر میں میرے اور اڈیٹر کے علاوہ کوئی اور تھا ہی نہیں۔ ایک دن اڈیٹر نے مجھ سے کہا کہ ہمارا ماہر نفسیات چونکہ چھٹی پر گیا ہوا ہے کیا میں اس کی غیر حاضری میں اس کالم کی ذمے داری سنبھال سکتا ہوں۔ میں نے سوچا تو مجھے لگا کہ یہ کام مشکل تو نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارے یار دوست اکثر اپنے مسائل کا حل ڈھونڈنے کے لئے ہم سے مشورہ کرتے رہتے ہیں۔ کئی بار ہمارے مشورے کی وجہ سے ان کے مسائل حل بھی ہوتے ہیں۔ اگر ہم ان کے مسائل حل کر سکتے ہیں تو قارئین کے کیوں نہیں۔ ہماری وجہ سے اگر کسی قاری کا مسئلہ حل ہو گیا تو وہ خوش ہو کر ہمیں دعائیں دے گا اور اگر نہ ہوا تو وہ ہمارا کیا بگاڑ لے گا۔ چنانچہ ہم نے اڈیٹر کو کہا کہ ہم بخوشی یہ ذمے داری قبول کرنے کو تیار ہیں وہ ہمیں قارئین کے خط

دے دیے، ہم جواب لکھ دیں گے۔ یہ سنتے ہی اڈیٹر ہمارا منہ تکنے لگا۔ کہنے لگا "تمہیں اتنا بھی نہیں پتہ کہ قارئین ہمیں کوئی خط نہیں لکھتے۔ خط بھی تم لکھو گے اور جواب بھی تم لکھو گے۔ سمجھے"

یہ بات سن کر ہمیں حیرانی تو ضرور ہوئی لیکن اتنی بھی نہیں کہ ہم اس کالم کی ذمے داری قبول کرنے سے انکار کر دیتے۔ ہم نے سوچا کہ اگر ہم جواب لکھنے کے اہل ہیں تو سوال لکھنے کے کیوں نہیں۔ سوال تو جواب سے ہمیشہ آسان ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم نے یہ خدمت اپنے سر لے لی۔

اگلے دن ایک صاف ستھرا کاغذ لے کر بیٹھ گئے اور اگلے ہفتے کے کالم کے لئے سوال سوچنے لگے۔ جب آدھ گھنٹے تک کوئی سوال نہ سوجھا تو گھبراہٹ ہونے لگی کہ اب کیا ہوگا۔ اسی لمحے ہمیں اپنے استاد کا مشورہ یاد آیا کہ جب کبھی لکھنے کے لئے مواد کی ضرورت ہو اور باہر سے کوئی چیز نہ ملے تو اپنے اندر جھانکو۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا اور دیکھا کہ ہمارے اندر سینکڑوں پریشانیاں ہیں جو حل طلب ہیں۔ سینکڑوں ایسے سوال ہیں جو جواب کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ہم نے اپنے سوال کاغذ پر لکھنے شروع کئے اور پھر ان کو حل کرنے لگے۔ اس طرح کالم کی شکل بننے لگی جو کچھ اس طرح تھی۔

سوال : میں نے حال ہی میں میٹرک کا امتحان پاس کیا ہے۔ کالج کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ میرے والد کے وسائل اچانک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں ان کی مجبوری کو سمجھتا ہوں لیکن اپنی خواہش کا کیا کروں کہ دبائے نہیں دبتی۔

جواب : اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش بہت اچھی خواہش ہے۔ ہماری طرف سے مبارک باد قبول فرمایئے۔ لیکن خاندانی مجبوریوں کو سمجھنا بھی بہت ضروری ہے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ دن بھر ملازمت کیجئے اور شام کو کسی کالج میں داخلہ لے لیجئے۔ اس طرح آپ تعلیم بھی حاصل کر لیں گے اور خاندان پر بوجھ بھی نہیں بنیں گے۔

سوال : میرے گھر کے سامنے سڑک کے دوسری طرف کوٹھیوں کی ایک قطار ہے۔ ان کوٹھیوں میں ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی رہتی ہے جو ہر روز اپنے ذاتی تانگے پر سوار ہو کر سکول جاتی ہے۔ اسے دیکھ کر میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس کے تانگے کے پیچھے دوڑ پڑوں اور دوڑتے دوڑتے اس سے اظہار محبت کروں۔ کیا مجھے ایسے کرنا چاہیے۔

جواب : ہمارا مشورہ ہے کہ ایک دو سال کے لئے اپنا جذبہ محبت دبائے رکھیئے۔ ہو سکتا ہے اس عرصہ میں آپ کو کوئی اچھی سی نوکری مل جائے اور آپ اپنا تانگہ خریدنے کے اہل ہو جائیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو آپ کا کام نسبتاً آسان ہو جائے گا اور آپ اپنی محبت کا اظہار اس لڑکی کے تانگے کے پیچھے دوڑ کر نہیں بلکہ اپنے تانگے کو اس کے تانگے کے مقابل چلاتے ہوئے کر سکیں گے۔ اگر اس عرصے میں اس کی شادی ہو گئی تو گھبرایئے گا نہیں کہ کوئی اور تانگے والی آپ کو نظر آجائے گی۔

سوال : میں جہاں کام کرتا ہوں وہاں مجھے بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔ میرا مالک میرا کام تو بڑھاتا جا رہا ہے لیکن تنخواہ نہیں بڑھا رہا۔ کیا کوئی ایسا نسخہ ہے جس کے ذریعہ اس کے دل میں یہ خواہش بیدار کی جا سکے کہ وہ میرے ساتھ انصاف کرے۔

میں ابھی اتنا ہی لکھ پایا تھا کہ اڈیٹر میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اگر کالم مکمل ہو گیا ہو تو اسے دے دوں تاکہ پرچہ وقت پر پریس جا سکے۔ میں نے کہا "صرف ایک سوال کا جواب دینا ہے۔" کہنے لگا۔ وہ میں دے دوں گا۔ اگلے ہفتے جب پرچہ چھپ کر آیا تو اس سوال کا جواب اڈیٹر نے یوں دیا تھا۔ "یہ ممکن نہیں ہے۔"

اسی دن اڈیٹر نے مجھے ملازمت سے نکال دیا۔ وجہ یہ بیان کی کہ تم کل پرزے نکالنے لگ گئے ہو جس کی وجہ سے ہمارا نباہ ممکن نہیں ہوگا۔

اس دن اخبار کے دفتر سے نکلتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اڈیٹر نے اس کالم کی ذمہ داری مجھے سونپ کر مجھے کم از کم یہ ذہن نشین کرا دیا ہے کہ اپنے مسائل کے حل ڈھونڈنے کے لئے مجھے کسی ماہر نفسیات کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ حل میں خود تلاش کر سکتا ہوں۔

ڈاکٹر مظفر حنفی
پروفیسر اقبال چیئر
کلکتہ یونیورسٹی ۔ کلکتہ ۷۳

دو غزلیں

(پرویز شاہدی کی یاد میں)

سنا ہے عافیت خطرے میں ہے عزت مآبوں کی
تو پھر جاری رہے یلغار ساحل پر حبابوں کی

کبھی طوفان اٹھتے ہیں ، کبھی سیلاب آتے ہیں
ضرورت پڑ گئی محلوں کو ہم خانہ خرابوں کی

تبسم سب کے ہونٹوں پر ، محبت سب کے سینے میں
مگر تعبیر الٹی ہے مرے معصوم خوابوں کی

ہماری آبلہ پائی نے کیا کیا گل کھلائے ہیں
ادھر جنگل ہے کانٹوں کا ادھر فصلیں گلابوں کی

کسی گوتم ، کسی سرمد ، کسی سقراط سے پوچھو
کہ یہ فہرست میں شامل ہیں میرے ہم رکابوں کی

جنوں کے پاؤں میں زنجیر ، وحشت کے لیے زنداں
خرد محدود کوئی حد ہے تمہارے احتسابوں کی

مظفر عالموں کے خون میں حدت نہیں ہوتی
سکھا دو تجربے کی دھوپ میں باتیں کتابوں کی

ہاتھ بندھے ہیں آنکھ مندی ہے لیکن اس سے حاصل کیا
خون اگر حدت رکھتا ہو ، مقتل کیا ہے قاتل کیا

پیروں میں دو چار پھپھولے ، سر پہ تھوڑی گرد سفر
وحشت کو اتنا ہی بہت ہے بنجاروں کی منزل کیا

مٹی اور پسینہ مل کر خوشبو دینے لگتے ہیں
یوں سب کو مٹی ہونا ہے عالم کیا اور جاہل کیا

تختے پر بہتے پھرتے تھے ، موج میں تھے ہم ، لیکن آج
موجیں سر دھنتی پھرتی ہیں ، ڈوب رہا ہے ساحل کیا

آندھی کے ہمراہ رہیں تو ذرے اوپر اٹھتے ہیں
خاک بسر ٹھوکر کھاتے ہیں تو کیا اور تیرا دل کیا

آئینہ تو آج مظفر لے آئے بازار سے ہم
اب چہرہ بھی لانا ہوگا آئینے کے قابل کیا

ستارہ لطیف خانم
برطانیہ

غزل

کیوں رہتے ہیں آثار جنوں ، سوچ رہی ہوں
کس کس سے میں یہ بات کہوں ، سوچ رہی ہوں

جس بات کو سب اہل نظر تاڑ چکے ہیں
کب تک میں اسے راز رکھوں ، سوچ رہی ہوں

کشمیر ہو یا بوزنیا یا ہو فلسطین
کس کس کا میں نوحہ لکھوں ، سوچ رہی ہوں

ہر عہد میں دیکھے ہیں بدلتے ہوئے موسم
بدلا نہیں کیوں حال زبوں ، سوچ رہی ہوں

اس دور میں تحقیر مسلماں ہے فزوں
کیوں سرد ہے اس قوم کا خوں ، سوچ رہی ہوں

ایک خوف سا چھایا ہے مری فکر و نظر پر
یہ بات میں اب کس سے کہوں ، سوچ رہی ہوں

دنیا سے دبے پاؤں گزر جاؤں ستارہ
بس اب تو یہی کر کے رہوں ، سوچ رہی ہوں

عبداللہ ندیم
مجید منزل 4_2_54
لطیف بازار _ نظام آباد (اے۔پی)

غزل

اجنبی نہیں ہوں میں آنکھ کیوں چراتے ہو
میں نے تم کو چاہا ہے کیوں عذاب ڈھاتے ہو

روشنی ہی آنکھوں کی آکے چھین لو میری
کیوں ہوا سے مل کر تم یہ دیے بجھاتے ہو

زندگی کی نعمت بس ایک بار ملتی ہے
جان کر بھی تم اپنا وقت کیوں گنواتے ہو

درد بن کے رہتے ہو تم ہمارے سینے میں
اشک بن کے آنکھوں میں اب بھی جھلملاتے ہو

کس کو دوں ثبوت آخر اپنی میں وفاؤں کا
لوگ آزماتے ہیں تم بھی آزماتے ہو

جس کو بھول جانا ہے اس کو یاد رکھتے ہو
جس کو یاد رکھنا ہے اس کو بھول جاتے ہو

ہنسنے اور ہنسانے کا فن بھی تم کو آتا ہے
تم سخن کی کھیتی میں درد بھی اگاتے ہو

تم ندیم بھولے ہو، چھوڑ کر خدا کا گھر
کس صنم کے کوچے میں اپنا سر جھکاتے ہو

جمیل نظام آبادی ایم اے
ایڈیٹر "گونج"
اعظم روڈ _ نظام آباد

غزل

بے خودی تھی دلکشی تھی زندگی تھی میں بھی تھا
رات حسن یار کی جادوگری تھی میں بھی تھا

مجھ کو کب احساس تھا تاریکیوں کا راہ کی
میرے عزم و حوصلے کی روشنی تھی میں بھی تھا

رات کے بارے میں کچھ مت پوچھیے کیسے کٹی
دل کی گلیاں تھیں مری دیوانگی تھی میں بھی تھا

ورنہ بچ آنا بہت مشکل تھا غم کی آنچ سے
جانے کس کس کی دعاؤں کی نمی تھی میں بھی تھا

رات کی رانی کی خوشبو ہجر کے لمحوں کا کرب
تیری یادوں کی چٹکی چاندنی تھی میں بھی تھا

دھوپ کی تلوار لے کر سر پہ سورج تھا کھڑا
اور بے سایہ شجر تھے تشنگی تھی میں بھی تھا

اس جگہ رشک و حسد کی آندھیاں چلتی رہیں
جس جگہ میری وفا تھی دوستی تھی میں بھی تھا

آگہی کے موڑ سے بچ بچ کے آیا ہے جمیل
ایسی منزل پر جہاں بس بے خودی تھی میں بھی تھا

مجیب رامش
3/28 روی شنکر نگر
بھوپال 462016

رائیگاں

سورج اپنی کرنوں کی قسمت مانگے
ہوا بدن میں اترے تو اجرت مانگے
بھوک پیٹ کا روگ ہی چاہے بن جائے، روٹی نہ ملے
پیاس روح کا زخم ہی چاہے کہلائے، پانی نہ ملے
بادل ہیں کہ خوشامد خور اعلیٰ افسر ہیں
جل تھا میں ننگی کنیا ہیں تب خوش ہوں تب جل برسے
بنیئے کھیت _ !!!
جب ان کو عورت کے لہو کا سود ملے تب فصلیں دیں
کیا جو لوگ پہاڑوں سے اترے سب پاگل تھے _؟
یہ کیسی دنیا ہے جس میں تم رہتے ہو؟
لڑکا جب نوکر ہو جائے تب ماں کی ممتا جاگے _!!
لڑکی کو گھر بار نہ جب تک مل پائے
بیٹی نہ بنے کاندھوں کا بوجھ کہی جائے
عورت ساتھ نبھانے کو کردار نہیں دولت دیکھے _!!!
ردی کی دو کانوں پر اک بھیڑ بچنے والوں کی
تم بھی لکھ کر اس کاغذ کو اس دو کان پہ ڈال آنا!
"وہسکی" کی بوتل اس کی تھیلی میں کسی کے گھر جائے گی!
تنہائی _ دانتوں کا درد !!!
چاہے کمرہ ہو چاہے تالاب کنارے کا وہ پتھر
جس پر تم بیٹھے ہو
دور سڑک پر اکا دکا لوگ ابھی چلتے پھرتے ہیں
گھر جا کر بھی کیا کر لوگے _؟
چھت سے آتی _ "ننگی آوازیں" _
کیا سونے دیں گی تمہیں؟
گھر جا کر بھی کیا کر لوگے _؟؟

بخش لائلپوری (لندن)

غزلیں

○

غنیم شہر نے آسیب گھر رکھے ہوئے ہیں
دلوں میں وسوسے آنکھوں میں ڈر رکھے ہوئے ہیں
انا کے کیف سے کوئی یہاں اونچا نہیں ہے
دکھاوے کے فقط کندھوں پہ سر رکھے ہوئے ہیں
عجب پختہ یقیں ہیں ساکنانِ شہر ظلمت
اطاقِ شب میں امید سحر رکھے ہوئے ہیں
قفس کے ساتھ بنیادِ قفس بھی ہل رہی ہے
پرندے آبروئے بال و پر رکھے ہوئے ہیں
کشیدہ سر کوئی اب ڈھونڈ کر لائے کہاں سے
کشیدہ سر ستم کی دار پر رکھے ہوئے ہیں
نکل جاتے ہیں جو غنچوں کو وقتِ آفرینش
چمن میں جابجا ایسے شجر رکھے ہوئے ہیں
زمیں کی پستیوں سے بخش ابھی نکلے نہیں ہیں
فلک کے بام پر اپنی نظر رکھے ہوئے ہیں

○

ختم ہوئی ہے سانس کی پونجی آخری دم پر بیٹھا ہے
بخش ازل سے آس لگائے تیرے کرم پر بیٹھا ہے
ڈر کر یہ صیادِ ازل سے امن کے نغمے گا نہ سکا
کب سے حرف و سخن کا پنچھی شاخِ قلم پر بیٹھا ہے
اپنے حرم کے تہہ خانے میں اہلِ حرم محبوس ہوئے
پیر کلیسا گاؤ کے پنجے بامِ حرم پر بیٹھا ہے
اللہ جانے کب یہ پھٹ کر دنیا کو برباد کرے
میرے عہد کا ہر اک انساں ایٹم بم پر بیٹھا ہے

قطعہ

پیڑ ہمارا کیا پھل دے گا کارگہ زر داری میں
دیوِ استحصال یہاں پر شاخ پہ جم کر بیٹھا ہے
ہم کو یقیں ہے مٹ نہ سکے گا دہر کی تند ہواؤں سے
بخش جو اپنی جاں کے ورق پر حرف رقم کر بیٹھا ہے

قاضی حسن رضا
قاضی پورا۔ کھنڈوا ۴۵۰۰۰۱

غزلیں

○

تم نے محاذِ غم کو سنبھالا کبھی نہیں
نیزوں پہ اپنے سر کو اچھالا کبھی نہیں
ہم نے غمِ حیات کو کچلا ہے جا بہ جا
یہ سانپ آستین میں پالا کبھی نہیں
مجھ کو نہیں گوارہ کسی شکل میں شکست
گردن میں ہار پھولوں کا ڈالا کبھی نہیں
صحرا کی تیز دھوپ، سفر دشت کا طویل
پھوٹا ہمارے پاؤں کا چھالا کبھی نہیں
حسنِ عمل نے تجھ کو سنوارہ حسن رضا
کیچڑ سے خود کو تو نے نکالا کبھی نہیں

○

اظہر نیر
کنسی سمری، دربھنگا، بہار

آپ آئینہ ہیں آئینہ بچا کر رکھئے
شہر آہن میں کہیں خود کو چھپا کر رکھئے
زندگی ہوگئی کشکول کی مانند تو پھر
ہر گھڑی اس کی طرف ہاتھ اٹھاکر رکھئے
پتھروں کی ہے یہاں چاروں طرف سے بوچھار
اپنے اخلاق کا آئینہ بچاکر رکھئے
جب وہ قسمت میں نہیں ہے تو نشانی کے طور
اس کی تصویر کو سینے سے لگاکر رکھئے
اس کے آنے کی ہے امید تو پھر لازم ہے
گھر کے سارے در و دیوار سجاکر رکھئے
کس طرح نام قبیلے کا بچے گا نیر
سرحدیں مٹنے لگیں خود کو بچاکر رکھئے

ساحل احمد
الہ آباد

بے عنوان نظمیں

۱- چلو
چلتے رہو
تھک جاؤ تو پیر واپس کر دینا

۲- اجتہاد کی زنجیر
آنسوؤں سے بندھی تھی
دھوپ کیوں باہر کھڑی تھی

۳- دھیرے دھیرے سب
رخصت ہو جاتے ہیں
اور پھر رہ جاتی ہے گھر میں خاموشی

۴- دل کی دھڑکن مت گنو
دھڑکنیں گنی نہیں جاتیں
پڑھی جاتی ہیں

۵- کوئی تصویر ایسی مت بناؤ
جو تمہاری ہی رقابت میں
رنگ بدل ڈالے
تماشہ بن جاؤ

۶- پرندہ جب کوئی پر پھاڑتا ہے
صیاد جال ڈال دیتا ہے
پر پھاڑنا کمزوری نہیں

بلبل کاشمیری (لندن)

غزل

کیسے چمن پہ چھاگئے زاغ و زغن تمام
غائب ہیں خوشنوا تھے جو مرغِ چمن تمام

گھٹنے لگا شباب اسے فکر کھا گئی
من کا چھٹانک رہ گیا وہ جانِ من تمام

ترکی بہ ترکی دوں تری ترکی کا کیا جواب
ترکی مری تو کرگئی ترکِ وطن تمام

نازک بدن کی میم کے نازک لباس کو
میں نے چھوا تو ٹوٹ گئے وہ بٹن تمام

وعدے بھی توڑتے ہیں وہ بادام کی طرح
"بادام چشم" ہوتے ہیں وعدہ شکن تمام

قدغن ہے گفتگو پہ بھی گلشن میں اس لئے
منہ کھولتے نہیں ہیں وہ غنچہ دہن تمام

بجلی کے بلب کی بھی ضرورت نہیں رہی
"روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام"

داڑھی جناب شیخ کی تھی محترم بہت
تقسیم کی عوام میں یہ تحفتاً تمام

آنکھیں ترس رہی ہیں انہیں دیکھنے کو پھر
کیا لام پر چلے گئے ہیں گلبدن تمام

"روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام" (حسرت موہانی)

باترح بہاری (کلکتہ)

جہنم کی بہار

رنج و غم اور آفت و افلاس کا مارا ہوا
ایک شاعر آخرش اللہ کو پیارا ہوا

دیکھ کر کھاتے ہیں دنیاوی عمل اور فعل کو
اک فرشتے نے کہا شاعر سے دوزخ میں چلو

جب ہوا داخل جہنم میں تو شاعر نے کہا
مرحبا ! کیا مستقر ہے یہ سکون و امن کا

یہ لٹاتی بھینی بھینی خوشبوئیں بادِ صبا
یہ تلطف یہ تلذذ یہ تعیش یہ مزا

یہ فضائیں یہ گھٹائیں اور یہ فصلِ بہار
خوب ہے تیری مشیت واہ رے پروردگار

سن رہا تھا غور سے داروغہ دوزخ یہ بات
دفعتاً بولا وہ شاعر سے براہِ التفات

زنگ آلودہ ہیں تیری عقل و دانش کے ظروف
یہ جہنم ہے ! جہنم ہے ارے او بیوقوف

آتشِ دوزخ کو بھی کہتا ہے تو فصلِ بہار
اور جہنم میں نظر آتا ہے تجھ کو مرغزار

یہ بتا ! آیا ہے تو دنیا کے کس استھان سے
جھٹ سخنور نے کہا، ڈائرکٹ ہندوستان سے

نوشاد علی انصاری

J 85 نوپیاروڈ کلکتہ_39

تنہائی

جب سے میری آنکھ کھلی ہے
میں نے پائی ہے
کبھی تنہائی،
تو کبھی تنہائی کا کرب
دیکھے ہیں تو
صرف روتے اور بلکتے لمحے
سنے ہیں تو
انگنت جھوٹے سچے وعدے
پیئے ہیں تو
بے شمار آنسو
محسوس کی ہے تو
جیتے لمحوں کی بھینی بھینی خوشبو
یہ سب کچھ دیکھ کر بھی
میں چپ چاپ کھڑا
ہر آتے جاتے موسم میں
بس یہی سوچتا رہا،
کہ کوئی تو ہوگا
جو ہوگا میرا شریک غم
اور رکھ دے گا میرے
ہرے زخموں پر مرہم
لیکن اے خدا !
اس دور کے لوگوں کو یہ کیا ہوا؟
ہمدردی کا نہ کوئی جذبہ
اور نہ ہی پیار کا کوئی صلہ
ظلمتوں کا ہر دم وہ ساتھ دیتے ہیں
جو پیڑ سایہ دیتا ہے
اسے ہی کاٹ دیتے ہیں !

ملک زادہ جاوید
T_25, Sector XI
NOIDA _ 201301

غزل

تمام غم ہیں ادھورے خوشی ادھوری ہے
ترے بغیر مری زندگی ادھوری ہے

شبِ سیاہ پہ تحریر ہو اجالے کی
کہ میرے پاس ابھی روشنی ادھوری ہے

بڑی طویل ہیں عمریں عداوتوں کی مگر
محبتوں کے لیے ہر صدی ادھوری ہے

میں چاہتا ہوں کہ وہ اس پہ اپنا نام لکھے
بہت دنوں سے مری ڈائری ادھوری ہے

نہ جانے کتنے ہی لمحوں کا خون کر ڈالا
کھنڈر کی پیاس مگر آج بھی ادھوری ہے

وہ چاند چہرا نہ اترا ورق پہ البم کے
غزل ہوئی تو ہے لیکن ہوئی ادھوری ہے

اسے سلیقہ تو آتا ہے گفتگو کا مگر
ابھی مزاج میں شائستگی ادھوری ہے

دل و دماغ پہ جاوید اس کا قبضہ ہے
بغیر اس کے مری شاعری ادھوری ہے

اعجاز تابش
ناگور

تمنا

اگر مجھ کو یہ حق ملتا
کہ خوشیاں بانٹ دوں سب کو
تو میں خوشیوں کی سب دولت
مسرت کا ہر اک لمحہ
نہایت پیار سے
سب بیٹیوں کے نام کر دیتا

اگر مجھ کو یہ حق ملتا
کہ میں اخلاق حسنہ
بانٹ سکتا اس زمانے کو
تو میں اوصاف حسنہ
سارے بیٹوں کو عطا کرتا
جہاں روشن بنا دیتا

اگر مجھ کو یہ حق ملتا
کہ بانٹوں پیار کی دولت
تو میں چاہت کی ہر ساعت
محبت کا ہر اک جذبہ
فقط بیوی کو دے دیتا
میں گھر جنت بنا دیتا

اگر مجھ کو یہ حق ملتا
متاعِ زندگی بانٹوں
تو میں ہر اک نفس اپنا
متاعِ زندگی ساری
زمانے بھر کی ماؤں کے
تقدس کو عطا کرتا
اگر مجھ کو یہ حق ملتا

محمد احمد دانش ردولوی
بجنور ـ ۲۴۶۴۳۵ (یوپی)

ایک خط دیارِ غیر سے

میں لے کے ہاتھ میں بیٹھا ہوں خامہ و قرطاس
تصورات میں ابھری تمہاری پرچھائیں
رخِ حسیں کی ضیا باریاں ہیں چاروں طرف
کہ جیسے شام کو رنگ شفق کی لالی ہو
گھنیری زلف سیہ اس طرح ہے بکھری ہوئی
کہ جیسے موسم باراں میں بدلی کالی ہو
بوقت صبح میں بیٹھا ہوں لان میں آکر
پریشاں حال سا غلطیدہ فکر میں اپنی
نسیم صبح کے جھونکوں سے بھیگی بھیگی فضا
مگر میں اپنے ہی فکر و خیال میں گم ہوں
انہی فضاؤں میں تم لے کے ایک تازہ گلاب
بہت قریب سے دیتی ہو پیار کی دعوت
وہی گلاب لگایا تمہارے بالوں میں
رخِ حسیں پہ مچلتی ہے اک حجاب کی لہر
قریب ہو کے بھی تم مجھ سے دور ہوتی ہو
دیار غیر نے ڈالے ہیں میری جھولی میں
یہ چند نقرئی سکے سکون کی خاطر
مگر سکون میسر کہاں زمانے میں
تمہارا ہجر ہے اور کچھ سہانی یادیں ہیں
نئی زمین ہے ماحول اجنبی سا ہے
یہاں پہ کون ہے اپنا سبھی ہیں بیگانے
وہ سوندھی مٹی وطن کی بہت ستاتی ہے
شکم کی بھوک نے اپنوں سے مجھ کو دور کیا
شکم کی بھوک کا احساس مٹ چکا لیکن
بس ایک آرزو دل میں تمہارے وصل کی ہے

مانک ٹالا
E-10, Cenced Apartments,
Pali Hill, Khar.
BOMBAY - 400052

جی۔ کے۔ مانک ٹالا

کیا "سوز وطن" ضبط ہوئی تھی؟

پریم چند کا اصلی نام دھنپت رائے تھا۔ ابتدا میں وہ "نواب رائے" کے قلمی نام سے لکھتے تھے اسی نام سے ان کے دو ناول "کشنا" اور "ہم خرما و ہم ثواب" چھپ کر مقبول ہو چکے تھے۔ علاوہ ازیں ان کے کچھ متفرق مضامین اور تبصرے "اردوئے معلیٰ" اور "زمانہ" وغیرہ رسائل میں اسی نام سے شائع ہو چکے تھے۔ لیکن "سوز وطن" کے شاخسانے کے بعد ان کو یہ نام ترک کرنا پڑا اور کچھ عرصہ تک وہ مختلف رسائل میں "د۔ ر" - "ن۔ ر" وغیرہ نقلی ناموں سے اپنے مضامین اور افسانے شائع کراتے رہے۔ بعد میں منشی دیا نرائن نگم کے تجویز کردہ قلمی نام "پریم چند" سے انہوں نے اپنی تخلیقات شائع کرانا شروع کر دیں۔ اور اب وہ عالم ادب میں پریم چند کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔

اس عرصے میں وہ "نواب رائے" کے نام سے کافی حد تک اپنا ادبی تشخص قائم کر چکے تھے۔ اس لئے "نواب رائے" سے ترک تعلق کے باعث انہیں کافی ذہنی کوفت ہوئی۔ چنانچہ وہ نگم صاحب کے نام اپنے ایک خط میں اس نام کے مرحوم ہو جانے کا سوگ مناتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

> " پریم چند اچھا نام ہے۔ مجھے بھی بہت پسند ہے۔ افسوس صرف یہ ہے کہ پانچ چھ سالوں میں
> نواب رائے کو فروغ دینے کی جو محنت کی گئی وہ اکارت گئی۔ یہ حضرت قسمت کے ہمیشہ
> لنڈورے رہے اور شاید رہیں گے ...."(۱)

لیکن "نواب رائے" کو کیا پتا تھا کہ "پریم چند" کا قلمی نام اختیار کرتے ہی ان پر شہرت کے دروازے کھل جائیں گے۔ پریم چند کی شہرت نے ان کے بہت سے حاسد بھی پیدا کر دیئے جو ان پر ادبی سرقے وغیرہ کے الزامات لگا کر انہیں بدنام کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن وہ لوگ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے اور وہ شہرت کی بلندیوں کی طرف پرواز کرتے رہے۔

"نواب رائے" کا نام ترک کرنے سے انہیں ایک اور ذہنی صدمہ بھی پہنچا تھا جس کے بارے میں نگم صاحب فرماتے ہیں کہ۔

> " پریم چند شروع میں "نواب رائے" کے نام سے لکھا کرتے تھے اور یہ نام انہیں بہت عزیز
> تھا کیونکہ ان کے والد انہیں پیار سے "نواب" پکارا کرتے تھے۔ اور یہ نام ہندو مسلمانوں
> کے معاشرتی اتحاد کی یاد بھی تازہ رکھنے والا تھا۔" ....(۲)

"سوز وطن" پریم چند کی پانچ کہانیاں کا مجموعہ ہے۔ ان کہانیوں کے نام درج ذیل ہیں۔ (۱) دنیا کا سب سے انمول رتن۔ (۲) شیخ مخمور۔ (۳) یہی میرا وطن ہے۔ (۴) صلہ ماتم۔ (۵) عشق دنیا اور حب وطن۔

اس مجموعہ کی آخری کہانی ماہنامہ "زمانہ" کے اپریل ۱۹۰۸ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ باقی کہانیوں کے کسی بھی رسالے میں شائع ہونے کے شواہد نہیں ملے۔

یہ مجموعہ "زمانہ پریس" کانپور کی طرف سے جون یا جولائی ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا تھا۔ کتاب پر اشاعت کا سنہ درج نہیں ہے۔ مگر مصدقہ شواہد سے پتا چلتا ہے کہ اشاعت کی پیش کردہ درج بالا تفصیل درست ہے۔ "زمانہ" کے ستمبر۔اکتوبر ۱۹۰۸ء کے شمارے میں شائع کردہ اشتہار سے پتا چلتا ہے کہ یہ ۹ جزکی کتاب تھی اور دو قسموں کے کاغذ پر شائع ہوئی تھی۔(۱) قسم اول دبیز سد لشی کاغذ والی، کتاب کی قیمت ساڑھے چار آنے اور (۲) قسم دوم معمولی سد لشی کاغذ والی کتاب کی قیمت ساڑھے تین آنے تھی۔(۳)

چوتھی کہانی "صلہ ماتم" کو چھوڑ کر باقی سبھی کہانیاں جذبہ وطن کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ پہلی دو کہانیاں داستانی طرز پر لکھی گئی تھیں۔ ان پر بعض ناقدین نے اعتراض کیا تھا کہ ٹیگور، بنکم، شرت اور انگریزی ادب کی کہانیوں کے مطالعے کے باوجود وہ پرانے رنگ کی داستانی طرز تحریر کو نہ تج سکے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ پریم چند نے یہ انداز بیان دانستہ طور پر اپنایا تھا اور حب وطن کے جذبے کو ابھارنے کے لئے تہ دار انداز تحریر اختیار کیا تھا۔

اردو اور ہندی کے تقریباً سبھی ماہرین پریم چندیات اس بات پر متفق ہیں کہ یہ کتاب باغیانہ ہونے کے باعث بحق سرکار ضبط کرلی گئی تھی۔ اس سلسلے میں چند مستند محققین کی آراء پیش خدمت ہیں :-

(۱) ڈاکٹر جعفر رضا :- "یہ کتاب انگریزی سرکار کو "سڈیشن" (اشتعال) نظر آئی اور بحق سرکار ضبط کی گئی"۔(۴)

(۲) ہنس راج رہبر صاحب اس کا زمانہ اشاعت ۱۹۰۹ء [جو کہ بالکل غلط ہے] بتانے کے بعد فرماتے ہیں "اب انگریز حکمران یہ کیسے برداشت کرسکتے تھے کہ کوئی ادیب ہندوستانیوں میں حب الوطنی کے جذبے کو ابھارے۔ انہوں نے نہ صرف کتاب ضبط کی بلکہ جتنی کتابیں ان کے ہاتھ لگیں انہوں نے اسی وقت آگ میں جلادیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی ادیب کی کتابوں کو اس کی نظروں کے سامنے نذر آتش کیا گیا"۔(۵)

(۳) ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا :- "اردو میں اس کی اشاعت جون ۱۹۰۸ء میں ہوئی جس کی زیادہ تر جلدیں ہمیر پور کے کلکٹر کی طرف سے بغاوت کے جرم میں ضبط کرلی گئیں"۔(۶)

(۴) ڈاکٹر قمر رئیس :- "سوز وطن جون ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ جولائی ۱۹۰۸ء کے زمانہ میں اس کی اشاعت کا اعلان ملتا ہے۔ اور پھر فروری ۱۹۰۹ء تک (جب تک کہ کتاب ضبط نہیں ہوئی) ہر ماہ پابندی سے اس کے اشتہار ملتے ہیں"۔(۷)

ڈاکٹر قمر رئیس اس کتاب کی ضبطی کا زمانہ فروری ۱۹۰۹ء متعین فرماتے ہیں اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس کے بعد کتاب کے اشتہار شائع ہونے بند ہوگئے۔ لیکن "زمانہ" کے جولائی ۱۹۰۹ء کے شمارے میں صفحہ ۲ کے دوسرے نصف حصے میں اس کا اشتہار موجود ہے۔ اس کی عبارت کے کچھ حصے پیش ہیں۔

"سوز وطن / یعنے / زمانہ کے مشہور و مقبول مضمون نگار منشی نواب رائے کی تازہ اور بہترین تصنیف، اس میں پانچ قصے لکھے گئے ہیں اور سب درد وطن کے جذبات سے پر ہیں۔ طرز بیان نہایت لطیف، دلکش اور رقت انگیز .... قیمت ۴ر/ [ساڑھے چار آنے]

ڈاکٹر قمر رئیس ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں "اپریل ۱۹۰۸ء سے مارچ ۱۹۱۰ء تک "زمانہ" میں نواب رائے کی کوئی کہانی نہیں ملتی۔ دراصل یہ وہ زمانہ ہے جب "سوز وطن" ضبط ہوئی تھی اور نواب رائے پر پابندی لگادی گئی تھی کہ اپنا کوئی مضمون سرکار کو دکھائے بغیر اشاعت کے لئے نہ بھیجیں۔(۸)

موصوف کے اس اقتباس کے بارے میں میری معروضات پیش خدمت ہیں۔

اپریل ۱۹۰۸ء سے غالباً ان کی مراد اپریل ۱۹۰۹ء ہے [یہ کتابت کی غلطی لگتی ہے]۔ ان کے مطابق پریم چند پر یہ پابندی لگادی گئی تھی کہ "وہ اپنا کوئی مضمون سرکار کو دکھائے بغیر اشاعت کے لئے نہ بھیجیں"۔ اس رو سے نہ صرف ان کی کہانیاں بلکہ مضامین بھی اپریل ۱۹۰۹ء کے بعد رسائل میں نظر نہیں آنے چاہئیں۔ لیکن زمانہ کے درج ذیل شماروں میں ان کے مضامین وغیرہ نظر آتے ہیں اور مصنف کے نام کے طور پر "نواب رائے" کا نام

موجود ہے۔

(۱) زمانہ : اکتوبر ۱۹۰۹ء "زلیخا" کے عنوان کے تحت ان کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔

(۲) زمانہ : دسمبر ۱۹۰۹ء میں بھی "کلیاں" کے عنوان کے تحت ایک اور مضمون شائع ہوا تھا۔

(۳) زمانہ : اپریل ۱۹۰۹ء میں "سیر درویش" نامی طویل کہانی کی پہلی قسط پر بھی "نواب رائے" کا نام موجود ہے۔

پریم چند نے نگم صاحب کے نام ۲۳/ مارچ ۱۹۱۷ء کو ایک خط لکھا تھا جس کے پس نوشت کی تحریر ملاحظہ ہو۔ "سوز وطن کی ایک جلد ضرور روانہ کریں یہاں ایک بھی جلد نہیں ہے"۔(۹)

اس کے علاوہ زمانہ نومبر ۱۹۱۹ء کے اشتہاروں کے صفحہ نمبر ۷ (دو کالمی صفحہ) کے دوسرے کالم میں اور زمانہ مارچ ۱۹۲۱ء کے سرورق کے اندرونی تیسرے صفحے کے تین کالمی اشتہاروں کے پہلے کالم میں بھی اس کتاب کے مختصر ترین اشتہار موجود ہیں۔ یعنی صرف نام کتاب اور قیمت۔

اس کے بعد ۱۹۲۹ء میں گیلانی الیکٹرک پریس، لاہور سے "سوز وطن" اور "سیر درویش" کے نام سے یہ کتاب "نواب رائے" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔

اگر فروری ۱۹۰۹ء کے آس پاس کتاب ضبط ہو گئی ہوتی تو مارچ ۱۹۲۱ء تک اس کے اشتہار کیسے شائع ہو سکتے تھے اور پھر ۱۹۲۹ء میں ایک کہانی کے اضافے کے ساتھ یہ کتاب کس طرح شائع کی جا سکتی تھی؟

سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ اس وقت تک کوئی ایسا پریس ایکٹ معرض وجود میں نہیں آیا جس کے تحت "سوز وطن" ضبط کی جا سکتی۔

میں کئی روز تک سنٹرل لائبریری، بمبئی میں گورنمنٹ آف انڈیا گزٹ کے ۱۸۶۷ء سے ۱۹۱۰ء تک کے پریس ایکٹوں کی تفصیلات معلوم کرنے میں کوشاں رہا اور آخر کار اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ اس سلسلے کی تفصیل میں جانے سے پہلے مختصر الفاظ میں پس منظر پیش کرتا ہوں۔

ہندوستان میں پرنٹنگ پریس کی اٹھارویں صدی کے آخری دہوں میں درآمد شروع ہو گئی تھی۔ غالباً اس کی درآمد عیسائی مشنریوں کی مرہون منت تھی۔ تبلیغی کتابچوں اور پمفلٹوں کے علاوہ ابتدائی اخبارات اور رسائل بھی ان ہی کی کوششوں سے شائع ہونے شروع ہوئے تھے۔ بہرحال انیسویں صدی کے آغاز میں غیر تبلیغی اخبارات اور رسائل کی طباعت اور اشاعت کے شواہد ملتے ہیں۔ نشر و اشاعت کی ترقی کے ساتھ ہی غیر ملکی حکومت نے پریس ایکٹ نافذ کرنے شروع کر دیئے تھے اندر جیت لال مرحوم اپنی کتاب "قومی ہیرو" میں راجہ رام موہن رائے کے باب میں صفحہ ۱۲۲ پر رقم فرماتے ہیں۔

> "آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے راجہ رام موہن رائے اپنے دو چار ہم خیالوں کے ساتھ انگریزی حکومت سے پریس کی آزادی کے لئے قانون کی لڑائی لڑنے لگے۔ اس زمانے میں کسی کو اتنی سمجھ ہی نہ تھی اور نہ کسی کو یہ جرأت تھی کہ حکومت وقت کے ساتھ زور آزمائی کرے۔ ۱۸۲۳ء میں کلکتہ سے نکلنے والے ایک انگریزی اخبار کے مالک مسٹر بکنگھم کو ملک سے باہر نکل جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ کیوں کہ حکومت اس سے ناخوش ہو گئی تھی۔ اور ۱۴/ مارچ ۱۸۲۳ء کو پریس کی آزادی کم کرنے کا ایک قانون نافذ کیا گیا ...."

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے خوں آشام سیلاب سے ابھرنے کے بعد کمپنی بہادر نے ظلم و استبداد کا شکنجہ اور زیادہ کسنا شروع کر دیا تھا۔ اس شکنجے سے پرنٹنگ پریس اور دیگر ذرائع نشر و اشاعت کس طرح محفوظ رہ سکتے تھے چنانچہ ۱۸۶۷ء میں سرکار نامدار ایک نیا پریس ایکٹ معرض وجود میں لائی۔ "سوز وطن" کے سلسلے میں اسی پریس ایکٹ نے دھنپت رائے نواب رائے کو پریم چند بنانے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ اس ایکٹ کا نام تھا

THE PRESS AND REGISTERATION OF BOOKS ACT–1867 (XXV of 1867)

اسی ایکٹ کی رو سے ہر اخبار، رسالے، کتاب، پمفلٹ غرض کہ ہر مطبوعہ تحریر کی مقررہ تعداد میں جلد ہی شائع ہونے کے ایک ماہ کے اندر اندر سرکار کی نامزد کسی بھی اتھارٹی کے پاس جمع کرانا ضروری تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈیکلریشن میں اور کتاب کے اندر مصنف کا نام پتہ اور دستخط۔ اخبار یا رسالے کے ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر کا نام، پریس کا نام اور پتہ اور دیگر اہم تفصیلات فراہم کرنا بھی ضروری تھا۔

لیکن "سوز وطن" کی اشاعت کے بعد اس کے پبلشر منشی دیا نرائن نگم مالک "زمانہ پریس" کی طرف سے یہ تفصیلات مہیا کرنے کی کوتاہی کے نتیجے میں نگم صاحب پر بھی تھوڑا بہت عتاب نازل ہوا تھا۔

"زمانہ" کے پریم چند نمبر میں منشی پیارے لال شاکر میرٹھی کے مضمون "منشی پریم چند کی یاد میں" میں شاکر صاحب، پریم چند کے الفاظ میں ان پر جو عتاب نازل ہوا تھا اس کا ذکر ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

> "منشی دیا نرائن نگم کے مطبع سے پہلی کتاب "سوز وطن" شائع ہوئی تھی۔ معلوم نہیں کیا وجہ ہوئی کہ کتاب پر پرنٹر و پبلشر کا نام نہیں چھپا۔ ظاہر ہے کہ ایسی غلطی عمداً نہیں ہوا کرتی۔ مگر سنتا کون ہے۔ جانچ پڑتال ہوئی تو اس سلسلہ میں میرا نام بھی کھل گیا۔ خود ہی سوچو، ایک سرکاری ملازم اور "سوز وطن" ایسی کتاب کا مصنف! توبہ، توبہ" (۱۰)

منشی دیا نرائن نگم نے درج بالا اقتباس پر درج ذیل فٹ نوٹ دیئے ہیں۔ جن سے اس ایکٹ کے بارے میں بھی تھوڑی بہت روشنی پڑتی ہے

(۱) ناتجربہ کاری اور پریس ایکٹ کے قواعد سے یہ غلطی ہو گئی تھی۔ لیکن مجسٹریٹ نے اس کے پاداش میں ایڈیٹر "زمانہ" پر بھی پچاس روپئے کا تاوان عائد کر دیا تھا۔

(۲) نئی چھپی ہوئی کتابوں کے داخلہ فارم میں مصنف کا پورا نام اور پتا (مع دستخط) درج کیا جاتا ہے۔

سیاسی اتھل پتھل کے تقاضوں کے پیش نظر سرکار وقتاً فوقتاً پریس پر اپنا شکنجہ زیادہ سے زیادہ کستی رہی۔ چنانچہ ۱۸۹۸ء میں بھی ایک پریس ایکٹ نافذ ہوا تھا۔ اس کی تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں لیکن اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ اس کا مقصد بھی پریس پر سرکار کا شکنجہ اور زیادہ مضبوط کرنا تھا۔

اس کے بعد ۸ / جون ۱۹۰۸ء کو نیا ایکٹ معرض وجود میں آیا تھا۔ اس ایکٹ کا نام تھا

NEWS PAPERS (INCITEMENT TO OFFENCE) ACT

اس ایکٹ کے نافذ کرنے کا پس منظر یہ تھا کہ ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم کے نتیجے کے طور پر ملک میں جاگرتی کی ایک نئی لہر دوڑ چکی تھی۔ دہشت پسندوں کی سرگرمیاں تیز ہو چکی تھیں۔ چنانچہ وطن پرست اخبارات نے بھی سرکار کے خلاف تلخ و تند الفاظ میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا نقطہ عروج یہ تھا کہ بنگال کے گورنر کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ کلکتے کے پولیس مجسٹریٹ کنگز فرڈ کو قتل کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ یہ پولیس مجسٹریٹ جب کلکتہ سے تبدیل ہو کر مظفر پور آیا تو تیس اپریل ۱۹۰۸ء کو سترہ سالہ پرپھل چاکی اور پندرہ سالہ خودی رام بوس نے مل کر اس پر بم سے حملہ کیا۔ کنگز فرڈ تو بال بال بچ گیا لیکن اس کی جگہ مسز اور مس کینڈی نام کی دو انگریز ماں اور بیٹی جائے وقوعہ پر ہلاک ہو گئیں۔ پرپھل چاکی نے وہیں اپنے آپ کو گولی مار لی۔ اور خودی رام بوس بھاگ نکلا لیکن اگلے ہی روز مظفر پور سے چالیس میل کی دوری پر پکڑ لیا گیا اور سرکار نے پوری عجلت کے ساتھ اسے گیارہ اگست ۱۹۰۸ء کو تختہ دار پر چڑھا دیا۔

جس روز درج بالا ایکٹ پاس ہوا اسی روز EXPLOSIVE SUBSTANCES ACT (آتش گیر اشیاء / بم اسلحہ وغیرہ سے متعلق قانون) بھی نافذ کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے نومبر ۱۹۰۷ء میں PREVENTION OF SEDITIOUS MEETINGS (

ACT باغیانہ اجتماعات کی روک تھام کا قانون) نافذ کر دیا گیا تھا۔(۱۱)

قصہ مختصر سرکار نے مذکرہ بالا پریس ایکٹ نافذ کر کے ہر طرح کی مطبوعہ چیزوں پر ایک زبردست کاری ضرب لگائی۔ لیکن اس کے باوجود اس میں رسائل، اخبارات، کتب اور پرنٹنگ پریسوں کی ضبطی، ضمانت طلبی یا ضمانت کی ضبطی وغیرہ کی کوئی دفعہ موجود نہیں تھی۔ چنانچہ جب "سوز وطن" شائع ہوئی تو اس وقت اس کی ضبطی کا کوئی قانون موجود نہیں تھا۔ اور اسے باضابطہ طور پر ضبط نہیں کیا جاسکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ پریم چند پر سیڈیشن ایکٹ کے تحت مقدمہ چلاکر انہیں سزادلائی جاسکتی تھی۔ جیسا کہ مولانا حسرت موہانی کے ساتھ ہوا تھا۔ "اردوئے معلے" کے جون ۱۹۰۸ء کے شمارے میں کسی مضمون نگار کے ایک باغیانہ مضمون "مصر میں انگریزوں کی پالیسی" کی اشاعت کے بعد سرکار کی طرف سے مضمون نگار کا نام اور پتا طلب کیا گیا۔ لیکن مولانا نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ ان پر پر سیڈیشن ایکٹ کے تحت مقدمہ چلاکر انہیں قید و بند کی سزا تو دے دی لیکن "اردو معلے" ضبط نہ کیا جاسکا۔

اسی طرح سرکار "سوز وطن" باضابطہ طور پر ضبط کرنے کی مجاز نہیں تھی۔ لیکن بے چارے دھنپت رائے سرکاری ملازم تھے اور ان پر محکمہ کی طرف سے دباؤ ڈال کر ان سے کتاب کی "غیر فروخت شدہ" جلدیں حاصل کر کے انہیں تلف کر دیا گیا۔ چنانچہ اسے ہم زیادہ سے زیادہ بے ضابطہ ضبطی کا نام دے سکتے ہیں۔ اور نگم صاحب نے زمانہ کے پریم چند نمبر میں اسے بے ضابطہ ضبطی ہی قرار دیا ہے۔ اس کی تفصیل بعد میں پیش کی جائے گی۔

اس واقعہ کے بارے میں پریم چند نے جو تفصیل پیش کی ہے وہ درج ذیل ہے۔

> "اس وقت میں سرشتہ تعلیم میں سب ڈپٹی انسپکٹر تھا اور ہمیرپور کے ضلع میں تعینات تھا۔ کتاب کو نکلے چھ مہینے ہو چکے تھے [کم سے کم سولہ سترہ ماہ] ایک دن رات کو میں اپنے کیمپ میں بیٹھا ہوا تھا کہ کلکٹر صاحب کا پروانہ پہنچا کہ فوراً آکر ملو۔ جاڑے کا موسم تھا۔ میں نے بیل گاڑی جتوائی اور راتوں رات تیس چالیس میل کا سفر طے کر کے دوسرے دن صاحب سے ملا ان کے سامنے سوز وطن کی ایک جلد رکھی ہوئی تھی، میرا ماتھا ٹھنکا، اس وقت میں "نواب رائے" کے نام سے لکھا کرتا تھا۔ مجھے اس کا کچھ کچھ پتا مل چکا تھا کہ خفیہ پولیس اس کتاب کے مصنف کی کھوج میں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے مجھے کھوج نکالا۔ اور صاحب کلکٹر نے اس کی جواب دہی کے لئے مجھے بلایا ہے۔ صاحب نے مجھ سے پوچھا، کیا یہ کتاب تم نے لکھی ہے؟"
>
> میں نے کہا۔ "ہاں"
>
> صاحب نے ایک ایک کہانی کا مجھ سے مطلب پوچھا، اور آخر بگڑ کر بولے "تمہاری کہانیوں میں سڈیشن بھرا ہوا ہے، اپنی تقدیر پر خوش ہو کہ انگریزوں کی عملداری میں ہو۔ مغلوں کا راج ہوتا تو تمہارے دونوں ہاتھ کاٹ لئے جاتے۔ تمہاری کہانیاں یک طرفہ ہیں۔ تم نے انگریزی سرکار کی توہین کی ہے۔ وغیرہ۔ آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ میں "سوز وطن" کی کل کاپیاں سرکار کے حوالے کر دوں۔ اور آئندہ صاحب سے اجازت لئے بغیر کچھ نہ لکھوں۔ میں سمجھا کہ چلو سستا چھوٹ گیا۔ کل ہزار کاپیاں چھپی تھیں اور ابھی مشکل سے تین سو جلدیں فروخت ہو سکی تھیں، میں نے بقیہ سات سو کاپیاں زمانہ پریس سے منگاکر صاحب کی نذر کر دیں۔(۱۲)

اس سلسلہ میں میری دو معروضات پیش خدمت ہیں۔

(۱) ڈاکٹر قمر رئیس فرماتے ہیں کہ فروری ۱۹۰۹ء میں یہ کتاب ضبط ہوئی تھی۔ مگر میں نے جولائی ۱۹۰۹ء کے "زمانہ" میں شائع شدہ اشتہار پچھلے صفحات میں نقل کر دیا ہے۔ جس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک یہ کتاب باضابطہ یا بے ضابطہ طور پر ضبط نہیں ہوئی تھی۔ پریم چند کے درج بالا اقتباس میں "جاڑے کا موسم" اُس سال کے اواخر کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ یہ کتاب باضابطہ طور پر ضبط نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ کلکٹر کے ساتھ ایک معاہدہ کی رو سے کتاب کی غیر فروخت شدہ جلدیں اس کی نذر کر دی گئی تھیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک ایسا کوئی پریس قانون معرض وجود میں آیا ہی نہیں تھا جس کے تحت "سوز وطن" ضبط کی جا سکتی۔

(۲) پریم چند کے درج بالا اقتباس میں درج ہے کہ "تین سو جلدیں فروخت ہوئی تھیں، بقیہ سات سو جلدیں زمانہ پریس سے منگا کر صاحب کی نذر کر دیں" ۔ یہ بیان بھی حقیقت سے دور ہے۔ مستند شواہد سے پتا چلتا ہے کہ یہ کتاب پریم چند اور نگم صاحب کی ساجھے داری میں شائع ہوئی تھی اور دونوں اپنے اپنے حصے کی جلدیں اپنے اپنے ذرائع سے فروخت کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں نگم صاحب کا یہ بیان بڑی اہمیت کا حامل ہے اور ہمارے سامنے صحیح تصویر پیش کرتا ہے۔

> "مگر جب سوز وطن کی بے ضابطہ ضبطی کے بعد ان کے افسران نے انہیں تصنیف و تالیف کی ممانعت کر دی تو ان کو اس نام کو خیرباد کہنا پڑا۔ "سوز وطن" کی جس قدر کاپیاں ان کے پاس تھیں وہ انہوں نے حکام کے حوالے کر دیں۔ میرے پاس جو اسٹاک باقی رہ گیا تھا۔ اس کی کسی نے خبر نہ لی اور یہ کتابیں ضائع ہونے سے بچ گئیں اور آہستہ آہستہ فروخت ہوتی رہیں .... "(۱۳)

بنارسی داس چترویدی کے نام پریم چند اپنے ۳/ جون ۱۹۳۰ء کے خط میں اس کتاب کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

> "سب سے پہلے ۱۹۰۷ء [صحیح جون جولائی ۱۹۰۸ء ہے] میں میرا سوز وطن جو پانچ کہانیوں کا سنگرہ ہے، زمانہ پریس سے نکلا تھا۔ پر اسے ہمیر پور کے کلکٹر نے مجھ سے لے کر جلوا ڈالا تھا۔ ان کے خیال میں وہ وِدروہ آتمک (باغیانہ) تھا۔ حالانکہ تب سے اس کا انوواد کئی سنگرہوں اور پترکاؤں میں نکل چکا ہے۔ (۱۴)

چترویدی جی کے نام درج بالا خط سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کہانیوں کا ترجمہ کئی مجموعوں اور رسالوں میں شائع ہوا۔ اور آخر جب پریم چند سرکاری ملازمت سے ۱۵/ فروری ۱۹۲۱ء کو مستعفی ہو گئے تو انہیں اس بات کا خوف بھی نہ رہا۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن گیلانی الیکٹرک پریس لاہور سے ایک اور کہانی "سیر درویش" کے اضافے کے ساتھ "سوز وطن اور سیر درویش" کے نام سے شائع ہوا۔

جس ایکٹ کے نفوذ کے بعد کتابوں وغیرہ کی ضبطی کا آغاز ہوا تھا وہ سوز وطن کی بے ضابطہ ضبطی کے بعد جاری ہوا تھا۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

یہ ایکٹ ۹/ فروری ۱۹۱۰ء کو نافذ کیا گیا تھا۔ اس ایکٹ کا مخفف نام تھا "انڈین پریس ایکٹ ۱۹۱۰ء (ایکٹ نمبر ا)" ۔ اس ایکٹ کی رو سے پرنٹنگ پریسوں، اخباروں، رسالوں، کتابوں۔ غرض کہ ہر مطبوعہ چیز پر۔ چاہے وہ سائیکلو اسٹائل مشین پر ہی کیوں نہ چھپی ہو۔ سرکار نے اپنا شکنجہ مکمل طور پر کس دیا۔ پریسوں، اخباروں، رسالوں اور کتابوں کی ضبطی، ضمانت، طلبی اور ضمانت کی ضبطی وغیرہ کا حق بھی سرکار کو حاصل ہو گیا۔ اس کے علاوہ اس ایکٹ کے تحت سرکار نے ہر ضبط شدہ مطبوعہ چیز کو ہر اس جگہ سے جہاں اس کے موجود ہونے کا شک ہو، برآمد کرنے اور اسے بحق سرکار ضبط کرنے کے لئے تلاشی کے وارنٹ جاری کرنے کا اختیار بھی حاصل کر لیا۔

حواشی

(۱) "پریم چند کے خطوط" ص ۳۹۔ ستمبر ۱۹۱۰ء
(۲) زمانہ کا پریم چند نمبر (فروری ۱۹۳۸ء) ص ۹۲
(۳) "پریم چند وشوکوش" جلد نمبر ۲ از ڈاکٹر کمل کشور گوینکا (پہلا ایڈیشن ۱۹۸۱ء) ص ۲۲۳ پر زمانہ کے اشتہار کا عکس۔
(۴) پریم چند کا تنقیدی مطالعہ (طبع چہارم ۱۹۷۷ء) ص ۳۷ اور ۳۸

(۵) "پریم چند" (طبع سوم مئی ۱۹۸۰ء) ص ۱۰۰-۱۰۱
(۶) پریم چند وشوکوش۔ جلد ۲ ص ۲۲۳
(۷) تلاش و توازن ص ۱۰۵
(۸) ایضاً ص ۱۰۶
(۹) پریم چند کے خطوط ص ۲۰۳
(۱۰) زمانہ۔ پریم چند نمبر ص ۱۹
(۱۱) اس پس منظر کی تفصیل امرت رائے کی کتاب قلم کا سپاہی کے ص ۸۶ اور ۸۷ سے حاصل کی گئی ہے۔
(۱۲) زمانہ کا پریم چند نمبر۔ منشی پریم چند کی کہانی ان کی اپنی زبان ص ۸-۹
(۱۳) ایضاً ص ۹۲
(۱۴) پریم چند کے خطوط ص ۲۰۳

ادبی خبریں _ اطلاعات _ اعلانات

سہ ماہی ادبی دستاویز "اثبات و نفی" کی رسم اجرا

۲/ ستمبر ۹۵ء کو کلکتہ کے بھارتیہ بھاشا پریشد ہال میں ادبی جریدہ ماہنامہ "شاعر" کے مدیر اور مشہور شاعر جناب افتخار امام صدیقی نے سہ ماہی ادبی دستاویز "اثبات و نفی" کی رسم اجرا کے موقع پر کہا کہ "اثبات و نفی" کی اجرا سے میرے خاندان میں اضافہ اور ادبی رسالے کی روایت کی توسیع ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہر زبان میں خالص ادبی رسالے کے قارئین ہمیشہ کم رہے ہیں۔ کیونکہ اس رسالے کے مدیر کو عالمی تناظر پر روشنی ڈالنی پڑتی ہے اور وہ جس عمر میں جی رہا ہے اس دور کو اسے اپنے مشاہدے کی رو سے دیکھنے کے بعد عوام تک پہنچانا پڑتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ کوئی بھی ادبی رسالہ اس وقت تک کامیابی کے ساتھ شائع نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ مدیر کا خواب اور اس کی روح نہ بن جائے۔ اور ساتھ ہی ساتھ رسالے میں مدیر کا جنون شامل نہ ہو جائے۔ تقریب کی صدارت کرتے ہوئے جسٹس خواجہ محمد یوسف نے بنگال کی ادبی خدمات کا ذکر کیا اور "اثبات و نفی" کے بارے میں کہا کہ یہ رسالہ واقعی ادبی دستاویز ہے۔ یہ رسالہ ادب کی بڑی خدمت کرے گا اور مستقبل قریب میں اسے عوامی مقبولیت حاصل ہو جائے گی۔ پروفیسر علقمہ شبلی وائس چیرمین مغربی بنگال اردو اکیڈمی اور والد مدیر رسالہ نے "اثبات و نفی" کو مدیر عاصم شہنواز شبلی کا رسالہ کہا۔ ڈاکٹر ظفر اوگانوی نے "اثبات و نفی" سے اپنے گہرے مراسم اور دوہرے تعلقات کا اظہار کیا۔ ایک تو استاد کی حیثیت سے، دوسرے صلاح کار کی حیثیت سے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ساقی، نگار، شاعر، شب خون ایسے رسالے ہیں جن سے ادبی نظریہ سازی ہوئی ہے اور جن سے نئی نئی تحریکیں جنم ہوئی ہیں، لہذا "اثبات و نفی" سے بھی کوئی تحریک یا نظریہ سازی قائم ہو۔ جناب کلیم شمیم نے کہا کہ عاصم نے رسالہ نکالنے کا خواب تین چار سال قبل ہی دیکھ لیا تھا لیکن یہ خواب اب جاکر پورا ہوا ہے۔ انہوں نے رسالے کو سراہتے ہوئے کہا کہ مدیر کو چاہیے کہ رسالہ اسی محنت اور لگن سے نکالے تاکہ اردو ادب کی خدمت ہو سکے۔ ڈرامہ نگار ظہیر انور نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا کہ رسالوں کا نکلنا دراصل شاعر و ادیب کے خوابوں کے وہ سلسلے ہیں جو انہوں نے کبھی دیکھے تھے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ رسالہ سماجی تشکیل کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ انہوں نے "اثبات و نفی" کو بنگال اور بنگلہ ادب کا ترجمان بتایا۔ جناب حسین رشید نے کہا کہ رسالہ رسم الخط کو زندہ رکھنے کے لیے شائع کیا جاتا ہے۔ لہٰذا مدیر کو چاہیے کہ وہ تمام گروہ بندی، علاقائیت سے اجتناب برتتے اور رسالے کے فروغ کے لیے سعی کرے۔ پروفیسر نصر غزالی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ یہ سارے پھول (جن سے گل پوشی کی گئی ہے) واقعتاً علقمہ شبلی صاحب کو پہنائے جائیں کہ وہ ان کے مستحق ہیں۔ نیز انہوں نے اپنے ہونہار بھتیجے عاصم شہنواز شبلی کے علمی و ادبی کارناموں کا جائزہ لیا اور یہ امید ظاہر کی کہ "اثبات و نفی" جلد ہی اردو کے چند اچھے رسالوں میں گنا جائے گا۔ جناب انیس رفیع نے فرمایا کہ کلکتہ کبھی بھی اردو کے لیے سنگلاخ نہیں رہا ہے۔ انہوں نے مدیر "اثبات و نفی" کو مبارکباد پیش کی۔

"اثبات و نفی" کی رونمائی کے موقع پر دائیں سے عاصم شہنواز شبلی، مدیر اثبات و نفی ـ حکیم فیضان احمد ـ انیس رفیع ـ پروفیسر علقمہ شبلی ـ افتخار امام صدیقی (مدیر شاعر) ـ جسٹس خواجہ محمد یوسف ـ شمائل نبی ـ پروفیسر نصر غزالی

****

جناب حکیم سید فیضان احمد نے مدیر کو مبارکباد دی اور کہا کہ یہ رسالہ بنگال کے ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہار حکومت کے سابق وزیر جناب شمائل نبی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اثبات و نفی کے اجرا کو فال نیک بتایا۔ افضال عاقل نے اثبات و نفی [illegible] کی جانب سے رپورٹ

پیش کی جس میں بتایا کہ ہندوستان کی صحافت میں کلکتہ کو اولیت حاصل ہے اور اس رسالے کے اجرا کا مقصد "ادبی جمود" کو توڑ کر ادبی ماحول کو فعالیت سے دوچار کرنا ہے۔ نوجوان شاعر نسیم فائق نے نظم کی صورت میں "اثبات و نفی" کے مدیر کو خراج عقیدت پیش کیا۔ آخر میں مدیر اثبات و نفی عاصم شہنواز شبلی نے مقررین، حاضرین اور قلمکاروں کا شکریہ ادا کیا اور یقین دلایا کہ اس رسالے کے توسط سے نئی نسل کے قلمکاروں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور بنگلہ ادب کے ترجمے کو اولیت دی جائے گی۔

افتخار امام صدیقی صاحب نے "اثبات و نفی" کی رونمائی کی اور نئی نسل کے نمائندہ شاعر جناب رفیق انجم نے نظامت کے فرائض بحسن و خوبی انجام دیے۔

رپورٹ : جاوید ہمایوں
مرسلہ : اثبات و نفی

ooooo

سید ماجد الباقری کی یاد میں جلسہ

منفرد لب و لہجے کے شاعر، ادیب، نقاد اور افسانہ نگار سید ماجد الباقری ۷۶ برس کی عمر میں ۳۱ مئی ۱۹۹۵ء کو اسلام آباد میں انتقال کر گئے۔ حلقہ ارباب ذوق راولپنڈی کے زیر اہتمام مرحوم سید ماجد الباقری کی یاد میں نیشنل سنٹر میں تعزیتی ادبی ریفرنس کا انعقاد ہوا۔ جس کی صدارت ثناء اللہ اختر ڈائریکٹر محکمہ تعلقات عامہ راولپنڈی ڈویژن نے کی۔ جب کہ معروف افسانہ نگار ڈاکٹر رشید امجد اور نقاد جلیل عالی مہمانان خصوصی تھے۔ ثناء اللہ نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ ماجد الباقری کا منفرد ادبی طرز اسلوب مستقبل کے تقاضوں اور موجودہ عوامی مسائل کی بھرپور غمازی کرتا ہے۔ انہیں عوامی مسائل و نفسیات پر خاص اپروچ حاصل تھی جو کہ ان کی شاعری میں بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ "ٹاک ٹاک" اور شعری مجموعہ "لفظ کی چادر" انسانی مسائل اور ان کی نفسیات سے متعلق بہترین شاہکار ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان میں واقعی جدید غزل گوئی کا مستقبل روشن ہے۔ وہ ایک سچے، کھرے اور مخلص انسان تھے۔

اس موقع پر ڈاکٹر رشید امجد نے کہا کہ مرحوم ماجد الباقری ایک وضعدار انسان دوست تھے ان کی ادبی خدمات و تخلیقی سفر بہت پرانا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی جدید اردو غزل اور افسانوں میں ٹھوس ریسرچ ورک ہے۔ ان کی امیجری (تخیلات) میں جدت اور نادر پن پایا جاتا ہے۔ ان کے ہاں حرف و معنی کا رشتہ ہی انھیں دراصل ماہر عروض ثابت کرتا ہے۔ ان کا نام اور کام مستقبل میں بھی زندہ رہے گا۔

جلیل عالی نے کہا کہ ماجد الباقری اگرچہ ایک افسر تھے لیکن شاعری سے انھیں عشق تھا۔ وہ الفاظ کا استعمال انتہائی جرأت و بے باکی سے کیا کرتے تھے۔ وہ ماہر عروض تھے۔ ان کی ان ہی اعلیٰ خدمات پر اہل راولپنڈی کو بھی ناز ہے۔ اس موقع پر حلقہ ارباب ذوق کے پلیٹ فارم سے انوار فیروز نے کہا کہ مرحوم جدید اردو غزل کے بے پایاں شاعر تھے ان کے غیر مطبوعہ کلام کو اکادمی ادبیات پاکستان فوری شائع کرانے کے انتظامات کرے تاکہ ان کی شاعری سے اہل قلم مستفید ہو سکیں۔ اسی طرح تقریب میں قمر رعینی، رشید نثار، شمس الغاں ناز و دیگر مقررین نے کہا کہ مرحوم تمام زندگی شعر و ادب کی آبیاری کرتے رہے لیکن اس کے صلہ میں ایک گھر یا پلاٹ تک حاصل نہ کر سکے اور تمام عمر کرایہ کے مکانوں میں مقیم رہے۔ اس تعزیتی ریفرنس میں زاہد حسن چغتائی، سرور انبالوی، زہیر کنجاہی، شاہد زمان، فضل الٰہی بہار، عظیم الوقار فرحان، سجاد حسین ساجد، مرحوم کے فرزند مسعود ماجد سید، ڈاکٹر رشید نثار، پروفیسر ڈاکٹر سرور کامران، سلطان صبروانی اور گل وارثی نے بھی مرحوم کے فن اور شخصیت کے حوالے سے اظہار خیال کیا اور اختتام پر مرحوم کے لیے اجتماعی دعائے مغفرت کی گئی۔

(رپورٹ : سید خرم ماجد، راولپنڈی پاکستان)

ooooo

ہیرانند سوز اور شہناز فاطمہ کو ادبی خدمات پر اعزاز

فرید آباد ہریانہ کی مشہور ادبی انجمن "ساہتیہ کار سنسد سمستی پور" نے اپنے ۱۹۹۴ء کے اعلان کردہ انعامات میں سے دو انعام یافتگان مسٹر ہیرانند سوز اور مس شہناز فاطمہ کو بالترتیب "میر ادب ایوارڈ" اور "منشی پریم چند ایوارڈ" پیش کرنے کی تقریب کا انعقاد انجمن ادب فرید آباد کے زیر اہتمام ۲۳/ جولائی ۱۹۹۵ء کو انجمن کے صدر مسٹر واسدیو ساہنی طالب کی رہائش گاہ پر کیا جس میں "ساہتیہ کار سنسد" کے صدر شری ہری دلش تردن نے ان دونوں قلم کاروں کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک توصیفی سند ایک یادگار

ایک شال اور پانچ پانچ سو روپے نقد رقم سے نوازا - جلسے کے صدر حاجی امین دہلوی اور مہمان خصوصی شری ہری دلش ترون نے ادبی خدمات کے سلسلے میں مختلف ریاستوں کی انجمنوں کے درمیان باہمی رابطے کی افادیت اور اہمیت پر زور دیا اور اس تقریب کو اس ضمن میں ایک مستحسن قدم بتایا۔

مس شہناز فاطمہ نے اپنی کہانی "شہنائی" سنائی اور شعرا نے اپنا کلام عنایت کیا - جن میں مقامی شعرا کے علاوہ دہلی سے جناب ظفر عدیم، منور سرحدی، ماشاد دہلوی، ماشاد اورنگ آبادی اور ہری دلش ترون نے شرکت فرمائی - مسٹر منور سرحدی نے ہیرانند سوز کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

مرسلہ : انجمن ادب فرید آباد، فرید آباد

ooooo

بخش لائلپوری کی جانب سے عطاء الحق قاسمی اور ڈاکٹر نارنگ کے اعزاز میں ایک یادگار ادبی نشست

لندن میں گزشتہ دنوں ادبی محفلوں میں بہت رونق رہی - پروفیسر گوپی چند نارنگ دہلی سے تشریف لائے - ادھر عطاء الحق قاسمی اپنے امریکہ کے ادبی دورے کے بعد پاکستان واپس جاتے ہوئے چند روز لندن رکے - عطاء الحق قاسمی اور پروفیسر نارنگ کے اعزاز میں بخش لائلپوری نے اپنے گھر پر ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا۔

شعر و سخن کے دور میں صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی جب کہ عطاء الحق قاسمی مہمان خصوصی تھے اور نظامت کے فرائض ساقی فاروقی نے انجام دیئے - ان کے علاوہ اس محفل میں شاعر اعجاز احمد اعجاز، سوہن راہی، چمن لال چمن، "صدا" کے منتظم اقبال مرزا، پاکستان کے عزیز بابر، افسانہ نگار جتندر بلو، آرٹسٹ ابرار ترمذی اور اہل ذوق میں یونس تنویر اور بہت سے دیگر اصحاب نے رونق میں اضافہ کیا۔

نجی نشست عموماً حالات حاضرہ، موسم پر ہلکے پھلکے تبصرے، پینے کھانے کے عمل اور شعر و شاعری تک تمام ہوتی نظر آتی ہے - لیکن اس محفل میں اردو کے اسکالر پروفیسر نارنگ صاحب نے بہت سے ادبی و عملی پہلوؤں پر بھی سیر حاصل گفتگو کی جس میں موجود حضرات نے اپنی اپنی بساط کے مطابق حصہ لیا۔

درمیان میں ساقی فاروقی نے گفتگو کا رخ اپنی متنازعہ غزل کی جانب موڑا جو عروض کی غلطیوں کے حوالے سے لاہور کے "معاصر" میں توجہ کا باعث بنی ہوئی ہے - اس نئی بحر کی بحث کو سن کر عالم سرور سے بخش لائلپوری چونک اٹھے اور اپنے مخصوص لہجے میں گویا ہوئے کہ ساقی میاں تمہاری اس غزل کے چھ مصرعے ناموزوں ہیں، غزل مروجہ بحر سے خارج ہے - یہ ایک اصولی مسئلہ ہے اور جن ارکان پر تم اس غزل کی تقطیع کر رہے ہو، ان کی حیثیت ایجاد کرنے والے کی خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے - اور جو لوگ تمہارے حق میں اسناد پیش کر رہے ہیں وہ بھی تمہاری طرح عروض سے نابلد ہیں - میرا خیال ہے کہ اس غزل کی جانچ اس مروجہ بحر میں ہوگی جس میں غالب اور اقبال نے غزلیں لکھی ہیں - ڈاکٹر نارنگ نے بخش لائلپوری کی تائید کی اور ساقی فاروقی خاموش ہو گئے۔

اس مذکورہ غزل کے حوالے سے معاصر کے ایڈیٹر عطا قاسمی کی جانب رجوع کرتے ہوئے میں نے عرض گزاری کہ مشفق خواجہ نے معاصر میں لکھا ہے کہ "ساقی تم نے کمال کا نہیں عجز کا مظاہرہ کیا ہے، تمہارے پاس عروض کی ورکنگ نالج بھی نہیں ہے - جو بحریں مروج ہیں انہیں میں اپنے کمال کا مظاہرہ کرو" - اس کے بعد ہند و پاک کے عصری ادب کے کئی پہلو بیچ میں آئے قاسمی صاحب کے مخصوص جاندار لطیفوں کا لطف سب نے اٹھایا، قہقہے گونجے - انہوں نے اپنے حالیہ دورہ امریکہ کے نئے مشاہدات بیان کئے - رات گئے تک بہت دلچسپ ماحول رہا۔

رپورٹ : ابرار ترمذی، لندن

ooooo

مقصود الٰہی شیخ کے افسانوں کا گورمکھی میں ترجمہ

ڈاکٹر گردیال سنگھ رائے برمنگھم میں ایک معزز ٹیچر رہ چکے ہیں - کچھ عرصہ پہلے مقصود الٰہی شیخ کے افسانوں کے مجموعہ "جھوٹ بولتی آنکھیں" کی لندن میں رسم اجراء ہوئی تھی - اس تقریب میں ڈاکٹر گردیال سنگھ رائے بھی اس طرح شریک بزم ہوئے تھے کہ اپنے ساتھ مدیر "راوی" مقصود الٰہی شیخ کی 11 کہانیوں کا پنجابی ترجمہ انہیں اچانک پیش کیا جس پر مصنف نے ڈاکٹر رائے کے لئے حیرت اور ممنونیت کا اظہار کیا تھا - 11 کہانیاں اب "اکھیاں

کوڑ ماردیاں " کے عنوان سے گورمکھی میں کتابی شکل میں مترجم ڈاکٹر زرائے نے پیش کردی ہیں جس کے ناشر "لٹریچر ہاؤس " پتلی گھر، امرتسر (انڈیا) ہیں - کتاب کی قیمت ۷۵ روپے ہے -

پچھلے دنوں لندن میں اس کتاب کا اجراء انٹرنیشنل ساہت سبھا کی جانب سے کیا گیا - جس میں "ادب لطیف " (لاہور) کی مدیرہ محترمہ صدیقہ بیگم نے خاص طور پر شرکت کی - تقریب میں اردو ، ہندی ، پنجابی ادباء نے بڑی تعداد میں شرکت کی - سبھا کے پردھان سردار گرشرن سنگھ نے کتاب کی نقاب کشائی کرتے ہوئے اسے پنجابی ادب میں ایک اضافہ قرار دیا - ڈاکٹر پریتم سنگھ کیمبو نے " اکھیاں کوڑ ماردیاں " پر ایک مقالہ پڑھا جس پر بحث ہوئی - اور ناول نویس سورن پربت ، میری بولی میرا دھرم کے مدیر پرنسپل گربچن سنگھ بھوئی ، سردار بلدیو سنگھ صابر ، گیانی مکھن سنگھ مرگند ، کیپٹن نصیب سنگھ ڈھلون ، جناب نذیر احمد بٹ اور سید احمد نے حصہ لیا - مقصود الہی شیخ نے سبھا کا دلی شکریہ ادا کیا اور کہا کہ سبھا نے ہی مجھے پنجابی کی ادبی دنیا سے متعارف کرایا ہے - انہوں نے پنجابی میں تقریر کرتے ہوئے کہا میں تن من دھن سے اردو کے لئے کام کر رہا ہوں مگر سچی بات یہ ہے کہ اردو کو دودھ تو پنجابی نے ہی پلایا ہے - انہوں نے فخریہ کہا کہ ان کی ماں بولی پنجابی ہے اور کہا کہ لگتا ہے پنجابی کے میٹھے پن کا چرچا کرتے ہوئے ہمارا مل بیٹھنا کچھ نہ کچھ رنگ تو لائے گا (اور زبانوں کا فروغ ہوگا) پروگرام کے پہلے حصہ میں اسٹیج پر سبھا کے پردھان کے ساتھ جناب مقصود الہی شیخ ، ناول نگار سورن پربت ، ادب لطیف کی مدیرہ محترمہ صدیقہ بیگم ، گیانی مکھن سنگھ مرگند رونق افروز تھے - نظامت کے فرائض ڈاکٹر گرنام سنگھ گل انجام دے رہے تھے -

دوسری نشست میں پنجابی اور اردو کے قلمکاروں نے شاعری کا رنگ باندھا - جسے مشاعرہ کہتے ہیں یہاں اسے کوی دربار کا نام دیا گیا تھا جس میں سردار گرداس سنگھ پرمار ، سادھو سنگھ شدرک ، جناب امین ملک ، عطا جالندھری ، ایوب اولیاء ، مرمندر سنگھ پنیر ، جناب منیر محمد قریشی ، گیانی درشن سنگھ ، ڈاکٹر گرنام سنگھ گل ، ملک فضل حسین ، مکھن سنگھ مرگند ، ہربجن سنگھ ورک ، شیخ نور محمد ، ڈاکٹر سید محمود دیوان ، سریندر سنگھ کوہلی ، سورن پربت ، گرعادل ، عاصم واسطی ، بلوندر سنگھ معتاور ، نذیر احمد بٹ اور گرشرن سنگھ عجیب نے اپنا کلام پیش کیا -

مشمولات انشاء پر اپنے تاثرات جلد از جلد اور کم سے کم الفاظ میں عنایت فرمایا کریں - اعزازی قارئین پرچہ ملنے کی اطلاع دیا کریں ورنہ ان کے نام پرچہ بھیجنا بند کر دیا جائیگا - (ادارہ)

شمس کنول کا انتقال

اردو کے مشہور ادیب و صحافی شمس کنول کا لمبی بیماری کے بعد قریب ۷۰ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا - مسٹر شمس کنول نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بمبئی سے کیا - انہوں نے ہفت روزہ انقلاب میں کام کیا - اس کے بعد فنکار نام سے فلمی میگزین نکالی - لیکن وہ زیادہ دونوں تک نہیں چل سکی اس کے بعد انہوں نے لگن نام سے ایک ادبی میگزین بمبئی سے ہی شروع کر - لگن میگزین کے عالمی مذاہب نمبر اور ہندوستانی مسلمان دونوں خصوصی شمارے ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہوئے - چند ماہ پہلے انہوں نے رسالہ "افق تا افق " نکالا جو بند بھی ہوگیا -

بجنور سے شمس کنول نوجوانی میں ہی بمبئی چلے لئے تھے اور قریب ۳۵ سال تک بمبئی میں ہی مقیم رہنے کے بعد قریب آٹھ دس سال اپنی اہلیہ شہناز کے ساتھ بجنور آگئے تھے اس کے بعد وہ علی گڑھ چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کرلی تھی - گزشتہ ۵/اکتوبر کو تشویشناک حالت میں انہیں بجنور لایا گیا تھا جہاں انہوں نے اپنے بھائی کے مکان پر ۱۲/اکتوبر کو دم توڑ دیا - شمس کنول کے کوئی اولاد نہیں تھی وہ اپنے پیچھے اپنی بیوہ اور سوگواروں کو چھوڑ گئے -

ماہنامہ انشاء شہناز کنول سے اپنے دکھ کا اظہار کرتا ہے -

آپ کی ڈاک

○ مراسلہ نگار کی رائے سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

○ میں انشاء کی کافی پرانی قاری ہوں۔ مگر خط پہلی بار لکھ رہی ہوں۔ سوواں شمارہ ہر طرح سے مکمل تھا۔ اگر کمی تھی تو بس ایک ہی جو تمام اردو میگزین کا طرۂ امتیاز ہے۔

جی ہاں طنز و مزاح کی۔

کیا اردو میں طنز و مزاح لکھنے والے بالکل ختم ہوگئے ہیں یا پھر آپ کی پہونچ ان تک نہیں ہے۔ یا پھر آپ طنز و مزاح کو اہمیت نہیں دیتے۔ اردو کا کوئی شمارہ کوئی میگزین دیکھو سب روکھے پھیکے خشک اگر کچھ ملے گا تو صرف چند لطیفے وہ بھی گھسے پٹے۔ اکبر الہ آبادی۔ پطرس بخاری۔ دلاور فگار مشاعروں میں ساغر خیامی۔ پاپولر میرٹھی کے لٹکے جھٹکے۔ کہانی ختم۔

پچھلے دنوں اردو مجلس کے پروگرام میں احمد علوی کے طنزیہ قطعات سننے کا اتفاق ہوا۔ واقعی کمال کے قطعات تھے۔ مگر اس شاعر کو بھی کسی میگزین میں نہیں دیکھا۔ کہیں مشاعرے میں نہیں سنا۔

آخر آپ لوگ اردو میں نئے لکھنے والوں کو راستہ کب دیں گے۔ کیا جب اردو ختم ہوجائے گی۔ اگر پرانی نسل نئے آنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گی تو سمجھ لو اس پرانی نسل کا نام لیوا بھی کوئی نہیں ہوگا۔

دلاور فگار کے بعد ہمارے یہاں دوسرا دلاور فگار کیوں پیدا نہیں ہوا۔ اس پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔ شوکت تھانوی۔ پطرس بخاری کی روایت انہیں کے ساتھ کیوں ختم ہوگئی کیا ان کا کام مکمل تھا۔ اگر انہوں نے طنز و مزاح کی روایت کو ادھورا چھوڑا تھا تو آخر ان کے ادھورے کام کو پورا کرنے والے آگے کیوں نہیں آتے۔

میری گزارش ہے کہ اردو میں طنز و مزاح کی نثر یا شاعری ایک طرح سے مر رہی ہے۔ اسے زندہ کیجئے۔ نئے لکھنے والوں کو سامنے لایئے۔ چاہے ان کی تخلیقات کم معیاری ہوں ان کی حوصلہ افزائی کیجئے۔ انہیں حوصلہ ملے گا تو وہ کل معیاری بھی لکھیں گے۔ طنز و مزاح کا کالم انشاء میں مستقل کیجئے۔ امید ہے میری ناقص رائے پر آپ غور فرمائیں گے۔

اسماء خان

F-17 ، دلشاد کالونی، دہلی -95

○ "انشاء" کا عید نمبر نظر نواز ہوا۔ ٹائٹل پر مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے مقبرہ کی خوبصورت، پرکشش اور روح پرور تصویر دیکھ کر جی باغ باغ ہوگیا۔ شمارہ میں شامل دوسری تاریخی تصاویر بھی انتہائی جاذب نظر اور دلکش ہیں۔ آپ کا اداریہ "چراغوں کو ڈر ہے یہ تم جانتے ہو" انفرادی اور لاجواب ہے۔ بخدا بہت پسند آیا۔ نسیم عزیزی صاحب کی نظم "جو اب کے عید آئی تو" بڑی خوبصورت نظم ہے۔ عید کے موقع پر آپ جیسے کلکتہ کے نامور صحافی اور بلند مرتبت شاعر کی جانب سے "میٹرو عید" میٹرو ریلوے کلکتہ کے لیے ایک منفرد اور شاہکار ادبی تحفہ ہے جس کے لیے آپ پوری اردو برادری کی جانب سے بہت بہت مبارکباد کے مستحق ہیں۔

خورشید احمد صاحب کا مضمون "اسوۂ محمدی کی جامعیت" نہایت معلوماتی اور قابل تعریف ہے۔ کارمن کا گل کا تاریخی مضمون "اسلامی طرز تعمیر کا عجائب گھر اورنگ آباد" کو آپ نے نہایت خوش اسلوبی سے اردو میں ترجمہ کرکے قارئین انشاء کے لیے اہم تاریخی معلومات فراہم کی ہیں جس کے لیے آپ واقعی شکریہ کے مستحق ہیں۔ خوشبو کی شاعرہ پروین شاکرہ پر "ایک گوشہ" شائع فرماکر آپ نے انسانی، اخلاقی، ادبی اور صحافتی فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ گوشہ مرحومہ کی ادبی خدمات کے اعتراف اور مرحومہ کی روح کو خراج عقیدت پیش کرنے کا پرخلوص نمونہ ہے۔ مرحومہ کے کلام کا انتخاب بھی بہت پسند آیا۔ افسانوں میں "سہالک، ستارے چمک رہے ہیں، میں تھک چکی ہوں، رشتوں کا تقدس" بہت معیاری اور جاندار افسانے ہیں۔ تمنا مظفرپوری کا انشائیہ "میں" آپ اپنی مثال ہے۔ بھارت بھوشن کا مضمون "فلم ساز آر کے نفاست فی الذات" بہت پسند آیا۔ راجکپور جیسے نامور، ماہر فن اور عظیم فلمی اداکار کی صحیح تعریف کی گئی ہے۔ یقیناً بقول مصنف راجکپور ایک ماہر فن تھے جنہیں سنیما کے میڈیم کا پورا پورا ادراک تھا۔

"عشق، انا، مخمور سعیدی" کیول سوری صاحب کا مضمون حقیقت پر مبنی ہے۔ فاضل مضمون نگار نے مخمور سعیدی کی شاعری کے کئی پہلوؤں کے بجائے ایک ہی پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ "دیوار و در کے درمیاں" کو پڑھتے ہوئے عشق اور انا کے علاوہ بھی کئی پہلو دعوت فکر دیتے ہیں کیا ہی اچھا ہوتا اگر کیول سوری صاحب ان کی بھی وضاحت فرمادیتے۔ کتابوں پر تبصرے مختصر ہوکر بھی جامع اور معیاری ہیں۔ ادبی سرگرمیاں۔ اطلاعات و اعلانات کا گوشہ بھی بڑا معلوماتی ہے اس گوشے کی اشاعت کا سلسلہ ملکی و غیر ملکی سطح پر ادبی سرگرمیوں سے آگاہی کا بہترین ذریعہ ہے۔

وسیم ربانی۔ شاہجہاں پور

○ مئی 1995 کے انشاء میں جناب خورشید ملک صاحب نے نہایت چبھتی ہوئی طنزیہ زبان میں انشاء کے سوویں شمارے کی "تعریف" کی ہے اور باتوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ لکھنے کی بھی جسارت کی ہے - "احمد سعید ملیح آبادی اور یحییٰ نشاط نے اپنے مضامین میں آپ کو خوب مکھن لگایا ہے" ..... بغیر کسی مبالغہ کے صحیح واقعات کی روشنی میں کسی ایڈیٹر کی زبردست محنت اور جدوجہد کی نشاندہی کرنا اور اس کی تکلیفوں، دشواریوں اور رستے کی رکاوٹوں کو محسوس کرتے ہوئے ان کا ذکر کرنا اور ان پر قابو پاکر اپنے مقصد کے حصول کے لیے کامیابی کے ساتھ آگے بڑھنے کے لیے کسی ایڈیٹر کو مبارکباد دینا میرے خیال میں "مکھن لگانا" نہیں ہے - اسے حوصلہ افزائی - قدر دانی - قدر شناسی تو کہا جاسکتا ہے - خوشامد یا "مکھن لگانا" نہیں - دوسرے جناب احمد سعید صاحب، اب اس عمر میں ف - س - اعجاز کو کاہے کے لیے "مکھن لگانا" چاہیں گے - میرے خیال میں اردو ادب اور صحافت میں ان کا مقام ایسی اوچھی حرکتوں سے بہت زیادہ بلند ہے - ان کے بارے میں ایسا سوچنا بھی کم ظرفی کی نشانی ہے - مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جناب خورشید ملک صاحب کو آپ کے اتنا خوبصورت اور جامع صدی نمبر نکالنے میں کامیابی حاصل کرلینے اور یہ معرکہ سر کرلینے پر شدید قسم کا حسد محسوس ہوا - اور اسی ہیجان کا نتیجہ یہ مکتوب ہے - خیر میرا یہ خط لکھنے کا اصلی مقصد آپ کا یا احمد سعید صاحب اور یحییٰ نشاط صاحب کا ڈیفنس کرنا نہیں ہے - وہ آپ لوگ خود بخوبی کرسکتے ہیں یا آپ تینوں حضرات یہ نہایت بچکانہ ردِ عمل نظرانداز کرسکتے ہیں - میرا یہ مکتوب لکھنے کا مقصد خورشید ملک صاحب کے منشی پریم چند کے بارے میں دیئے ریمارکس کا جواب دینا ہے -

لیکن اس سے پہلے میں جناب وسیم یمنائی کے مضمون "گوپی چند نارنگ - کردار اور گفتار - اپنے خطوط کے آئینہ میں" (انشاء - نومبر - دسمبر 1994ء) کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں - وسیم یمنائی صاحب نے اپنے اس مضمون میں لکھا ہے "جناب خورشید ملک نہایت غیر جانبدار - بے تعصب اور نڈر انسان ہیں" ...... نڈر کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہنا چاہتا - لیکن یہ کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ وہ "غیر جانبدار" اور "بے تعصب" قطعی نہیں ہیں - مہاجرین اور شرنارتھیوں کے بارے میں ان کے جانبدارانہ اور حقیقت سے کوسوں دور اظہار خیال کا معقول جواب میں نے پہلے بھی انشاء میں چھپے ایک مکتوب کے ذریعے دیا تھا (انشاء جلد ۱۰ - شمارہ 2-3 عید نمبر) اب اس مضمون کے بارے میں عرض ہے کہ پہلے تو جناب خورشید ملک صاحب نے افسانہ نگار رام لعل کے نام لکھے گئے نہایت پرائیوٹ نوعیت کے خطوط اپنے نہایت جانبدارانہ حاشیوں اور نوٹس کے ساتھ شائع کرکے جناب وسیم یمنائی کے مضمون کے لیے مواد فراہم کیا اور مضمون چھپ جانے کے بعد لکھتے ہیں - "کاش عزیزی وسیم یمنائی نے مجھ کو مضمون دکھادیا ہوتا تو میں سختی سے منع کردیتا کہ اسے اشاعت کے لیے نہ بھیجیں" ..... کیونکہ -- "اس مضمون سے نہ صرف گوپی چند نارنگ ناراض ہیں بلکہ خود رام لعل بھی خفا ہیں" - "میں دونوں حضرات سے عزیزی وسیم یمنائی کی طرف سے معذرت چاہتا ہوں" - عذر گناہ بدتراز گناہ - کیا واقعی خورشید ملک صاحب کو اس مضمون کے بارے میں علم نہیں تھا؟

اب منشی پریم چند کے بارے میں - خورشید ملک صاحب نے اپنے مکتوب میں لکھا ہے - "پریم چند پر فرقہ پرست ہونے کا الزام صرف "دارالشکوہ کا دربار" ہی سے دور نہیں ہوسکتا" - مجھے یہ ریمارکس پڑھ کر بہت حیرانی اور ذہنی کوفت ہوئی ہے - ویسے مجھے زیادہ حیرانی نہیں ہونی چاہیے تھی کیونکہ پہلے بھی ان کی جانبدارانہ اور متعصبانہ تحریریں میری نظر سے گزری ہیں -

کچھ اور لوگوں نے بھی منشی پریم چند کی شروع کی زندگی میں ان کے آریہ سماج سے متاثر ہونے کے معاملہ کو طول دے کر انہیں فرقہ پرست قرار دیا ہے - مجھے نہیں معلوم خورشید ملک صاحب کن ناولوں اور افسانوں کی بناء پر منشی پریم چند پر فرقہ پرست ہونے کا الزام لگاتے ہیں - اگر وہ ان ناولوں و افسانوں کی نشاندہی ماہنامہ انشاء کے ذریعے کردیں تو ممنون رہوں گا - لیکن براہ مہربانی Out of Context پریم چند کو Quote نہ کریں - حوالے پورے مکمل پس منظر کی روشنی میں ہونے چاہئیں -

اس میں شک نہیں کہ پریم چند آریہ سماج کی تحریک سے خاص کر اس کے سماج سدھار کے کام سے متاثر ضرور ہوئے - لیکن ذہنی اور تہذیبی پس منظر کچھ ایسا تھا جس میں فرقہ پرستی کی گنجائش نہ تھی - وہ ایک کائستھ گھرانے میں پیدا ہوئے جو ہندو مسلم گنگا جمنی تہذیب کی روایتوں کا علم بردار تھا - ان کی تعلیم بھی اردو، فارسی میں ہوئی - ابتدائی تعلیم ایک مولوی کے ہاتھوں حاصل کی - فرقہ واریت کے اصلی روپ سے وہ خوب آگاہ تھے - چنانچہ وہ اپنے ایک ہندی مضمون "فرقہ واریت اور تہذیب" میں لکھتے ہیں - "فرقہ واریت ہمیشہ تہذیب کی دہائی دیا کرتی ہے - اسے اپنے اصلی روپ میں نکلتے شرم لگتی ہے اس لیے وہ اس گدھے کی طرح ہے جو شیر کی کھال اوڑھ کر جنگل کے جانوروں پر رعب جمایا کرتا ہے - فرقہ واریت تہذیب کا خول پہن کر آتی ہے - ہندو اپنی تہذیب کو قیامت تک زندہ رکھنا چاہتا ہے - مسلمان اپنی تہذیب کو - دونوں ہی ابھی تک اپنی اپنی تہذیب کو اچھوتی سمجھ رہے ہیں - یہ بھول گئے ہیں کہ اب نہ

کہیں مسلم تہذیب ہے اور نہ ہندو تہذیب - اور نہ ہی کوئی دوسری تہذیب
اب دنیا میں صرف ایک تہذیب ہے اقتصادی تہذیب - مگر ہم آج بھی ہندو
تہذیب اور مسلم تہذیب کا رونا روتے چلے جاتے ہیں - حالانکہ تہذیب کا
مذہب یا دھرم سے کوئی تعلق نہیں - آریہ تہذیب ہے - ایرانی تہذیب ہے -
عرب تہذیب ہے - لیکن عیسائی تہذیب مسلم یا ہندو تہذیب نام کی کوئی چیز
نہیں - "

پریم چند نے مولانا محمد علی مولانا شوکت علی کو رام لچھمن کی جوڑی
سے تشبیہ دی ہے - ایک ہندو بھلا اس سے زیادہ کسی کو کیا خراج عقیدت
پیش کرسکتا ہے - وہ چاہتے تھے کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کو اچھی طرح
سمجھیں - اور آپس کی غلط فہمیاں دور ہوں - چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کے
ایک نہایت ہی اہم اور جذباتی واقعے کو اپنے ڈرامے کا موضوع بنایا - انہوں
نے کربلا پر ایک ڈرامہ لکھا - یہ ڈرامہ 1924ء میں گنگا پستک مالا کی طرف
سے شائع ہوا -

قومی زبان کے بارے میں بھی ان کا نظریہ نہایت ہی صحت مند تھا -
وہ ایک ایسی جاندار زبان کے قائل تھے جو عام فہم ہو اور رابطے کی زبان بننے
کی صلاحیت رکھتی ہو - اس زبان کو اردو یا دیوناگری کسی بھی رسم الخط میں لکھا
جاسکتا ہے - 24 مئی 1934ء کو دکھن بھارت ہندی پرچار سبھا کے جلسہ
میں اپنی صدارتی تقریر میں انہوں نے کہا تھا - "میری ساری عمر اردو کی خدمت
کرتے گزری ہے آج بھی جتنا اردو میں لکھتا ہوں اتنا ہندی میں نہیں لکھتا - اور
کائستھ ہونے اور بچپن سے فارسی کا ابھیاس کرنے کے باعث اردو میرے لیے
جتنی سوبھاوک (فطری) ہے اتنی ہندی نہیں" - اسی تقریر میں آگے کہتے ہیں -
"راشٹر بھاشا سے ہمارا کیا مطلب ہے - اس کے بارے میں بھی چند لفظ کہوں گا
اسے ہندی کہیے یا اردو - چیز ایک ہے - نام سے ہماری کوئی بحث نہیں - زندہ
بھاشا تو زندہ جسم کی طرح برابر رہتی ہے - شدھ ہندی تو نرر تھک (بے معنی)
لفظ ہے - جب بھارت شدھ ہندو ہوتا تو اس کی بھاشا شدھ ہندی ہوتی - جب
تک یہاں مسلمان ، عیسائی ، پارسی ، افغانی سبھی جاتیاں موجود ہیں - ہماری
بھاشا بھی دیاپک (ترقی پذیر) رہے گی" - زبان کے بارے میں پریم چند کی نیک
نیتی ہی تھی کہ انہوں نے ایک نہایت ہی معقول اور ٹھوس تجویز رکھی تھی کہ
"شمالی ہندوستان میں تمام سکولوں میں دسویں جماعت تک اردو - ہندی
دونوں کی تعلیم لازمی کردی جائے - اس کے نتیجے میں دونوں زبانوں کا ارتقاء
اس ڈھنگ سے ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کے قریب آتی جائیں گی اور ایک دن
ایسا آئے گا - جب دونوں ایک ہوجائیں گی" - اگر آزادی کے بعد ہم نے ان کی
اس تجویز پر عمل کیا ہوتا تو ابھی تک اردو - ہندی کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل
ہوگیا ہوتا -

صرف فرقہ پرستی کا الزام ہی نہیں - پریم چند کے بارے میں ایک
اور تنازع بھی ہے - جہاں ایک طرف کہا جاتا ہے کہ "پریم چند نے کہانی کو سچ
بولنا سکھایا" اور پریم چند کو اردو ادب میں حقیقت نگاری کا پہلا امام تسلیم کیا
جاتا ہے - پریم چند اردو کے پہلے ادیب ہیں - جنہوں نے اردو فکشن کو حقیقت
نگاری سے روشناس کرایا - پریم چند سے پہلے جو داستانیں اور کہانیاں اردو میں
ابھریں ان میں زبان و بیان اور دلچسپی کے اعتبار سے تو بہت کچھ ہے لیکن ان
میں ہندوستانی معاشرہ اور اس کا اصلی روپ نہیں ملتا - ہندوستانی عوام نہیں
ملتے - ہندوستانی کردار کی کوئی جھلک نہیں ملتی - ہندوستان کے گلی کوچے نہیں
ملتے - ہندوستانی رہن سہن نہیں ملتا - اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کسی
سماجی شعور کا پتہ نہیں ملتا - پریم چند اردو میں اور غالباً ہندی میں بھی پہلے
افسانہ نگار تھے جنہوں نے عوام کی زبان میں باتیں کیں - ان کے دکھ درد کو
سمجھا اور کہانیوں کو راجاؤں نوابوں بادشاہوں جاگیرداروں کے محلوں سے نکال
کر دیہاتوں کی جھونپڑیوں اور کھیتوں کھلیانوں تک پہنچادیا -

دوسری طرف کچھ نام نہاد نقاد پریم چند کی اسی خوبی کو ان کی کمزوری
سمجھتے ہیں - اور ان پر اعتراض کرتے ہیں - حال ہی میں ایک بحث میں ایک
ایسے ہی (خورشید ملک صاحب جیسے ؟) نقاد نے یہ بات کہی .... "زیادہ تر
سماجی حقیقتوں کو ڈھونڈنے والے ادیب اور افسانہ نگار متوسط اور نچلے طبقے
سے آتے ہیں - اسی لیے ایک طرف تو بڑے لوگوں یعنی دولت مندوں سے حسد
کرتے ہیں کہ خود اس منزل تک نہیں پہنچ سکتے - اس لیے ان کے خلاف لکھتے
ہیں - دوسری طرف اپنی معاشی اور تہذیبی پستی کو عظمت بخشنے (glorify
کرنے) کے لیے ایسا کرتے ہیں - کیا حقیقتیں نالی میں کلبلاتے کیڑوں میں ہی ملتی
ہیں - قلیوں - کباڑیوں ہی کی زندگی میں ہیں ؟ - یہ سب خرافات پریم چند کی لائی
ہوئی ہیں - ہندوستانی کہانیوں کا ڈھانچہ پریم چند نے ہی بگاڑا ہے - جس پر بے
عمل ترقی پسند افسانہ نگاروں نے "دنیا بھر کے مزدوروں ایک ہوجاؤ" کا نعرہ
لگا کر کہانی کے حسین خواب دیکھنے والے Process کا قلع قمع کردیا" اب
اس تنازعے پر میں کیا بحث کروں آپ خود ہی فیصلہ کیجئے - لیکن ایک بات
ضرور کہوں گا کہ پریم چند کو فرقہ پرست کہنے والے اپنی کم ظرفی اور متعصبانہ
ذہنیت کا ہی مظاہرہ کرتے ہیں -

خیر اندیش

رام پرکاش کپور ، دورگ (ایم - پی)

○ مئی کا شمارہ نظر نواز ہوا - شمارے کا گیٹ اپ دیکھ کر دل
چھوٹا ہو گیا لیکن جب یہ شمارہ نظروں سے گزرا تو اس میں وہ سب پایا جس کی
امید نہیں تھی - رسالہ کافی معیاری ہے - افسانے اور غزلیں بے حد پسند آئے -
اور بے ساختہ ہم یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ "واقعی ف - س - اعجاز صاحب نے
دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے"

م - ن - امین
کلٹی بردوان

○ مئی کا شمارہ ملا - اداریہ اچھا ہے - بمبئی سے مسلمانوں کے تخلیہ
کے بارے میں پڑھ کر بہت افسوس ہوا - ایک واحد شخص بال ٹھاکرے وہاں
حکمراں ہے اور اس کی بد زبانی پر "دلی" تک خاموش ہے - انتشار پسند طاقتیں
تیزی سے متحد ہو رہی ہیں اور حکومت ان کی تقاریر کو بے ضرر سمجھ کر خاموش
ہے -

محسنی ، کانکی نارہ

○ جولائی کا شمارہ ملا - پرچہ صوری و معنوی اعتبار سے اب
واقعی خوب ہو گیا ہے - ہاں ایک بات ہے کہ انتخاب آپ کا بے حد سخت ہو گیا
ہے کہ پرچے کو ایک خاص مقام تک لے جا رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اب
نامور و ممتاز قلم کار و فن کار انشاء کی طرف پہلے سے زیادہ متوجہ ہو رہے ہیں -!
"نظریہ ارتقاء اور قرآن" نسیم قمر ندوی کا مضمون خوب بھی ہے ،
معلوماتی بھی ہے - محترم سلیم اختر صاحب کا سفر نامہ کچھ خاص متاثر نہ کر سکا -
اقبال حسن آزاد کا افسانہ "حرام - حلال" خاصا پسند آیا - انہوں نے تھرڈ کلاس
گھرانوں کی روزمرہ کی زندگی کی صحیح اور مکمل عکاسی کی ہے جو کہ ایک کامیاب
و کامران قلم کار کی پہچان ہے - "وابستگی وابستگی" محترم مقصود الہی شیخ صاحب کا
افسانہ زبردست تاثر چھوڑ گیا -
جمال اویسی ، اقبال متین ، مبارک شمیم ، نسیم سحر ، گووند رشک
اور مختار احسن انصاری کی غزلیں اچھی لگیں - آپ کا "اداریہ" فرض شناس
اردو صحافت کے فرائض "ذہن پر تاثر چھوڑ گیا -

بدنام بشر ، پاکور

○ رئیس الدین فریدی صاحب کا مضمون نئی پیڑھی کو اپنے
وطن کے سابقہ حالات سے روشناس کرواتا ہے - ڈاکٹر اظہار مسرت کی دونوں
شعری تخلیقات بہت خوبصورت اور معیاری ہیں - جوگندر پال کے "نو" عنوان
سے مختصر افسانے غیر متاثر کن ہیں پرچے کی کتابت طباعت ماشاء اللہ بہت خوب
ہے - مجموعہ اعتبار سے پرچہ اعلیٰ معیار کا ہے -

ڈاکٹر شفیق امام
علی گڑھ

○ جولائی اگست کا مشترکہ شمارہ ملا - آپ کے اداریے حسب
معمول ذہن و دل کو جھنجھوڑتا ہے - آپ کی بے باکی اور نڈر ناقابل تعریف ہے
مقصود الہی شیخ اپنی کہانی میں Picture of Dorian
Gray کو ڈی - ایچ لارنس کی تخلیق بتاتے ہیں - میرے پاس جو کتاب ہے اس
پر مصنف کا نام آسکر وائلڈ لکھا ہے - ہو سکتا ہے وائلڈ نے سرقہ کیا ہو - شیخ تو یو
کے میں مقیم ہیں - وہاں کے کسی پبلشر سے پوچھ کر اگر اصل مصنف کا نام
بتا سکیں تو ممنون ہوں گا - اس کتاب کا پہلا ایڈیشن لندن سے 1891ء میں
شائع ہوا تھا ہو سکتا ہے Lady Chatterlis Lover وائلڈ نے لکھی
ہو - خیر اس پر روشنی تو شیخ صاحب ہی ڈال سکتے ہیں -

شرون کمار ورما ، امرتسر

○ جلد ۱۰ کا شمارہ ۸ نظر نواز ہوا - "گفتنی" کے تحت "کوڑے کا
ٹب" اور "تندور مرڈر کیس" نظمیں لکھ کر آپ نے قانون کے اندھے پن پر طنز
کیا ہے - کاش حادثے کی آنکھوں میں بھی کیمرہ ہوتا !؟ خاص خاص موقع پر
آپ یہ طریقہ اپناتے ہیں اچھا لگتا ہے ، لیکن آپ کے نثر میں لکھے "گفتنی" کی
بات ہی کچھ اور ہوتی ہے - "پہلا یوم آزادی اور اس کے بعد" میں رئیس الدین
فریدی نے بڑی سچائی سے کام لیا ہے ، محترم ایک صحافی کے ساتھ ساتھ ایک
ادیب کی مشاہداتی نظر بھی رکھتے ہیں - اسے پڑھ کر ان کی سوانح حیات پڑھنے کی
خواہش پیدا ہو گئی ہے - یہ کب تک شائع ہوگی ؟ - ریاض عمر نے "جشن آزادی
1995" کے ایام میں بابری مسجد کی شہادت پر ایک دعا لکھ کر اپنی وسیع القلبی
کا اظہار کیا ہے کیونکہ انہوں نے ان لوگوں کے لیے بھی دعا کی ہے جنہوں نے
مسجد کو شہید کیا - "اے خداوند کریم انہیں معاف کر دیجیو !" جیسی دعا ہے ،
ایسی دعا مجبور مظلوم اور بے سہارا مسلمانوں کی ہی دعا ہو سکتی ہے - کہاں ہم
لوگوں کے اندر تنظیم آئی ہے اور نہ ہی کوئی مثبت صورت حال نظر آ رہی ہے
جس سے مسلمانوں کا فائدہ ہوا ہے ، ہو رہا ہے یا ہو گا ! اخلاقی ، معاشی ، سیاسی
عمرانی ، اقتصادی ، مذہبی معاملے میں ہم اور زیادہ بکھر گئے ہیں - جوگندر پال کی
نو منی کہانیاں پسند آئیں ، خاص طور سے "عروج" ، "نہیں رحمان بابو" اور
"ملاقات" - نظمیں اور غزلیں معمولی ہیں - "سب سے چھوٹا غم" پر ظفر فدائی کا

تبصرہ پسند آیا۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا مضمون "غواصی کی مثنویوں میں اخلاقی اقدار" بہت پسند آیا۔ موصوف نے اخلاقی اقدار پر بہت پر مغز اور مدلل انداز میں لکھا ہے۔ لیکن موصوف نے اپنے مقالے میں ایک رومانی انداز اختیار کرلیا ہے۔ انہیں طوطی نامہ پڑھ کر بوکے شیو (BOCCACIO) کی "دی کیمران" (THE CAMERON) کی یاد آتی ہے۔ "سحرالبیان" انہیں بے جان نظر آتی ہے۔ مومن، حسرت اور جگر کی غزل غواصی کے مقابلے میں بے رنگ، بے مزہ بغیر نمک کی کھچڑی کی طرح ہے۔ لیکن ہاں! فکری احساس کی بلندی میں وہ غالب کے ہم پلہ ہیں۔

اس میں کسی کو انکار نہیں کہ غواصی ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ بناوٹ اور تصنع سے پاک تھے اور انداز بیان نہایت سادہ تھا۔ لیکن ان کی زبان قدیم ہونے کی وجہ سے سمجھنے اور پڑھنے میں تھوڑی دقت بھی ہوتی ہے۔ غواصی کی غزل اظہار بیان کی سادگی، سوز و گداز کی وارفتگی اور تاثرات کی فراوانی کے علاوہ ہندوستانی اقدار اور مقامی روایات کی پاسداری و احترام بھی ملحوظ رکھتی ہے۔

مرزا اکبر علی خان لکھتے ہیں "غواصی نے صرف ۳۵ کہانیوں کا انتخاب کیا" جب کہ گوپی چند نارنگ نے "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" میں ۴۵ کہانیوں کا ذکر کیا ہے جو طوطے نے سنائیں۔ دوسری جگہ مرزا اکبر علی بیگ صاحب یوں رقم طراز ہیں کہ "طوطے نے ۲۵ کہانیاں ۲۹ راتوں میں بیان کیں۔ اس کا ماخذ کیا ہے۔ اس سے محترم آگاہ کریں بڑی مہربانی ہوگی۔ انہوں نے سوداگر لکھا ہے جب کہ مثنوی اور کتابوں کے مطالعہ سے سوداگر کا لڑکا ہونا ثابت ہوتا ہے جو بڑی منتوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔

مثنوی "مینا ستونتی" میں چندا جب پہلی بار گوالے (لورک) کو دیکھتی ہے تو اس کے مردانہ حسن و جمال پر ہزار جاں سے قربان ہوجاتی ہے۔ موصوف نے چرواہا لکھا ہے گوپی چند نارنگ نے گوالہ لکھا ہے اس کے علاوہ نیشنل لائبریری سے ہم نے "مینا ستونتی" کے بارے میں نوٹ کیا تھا اس میں بھی گوالہ لکھا ہوا ہے۔

پھر موصوف نے صرف راجہ لکھا ہے جب کہ اس کا ایک نام بھی ہے اور مثنوی میں نام بالکل واضح ہے گوپی چند نارنگ نے بھی راجہ کا نام کنور بتایا ہے۔ دیکھیے غواصی کس طرح راجہ کا تعارف کراتے ہیں۔ اس میں سے صرف دو شعر ملاحظہ فرمائیں۔

کہ یک شہر تھا بڑا بادشاہ
جہانگیر عالم میں تھا شہنشاہ
سچا، عادل و مہربان شہر یار
اتھا ناؤں اس کا سو بالا کنوار

موصوف نے لکھا ہے اس کے حسن کی تعریف سن کر راجہ اس پر فریفتہ ہوگیا۔ جب کہ راجہ اپنی بیٹی چندرا کا بدلہ مینا سے لینا چاہتا تھا کیونکہ اس کے شوہر لورک کے ساتھ اس کی بیٹی فرار ہوگئی تھی۔ انتقام کی آگ سے مغلوب ہوکر اس نے دلالہ کو بھیجا تھا کہ وہ مینا کے جذبات کو ابھارے۔ اور کٹنی جس طور پر اس کے جذبات کو ابھارتی ہے اور جس طور پر اسے برانگیختہ کرنا چاہتی ہے وہ بالکل فطرت کے موافق لگتا ہے۔

پیا بن سوکیوں سیج بھاتی تجھے
یکیلی کوں کیوں نیند آتی تجھے
نہ رکھنا ہے دو دن کی دنیا میں لاج
صبا کرنے کا کام کرنا ہے آج
دنیا کی ہوس کچھ نہ دیکھی ہے توں
دنیا کی لذت کچھ نہ چاکی ہے توں

راجہ اس کے حسن سے متاثر ہوکر اسے حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ وہ سچا رحمدل، انصاف پسند راجہ تھا۔ انتقام کی آگ نے اسے اندھا کردیا تھا۔ لیکن مینا کی وفاداری اور شوہر پرستی کو دیکھتا ہے تو اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتا بلکہ اس کا شوہر اس کے حوالے کردیتا ہے۔ اور یہی اس کے انصاف و سخاوت کی دلیل ہے۔

سید احتشام الدین
رسول منزل، محلہ ملا حلیم خان، دربھنگہ

Justice K. M. Yusuf
Judge,
High Court, Calcutta (Retd.);
Chairman,
Yusuf Commission of Inquiry,
Calcutta,
Government of West Bengal.

Office: 5, Council House Street,
(3rd Floor)
Calcutta-700 001
Phone: 243-0803
Resi.: 4-C, North Range,
Calcutta-700 017
Phone: 244-6437

The 20th January, 1995

Dear Mr. Ejaz,

It was a great pleasure to receive your 100th issue of the "Insha". You deserve not only congratulations but a high sense of gratitude by the Urdu-speaking people to bring out such a wonderful 'Sadi Shumara.' You are a crusader for the cause of the language and your brave struggle is praiseworthy.

I am yet to go through this prestigious publication but I had a cursory glance. Mr. A. S. Malihabadi's article provides a lot of information relating to Urdu newspapers and press including the plus and minus points. Mr. Raisuddin Faridi's article throws light on the background of partition but appears to end abruptly. Mr. Syed Monir Niyazi has dealt with a very sensitive issue: reservation for Muslims. My friend Mr. Kalimuddin Shams is, in fact, the pioneer of this move. He is sincere in his approach but views may differ.

It must be said to your credit that you have chosen the writers including the poets remarkably well with one or two exception which is obvious. The Sadi issue provides plethora of intellectual food. The get-up and printing are excellent. Hats off to F. S. Ejaz! Bravo to his courage of conviction!!

With warm regards,

Sincerely,

خواجہ محمد یوسف

Mr. F. S. Ejaz,
"Insha",
25-B, Zakaria Street,
Calcutta-700 073

[illegible]

کولمبس
شمارہ

اسکنڈے نیویائی ادب

افسانے مضامین شاعری

اسکنڈے نیویا

انشاء کے

عید نمبر ۱۹۹۶ء

کے لئے تخلیقات

نظم و نثر

15 دسمبر 95ء تک

قبول کی جائیں گی۔

(ادارہ)

میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر کے چاروں طرف
دیواریں ہوں اور کھڑکیاں بند ہوں۔ میں چاہتا
ہوں کہ سب ملکوں کی ثقافتوں کی ہوائیں زیادہ
سے زیادہ آزادی کے ساتھ یہاں گھومتی رہیں
لیکن میں نہیں چاہتا کہ میرے پاؤں اُن
میں سے کسی لہر سے اکھڑیں۔

مہاتما گاندھی

مہاتما گاندھی کا 126 واں یوم پیدائش
2 ؍اکتوبر 1995

davp 95/303

مشرقی ہندوستان کا بہترین اور واحد بین الاقوامی اُردو رسالہ

ماہنامہ انشاء کلکتہ

جلد: ۱۰ | دسمبر ۱۹۹۵ء | شمارہ: ۱۲

مدیر: ف۔س۔اعجاز

فی شمارہ : ۸ روپے
زرسالانہ : ۹۰ روپے
مغربی ممالک سے: ۱۲ پونڈ یا
۲۰ ، امریکی ڈالر

رقومات بذریعہ منی آرڈر، بینک ڈرافٹ، چیک صرف "انشاء پبلی کیشنز" کے نام میں روانہ فرمائیں ورنہ قابلِ قبول نہ ہوں گی۔ برطانیہ سے BPO کے ذریعہ رقومات بھیجی جائیں۔

فہرست

خط و کتابت، مضامین بھیجنے اور ترسیل زر کا پتہ :
ماہنامہ انشاء انشاء پبلی کیشنز
۲۵- بی زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳، فون: ۲۵-۴۲۱۶

خودی کو مت گرا اتنا ـــ ـــ

دیش کے مسلمانوں کو ابھارا جارہا ہے کہ وہ حکومت سے اپنے لئے پچھڑے ہندو طبقات کی طرح پسماندہ درجے میں اندراج کا مطالبہ کریں۔ ہندو سماج میں افراد اور طبقات کی جو درجہ بندیاں ہیں ان کے پیش نظر پچھڑی ذاتوں کے ہندوؤں کا تعلیم اور ملازمتوں میں تحفظ یا ریزرویشن کا دعویدار ہونا نامناسب نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اسلام کے پیروکاروں کا اپنی پسماندگی کے باوجود دوسروں کی روش اختیار کرنا ان کی دیکھا دیکھی اپنے لئے ریزرویشن کی مانگ کرنا اسلامی اسپرٹ اور روایات کے خلاف اور بھیک مانگنے جیسا ہے۔ پہلے تو اپنا وقار اپنے ہاتھوں مٹی میں ملا دیا اور اب ضرورت کے وقت محاسنِ طلب گنواتے چلے جارہے ہیں۔

ریزرویشن کی مانگ جن کانفرنسوں اور کنونشنوں میں کی جاتی ہے ان کا انعقاد دو طرح کے مسلمانوں کے زیر سرپرستی عمل میں آتا ہے۔ ایک تو پچھلا الکشن ہارے ہوئے مسلمان اور دوسرے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے مسلم وزراء ہیں جنہیں آئندہ الکشن لڑنا دشوار نظر آرہا ہے۔ ارادتاً بابری مسجد کے صدمے کی طرف سے مسلم عوام کی توجہ ہٹائی جارہی ہے۔ اگر لوگ بابری مسجد کا غم پوری طرح بھول جائیں تو کانگریس اور دیگر غیر فرقہ پرست پارٹیوں کو الیکشن لڑنے میں آسانی ہوگی۔ چنانچہ اس وقت مسلمانوں کے لئے تعلیم اور ملازمت میں تحفظ کا سوال بار بار اٹھایا جارہا ہے۔ لیکن بابری مسجد کی تلافی تعلیم اور ملازمت میں تحفظ دے کر نہیں کی جاسکتی۔

غیر بی جے پی حکمراں پارٹیوں کے اکابر اور وزراء جگہ جگہ جلسوں میں اس تحفظ پر اصرار کر رہے ہیں۔ جب حکومت تمہاری ہے اور تم خود وزیر ہو تو پھر جلسے جلوسوں میں "ریزرویشن ریزرویشن" کیوں چلاتے ہو۔ اس کے لئے پارلیمنٹ سے قانون پاس کرواؤ۔ بے بس لوگوں کو طلسمی نعروں کے فریب میں مبتلا کرتے ہو۔ انہیں اس میں کشش نظر آتی ہے اور وہ ہزاروں کی تعداد میں بھیڑ لگانے چلے آتے ہیں۔ لیکن اس میں کیا شک ہے کہ بھیڑ لگا کر تحفظ تحفظ کی رٹ لگانے والے مسلم سیاستدانوں کو آئندہ انتخابات میں اپنا بیڑہ پار ہونا مشکل نظر آرہا ہے۔ اب کے وہ موسم احتساب کی ہواؤں کا مقابلہ نہیں کرپائیں گے۔ مسلمان کانگریسی لیڈر سہمے ہوئے ہیں کہ اب کے الکشن میں ان کا اور ان کی پارٹی کا کیا ہوگا۔ نہ وہ گھر کے رہیں گے نہ گھاٹ کے۔ اس لئے پارٹی کے ماضی کے اعمال پر ندامت ظاہر کرنے کے لئے ملت کے رفیق بنے شہر شہر گھگھیاتے لگائے پھر رہے ہیں۔ دراصل ان دنوں وہ بیچارے خود لائق ہمدردی ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ بقول میر ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

ایک مسلم مرکزی وزیر فرماتے ہیں کہ وہ مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ مسلمانوں کی پسماندگی کی بنیاد پر ان کے لئے ریزرویشن کا مطالبہ کر رہے ہیں جو ان کا حق ہے۔ اس کے ساتھ ہی وزیر موصوف اونچی ذات کے ہندوؤں میں جو پسماندہ ہیں انہیں بھی ریزرویشن کی سہولت دلوانا چاہتے ہیں تاکہ سبھوں کے ساتھ سماجی انصاف ہوسکے۔ مذکورہ وزیر یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کا یہ مطالبہ ایک وزیر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہے۔ وزیر کے اسی بیان سے اس کی مجبوری اور ذہنی کشمکش کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے "مسلمان" اور "وزیر" کے بیچ ایک خط فاصل قائم کر رکھی ہے۔ وزیر کی حیثیت سے اس کا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔ مسلمان کی حیثیت سے جو بات اس کے لبوں پر آتی ہے وہ گردش روزگار کو ایک دو ساغروں سے ٹالنے والی بات ہے یا جیسے کوئی چرخ سے نان راحت طلب کر رہا ہو جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ خود ہی بازار سیاست میں کاسہ گدائی لئے پھرتا ہے۔
مسلم ریزرویشن کے جلسوں میں ہر خطیب پر لازم آتا ہے کہ وہ اپنے زور خطابت سے امت مسلمہ کو پچھلے مقررین سے دس فٹ زیادہ پستی میں

ہوا بیان کرے ۔ اور منہ سے اقرار کرے کہ مسلمان گر چکا ہے، پسماندہ ہو چکا ہے، اب بہت دن تماشائی بن کر نہیں رہ سکتا خطیب کو حاضرین جلسہ کو ملازمتوں میں اونچی نیچی ذاتوں کے رٹے رٹائے آکڑے بلحاظ تناسب آبادی سے آگاہ کرنا پڑتا ہے ۔ تمام سیاسی پارٹیوں کے مسلم لیڈران جو اپنے اپنے نظریاتی اختلافات بھلا کر بذریعہ ہوائی جہاز جلسے میں تشریف لائے ہوتے ہیں کی تائید سے ملک کے وزیر اعظم پر مسلم ریزرویشن کے لئے تقریری دباؤ ڈالنا پڑتا ہے ۔ ظاہر ہے یہ دباؤ جس سربراہ پر ہوتا ہے وہ اور کسی کے دباؤ میں آئے یا نہ آئے لیکن ان کے دباؤ میں آنے والا نہیں ۔ وہ دباؤ ڈالنے والوں کے انداز حکیمانہ اور انداز مریضانہ سے پہلے ہی سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے ۔ وہ حسن طلب کی اچھی پرکھ رکھتا ہے ۔ اسے معلوم ہے کہ دلالوں اور کمیشن ایجنٹوں کی طرح پر سٹیج میں بات کرنے والے اس درجے کے لوگ نہیں کہ خدا تھک کر ان سے پوچھے گا کہ بتاؤ تمہاری رضا کیا ہے ۔ تمہارے لئے کیسی تقدیر لکھ دی جائے ۔ کہو تو تمہیں اتنا ناکارہ اور اس درجہ پست کر دکھایا جائے کہ ہندوستان کی کل سرکاری ملازمتوں کے مستحق تم ہی بن جاؤ ۔

غرض یہ ہے کہ یہ سارے کھدر پوش الکشن بعد گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو جائیں گے اور مسلمانوں کا ہنر یونہی مٹی میں ملتا چلا جائے گا ۔ دانائی اس میں ہے کہ لوگ اپنے ہنر کو پہچانیں، اس کی بے قدری نہ ہونے دیں ۔ اپنے مطالبات کی اساس اپنی احتیاجات پر رکھیں لیکن اپنے ظرف اور وقار کو فراموش نہ کریں ۔ باطنی خوبیوں اور صلاحیتوں کو نکھاریں اور ہم وطنوں سے انہیں منوائیں ۔ وہ دن سب سے اچھا دن ہوگا جب اس سماج سے پکار اٹھے گی کہ ریزرویشن ختم کر دیا جائے ۔ اس کے لئے اپنے ہاتھوں کے بل، اپنے ایمان کی ہدایت اور اپنے خدا پر بھروسہ پختہ کرنا ہوگا ۔ ریزرویشن فرقہ واریت کے عملی نفاذ کا دوسرا نام ہے جس سے ہندوستان کی فکری جڑیں کمزور اور کھوکھلی ہو رہی ہیں ۔ ابھی چند دنوں پہلے ایک برہمن ایڈوکیٹ نے اپنے خاندان سمیت ہریجن وادھنے کا اعلان کر دیا محض اس لئے کہ وہ اپنے بیٹے کے لئے ہریجن محفوظ کوٹے سے نوکری کی سہولت ڈھونڈ رہا تھا ۔ تو مسلمان یہ بتادیں کہ کیا بوقت افتاد وہ ایسی آسانیوں کے دلدادہ ہو جائیں گے کہ اپنا مذہب ترک کر کے دوسرا مذہب اختیار کر لیں گے ؟

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
اقبال

مظہر امام
176-B, Pocket I
Mayur Vihar, Phase I
Delhi-110091

نگار خانوں کی یادیں : یادوں کے نگار خانے

یادنگاری موجودہ اردو ادب میں ایک الگ صنف کا درجہ اختیار کرنے لگی ہے۔ شخصیتوں کے حوالے سے اپنی یادوں کو تازہ کرنا ہمارے کئی ادیبوں کا محبوب مشغلہ بنتا جارہا ہے۔ قیصر عثمانی بھی ان میں سے ایک ہیں جو وقتاً فوقتاً یادوں کے نگار خانے سجاتے رہتے ہیں۔ اور اگر یہ نگار خانے، نگار خانوں کی یادوں سے منور کئے گئے ہوں تو ان کی کیفیت مئے دو آتشہ کی ہو جاتی ہے۔ قیصر عثمانی کی کتاب "یادوں کے سائے" کچھ ایسا ہی تاثر دیتی ہے

قیصر عثمانی نے عین عالم نوجوانی میں فلم نگری میں قدم رکھا۔ خوب صورت تھے، پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ پڑھے لکھے، شستہ، مہذب، ایک نجیب گھرانے کے چشم و چراغ۔ شعر کہتے تھے، افسانے لکھتے تھے۔ گیا کے معروف ادبی رسالے "سہیل" کی ادارت کے فرائض انجام دے چکے تھے۔ ادبی حلقوں میں جانے پہچانے جاتے تھے۔ فلمی دنیا کے گلیمر نے انہیں اپنی جانب کھینچا۔ بچپن ہی میں انہوں نے ایک بزرگ کے مزار پر دعا مانگی تھی کہ کسی دن ان کا بھی فلمی دنیا سے تعلق پیدا ہو۔ تیرہ چودہ سال بعد یہ دعا مستجاب ہوئی۔ ان کے دوست شیدا کیوردی نے ان کے شوق کو مہمیز دی۔ ۴۲ء کے اوائل میں گیا سے کلکتہ آگئے۔ تلاش معاش میں ناکام ہوتے رہے۔ ایک دن مایوسی کے عالم میں ایک راستے سے گزر رہے تھے کہ "فضلی برادران" کا بورڈ نظر آگیا۔ سوئے اتفاق کہ معروف شاعر اور آئی۔ سی۔ ایس افسر فضل احمد کریم فضلی نے انہیں دفتر میں دیکھ لیا اور ان کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے لگے۔ ادبی صحافت کا تجربہ کام آیا۔ پچاس روپیے ماہانہ پر "فضلی برادران" کے ملازم ہوگئے۔ کچھ ہی دنوں میں پبلسٹی آفیسر مقرر کردیئے گئے۔

قیصر عثمانی اپنے دوست شیدا کیوردی کے علی الرغم اداکاری کی طرف نہیں آئے۔ حالانکہ میرے خیال میں وہ "پردہ نشیں" کے ہیرو شیدا سے زیادہ خوش شکل تھے۔ اس زمانے کی ان کی تصویر سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔ مزمل خورشید سے بھی، جو اسی زمانے میں ایک دو فلموں میں ہیرو یا سائڈ ہیرو کی حیثیت سے آئے تھے۔ غالباً قیصر عثمانی کو پردہ، سیمیں پر نہیں بلکہ قرطاس ادب پر نمایاں ہونے کا زیادہ شوق رہا۔ شاید وہ سمجھتے ہوں کہ ادب میں زندہ رہنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ فلمی اداروں کی ملازمت کے دوران اپنی مصروفیات کے باوجود انہوں نے افسانے لکھے، ایک ناول لکھی، شعر بھی کہتے رہے۔ ایک طویل نظم "پرچھائیوں کے دیس میں" لکھی اور اس پر قرۃ العین حیدر سے بھی داد حاصل کی، ادبی اور فلمی شخصیتوں پر وقتاً فوقتاً مضامین لکھتے رہے، کتابیں چھپوائیں، بڑے پیمانے پر مشاعرے منعقد کئے، اردو کی لڑائی لڑتے رہے۔

اس صدی کی پانچویں دہائی دراصل ہندوستانی فلم سازی کے بلوغ کا زمانہ ہے۔ متکلم فلموں کا آغاز ۳۱ء میں ہوا، اور اس کے بعد دس سال کا زمانہ تشکیلی دور کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اس تشکیلی دور میں بھی کئی عہد ساز فلمیں بنیں۔ نیو تھیٹرز، بمبئی ٹاکیز اور پربھات کے عروج کا زمانہ یہی ہے۔ ۴۲-۴۱ء تک یہ بڑے ادارے اپنا کام پورا کر چکے تھے۔ ۴۳-۴۲ء میں اور اس کے بعد ہماری فلمی صنعت میں بہت سے نئے چہرے سامنے آئے۔ ان میں فلمی اداکار بھی تھے، فلم ساز اور ہدایت کار بھی اور فلمی شعبے سے تعلق رکھنے والے دوسرے تکنیکی ماہرین بھی۔ دلیپ کمار، راج کپور، دیو آنند، نرگس، ثریا، مدھو بالا انہیں دنوں پردہ، سیمیں پر نمایاں ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان فلم پر جگمگانے لگے۔ یہ سب قیصر عثمانی کے ہم عصر تھے۔ مسلم سوشل فلمیں بنانے والوں میں فضلی برادران کو نہ صرف اولیت حاصل تھی بلکہ وہ پیش پیش بھی تھے۔

فضلی برادران تین تھے ۔ سب سے بڑے سید فضل احمد کریم فضلی آئی ۔ سی ایس ۔ کلکتہ میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھے ۔ شعر گوئی سے خاص شغف تھا ۔ "ساقی" میں ان کا کلام باقاعدگی سے چھپا کرتا تھا اور ان کے مجموعہ کلام "نغمہء زندگی" کا اشتہار بھی ۔ عموماً غزلیں چھوٹی بحر میں ہوا کرتی تھیں ۔ میں نے بھی جب تیرہ سال کی عمر میں تک بندی شروع کی تو ان کی ایک زمین میں غزل کہی تھی ۔ ان کے منصب اور مرتبے نے انھیں فلم سازی کے میدان میں آنے کی اجازت تو نہیں دی ۔ لیکن "فضلی برادران لمیٹڈ" کے قیام میں ان کی ذاتی کوششوں اور اثر و رسوخ کا خاص دخل تھا ۔ انہوں نے "معصوم" نامی فلم کی کہانی لکھی جو ان کے چھوٹے بھائی ایس ۔ الیف ۔ حسنین کی ہدایت میں بنی ۔ ان کی تحریر کردہ ایک اور فلم "یادگار مشاعرہ" حسنین ہی کی ہدایت میں بن رہی تھی اور تمام ادبی حلقوں میں اس کا بڑا چرچا تھا ۔ یہ فضل احمد کریم فضلی کی ذاتی کشش انگیز شخصیت کا اثر تھا کہ مولوی عبدالحق ، خواجہ حسن نظامی ، جوش ، جگر ، ساغر نظامی ، مسعود علی ذوقی اور دوسرے اکابرین ادب اس فلم کی شوٹنگ میں حصہ لے رہے تھے ۔ قسمت نے یاوری نہ کی ، اور اس کے پرنٹ جل کر خاکستر ہوگئے ، ورنہ سچ یہ ایک یادگار فلم ہوتی ۔ فضل احمد کریم فضلی تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان چلے گئے ۔ وہیں انہوں نے ایک ناول "سحر ہونے تک" تصنیف کیا ، جس کی اچھی خاصی پذیرائی ہوئی ۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد وہ کراچی منتقل ہوگئے ، اور وہیں ان کا انتقال ہوا ۔

دوسرے بھائی ایس ۔ الیف ۔ حسنین اچھے خاصے پڑھے لکھے نوجوان تھے ۔ کم عمری میں ہی یعنی تقریباً ۲۸ سال کی عمر میں وفات پاگئے ۔ ۳۸ء میں ستائیس (۲۷) سال کی عمر میں "قیدی" بنائی اور نام کمایا ۔ "قیدی" کو عام طور پر ہندوستان کی پہلی مسلم سوشل فلم کہا جاتا ہے ۔ اس کے بعد انہوں نے "معصوم" بنائی اور "فیشن" ۔ تینوں فلموں میں کامیابی کا نیا ریکارڈ قائم کیا ۔ "قیدی" کی کہانی سبطین فضلی نے لکھی تھی اور "معصوم" کی جیسا کہ عرض کیا گیا فضل احمد کریم فضلی نے ۔

سبطین فضلی (جو عام طور سے ایس ۔ فضلی کے نام سے معروف تھے) "قیدی" کے کہانی کار کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے ۔ ان کی ہدایت کردہ پہلی فلم "چورنگی" ۴۲ء میں ریلیز ہوئی ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مقبول فلم کلکتہ کے مشہور بازار چورنگی پر بھیک مانگنے والی ایک خوبصورت بھکارن کی داستان حیات تھی جسے ایس ۔ فضلی نے دل دے دیا تھا ۔ "چورنگی" میں ایس ۔ فضلی نے بھی ایک چھوٹے سے کردار میں اداکاری کے جوہر دکھائے تھے اور قیصر عثمانی نے بھی ایک مختصر رول ادا کیا تھا ۔ ۴۲ء میں ہی ان بھائیوں کا ادارہ بمبئی منتقل ہوگیا اور وہیں ایس ۔ فضلی نے "عصمت" ، "شمع" اور "مہندی" نام کی فلمیں بنائیں ۔ ایس ۔ فضلی کا بڑا وصف یہ تھا کہ وہ کان کے کچے نہیں تھے اور اپنے معتبر عملوں کی پوری طرح پشت پناہی کرتے تھے ۔ تقسیم کے بعد ان بھائیوں کے پاکستان چلے جانے سے ہماری فلمی صنعت خوبصورت مسلم سوشل فلموں کے خالقوں اور اردو زبان و ادب کے خاموش خدمت گزاروں سے محروم ہوگئی اور یہ خلاء پھر پر نہ کیا جاسکا ۔ مجھے آج بھی یاد کرکے مسرت ہوتی ہے کہ میں نے قیدی ، معصوم ، چورنگی ، فیشن ، عصمت ، شمع اور مہندی سب ہی فلمیں دیکھی تھیں ۔

قیصر عثمانی خوش نصیب تھے کہ انھیں ان بھائیوں کی معیت میں کام کرنے کا موقع ملا ۔ ان کے ادارے کے پبلسٹی آفیسر کی حیثیت سے انہوں نے نہایت مخلص اور ایمانداری کے ساتھ اپنی خدمات سرانجام دیں اور اس وابستگی نے ان کے تجربوں کو صلابت بخشی ۔ معاون ہدایت کار کی صورت میں بھی انہوں نے بعض فلموں کی کامیابی میں حصہ لیا ۔ سبطین فضلی اکثر انہیں "پرنس چارمنگ" (PRINCE CHARMING) کہہ کر مخاطب کرتے تھے ۔

نرگس اپنے وقت کی سب سے بڑی ہیروئن تھی ۔ اس کے ساتھ ثریا اور مدھو بالا دو اور ہیروئنوں کے نام لئے جاتے تھے ۔ ثریا ، نرگس سے چند ماہ پہلے ۴۳ء کے اوائل میں پرتھوی راج کپور کے ساتھ "اشارہ" میں ہیروئن بن کر آئی تھی ۔ نرگس پہلی دفعہ محبوب کی ہدایت میں بنی فلم "تقدیر" میں ہیروئن کی حیثیت سے موتی لال کے بالمقابل آئی ۔ یہ فلم ریلیز تو دسمبر ۴۳ء میں ہوگئی تھی ، لیکن اسے عام طور پر ۴۴ء کی فلم کہا جاتا ہے ۔ مدھو بالا اس کے کچھ عرصہ بعد کیدار شرما کی "نیل کمل" میں راج کپور کے ساتھ ہیروئن بن کر پردہء سیمیں پر نمودار ہوئی ۔

نرگس میری ہم عمر تھی ۔ مجھے فلم بینی کے ساتھ فلمی رسائل کے مطالعے کا چسکا ۴۳-۴۲ میں ہی لگا تھا ۔ نرگس جب " تقدیر " میں آئی تو اس کی عمر پندرہ کے آس پاس تھی ۔ وہ اس طرح میری آنکھوں اور دل میں رچ بس گئی کہ اس کے بعد کوئی اور ہیروئن اس حد تک نہیں جچی ، اور میں عرصے تک اس سے شادی کرنے کے خواب دیکھتا رہا ۔

نرگس سے قیصر عثمانی کا سامنا " عصمت " کے سیٹ پر ہوا جو نرگس کی دوسری فلم تھی ۔ اس کی ہدایت ایس ۔ فضلی کے ذمے تھی اور قیصر عثمانی معاونت کر رہے تھے ۔ ماضی کی یادیں تازہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ نرگس اتنی ذہین تھی اور مکالموں کی ادائیگی پر اسے اتنا قابو تھا کہ اس کے کسی شاٹ کو ری ٹیک کی ضرورت نہیں پڑتی تھی ۔ اس مضمون میں نرگس کی والدہ جدن بائی کے شاہانہ کروفر کا بھی ذکر ہے اور نرگس کی نانی کے مغلظات کا بھی ۔ انہوں نے اس واقعے کا بھی ذکر کیا ہے کہ ایک روز جدن بائی نے راج کپور کو دیکھ لیا تو اس کے سامنے نرگس کی وہ ڈانٹ ڈپٹ کی کہ اس کی چوٹ راج کپور محسوس کرتا رہا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر معذرت کرنے لگا ۔ اس مضمون سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ گیا کے مشہور رئیس ظفر نواب کے یہاں اکثر جدن بائی کا مجرا ہوا کرتا تھا ۔ اور ظفر نواب مرحوم کے صاحبزادے مظفر نواب اپنی اہلیہ کے انتقال کے بعد ۴۸ء میں جب فلم بنانے کا خیال سے بمبئی آئے تو وہ اپنی پہلی فلم کی ہیروئن کے لئے نرگس کو لینا چاہتے تھے ، مگر جدن بائی نے کسی مصلحت کے پیش نظر رضامندی نہ دی ۔ قیصر عثمانی نے اس مصلحت سے پردہ نہیں اٹھایا ۔ اس زمانے میں یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ مظفر نواب نرگس کے عشق میں ہی فلم سازی کے میدان میں آئے ہیں ۔ ضمنی طور پر دوسری باتیں بھی مشہور ہوئی تھیں ، مگر ان کی تردید خود مظفر نواب نے اپنی خود نوشت " مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا " میں کر دی ہے ۔ قیصر عثمانی نے نرگس کی شادی سے پہلے ایک افسانہ " نرگس کی ساڑی " کے عنوان سے لکھا تھا ۔ یہ ساڑی جو سفید ہے ، خواہش کرتی ہے ، کاش یہ سہاگ کی مہندی سے سرخ ہو جائے ! مجھے یاد آتا ہے انہیں دنوں مشہور صحافی رام اورنگ آبادکر نے ایک باقاعدہ کتاب نرگس پر لکھی تھی اور اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں بہت سے انکشافات کئے تھے ۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ راج کپور نے اپنا ذاتی ادارہ قائم کرنے کے لئے نرگس سے معاشی فائدے حاصل کئے اور اس کا استحصال کیا ۔

قیصر عثمانی نے مدھو بالا پر معرکے کا مضمون لکھا ہے ۔ شروع سے آخر تک افسانے کا سا لطف ملتا ہے ۔ قیصر عثمانی بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور اپنے اس فن کا مظاہرہ انہوں نے اس مضمون میں کمال خوبی سے کیا ہے ۔ مدھو بالا جیسی بڑی اداکارہ میں ایک محبت بھرا دل تھا ، اور اس دل کے نہاں خانے میں قیصر عثمانی کے لئے جو محبت اور شفقت تھی ، اس کے نقوش واضح طور پر اس خاکے میں ابھرے ہیں ۔ مدھو بالا ان کی غربت اور مفلوک الحالی کے باوجود ان کے لئے ایک خاص نوع کا جذبہ رکھتی تھی ۔ وہ ان کا اسلوب زندگی بدلوانا چاہتی تھی ، مگر اس کے لئے ان کی اس طرح مدد کرنا چاہتی تھی جو احسان کے زمرے میں نہ آئے ۔ قیصر عثمانی نے بھی اس خاکے میں اپنے آپ کو کہیں چھپایا نہیں ہے ۔ ان کا احساس کمتری انہیں بات بات پر اندیشوں میں مبتلا کر دیتا ہے ۔ اکثر وہ مدھو بالا کے جذبہ ، محبت یا جذبہ ، ہمدردی کو مذاق پر محمول کرتے ہیں ۔ مدھو بالا کی جانب سے اتنی اچھی پیشکش کے باوجود ان کا کچھ نہ کر پانا ایک سانحہ ہی ہے ۔ اپنی ناکامی کا الزام وہ اپنی قسمت کو دیتے ہیں ۔ شاعر کا المیہ یہی ہے کہ وہ اپنی تصوراتی دنیا میں گم رہتا ہے اور عملی زندگی میں ناکام رہتا ہے ۔ اس کی مایوسی ، محرومی ، اس کا غم اس کی انا کو تسکین دیتے ہیں ۔ خود تو پہل کرنے سے رہا ، اگر محبوب کی جانب سے پیش قدمی ہو تب بھی وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے ۔ وہ بس " میرا حصہ دور کا جلوہ " پر قناعت کر لیتا ہے ۔ جگر کا مشہور شعر ہے :

مجھے یہ وہم رہا مدتوں کہ جرأت شوق
کہیں نہ خاطر معصوم پر گراں گزرے

ممکن ہے مدھو بالا قیصر عثمانی سے رشتہ ، ازدواج قائم کرنا چاہتی ہو اور اس خیال سے کہ گھر والے اور متعلقہ معاشرہ کسی ایسے شخص کو قبول نہ کرے گا جو معاشی اعتبار سے مستحکم نہ ہو ، وہ ان کو معاشی استحکام دلانے کے لئے فلم سازی کی طرف آنے کی ترغیب دے رہی ہو ۔ " روئے گل سیر ندیدیم

و بہار آخر شد " کہہ کر اپنی حالت پر قانع ہو جانا شاعر قیصر عثمانی کے لئے آسان ہے، لیکن انہیں اعتراف کر نا چاہیے تھا کہ اس میں ان کے حوصلوں کی پستی شامل تھی ۔ بقول حسرت :

غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مرے شوق کی بلندی ، مرے حوصلوں کی پستی

مدحو بالا کی داستان میں قیصر عثمانی نے صرف ان واقعات کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق ان کی اپنی ذات سے ہے ۔ اس کے برعکس مینا کماری کی روداد میں اپنے روابط کے علاوہ ان واقعات کا بھی بیان ہے جو براہ راست ان کے مشاہدے میں نہیں آئے ۔ اس مضمون میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جنہیں عام طور پر لوگ نہیں جانتے ۔ خصوصاً مینا کماری کی نو عمری کے بارے میں جب وہ فلموں میں چھوٹے چھوٹے رول کرتی تھی ۔ " پرتگیہ " میں موتی لال کی چھوٹی بہن بنی تھی ۔ اس زمانے میں بھی اس کی خوش اخلاقی اور شعر و شاعری کا شوق قابل توجہ تھے ۔ اس کے ذوق شعر کا ذکر قیصر عثمانی کے الفاظ میں سنیئے :

" جب میں اپنی کوئی نظم یا غزل سنانے لگتا تھا تو اس چھوٹے سے خاندان میں صرف مینا کماری ہی ایک ایسی ہستی تھی جو ہم دونوں کے پاس بیٹھ کر میرا کلام سننے میں محو ہو جاتی تھی ۔ کبھی تو ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگتی تھی اور کبھی ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی خاص شعر کی تہہ میں ڈوبی جاری ہو ۔ اس کا معصوم سا چہرہ ایک عجیب سی کیفیت سے معمور ہونے لگتا تھا " ۔

مینا کماری کے والد ماسٹر علی بخش سے قیصر عثمانی کے قریبی مراسم تھے اور انہیں کے اصرار پر وہ ان کے یہاں آیا جایا کرتے تھے ۔ اس قربت کی وجہ سے ان کے دوست مینا کماری سے ان کی شادی کی بات چلانے کا ذکر کرتے ۔ لیکن ایک بار مذاق نے سنگین صورت اختیار کر لی ۔ بمبئی کے ایک ہفتہ وار " آئینہ " میں قیصر عثمانی اور مینا کماری کی شادی کی باقاعدہ فرضی رپورٹ چھپی، ساتھ ہی احسن رضوی کا لکھا ہوا سہرا بھی ۔ قیصر عثمانی کی صفائی کے بعد شاید مینا کماری کے والد کا دل صاف ہو گیا، لیکن مینا کماری کے رویے میں ایک نمایاں احتیاط اور روکھا پن در آیا ۔ جہاں تک شادی کا سوال ہے ، قیصر عثمانی کا کہنا ہے کہ ایکٹرس سے شادی ان کی افتاد طبع کے خلاف تھی ۔ مینا کماری کی ذات سے قریبی واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس کے نانا اپنے وقت کے مشہور ادیب " العصر " اور " ادیب " کے اڈیٹر پیارے لال شاکر میرٹھی تھے ۔ مینا کماری کے والد ماسٹر علی بخش ان کی بیٹی کو بھگا کر لے گئے تھے ، اور اس سے تھیٹر میں کام کراتے تھے ۔ پھر مذہب تبدیل کرا کر اقبال بانو بنایا اور اس سے شادی کر لی ۔ ایک بار شاکر میرٹھی جب بمبئی آئے تو قیصر عثمانی کو اپنے داماد کے یہاں لے گئے جہاں ان کا مختصر قیام تھا ۔ مینا کماری پہلی بار ۴۶ء میں راجہ نینے کی فلم " بچوں کا کھیل " میں نوخیز ہیروئن کے روپ میں آئی تھی ۔ پھر وہ آہستہ خرامی سے فلمی دنیا میں قدم جمانے لگی ۔ کمال امروہی کی عقابی آنکھوں نے اس جوہر کی قیمت کا اندازہ لگایا ، اور اسے " انار کلی " بنانے کا خواب دکھا کر اس سے شادی کر لی ۔ یہیں سے مینا کماری کی زندگی کے المیے کا آغاز ہوا ۔ حتیٰ کہ شراب نوشی اور جنسی آزادہ روی اس کے لئے نفسیاتی مرض بن گئے ۔ قیصر عثمانی کے مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ وہ میک اپ روم میں بھی اپنے ہیرو کے ساتھ اختلاط کو روا رکھتی تھی ۔

قیصر عثمانی نے ایک جگہ اس امر پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ دو فلموں کی شوٹنگ کے دوران معاون ڈائرکٹر کی حیثیت سے ان کا مینا کماری کا ساتھ رہا، مگر وہ انہیں بالکل نظر انداز کرتی رہی جیسے کبھی کی جان پہچان ہی نہ ہو ۔ انہیں دنوں فلم کے ڈائرکٹر دیوندر گوئل نے مینا کماری کو بتایا کہ ۴۴ء میں قیصر صاحب نے آپ پر ایک قطعہ کہا تھا، اور یہ آپ کو اس لئے معلوم نہ ہو سکا کہ قیصر صاحب یک طرفہ افلاطونی محبت کے قائل ہیں ۔ اس بات سے مینا کماری نے دلچسپی لی ۔ ایک دوسرے موقع پر اس نے قیصر عثمانی کے تعلق سے شوخ فقرے بھی کہے ، مگر وہ اپنی خلش کو دل سے نہ نکال سکے ۔ انہیں یہ احساس تکلیف پہنچاتا تھا کہ چندر موہن ، اشوک کمار ، گیتا بالی ، مدحو بالا اور راجندر کمار جیسے فن کاروں کو تو ان کے بطیر سٹ (SET) پر لطف نہیں آتا تھا ، مگر مینا کماری کا رویہ بالکل بے اعتنائی کا تھا ۔

یناکماری کی زندگی میں کئی شاعر، اداکار اور فلم ساز آئے، اس کی بے بسی اور کمزوری سے فائدہ اٹھاتے رہے ۔ کثرت سے نوشی نے اچھے اور برے کی تمیز بھی مٹادی تھی اور اس عالم میں اسے تن بدن کا ہوش بھی نہیں رہتا تھا۔ قیصر عثمانی نے لکھا ہے :

" کبھی وہ اپنی زندگی کے گلزار میں شعر و سخن کے پھول کھلاتی، کبھی کسی محبت کے فریب میں آکر ساون کی طرح جھوم جھوم اٹھتی اور کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے شراب ناب میں غرق رہنے ہی کو اپنا دھرم بنالیا ہو" ۔

ان جملوں میں وہ تین نام پہچانے جاسکتے ہیں جو مینا کماری سے قربت کی وجہ سے فلمی دنیا میں قدم جمانے میں کامیاب ہوئے ۔ اس سے کیف یاب ہونے والوں میں ایک مشہور ترقی پسند شاعر کا نام بھی لیا جاتا تھا، جس کا تذکرہ قیصر عثمانی نے نہیں کیا۔

مدحو بالا اور مینا کماری کے علاوہ سب سے تفصیلی خاکہ دیوندر گوئل کا ہے ۔ قیصر عثمانی کے اس مضمون سے گوئل کی شخصیت کا ایک نہایت دلآویز نقش ابھرتا ہے ۔ سبطین فضلی سے دیوندر گوئل کا تعارف قیصر عثمانی نے کرایا تھا اور دونوں فضلی برادران میں کام کرتے ہوئے گہرے دوست بن گئے تھے ۔ دیوندر گوئل نے اس کا ہمیشہ لحاظ رکھا اور جب بھی قیصر عثمانی معاشی طور پر پریشان ہوئے، گوئل نے ان کی مدد کی، حتیٰ کہ ستمبر ۵۵ء میں انہیں اپنے ادارے سے وابستہ کرلیا اور قیصر عثمانی بھی "وفاداری بہ شرط استواری" پر عمل کرتے ہوئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گوئل سنے کارپوریشن کے ہوگئے "گوئل صاحب اپنے لیے کم دوسروں کے لئے زیادہ جیتے تھے" ۔ انہیں اس سے بڑا COMPLIMENT قیصر عثمانی اور کیا پیش کرسکتے تھے۔

ان شخصیتوں کے علاوہ قیصر عثمانی نے اپنے زمانے کے چند اور مشہور اداکاروں کی یادیں بھی پیش کی ہیں ۔ موتی لال، چندر موہن، سہراب مودی، بلراج ساہنی ۔ موتی لال اور چندر موہن کی یادیں مختصر ہیں، مگر ان کے کردار کا کوئی نہ کوئی رخ ان سے بھی اجاگر ہوتا ہے ۔ سہراب مودی اداکار کے علاوہ فلم ساز بھی تھے اور ایک بڑے اسٹوڈیو کے مالک بھی ۔ بڑی لے دے رہنے والی شخصیت، مگر مہتاب کے عشق نے ان کے اندر کے موم کو پگھلا دیا تھا ۔ بلراج ساہنی کے خاکے میں ان کے ادبی ذوق، سیاست سے شغف، اپنے اصل وطن سے محبت جو اب پاکستان میں ہے، اور اپنے فن کے اظہار کے لئے جان کو ہتھیلی پر لینے کا جذبہ جیسے اوصاف کا ذکر بڑے موثر پیرائے میں ہوا ہے ۔

یہ ہیں وہ شخصیتیں جو قیصر عثمانی کے سجائے ہوئے یادوں کے نگار خانے کی زینت ہیں ۔ اس سے پہلے وہ بعض معروف ادیبوں اور شاعروں پر اسی نوعیت کے مضامین کا مجموعہ "یادوں کا سفر" کے نام سے شائع کرکے داد وصول کرچکے ہیں ۔ اب انہوں نے فلمی شخصیتوں کی یادیں "یادوں کے سائے" کے نام سے پیش کی ہیں ۔ قیصر عثمانی کے نزدیک یہ خاکے نہیں بلکہ یادداشتوں پر مبنی مضامین ہیں ۔ ان کی بنیاد، ذاتی تجربہ اور مشاہدہ ہے ۔ بعض تصویریں ادھوری ہیں کیونکہ مصنف کی یادداشت میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا ۔ شخصیت سے ملنے جلنے، اسے دیکھنے، اسے برتنے میں جو تاثرات مصنف کے ذہن میں آئے ہیں ۔ اس نے نہایت خلوص اور صداقت کے ساتھ دلچسپ اسلوب میں پیش کردیا ہے ۔

اگر کسی شخصیت کی تصویر اس طرح پیش کی جائے کہ اس کی صورت اور سیرت کے خط و خال اجاگر ہوں تو اسے عام طور سے خاکہ نگاری یا مرقع نگاری کہا جاتا ہے ۔ دونوں کی حدود تقریباً یکساں ہیں ۔ یہ بھی یادوں پر مبنی ہوتے ہیں، لیکن اگر صورت اور سیرت کا واضح خاکہ پیش کرنا مقصود نہ ہو اور شخصیت کے تعلق سے صرف یادوں کے چراغ روشن کرنے ہوں تو اس کے لئے آج کل "یاد نگاری" کی ایک اصطلاح مقبول ہونے لگی ہے ۔ اس لحاظ سے قیصر عثمانی کے یہ مضامین "یاد نگاری" کے ذیل میں آتے ہیں ۔ یہ ان کی خود نوشت کے اجزاء بھی ہوسکتے ہیں ۔ بہرحال، اصطلاحوں میں کیا رکھا ہے ۔ یہ مضامین خاکہ نگاری کے ذیل میں آئیں یا یاد نگاری کے، یا انہیں قیصر عثمانی کی اپنی زندگی کی روداد قرار دیا جائے، ان کی دلچسپی سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور اپنی جگہ حقیقت مسلم ہے کہ یہ ان شخصیتوں کو ہمارے سامنے زندہ لا کھڑا کرتے ہیں ۔ یہی ان کی طاقت ہے، یہی ان کی کامیابی ہے !!

بسمل ساہنی
67/C4E/8, Janak puri,
New Delhi - 110058

غزلیں

○

کرتے رہتے ہیں مصنف نت نئی تصنیف بھی
ہوتی ہے ان میں سے کوئی قابلِ توصیف بھی

کیا خبر مل جائیں وہ دل جو جدا ہیں بے سبب
سچے دل سے ہم کریں کچھ کوشش تالیف بھی

آپ اپنا دل محبت سے اگر بھرتے رہیں
خود بخود ہونے لگے گی بغض میں تخفیف بھی

ہیں سبھی آسائشیں دنیا کی انساں کے لیے
اپنے بھاگوں بھوگتا پھرتا ہے وہ تکلیف بھی

ہوتا مذہب ہی اگر بنیاد یکجہتی میاں
ہو نہیں سکتی تھی پاکستان کی تنصیف بھی

دیکھ لینا رقص میں آجائیں گے دیوار و در
ہاں ذرا ناچیز کے گھر لائیں وہ تشریف بھی

شاعری بسمل کی شہرت کا وسیلہ ہی نہیں
اہلِ فن کرتے ہیں اس کے شعر کی تعریف بھی

○

برکھا میں اب کے سال کچھ ایسی جھڑی رہی
زنداں میں دھوپ، ابر کے ہفتوں پڑی رہی

خود سے جدا خیال کی گوہر کڑی رہی
مربوط پھر بھی میری غزل کی لڑی رہی

ہم اپنی دھن میں جانے کہاں سے کہاں گئے
منزل ہمارے واسطے پھر بھی کھڑی رہی

تدبیر سے تو کام نہ کوئی بھی بن سکا
پیروں میں اپنے بخت کی بیڑی پڑی رہی

غم نے تو دل کو اپنا ٹھکانہ سمجھ لیا
آئی کبھی خوشی تو گھڑی دو گھڑی رہی

آنے کو وہ ہمارے مقابل تو آگئے
ان کی نظر زمیں پہ ہی لیکن گڑی رہی

مزدور نے بنائے سبھی کے مکاں، محل
رہنے کو اس کے چھوٹی سی بس جھونپڑی رہی

آخر سخنوری میں ہوئے ہم بھی نامور
محنت ضرور اس میں ہمیشہ کڑی رہی

پھر سے جہاں میں آئے کہیں تو نظر وفا
بسمل کے دل میں، اس کی تمنا بڑی رہی

○

چوکھٹ پہ اس کی جا کے اٹھا اپنے سر سے فیض
سجدوں کے بعد ملتا ہے گر اس کے در سے فیض

کیا کیا زمیں اٹھاتی ہے شمس و قمر سے فیض
تو آسماں کو کچھ بھی نہیں بحر و بر سے فیض

لینے دو سب کو ساقی کے ہاتھوں سے جام سے
میں تو فقط اٹھاؤں گا اس کی نظر سے فیض

میرے تصورات میں آنا پڑا اسے
کس کو ہوا ہے اتنا بھی دردِ جگر سے فیض

تعبیر خواب وصل ملی، آرزو گئی
اچھا ملا ہے دل کو دعا کے اثر سے فیض

سایہ فگن ہمالہ کی چوٹی پہ ہے اگر
پہنچے گا کیا کسی کو بھلا اس شجر سے فیض

کرتی ہے پھر بھی اس کی حفاظت یہ برابر
ہوتا نہیں ہے کچھ بھی صدف کو گہر سے فیض

دل کے مریض کو تو دعائے وصال دو
پہنچے گا کیا اسے تجبہ چارہ گر سے فیض

سب کہہ رہے ہیں رقص ہے بسمل کا دیدنی
واللہ مل گیا ترے تیر نظر سے فیض

سید عطا جالندھری، برمنگھم (یوکے)

غزل

غریبِ شہر کو فکرِ جہاں میں ڈال دیا
میرے خلوص کو کس امتحاں میں ڈال دیا
جو شخص بھی اسے دیکھے بچشمِ نم دیکھے
یہ کیسا درد میری داستاں میں ڈال دیا ؟
مرے وجود کو جس نے جلا کے خاک کیا
وہ ایک شعلہ سا قلبِ تپاں میں ڈال دیا
جسے کچھ واسطہ منزل سے ہے نہ رستے سے
اسے بھی تو نے میرے کارواں میں ڈال دیا
مرے نصیب میں محرومیاں رقم کر دیں
کفن بہار کا دستِ خزاں میں ڈال دیا
یہ کائنات مسخر ہوئی ترے دم سے
کہ رازِ آگہی کون و مکاں میں ڈال دیا
عطا یہ آگ بھڑکتی ہے اور نہ بجھتی ہے
شرر کچھ ایسا میرے استخواں میں ڈال دیا

خاں نثاری غازی پوری
4, Tarachand Dutta Street
Calcutta _ 700073

غزل

ہے کس رہزن کی یہ ہمت کہ لوٹے کارواں میرا
خدا کے فضل سے بچہ ہوا ہے جیواں میرا
سسر بھی ساس بھی ہیں سالیاں بھی اور سالے بھی
مری بیوی کا میکہ بن گیا آخر مکاں میرا
ابھی تک ہوں تو میں بھی بابری مسجد کے فیور میں
بدل جاتا ہے کرسی دیکھ کر لیکن بیاں میرا
میں بزنس مین ہوں بھڑے کی قیمت کس کے لیتا ہوں
جھکاؤں گا وہاں سر فائدہ ہوگا جہاں میرا
کبھی برلا کی جھولی میں ، کبھی ٹاٹا کی جھولی میں
نہ یہ ہندوستاں تیرا ، نہ یہ ہندوستاں میرا
قلم گھسنا مرا پیشہ نہیں ، میں خان صاحب ہوں
اگر ڈنڈا چلاتا ہو تو لینا امتحاں میرا

حفیظ آتش
بھٹی کلاتھ ایمپوریم
بازار شفاعت پوتہ
امروہہ - ۲۴۴۲۲۱

"بے دست و پا"

ملے اوپر کی تینوں بہنیں
کھیل رہی ہیں
گڑیا کو کپڑے پہنا کر
ڈول رہی ہیں
اک دوجے کے
کانوں میں کچھ بول رہی ہیں
مٹی کی کوری ہنڈیا میں
میٹھے چاول ابل رہے ہیں
اور بھری دوپہر میں اماں
آنگن والے دروازے میں
کچھ جاگی، کچھ سوئی سی
خاموش پڑی ہیں
ان خوشیوں میں
پیپل کی اک شاخ سے اترا
کالے پھن والا اک جوڑا
بچے چیخے اماں دوڑیں
گھر آنگن میں شور مچا تھا
سننے والا ان چیخوں کو
دور تلک بھی
کوئی نہیں تھا

"تجدید"

ہر گلی کوچہ و بازار کی
رونق چھینی
اور ویرانی، دل پر
سبھی روئیں سڑکیں
مجرموں کی طرح
سر اپنا جھکائے اشجار
خودکشی کرتے ہوئے
رنج میں ڈوبے افکار
ہو گئے چیخوں کے
بجھتے ہوئے دریا خاموش
ہر طرف خشک ہیں
جذبوں کے سمندر لیکن
جھانک کر دیکھیں
کسی آنکھ میں شاید کوئی
سانس لیتا ہوا
اک خواب کہیں زندہ ہو

"دستور"

کھڑکیاں بند
مقفل ہیں سبھی دروازے
کوئی رشتہ
نہ سماعت کا ہے
آواز کے ساتھ
اور مصلوب ہوئی جاتی ہے
ہر جنبشِ لب
زندگی اپنے تقاضوں سے
پرے سوچتی ہے
کون سا کوہ
اٹھائے
کیسے دستور کہے

بی زیتون

ساجدہ عندلیب رحمن
1/E ابراہیم روڈ۔ خضرپور
کلکتہ۔ ۷۰۰۰۲۳

"اُفوہ! انہیں کس طرح سمجھاؤں کہ ہر رات بنگار اماں کے جسم کا نہیں بلکہ روح کا قتل ہوا کرتا تھا" ۔ بی زیتون کے دماغ میں ایک ہیجان برپا تھا۔ وہ سوچ رہیں تھیں، بنگار اماں کے جسم، اس کی روح اور اس کے ارمانوں کو مجروح کرنے والا بھی کوئی اور نہیں بلکہ اس کا جاہل اور عیاش شوہر بنڈیا ہی ہے۔ اف۔! " بی زیتون پریشان ہو اٹھیں۔ "کتنا مشکل ہے یہ کام۔ کس طرح ان بچوں کے دماغ میں یہ باتیں ڈالوں۔ جو بظاہر نہایت ہی آسان سے سوالات ہیں!"

روزانہ نماز عصر سے فارغ ہو کر جونہی بی زیتون جالی دار دروازے کے قریب بیٹھتیں بستی کے تمام بچے ان کے گرد اکٹھے ہونے لگتے۔ عمر کی پچاسویں منزل گزارنے کے باوجود انہیں بچوں کا مجمع ہی اچھا لگتا۔ لہٰذا وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرا مسکرا کر ان کا خیر مقدم کرتیں! بی زیتون کا سمبندھ لکڑی کی اس پرانی تین منزلہ عمارت سے کافی گہرا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ مکان شیخ مسرور صاحب کی ملکیت تھی۔ شیخ صاحب بستی کے سب سے دولت مند آدمی مانے جاتے تھے۔ نوکر چاکر، عزت، شہرت سبھی کچھ تھا ان کے پاس۔ اور یہ تمام چیزیں اگر موجود ہوں تو رفیقوں و عزیزوں کا جم غفیر نظر آنا لازم ہے! جہاں شیخ صاحب سادگی کا ایک مجسمہ تھے وہاں ان کے رشتے داروں کی عیش و عشرت سے پر زندگی کا کہنا ہی کیا!

مگر۔ مگر۔ دن کیا ہمیشہ ایک جیسے ہی رہتے ہیں؟ ہرگز نہیں! قدرت کے اصول کے آگے انسان کا بس کب چلتا ہے؟ ادھر شیخ صاحب کی وفات ہوئی ادھر تنکے کی طرح ہر شئے بکھر کر رہ گئی اور۔ اور آج ان کی وارث کے نام پر بی زیتون ہی رہ گئیں! لمبا قد، گورا رنگ، چوڑی پیشانی، گھنگھریالے بال اور بے داغ سفید ساڑی۔ انہیں اپنی بستی اور بستی کے لوگوں سے کافی انسیت تھی۔ ان کی اپنی بستی ابراڈین جس کے متعلق انہوں نے یہ بات پھیلا رکھی تھی کہ اس کا نام ابراڈین نامی سمندر کھنگالنے والے ایک جہازی کے نام پر رکھا گیا تھا۔ بھلے ہی ان کی یہ بات درست ہو یا نہ ہو مگر بستی والوں کے درمیان یہ خیال عام تھا کہ نہ صرف بی ہر فن میں مہارت رکھتیں ہیں بلکہ ان کی جانکاری بھی وسیع ہے۔ ان کی قابلیت پر نہ ہی کسی کو شک تھا اور نہ ہی تعجب! تعجب اگر تھا تو ان کے خیالات پر جو یہاں کے کھلے آسمان اور کھلے سمندر جیسے تھے۔ وہ کہتیں "آسمان کوئی چیز نہیں بلکہ ہمارے سروں پر آئینوں کا شامیانہ ہے اس کا نیلا رنگ۔ سمندر کے پانیوں کا عکس ہے۔ اور۔ اور۔ ہر رات روشن ہونے والے ستارے ہمارے جزیرے ہیں!" یہ کہتے ہوئے اکثر ان کی بھنویں تن جاتیں اور سینہ پھولنے لگتا۔

"بی! ان میں ہمارا جزیرہ کون سا ہے؟" بچے ان سے پوچھتے۔

"ہمارا جزیرہ؟" وہ مسکراتیں۔ پھر شہادت کی انگلی اٹھا کر اشارہ کرتیں "وہ رہا!"

"وہ؟" بچے خوشی خوشی ان کی انگلی کی پوروں پر گھومتا ہوا اپنا جزیرہ دیکھنے لگتے۔ دیر تک وہ بھی ان کے ہمراہ اپنا جزیرہ دیکھنے میں محو رہتیں۔ پھر اپنے شانوں کو حرکت دے کر دور دور تک نگاہ دوڑانے کی کوشش کرتیں۔ ان کی نظریں گردش کرتی ہوئی حسینہ چاچی کے کھلے صحن میں کھڑے املی کے درخت سے ٹکرانے لگتیں!

"یہ درخت اتنا شاداب کیوں ہے؟"

"نہیں معلوم؟ تعجب ہے! ارے پاگلو اس پر پریوں کا ڈیرہ ہے!" وہ سنبھل کر بیٹھ جاتیں اور ان کا داہنا ہاتھ تسبیح پر چلنے لگتا۔

"سچ؟"

"بالکل سچ! لال پری - سبز پری - نیلم پری - اور - اور - گوہر پری - پریوں کی رانی!" وہ آنکھیں نکالے انہیں یقین دلانے کی کوشش کرتیں۔

"صرف پریوں کا ہی نہیں بلکہ اس پر جن و آسیب کا بھی عمل ہے!" بچوں کا تجسس تو بڑھ جاتا مگر ان کے حلق خشک ہونے لگتے اور سہمے سہمے سے وہ ایک دوسرے کے قریب بڑھ آتے ۔! "اب ان سے ڈرنا کیا؟ ہمیں تو صرف ان سے خبردار رہنا چاہیے! وہ دانتوں پر دانت جمائے انہیں تنبیہہ کرنے لگتیں!

"وہ کس طرح؟ دل و دماغ کو قابو میں لاکر بچے سادہ لوحی سے پوچھتے!

"ان بلاؤں کا دخل بعد مغرب اکثر ہوتا ہے ۔ اور ہاں ایک بات کا خیال رہے کہ انہیں لمبے اور کھلے ہوئے بال بہت پسند ہیں ۔ اگر تم بالوں کو کھولے یہاں سے گزرو گے تو وہ تمہارے پیچھے پیچھے ہی آجائیں گے ۔ لہٰذا ان سے بچنے کے لئے کبھی مغرب کے بعد بال کھولے اس درخت کے نیچے سے مت گزرنا ۔ خبردار ۔ ہرگز نہیں!" یہ کہتے ہوئے ان کی انگلیاں مزید تیزی سے گردش کرنے لگتیں!

"تمہیں کچھ علم ہے؟" وہ خاموش ہو جاتیں ۔

"کیا؟" بچے ان کی خاموشی توڑنے کی کوشش کرتے!"

"ان حسینہ بی پر بھی ان بلاؤں کا ہی اثر ہے! دیکھتے ہیں ان کا دماغ آٹھوں پہر ساتواں آسمان پر جو رہتا ہے" یہ کہتے ہوئے موہنہ دبائے مسکرانے لگتیں!

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی ۔ نورن خالہ کا گھر بھی تو ۔!" بچے پوچھتے ۔

نورن خالہ ۔ آٹھ جوان بچوں کی ماں ۔ اب بھی وہی لگتیں ۔ وہی بھولپن ۔ وہی سر تال ۔ اور وہی گن ۔!"

"ہونہہ! نورن خالہ ۔! کامروپ اور کچھا کے نام سنتے ہو؟" وہ بات کو طول دیتے ہوئے پوچھتیں ۔ بچے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہتے!

آں ۔ کامروپ اور کچھا ۔ نہیں!

"حد ہو گئی ۔ پھر تو تم یہ بھی نہیں جانتے ہوگے کہ کامروپ اور کچھا انہی دو جگہوں کے نام ہیں جہاں جیتے جاگتے انسانوں کو جانور بنا دیا جاتا ہے!"

"اچھا؟" وہ متحیر ہو کر پوچھتے!

"یہ سب جادو سے ہوتا ہے!"

"جادو ۔ ہاں! اب سمجھ میں بات آگئی ۔ ہر روز کاندھے پر بڑی سی جھولی ٹانگے ہماری گلی سے عليل نانا گزرتے ہیں ۔ آپ نے ہمیں بتایا تھا کہ ان کی جھولی میں جادو کی ٹوپی ۔ جادو کی چھڑی اور جادو کی بانسری ہے ۔ شاید انہیں کی ہتھیلی میں کامروپ ہے! اور ۔ ان کی چھڑی، ٹوپی اور بانسری میں ہی کچھا ہے ۔ ہاہاہا ۔! وہ قہقہے لگاتے ہوئے تالیاں بجا بجا کر گانے لگتے!

پاگل نانا ۔ جادو کا دیوانہ

جھولی لٹکائے ۔ گاتا جادو کا ترانہ ۔ جادو کا ترانہ!

بس بس بس! بی زیتون ہنسی سے دوہری ہونے لگتیں!

"ہاں! تو میں کہہ رہی تھی کہ نورن بی کے گھر کی لمبی سے سیڑھی میں بھی کامروپ کچھا کے جادو کا اثر ہے! وہ کچھ دیر سوچنے لگتیں ۔ پھر کہتیں!

"یہ گنڈہ! انہوں نے بچوں کو بس میں کرنے کی خاطر چلا رکھا ہے!"

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لئے کہ اس سیڑھی سے ہوتے ہوئے کوئی بھی بچہ ان کے گھر جائے تو بس انہیں کا ہو کر رہ جائے" یہ کہتے ہوئے وہ کنکھیوں سے بچوں کی

جانب دیکھتیں اور معصوم سر ہلا ہلا کر ان کی باتوں پر یقین کرنے لگتے!

اس طرح بی زیتون اور بچوں کی سالہا سال کی دوستی نے ان کی ذات میں تشنگی کا وہ بیج بو دیا کہ اس کا انکور پودے سے تناور درخت بننے کی دھمکیاں دینے لگا۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ قریب سے قریب تر ہوتے گئے!

ایک شام خلاف توقع بی زیتون کا صحن خالی تھا۔ نہ ہی وہاں بچے موجود تھے، نہ ہی بی زیتون تھیں اور نہ ہی وہ دلچسپ کہانیاں! بستی والے بنڈیا کے گھر کے پاس جمع تھے۔ بنگار اماں کی فلک شگاف چیخ ایک عجیب و غریب سماں باندھ رہی تھی۔ بنڈیا۔ بنگار اماں کا شرابی شوہر لڑکھڑاتے قدموں کو سنبھالتے ہوئے اس کو خاموش ہونے کے لئے کہہ رہا تھا۔ "نی شیم۔ گودانی چیتس!" وہ اپنی مادری زبان میں اسے کچھ کہہ رہا تھا۔ بی زیتون کے ہاتھ اب بھی تسبیح پر چل رہے تھے۔ بچے آپے سے باہر بنگار اماں کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

"گودانی چیتس!" بنڈیا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا اور وہ غصے سے بھیڑ کو چھٹنے کا اشارہ کرنے لگا! مگر بھیڑ تھی کہ بڑھتی ہی جارہی تھی اس کی پرواہ کئے بغیر بنگار اماں زار و قطار رونے لگیں۔ اس کے زخم رسنے لگے اور درد بتدریج بڑھنے لگا۔ بنگار اماں کو اس حالت میں دیکھ کر بنڈیا موہنہ کھولے مسکرانے لگا۔ اس کی زہریلی مسکان، لڑکھڑاتے قدم و شراب کی بدبو بنگار اماں کے ذہن میں پھیلنے لگی۔ اور لمحہ بہ لمحہ اس کی روتی آنکھیں خوں رنگ ہونے لگیں۔ یک بیک وہ اپنی پوری طاقت سے بنڈیا پر حملہ آور ہو گئی۔

"حرامی۔ سالے۔ شرابی۔ عورت سے پیشہ کرواتا ہے۔ ماتا کو کولہبر میں موتا کر راجہ بنتا ہے۔ بیوڑا۔ ماں کے بھڑوے!" یہ کہہ کر اس نے اپنی گرفت مضبوط کر ڈالی۔ بنڈیا کی گردن پوری طرح اس کے شکنجے میں تھی۔ پکڑ سخت سے سخت ہوتی جارہی تھی۔ گردن بنڈیا کی ہی سہی مگر بنگار اماں کے لئے یہ گردن اس بے غیرت شخص کی تھی جس نے اس کے دامن کی پاکیزگی کو داغدار کر کے رکھ دیا تھا۔ یک بیک بھیڑ پر سکتہ طاری ہونے لگا اور بچے مبہوت نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ بی زیتون بھی بنگار اماں کی غیر متوقع جرأت دیکھ کر گنگ تھی۔ غیر مہذب آہنی شکنجے میں پھنسی گردن ایسی دبی جارہی تھی کہ زبان باہر نکل آئی۔ اور۔ اور۔ آنکھوں کے لٹو گڈھے سے باہر نکل آئے!

"ارے اس حرام زادی کو روکو تو سہی۔ آگے بڑھ کر اس شرابی کو بچالو۔!" چاروں طرف شور مچنے لگا۔ پھر یہ شور بلند سے بلند تر ہونے لگا! اچانک ہی ایک زور دار ڈنڈا بنگار اماں کے دونوں گٹو پر ٹھک سے پڑا۔ کسے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے اور بے جان جسم ایک طرف لڑھک گیا۔ پولیس کا سپاہی آگے بڑھ کر ڈنڈے کو فضا میں لہرا لہرا کر بھیڑ کو تتر بتر کرنے لگا۔

"Oh ! He is dead!" وہ زمین پر پڑے بنڈیا کو دیکھتے ہوئے بولا یہ دیکھ کر دور جیپ میں موجود دوسرے سپاہی بھی قریب بڑھ آئے!

"سالی! بدمعاش عورت نے اپنے شوہر کو ختم کر ڈالا"۔

"یہ عورتیں! بھگوان بچائے ان سے!"

"ارے۔ کسی اور کے ساتھ اس کا چل رہا تھا!"

"بدمعاش تھی۔!" لوگوں کے درمیان چہ میگوئیاں ہونے لگی!

"پاگل عورت ہے۔ سالی!" مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے ایک سپاہی بولا!

"نہیں۔ یہ سب جھوٹ ہے یہ سب جھوٹ ہے! بکواس ہے!" وہ چیخ چیخ کر سر کے بال نوچنے لگی۔ اور۔ پھر۔ شدت جذبات سے نڈھال ہو کر زمین پر لوٹنے لگی!

"وہ کمینہ۔ ہر رات ایک نیا مرد ساتھ لے کر آتا۔ مجھے آگمات پہنچاتا۔ پھر بے جان کھلونے کی مانند اس کے حوالے کر دیتا۔ بتاؤ پاگل کون ہے" میں یا وہ؟ بدمعاش کون ہے؟ وہ یا میں؟"

"بتاؤ؟ بتاتے کیوں نہیں! وہ للکار کر سپاہی سے بولی!

"نہیں بتاسکتے نا؟" وہ کھوئی ہوئی نظروں سے یوں ادھر ادھر دیکھنے لگی جیسے کوئی آسمانی طاقت وہاں نمودار ہو کر اسے اپنی آغوش میں دبوچ لے گی!

"ہا۔ہا۔ہا!" قہقہے لگانے لگی پھر خود کو سنبھالتے ہوئے زمین سے اٹھی اور سپاہی کے سامنے کھڑی ہو کر ایک دلدوز چیخ نکالنے لگی "ہو۔ہا۔ہا اور اپنا سینہ ٹھونک کر کہنے لگی!

"جب میری بتیا ہوتی تھی تو کوئی سالا اف بھی نہیں کرتا تھا۔اور۔آج" اس کی بتیا ہو گئی تو دیکھو کتنے ہمدرد یہاں آن موجود ہو گئے۔ہا۔ہا۔ہا۔ قانون کے رکھشک بھی ہیں۔"طنز کی آمیزش لئے اب بھی اس کے قہقہے بلند ہو رہے تھے!

"آج پولیس کے سپاہی شان سے اپنے آپ کو قانون کے محافظ کہہ رہے ہیں۔کیونکہ آج ایک مرد مارا گیا ہے۔وہ بھی ایک کمزور عورت کے ہاتھوں" وہ نہایت ہی رازدارانہ لہجے میں بی زیتون کے قریب سر کو جھکاتے ہوئے بولی "مردوں کو اتیاچار کرنے کا حق ہے! ہا۔ہا۔ہا۔وہ کیوں ہے معلوم "وہ اس لئے کہ دنیا مردوں کے لئے بنی ہے۔یہاں کے قانون بنانے والے بھی مرد ہیں۔عورتوں پر ظلم کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ہا۔ہا۔ہا!"

"چلو۔چلو۔زیادہ صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں"۔سپاہی بنگار اماں کی جانب بڑھنے لگا۔وہ اب بھی بانہیں پھیلا پھیلا کر زوردار لہجے میں اپنی صفائی پیش کر رہی تھی۔اس کی پرواہ کئے بغیر سپاہی نے اسے ہتھکڑی پہنادی اور گھسیٹتا ہوا جیپ کے قریب لے آیا۔بنڈیا کی لاش اب بھی زمین پر پڑی ہوئی تھی۔شراب کی بدبو فضا میں پھیل رہی تھی۔وہ لاش کی طرف دیکھنے لگی۔پھر حقارت سے نظر پھیر لی۔"آخ۔تھو!"

"کمینی۔حرامزادی۔فاحشہ۔اگر وہ شرابی بھی تھا تو کیا ہمرد تھا اپنی کمائی کی پیتا تھا!"

"اری۔اپنی عورت کس کا ساتھ دے سکتی ہے؟" حرامی۔سالی! لوگ اپنی بھرپور آواز میں اسے موٹی موٹی گالیاں دے رہے تھے! رفتہ رفتہ جیپ کی آواز گم ہونے لگی۔تاریکی بڑھنے لگی۔اور بنگار اماں کی جانب بھی ہر سو اندھیرا چھانے لگا!

بی زیتون کا سکتہ ٹوٹا۔بچوں کی آواز شور کی طرح اٹھنے لگی۔وہی سوالات!

"بولیے نانی۔بنگار اماں نے بنڈیا کا خون کیوں کر دیا؟

"کس طرح ہر رات بنڈیا کے ہاتھوں بنگار اماں کی بتیا ہوتی تھی؟"

"وہ مرتی کیوں نہ تھی بنڈیا کی طرح۔بنڈیا پھر زندہ کیوں نہ ہوا بنگار اماں کی طرح۔کیوں؟ کیوں؟"

بی زیتون اضطراب سے ادھر ادھر دیکھنے لگیں "کیا جواب دوں؟ کیا کہوں؟ ہاں!" اچانک ایک ہلکا تبسم ان کے لبوں پر ابھرنے لگا! ان کا ذہن روشن ہونے لگا اور انہیں ذرہ ذرہ دکھائی دینے لگا۔

"یہ تو اسی املی پیڑ والے آسیب کا کرشمہ ہے!" وہ بول اٹھیں

"ہاں! میری بات نہ مان کر بنگار اماں بالوں کو کھولے مغرب کے وقت اس پیڑ کے نیچے سے گزر گئی۔بس اسی وقت آسیب کا سایہ اس پر ہو گیا۔ پھر۔وہ اس کی زد میں آکر بنڈیا کو زدوکوب کرنے لگی۔آسیب بہت طاقتور ہوتے ہیں۔بنڈیا اس کی مار کی تاب نہ لاسکا اور مر گیا۔ہمیشہ کے لئے!

"سچ؟" بچے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ان کی پیشانی پر ننھی ننھی بوندیں چمکنے لگیں اور ایک خوف بھری نگاہ سے بار بار املی کے پیڑ کو تکنے لگے۔انہیں بی زیتون کی باتوں کا یقین آگیا تھا۔بی زیتون کو لگا کہ ان کے دل کی دھڑکنیں جو کچھ دیر قبل یک لخت بند ہو گئیں تھیں۔ پھر اسی تیز رفتاری سے چلنے لگی ہیں"۔

"ہا۔ا" انہیں اطمینان ہونے لگا اور ان کے ہاتھ تیزی سے تسبیح دانوں پر گردش کرنے لگے!

غوث شریف عارف
مکان نمبر ۳۳۹۶، املی والا چوک
باری پورہ، جے پور ۔ ۲، راجستھان

غزل

دنیا کا عیش سارا کبیروں میں بٹ گیا
لیکن غم حیات صغیروں میں بٹ گیا

اک زعم خود سری تو امیروں میں بٹ گیا
اقلیم ہوش سارا وزیروں میں بٹ گیا

کاسہ لیے کھڑے تھے وہاں خسرو زماں
ترکہ مگر سلف کا فقیروں میں بٹ گیا

وحدت بکھر کے کثرت انبوہ بن گئی
میرا وجود جب سے ضمیروں میں بٹ گیا

میرے تخیلات نے جس کو کیا رقم
ہر لفظ زندگی کا نظیروں میں بٹ گیا

تیرے کرم سے جو بھی ملا فصلِ گل ہمیں
ترکے میں وہ تو سارا اسیروں میں بٹ گیا

چتنے گریز پا ہوئے لمحے نشاط کے
میرا نصیب اتنی لکیروں میں بٹ گیا

کیوں شکوہ سنج اہل چمن ہو رہے ہیں آج
خاروں کا تاج جب کہ اسیروں میں بٹ گیا

عارف ہمیں ہے ناز کہ اس دور حشر میں
اپنا خلوص سارا ظہیروں میں بٹ گیا

شکیل گوالیاری

غزل

یہ زندگی ہے خدا داد رکھ سکے تو رکھ
بڑا شریر ہے ہمزاد رکھ سکے تو رکھ
وجود تیرے ہی گھر میں ہے چار نسلوں کا
ہر ایک فرد کا دل شاد رکھ سکے تو رکھ
تری زمین بھی سورج کے گرد گھومتی ہے
تو اپنے آپ کو آزاد رکھ سکے تو رکھ
جہاں کسی کی حکومت نہ ہو خدا کے سوا
وہاں مکان کی بنیاد رکھ سکے تو رکھ
کسی ترازو میں اتنی نہیں ہے گنجائش
زباں کی نوک پہ فریاد رکھ سکے تو رکھ
شکیل مجھ کو بھلا دے تو کوئی بات نہیں
نصیحتوں کو مری یاد رکھ سکے تو رکھ

ڈاکٹر پی کے سریواستو مجاز جے پوری
27 _ D ویونگر ۔ جے پور (راجستھان)

غزل

کچھ اس اد سے ہوا وہ خیال میں شامل
سوال جیسے ہوا ہو سوال میں شامل
شکست جام سے روشن ہے میکدہ یعنی
جمال یار ہے شیشے کے بال میں شامل
مزاج گیسوئے جاناں ہے دوش پر غالب
نظام گردشِ دوراں ہے حال میں شامل
قبول ترک تعلق کا فیصلہ لیکن
حضور آپ بھی ہوں گے مآل میں شامل
نہ نیند ہی ہمیں آتی، نہ آنکھ کھلتی ہے
ہوئے ہیں شام و سحر اعتدال میں شامل
چراغ شام ہی تنہا سحر نصیب نہیں
دعائے شب ہے ہمارے بھی حال میں شامل
مجاز ڈھلتی ہوئی شام زندگی کے سوا
نہیں ہے کوئی بھی میرے زوال میں شامل

بنگلہ ۔ سوکانت بھٹاچاریہ
اردو ۔ تسلیم نیازی
عالم نگر، برنپور ۔ آسنسول ۲۵

کشمیر

دم گھٹنے والا کہرہ اب نہیں
نہ اب وہ ذلت آمیز برف باری ہے
سورج نے چھو لیا ہے اس جنت ارضی کو
بیدار آنکھیں متحیر ہیں
برف کا پردہ تار تار ہو گیا ہے
زرد / خشک پتے اڑ چکے ہیں
دھوپ کو مدعو کیا ہے اس لالہ زار نے
کشمیر نے اپنا تیور، بدلا ہے
جمال میں آج جلال گھل آیا ہے
پگھلی ہوئی برف میں
زندگی کا ارتعاش در آیا ہے
سمندری ہواؤں میں اس کی زلفیں اڑ رہی ہیں
جیسے برہم ہوں
سرو، صنوبر اور چنار کے باغوں میں
آج ناراضگی ہے
آندھی کے ہم مزاج ہیں آج سب
کشمیر آج یخ بستہ نہیں
اس کی حرارت آج ساری دنیا محسوس کر رہی ہے
سینے میں اس کے
غم و غصہ کی ندیاں امڈ رہی ہیں
منقلب کشمیر کی تیز و تند ہواؤں میں
سیاہ آندھی کا پرچم آسمان کو چھو رہا ہے
ازل سے خوابیدہ، بے موت و صدا ہمالیہ کے سینے میں
آج نئی دھڑکن بیدار ہوئی ہے

صلاح الدین نیر
"کہکشاں" 11_3_824/7
نیو ملے پلی۔حیدرآباد

غزلیں

○

شعر کہتا ہوں ہمیشہ سچ کے طرز عام سے
ہر غزل کی ابتداء کرتا ہوں تیرے نام سے

صبح تو ہونے لگی ہے جانے کیا انجام ہو
دل بہت گھبرا رہا ہے روشنی کے نام سے

آپ سے ہم مطمئن تھے دشمنی جاتی رہی
پھر کوئی دھوکہ نہ دینا دوستی کے نام سے

کاسہء دریوزہ لیکر اہل فن کے ہاتھ میں
زندگی سوئی ہوئی ہے کس قدر آرام سے

مجرموں کی طرح کب تک ہم پس پردہ رہیں
کب تلک نیر جئیں گے مصلحت کے نام سے

○

یوسف ہوں محبت کا خریدار نہیں ہوں
میں اپنی جگہ بزم ہوں بازار نہیں ہوں

جب بھیگی ہیں پلکیں تو بڑھتے ہیں خود آنچل
ویسے کسی دامن کا طلبگار نہیں ہوں

میں دیکھ لیا کرتا ہوں آنکھوں کو تمہاری
جب رند یہ کہتے ہیں کہ مے خوار نہیں ہوں

یہ بات کبھی صاحب گلشن ہی سے پوچھو
میں مجرم ویرانیء گلزار نہیں ہوں

اک ایسا بھی وقت آیا ہے چاہت کے سفر میں
میں آج خود اپنا بھی پرستار نہیں ہوں

کچھ ربط ہی ایسا ہے چلا آیا ہوں نیر
تم یہ نہ سمجھنا کہ میں خوددار نہیں ہوں

کنور بہادر سنگھ سوز

جنگ کی غارت گری

ہیں دھماکے اور دھواں پیہم اٹھے ہر سو کراہ
حال گیتی دیکھ کر حیرت زدہ ہیں مہر و ماہ

ہورہا باراں بلاؤں کا ہے ملتی ہے نہ راہ
ہے در بتخانہ کس جا کس طرف ہے قبلہ گاہ

کیا شجر کیا آدمی کیا ہیں چرند اور کیا پرند
ہم نہ چھوڑ دیں گے وہ کہتے تھے کہیں زندہ گیاہ

پیر و طفلاں مرد و زن لاکھوں ہیں دم سادھے ہوئے
دشمنوں کے شہر پر ہیں ٹوٹ پڑنے کو سپاہ

گونج اٹھتے ہیں فضا میں قہقہے ابلیس کے
ہے لپٹ اٹھتی جہاں تک اپنی جاتی ہے نگاہ

پھٹ پڑا بارود ضائع ہوگئے ہیں دست و پا
ہو دعائے مغفرت کیا منہ سے جب نکلے نہ آہ

عابد جعفری
ٹورنٹو۔کنیڈا

غزل

لہو ہر موج میں شامل کروں کیا
میں نذر دوریء ساحل کروں کیا

شعور و آگہیِ شب سے نکلے
میں نور صبح سے حاصل کروں کیا

مرے حلقوم پر ہے میرا خنجر
تو اب میں شکوۂ قاتل کروں کیا

مرا ایمان ہے انساں نوازی
تو اس ایمان کو باطل کروں کیا

میں ہر غم کی دوا بن جاؤں کیسے
بہت ہے کام یہ مشکل کروں کیا

میں اس کی بزم میں کیوں کر نہ جاؤں
مرے بس میں نہیں ہے دل کروں کیا

گناہ

شمشاد ندیم
ای / ۲۲ مہناری سرائے
دھام پور یو۔پی 246761

ایسا نہ تھا کہ نماز آ آنٹی نے یہ کام پہلی مرتبہ کیا ہو۔ ان سے پہلے ہی محلہ کا ہر گھرانا تقریباً اپنی حیثیت کے مطابق اس کام کو انجام دے چکا تھا۔ لیکن آج نماز آچچی کبیر ہو یا شریف سریش ہو یا سردار دیال سنگھ کا گھر وہ سبھی گھروں میں موضوع بحث بنی ہوئی تھیں۔ یہ ممکن نہ تھا کہ آنٹی دنیا کی چمک دمک سے متاثر ہو گئی ہوں لیکن پھر ان کے دنیاوی اعمال میں ایسا کچھ تو تھا جس کی وجہ سے سبھوں کے لبوں پر ان کا ذکر رہا کرتا تھا۔

آنٹی کو یہ لقب یونہی نہ ملا تھا بلکہ سالوں تک انہوں نے اس کے لئے صدق دل سے جدوجہد کی تھی۔ جس دن سے شادی ہو کر سسرال میں قدم رکھا وہ دن اور آج کا دن مجال کبھی نماز قضا ہوئی ہو ہر وقت دینی کاموں میں لگی رہتی تھیں۔ شام کے وقت محلہ کی عورتوں اور بچوں کو دین کی تعلیم دیتی تھیں۔ ایسا نہ تھا کہ شادی کے بعد وہ اپنی شان بنانے کے لئے یہ سب کرتی ہوں وہ بچپن سے ہی مذہبی واقع ہوئی تھیں۔ ان کا خاندان ہی خالص دینی روایتوں کا پابند تھا۔ جس کا اثر ان کی شخصیت پر ہمیشہ رہا تھا۔

لیکن واہ ری تقدیر ! چچی نماز آ کی دنیاوی تقدیر کس قدر کمزور ثابت ہوئی کہ شوہر ملا تو ماڈرن قدروں کا دلدادہ، سنیما جانا، ٹی۔وی، اسٹیج پروگرام اور مشاعروں کا شوقین چچی جب بھی ان کو دین کی جانب راغب کرتیں وہ انہیں پیار سے ٹال دیتے۔ شروع میں تو یہ سلسلہ روایتاً چلا لیکن جب چچی کی جانب سے دین کے فروغ کا سلسلہ گھر اور ان کی اپنی حدود لانگھ کر محلہ میں داخل ہوا تو چچا کو چچی کے مزاج سے بڑی کوفت پیدا ہوئی۔ چچی کا اپنی حدوں تک دین کی پابندیاں کرنا تو ان کو قبول تھا پر ان سے یہ برداشت نہ ہوا کہ وہ جب بھی گھر میں تھکے ہارے سے داخل ہوں تو ہر وقت کانوں میں محبت سے لبریز کھنک دار آواز کی جگہ دین کی باتیں اور توحید کا ہی درس گونجتا رہے۔ وہ تو یہ چاہتے تھے ان کی بیگم اپنی حدوں تک توحید کی پابندیاں کریں۔ تعلیم دین کے لئے محلے کی عورتوں اور بچوں کی بھیڑ ان کے یہاں ہی کیوں اکٹھا ہو۔

شام تو ان کے خوابوں کا حسین جزیرہ تھی۔ ہر سرمئی شام کو وہ چچی نماز آ کے ساتھ عشق میں پوری طرح ڈوب کر گزارنا چاہتے تھے۔ جیسے کہ شادی کے بعد شروع میں کچھ دن انہوں نے گزارے تھے۔ لیکن چچی کا ماننا تھا کہ خدا نے دین اور دنیا کا جتنا علم ان کو بخشا ہے وہ اسے اس کے حقداروں کو پہنچاتی رہیں اور اس طرح خوشگوار ازدواجی زندگی کے ساتھ دینی فرائض بھی پورے کرتی رہیں۔

ادھر جب سے چچی کا دینی تعلیم کا سلسلہ بڑھ گیا تو چچا کا گھر سے غیر حاضر رہنا رات کو دیر سے گھر واپس لوٹنا، اکثر شوکت میاں کے گھر رنگین ٹی۔وی کے سامنے گھنٹوں بیٹھے رہنا بڑھ گیا۔ مشاعروں اور اسٹیج پروگراموں میں شامیں بتانا ان کا عام معمول بن گیا۔

ایسا نہ تھا کہ وہ ٹی۔وی نہ خرید سکتے ہوں بلکہ وہ تو کئی بار گھر میں رنگین ٹی۔وی لانا چاہتے تھے۔ لیکن چچی نے دین کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ کر ٹی۔وی گھر میں لانے کی مذمت کی تھی۔ بلکہ اب تو ریڈیو بھی ان کے گھر خبریں سنانے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔

ادھر چچا رات کے گیارہ بجے گھر آتے۔ صبح جلدی کام کے لئے نکل جاتے۔ اب تو درمیان میں بھی وہ گھر نہیں آتے تھے۔ رات گئے گھر آتے کھانا

کھا کر چپ چاپ سو جاتے ۔ چچی نمازآ نے پہلے تو سوچا کہ کام کی زیادتی ہو گئی ہے لیکن آہستہ آہستہ جب چچا کا یہ معمول ہی بن گیا تو چچی کو گمان ہوا کہ چچا کچھ روٹھے سے رہتے ہیں رسماً بات چیت سے آگے بات ہی نہیں کرتے ۔

ان کا دل اپنی خامیاں تلاش کرنے لگا انہیں اپنے اعمال و کردار میں کوئی خامی نظر نہ آئی وہ راتوں دعائیں مانگتی رہتیں ، کروٹ لئے آنسو بہاتی رہتیں ۔ لیکن چچا کو ان کی بے بسی اور بے چینی کا علم نہ ہوا اس کیفیت کو جب مہینوں گزر گئے تو انہوں نے ایک بار پھر اپنے دل و دماغ پر زور ڈالا کہ " اے خدا ! مجھ سے کہاں غلطی ہوئی ہے ۔ میری زندگی میں تو خدا اور مجازی خدا کے سوا کچھ بھی نہیں ۔ وہ اپنا کوئی ایسا گناہ نہ تلاش کر سکیں جس کی انہیں سزا مل رہی تھی ۔ راتوں کا سکون دن کا چین ان سے روٹھ گیا ۔ سوچتے سوچتے ان کا ذہن ماؤف ہو گیا ۔ کچھ ہی دنوں میں ان کا رنگ پھیکا پڑ گیا ۔ سوچ کی پرچھائیاں مستقل ان کے چہرے پہ رقص کرنے لگی تھیں ۔

وہ ایک رات کروٹ بدلے اپنی کم نصیبی پہ آنسو بہا رہی تھیں چچا ابھی گھر واپس نہیں لوٹے تھے کہ اچانک ان کے دل میں ایک خیال آیا ۔ اپنے آپ کو چچا کے دل میں ہمیشہ کے لئے آباد کر لینے کا خیال چچا کے ساتھ ہر شام سہانی اور یادگار بنانے کا خیال ۔

جو کام ان کی دعائیں نہ کر سکیں اسے کرنے کے لئے اور اپنی زندگی کی دنیاوی راتوں میں قمقموں اور جگنوؤں کی مانند جھلملاہٹ لانے کے لئے انہوں نے ایک گناہِ عظیم کرنے کا فیصلہ کیا ۔ اس سے پہلے شاید تصور میں بھی انہوں نے اتنا بڑا گناہ کرنے کی نہ سوچی تھی ۔

لیکن واہ رے خدا ۔ تری خدائی .... تو نے عورت کو زندگی کے کئی موڑوں پر اس قدر کمزور بنا دیا کہ وہ تیری ذات کے مقابل ان موڑوں پر شوہر کو فوقیت دیتی ہے اور چچی نمازآ کی مانند زندگی میں کئی عظیم گناہ کرنے پہ مجبور ہوتی ہے آخر تو نے اسے کمزور کر کے آدم کو بہکانے کا بدلا لے ہی لیا ۔

یہ خبر جب میرے کانوں میں پڑی تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے نمازآ چچی سے ملنے کا ارادہ کیا ۔ وہ ہماری بھابی تھیں ۔ لیکن محلے کے تمام بچوں نے ان کی پاک دامنی اور عبادت کے ذریعہ انہیں چچی نمازآ کا لقب اس انداز میں عنایت کر دیا تھا کہ گویا وہ ہمیشہ سے چچی نمازآ ہی ہوں ۔ اس معاملے کی صحیح جانکاری کی خاطر میں نے اسی وقت ان سے ملنا ضروری سمجھا ۔

حالانکہ چچی کو اس گناہ کو کئے ہوئے ابھی قریب چار ہی گھنٹے ہوئے تھے لیکن ان چار گھنٹوں پہلے کئے گئے گناہ سے وہ اتنی مشہور ہو گئی تھیں کہ شاید چار سو سالوں کی عبادت کے بعد بھی مقبول نہ ہوتیں ۔ دوپہر ڈھلنے کو تھی ۔ میں ان سے ملنے چل پڑا ۔

ٹرن ..... ٹرن ..... ٹرن ..... دروازے پہ لگی گھنٹی کے خاموش ہوتے ہی اندر سے ایک نسوانی آواز آئی جو یقیناً بوڑھی تائی جی کی تھی ۔ " کون ہے " " میں ہوں تائی جی شہاب ، کچھ لمحوں بعد دروازہ کھلا ۔ تائی جی مجھے لے کر ڈرائنگ روم میں آگئیں ۔ ہر چیز سلیقے سے اپنی جگہ لگی تھی " بیٹھو بیٹے " اور بتاؤ کیسے آج سہ پہر ہماری یاد آئی ۔ " بس تائی جی یوں ہی چلا آیا " نہیں بیٹے تم تو اکثر شام کے اوقات میں آتے ہو ضرور تم بھی بہو کے اس عظیم گناہ کے سلسلے میں بات کرنے آئے ہو گے " محلے کی بہت سی عورتیں بہو سے ملنے آ چکی ہیں لیکن بہو نے ابھی کسی کا سامنا نہیں کیا ۔ شاید تم سے کوئی بات کر لے ۔ اس گھر کے لئے بیچاری کس قدر محنت کرتی ہے لیکن بڑا نالائق بیٹا ہے کہ بہو کی خوبیاں ہی اس کو خامیاں لگتی ہیں ۔ میں بہو کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں وہی تم کو بہتر بتا سکتی ہے کہ اس نے یہ گناہ کیوں کیا ؟؟؟

عادتاً دانشمندانہ باتیں کر کے تائی جی چلی گئیں ابھی میں اپنے حواس درست نہ کر پایا تھا کہ نمازآ چچی اپنا افسردہ وجود لئے اپنے مخصوص انداز میں کمرے میں داخل ہوئیں ۔ میری نظروں کو یقین نہ ہوا کہ انہوں نے اتنا بڑا گناہ کیا ہے ۔ وہی چہرے کی افسردہ سی پاکیزگی ، سر پر آنچل ، وہی چہرہ وہی قد و قامت سب کچھ تو وہی تھا بالکل محلے کے بچوں کی چچی نمازآ والا ۔!!! .... پھر سارے محلہ کے لوگ ان کو بدنام کرنے پہ کیوں تل گئے ہیں ۔

ارے یہ کیا ۔ ان کا گناہ تو مجھے بھی ڈرائنگ روم میں سجا نظر آگیا ۔ یقین نہیں ہو تا شاید اس لئے ان کی آنکھیں مسلسل جھکی ہوئی ہیں ان کا چہرا اس لئے شاید بے حد غمگین ہے ۔ شاید گناہ کا احساس ان کے ضمیر کو ڈس رہا ہے میرا ضمیر چیخ اٹھا ۔

آخر انہوں نے یہ گناہ کیوں کیا ؟ ذہن میں اٹھتے طوفان کی لہروں نے سرپٹک پٹک کر دم توڑ دیا اور یہ خاموشی جب گراں گزرنے لگی تو بھابی (چچی

نمازآ) کی آواز دل کے گنبد سے گونجی "یہ گناہ میں نے اس لئے کیا شیب بھائی کیونکہ میری روح پر ہزاروں لاکھوں ایسے زخم ہوگئے تھے جو ہر شام سے سحر تک اور سحر سے اشام تک درد، کسک، تنہائی، اذیت اور ظلم کے ناسور بن کر رستے رہتے تھے۔ بستر کانٹوں کا نہیں زہرآلودہ کانٹوں کا بچھونا بن گیا تھا۔ تمہارے بھائی مجھ سے دور ہوتے جارہے تھے۔ وہ مہینوں سے مسلسل مجھ سے بات نہیں کر رہے ہیں۔

یوں تو جس روز سے میں سرخ جوڑا پہن کر اس گھر میں آئی تھی۔ انہیں اسی دن احساس ہو گیا تھا کہ میں ایک مذہبی عورت ہوں لیکن عورت ہونے کے پیش نظر مجھے اس بات کا احساس آہستہ آہستہ ہوا کہ وہ صرف سماجی، شوخ فلموں، عشقیہ ڈراموں، مشاعروں اور ماڈرن کلچر کے ساتھ ساتھ ٹی وی کے دلدادہ ہیں۔

مسلسل تین برسوں سے خدا سے دعائیں کرتے کرتے میں ہار مان گئی۔ لیکن نہ جانے کیوں خدا ان کا رخ میری جانب نہ موڑ سکا۔ میرا درس و اخلاق تعلیم کا کام ان کو مزید کمزور کرتا چلا گیا۔ پچھلے ایک برس سے تو ان کی کیفیت کو سہہ کر ایک عورت کی ہمت جواب دے گئی۔ قریب ہو کر بھی دلوں سے ہزاروں میلوں کے فاصلے پر رہنا مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ آخر وہ میرے مجازی خدا ہیں۔

"وہ ہر رات جب بارہ بجے کے قریب گھر واپس آتے ہیں تو ہمت نہیں ہوتی کہ ان سے کچھ کہوں اونچی آواز میں بھی تو بات نہیں کر سکتی محلے کے لوگ کہیں گے کہ بچی نمازآ جیسی عورت بھی اپنے شوہر سے راتوں کو جھگڑتی ہے۔ ڈراموں، مشاعروں اور ٹیلی ویژن کی محفلوں میں رہنا ان کا دستور ہو گیا ہے"۔ وہ کچھ لمحوں کو خاموش ہو گئیں۔ ان کی باتیں مجھے نئی خلاؤں سے آشنا کرا رہی تھیں۔

"کرب، تڑپ، اجنبیت، خاموشی اور دوری کی صلیب پہ لٹکے رہنے سے روح کمزور ہو گئی اور تب مجازی خدا کے حق میں ایک معمولی عورت کے ہاتھوں روحانی عورت کا قتل ہو گیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے یہ عظیم گناہ کیا ہے"۔ بھابھی عظیم گناہ پہ زور دیتی ہوئی بولیں۔

"محلے کے سب لوگوں سے کہہ دو کہ بچی نمازآ ایک عورت بھی ہے وہ لوگ میرے گناہ کو نہ دیکھیں بلکہ گناہ ہونے کی وجوہات پہ غور کریں۔"

میں جانتی ہوں کہ میرا مجازی خدا آج میرے قریب ہے میں کیسی گنہگار کمزور سی عورت ہوں کہ حقیقی خدا پر مجازی خدا کو فوقیت دے دی۔

ہاں آج مسرتوں کی بارش سے اس گناہ کے سبب میری روح کے چھالوں کو مرہم مل جائے گا۔ شام ہوتے ہی جب وہ شوکت صاحب کے گھر جائیں گے تو ان کو میرے اس گناہ کے بارے میں شوکت صاحب خود بتادیں گے اور میں جانتی ہوں کہ وہ دوڑتے ہوئے گھر آئیں گے۔ حیرت، خوشی اور کانپتی آواز میں میرے کان میں سرگوشیاں کرنے سے پہلے مجھے اپنی بانہوں کے مضبوط حصار میں جکڑ لیں گے اور ہواؤں سی نرم آواز میں کہیں گے۔

"کیا تم واقعی گھر میں رنگین ٹی۔ وی لے آئی ہو" ؟؟؟

بقیہ: سوالات ... .

یہ [illegible] یک ٹک دیکھتا سا لگا۔ ایک پل کے لئے یقین ہی نہیں آیا۔ اس کا چہرہ یکایک آنکھوں میں گھوم گیا۔ مسکراتے چہرے پر کتنے ہی سوالات کا جواب دیتا ہے۔ میں بہت کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ اور اپنے بارے میں سب کچھ بتانا چاہتا ہوں مگر خاموشی بدستور پھیلی ہے۔ سارے منظر جیسے خاموش ہو گئے ہیں۔ بس ٹوٹ کر بکھرنے کا عمل پوری شدت سے جاری ہے۔ سب کچھ بکھر گیا ہے۔ ٹوٹ گیا ہے اور سوالات در سوالات، میرے اندر پھیلتے ہی جا رہے ہیں۔ اور میں ان سب میں کہیں ڈوب گیا ہوں، ۔ نہیں شاید، بالکل ٹوٹ گیا ہوں۔ !!

نجمہ فرحت قادری
ریسرچ اسکالر
مکان نمبر 652 ، محمد زئی
شاہ جہانپور (یو۔پی)

غزل

بدل ہی جاتی ہے قسمت بھی چند لمحوں میں
کہ اک نگاہ میں ہوتا ہے فیصلہ دل کا
اب ہم بھی دیکھیں گے کتنے ہیں تیرے ظلم و ستم
بڑھا رہی ہے نظر اس کی حوصلہ دل کا
یہ عشق ہے کہ اسے عقل سے بہت دوری
عجب طرح کا ہے یہ بھی معاملہ دل کا
ہماری ایک ہے حسرت اگر وہ مل جائیں
تو ہم بھی خوب نکالیں گے ولولہ دل کا
یہ جسم و روح کا رشتہ عجیب رشتہ ہے
لگا ہوا ہے ازل سے یہ سلسلہ دل کا
ذرا سی چیز ہے اور اس پہ یہ قیامت ہے
مچا ہوا ہے زمانے میں غلغلہ دل کا
ہزار راہ میں آئیں گی مشکلیں نجمہ
پہنچ ہی جائے گا منزل پہ قافلہ دل کا

شبیر سہرامی
کمیلن گنج سہرام
بہار 821115

غزل

کون سے آفت کدے کی آگ میرے سنگ ہے
جسم بھی بے کیف اپنی شام بھی بے رنگ ہے
جانے کس بے منظری کی آنچ سب کو چھو گئی
اپنا چہرا دیکھ کر ہر آدمی اب دنگ ہے
اب کہاں جاؤگے لے کر کانچ سا اپنا بدن
اپنے ہاتھوں میں اٹھا رکھا سبھی نے سنگ ہے
کیا ضروری ہے کہ بھا جائے تمہیں میری ادا
زندگی جینے کا سب کا اپنا اپنا ڈھنگ ہے

شجاع الدین شاہد
Airport Stg. Office
Dadar Ho Bldg 2nd floor
Bombay _ 400014

غزل

وہ شخص ٹوٹ کے کچھ اس طرح سے رویا ہے
کہ آنسوؤں کا اثاثہ بھی اپنا کھویا ہے
ہر اک موڑ سے خوشبو لہو کی آتی ہے
یہ تخم اپنی زمینوں میں کس نے بویا ہے
اسے جگائیے شب خون ہو بھی سکتا ہے
وہ گہری نیند میں صدیوں سے یونہی سویا ہے
خوشی کا لمحہ تو پرچھائیں بن کے ڈوب گیا
غموں کا بوجھ تو تاعمر ہم نے ڈھویا ہے
دلوں کے بیچ میں دیوار اٹھ گئی شاہد
جو زندگی میں کمایا تھا آج کھویا ہے

احمد امام
چوڑی محل، بالاپور (اکولہ)

غزل

جو اندھے ہیں سو ہیں، دیدہ وروں کا بس نہیں چلتا
وہاں میں ہوں جہاں سوداگروں کا بس نہیں چلتا
مری ہمت کے پانو کب کے گھائل کر دیئے ہوتے
مگر راہوں میں بکھرے پتھروں کا بس نہیں چلتا
زبوں حالی، غم و آلام، درد دل، پریشانی
عزائم ہوں تو پھر ان اجگروں کا بس نہیں چلتا
زمانے سے یہ خود کو جوہری تسلیم کروالیں
کریں گے کیا کہ ان شیشہ گروں کا بس نہیں چلتا
وگرنہ بیچ کھا جاتے یہ اپنی مادر گیتی
مگر ہندوستانی افسروں کا بس نہیں چلتا
بظاہر ہم تو چھوٹے ہیں، تمہیں معلوم ہے لیکن
ہمارے سامنے قدآوروں کا بس نہیں چلتا

اسرار حسین اسیر
محلہ ـ جھنڈ گوٹی
شاہجہاں پور

غزل

وہ حسن بے مثال کا پیکر عجیب ہے
جس نے اسے تراشا وہ آزر عجیب ہے
نازل ہوئی ہیں جس پہ محبت کی آیتیں
وہ دیں عجیب ہے وہ پیمبر عجیب ہے
ہر دن لہو لہان ہے ہر شام زخم زخم
میری نظر کے سامنے منظر عجیب ہے
میں خالی ہاتھ ہوں تو لرزتا ہے دیکھ کر
میداں میں دشمنوں کا بھی لشکر عجیب ہے
معصوم التجائیں ہیں لفظوں کے روپ میں
میری شکایتوں کا بھی دفتر عجیب ہے
میری غزل کو سن کے سر انجمن اسیر
اس کی زبان پہ حرف مکرر عجیب ہے

بدنام بشر
بگان پاڑا وارڈ 7
پاکوڑ ـ ۸۱۶۱۰۷ (بہار)

غزل

وہ جو ہونا تھا ہو گیا آخر
خاک تن خاک میں ملا آخر
قریہ قریہ یہ آگ پھیل گئی
کوچہ کوچہ دھواں اٹھا آخر
زندگی جس پر ایک تہمت تھی
وہ بھی دنیا میں جی گیا آخر
ایک تالاب تھا وہ ٹھہرا ہوا
تیری آہٹ پہ ہنس دیا آخر
چڑھ کر ان سیڑھیوں پہ ریشوں کی
آدمی بن گیا خدا آخر

غزلیں

ف-س-اعجاز

جو اپنے شہر کی معصوم دیواروں پہ لکھتے ہیں
انوکھا طنز وہ اپنے ہی کرداروں پہ لکھتے ہیں

یہ تاثیر سخن تو وقت کو پرنور کرتی ہے
یہ روشن آیتیں تو صرف میناروں پہ لکھتے ہیں

وہ جن پر بادشاہوں کی نوازش ہوتی رہتی ہے
وہ درباروں کے شاعر صرف درباروں پہ لکھتے ہیں

کہاں تھے، کس جگہ تھے، کس نے کی تعمیر ان سب کی
بہت کم لوگ ہیں جو اپنے معماروں پہ لکھتے ہیں

ہمارا کیا ہے تیری صاحبی بدنام ہوتی ہے
کہ ہم اپنی ملامت تیری پھٹکاروں پہ لکھتے ہیں

کئی قصے ہیں جو شبنم کی ٹھنڈک پر نہیں لکھتے
سلگتے رتجگے آنکھوں کے انگاروں پہ لکھتے ہیں

نشاط قرب کی تحریر کو پڑھ کر بتادے تو
لبوں سے بات کیا ہم تیرے رخساروں پہ لکھتے ہیں

یہ سانسیں، یہ محبت ایک بن جانے کی خاطر ہیں
یہ بوسے ٹوٹتی، بدلن کی، دیواروں پہ لکھتے ہیں

جہاں ہر شئے کی قیمت آسماں کو چوم لیتی ہے
ہم اپنی بے کسی کا حال بازاروں پہ لکھتے ہیں

ہمارے سر کا سودا ہے، ہمارے سر میں رہتا ہے
ہماری پیاس ہے، ہم اپنی تلواروں پہ لکھتے ہیں

تم اپنے خون کو بس اک ثواب جاریہ سمجھو
ہم ایسی سرخیاں اردو کے اخباروں پہ لکھتے ہیں

کوئی آہٹ بھی نہیں خواب کے محلوں میں ابھی
کوئی صورت نہیں بنتی ہے دھندلکوں میں ابھی

جاگتی آنکھوں میں وہ نیند کا آنا جانا
ذائقہ رات کے بوسوں کا ہے پلکوں میں ابھی

کس سے اس اڑتے ہوئے ابر کا سودا کرلیں
غور ہوتا ہے ہواؤں کے سفیروں میں ابھی

چار دیواروں کا اک گھر نہیں بننے پاتا
دشمنی ہے میرے ہاتھوں کی لکیروں میں ابھی

ہوگیا کون یہ روپوش صدا دے کے مجھے
کوئی اسرار ہے جلتے ہوئے پردوں میں ابھی

تیری آنکھوں میں نہیں ہوں تو کوئی بات نہیں
میں تو خود بھی نہیں کچھ اپنی نگاہوں میں ابھی

ایسا لگتا ہے ترے اونچے محل میں آکر
دفن ہوجاؤں گا ان سونے کی اینٹوں میں ابھی

گیت گاتے ہوئے ہم رقص کریں گے باہم
خواب اتریں گے محبت کے جزیروں میں ابھی

تیرتا ہے میری آنکھوں میں یہ چہرہ کس کا
ہے کوئی چاند رواں جھیل کی موجوں میں ابھی

"سوالات ؟"

عظیم راہی
کریم کالونی، روشن گیٹ، اورنگ آباد

ٹوٹ کر بکھرنے کا عمل جاری تھا۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا اس عمل کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اوبڑ کھابڑ راستے، مٹی کی کچی سڑکیں اور کہیں کہیں نیم پکی سڑکیں، ان تمام راستوں کے درمیان چلتے ہوئے کتنے ہی خیالات جنم لے رہے تھے۔ کتنے ہی وسوسے سر اٹھا رہے تھے اور کتنے سوالات منہ لٹکائے کھڑے تھے !۔ بظاہر تو کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اندر ہی اندر جیسے سب کچھ بدل گیا تھا۔ کچھ راستے کہیں کہیں پکی سڑکوں میں بدل چکے اور مٹی کی کچی سڑکیں، نیم پکی سڑکوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ ان سڑکوں کو کھیت کے درمیان سے نکالے جانے والی سو فٹ چوڑی روڈ سے ملا دیا گیا تھا۔ اب اطراف کی آبادی کافی گنجان ہو گئی تھی لیکن دوکانیں تقریباً وہیں اور بالکل ویسی ہی تھیں۔ البتہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ جن لوگوں کی وہاں بہت چھوٹی پٹری نما دوکانیں ہوا کرتی تھیں اب ان لوگوں کی دوکانیں کافی بڑے جنرل اسٹور میں تبدیل ہو گئی تھیں اور اس وقت کی بڑی بڑی دوکانیں اب بالکل چھوٹی ہو گئی تھیں۔ ایسا کیوں ہوا تھا ؟!۔ سوال آگ کی لپٹ بن کر میرے پورے وجود کو یکایک جھلسا گیا۔

ایک بیوٹی پارلر، آئسکریم پارلر بھی کھل گیا تھا اور ویڈیو سنٹر پر تو بڑی رونق تھی۔ ہر شو میں وہ ایک نئی فلم جو دکھا رہا تھا۔ بلکہ گاؤں کا سارا ہجوم اس چھوٹے سے ویڈیو سینٹر میں جمع ہو گیا تھا۔ بظاہر تو ایسا لگتا تھا جیسے راستے بالکل سنسان ہو گئے ہوں۔ گرمی اپنی شدت کے ساتھ برس رہی تھی اور دوکانیں خالی خالی دکھائی پڑتی تھیں۔ البتہ ہوٹلوں میں کچھ بھیڑ ضرور دکھائی دے رہی تھی۔ شاید اس لئے بھی کہ وہاں مخرب اخلاق گانوں کے کیسیٹ بج رہے تھے۔ "چولی کے پیچھے ------ !" جیسے گیت دھوم مچا رہے تھے۔ میرے اندر کہیں سے قوالی کی عقیدت میں جھومتی ہوئی آواز ابھر رہی تھی۔
"بھر دو جھولی میری یا محمدؐ ------ !"

بچپن تو یہیں گزرا تھا اور اکثر چھٹیوں میں لڑکپن کے دن بھی بڑی خوشگوار یادیں بن کر دل و دماغ پر چھا جاتے تھے۔ جب یہاں سے ہجرت کر کے اپنے لوگوں کو مجبوراً چھوڑ کر دور کہیں جانا پڑا تو سفر در سفر کرب زندگی کا مقدر بن گیا۔ لیکن اپنی جڑوں سے جڑے رہنے کا خواب میں نے زندگی میں، ہر پل سوتے جاگتے دیکھا تھا کہ رشتے قائم رہیں، تعلقات بنے رہیں۔ یہ سب سوچ کر رشتہ داروں سے میں نے ناطہ جوڑ لیا کہ محبتوں کا پانی رشتوں کی جڑوں میں برابر پہنچتا رہے اور رشتہ داریوں کا یہ درخت ہمیشہ ہرا بھرا اور شاداب رہے۔ لیکن پتہ نہیں مجھ سے کہاں ایسی غلطی ہو گئی تھی کہ کوئی ان جڑوں کو اندر ہی اندر غیر محسوس طریقے سے کاٹتا جا رہا تھا۔ اور ان تمام کو جوڑنے اور اپنی جڑوں سے جڑے رہنے کی کوشش اور ان سب کو جوڑنے کی تگ و دو میں میں ٹوٹتا بکھرتا رہا ہوں۔ اب سوچتا ہوں تو یہ سب مجذوب کی بڑ معلوم ہوتے ہیں۔ آخر مجھے کیا ضرورت تھی۔ ان رشتوں کو تناور درختوں میں بدلنے کی خواہش کرنے کی یہ آرزو میری اپنی تھی۔ سزاوار بھی میں ہی ہوں اور شاید ہمیشہ رہوں گا۔ ایک سوال پھر مجھ سے جواب طلب کرتا ہوا میرا منتظر کھڑا تھا۔

اب یہاں رہا بھی کون تھا۔ ایک وہ جو شہر میں جا کر کچھ نہیں کر سکتے تھے یا کچھ کرنے کی عمر ہی ختم ہو چکی تھی۔ یا پھر وہ لوگ جو ہمیشہ اپنی بدحالی میں خوش رہنے کا ہنر جانتے تھے باقی سب تو کب کے شہروں میں منتقل ہو چکے تھے۔ کچھ تو اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں اور کچھ ان کے حصول کے بعد ملازمتوں کے سلسلے سے جڑے اپنی اولاد کا سکھ پانے کی غرض سے وہیں بس گئے تھے۔ پھر یہاں کون تھا ؟!۔ کس لئے مجھے جڑوں سے اندر تک

جڑے رہنے کا خیال آیا تھا۔ وہ سب وہاں سے کب کے نکل چکے تھے اور میں ان سب کے پیچھے بھاگتا پھر رہا ہوں۔ وقت تو آگے بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اور ایک میں ہوں کہ کہہ دوں کہ لوٹ آ، اے گردش ایام تو ------ ! بے وقت کی راگنی جیسی آرزو مگر بے ثمری ہوتی ہے۔ جو لوگ ملے ان کے چہروں پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ پہلے سی رونق جانے کہاں کھو گئی تھی۔ اور نہ ملنے پر کوئی خاص خوشی کے آثار نمایاں ہوئے تھے سب اپنے کاموں میں الجھے ہوئے تھے۔ نفسا نفسی کا ایک عجیب سا عالم تھا۔ ہن برس رہا تھا۔ کار زار حیات کے اس ماحول میں میرا خود کو تنہا محسوس کرنا عجیب سی بات تو نہیں تھی۔ لیکن کچھ ایسا ہی لگتا تھا۔ وہ رشتے جو بچھڑ جانے پر یاد کا سرمایہ بن گئے تھے اور یاد کرنے پر جو خوشگوار لمحوں کا احساس دل میں جگاتے تھے۔ وہی رشتے آج ملنے پر کوئی احساس، کوئی کیفیت نہیں جگا پا رہے تھے۔ کتنی عجیب بات ہے۔ میں پھر بکھرنے لگا۔ اندر ہی اندر سب کچھ ٹوٹنے لگا۔ اب شکایتیں کس سے کریں۔ اپنوں سے، جن سے ہم اٹوٹ محبت کرتے ہیں اور یہ حق بھی رکھتے ہیں مگر یہ چلن تو شاید کب کا ختم ہو چکا ہے۔

"میاں، تم کس زمانے میں سانس لیتے ہو، کس دنیا میں جیتے ہو؟!"۔ سوال کوندا بن کر میری جانب لپکا۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

"کیوں، میاں کب آئے" "کیسے ہو؟!" لگا سوالات کا ریلا میرے دل میں گھس آیا مگر جب آنکھیں پھیلائیں تو پھر وہاں کوئی نہیں تھا۔ سوالات تو جیسے میرے اندر سر ابھار رہے تھے۔ سوال جب خود اپنے آپ سے ہو اور جواب خود ہی دینا پڑے تو یہ کتنا مشکل ہوتا ہے۔ کوئی ذرا مجھ سے پوچھے، مگر اب پوچھے گا بھی تو کون ؟!۔

خاندان کے سارے لوگ پورے گاؤں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بڑا بھرا پورا خاندان ہے۔ رشتہ داروں کی جیسے کوئی حد اور نہ ہی ان کے گھروں کی سرحد۔ بس جہاں چلے جائیں جیسے محبتوں کے سرچشمے ابل رہے ہوں۔ کھیت، کھلیان لہلہا رہے ہوں، باغیچے مہک رہے ہوں میرے اپنے گاؤں کے لوگوں سے ملا رہے ہیں۔ میرا اپنا تعارف کروا رہے ہیں۔ میرے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کھل اٹھی ہے۔ گالوں پر رونق بڑھ گئی ہے۔ میں خوشی سے سرشار ان کے سارے سوالات کے جواب دے رہا ہوں لیکن جواب پوری توجہ کے ساتھ سننے والا کوئی نہیں۔ گو کہ سب لوگ ہجوم کی شکل میں موجود ہیں اور اس بھیڑ میں میں بالکل تنہا خود کو محسوس کر رہا ہوں۔ بچپن، لڑکپن تو یہیں گزرا تھا۔ اکثر چھٹیوں میں آنکھ مچولی، گلی ڈنڈا، پتنگ بازی اور نہ جانے کتنے ہی کھیل ان میدانوں میں کھیلے تھے۔ آنگن، دالان، صحن اور چمن سب گھر کے اندر ہی ہوتے تھے اور جتنے بڑے گھر ہوتے تھے اس سے بڑھ کر ان سب کے دل۔ سب تو سب پانی کا کنواں بھی گھر میں ہوتا تھا۔ مجھے پہلے پہل بڑا ڈر لگتا تھا۔ پانی کی بالٹی کھینچنے کے تصور سے ہی بدن پر کانٹے اگ آتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ عادت ہو گئی اور عادت مشغلہ بن گئی۔ جب جی چاہا پانی کنویں سے نکالا اور نہا لیا۔ شام ہوئی، کھیت میں گئے اور آموں کے پیڑوں سے لگے جھولوں میں خوب جھولے پیڑوں پر لٹکے اور خوب مستیاں کیں، موج مناتے ہوئے شام ڈھلے گھر پہنچے اور شام کے ملگجی اندھیرے ڈوبنے لگے۔ رات کے اندھیرے گہرے ہو جاتے۔ ہم چوپال میں جا کر بیٹھ جاتے۔ دنیا بھر کے قصے سنائے جاتے۔ ہم بھی سنتے اور سمجھ میں نہ آنے پر خوش ہوتے اب میں یہاں چوپال کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ نہیں شاید وہاں سنایا جانے والا کوئی قصہ تلاش کر رہا ہوں۔ لیکن تلاش کے وسیلے سے ایک سوال پھر میرے سامنے منہ اٹھائے کھڑا ہے۔ آخر میں کیا کروں۔ ؟!۔ کس سے پوچھوں!۔ اچانک مجھے وہ بوڑھا یاد آ گیا۔ گاؤں کے راستے پر جس کا ایک بڑا سا گھر تھا۔ اپنے مکان کے سامنے چبوترے پر بیٹھا ہر آنے جانے والے پر نظر رکھتا اور ان کی خیریت دریافت کرتا۔ خبر گیری کرتا اور ہر شخص سے جیسے چھیڑ چھیڑ کر بات کرتا، سوالات کرتا رہتا اور باہر سے آنے والے مہمان کا تو جیسے وہ سواگت ہی کرتا، سوالات کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری کر کے۔ بچپن میں مجھے بڑی چڑ سی ہوتی تھی اس بوڑھے کو دیکھ کر۔ جب کبھی وہ مجھے گاؤں میں دیکھتا۔ بڑا خوش ہوتا۔ سر پر ہاتھ پھیرتا اور مسکرا مسکرا کر بس سوالات کئے جاتا۔ میں جواب دیتے دیتے تھک جاتا۔ مگر وہ سوالات کرتا ہی رہتا۔ تجسس کی عمر تو میری ہوتی لیکن بوڑھے میں بھی وہی سلسلہ دوبارہ شروع ہو جاتا۔ آج میں یہاں آیا ہوں جب سب کچھ کہنا چاہتا ہوں، سب کچھ بتا دینا چاہتا ہوں، وہ بھی جو شاید مجھ سے نہ پوچھے۔ لیکن وہ ہے کہاں ؟!۔ جب سے اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں خود اس سے ملنا چاہتا ہوں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دینا چاہتا ہوں۔! لیکن وہ ہے کہاں!؟ سوال کا کوندا پھر میری جانب لپکا۔ میں بڑی بے بسی سے اسے کھوجتا رہا، اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے خود ہی ہر سو تلاش کرتا رہا۔ آخر مجھے معلوم ہوا کہ [illegible] نہیں رہا"

باقی صفحہ ۳۰ پر

کیول سوری
2417 کمرہ بنگش
دریا گنج، نئی دہلی110002

گلزار۔ پکھراج کی چاندنی میں

لگ بھگ اڑتالیس برس پہلے جب نئی سرحدیں بنیں اور عوام کو ان سے آگاہ کرنے کے لئے رات کی تاریکیوں میں ایسے چراغاں کئے گئے کہ لوگ مدتوں دیوالی منانے سے خائف رہے۔ دن کے اجالوں میں ایسے رنگ اچھالے گئے کہ کئی برس تک ہولی منانے کا خیال بھی ہولناک لگتا رہا۔ "بہادری" اور "جواں مردی" کے ایسے ایسے کارنامے سامنے آئے کہ یزید کا رنگ بھی پھیکا پڑ گیا۔ ان ہی دنوں ایک خون آشام رات میں، جب گھر کے لوگ اپنا سامان باندھ رہے تھے، ایک کمسن لڑکے نے بھی اپنی پوری جائداد جو ایک بھمیری اور لاٹو پر مشتمل تھی، اپنے پاجامے کے نیفے میں اڑس لی اور اپنی ماں کی انگلی تھام کر ان انجانی منزلوں کی سمت چل پڑا جن کا انتخاب اس نے نہیں، وقت نے اس کے لئے کیا تھا ...... زندگی کے اس طویل سفر میں کئی پڑاؤ آئے۔ کبھی دلی کبھی بمبئی، کبھی کہیں کبھی کہیں۔ راہیں ناہموار تھیں، رستے اوبڑ کھابڑ۔ مسلسل سفر چونکہ شرط حیات تھا، اس کی گرد میں وہ بھمیری اور لاٹو کہیں کھو گئے جنہیں وہ دینے سے سنبھال کر لایا تھا۔ وہ کھو ضرور گئے لیکن اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئے کیونکہ آج بھی سرحد کے سناٹوں میں وہ انہیں ناچتے، گھومتے دیکھتا ہے۔ وہ کمسن لڑکا جو ان دنوں ریلیبوجی کے نام سے پکارا جاتا تھا آج گلزار کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اس طویل سفر میں اسے کہرانیوں کے نخلستان بھی ملے ہیں اور مایوسیوں کے سراب بھی۔ "چاند پکھراج کا" شاید ان دو کیفیتوں کے امتزاج ہی کا نام ہے گلزار کا یہ مجموعہ حال ہی میں روپا اینڈ کمپنی، نئی دلی نے شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ کی شاعری کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے میں ایک واقعہ کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

آج سے لگ بھگ پچیس سال پہلے ساحر لدھیانوی کی نظم "پرچھائیاں" کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اردو تنقید کے ایک معتبر نام نے "مکھن سی ملائم راہوں پر بوٹوں کی خراشیں پڑنے لگیں۔" کے بارے میں فرمایا تھا :

یہ مکھن سی ملائم راہیں کیا ہوتی ہیں ؟ راہیں، ہموار ہوتی ہیں، پتھریلی ہو سکتی ہیں، سیدھی یا ٹیڑھی ہو سکتی ہیں، مکھن سی ملائم نہیں ہو سکتیں۔ اور اگر مان بھی لیا جائے کہ ہو سکتی ہیں تو کیا فوجی بوٹ ان میں دھنس نہیں جائیں گے ؟ صرف خراشیں ہی چھوڑ پائیں گے ؟ وغیرہ وغیرہ ...... میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اس شعر دشمن رویہ کے ساتھ گلزار کی شاعری کا مطالعہ بے کار ہو گا۔ اسے سمجھنے کے لئے تو آپ کو اس کے ذہنی سفر میں شریک ہونا پڑے گا۔ کچھ دیر اس کے ساتھ اس کی سوچ، اس کے تصور کی ان وادیوں میں بھٹکنا ہو گا جو اس شعری فضا کو جنم دیتی ہیں۔ خود گلزار کا مطالبہ بھی تو بس اتنا سا ہے۔

"صرف احساس ہے یہ روح سے محسوس کرو"

گلزار کی سوچ کا دھارا نہ تو حصار کے اندر کی شاعری کی گھسی پٹی ترکیبوں سے استفادہ کرتا ہے اور نہ اردو شاعری کی مروجہ تشبیہوں اور استعاروں سے متاثر ہوتا ہے۔ کہیں کہیں تو وہ لفظوں کے ساحلوں کو چیر کر اظہار کے نئے نئے جزیروں کی تلاش میں بہت دور نکل جاتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ اس کے فن کا کمال ہے یا اس کی سوچ کی سچائی کا اعجاز کہ اس کے بدلتے ہوئے اجنبی الفاظ اور غیر مانوس ترکیبیں بھی شناسا اور جانی پہچانی سی لگنے لگتی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

قہقہاتی ہوئی اس بھیڑ میں شامل ہو کر
میں بھی اک بار ہنسوں، خوب ہنسوں، خوب ہنسوں

پورن ماشی کی رات جنگل میں
جب کبھی چاندنی بدلتی ہے
پتوں میں گھنٹیاں سی بجتی ہیں
(چاندنی)

میرے نام اک نظم لکھونا !
مجھ کو اپنے اک چھوٹے سے شعر میں سی دو !

ہوا کے سینگ نہ پکڑو ، کھدیڑ دیتی ہے
زمیں سے پیڑوں کے ٹانکے ادھیڑ دیتی ہے

شاخ پر کوئی قہقہہ تو کھلے
کیسی چپ سی چمن میں طاری ہے

اس کے اجنبی لفظوں اور غیر مانوس ترکیبوں کے امتزاج سے کبھی کبھی ایک عجیب رقت انگیز سی فضا جنم لیتی ہے ......

تمام موسم ٹپک رہا ہے
پلک پلک رس رہی ہے یہ کائنات ساری
ہر ایک شے بھیگ بھیگ کر دیکھ کیسی بوجھل سی ہو گئی ہے
دماغ کی گیلی گیلی سوچوں
بھیگی بھیگی اداس یادیں ٹپک رہی ہیں
(سیلن)

کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ دفعتاً ہر چیز اپنے معنی کھو بیٹھتی ہے۔ مقدس ہتھیلیوں سے پگھلتی ہوئی حنا کی دمک، چراغ آخر شب کی ٹمٹائی لو، چاند چہروں کی پر نور پیشانی پر لرزتی، دم توڑتی ہوئی چندر کرن، سب بے معنی لگنے لگتے ہیں۔ ذہن و دماغ پر ہو کا عالم طاری ہو جاتا ہے، اور دل کا آسیب ہولے ہولے سسکنے لگتا ہے۔

قدیم راتوں کی ٹوٹی قبروں کے میلے کتبے
دنوں کی ٹوٹی ہوئی صلیبیں گری پڑی ہیں
شفق کی ٹھنڈی چتاؤں سے راکھ اڑ رہی ہے
جگہ جگہ گرز وقت کے چور ہوگئے ہیں
جگہ جگہ ڈھیر ہوگئی ہیں عظیم صدیاں
میں کھنڈروں کی زمیں پہ کب سے بھٹک رہا ہوں
(کھنڈر)

گرد وپیش اور ماحول میں پھیلی ہوئی غلاظت، پژمردگی، مفلسی اور درندگی اس کے حساس ذہن کو پے در پے کچوکے لگاتی رہتی ہیں۔ یہ المناک تصویریں جب کرب میں ڈھلتی ہیں تو کبھی اس کی ولدوز نظم "ایک بچہ" کا روپ بن کر سامنے آتی ہیں اور کبھی جاں بلب انسان کے چہرے پر چھائی ہوئی بیوگی کا ایک ایسا کربناک بین، جس کی بازگشت دیر تک فضاءمیں گونجتی رہتی ہے۔

سب پہ آتا ہے سب کی باری ہے
موت انصاف کی علامت ہے
زندگی سب پہ کیوں نہیں آتی ؟
(تروینی)

ذہن کو مفلوج کردینے والے اس دکھ کا اظہار اس کی نظم "قبریں" میں یوں ہوتا ہے۔

کیسے چپ چاپ ہی مرجاتے ہیں کچھ لوگ یہاں
جسم کی ٹھنڈی سی تاریک سیاہ قبر
کے اندر نہ کسی سانس کی آواز
نہ سسکی کوئی
نہ کوئی آہ، جنبش، نہ ہی آہٹ کوئی ....

فرقہ پرستی کی لگائی ہوئی آگ میں جب اسے انسانیت کی چتائیں جلتی دکھائی دیتی ہیں تو اس کی چیخ اس سوال میں ڈھل جاتی ہے۔

وہ تو کل نو ہی برس کا تھا، اسے کیوں چن کر
فرقہ وارانہ فسادات نے کل قتل کیا۔ ؟
(وارثت)

اپنے چاروں طرف بکھرتے ہوئے انسانی خون کو بار بار دیکھنے کے باعث اس کا اخبار سے خائف ہوجانا بالکل فطری امر ہے کہ تازہ اخبار تازہ خبریں لائے گا۔ وہ خبریں جنہیں وہ پڑھنا نہیں چاہتا، سننا نہیں چاہتا۔ کبھی وہ یہ بیان دینے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

روز صبح اخبار مرے گھر
خون میں لت پت آتا ہے
(اخبار)

اپنے معاشرے میں منفی رویوں اور ان کے اثرات پر اس کا حساس دل لہو ضرور روتا ہے۔ لیکن وہ انسان کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ یہی وہ مثبت رویہ ہے جو زندگی کے تسلسل کو قائم رکھتا ہے۔ ن۔م۔ راشد کی طرح گلزار کا بھی یہ ایمان ہے کہ اس پنگھٹ کی ڈگر، جہاں تخلیقی سوتے پھوٹتے ہیں، کٹھن ہی سہی، بالآخر فتح فن اور تخلیق ہی کی ہوگی۔ اور جب یہ ہوگا تو سماج میں منفی رویوں کا دم گھٹ جائے گا اور نیا آدمی اس دھرتی پر نور کی چادر تان دے گا۔ صبح فردا کے تابناک ہونے کا یقین اس کی نظم "ابھی نہ پردہ گراؤ" میں یوں سامنے آتا ہے۔

یہ لو بچالو، جو تھک کے کردار کی ہتھیلی سے گر پڑی ہے
یہ لو بچالو، یہیں سے اٹھے گی جستجو پھر بگولا بن کر
یہیں سے اٹھے گا کوئی کردار پھر اسی روشنی کو لے کر
کہیں تو انجام و جستجو کے سرے ملیں گے
ابھی نہ پردہ گراؤ، ٹھہرو!

رشتوں کی شکست و ریخت کا احساس عام لوگوں کی طرح گلزار کے لئے بھی کربناک ہے لیکن اس کے یہاں اس کا اظہار عام آدمی کی آہ و فغاں یا واویلا بن کر سامنے نہیں آتا۔ وہ تو اس کا ذکر بڑے باوقار انداز سے اس طرح کرتا ہے جیسے یہ آپ بیتی نہ ہو، جگ بیتی ہو۔ اپنی نظم "گرہیں" میں جلاہے کے فن کو سراہتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ میرے تانے بانے میں گرہ بنتر کی ایک بھی گانٹھ دکھائی نہیں دیتی حالانکہ تو دن رات تانے بانے بنتا ہے، اور میں

میں نے تو اک بار بنا تھا ایک ہی رشتہ
لیکن اس کی ساری گرہیں
صاف نظر آتی ہے میرے یار جلاہے!

اس کی غزل کے ان اشعار میں بھی آپ کو وہی بے نیازانہ کیفیت نظر آئے گی۔

ہاتھ چھوٹیں بھی تو رشتے نہیں چھوڑا کرتے
وقت کی شاخ سے لمحے نہیں توڑا کرتے
جاگنے پر بھی نہیں آنکھ سے گرتیں کرچیں
اس طرح خوابوں سے آنکھیں نہیں پھوڑا کرتے

گلزار کی جڑیں اپنے تیت میں بہت گہری ہیں۔ آج بھی اس مٹی کی مہک، جس سے اس کا خمیر اٹھا تھا، بھیس بدل کر نئے نئے روپ لئے اس کے در تمان کے دروازے پر خواب بن کر دستک دیتی ہے۔ مانوس چہروں کی اجلی چادر پہن کر اسے زیر لب پکارتی ہے اور پھر اس کی دہلیز پر اپنی بھینی بھینی سی خوشبو چھوڑ کر واپس لوٹ جاتی ہے۔ اس حیات افروز مہک سے سرشار جب وہ آنکھ کھولتا ہے تو گھر آنگن میں سناٹوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اور پھر آہستہ آہستہ یہ جان لیوا حقیقت آشکار ہوتی ہے :

خواب تھا شاید!
خواب ہی ہوگا!!
سرحد پر کل رات، سنا ہے، چلی تھی گولی
سرحد پر کل رات، سنا ہے
کچھ خوابوں کا خون ہوا تھا!

دستک

گلزار اپنی شاعری کے تناظر میں انکسار کا پیکر نظر آتا ہے۔ اس کی ایک جھلک اس کی نظم "میں" میں دکھائی دیتی ہے۔

میں کائنات میں سیاروں میں بھٹکتا تھا
دھوئیں میں، دھول میں الجھی ہوئی کرن کی طرح
میں اس زمیں پہ بھٹکتا رہا ہوں صدیوں سے
گرا ہے وقت سے کٹ کے، جو لمحہ اس کی طرح

لیکن جب اس کی انا جاگتی ہے تو آدمی تو کیا، پوری خدائی کسی ایسی فلم کا سیٹ بن جاتی ہے جہاں خدا ایک چھوٹا موٹا رول کرنے والا ایکٹر ہوتا ہے اور گلزار ڈائریکٹر۔ تیور دیکھئے :

کیوں میری شکل پہن لیتا ہے چھپنے کے لئے ؟
ایک چہرہ کوئی اپنا بھی خدا کا ہوتا .....

خیال پھینکا ہے رفتار بے پناہ کے ساتھ
خدا کو پہنچے کہ اس سے پرے نکل جائے
کہ اس کے بعد جو پہنچا تو مجھ تک آئے گا

(تردید)

عشق کے معاملے میں بھی اس کی انا گھٹنے نہیں ٹیکتی یہاں بھی وہی وقار دکھائی دیتا ہے جو اس کی شاعری اور شخصیت کا حصہ ہے۔ ثبوت کے لئے اس کی ایک غزل کا شعر سنیے :

جس کی آواز میں سلوٹ ہو نگاہوں میں شکن
ایسی تصویر کے ٹکڑے نہیں جوڑا کرتے

گلزار کے شعری نگار خانے سے گزرتے ہوئے ایک تاثر جو بار بار ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ جن محسوسات کا اظہار اس کے یہاں ہوتا ہے وہ موضوع کے طور پر اس کے سامنے نہیں آتے بلکہ کیفیت بن کر اس پر نازل ہوتے ہیں۔ اگر وہ اپنے ماحول میں پھیلی ہوئی غلاظت، مفلسی یا سفاکیوں کا ذکر کرتا ہے تو اس کی باتیں کسی تحریک کا دیا ہوا کھوکھلا نعرہ نہیں لگتیں، بلکہ کسی ذہین، ایماندار اور حساس آدمی کے ذہنی کرب کی آئینہ دار ہوتی ہیں اور جب وہ اپنے مخصوص، دھیمے لہجے میں ان جذبات کا بیان کرتا ہے جن کا ذکر اگلے وقتوں کے شاعر صرف رازداروں اور قاصدوں ہی تک محدود رکھتے تھے تو اس کے وجود کا انگ انگ کسی ماورائی سرشاری سے بھیگ جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

تم ایک تکیے میں گیلے بالوں کی بھر کے خوشبو
جو آج بھیجو
تو نیند آجائے، سو ہی جاؤں۔

(ڈائری)

دو سوندھے سوندھے سے جسم جس وقت
ایک مٹھی میں سو رہے تھے
لبوں کی مدھم طویل سرگوشیوں میں سانسیں الجھ گئی تھیں
مندے ہوئے ساحلوں پہ جیسے کہیں بہت دور ٹھنڈا ساون برس رہا تھا
بس ایک ہی روح جاگتی تھی۔

(بے خودی)

ترے لبوں پہ زبان رکھ کے
میں نور کا وہ حسین قطرہ بھی پی گیا ہوں
جو تیری اجلی دھلی ہوئی روح سے پھسل کر
ترے لبوں پر ٹھہر گیا تھا۔

(چمپئی دھوپ)

تمہارے ہاتھوں کو چوم کر، چھو کے اپنی آنکھوں سے آج میں نے
جو آیتیں پڑھ نہیں سکا ان کے لمس محسوس کر لئے ہیں

(لمس)

ایک آنسو گرا دو آنکھوں سے

کوئی آیت ملے نمازی کو
کوئی حرف کلام پاک ملے ——

(گزارش)

اس کی حیثیت ثانوی ہی سہی بہرحال یہ ذکر ضروری ہے کہ اس مجموعہ کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے ایک دو باتیں ذرا سی کھٹکیں۔ ان میں سے ایک "سا" اور "سی" کا بہت زیادہ استعمال ہے۔ میں نہیں کہتا کہ یہ عیب ہے میر کا ایک شعر ہے :

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

عیب تو دور کی بات "سی" یہاں شعر کی دھڑکن بن گئی ہے۔ لیکن ان کے بے دریغ استعمال سے قاری کو یوں لگتا ہے کہ ان الفاظ کو محض اور ان کے پیش نظر برتا گیا ہے۔ گلزار کی نظم "ایک پتہ" جو زیر بحث الفاظ سے قطع نظر بہت اچھی نظم ہے، کے ابتدائیہ مصرے یوں ہیں :

یہاں سے ذرا آگے چل کر
پھٹی سی دری پر
پرانا سا
ایک آدمی سا ملے گا
ادھورا سا چہرہ ہے ....

دوسری بات یہ کہ کہیں کہیں حسن بیان کے فقدان کی وجہ سے اس کا اچھوتا خیال بھی وہ تاثر نہیں پیدا کر پاتا، جو ہونا چاہیے تھا۔ اس کی نظم "مسیحا" پڑھتے ہوئے یہ خیال بے اختیار ذہن میں آتا ہے۔ بات کتنی اچھی ہے کہ گلزار کے نزدیک اس کی شاعری (محض اظہار کا وسیلہ ہی نہیں) اس کی ذہنی اور جسمانی توانائی کا سرچشمہ بھی ہے۔ لیکن اس مختصر سی نظم کو پڑھتے ہوئے کئی جگہ زبان رکتی ہے۔ لہٰذا فصاحت پر حرف آجاتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ ہر شاعر کا انداز بیان اس کا اپنا ہوتا ہے اور اس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ پر غلط یا صحیح قاری کے بھی کچھ مطالبات ہوتے ہیں۔

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے میں گلزار کی نظم "تعاقب" کا ذرا سا تفصیلی ذکر کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ کہ میرے نزدیک یہ نظم اردو کے شعری سرمایہ میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ یہ نظم جب میں نے پہلی بار پڑھی تو ایک عجب سی خلش کا احساس ہوا۔ پھر پڑھی تو جھنجلاہٹ ہونے لگی کہ میرا ذہن نظم پر تاثرات کو ترتیب دینے کی بجائے ادھر ادھر کیوں بھٹک رہا ہے۔ اور پھر اچانک یادداشت کا ایک دریچہ کھلا اور امریکی شاعر ایڈگر ایلن پو (Edgar Allen Poe) کی نظم "الڈورا ڈو" جسے میں نے برسوں پہلے پڑھا تھا، کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ بڑا خوش گوار اچنبھا ہوا کہ زمانی اور مکانی فاصلوں کے باوجود کبھی کبھی دو انسانی ذہن کیسے ایک ہی خواہش کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ یہاں میں یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ تعاقب، ایلڈوراڈو سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ دونوں نظموں کا ڈرافٹ اتنا مختلف ہے کہ کسی قسم کے شک، کسی طرح کے شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ ایڈگر ایلن پو کی نظم کا خلاصہ یوں ہے :

دن کے اجالوں میں رات کی سیاہیوں میں ایک جانباز، خوش فکر گھڑ سوار ایلڈوراڈو کی تلاش میں ان گنت منزلیں طے کر چکا ہے۔ جب جوانی اسے بڑھاپے کی دہلیز پر چھوڑ کر کہیں گم ہو جاتی ہے تو اس احساس سے اس کے دل پر سائے سے منڈلانے لگتے ہیں کہ خدا کی بنائی ہوئی اس دھرتی پر اسے ایلڈوراڈو کہیں دکھائی نہیں دیا۔ بالآخر جب جسمانی قوتیں ساتھ چھوڑ جاتی ہیں تو وہ ایک ہم سفر سائے سے ایلڈوراڈو کا پتہ پوچھتا ہے۔ جواب ملتا ہے۔ "چاند کی پہاڑیوں کے اس پار ---- سایوں کی وادیوں سے پرے ---- اگر تمہیں ایلڈوراڈو کی تلاش ہے تو جوانمردی سے اپنا سفر جاری رکھو"

گلزار کی نظم "تعاقب" کا اختصار حسب ذیل ہے۔

ایک شوخ ہرن کا شکار کرنے کے لئے جب وہ جنگل میں داخل ہوا تھا تو ابھی ابھی پو پھٹی تھی۔ پھر صبح دوپہر میں ڈھلتی رہی اور دوپہر سہ پہر میں۔ لیکن وہ چھلاوہ سا ہرن کبھی پیڑوں میں گم ہو جاتا ہے، کبھی ٹیلے پر نظر آتا ہے تو کبھی چشمے کے اس پار۔ دونوں ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہیں۔ مسلسل، کبھی نہ ختم ہونے والا تعاقب۔ اب شکار اور شکاری کی تمیز ختم ہو گئی ہے۔ کبھی اس نے سوچا تھا کہ وہ اس شوخ ہرن کو اپنے نیزے کی نوک پر پرچم کی طرح تان کر شہر میں داخل ہو گا۔ لیکن اب جب زندگی کی شام آگئی ہے تو یہ آسیب نما خوف اس کی رگ رگ میں سرایت کرنے لگا ہے کہ شاید وہ کبھی اس ہرن کو زیر نہ کر پائے گا۔ شاید بلکہ ہرن ہی فاتح ثابت ہو گا اور اسے اپنے سینگوں پر اٹھا کر کسی غار کی پہنائیوں میں گم ہو جائے گا۔

ایڈگر ایلن پو کا ایلڈوراڈو کیا ہے؟ گلزار کا چھلاوہ سا ہرن کس چیز کا علامیہ ہے؟ شہر تمنا کا------ جو ان دونوں نظموں میں قدر مشترک ہے۔ شہر تمنا کی کھوج اور اس کے لئے سفر، مسلسل سفر۔ ایڈگر ایلن پو کا گھڑ سوار اس کبھی نہ ختم ہونے والی تلاش سے نہ تو بیزار دکھائی دیتا ہے اور نہ مایوسیوں کے سامنے ہتھیار ڈالتا ہے۔ عمر کے آخری حصے میں جب وہ ایک ہم سفر سائے سے (جو اس کا ہمراز ہے) اپنی منزل کا پتہ پوچھتا ہے تو اسے اپنا سفر جاری رکھنے کی تلقین کے ساتھ پو کی نظم ختم ہو جاتی ہے۔ حد نظر تک پھیلے ہوئے صحراؤں کے سراب چونکہ کسی شدید رد عمل کے حامل نہیں ہوتے، یہ کردار ماورائی بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کے برعکس گلزار کا کردار (یامیں) گوشت پوست کا جیتا جاگتا فرد ہے۔ جس کا رویہ ویسا ہی ہے جیسا ہم میں سے بیشتر کا ہوتا۔ پو کے کردار کی طرح جب اس کی زندگی کی شام ڈھلنے لگتی ہے تو اس کے ذہن میں مایوسیاں اس خوف کو جنم دیتی ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ہرن ہی اسے اپنے سینگوں پر اٹھا کر کسی اندھی غار میں اتر جائے۔ گلزار کا کردار چونکہ ماورائی نہیں، ارضی ہے اس کی نظم ایک منطقی نتیجہ پر پہنچ کر ختم ہوتی ہے۔ میرے نزدیک یہ اس نظم کی ایسی خوبی ہے جو اسے "ایلڈوراڈو" سے کہیں آگے لے جاتی ہے۔

میری تمنا ہے کہ گلزار کے شعری مرغزاروں میں رنگ برنگے پروں والی شوخ رنگ تتلیوں کا رقص مدتوں جاری رہے کہ اردو شاعری کے سبزہ زار کو اس آبیاری کی بہت ضرورت ہے۔

تبصرۂ کتب

○ تبصرے کے لئے ہر کتاب کی ۲ جلدیں آنا ضروری ہیں

نام کتاب	:	"اردو مثنوی، مطالعہ اور تدریس"
مصنفہ	:	ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
سنہ اشاعت	:	۱۹۹۳ء (بار دوم)
ضخامت	:	۲۱۲ صفحات
قیمت	:	۱۰۰ روپے
ناشر	:	مصنفہ، ڈی ۱۱ / سی ۱ موتی باغ، نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۱
مبصر	:	پرویز شہریار

قدیم اردو ادب پر مصنفہ کی تحقیقی و تنقیدی نظر بطور خاص رہی ہے - ان کی پہلی تحقیقی کاوش "ریاست میسور میں مثنوی کا ارتقاء" پر انہیں ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی گئی تھی - بعد ازاں ان کی ادبی اور لسانی تلاش و جستجو کا سفر مختلف ابعاد میں جاری ہے - ان کا اصل میدان تحقیق اردوئے قدیم اور دکن ہے اور اس میں بھی تخصیص، صنف مثنوی کو حاصل رہی ہے - علاوہ ازیں لسانیات، قواعد زبان اور مثنوی ان کے محبوب موضوعات تحقیق ہیں -

پیش نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے -

یوں تو مثنوی پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور انتخابات شائع کئے جا چکے ہیں - لیکن کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کی ضروریات اور ان کے مسائل کے پیش نظر لکھی جانے والی اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں مثنوی کی ابتداء کی تاریخ اور مثنوی کی تدریس کے اصول سے بات شروع کرکے بلا امتیاز زماں و مکاں ہندوستان کے مشہور و معروف بلکہ مستند مثنوی نگاروں کے انتخاب کلام پیش کئے گئے ہیں -

اس کتاب میں فاضل مصنفہ نے نمونہء کلام پیش کرنے سے پہلے متعلقہ شاعروں کی حیات اور ان کے ادبی کارناموں سے بھی طلباء کو خاطر خواہ طور پر روشناس کرانے کی کوشش کی ہے - اس میں حضرت شاہ برہان الدین جانم سے لے کر میر حسن اور دیا شنکر نسیم لکھنوی تک پندرہ مثنوی نگاروں کی کل بائیس عدد مثنویاں شامل کی گئی ہیں -

پیش نظر کتاب میں اردو ادب تک کی نو دریافت اور مسلم الثبوت مثنویوں کو اس نقطہ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ طالب علموں - سردست ایسا مواد مل سکے جس سے کہ اردو مثنوی کی واقعی اہمیت کا اندازہ ہو اور معہ ایک مشت مطالعہ کا موقع بھی ملے - اس کے لئے موصوفہ نے مثنوی کی علاقہ اور مختلف ادوار پر مبنی مروجہ تقسیم سے قصداً انحراف کیا ہے اور انھیں ایک دھاگے میں تاریخ وار پرونے کی کوشش کی ہے - اس اعتبار سے اس میں دکن کے مذکورہ بالا شاعر کے علاوہ عبدل بیجاپوری، احمد گجراتی، صنعتی بیجاپوری، رستمی بیجاپوری، ابن نشاطی گولکنڈوی، ملا نصرت بیجاپوری، روشن علی سیار نگ پوری اور سراج اورنگ آبادی کی مثنویاں شامل ہیں - اسی طرح شمالی ہند کے سودا اور میر کے علاوہ اسمٰعیل امروہوی کی مثنویاں بھی منتخب کی گئی ہیں -

کتاب کے اولین حصے میں اردو مثنوی کی ابتداء سے بحث کی گئی ہے نیز قدیم مثنویوں کے سماجیاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے مثلاً قدیم مثنویوں کے موضوعات اور ان کے کرداروں کو اجاگر کیا گیا ہے -

لیکن اس کتاب کا حاصل مطالعہ مضمون "تدریس مثنوی" ہے جس میں بعض قابل قدر اصول مدلل طور پر پیش کئے گئے ہیں - اس سے طلباء کو مثنوی کے قصہ کا ماخذ، قدیم مثنویوں میں تاریخ تصنیف کی نشاندہی، تحریر مثنوی کی مدت اور قدیم مثنویوں میں مثنوی کے نام کی صراحت وغیرہ کی تفہیم میں مدد ملے گی - اس کے علاوہ مثنویوں میں شامل غزل، رباعی اور قصیدے وغیرہ کی بحروں کی شناخت کو سہل بنانے کی کوشش کی گئی ہے -

اپنی بات کے تحت مصنفہ نے اس کتاب کے اغراض و مقاصد بیان کرنے کے بعد فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ سے کتاب کی اشاعت کے لئے ملی جزوی مالی امداد کا بہت خوش اسلوبی سے اعلان اور شکریہ ادا کیا ہے -

عمدہ کاغذ، نفیس طباعت، مضبوط جزبندی، ہارڈ بونڈ اور دیدہ زیب سرورق کتاب کے حسن باطن کے ساتھ ساتھ خارجی حسن میں بھی اضافہ کرتے ہیں - آخر میں بقول مصنفہ "مجھے امید ہے کہ قارئین کو یہ نئے ڈھنگ کی کوشش پسند آئے گی" -

○○○○○○

نام کتاب	:	دھوپ کھلی ہے
شاعر	:	منوہر لال آہوجہ ۔ بیدل سرحدی
صفحات	:	۱۲۸ ۔ مجلد مع رنگین سرورق
قیمت	:	قسم خاص ۳۰ روپے ۔ معمولی ۱۰ روپے

ملنے کے پتے : سنت نرنکاری پبلی کیشنز
نرنکاری کالونی - دہلی - ۹
ماڈرن پبلشنگ ہاؤس - ۹ / گولہ مارکٹ
دریا گنج ، دہلی - ۲

تبصرہ : رئیس الدین فریدی

۴۷ - ۴۸ میں لاکھوں ہندو اور سکھ ان علاقوں سے جو پاکستان کہلائے نہایت دشوار گزار اور دردناک حالات میں ترک وطن کرکے ہندوستان آئے اور ابتدا میں یہاں بھی بڑی ٹھوکریں کھائیں ان میں سے جو لکھے پڑھے تھے وہ سب اردو سے واقف تھے - ان میں سے کچھ ایسے تھے جن کو سیاست اور مذہب کے کٹرپن نے دائرہ انسانیت سے دور کردیا تھا اور جو لوگ علمی مذاق رکھتے تھے وہ دائرہ انسانیت ہی میں رہے اور حد تو یہ ہے کہ انہوں نے اردو زبان اور اردو تہذیب کا دامن نہیں چھوڑا - اس قسم کے ایک انسان دوست منوہر لال آہوجہ بھی ہیں وہ شرنارتھی بن کر آئے - خوب ٹھوکریں کھائیں مگر نہ شرافت کو چھوڑا نہ اردو کو - انگریزی میں ایم - اے پاس - محکمہ ٹیلیفون کے افسر بنے - اردو کی عاشقانہ شاعری اور فطری خوش طبعی کی وجہ مشاعروں اور محفلوں کی جان بنتے رہے - ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو سکھوں کے نرنکاری مشن میں داخل ہوکر مادی ٹیلیفون کے بجائے روحانی ریڈیو میں مشغول ہوگئے اور تصوف - روحانیت - اخلاق - شرافت اور انسانیت کے گیت گانے لگے - زیر تبصرہ کتاب میں اسی دور کی ایک سو سے زیادہ غزلیں شامل ہیں - جن میں زبان و بیاں کی ساری خوبیاں موجود ہیں اور حالات و جذبات کی صحیح عکاسی کرتی اور اردو شاعری میں صوفیانہ - روحانی اور اخلاقی طرز کلام کی جو کمی ہورہی ہے اسے پورا کرتی ہیں کتاب چونکہ نرنکاری مشن کے اخوت کے پیغام کو عام کرنے کے نکتہ نظر سے چھپی ہے اسی لئے قیمت بھی کم رکھی گئی ہے مگر ہے قابل قدر - چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں -

بچھا رہا ہوں زمانے کی راہ میں کانٹے
مگر یہ بھول گیا خود برہنہ پا ہوں میں

بیدل کوئی اداس دکھائی نہ دے مجھے
دنیا کے غم سمیٹ لوں میرا جو بس چلے

یوں ذہن میں سودا ہے تعمیر و ترقی کا
جیسے ہمیں دنیا میں پھر لوٹ کے آنا ہو

لگے نہ ٹھیس کہیں دیکھ احتیاط برت
دلوں کو رکھتے ہیں شیشے کے برتنوں کی طرح

(میرانیس کے اس شعر سے استفادہ)

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

ایک فن ہے زندگی میں خود پہ ہنسنا دوستو
جو ہنسی غیروں پہ آئے وہ ہنسی کس کام کی

جل آب میں ہوتے ہوئے بہتر نہیں دیکھا
کانٹوں کو کبھی ہم نے معطر نہیں دیکھا

ہو کیا انداز کیا دستور ہے اے میکدے والے
کسی کے ہوش گم کردو کسی کو تشنگی بخشو

الغرض پوری کتاب اور پوری پوری غزلیں محبت - رواداری اور انسانیت کے پیغام سے بھری ہوئی ہیں بعض جگہ رندانہ یا عارفانہ بے باکی کا ضرورت سے زیادہ مظاہرہ بھی ہوگیا ہے - مثلاً

یا تو ہر ایک بت میں خدا کا جمال ہے
یا چشم انتخاب نہیں ہے کسی کے پاس

گفتگو کرتا ہوں جب بھی جام سے
ابتداء کرتا ہوں تیرے نام سے

اس کے علاوہ کچھ اشعار غلطیوں کا شکار بھی نظر آتے ہیں جو کاتب کے کھاتے میں نہیں جاسکتی ہیں - مثلاً

کرکے اشارہ آپ نے مجھ کو خدا دکھادیا
اب تک پڑا تھا آنکھ پہ پردہ جو وہ ہٹا دیا

دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہیے تھا

آنکھوں پہ جو حجاب تھا آپ نے وہ اٹھا دیا

اسی غزل کا ایک اور شعر

یوں تو سیاہ رات کا کتنا بہت محال تھا
لیکن کسی کی یاد نے پھر سے دیا جلادیا
(محال کے ساتھ بہت کا استعمال محل نظر ہے لیکن کی جگہ ایک ہونا چاہیے تھا۔ پھر سے معیوب ہے۔ صرف پھر کافی ہوتا ہے)
صفحہ ۲۸ کی غزل کا ایک شعر

مایا کے جنگل سے انسان
بچنا چاہے بچ نہ پائے

اسی طرح

ہم بڑے دو ٹٹ دریا کے
ساتھ رہے اور مل نہ پائے

ان دونوں شعروں میں محاوروں کے نہ کی جگہ نہیں موزوں رہتا۔
بعض غزلوں میں اردو میں ہندی کی ملاوٹ ضرورت سے زیادہ ہے مگر لطف سے خالی نہیں۔ مثلاً

جانت بجانت کے چہرے دیکھے وکست چہرے وکرت چہرے
آدرسوں کے درپن چہرے پیڑاؤں سے کھنڈت چہرے

مجموعی طور پر بیدل سرحدی صاحب کی کوشش و کاوش لائق داد اور قابل قدر ہے اور وہ خود حقدار مبارک باد ہیں۔

ooooo

نام کتاب	:	انداز غزل
شاعر	:	ڈاکٹر شفیق اعظمی
صفحات	:	۱۴۲
قیمت	:	۵۰ روپے
تقسیم کار	:	نصرت پبلشرز، امین آباد، لکھنؤ-۲۲۶۰۱۸
مبصر	:	عاصم شہنواز شبلی

"انداز غزل" ڈاکٹر شفیق اعظمی کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو غزلوں پر مشتمل ہے۔ محترم کیفی اعظمی اور ڈاکٹر اختر بستوی جیسے معتبر شاعروں کی آرا بھی کتاب میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر شفیق اعظمی ایک نوجوان شاعر ہیں اور ان کی شاعری کی عمر بھی زیادہ لمبی نہیں ہے۔ اس کے باوجود کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ شاعر کے کلام میں پختگی فکر اور فنکارانہ مہارت کی کمی ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعر نے علم اور مطالعے کی وسعت سے اپنے ذہن کو مالا مال کیا ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ڈاکٹر اختر بستوی جیسے اچھے شاعر کی رہنمائی بھی ان کے کام آئی ہو۔ کیونکہ کہیں کہیں اختر صاحب کی ہلکی سی چھاپ شفیق صاحب کی بعض غزلوں میں نظر آجاتی ہے اور یہ بات قابل گرفت نہیں کیونکہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔

کلاسیکیت اور جدیدیت کے امتزاج سے شفیق اعظمی کی غزلوں کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ جو شاعر روایت کا پاسدار بھی ہو اور ساتھ ساتھ اپنی تخلیقی صلاحیت کے تحت نئے مضامین اور نئے پیرائے کی تلاش میں سرگرداں ہو۔ ایسی ہی غزلوں میں روایت اور جدت کی آمیزش نظر آئے گی۔ مستقبل کا لائحہ عمل یا مستقبل میں غزل کا سفر ان ہی پر منحصر ہوگا۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ ڈاکٹر شفیق اعظمی کا تعلق اسی گروہ سے ہے۔ ڈاکٹر شفیق اعظمی کے بعض اشعار تو بالکل لاسلا ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھیں جو مستقبل کی غمازی کرتے ہیں۔

کام تو مل بھی جائے گا لیکن
مسئلہ شہر میں مکان کا ہے
گھر کے اندر حبس گھٹن
باہر ہر سو آگ لگی
رات میں آسیب پھرتے ہیں تمام
شام ہوتو گھر چلے آیا کرو

ان اشعار کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں ایسے اشعار بھی نظر آجاتے ہیں جو چاول کھاتے کھاتے کنکر کا احساس دلا جاتے ہیں۔ بعض شعر محض STATEMENT بن کر رہ گئے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی "انداز غزل" ایک اچھی کاوش ہے اور مستقبل میں ان سے مزید اچھے مجموعے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

ooooo

نام کتاب	:	بے گھری
کہانی کار	:	مشتاق انجم
صفحات	:	۱۰۴
قیمت	:	۳۰ روپے
سنہ اشاعت	:	۱۹۹۴ء
تقسیم کار	:	دستک کتاب گھر، شیب پور، ہوڑہ-۲
مبصر	:	عاصم شہنواز شبلی

"بے گھری" مشتاق انجم کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں

"بے گھری" سے "کالڈی پرچم تک" ۱۷ کہانیاں شامل ہیں - "بے گھری" چونکہ مشتاق انجم کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ہے اس لئے اس کا جائزہ اسی روشنی میں لیا جانا چاہیے - نقش اول اس بات کا ثبوت ہے کہ مصنف کے اندر ایک کہانی کار چھپا ہوا ہے جسے حالات موافق ہونے پر ابھر کر سامنے آنے کا موقع ملے گا - "بے گھری" میں شامل کہانیوں میں استعارہ، علامت اور تمثیل کی بے جا بھرمار نہیں ہے بلکہ سیدھی سادی زبان میں ہمارے درد و داغ اور شکست و ریخت کی کہانیاں ہیں - ان کہانیوں کو حسیات کی کہانیاں بھی کہہ سکتے ہیں -

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مشتاق انجم کے افسانوں میں انسان کی زندگی اور اس کا سماج جھانکتا ہوا نظر آتا ہے - ان کے افسانے "بے گھری"، "قیادت کا لہو"، "خراج عقیدت"، "بوسیدہ عمارت کے معمار" اور "بند کمرے کے باہر" پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں - ان افسانوں میں انہوں نے اپنی باتیں بڑی فنکاری سے پیش کی ہیں - مشتاق انجم کے محسوسات، تجربات اور ذوق تجسس اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کی نگاہیں تیز ہیں اور وہ گہرائی تک جا کر چیزوں کو پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں - مشتاق انجم کے افسانے کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان کے یہاں کہانی کا حسن مجروح نہیں ہوا ہے - دو تین افسانے کچھ کمزور ضرور ہیں لیکن اچھے افسانوں کی بھیڑ میں ان پر توجہ کم پڑتی ہے - مجھے یقین ہے کہ ان کا آئندہ مجموعہ زیادہ زوردار اور پر تاثر ہوگا جو یقیناً ان کی شناخت میں معاون ثابت ہوگا - اس کتاب کا پیش لفظ مشہور افسانہ نگار انیس رفیع نے لکھا ہے اور ان کے روشن مستقبل کی پیشگوئی کی ہے - "بے گھری" کی کتابت اور طباعت پر دھیان نہیں دیا گیا ہے -

ooooo

کتاب کا نام	:	رقص تنہائی (مجموعہ منظومات)
مصنف	:	علی اصغر
سنہ اشاعت	:	۱۹۹۳ء
صفحات	:	۱۴۸
قیمت	:	۵۰ روپے
ملنے کے پتے	:	(1) مکتبہ شعر و حکمت، حیدر آباد
		(2) (ناشر) حیدر آباد ادبی و تہذیبی فورم ۴/۱۸۴، نیو ملکہ نگر کالونی، حیدر آباد - ۵۰۰۰۳۶ (اے - پی)
تبصرہ نگار	:	ڈاکٹر خالدہ حسین

"رقص تنہائی" علی اصغر کا پہلا شعری مجموعہ ہے - اس شعری مجموعے میں صرف دو غزلیں اور ایک سو اکتالیس نظمیں ہیں - علی اصغر حیدر آباد کے مشہور شاعر ہی نہیں، وہ انگریزی ادب کے استاد بھی ہیں - عثمانیہ یونیورسٹی سے انگریزی اور فلسفہ میں ایم - اے کرنے کے بعد ہی وہ وہاں کے مختلف کالجوں میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے ہیں - اور ان دنوں ان کا تعلق گورنمنٹ کالج آف آرٹس اینڈ سائنس (نظام آباد) سے ہے - انہیں بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا - چنانچہ فلسفہ اور انگریزی ادب کے وسیع و عمیق مطالعہ نے ان کی شاعری کو جلا بخشی -

علی اصغر کو گوشہ نشینی اور کتب بینی پسند ہے - رقص تنہائی کے دیباچے میں انہوں نے لکھا ہے : "تنہائی دروں بینی کو تقویت پہنچاتی ہے اور معرفت ذات اور سچائی کے ادراک میں معاون ثابت ہوتی ہے" -

علی اصغر نے پروفیسر شیو کمار کی ابتدائی انگریزی نظموں کے اردو میں منتقل کیا ہے اور یہ ترجمے رسالہ "سب رس" میں شائع ہوئے - انہوں نے انگریزی نظموں کے علاوہ تلگو نظموں کے ترجمے بھی کئے ہیں، جو "ایک اور نیا پل" نامی ذو لسانی مجموعے میں شامل ہے -

علی اصغر نے مغربی شعرا کے اثرات قبول کئے ہیں، جس کا اعتراف انہوں نے اپنے دیباچے میں خود کیا ہے - "انگریزی رومانی تحریک نے مجھے کافی متاثر کیا ہے - خاص کر ورڈزورتھ اور کیٹس نے" گولڈ اسمتھ، دوستوولسکی، ٹالسٹائی اور کافکا کے ساتھ ہی انہیں ایمجسٹ شعرا بہت پسند رہے ہیں - ہندوستانی شعراء میں مجاز، مخدوم، میرا اور بنگالی شاعر ٹیگور سے انہیں خاص شغف رہا ہے -

علی اصغر ابتدا میں غزلیں کہتے تھے لیکن میلان طبع نظم کی طرف ہونے کی وجہ سے انہوں نے زیادہ توجہ نظم پر دی ہے - یہی وجہ ہے کہ اس شعری مجموعے میں نظمیں کثیر تعداد میں ہیں، جن میں بیشتر آزاد نظمیں ہیں - آزاد نظم کے بارے میں ان کا نظریہ ہے کہ "شاعری کا آہنگ نثر کے آہنگ سے مختلف ہوتا ہے - اس لئے آزاد نظم میں اگر یہ آہنگ برقرار نہ رہ سکے تو پابند شاعری کرنی ہی بہتر ہے -" ان کا یہ بھی نظریہ ہے کہ جس شاعری میں صرف فلسفیانہ اظہار خیال ہو، سوز و گداز، سلاست و روانی اور شگفتگی نہ ہو تو وہ شاعری شاعری نہیں بلکہ فلسفہ بن جاتا ہے - چنانچہ علی اصغر کی آزاد نظمیں ان کے اس نظریہ فن کی پوری پوری ترجمانی کرتی ہیں - ان میں شاعرانہ آہنگ، سلاست اور روانی کے علاوہ رومانی محزونی بھی ہے - زیر تبصرہ مجموعے کی نظمیں حقیقی شاعری کے نمونے پیش کرتی ہیں - اور یہ بھی ثابت کرتی ہیں کہ علی اصغر لفظوں کے جوڑ توڑ کی شاعری کو شاعری نہیں سمجھتے - ان ہی کا شعر ہے :

جوڑ توڑ لفظوں کا شاعری نہیں ہوتا
لوگ جانے کیوں ایسا بار بار کرتے ہیں

پروفیسر مغنی تبسم نے ان کی شاعری کے بارے میں یہ بڑی اچھی رائے دی ہے کہ "علی اصغر کی فنکاری کے جوہر خاص طور پر مختصر لفظوں میں اجاگر ہوتے ہیں۔ مختصر نظم بیانیہ کی تفصیل کی متحمل نہیں ہوتی اور اس معاملے میں غزل کے شعر سے مماثلت رکھتی ہے۔ علی اصغر اختصار اور جامعیت پیدا کرنے کے لئے ایمائیت سے کام لیتے ہیں۔ اور کبھی پیکر تراشی کے ذریعہ وہ کسی خیال، تجربے یا واردات کو تصویر میں ڈھال دیتے ہیں۔"

یہ رائے اتنی اچھی اور نپی تلی ہے کہ علی اصغر کی نظمیں پڑھنے کے بعد کسی کو اس کی تردید کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر نظموں کے اقتباسات دینے کی بجائے یہاں صرف دو مختصر نظمیں دی جارہی ہیں تاکہ علی اصغر کی شاعری کا کچھ ذائقہ قارئین کو بھی مل جائے:

تنہا

ایک پرندہ
پاگل، یخ بستہ جاڑوں میں
برگد کی ننگی ٹہنی پر
راتوں کو چھا کرتا ہے

اس برگد پر
جس کی شاخوں کے نیچے ہم
خوابوں کی دنیا میں کھو کر
راتیں کاٹ دیا کرتے تھے

ooooo

ادھوری ملاقات

میں جب اس کے گھر جاؤں گا
میرے قدموں کی آہٹ سے
اس کی پلکیں جھک جائیں گی
سرگوشی میں باتیں کرنے کی خواہش سے
پیاس بڑھے گی
خاموشی سنگیت بنے گی
میں کچھ کہنے کی کوشش میں
دیواروں پر ٹنگے ہوئے منظر دیکھوں گا
وہ کھڑکی سے باہر کی دنیا میں جیسے کھو جائے گی
ٹیلی فون سہارا دے گا
اور ہم اپنی ٹھنڈی چائے کو
تنہا چھوڑ کے اٹھ جائیں گے

ooooo

زیر نظر مجموعے کی صرف معنوی خوبیاں ہی متاثر نہیں کرتیں، ان خوبیوں تک پہنچنے سے پہلے ہی مجموعے کا صوری حسن اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے یہ حسن پیدا ہوا ہے، پرکشش سرورق جو نفیس کاغذ، عمدہ کتابت اور روشن طباعت سے راشٹرپتی انعام یافتہ مصور پی سدرشن کی مہارت کا نمونہ ہے۔

تاثرات بہ سلسلہ مضمون "گوپی چند نارنگ - کردار اور گفتار"

محمد حامد علی خان
جیل روڈ، مظفرپور، بہار

محمد حامد علی خان کی تحریر ہمیں عرصہ قبل موصول ہو چکی تھی - اور اپنی اشاعت کی باری کی منتظر تھی - اس کی کتابت بھی ہو چکی تھی اور اکتوبر کے شمارے میں وہ شائع ہونے والی بھی تھی - اسی اثناء میں افسانہ نگار رام لعل صاحب کا خط موصول ہوا جس میں انہوں نے اپنے خطوط کے مرتب خورشید ملک کی سرزنش سخت الفاظ میں کی تھی - ہنگامی طور پر وہ خط اکتوبر کے شمارے میں شائع کرنا پڑا - لیکن رام لعل جی کی وضاحت کے بعد حامد علی خان کی تحریر کے بعض حصے اشاعت کے قابل نہیں رہ گئے - چنانچہ اب ان کے مضمون کے بعض حصے حذف کئے جا رہے ہیں - حامد علی خان کا وسیم مینائی شاہجہاں پوری کی تحریر کے خلاف ہر اعتراض جو انہوں نے ڈاکٹر قمر رئیس کو ملوث کرتے ہوئے شائستہ اور مہذبانہ انداز میں پیش کیا ہے شائع کیا جا رہا ہے - آئندہ اس سلسلے میں صرف ڈاکٹر نارنگ اور ڈاکٹر قمر رئیس صاحبان کی تحریروں کو انشاء میں جگہ دی جا سکتی ہے - بصورت دیگر یہ سلسلہ اب بند سمجھا جائے -

محمد حامد علی خان بدم شری ڈاکٹر نارنگ پر پی - ایچ - ڈی کر چکے ہیں - ان کی تھیسس بڑے سلیقے اور اہتمام سے شائع ہوئی ہے -

مدیر

رسالہ "انشاء" کے نومبر دسمبر ۹۴ء کے شمارے میں کسی وسیم مینائی کا مضمون "گوپی چند نارنگ - کردار اور گفتار" نظر سے گزرا - اس پر مدیر نے نوٹ دیا ہے کہ "مضمون نگار کی رائے سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے" - مضمون سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ وسیم مینائی کہاں کے شاعر یا ادیب ہیں اور ان کی ادبی حیثیت کیا ہے؟ اور یہ چیتھڑا مضمون انہوں نے کس کے کہنے پر لکھا ہے - اس میں ایک بلند مرتبت ادیب کی کردار کشی کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے، حد درجہ لائق مذمت ہے اور اس سے لکھنے والے کی بددیانتی جھلکتی ہے - مذکورہ مضمون میں جان بوجھ کر حقائق کو مسخ کیا ہے اور سیاق و سباق سے خطوط کے جملوں کو ہٹا کر قارئین کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے - محرر مضمون نگار کو اس پر غصہ ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ڈاکٹر قمر رئیس کو رام لعل کے نام اپنے خط میں "سازشی" کیوں کہا ہے؟ محرر مضمون نگار نے "قند مکرر" کا یہ خط غور سے پڑھنے کی زحمت نہیں کی (اور وہ پڑھتے بھی کیسے چونکہ مضمون تو لکھا نہیں لکھوایا گیا ہے) - یہ خط انجمن ترقی اردو کی مجلس عام کے الیکشن کے بارے میں ہے جس کی رکنیت کے لیے رام لعل امیدوار تھے اور انہوں نے پروفیسر نارنگ کو حمایت کے لیے لکھا تھا - مضمون نگار کو شاید یہ معلوم نہیں کہ جمہوریت میں کسی شخص کا اپنی رکنیت کے لیے ووٹ مانگنا یا امیدوار کے حامیوں کا اس کی تائید کے لیے دوسروں کی حمایت کرنا کوئی جرم نہیں ہے - اس خط میں کئی لوگوں کا ذکر آیا ہے جن کے ووٹ پر رام لعل بھروسہ کر رہے تھے - ان میں سے بعض نے رام لعل کو ووٹ دیا بعض نے نہیں دیا - اس تناظر میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا پورا جملہ یوں ہے :

"قمر رئیس انتہائی بے ایمان اور سازشی آدمی ہے، وہ ہرگز آپ کو ووٹ نہیں دے گا"

ڈاکٹر نارنگ نے اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ پورا کمیونسٹ گروپ ایک ساتھ ووٹ دے رہا ہے ایک ایسے شخص کو جو وزیر ہونے والا ہے کیونکہ یہ لوگ کرسی کو پوجتے ہیں - اگر منافق کو منافق کہنا غلط ہے یا اگر جھوٹے کو جھوٹا کہنا غلط ہے تو یقیناً نارنگ صاحب کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا - ڈاکٹر نارنگ کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ کلمہ حق کہنے سے انہیں کوئی نہیں روک سکتا - ان کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ انتہائی صاف گو اور

بیباک توی ہیں، جس کی مدد کرتے ہیں کھل کر کرتے ہیں اور اگر کسی کو منافق یا ریاکار جانتے ہیں تو اس کو بے نقاب کرنے سے باز نہیں آتے۔ شاید محرر مضمون نگار کا عندیہ یہ ہے کہ پروفیسر نارنگ کو راست گفتاری سے کام لینا نہیں چاہیے تھا۔ ان کو شاید یہ معلوم نہیں کہ ڈاکٹر نارنگ نے ہمیشہ راست گفتاری ہی کی راہ کا انتخاب کیا ہے خواہ اس میں کتنے ہی کانٹے کیوں نہ بچھے ہوں۔ بے شک اس راست گفتاری کی ان کو بھاری قیمت چکانا پڑی ہے اور بار بار ان کے خلاف سازشوں اور الزام تراشیوں کا بازار گرم کیا گیا ہے۔ تازہ مضمون میں ایسی ہی مذموم کوشش ہے لیکن ڈاکٹر نارنگ کی بنیاد چونکہ حق پر ہوتی ہے ان کے مخالفوں کو ہمیشہ منہ کی کھانا پڑی ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ پچھلے تقریباً چالیس سال سے جس رہنمائی اور دل سوزی سے اپنا علمی کام کرتے رہے ہیں اور آج دنیائے علم و ادب میں ان کی تصانیف اور ان کی فکر کی بنا پر ان کا جو مقام و مرتبہ ہے، اور نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان اور بین الاقوامی سطح پر ان کے کام کو جس عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اس کے پیش نظر اگر ان کے بعض معاصرین ان سے حسد کا رشتہ رکھتے ہیں یا ان کے خلاف رشک و رقابت کا بازار گرم کرتے ہیں، یا بعض نام نہاد ترقی پسند فاشسٹی حربوں کو بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ڈاکٹر نارنگ ایسی حرکتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں تاکہ ان کے علمی انہماک میں رخنہ اندازی نہ ہو، اور فضول باتوں میں وقت برباد نہ ہو۔ لیکن زیر بحث خط میں معاملہ خود ان کی ذات کا نہیں بلکہ رام لعل کا تھا اور وہ ان کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے سچائی ان کے قلم سے نکل گئی۔ یعنی میرے ساتھ تو جو ہوتا رہا ہے سو ہوتا رہا ہے، لیکن تم کو ووٹ ملنے والا نہیں۔ چنانچہ یہی ہوا اور رام لعل الیکشن ہار گئے۔ ڈاکٹر نارنگ کی پیشن گوئی سچ ثابت ہوئی۔ انجمن ترقی اردو ہند کے ۱۹۸۱ء کے مجلس عام کے ریکارڈ سے اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر نارنگ نے یہ کڑوا سچ اپنے لیے نہیں، یا ڈاکٹر قمر رئیس کو نیچا دکھانے کے لیے نہیں، بلکہ رام لعل کو متنبہ کرنے کے لیے کہا تھا۔

اسی طرح اس مضمون میں دوسرے جملے بھی سیاق و سباق کاٹ کر پیش کیے گئے ہیں۔ جہاں تک صیغہ واحد کا تعلق ہے تو ادیبوں میں بے تکلفی میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔ اس میں کسی کی تحقیر کا پہلو تلاش کرنا خود مضمون نگار کی اپنی بد دیانتی کو ظاہر کرتا ہے۔ کلام حیدری کے بارے میں صاف لکھا ہے "آہنگ کا تازہ فکشن نمبر آپ نے دیکھا ہوگا، کلام حیدری کی محنت لائق داد ہے"۔ لیکن اس جملہ کو پردہ خفا میں رکھ کر مضمون نگار نے فقط بعد کا جملہ لکھ کر بیہودہ ریمارک کیا ہے۔ جس سے بغض و کینہ صاف جھلک رہا ہے۔

ڈاکٹر نارنگ اگر ٹی۔ وی پر مقبول ہیں تو اس پر بھی طنز کیا ہے۔ یعنی اگر ٹی۔ وی والے ڈاکٹر نارنگ کو بلاتے ہیں یا وہ اپنے موضوع پر پورے غور و فکر سے بولتے ہیں یا جیسا کہ مشفق خواجہ اور بہت سے دوسروں نے لکھا ہے کہ وہ سننے والوں پر سحر طاری کر دیتے ہیں تو گویا اس میں بھی ڈاکٹر نارنگ کا قصور ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ "قند مکرر" (مرتبہ خورشید ملک) میں قمر رئیس کا صرف ایک خط شامل ہے۔ شاید باقی خطوط روک لیے گئے لیکن اس خط میں بھی دل کا چور زبان پر آگیا ہے۔ مثل مشہور ہے چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ اس خط میں ڈاکٹر نارنگ تو کیا، قمر رئیس نے آل احمد سرور اور ڈاکٹر محمد حسن کو بھی نہیں بخشا۔ رام لعل کو لکھا ہے کہ اگر آپ ان لوگوں سے گوشہ کے لیے مضمون لکھوا رہے ہیں تو پھر میں شریک نہیں ہوں گا (صفحہ ۲۳۵) غور طلب ہے کہ سرور صاحب اور محمد حسن قمر رئیس کے اساتذہ میں شامل ہیں اور ڈاکٹر محمد حسن کا درجہ تو مربی و محسن کا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ قمر رئیس کو قمر رئیس بنانے میں ڈاکٹر محمد حسن کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ مرتب کتاب خورشید ملک کی جانبداری کی پول اسی سے کھل جاتی ہے کہ ڈاکٹر قمر رئیس کے اس خط پر انہوں نے کوئی نوٹ نہیں دیا ہے۔ جب کہ اپنے دیگر نوٹس میں پروفیسر گیان چند جین تک کو نہیں بخشا۔

محرر مضمون نگار نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی رپورٹ کے بارے میں بھی غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ یہ رپورٹ ریکارڈ میں موجود ہے اور اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ محرر مضمون نگار کو یہ تک نہیں معلوم کہ انکوائری ڈاکٹر نارنگ کے خلاف نہیں بلکہ بعض شر انگیز طلبا کے [illegible]

تھی۔ یہ بات بھی غلط کہی گئی ہے کہ یہ رپورٹ شائع نہیں ہوئی۔ یہ شائع شدہ موجود ہے اور جہاں اس کا حوالہ دیا جارہا ہے۔ البتہ بعض لوگ جو ڈاکٹر نارنگ سے حسد کرتے تھے، انہوں نے ڈاکٹر نارنگ کے خلاف سازش کی۔ ڈاکٹر قمر رئیس صاحب بھی در پردہ غلط باتوں کی تشہیر میں پیش پیش رہے۔ جسٹس حمید اللہ بیگ نے نہ صرف ڈاکٹر نارنگ کو الزام سے بری قرار دیا بلکہ اپنی رپورٹ میں واضح لفظوں میں ڈاکٹر نارنگ کی تعریف کی۔ جامعہ کے شعبہ اردو کو چند ہی برسوں میں انہوں نے جس مقام پر پہنچا دیا اس کا اعتراف بھی رپورٹ میں موجود ہے۔ یہ رپورٹ اس زمانے کے تمام اخبارات میں شائع ہوئی۔ پٹنہ کے "عظیم آباد ایکسپریس" نے پورے دو صفحوں پر مکمل رپورٹ شائع کی، اس میں سرخی لگائی گئی "پروفیسر نارنگ نہ فرقہ وارانہ ذہن رکھتے ہیں اور نہ فرقہ پرست ہیں"۔ اس سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو :

> "جن اشخاص کو ریڈر اور پروفیسر کی حیثیت سے ترقی دی گئی زیادہ تر ان کا انتخاب صحیح نہیں تھا، اور وہ مطلوبہ قابلیت کو پورا نہیں کرتے تھے چنانچہ نتیجے کے طور پر قابلیت کی شرط کو نرم کرنا پڑا۔ کمیٹی اس بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ پروفیسر نارنگ کی قابلیت اور لیاقت کے پیش نظر، نیز ان کی تحقیقی صلاحیت، اردو ادب کی خدمات اور شعبہ اردو کی زبردست توسیع کے پیش نظر کمیٹی اس حالت میں نہیں ہے کہ پروفیسر نارنگ کے تقرر کو غیر مستحق قرار دے۔ جہاں تک یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہونے کا سوال ہے ان کی اہلیت مسلم ہے"۔
>
> (عظیم آباد ایکسپریس، پٹنہ، ۱۵/ اگست ۱۹۷۹ء، ص ۲،۵)

شاید ڈاکٹر قمر رئیس صاحب یا اس نوع کے لوگ یہ چاہتے ہیں ڈاکٹر نارنگ کے شاگرد، مداح اور ہمدرد بھی اراکین "نوائے جامعہ۔ اردو" کی طرح باقاعدہ رسالے شائع کرکے اردو کے فاشسٹوں کی حرکتوں کو بے نقاب کریں، جو تنگ نظری اور خبث باطن کی بنا پر دوسروں کی تذلیل کرتے ہیں، اور نتیجتاً اردو کے کاز کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

ایل اینڈ ٹی L & T

کثیرالابعاد انجینرنگ اور تعمیراتی کمپنی

لارسن اینڈ ٹوبرو لمیٹڈ
(L&T) کئی کمپنیوں کا مجموعہ ہے جس کے تحت کئی مقامات پر مینوفیکچرنگ کمپلیکس، کارخانے، دفاتر اور سروس اڈے قائم ہیں - اس کی مصنوعات اور خدمات کی فہرست میں مندرجہ ذیل اشیاء اور منصوبے شامل ہیں۔

بوتلوں کے ڈھکن - کیمیا - پیٹرو کیمیا - فولاد اور سمنٹ تیار کرنے والی مشینیں - سمنٹ، محیطی کمپیوٹر اور سافٹ ویر (Peripheral Computers) - تعمیرات - کنٹرول اور خود کاریات - ڈیزل انجن اور جنریٹر سیٹ - وسائل نقل و حمل - وسائل تعمیرات - انجینرنگ - سامان رسانی اور تعمیرات - غذائی پروسیسنگ کے پلانٹ - نکلیائی طاقت کے ہارڈ ویر اور خلائی تحقیق - میڈیکل الکٹرونکس - ساحلی تیل - اور گیس پیداوار کے پلیٹ فارم - پٹرول اور ڈیزل کے پمپ - برقی پراجکٹ - شپنگ - سوئچ گیئر - ٹیلی مواصلات - جانچ اور پیمائش کے آلات - ربر اور پلاسٹک پروسیسنگ کی مشینری - ولو (Valves) اور جھلائی دھات (Welding alloy)

L & T کو ۱۹۳۸ء میں دو ڈینش انجینروں، ہیننگ ہالک لارسن اور سورین کرستیان ٹوبرو نے پارٹنرشپ میں قائم کیا۔ ۱۹۴۶ء میں یہ ایک پرائیوٹ لمیٹڈ کمپنی اور ۱۹۵۰ء میں لمیٹڈ کمپنی بن گئی۔ اب اس وقت اس کے تقریباً دس لاکھ حصص دار ہیں اور ۳۲ ہزار سے زائد اس کے ملازمین ہیں۔ ایل اینڈ ٹی ہندوستان کی پانچ سب سے بڑی نجی سیکٹر کمپنیوں میں سے ایک ہے ۳۱ مارچ ۱۹۹۵ء کو ختم ہونے والے سال میں L & T کی فروخت اور دیگر آمدنی کے اعداد ۳۳۱۸۰ ملین روپیے ہیں۔

L & T کے پیداواری مراکز:

○ **پووال اور مدھ، بمبئی**: پلانٹ اور بھاری ساز و سامان - سوئچ گیئر - پٹرول پمپ - بوتلوں کے ڈھکن - کنٹرول اور خود کاریات - جھلائی دھاتیں اور انڈر کیرج پرزے۔

○ **تھانے**: الکٹرونکس اور انڈر کیرج کے پرزوں کو تیار کرنے والے اینٹ۔

○ **اوارپور**: سمنٹ

○ **ناسک**: ہلکے وزنی شیشوں کے Containers ظروف

○ **انکلیشور، گجرات**: جھلائی دھاتیں

○ **کنس بہل، اڑیسہ**: فولاد، کاغذ اور Pulp تیار کرنے کے پلانٹ سامان اٹھانے والی اور معدنی پروسیسنگ مشینیں

○ **فرید آباد (ہریانہ)، احمد نگر (مہاراشٹرا)**: سوئچ گیئر۔

○ **میسور**: طبی برقی اوزار - محیطی کمپیوٹر - ٹیلی مواصلات - جانچ اور پیمائش کے اوزار۔

○ **بنگلور**: ارتھ موونگ اور تعمیراتی آلات و اوزار - ہائڈرولک سامان - ڈیزل انجن اور جنریٹر سیٹ۔

○ **حاضرہ (گجرات)**: اوور ڈائمنشن کے بھاری ساز و سامان۔

○ **ہیری (مدھیہ پردیش)**: سمنٹ۔

○ **مدراس**: ولو (Valves) - ربر اور پلاسٹک پروسیسنگ مشینری۔

○ **پیتم پور (مدھیہ پردیش)**: Load backhoes

○ **کانڈلا (گجرات)**: برآمدی مقصد کی مصنوعات

○ **پانڈیچری**: ٹرانسمشن ٹاور (مواصلاتی مینار)

زیر تعمیر درگارپور ایکسپریس وے

○ جدید اسٹریم لائنڈ کرشر سسٹم معیار کی ضمانت ہے۔

○ ارتعاشی رودر گاڑی سڑک کے جماؤ میں مصروف۔ درگاپور ایکسپریس وے میں اس کا استعمال ہو رہا ہے۔

○ فرش ہموار کیا جارہا ہے۔

O کلول (گجرات) : برآمدی مقصد کے جوتے

O جھاڑ سوگووا (اڑلیسہ) : سمنٹ پسائی کا کارخانہ

L & T کی دو ذیلی کمپنیاں ہیں :

L & T Mc Neil Limeted (1)

یہ ربر پروسیسنگ کرتی ہے - ٹائر اور مرمتی ٹائر بنانے کی مشین اور پلاسٹک انجکشن مولڈنگ کی مشینیں بناتی ہے -

L & T Finance Limeted (2)

یہ ایکسپورٹ فینانس ، ہائر پرچیز ، سامان لیزنگ ، پراجکٹ فینانس ، مالیات ، فکسڈ ڈپازٹ میں معروف ہے -

L & T کی سات معاون کمپنیاں بھی ہیں :

L & T نے تکنیکی معلومات کے لئے عالمی شہرت یافتہ انجینرنگ کمپنیوں سے پیشہ ورانہ رابطے قائم کر رکھے ہیں - اس کے لئے اس نے اپنی ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ کے شعبے قائم کر رکھے ہیں اور ہر شعبے میں بہت ہنرمند انجینیز اور ماہر صنعتی ڈیزائن بنانے والے موجود ہیں -

لیڈر شپ :

ہندوستان میں اپنی کارکردگی کے بیشتر علاقوں میں L & T کی پوزیشن ہمیشہ اول رہی ہے - ملک کو سب سے پہلے پاؤر ورکنگ کھدائی کا چلن اس نے دیا - اس نے تکنیکی ری ایکٹر اور خلائی سواری کا ہارڈ ویر سب سے پہلے تیار کیا -

ہندوستان میں مندرجہ ذیل بدولت گھریلو سطح پر اسی کی بدولت ہوئے :

1) Hydrocracker reactor

2) 300 Tonne Capacity torpedo ladle cars

تین سو ٹن کا بوجھ اٹھانے والی تارپیڈو سیڑھی گاڑیاں

3) Cut naphtha plant

4) Hydraulic drive for sugar nulls (104")

5) Bag – O – Matic tyre curing press

(پوری دنیا میں پہلی بار)

6) Vertical dairy in india

دودھ کی عمودی ڈیری

انعامات :

نیشنل ریسرچ اینڈ ڈولپمنٹ کارپوریشن سے ایجاد (invention) کا قومی ایوارڈ حاصل ہوا - Hanover میلے میں اپنی مصنوعات کے ڈیزائنوں کے لئے متعدد بار Dietute industrieform ایوارڈ ملے - مزید برآں L & T کو بمبئی چیمبر آف کامرس سے سال ۱۹۹۴-۹۵ء کا Good Corporate Citizen Award بھی حاصل ہوا جو سماجی زندگی اور کارپوریٹ سیکٹر کا معیار اونچا کرنے والے تجارتی ادارے کو دیا جاتا ہے -

L & T سمنٹ سب سے اعلیٰ درجے کی قرار دی جاتی ہے - اور سب سے مہنگی بکتی ہے اس سمنٹ سے ہندوستان میں اور بیرون ہندوستان عظیم الشان تعمیرات مکمل ہوئی ہیں - دہلی کا بہائی ہاؤس (بہائیوں کا عبادت خانہ) جسے بیسویں صدی کا تاج محل قرار دیا گیا ہے - کمپنی کے ECC کنسٹرکشن گروپ نے اسی سمنٹ سے تیار کیا ہے - علاوہ ازیں ECC نے ملائشیا میں پل ، ازبکستان (سابق روس) میں ہوٹل ، ابو ظہبی میں ایک انٹرنیشنل ایرپورٹ ٹرمنل اور مشرق وسطیٰ میں ایک اسٹیڈیم ، ایک مہاجرین قصبہ ، ایک پولیس ہیڈکوارٹر کی بلڈنگ ، تیل کی تنصیبات گیس تقسیم کے مراکز ، متعدد کارخانے دودھ فارم ، پھلوں کے پروسیسنگ کارخانے بنائے - اور اب نیپال ماریشس ، روس اور عمان میں منصوبے تیار ہو رہے ہیں -

L & T کے منیجنگ ڈائرکٹر اور چیف ایگزیکٹیو افسر ایس - ڈی - ککارنی ہیں - وہ بہترین تنظیم کے لئے کارپوریٹ مینجمنٹ کی سربراہی کرتے ہیں -

L & T سڑک سازی میں :

L & T کے ECC کنسٹرکشن گروپ نے اپنے دائرہ کار کی توسیع کرتے ہوئے راستے اور سڑکیں بنانے کا کام بھی اپنے ذمہ لے لیا ہے - اور اس وقت جدید تکنیک اور خصوصی آلات کو بروئے کار لاتے ہوئے چار شاہراہوں کے بڑے منصوبے اپنے ہاتھوں میں لے رکھے ہیں ایسا ہی ایک پراجکٹ مغربی بنگال میں درگاپور ایکسپریسوے (نیشنل ہائی وے نمبر ۲) ہے جس کی طوالت ۴۰ کیلو میٹر اور لاگت ۳۸۰ ملین روپے ہے - اس منصوبے کے لئے سرمایہ ورلڈ بینک نے فراہم کیا ہے - یہ منصوبہ اب تکمیل کے قریب ہے -

O اڑیسہ میں سمبل پور سے راور کیلا تک اسٹیٹ ہائی وے نمبر ۱۰ کی پختگی اور کشادگی کا کام چالو ہے - موجودہ سڑک سمبل پور اور شہر فولاد

رادر کیلا کے بیچ ایک اہم رابطہ کا ذریعہ ہے۔ یہ معاہدہ ۲۰۷۳ ملین روپیہ کا ہے اور اس کے لئے سرمایہ صوبائی حکومت اور ایشین ڈویلپمنٹ بینک (ADB) نے مشترکہ طور پر دیا ہے۔ اب تک L & T کا یہ سڑک تعمیر کا سب سے بڑا معاہدہ ہے۔ اس منصوبے میں سمبل پور۔ رادر کیلا روڈ جو ۱۹۲ کیلو میٹر طویل ہے کے درمیان قدیم چھوٹے پلوں کا انہدام اور از سر نو تعمیر بھی شامل ہے تاکہ نئے مطلوبہ دو گلیارے بنائے جاسکیں۔ پرانی تعمیریں منہدم کرنے کے لئے بارودی دھماکوں کا استعمال کیا گیا جن کے لئے درمیانی اونچائی میں ساڑھے چار (۴.۱/۲) سے پانچ (۵) فیٹ گہرے سوراخ کئے گئے۔ پھر ان سوراخوں میں بارود بھردی گئی۔ ایک چھوٹے پل کو گرانے کے لئے ۲۸ کیلو آتش گیر مادہ ۱۰۰ سوراخوں میں بھرا گیا جو ہر ۵۰۰ مکعب میٹر اینٹوں کی تعمیر کو منہدم کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ صرف تین دن ابتدائی تیاریوں اور سوراخ کرنے وغیرہ میں صرف ہوئے جب کہ صرف نصف دن میں مادہ بھر دیا گیا اور دھماکے کردیئے گئے۔ بصورت دیگر یہی کام روایتی طریقے سے کمپریشر اور سڑک توڑنے والے اوزاروں کے ذریعہ ایک مہینے یا اس سے زائد مدت میں انجام پاتا۔

○ بنگلور۔ حصور روڈ، نیشنل ہائی وے نمبر ۷ کے صینے میں ۲۵ کیلو میٹر راستے کی لاگت ۴۰۰ ملین روپیہ ہے اور اس میں سرمایہ ADB لگا رہا ہے۔

○ پنجاب میں راجپورہ۔ سرہند نیشنل ہائی وے نمبر ۲، سوا چوبیس کیلو میٹر لمبا راستہ ۸۸۰ ملین روپیہ کا معاہدہ۔

علاوہ ازیں L & T نے اب تک ۵ لاکھ کیلو میٹر راستوں کا کام انجام کو پہنچایا ہے جس کا بیشتر حصہ ہندوستان اور باہر کے ملکوں میں مختلف صنعتی منصوبوں کے قیام سے متعلق ہے۔

ECC کا ہیڈ کوارٹر مدراس میں ہے۔ اس کے پاس راستوں کی تعمیر کے لئے ایسے ایسے حساس لوازمات اور مشینیں موجود ہیں جن سے بڑے سے بڑے حجم کا کام اعلیٰ معیار کی شرائط کے مطابق پختگی، صفائی اور زود رفتاری سے تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اس میں خام زمین، پتھر، روڑی کی لیباریٹری جانچ، برمے چلانے، زمین چھید کر اس کی گہرائی میں کھمبے اتارنے، تارکول کے ساتھ کنکریٹ ملانے، راستہ ہموار کرنے کے جدید طرز کے لوازمات موجود ہیں۔

کلکتہ ۔ درگا پور ایکسپریس وے مکمل :

L & T کے صدر (آپریشنز) مسٹر اے راما کرشنن نے کلکتہ میں ۱۹/ اگست ۹۵ء کو ہوٹل تاج بنگال میں ایک پریس کانفرنس کو اس منصوبے سے متعلق معلومات فراہم کیں۔ اس سے پیشتر دن کے وقت کمپنی کی طرف سے شہر کے پریس نمائندوں کو مذکورہ راستے کے معائنے کے لئے بذریعہ لگژری بس لے جایا گیا تھا۔

مسٹر راما کرشنن نے منصوبے کے پس منظر کا ذکر کیا اور کمپنی کو دیئے گئے معاہدے کی بروقت تکمیل کے سلسلے میں L & T کے رول کی وضاحت کی۔ انہوں نے میڈیا کے لوگوں کو بتایا کہ کلکتہ۔ درگاپور ایکسپریس وے ایک ۷۰ کیلو میٹر دو گلیارا AT-GRADE HIGWAY ہے۔ یہ ورلڈ بینک کا منصوبہ ہے اور وزارت سطحی ٹرانسپورٹ (روڈ ونگ) نئی دہلی اس منصوبے میں ورلڈ بینک کی ماتحت ہے جب کہ حکومت مغربی بنگال کا پبلک ورکس (روڈ ڈپارٹمنٹ اس کی براہ راست نگرانی کرتا ہے۔

یہ شاہراہ مغربی بنگال کے آنجہانی وزیر اعلیٰ ڈاکٹر بدھان چندر رائے کے فکر کا نتیجہ ہے۔ ساتویں دہائی میں اپنی موت سے پہلے ڈاکٹر بی سی رائے نے اس کے بارے میں تصور کیا تھا۔ یہ ایکسپریس وے گرانڈ ٹرنک روڈ کے نیشنل ہائی وے نمبر ۲ کا بائی پاس ہے اور بردوان کے قریب پالسیت سے کٹ کر نکلتا ہے اور کلکتہ کے قریب ڈانکنی نیشنل ہائی وے نمبر ۲ سے آکر مل جاتا ہے۔ اس طرح بردوان کلکتہ کا فاصلہ ۱۶ کیلو میٹر کم ہوگیا ہے اور اب ہوڑہ سے دہلی کے راستے سے چار معروف ریل لیول کراسنگ کم ہوگئے ہیں۔

یہ راستہ تیز رفتار گاڑیوں کے لئے بنایا گیا ہے اور پالسیت کے دوسرے کنارے پر ان سے ٹول ٹیکس وصول کیا جائے گا۔ اب تک ۹۳ فیصد کام مکمل ہوچکا ہے۔ ۷ فیصد کام بہت جلد مکمل ہوجائے گا اور ۳۱ دسمبر ۹۵ء تک پورے ۴۰ کیلو میٹر کی شاہراہ پر موٹریں دوڑنے لگیں گی منصوبے کی اصل لاگت ستمبر ۱۹۹۱ء میں معاہدے کے وقت ۲.۳۸۴ ملین روپیے تھے۔ جب کہ اسے مارچ ۱۹۹۵ء میں مکمل ہونا تھا لیکن تکمیل تک (یعنی اس سال کے اواخر تک) اس کی لاگت ۴.۳۰۴ ملین روپیہ ہوجائے گی۔

مسٹر راما کرشنن نے بتایا کہ اس راستے کی تعمیر میں زبردست میکانیکی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا گیا ہے اور حکومت اور ورلڈ بینک کی نظروں میں اپنی نیک نامی کے لئے L & T نے لاگت میں مزید اضافے کو اپنے سرمایے کا فیصلہ کیا ہے۔ تاکہ مستقبل میں مزید منصوبوں کے معاہدوں کے لئے کمپنی کو اعتماد کے قابل سمجھا جائے۔

ڈاکٹر شہپر رسول کو جوش ملیح آبادی ایوارڈ

جانے مانے شاعر جناب ڈاکٹر شہپر رسول کو "نیا سفر" ادارے کی جانب سے ۱۹۹۴ء کا بہترین شاعر کا جوش ملیح آبادی ایوارڈ دیا گیا۔ ایوارڈ ۴ ہزار روپے نقد، ایک شال اور توصیفی سند پر مشتمل تھا۔

ڈاکٹر شہپر رسول تقریباً گزشتہ ۲۰ برس سے ہند و پاک کے ادبی جرائد میں شائع ہو رہے ہیں۔ اردو غزل کے نئے منظر نامے پر ڈاکٹر شہپر رسول کا نام ایک حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا ایک مجموعہ کلام "صدف سمندر" ۱۹۸۸ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ ۱۹۸۸ء ہی میں ماہنامہ "سہیل" گیا، نے شہپر رسول کی شخصیت اور شاعری پر ایک خصوصی نمبر بھی شائع کیا تھا۔ عنقریب ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ منظر عام پر آنے والا ہے۔

اسلم جمشید پوری، شعبہ اردو
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی - ۲۵

ooooo

غالب اکادمی میں مشاعرہ اور محفل موسیقی

دہلی میں یونائیٹڈ فرینڈز فیملی کے زیر اہتمام غالب اکادمی میں پروفیسر عنوان چشتی کے زیر صدارت ایک عظیم الشان مشاعرہ اور موسیقی کا پروگرام منعقد ہوا۔ مشاعرہ کی نظامت ڈاکٹر تنویر چشتی نے کی۔ اس مشاعرے میں سوامی شیامانند سرسوتی روشن مہاراج، شریمتی ساوتری شرما نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ نسیم گنگوہی نے شمع روشن کر کے مشاعرہ کا آغاز کیا۔ بابو محمد حنیف وارثی، سکندر عاقل، دانش ایوبی اور بلدیو کپور عنبر نے مشاعرے کو کامیاب بنانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ نسیم گنگوہی نے پروفیسر عنوان چشتی کا شال پہنا کر اور پھول پیش کر کے خیر مقدم کیا۔ پروفیسر عنوان چشتی نے اردو کے شاعروں کو مشورہ دیا کہ وہ لسانی، فنی اور عروضی نکات سے آشنا ہو کر اپنی شاعری کو جمالیات کی نئی سطح سے روشناس کرائیں۔ اس مشاعرے میں پروفیسر عنوان چشتی، سوامی شیامانند سرسوتی روشن، ڈاکٹر شہپر رسول، عمران عظیم، عطائی گنجن، شمس رمزی، وسیم کانپوری، شہناز فرحت، سراج سلمان شمیم قریشی، افضل منگلوری، فرہاد شاہ جہاں پوری، کوثر متین، وجدی بھیان بلدیو عنبر، دانش ایوبی اور سکندر عاقل نے اپنا کلام سنایا۔ مشاعرہ کے بعد محفل موسیقی آراستہ کی گئی۔

مرسلہ : سکندر عاقل، بنگلہ ہاؤس، نئی دہلی - ۲۵

ooooo

"زندگی اک سفر" کا اجرا
رفعت سروش کی پچیسویں کتاب

دہلی کے نواحی شہر نوائیڈہ میں ۶/ نومبر ۹۵ء کو اردو فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ایک ادبی تقریب منعقد کی گئی جس میں رفعت سروش کی نئی کتاب "زندگی اک سفر" کا اجراء عمل میں آیا۔ جلسے کی صدارت افسانہ نگار بلراج ورما نے فرمائی۔ مہمان خصوصی تھے گلزار دہلوی اور ناظم جلسہ ابوالفیض سحر۔ سب سے پہلے ابوالفیض سحر نے جلسے کی غرض و غائت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ نوائیڈہ "شہر اردو" بنتا جا رہا ہے جہاں قرۃ العین حیدر رفعت سروش اور گلزار دہلوی جیسی اردو کی مایہ ناز شخصیات کے آجانے سے ادبی سرگرمیوں میں اور اضافہ ہوا ہے انہوں نے رفعت سروش کی ہمہ جہت تخلیقی شخصیت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ادب و شعر کی مختلف اصناف پر ان کو عبور حاصل ہے اور اب ان کی پچیسویں کتاب "زندگی اک سفر" کا اجراء اس امر کی دلیل ہے کہ وہ بے حد فعال شخصیت ہیں۔

بلراج ورما نے کتاب کا اجراء کرتے ہوئے ایک مختصر مضمون پڑھا جس میں کتاب میں شامل دو ریڈیائی ڈراموں "امراؤ جان ادا" اور "زندگی اک سفر" پر بھرپور تبصرہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ رفعت نے امراؤ جان ادا کے کردار میں نہایت فنکارانہ طریقے سے ریڈیائی ڈرامے کا روپ دکھایا ہے اور یہ ان کا حصہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ کاش رفعت امراؤ جان ادا پر ایک اوپیرا بھی لکھیں جو ان کا خاص میدان ہے۔ کتاب کے مقدمہ کی تعریف کرتے ہوئے بلراج ورما نے فرمایا کہ ریڈیو ڈرامے کے بارے میں بھرپور مضمون خاصے کی چیز ہے۔ اس میں رفعت نے اپنے تخلیقی سفر کو بھی قلم بند کر دیا ہے۔

گلزار دہلوی نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے بہ طور خاص رفعت سروش سے اپنی نصف صدی کی دوستی کا ذکر کیا اور ان کی شخصیت کو نہایت متوازن قرار دیا اور کہا کہ وہ اردو کے بے حد مقبول شاعر اور ادیب ہیں۔

بعد ازاں ہندی اردو کا ملا جلا مشاعرہ ہوا جس سے اندازہ ہوا کہ لوا نیشہ میں کس طرح اردو اور ہندی کے ادیب دوش بدوش تخلیقی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں - جمیلہ بانو، ثریا رحمن، منور سلطانہ، شبانہ نذیر، گلزار دہلوی، عشرت کرتپوری، پی پی رند سری واستو، رفعت سروش معصوم مراد آبادی نے اردو منظومات اور غزلیں پڑھیں جب کہ کملا ورما، یاور کانپوری، کنور پرتاپ سنگھ، پی کے جین اور راہل اگروال نے ہندی کویتائیں اور گیت پڑھے -

OOOOO

غالب کی ۸۹ غزلوں کا انگریزی میں ترجمہ
خواجہ طارق محمود کی کوشش کا نتیجہ

لندن - خواجہ طارق محمود کی کتاب

GHALIB
RHYMED TRANSLATIONS OF SELECTED GHAZALS

جس میں انہوں نے غالب کی ۸۹ غزلوں کا انگریزی میں منظوم ترجمہ اردو عبارتوں کے ساتھ پیش کیا ہے ان دنوں کافی مقبول ہو رہی ہے - کتاب کا سرورق دیکھ اور پڑھ کر انگریزی ادب کے قاری میں پوری کتاب پڑھنے کی امنگ جاگ جاتی ہے - غالب کی اولین اردو غزل انگریزی ترجمے کے ساتھ سرورق کی زینت بنائی گئی ہے -

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

Creation is reflection of creator.s caricature
Each picture is depicted is its paper pack inure

کاو کاو سخت جانیہا ہے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

Hardiness of solitariness is so hard to endure
From dusk to dawn is perpetuity, a mountain to devour

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

What joy it is to behold such unbounded emotion
That sword itself is greeting the martyr to allure

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

Let conjecture throw its dragnet as far and as wide
My verses are Sphinx - like, impossible to secure

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرپا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

Ghalib, I am so restive, even though kept as captive
I regard my fetters flimsy, I have every wish to abjure

OOOOO

"نوری رشید اینڈ کو" کے انعامات کی تقسیم

کچھ عرصہ قبل لندن میں ساؤتھ آل میں مشہور و معروف بیرسٹر اور ادبی و ثقافتی محفلوں کی جان قانونی مشیران و صلاح کار بیرسٹر محمد رشید شیخ اور ان سے بھی زیادہ نامور اور مقبول ان کی اہلیہ و شہرہ آفاق شاعرہ نور جہاں نوری کے دفتر " نوری رشید اینڈ کو " کا افتتاح ہوا - افتتاح کی رسم " تحریک خواتین پاکستان " کی صدر بیگم امۃ الفاطمہ صاحبہ نے ادا کی - مہمانوں میں ساؤتھ آل کی مقتدر سماجی سیاسی شخصیات کونسلر جسٹس آف پیس آنند، سرودل سنگھ گل، معزز وکلاء بیرسٹر، شعراء اور ادباء نے کثیر تعداد میں شرکت کی تھی - خوشی کی بات ہے کہ اب "نوری رشید اینڈ کو " کی جانب سے پاکستان کی جشن آزادی کے پرمسرت موقع پر فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے محب وطن پاکستانیوں کو ان کی خدمات کے سلسلے میں ۱۹/ اگست بروز ہفتہ ایم - اے جناح ہاؤس میں تمغے پاکستان ہائی کمیشن کے ایجوکیشن اتاشی جاوید

بادشاہ کے دست مبارک سے عطا کئے گئے جو تقریب کے صدر تھے۔

ان تمغوں کی اہمیت پر زور ڈالتے ہوئے نور جہاں نوری جن کا تیسرا شعری مجموعہ "خواب و خیال کے موسم" اب منظر عام پر آنے والا ہے نے کہا کہ ہوتا آیا ہے کہ یوم آزادی پر پاکستان میں ہر سال زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو حکومت پاکستان ان کی حوصلہ افزائی کے لیے تمغوں سے نوازتی ہے۔ وطن عزیز سے دور بھی پاکستانی ایسے ہیں جو نہ صرف وطن عزیز سے پیار کرتے ہیں بلکہ پاکستان کے لیے کسی حوالے سے فخر پاکستان اور آبروئے پاکستان ہیں جو اس دیار غیر میں اپنے تشخص، اپنی ثقافت اور پہچان کو سلامت رکھنے میں پیش پیش ہیں۔ "نوری رشید لینڈ گو" نے ایسے ہی لوگوں کی علمی، ادبی سماجی خدمات کی حوصلہ افزائی کے لیے مندرجہ ذیل اشخاص کا انتخاب کیا اور انہیں ایوارڈز دیئے گئے۔ انعامات، ایوارڈ، تعریفی اسناد یا اعتراف یہ وہ چیزیں ہوتی ہیں جن سے نہ صرف اچھے کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے بلکہ اور لوگوں کے دل میں اچھے کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ تقریب میں بہت بھاری تعداد میں پاکستانیوں نے شرکت کی۔ مندرجہ ذیل افراد کو ان کی خدمات کے صلے میں سرٹیفکیٹ اور تمغے دیئے گئے

(بائیں سے دائیں) نور جہاں نوری، بیرسٹر محمد اطہر، عمر شیخ او ورسیز کے چیرمین محمد عمر شیخ پاکستانی سفارت خانہ کے ایجوکیشن اتاشی جناب جاوید بادشاہ، نواب میر یاسین علی خان، رشید خان، پیچھے کھڑے ہوئے (دائیں سے) یوسف فاروقی ایم۔اے جناح ہاؤس کے مالک جاوید احمد، خالق بھٹی، وسیم صدیقی سردار قمر درانی، غلام محی الدین گاما اور بیرسٹر محمد رشید شیخ کا گروپ

****

(1) محمد عمر شیخ۔ قائد اعظم کی سیاسی تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن

(2) جاوید احمد - محب وطن پاکستانی جنہوں نے قائد اعظم کی رہائش خریدی اور قومی تقریبات کے لیے وقف کر دی۔

(3) غلام محی الدین گاما۔ آفتاب موسیقی جو گزشتہ ۳۰ سال سے پاکستان کا نام موسیقی کے ذریعے بلند کر رہے ہیں۔

(4) یوسف فاروقی ۔ بہترین فوٹو جرنلسٹ جو بہت محنت اور لگن سے قومی تقریبات کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔

(5) رشید خان ۔ بہترین فوٹو گرافر محب وطن پاکستانی جو گزشتہ ۳۰ سال سے قومی تقریبات کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔

(6) بیرسٹر علی محمد اطہر۔ محب وطن پاکستانی۔ بنگالی ہونے کے باوجود بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا۔ آج تک متحدہ پاکستان کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔

(7) خالق بھٹی قرآن کریم کا منظوم ترجمہ فرما رہے ہیں۔

(8) میر یاسین علی خان۔ بزرگ شاعر، قائد اعظم کے سپاہی۔

(9) سردار قمر درانی۔ ۱۹۶۴ء میں مغربی لندن میں پہلے اسلامی سنٹر کی بنیاد رکھی۔ جہاں سے ۳ ہزار بچے مذہبی تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔

(10) وسیم صدیقی ۔ بہترین براڈ کاسٹ۔ بہترین ناظم جن کی نظامت کسی بھی تقریب کی کامیابی کی ضامن ہے۔

مرسلہ : مسز سعیدہ بیگم

, Cuckoo Dene, Hanwell, London W7 - 3DT

OOOOO

جمشید مسرور کے اعزازت

ناروے میں رائل نارویجین کلچرل کونسل اور محکمہ ٹرانسپورٹ کے ایما پر ناروے کے چار معتبر نارویجین شعرا کی کمیٹی نے تین شعرا کی نظموں کا انتخاب کیا جنہیں انڈر گراؤنڈ ٹرینوں اور بسوں میں خوبصورت بڑے کارڈز کی شکل میں لگایا جانا تھا۔ ان تین منتخب شعرا میں سے دو نارویجین شعرا ہیں تیسرے اردو دنیا کے معروف شاعر جمشید مسرور۔ جمشید مسرور کی خوبصورت نظم "ایک منظر" (SCENARIO) کو جمشید مسرور کے پچھلے سال

ذو لسانی مجموعے "لمحوں کے سمندر" سے نظم کے نارویجین روپ سمیت
ب کیا گیا۔
پچھلے ہفتے ایک بہت بڑی اوپن ایئرپریس کانفرنس میں جمشید مسرور نے
نظم کا اردو روپ نارویجین سامعین کو سنایا۔ اس نظم کا نارویجین روپ
وے کے معروف شاعر ارلنگ کٹلسن نے سنایا۔ اس طرح اردو اوسلو کی
فضاؤں میں تاریخ میں پہلی بار گونجی۔

جمشید مسرور کی یہ نظم اس وقت نہایت خوبصورت فنکاری کے نمونے
خ رنگ کے پلے کارڈز کی صورت میں انڈرگراؤنڈ بسوں اور ٹرکموں میں
ں کے مشاہدے کے لیے آویزاں ہے۔ یہ جمشید مسرور کے علاوہ پاکستان
ر اردو دنیا کے لیے بھی ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ جمشید مسرور کا ایک اور
یخی اعزاز یہ ہے کہ ان کا کلام نارویجین کالجوں کے لیے نصاب میں شامل
ا جاچکا ہے۔ یہ درسی کتاب "KOLON" کے نام سے مارکیٹ میں
ستیاب ہے اور طلباء کے استعمال میں ہے۔ ماہنامہ انشاء کے تاریخی شاہکار
اسکنڈے نیویائی ادب نمبر" میں جمشید مسرور کی شاعری، افسانوں، تراجم
ر دیگر تحریروں کے لئے ایک الگ گوشہ قائم کیا گیا ہے۔

ناروے کی لیبر پارٹی (آربائیدر پارٹی) کی طرف سے روبینہ رانا سٹی کونسلر منتخب ہو گئیں

ناروے میں بلدیاتی انتخاب کے بعد ۲۵/ اکتوبر تک سٹی کونسل
نانے کی قانونی حد مقرر تھی۔ دائیں بازو کی جماعتوں میں شدید نا اتفاقی کی بناء
۔ یہ لیبر پارٹی ہی تھی جس نے پھر سٹی کونسل بنائی۔ محترمہ روبینہ رانا (بیگم
شید مسرور) کے بارے میں پہلے سے قیاس آرائی تھی کہ وہ ایک متحرک
سیاسی رہنما کے طور پر سامنے آئیں گی۔ لہٰذا نئی سٹی کونسل میں روبینہ رانا
سٹی کونسل کے طور پر منتخب ہو چکی ہیں۔ انہیں ان کی اپنی مرضی کے مطابق کلچر
ینڈ ایجوکیشن کمیٹی کا رکن نامزد کیا گیا ہے جو کہ اوسلو میں پاکستانی کمیونٹی
کے لیے ایک خوش آئند خبر ہے۔

ooooo

ادیبہ ڈاکٹر حبیب ضیاء جدہ میں

حیدرآباد دکن سے کوئی ادبی شخصیت جدہ آئے اور زندہ دلان
حیدرآباد اس کے اعزاز میں کوئی تقریب برپا نہ کریں، ایسا تو ممکن ہی نہیں۔
اور اب کے تو شخصیت بھی ایسی کہ اس کی ادبی سرگرمیوں پر نظر ڈالیں تو

ہماری ہمہ رکم اور اس کے موضوع پر نظر کریں تو بجھ لطیف! ہماری مراد
محترمہ ڈاکٹر حبیب ضیاء سے ہے جو جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو کی صدر اور
پانچ کتابوں کی مصنفہ ہیں، اترپردیش اردو اکیڈیمی اور آندھراپردیش اردو
اکیڈیمی سے ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں۔ اندرا گاندھی نیشنل فاؤنڈیشن کی طرف
سے بہترین رائٹر کا خطاب حاصل کر چکی ہیں اور ایک خوبصورت طنز و مزاح
نگار ہیں۔ ان کی پانچ کتابوں میں سے تین تو تحقیق و تنقید پر مشتمل ہیں جب
کہ دو کتابیں "گویم مشکل" اور "انیس بیس" طنزیہ و مزاحیہ مضامین پر
مشتمل ہیں۔ محترمہ حبیب ضیاء بزم عثمانیہ جدہ کے کرتا دھرتا جناب عارف
قریشی کی استاد رہی ہیں۔ اپنی استاد اور ایک نامور ادیبہ کو جدہ کے ادبی
حلقوں سے روشناس کرانے کے لیے عارف قریشی نے ایک شایان شان
تقریب کا اہتمام کیا جس کے پہلے دور کی صدارت جناب بیکس نواز شارق اور
نظامت جناب ناظر قدوائی والد نے کی۔ مزاحیہ مضامین پڑھنے والوں میں ڈاکٹر
نعیم جاوید تھے جنہوں نے "دانش گیری" کے عنوان سے دانش پر خوبصورت
خیال آرائی کی تھی، دوسرا مضمون یار عزیز علیم خان فلکی کا تھا جو حیدرآبادی
زبان یعنی دکنی کے حوالے سے اور اس کلچر کی نمائندگی پر پھلجھڑیاں بکھیر رہا تھا
اس دور کا اختتام ڈاکٹر حبیب ضیاء صاحبہ کے مزاحیہ مضمون "بے بی" پر ہوا
جس میں آپ نے بالغ ہو جانے والی "بے بیوں" کے ذکر سے محفل کو کشت
زعفران بنا دیا۔

تقریب کا دوسرا دور مشاعرے پر مشتمل تھا جس کی صدارت بزرگ شاعر
جناب شجاع الدین فاروقی نے فرمائی۔ مشاعرے کی پہلی شاعرہ محترمہ منورالنساء
منور تھیں جن کے ہاں مشاعرہ منعقد ہوا۔ دیگر شرکاء کے اسمائے گرامی یہ ہیں
خالد فریدی، عرفان بارہ بنکوی، علیم خان فلکی، شاہد انور، اطہر ہاشمی، راشد
صدیقی، بیکس نواز شارق، نسیم سحر، انجم ملیح آبادی، ناظر قدوائی والد، شجاع
الدین فاروقی۔

رپورٹ: نسیم سحر، جدہ

ooooo

ناروے میں نارویجین ادیب کنوت ہامسن کے ناول "وکٹوریہ" مترجم: ہرچرن چاولہ کی رسم اجراء

اوسلو (ناروے) ۲۲/ اکتوبر ۹۵ء کو بزم شعر و ادب، اوسلو کی
جانب سے اوسلو کمیون کی ڈائمک مانکے لائبریری (رو آ برانچ) کے ہال میں

ہرچرن چاولہ کے ترجمہ کردہ اور نیشنل پبلشنگ ہاؤس دریا گنج، نئی دہلی سے شائع شدہ عالمی شہرت کے نوبل انعام یافتہ نارویجین ادیب کنوت ہامسن کے ناول "وکٹوریہ" کی رسم اجراء مہمان خصوصی پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے ہاتھوں سرانجام پائی - پروفیسر آزاد اوسلو یونیورسٹی میں "ہند و پاک میں ماڈرن اردو شاعری" پر لیکچر دینے تشریف لائے تھے -

صدارت کے فرائض اوسلو میں پانچ کامیاب مشاعروں کے منتظم اور مشہور شاعر جمشید مسرور نے ادا کیے اور نظامت معروف افسانہ نگار سعید انجم کے ذمہ رہی -

آزاد صاحب نے فرمایا "ہرچرن چاولہ کے ناروے اور بھارت کے بیچ بنائے گئے ادبی پل کے پایوں میں یہ ایک اور نیا اور خوبصورت اضافہ ہے - اس سے پہلے بطور مترجم ہرچرن چاولہ "ناروے کے بہترین افسانے" اور ڈینش ادیب ایچ سی آندرسن کی بچوں کے لیے مشہور ترین طویل کہانی "ننھی جل پری" نام کی دو کتابیں قارئین اردو ادب کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں لیپنز ادب کے آوان پردان پروگرام کے تحت ان کی اردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی، ہندوستانی افسانوں سے منتخب کردہ 61 افسانوں کی ایک دلپذیر نارویجین انتھولوجی بہ زبان اردو ناروے میں دسمبر ۹۲ء میں منظر عام پر آچکی ہے - اس کے علاوہ اردو افسانے میں بھی ان کا بے شمار کام ہے جو میرے ناروے کے دو دوروں اور ان کی قربت میں میری نظروں سے گزرا ہے

چائے کے وقفے کے بعد پروگرام کے دوسرے دور میں آزاد صاحب کی صدارت میں ایک مشاعرے کا اہتمام ہوا، جس میں جمشید مسرور، عطا انصاری، خالد حسین تحمل، پرویز بھٹی وغیرہ نے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا - کئی محافل میں پہلے بھی پڑھی گئی جمشید مسرور کی پنجابی نظم نے سماں باندھ دیا - بعد میں آزاد صاحب نے اپنے تازہ کلام سے سامعین کو نوازا - انہوں نے اپنی ادبی اور شعری زندگی کے واقعات کے علاوہ قارئین کے پرزور اصرار پر اپنے والد محترم پروفیسر تلوک چند محروم کی نظم "ملکہ نور جہاں کا مزار" سنا کر اور دوسری ادبی و شعری شخصیتوں سے اپنے قرب کے حالات، تجربات اور واقعات بیان کرکے حاضرین کو محظوظ کیا - آخر میں ہرچرن چاولہ نے بطور صدر "بزم شعر و ادب" حاضرین اور آزاد صاحب کا شکریہ ادا کیا -

ooooo

ابھی تک یہ کالم ادبی "اطلاعات ○ اعلامات ◎ خبریں" کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے - تازہ شمارے سے عنوان میں تبدیلی کردی گئی ہے

(مدیر انشاء)

عید نمبر

انشاء کا آئندہ شمارہ "عید نمبر" ہوگا جو ۲۵ فروری ۹۶ء کو منظر عام پر آئے گا - سابقہ عید نمبروں کی طرح یہ عید نمبر بھی وقیع ادبی، دینی، علمی، فلمی مضامین، دلچسپ افسانوں اور منظومات پر مشتمل ہوگا - اس کی ضخامت تقریباً ۸۰ صفحات اور قیمت اندرون ملک ۱۰ روپے ہوگی - خصوصی تیاری کے سبب عید نمبر جنوری اور فروری ۹۶ء کے مشترک شمارے کے طور پر شائع ہوگا -